طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس: 557716 فون مکان: 521064

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۴. بارکو۔ سری نگر ۵. کیکوکیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. میڈونا کیننگ کمپنی
۷. چمپئین وہائٹ روٹس ۸. پیری سوئٹس اینڈ ٹافیز ۹. ڈرگ بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سِل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ؟

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:-

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض۔ حیدرآباد

ہم کہاں رکتے ہیں عرش و فرش کی آواز سے

.AIBANI TRAVELS.

○ گروپ ٹورز ○ امیگریشن

○ پاسپورٹ ○ ویزا

○ کرائے کی کاریں ○ ہوٹل ریزرویشن

اور ٹکٹیں ــــ اندرونِ ملک
اور غیر ممالک کے لیے

۳۱۲ عبدالرحمٰن اسٹریٹ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳
فون 339712 / 320188

اِس تھیلی کے

★

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

امریکہ.... امریکہ (سفرنامہ)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

★

مالِ مُفت (اِنشائیے)

چٹے بٹے (فہرست)

چورن (منظومات)

فروری ۱۹۸۷ء سے

شگوفہ

کے عام شمارہ کی قیمت چار روپے پچاس پیسے (4=50)

سالانہ خریداری ۴۵ روپیے ہوگی۔

(وی پی کی صورت میں ۵۰ روپیے) ——— (ادارہ)

نئے سال کی مبارک باد اور نیک تمناؤں کے ساتھ

منجانب :

اسٹینڈرڈ ویلڈنگ اینڈ میٹل ورکس

جہاں

ہمہ اقسام کا اسٹیل فرنیچر ، سلاٹیڈ اینگلز (SLOTTED ANGLES)

اور پریس سے متعلق اشیاء و آلات نہایت سلیقے اور عمدگی سے
تیار کیے جاتے ہیں

اِس کے علاوہ

خواہش اور فرمائش کے مطابق جاب ورکس (JOB WORK) بھی لیا جاتا ہے

ربط قائم کرنے کا پتہ :

انڈسٹریل گلڈ
یونٹ نمبر ۳۷ ، وجے نگر کالونی
حیدرآباد 500457

فون نمبرس :
فیکٹری : 224050
گھر : 263281

پروپرائٹر : شیخ احمد

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ شکم کیا ہے

فوڈ اِن

FOOD INN

قلبِ شہر میں جزوی ایرکنڈیشنڈ اور کانفرنس ہال

o مغلئی o عربی o پنجابی o چینی o تندوری

ہر طرح کے کھانے آپ کی پسند کے مطابق

اور ہماری دو جدّتیں ـــــ ویجی ٹیبل دودھ پلاؤ اور مٹن کھٹا میٹھا

فوڈ اِن FOOD-INN 61-A شہید بھگت سنگھ روڈ۔
قلابہ پولیس اسٹیشن کے سامنے۔ قلابہ بمبئی 400049
فون:۔ 2021435 — 2021289

کپڑوں میں دودھ جیسی سفیدی اور چاندی سی چمک تو صرف اور صرف
فلیش واشنگ پاؤڈر ہی سے آسکتی ہے
جی ہاں
ڈائنا کم انڈسٹریز کا تیار کردہ فلیش واشنگ پاؤڈر

فیکٹری کا پتہ: 8/274-4-19
حیدرآباد 500264

فون نمبرس 522146
551108

نئے سال کی مبارک باد اور نیک تمناؤں کے ساتھ
وٹامن اور پروٹین سے بھرپور
متوازن اور توانائی بخش فیڈس
کا
حیدرآباد اور سکندرآباد میں اہم مرکز
ماسٹر فیڈس
جہاں
پولٹری فیڈ، کیٹل فیڈ اور ریبٹ فیڈ
نہ صرف تیار کی جاتی ہے بلکہ ہول سیل اور ریٹیل میں فروخت بھی کی جاتی ہے

فیکٹری کا پتہ: 8/274-4-19 میر عالم ٹینک
حیدرآباد 500264

فون نمبر 522146
551108

یوسف ناظم
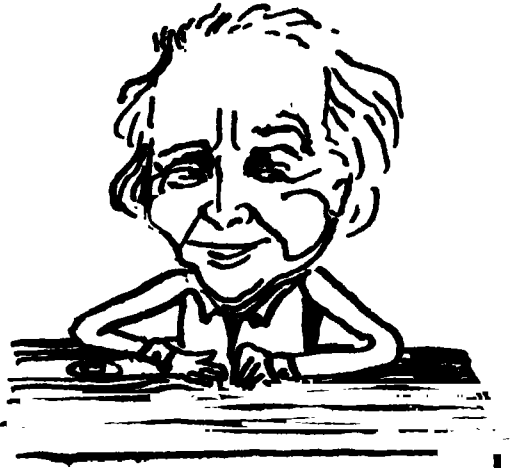
ایک خطبۂ صدارت

۷ نومبر ۸۶ء ۔ نمائش کلب حیدرآباد

ہمارے معاشرے میں جس طرح
شادی بیاہ کے لیے ایک مخصوص اور مناسب
عمر مقرر ہے اسی طرح ادب کی دنیا میں جلسوں کی صدارت
کے لیے بھی ایک خاص عمر طے ہے جو اتفاق سے کہیں درج نہیں ہے
لیکن ایک نفیس اور مستند روایت کی طرح سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔ سبھی
معززین اور منتظمین اس روایت کی پیروی کرتے اور ثوابِ دارین حاصل کرتے رہتے ہیں۔
میرا خیال جو ناقص ہونا چاہیے یہ ہے کہ اس خاکسار کو جسے راقم الحروف بھی کہا جاسکتا ہے
اس ضمن میں بالکل صحیح موقع پر طلب کیا گیا ہے ورنہ اس کا اندیشہ تھا کہ درد تو حد سے گزر جاتا لیکن دوا نہ بنتا۔
ان مقررہ اصولوں کے معاملے میں گڑبڑ اس وقت ہوجاتی ہے جب شادی بیاہ کی عمریں جو عام طور پر کھیلنے کھانے کے دن
ہوتے ہیں صدارت اور صدارت کی عمر کو پہنچ کر شادی کے شغل سے شوق فرمانے کو جی چاہتا ہے۔ ان
میں سے ایک غلطی تو اس لیے نبھ جاتی ہے کہ اس کا فائدہ کوئی اور نہیں اٹھا سکتا لیکن دوسرے
معاملے میں البتہ ۔۔۔۔

ایک عقد کی تقریب اور ایک ادبی نوعیت کے جلسے میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے یہ
بات میرے ذہن میں یوں آئی کہ ان دونوں موقعوں پر ایک خطبہ
ضرور ہوتا ہے بس فرق یہ ہوتا ہے کہ نکاح کے خطبے
کا صدمہ صرف دو افراد کو سہنا پڑتا ہے
جب کہ خطبۂ صدارت سے وقتی
طور پر ہی سہی سبھی حاضرین
جلسہ گھائل
ہوتے ہیں۔

ایک اور فرق یہ ہوتا ہے کہ نکاح کا خطبہ ایک ایسا شخص پڑھتا ہے جس کا نفسِ تقریب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت دور درشن کے درشک کی ہوتی ہے لیکن جلسے کے صدر کو یہ ناگوار فرض خود انجام دینا پڑتا ہے۔ ناگوار کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ یہ خطبہ سوائے صدر کے سب کو ناگوار گزرتا ہے لیکن ان دونوں میں سب سے زیادہ اہم فرق یہ ہوتا ہے کہ خطبۂ نکاح کے اردو حصّے میں کتنی ہی غلط سلط باتیں کیوں نہ داخل کر دی جائیں اور اس میں کتنے ہی حشو و زوائد کیوں نہ شامل کر دیئے جائیں خطبہ خواں شخص کبھی یہ نہیں کہتا کہ وہ اس منصب کے لائق نہیں تھا لیکن ادبی جلسوں کے صدور کو خواہ وہ کسی وجہ سے عالم فاضل ہی کیوں نہ ہوں بھری محفل میں تمام حاضرین جلسہ کے روبرو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس صدارت کے اہل نہیں تھے لیکن جہاں تک خاکسار کا تعلق ہے یہ بات مبنی برحقیقت ہے اور مجھے خوشی صرف اس لیے ہے کہ اس بات کا اعتراف کرنے اور سچ کہنے کا مجھے ایک موقعہ عطا کیا گیا۔ براہِ کرم وعدہ فرمایئے کہ آپ میرے اس اعتراف کو انکساری یا اس قسم کی کسی اور حرکت پر محمول نہیں فرمائیں گے۔

حضرات! یہ جلسہ چونکہ طنز و مزاح سے متعلق ہے اس لیے آپ سے میری دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ اس خطبۂ صدارت کو دوسرے درجے کا خطبہ سمجھیں کیونکہ ہمارے چند زعمائے ادب اور عمائدین نقد و نظر کا خیال ہے کہ طنز و مزاح ادب میں دوسرے درجے کی چیز ہے۔ یہ بات میں نے پہلے بھی سنی تھی کیونکہ میرا کام ہی سننے اور سہتے رہنا ہے لیکن ابھی کوئی ۴، ۵ ہفتے قبل بمبئی کی ایک ادبی نشست میں کھڑے ہو کر ایک مقرر نے یہ انکشاف فرمایا کہ طنز و مزاح کو دوسرے درجے کا ادب قرار دینے میں اہل یونان کا ہاتھ ہے۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ کم سے کم اس معاملے میں یقیناً کوئی بیرونی ہاتھ کار فرما ہوگا کیونکہ ہمارے یہاں کے کسی نقاد کے ذہن میں اتنی نازیبا بات کبھی ہرگز نہیں آسکتی۔ مقرر موصوف نے اس نظریئے کا مقام پیدائش تو دریافت کر لیا لیکن اس کے سنہ پیدائش پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ ان کی ڈالی ہوئی روشنی اتنی دور نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہم آپ سبھی جانتے ہیں کہ فلاسفۂ یونان و روما کی شہرت مسلّمہ ہے۔ یہ بے حد مشہور لوگ ہیں اور یہ بات بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ یونان کے علاقے میں دانشوروں کی پیدائش کا سلسلہ کب کا منقطع ہو چکا کیونکہ قدرت نے ہر علاقے کے لیے علم و فضل کا کوٹا بھی مقرر کر رکھا ہے اور یونان اس کوٹے سے زمانہ پہلے فارغ ہو چکا ہے اس لیے طنز و مزاح کے متعلق یہ بات جو خود مزاحیہ ہے معلوم نہیں کتنے ہزار سال پہلے کہی گئی تھی۔ بہرحال مجھے اس نظریے کی نفی کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی تردید کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کچھ عرصہ پہلے ایک شاعر نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ ایک مقامی روزنامے میں میرے متعلق یہ فتنہ انگیز خبر چھپی ہے کہ گذشتہ ہفتے دارالشفاء میں جو مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا اس میں مجھے زدوکوب کیا گیا۔ یہ سراسر غلط ہے میں اس خبر کی پرزور تردید کرتا ہوں اور اپنے احباب اور شناساؤں کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے قطعی زدوکوب نہیں کیا گیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو اس مشاعرے میں مدعو ہی نہیں کیا گیا تھا۔

حضرات! اس واقعے کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ طنز و مزاح سے متعلق جب یہ بات کہی ہی نہیں گئی تو میں اس کی تردید کیوں کروں۔ اس لیے اب تک میں نے جو عرض کیا آپ اُسے تردید نہ سمجھیں صرف تمہید سمجھیں۔

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ پچھلے چند دہوں سے طنز و مزاح کو ہندوستان کے سبھی علاقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کو ہر سطح پہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے

مقامات پر طنز و مزاح کی محفلیں منعقد کی گئی ہیں۔ سیمی نار ترتیب دیئے گئے ہیں جن میں اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث اور تبادلۂ خیال کیا گیا ہے۔ ظرافت سے متعلق گزشتہ چند سالوں میں کئی تحقیقی مقالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ آج سے کوئی نصف صدی قبل ظرافت سے متعلق اردو میں صرف رشید احمد صدیقی کی ایک کتاب طنزیات و مضحکات تھی جسے تبرک کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور آج یہ حال ہے اس موضوع پر اتنی کتابیں موجود ہیں کہ ان سے بچنا محال ہے۔ ہمارے وہ تنقید نگار جن کی پیشانیوں پر ظرافت کے نام سے دو تین بل پڑ جاتے تھے اب اس موضوع سے اتنی دلچسپی لینے لگے ہیں گویا ظرافت ان کی دوسری بیوی ہو اور دوسری بیوی کے معاملے میں لوگ تو ریشہ خطمی ہی ہو سکتے ہیں۔۔ یہ ایک مستحسن تبدیلی ہے۔ برف ابھی طرح پگھلتی ہے۔

دلی اردو اکادمی نے تو حال ہی میں خصوصی طور پر ایک مقالہ لکھوایا اور چھپوایا ہے۔ ہندوستان کی ساری اردو اکادمیوں میں اسی لیے مجھے دلی اردو اکادمی زیادہ پسند ہے۔ یہ میری محبوب اکادمی ہے اور ظرافت سے متعلق ایک کتاب کی اشاعت سے اس اکادمی نے ثابت کر دیا کہ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔

مذکورہ باتوں کے علاوہ دلی، لکھنؤ، بھوپال، اور بمبئی کی آکاش وانیوں نے ظرافت سے متعلق بند آڈی ٹوریم میں کھلے اجلاس منعقد کئے۔ دور دور سے مزاح نگاروں کو بلایا اور ان سے ان کی تخلیقات سنوا کر خود بکثرت داد حاصل کی۔ ریڈیو اسٹیشن کے یہ پروگرام اتنے ہی مقبول ہوئے جتنے کہ ان کے مشاعرے یا موسیقی کے پروگرام پسند کئے جاتے ہیں اور اگر آپ سچ پوچھتے ہیں تو ہندوستان کے سارے اسٹیشنوں میں بس یہی ایک اسٹیشن نام کے رہ گئے ہیں جن کا نام ریڈیو اسٹیشن ہے ورنہ ریلوے اسٹیشن تو اس قابل رہے نہیں کہ ادھر کا رخ کیا جائے۔ کچھ ریلوے اسٹیشن تو بالکلیہ عوام کے قبضے میں ہیں لیکن یہ وہ عوام نہیں ہیں جو انقلاب لاتے ہیں بلکہ وہ عوام ہیں جن کے خلاف انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ سطح پر ظرافت کو تسلیم کئے جانے کا ایک ثبوت تازہ ترین ثبوت یہ بھی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کی جانب سے مختلف اصناف ادب اور فنون پر جو اعزازات ہر سال دیئے جاتے ہیں ان کی فہرست میں ۱۹۸۲ء سے طنز و مزاح سے متعلق بھی ایک ایوارڈ کا اضافہ کیا گیا ہے اور کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ پہلا ہی ایوارڈ حیدرآباد کے حصے میں آیا۔ میرا اشارہ مجتبیٰ حسین کی طرف ہے۔ مجتبیٰ حسین صرف مزاح لکھنے ہی میں نہیں، طنز و مزاح کی تبلیغ کے کام میں بھی سب سے آگے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اردو کے کتنے ہی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ جتنے نکلتے ہیں اس سے زیادہ بند ہوتے ہیں۔ اگر کسی رسالے کے ۳ شمارے شائع ہو جاتے ہیں تو دیکھنے اور پڑھنے والوں کو تقریباً غش آجاتا ہے لیکن حیدرآباد کا ایک رسالہ شگوفہ ہے جو پچھلے ۱۴ سال سے بن نکلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر کی مالی حالت سقیم نہ سہی لیکن کچھ زیادہ منظم بھی نہیں ہے لیکن شگوفہ ہر ماہ چٹکتا ہی رہتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال اتنے زیادہ شریف بھی نہیں ہیں کہ اپنی محنت کی کمائی شگوفے پر خرچ کریں کیونکہ ان کے گھر میں بھی پھول اور شگوفے ہیں۔ اس خود مکتفی رسالے کی مسلسل اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ لوگ کم سے کم ظرافت کی حد تک بے حس اور بے بس نہیں ہیں۔

ہندوستان میں اور خاص طور پر اردو دنیا میں لوگوں میں حس مزاح کو زندہ اور سرسبز رکھنے کا کام شگفتہ

نیک کام زندہ دلانِ حیدرآباد ہی نے انجام دیا ہے اور یہ کام ایسے سخت اور نامساعد حالات میں انجام دیا ہے جب ہم غالب پہ کرم لیکن اردو پہ ستم کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور وہ بیج اُس زمانے میں شائع ہوتا تھا جب چمن میں اردو ہوائے گل کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ زندہ دلانِ پنجاب کی سرگرمیوں کے دن وہ تھے جب اردو خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی لیکن زندہ دلانِ حیدرآباد نے یہ کام اس وقت اپنے ذمّے لیا جب ماحول زبانِ حال سے کہہ رہا تھا

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ ؎ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن اس انجمن نے اس چراغ کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی لَو اتنی بڑھائی کہ کبھی اس سے لَو لگا بیٹھے۔ عالمی مزاح کانفرنس کے انعقاد نے قلی قطب شاہ کے اس دیس کی شہرت کو قطبین تک پہنچا دیا۔ حیدرآباد کے زندوں نے دنیا بھر کے زندوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ یہ انجمن آج سے ۲۰، ۲۲ سال پہلے صرف ایک ننھا پودا تھی آج یہ حمایت اللہ کی طرح شمشاد قد درخت ہے۔ حمایت اللہ کا نام میں نے اس لیے لیا کہ جب اس پودے کا بیج بویا جا رہا تھا تو یہ حضرت بھی موجود تھے۔

بھارت چند کھنہؔ اور نریندر لوتھر جیسے وسائل نصیب اور مسائل شکن اہلِ قلم اور ادب دوستوں نے اس درخت کو دھوپ، لُو اور پلیوشن سے بچایا اور یہ سایہ دار درخت مصطفیٰ علی بیگ اور طالب خوندمیری تک ۳ پیڑھیوں کو شاد اور آباد دیکھ چکا ہے اور اس بات کی صرف اُمید ہی نہیں بلکہ اس کا یقین ہے کہ حیدرآباد شہر میں پانی کی شدید قلت اور کبھی کبھی سر اٹھانے والی کسی علت کے باوجود یہ درخت ہمیشہ ہرا بھرا اور گھنا رہے گا۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ آپ اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔ درخت کا سایہ کسی بھی دیوار کے سائے سے بہتر ہوتا ہے چاہے وہ دیوارِ چین ہی کا سایہ کیوں نہ ہو۔ ویسے اگر آپ کو درخت سے زیادہ دیوار کا سایہ پسند ہو تو آپ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادارے کو دیوارِ قہقہہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ دیوار نہیں ہے جو لوگوں کے بیچ کھڑی کی جاتی ہے بلکہ وہ دیوار ہے جس پر آپ تکیہ کر سکتے ہیں اور جسے صرف کان ہی نہیں ایک زبان بھی عطا ہوئی ہے۔ اور یہ ہے شیریں زبان۔

ظرافت کے تعلق سے ایک بات بہرحال عرض کرنا چاہوں گا کہ ظرافت کا نقص یہ ہے کہ یہ جس قدر دل لبھانے والی چیز ہے اتنی ہی دل دکھانے والی چیز بھی ہے۔ ظرافت حدودِ شرافت میں رہے تو جانِ جاناں ہے ورنہ بلائے جان۔

حضرات! میں نے آپ کی جتنی بھی سمع خراشی کی ہے اس کا ازالہ ان تخلیقات سے ہو جائے گا جن سے اب آپ لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ میں آج کی اس محفل کو فرحت و انبساط سے ہمکنار کرنے والے تمام اہلِ قلم کا بلا تخصیص جنس و عمر خیر مقدم کرتا ہوں اور آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ طنز و مزاح کی محفل میں صدارت و دلالت کے کوئی معنے نہیں ہوتے کیونکہ

یہ مے خانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے ؎ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

اس محفل کی صدارت کو میں نے صدارت نہیں، سعادت سمجھ کر قبول کر لیا تھا ورنہ آپ سب جانتے ہیں کہ میں کتنے پانی میں ہوں اور وہ بھی حیدرآباد میں جہاں پانی ہی نہیں ہے۔

○○ [زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں پڑھا گیا]

اچھا قلم کسی کو صاحبِ قلم نہیں بناتا
لیکن
قلم کار کے لیے اچھا قلم بھی تو ضروری ہے

حیدرآباد و سکندرآباد میں
قلم کاروں، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ طالب علموں اور شوقین حضرات کے لیے
ہمہ اقسام کے بیرونی اور دیسی

فاؤنٹین پن و بال پن

کی فروختگی اور درستگی کا واحد مرکز

دِی دکن پن اسٹورس عابڈس

فون نمبر ہیڈ آفس، 42748
برانچ آفس، 820020

جہاں ایک بار آنے والا، کبھی کسی اور دکان کا رُخ نہیں کرتا۔

ہم نے شہر میں معیاری اور خوبصورت ہوٹلوں کی
ایک تاریخ بنائی ہے

کیفے گروٹو / کیفے گزیبو

ڈی یم آر ایل چوراہا سنتوش نگر حیدرآباد

بنجارہ ہلز روڈ ۱ حیدرآباد

مرزا برادرس کی نگرانی میں — نفیس ماحول ★ مودب سرویسنگ ★ واجبی قیمتیں
★ ہردم تازہ اشیاء خوردونوش ★ صفائی کا خاص اہتمام

مجتبیٰ حسین

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

(جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی گولڈن جوبلی ۲۲ر اور ۲۳ر دسمبر کو دہلی میں منائی گئی۔ یہ مضمون اس موقع پر پڑھا گیا)

میری نظر میں بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے بزرگ وہ جن کی بزرگی پر ترس آتا ہے اور دوسری قسم کے بزرگ وہ جن کی زندگی پر پیار آتا ہے۔ اگرچہ پیار اور ترحم دونوں ایک ہی وسیع جذبے کے ذیلی جذبے ہیں لیکن پیار چاہے بزرگ پر آئے یا دوشیزہ پر پیار ہی ہوتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحر کا شمار موخر الذکر بزرگوں میں ہوتا ہے جن کے بڑھاپے پر ان دنوں شباب آیا ہوا ہے ایک ایسا شباب جس کا تھوڑا سا حصہ بھی ہمیں پندرہ بیس برس پہلے مل جاتا تو ہم بھی وہ سب کچھ کر گزرتے جو آدمی کو کرنا چاہیئے۔ بزرگوں کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت پکڑتا ہے۔ لیکن بعض خوش نصیب بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی عبرت کے ساتھ ہر چیز کو پکڑ لیتا ہے۔ جیسے تین سال پہلے ایک دن میں نے کنور صاحب کو دیکھ کر اپنا کلیجہ پکڑ لیا تھا۔ یہ اس دن کی بات ہے جب دہلی میں ہر دن کی طرح بجلی فیل ہو گئی تھی۔ مجھے اور کنور صاحب کو دہلی کی ایک پچیس منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر پہنچنا تھا اور لفٹ بند تھی۔ کام چونکہ میرا تھا اسی لیے میں نے کنور صاحب سے کہا "میرا کام ضروری نہیں ہے کہ آپ ساتویں منزل تک چڑھ کر جائیں اور پھر آپ کی عمر بھی تو ۷۴ برس کی ہو چکی ہے۔

میرے اس جملے کو سنتے ہی ان کے بڑھاپے پر شباب آگیا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں انھیں منع کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا کہ میں نے یہ جملہ اس لیے نہیں کہا کہ وہ ۷۴ برس کے ہو گئے ہیں بلکہ اس لیے کہا کہ میں ۵۰ برس کا ہو چکا ہوں۔ مسئلہ میرے ضعف کا ہے ان کے ضعف کا نہیں۔ مگر وہ نہ مانے اور سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے بلکہ اکثر موقعوں پر تو دو دو سیڑھیاں ایک ہی قدم میں پھلانگ ڈالیں۔ میں ان کے پیچھے ہانپتا کانپتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرے روکنے کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا۔ بالآخر اس سفر میں ایک نوبت وہ بھی آئی جب وہ مجھ سے دو منزل آگے ہو گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ تو سنائی دے رہی تھی مگر وہ خود دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں گرتا پڑتا ساتویں

منزل پر پہنچا جہاں میں ایک آدمی سے ملتا تھا۔ میں نے اپنی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کو بڑی مشکل سے یکجا کر کے ان صاحب سے پوچھا کہ کہیں کنور صاحب آ تو نہیں گئے؟

وہ بولے "کنور صاحب تو نہیں آئے۔ البتہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے سیڑھیوں پر ایک سردار جی کی جھلک دیکھی ہے جو بڑی تیزی سے اوپر جا رہے تھے۔

میں نے کہا "وہی تو کنور صاحب تھے جو آپ سے ملنے کے لیے اس عمارت میں آئے ہیں۔

" تو پھر وہ اُوپر کیوں چلے گئے؟" اُن صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا" کچھ نہیں ذرا جوش جوانی میں اوپر تک چلے گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے۔"

کچھ دیر بعد کنور صاحب نیچے آ گئے۔ پتہ چلا کہ میرے چیلنے نے اُنھیں اتنا مشتعل کیا کہ تیرہ منزلوں تک چڑھتے چلے گئے۔ تیرھویں منزل پر اشتعال کچھ کم ہُوا تو اُنھیں احساس ہوا کہ اُنھیں تو ساتویں منزل پر ہی رُکنا تھا۔

مجھ سے کہا "تم کیسے جوان ہو۔ سات منزل تک نہیں چڑھ سکے۔ کیا ابھی سے تم پر بڑھاپا آگیا ہے؟ مجھے دیکھو کہ ۷۴ برس کا ہو چکا ہوں مگر آج بھی یہ حال ہے کہ ساتویں منزل پر کوئی کام ہو تو تیرہ منزل تک چڑھ جاتا ہوں۔"

میں نے اپنی ہار مانتے ہوئے معذرت کی اور اپنی صفائی میں ایک دانا کا قول اُنھیں سنایا کہ " بیس برس کی عمر کا گدھا، ساٹھ برس کے آدمی سے کہیں زیادہ بوڑھا ہوتا ہے" کیونکہ بڑھاپے کا تعلق کسی مخلوق کی عمر سے نہیں اُس کے قویٰ سے ہوتا ہے۔" کنور صاحب اِس قول سے ایسے ہی محظوظ ہوئے جیسے کہ ایک سچے سِکھ کو ہونا چاہیئے۔ یہ واقعہ تین برس پہلے کا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی اُنھیں کسی عمارت کی ساتویں منزل پر جانا ہو اور لِفٹ بند ہو اور کوئی ان کے بڑھاپے کو للکارے تو وہ کم از کم بارھویں منزل تک ضرور چڑھ جائیں گے۔ اور ہم جیسے نچلی منزل پر ہی کھڑے رہ جائیں گے۔

ان کی اس اعلیٰ و اَرفع صحت کا راز نہ جانے کیا ہے۔ سُنا ہے کہ نوجوانی میں بہت کسرت کرتے تھے۔ خالص چیزیں کھاتے تھے۔ ہر قسم کی کُشتیاں لڑتے تھے اور ہر قسم کا شکار کھیلتے تھے۔ میں نے کبھی ان کی صحت کا راز جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جنھیں اگر آپ جان بھی لیں تو اُن سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سُنا ہوگا کہ ایک شخص کی عمر سو برس کی ہوگئی تو کسی نے پوچھا "قبلہ! آپ نے یہ جو طویل عمر پائی ہے اس کا راز کیا ہے؟"

بزرگ بولے "میری طویل عمر کا راز صرف اتنا ہے کہ جب تک میں تیرہ برس کا نہیں ہوگیا تب تک میں نے عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب آپ ہی بتایئے۔ اس طرح کے راز کا آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

اِدھر دس بارہ برس سے کنور صاحب نے اپنی ڈاڑھی کو خضاب سے پاک کیا ہے ورنہ آج بھی ..

خضاب لگانا شروع کردیں تو ہم جیسوں سے نوجوان نظر آنے لگیں البتہ آواز ایسی پُرشباب، پاٹ دار اور رعب و دبدبہ والی پائی ہے کہ لگتا ہے گلے میں خضاب لگا رکھا ہے۔

کنور صاحب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں دیکھا تھا۔ حیدرآباد میں ہم لوگوں نے مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور میں اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری تھا۔ کانفرنس کے تین اجلاس تھے۔ پہلا اجلاس لطیفہ گوئی کا تھا جس کی صدارت کنور صاحب کو کرنی تھی۔ دوسرا اجلاس مزاحیہ مضامین کا تھا جس کی صدارت آنجہانی راجندر سنگھ بیدی کو کرنی تھی۔ اور تیسرا اجلاس مزاحیہ مشاعرہ سے متعلق تھا جس کی صدارت آنجہانی وی شنکر کے ذمہ تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں کنور صاحب کسی بڑے عہدے پر فائز تھے یا نہیں۔ کچھ عہدیدار ایسے ہوتے ہیں جو بڑے عہدے پر فائز نہیں رہتے بلکہ عہدہ ان پر فائز رہتا ہے۔ ہر دم اپنی عہدیداری کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کنور صاحب بھی اسی طرح کے عہدیدار ہوں گے مگر جب حیدرآباد آئے تو یوں لگا جیسے ہم میں سے ہی ایک ہیں۔ مزاح نگاروں کی اس کانفرنس کی کامیابی کی لوگوں نے پہلے ہی سے پیشین گوئی کردی تھی کیونکہ اس میں دو سکھ ادیب حصہ لے رہے تھے بلکہ راجندر سنگھ بیدی نے تو حیدرآباد ایرپورٹ پر اُترتے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا "میاں! مزاح نگاروں کی کانفرنس کی کامیابی کے لیے ایک ہی سردار کافی تھا۔ تم نے دو دو سردار اور وہ بھی بیدی سردار بُلا لیے۔ سونے پر سہاگہ اسی کو کہتے ہیں؟" سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کا یہ سب سے کامیاب اجتماع تھا۔ لطیفہ گوئی کی محفل کی صدارت چونکہ کنور صاحب کر رہے تھے اسی لیے میں نے تمام لطیفہ گو حضرات سے کہہ دیا تھا کہ وہ سرداروں والے لطیفے ہرگز نہ سنائیں۔ اس پر بعض لطیفہ گو حضرات نے محفل لطیفہ گوئی میں شرکت سے معذرت کرلی کہ واہ صاحب یہ کیا بات ہوئی کہ محفل لطیفہ گوئی کی ہو اور اس میں سرداروں کا ذکر نہ ہو — خیر صاحب، لطیفہ گوئی کی محفل ہوئی مگر میرے منع کرنے کے باوجود اس میں سرداروں کے لطیفے خوب سنائے گئے۔ تاہم اس صورتِ حال کے لیے میں ہی ذمہ دار تھا کیونکہ غیر سرداروں کو تو میں نے سرداروں کے لطیفے سنانے سے منع کیا تھا لیکن خود سرداروں سے یہ التجا نہ کی تھی کہ وہ اپنے بارے میں لطیفے سنانے سے گریز کریں۔ مجھے اب تک وہ محفل یاد ہے اور اس کے قہقہے اب تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ کنور صاحب سے میرے مراسم کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ اس دن سے آج تک زندہ دلانِ حیدرآباد کو اُن کی سرپرستی اور شخصی طور پہ مجھے اُن کی شفقت حاصل رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلہ میں، میں دہلی آیا گو میں اس ملازمت کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا لیکن کنور صاحب سے ملا تو وہ اس ملازمت کے بارے میں مجھ سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی لوگوں سے میرے بارے میں سفارش کی۔ کئی لوگوں کو بلا وجہ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ میں ذہین آدمی ہوں، قابل ہوں، اہل بھی ہوں اور نہ جانے کیا کیا ہوں مگر میں نے انٹرویو میں ان کے سارے دعوؤں کی تردید کردی اور حیدرآباد واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے حیدرآباد آئے تو خفا تھے کہ میں نے جان بوجھ کر انٹرویو میں اپنے آپ کو نا اہل ثابت کیا تھا۔ میں اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا کہ کنور صاحب مجھے آپ سے ہی یہ شکایت ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کے بارے میں

اس محکمہ کے ڈائرکٹر جنرل کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتا دیا تھا کہ وہ اپنی کرسی کے لیے مجھے ایک خطرہ سمجھنے لگا۔ یوں بھی ایک محکمہ میں دو قابل لوگوں کی گنجائش کہاں ہوتی ہے اسی لیے واپس چلا آیا۔

کنور صاحب کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے کہ جس پر مہربان ہوتے ہیں اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اسے آپ ان کی شفقت اور محبت نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جسے عزیز رکھتے ہیں اگر وہ نااہل بھی ہے تو اس میں اہلیت ڈھونڈتے ہیں نالائق بھی ہے تو اس میں لیاقت تلاش کرتے ہیں، جاہل ہے تو اس میں علم کی کھوج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنور صاحب کے اطراف مجھ جیسوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو کنور صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سچ مچ مجلسی آدمی ہیں۔ وہ محفل میں ہوں تو کیا مجال کہ کوئی اور جانِ محفل بن جائے۔ ان کی باتیں حاضر جوابی، بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی سے عبارت ہوتی ہیں۔ محفل کی نبض ان کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جس طرح کے لوگ ہوں اور جس طرح کا موقع ہو۔ اس کے مطابق ایسی نپی تلی بات کرتے ہیں کہ سب کو بھا جائے۔ محفل میں دس بارہ آدمی ہوں یا تیس پینتیس ہزار آدمی کنور صاحب سب کا مزاج جانتے ہیں۔

ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ حیدرآباد میں عالمی اقبال سمینار کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ برپا تھا۔ تیس پینتیس ہزار سامعین موجود تھے۔ سامعین نے ایک شاعر کا کلام سننے سے انکار کیا تو بدمزگی سی پیدا ہوگئی۔ نعرے لگنے لگے۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایسے میں کنوینر مشاعرہ نے اچانک اعلان کیا کہ اب جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر آپ کو اپنا کلام سنائیں گے۔ میں نے حیرت سے کنور صاحب کو دیکھا۔ کنور صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ مائیکروفون پر آئے۔ مائیکروفون تک آتے آتے وہ مجمع کے مزاج کو بھانپ چکے تھے۔ مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور ماحول کی مناسبت سے ایک ایسا شعر سنایا کہ جو مجمع نعرے لگا رہا تھا وہ تالیاں بجانے پر مجبور ہوگیا۔ پورے آدھے گھنٹے تک کنور صاحب نے مجمع کو اپنے قابو میں رکھا۔ ایک نوبت وہ بھی آئی کہ یہ کمبل کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن کمبل انھیں نہیں چھوڑتا تھا۔ جب مشاعرہ پوری طرح جم گیا تو پھر اسے کنوینر مشاعرہ کے حوالے کیا کہ میاں اب چلاؤ مشاعرہ اپنے حساب سے۔ میں نے اسے اپنے حساب سے ٹھیک کر دیا ہے۔ کنور صاحب مجمع کی نفسیات کو جتنا جانتے ہیں اتنا شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ اسی لیے وہ بعض اوقات مجمع کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو بلّی اپنے شکار کیے ہوئے چوہے کے ساتھ کرتی ہے۔

کنور صاحب اُردو شاعروں کے عالی جاہ ہیں۔ شاعر اور ادیب انھیں احتراماً "عالی جاہ" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کنور صاحب گھر پر نہ ہوں اور کوئی انھیں فون کرلے اور ایسے میں مسز کنور مہندر سنگھ بیدی فون کا رسیور اٹھائیں تو وہ کہتی ہیں "میں مسز عالی جاہ بول رہی ہوں" اپنے شاعر دوستوں کو وہ خوب نوازتے بھی ہیں۔ اُردو شاعروں کے مسائل اگرچہ بہت بڑے نہیں ہوتے لیکن ان کا حل تلاش کرنا ضرور دشوار ہوتا ہے۔ کنور صاحب ان کے مسائل نہ صرف حل کرتے ہیں بلکہ انھیں پیدا بھی کرتے ہیں۔ (مراد مسائل سے ہے) بھانت بھانت کے شاعر اُن کے اطراف جمع رہتے ہیں جس پہ یہ مہربان ہوجائیں اُسے ہندوستان کے کونے کونے میں گھما دیتے ہیں بلکہ بیس بائیس برس پہلے وہ اردو شاعروں کی ایک ٹیم کو لے کر برطانیہ گئے تھے۔ اس ٹیم میں انھوں نے اکثریت ایسے شاعروں

کی شامل رکھی تھی جو برطانیہ کی قومی زبان انگریزی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ برطانیہ نے ان شاعروں کو اور ان کے کلام کو خوب سمجھا اور لطف اندوز ہوئے۔ ان شاعروں کے لیے بھی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ پیلی بھیت یا پانی پت کے مشاعروں سے اچانک لندن کے مشاعرہ میں کلام سنانا گویا سات سمندر پار سے نکل کر سوئے دار چلے جانے کے مترادف تھا۔ اس کا فائدہ اردو زبان و ادب کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے شاعر یورپ کی ترقی اور چکاچوند سے اتنے مبہوت ہوئے کہ وطن واپس آکر ایک لمبے عرصہ تک کوئی شعر نہ کہہ سکے۔

کنور صاحب کے اطراف نہ صرف شاعر اور ادیب جمع رہتے ہیں بلکہ پہلوان اور فنِ پہلوانی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی جمع رہتے ہیں، اسی لیے میں ان کی محفل میں بہت محتاط رہتا ہوں کیوں کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطلع عرض کرے گا یا گھونسہ رسید کرے گا۔ کسی اچھی بات پہ مصافحہ کرے گا یا پنجہ لڑائے گا گویا کنور صاحب کی ذات ایک ایسا گھاٹ ہے جس پہ پہلوان اور شاعر دونوں ہی ایک ساتھ پانی پینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ پیتے ہیں۔

میں نے راتوں کی محفلوں میں بھی کنور صاحب کو دیکھا ہے۔ وہی سلیقہ، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی آن بان۔ کیا مجال ہے کہ شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹے۔ کوئی شاعر یا ادیب بہک جائے تو اُسے ٹوکنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس ادیب یا شاعر کی ویڈیو فلم ریکارڈنگ شروع ہو جاتی ہے جو دوسرے دن اسے بلا ٹکٹ دکھا دی جاتی ہے۔ وہ راہِ راست پر آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ معاملہ اگلی فلم پہ چھوڑ دیا جاتا ہے ایک محفل میں ایک ادیب نے اپنے ہوش کچھ اس طرح گنوائے کہ خود کنور صاحب سے لڑنے لگا۔ اس کے جی میں جو آیا وہ بکتا گیا مگر کنور صاحب خاموش رہے۔ کنور صاحب کے پہلوان دوستوں کو طیش آگیا۔ وہ اس ادیب کو سبق سکھانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب بڑی خاموشی کے ساتھ اس ادیب کو الگ لے گئے اور اپنی گاڑی میں لے بٹھا کر بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اسے گھر چھوڑ آئے۔ ایسی حرکت وہی آدمی کرسکتا ہے جو یا تو بہت کمزور ہو یا پھر ایک باظرف سکھ ہو۔

کنور صاحب کو میں نے کبھی غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا سوائے ایک دفعہ کے اور اتفاق سے ان کا یہ غصہ مجھ ہی سے متعلق تھا۔ ۱۹۸۵ء کی عالمی مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے کنور صاحب کو حیدرآباد آنا تھا۔ انھوں نے اپنی آمد کی تاریخ اور وقت سے مجھے مطلع کر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں انہیں لینے حیدرآباد ایرپورٹ پر آجاؤں۔ میں کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلہ میں بہت پہلے حیدرآباد چلا گیا تھا۔ بارہ ممالک کے مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے۔ کانفرنس کے کام اتنے پھیلے ہوئے تھے کہ ہم لوگوں نے کاموں کی تقسیم کر دی تھی۔ ایک کمیٹی صرف مہمانوں کے استقبال اور دیکھ بھال کے لیے بنائی گئی تھی۔ میں نے اس کمیٹی کے کنوینر کو بلا کر تاکید کر دی تھی کہ وہ فلاں تاریخ کو فلاں فلائٹ پر کنور صاحب کے استقبال کے لیے چلا جائے۔ جس دن وہ آرہے تھے اُس دن صبح بھی میں نے کنوینر کو کنور صاحب کی آمد کے بارے میں یاد دہانی کرا دی تھی۔ میں مطمئن ہو کر دوسرے کاموں میں جٹ گیا۔ دن میں تین بجے کے قریب اخبار "سیاست" کے دفتر سے میرے لیے فون آیا کہ کنور صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے کنور صاحب کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ بولے "میاں! میں اسی وقت دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کانفرنس میں شرکت نہیں کروں گا۔ میں نے تم سے خاص طور

کہا تھا کہ ایئرپورٹ پر آجانا مگر مجھے لینے کیلئے ایرپورٹ پر کوئی نہیں آیا۔ بڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا اور "سیاست" کے دفتر پر چھوڑ گئے۔ اب میں فوراً دہلی واپس جانا چاہتا ہوں۔"
کنور صاحب کی یہ بات سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سخت کوفت اور ندامت ہوئی۔ میں نے بہت معذرت کی، ساری صورتِ حال سے انھیں آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری ہر وضاحت کے جواب میں دہلی واپس جانے پر مصر نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اس وقت میرا ان کے پاس جانا مناسب نہیں ہوگا لہٰذا میں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے سارے اچھے مزاحیہ فن کاروں کو موٹروں میں بھر کر ان کے پاس روانہ کیا اور تاکید کی کہ پہلے تو اپنے لطیفوں اور اپنی پُرمزاح حرکتوں کے ذریعہ ان کا موڈ ٹھیک کریں اور انھیں ایک دیو گیسٹ ہاؤز لے جائیں جہاں ان کے قیام کا انتظام تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ دیو ایسا ہے جس پر لطیفوں اور مزاح کے ذریعہ ہی قابو پایا جاسکتا ہے۔ میں دو گھنٹے بعد لیک ویو گیسٹ ہاؤز پہنچا تو کنور صاحب کے کمرہ سے زوردار قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو وہ قہقہہ لگانے کے لیے اپنا منہ کھول چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے قہقہہ بار منہ کو مصنوعی طور پر بند کرنے کی کوشش کی مگر قہقہہ ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ قہقہہ ختم ہوا تو انھوں نے پھر اپنے چہرے پر سنجیدگی کو طاری کرنے کی کوشش کی۔ میں انتظار میں خاموش بیٹھا رہا کہ یہ اپنی خفگی مجھ پر ظاہر کردیں۔ خود ہی بولے "یہ تم نے یتیموں کی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟" میں نے کہا "آج آپ دہلی واپس ہونا چاہتے ہیں مگر آج کی فلائٹ میں کوئی نشست آپ کے لیے نہیں مل رہی ہے۔" بولے "میاں! میں تمہیں تمہاری ذمہ داری سے واقف کرانا چاہتا تھا۔ میں جب اپنے سے چھوٹوں میں غیر ذمہ داری کو پاتا ہوں تو بھڑک اٹھتا ہوں۔ میں تم سے بہت ناراض تھا مگر تمہارے ساتھیوں نے اب میرا موڈ بدل دیا ہے جاؤ تمہیں معاف کیا۔ مگر آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا۔" اُس دن پتہ چلا کہ ان کا غصّہ جھاگ کی طرح ہے کہ ادھر اُبل پڑا اور ادھر دیکھتے دیکھتے دب گیا۔

واضح رہے کہ کنور صاحب مشاعروں اور ادبی جلسوں میں جانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ صرف کرایہ آمد و رفت لیتے ہیں بلکہ دوسرے شہر میں قیام و طعام کے اخراجات بھی اکثر صورتوں میں خود ہی برداشت کرتے ہیں۔ کنور صاحب کی کتاب "یادوں کا جشن" کے مطالعہ سے میری معلومات میں نہ صرف ایک خوشگوار اضافہ ہوا ہے بلکہ یک گونہ اطمینان بھی حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بھوپال کے ایک ہفتہ وار ایڈیٹر کا ذکر کیا ہے جس نے انھیں ایک مشاعرہ میں بھوپال بلایا تھا۔ مشاعرہ کے بعد یہ ایڈیٹر غائب ہوگیا اور کنور صاحب کو آمد و رفت کا کرایہ نہیں ادا کیا۔ کنور صاحب نے ایک باظرف آدمی کی طرح اس رسالہ کا یا اس کے ایڈیٹر کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اگر وہ یہ کتاب پڑھے تو ان کے اخراجات آمد و رفت ادا کرے۔

اس واقعے کو پڑھ کر مجھے بھی بھوپال کے ایک ہفتہ وار ایڈیٹر کی یاد آگئی جس نے مجھے اور فکر تونسوی کو طنز و مزاح کے ایک جلسہ میں بلایا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم دونوں کو آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا کرے گا اور اگر جلسہ کامیاب رہا تو دو سو روپیہ فی کس معاوضہ بھی ادا کرے گا۔ میں اور فکر تونسوی فرسٹ کلاس سے بھوپال گئے۔ اس نے پہلے تو ہمیں دہلی سے بھوپال جانے کا سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا۔ پھر کہا کہ وہ جلسہ

کے بعد واپسی کا کرایہ اور باقی رقم ادا کر دے گا۔ جلسہ بے حد کامیاب رہا۔ لیکن جلسہ کے فوراً بعد وہ ایڈیٹر ایسا غائب ہوا کہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس کی تلاش میں، میں نے اور فکر تونسوی نے تقریباً سارا بھوپال دیکھ لیا مگر وہ نہیں ملا۔ بالآخر ہم دونوں ادب کی بے لوث خدمت انجام دینے کے بعد دہلی واپس آ گئے۔ فکر تونسوی نے اس ایڈیٹر کے خلاف ایک عدد کالم' اور میں نے ایک عدد مضمون لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جس ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر نے کنور صاحب کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا وہ وہی تھا جس نے ہمیں بھی اُردو کی بے لوث خدمت انجام دینے پر مجبور کیا تھا۔ میں چاہوں تو اس ایڈیٹر کا نام ظاہر کر سکتا ہوں لیکن جب کنور صاحب نے خود ہی اسے پوشیدہ رکھنا چاہا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اُس کا نام ظاہر کرنے والا۔

سنا ہے کہ کنور صاحب شکار کے بھی شوقین رہے ہیں۔ مجھے کبھی ان کے ساتھ شکار پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ ان کی ایک تصویر ضرور دیکھی ہے جس میں وہ اپنے مارے ہوئے ایک شیر کی نعش پر اپنا سیدھا پاؤں اور بندوق رکھے کھڑے ہیں۔ اس تصویر کی سب سے اہم خصوصیت مجھے یہ نظر آئی کہ اس میں کنور صاحب دیگر شکاریوں کی طرح اپنی فتح پر مسکراتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ شیر کے ہونٹوں پر میں نے ضرور ایک عجیب سی مسکراہٹ دیکھی ہے جیسے وہ کنور صاحب کے ہاتھوں اپنے ہلاک ہونے پر نازاں، فرحاں اور شاداں ہو۔

کنور صاحب جیسی ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں۔ ان کی شخصیت جن تہذیبی قدروں اور عوامل سے مل کر بنی ہے وہ قدریں اب معدوم اور ایسی شخصیتیں بھی اب نایاب ہوتی جاری ہیں۔ ہماری یہ خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسی شخصیتوں کو دیکھا۔ وہ رواداری، انسان دوستی، محبت، یگانگت اور خلوص کا ایک انوکھا پیکر ہیں۔ جسے عزیز رکھیں اس کے لیے کچھ بھی کر گزریں۔ ۱۹۸۴ء میں جب مجھے طنز و مزاح کا ساگر سوری غالب ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اس انعام کے لیے میرے انتخاب کی غلطی کس سے سرزد ہوئی ہے۔ جب معلوم ہوا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی اس انعامی کمیٹی کے رکن ہیں تو غلطی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھ سے سینیئر مزاح نگار کئی اور بھی ہیں۔ مانا کہ آپ مجھے عزیز رکھتے ہیں لیکن اردو ادب تو مجھے اتنا عزیز نہیں رکھتا۔ مگر وہ نہ مانے اور مجھے انعام دلوا کر ہی دم لیا۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں مسز اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب دہلی میں فسادات پھوٹ پڑے تو ہم سب پریشان ہو گئے۔ کنور صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جب ان کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی دوست کے گھر منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کے دوست نارنگ ساقی صاحب نے بتایا کہ ان کے بیٹے کی کوٹھی جلا دی گئی ہے اور ان کا کافی نقصان ہوا ہے۔ جب حالات ذرا سنبھلے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ چہرے پر وہی شگفتگی، بشاشت اور تازگی نظر آئی۔ انھوں نے فسادات کا ذکر تک نہ کیا جب میں نے ہی اپنے طور پر فسادات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا تو بڑی متانت اور خاموشی کے ساتھ بولے۔

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"

اب بھلا بتائیے اس کے بعد میں ان سے اس موضوع پر کیا بات کر سکتا تھا ان کا یہ جملہ مجھے آج بھی ان

کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اگرچہ کنور صاحب کی مادری زبان پنجابی ہے لیکن اُردو سے انھیں جو والہانہ عشق ہے ویسا عشق مجھے کسی اردو والے کے ہاں نظر نہیں آیا۔ وہ سراسر اردو تہذیب کی زندگی جیتے ہیں۔ اردو سے متعلق دہلی کی کوئی ادبی سرگرمی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے کنور مہندر سنگھ بیدی کی سرپرستی حاصل نہ ہو۔

ان کی کتاب "یادوں کا جشن" ایک ایسی شخصیت کی یادوں کا مجموعہ ہے جس نے اس برصغیر کی تاریخ کے ایک کربناک اور نازک دور سے گزرنے کے باوجود انسان دوستی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا جس کے پائے استقامت کو کسی بھی آزمائش میں لڑکھڑاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک اعتبار سے یہ کتاب برصغیر کی تاریخ کو صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویۂ نگاہ عطا کرتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے آدرش کی حیثیت رکھتی ہے۔

کنور صاحب اپنی مصروف سماجی زندگی میں سے شام کے دھندلکے میں کچھ وقت ضرور نکال لیتے ہیں جب وہ چیمسفورڈ کلب کے لان پر اکیلے چہل قدمی کرتے ہوئے گوربانی کا پاٹھ کرتے ہیں۔ دوست بھی موجود ہوں تو اجازت لے کر پاٹھ کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اکثر انہیں تنہائی میں اس طرح کی عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ اپنے سر کو جھکائے چپ چاپ چلتے رہتے ہیں جیسے انھیں اس دنیا سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ ایسے وقت وہ مجلسی آدمی بالکل نہیں دکھائی دیتے۔ انھیں دیکھ کر میرا جی بھی خدا سے دُعا کرنے کو چاہتا ہے کہ کنور صاحب برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنی باتوں سے ہمیں جینے کا نیا حوصلہ عطا کرتے رہیں اس وقت مجھے ایک بچہ کی یاد آگئی جسے رات میں سونے سے پہلے ماں نے کئی دعائیں مانگنے کی تاکید کی۔ آخر میں ماں نے بچہ سے کہا "بیٹا اب ذرا اپنے نانا جان کی درازئ عمر کے لیے بھی دُعا مانگو کہ وہ کئی برس تک اس دنیا میں زندہ رہیں۔" اس پر بچہ نے کہا "نہیں ماں! یہ دُعا بیکار ہے۔ نانا جان اب ویسے بھی اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اس بڑھاپے کے ساتھ ان کا مزید کچھ برس تک زندہ رہنا مناسب نہیں ہے۔ برخلاف اس کے میں خدا سے دُعا کرنا چاہوں گا کہ وہ انھیں پھر سے نوجوان بنا دے۔"

کنور صاحب کے تعلق سے میری دُعا کی نوعیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ خدا کے فضل سے ۸۰ سال کی اس گردش کے باوجود ان میں آج بھی نوجوانوں کی سی توانائی اور حوصلہ ہے اور اسی توانائی اور حوصلہ کا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہے۔ میری دُعا ہے کہ ان کی یہ توانائی اور جولانی ہماری آخری سانس تک قائم و دائم رہے۔ (آمین ثم آمین)

▲▲

مضمون نگار حضرات سے التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کی ایک ہی جانب لکھ بھیجیں۔

ہمارے شہر میں

طالب خوندمیری

ایک بے معنی سیاست ہے ہمارے شہر میں
ایک بے مصرف قیادت ہے ہمارے شہر میں
یہ ہوس، یہ راج ہٹ، یہ شعبدوں کا سلسلہ
جن کے چہروں کی بدولت ہے ہمارے شہر میں
آج کل ان کی حکومت ہے ہمارے شہر میں
بس انھیں کی قدر و قیمت ہے ہمارے شہر میں

شہر کی تزئین میں شامل صنم کاری بھی ہے
جذبۂ خدمت کی سو فیصد اداکاری بھی ہے
اُٹھیاں ہونے لگی ہیں پھر تعصب کی یہاں
پاؤں شاید زوجۂ ابلیس کا بھاری بھی ہے
پھر کسی شر کی ولادت ہے ہمارے شہر میں
آمد آمد قیامت ہے ہمارے شہر میں

یہ زمیں ہے ابتداء سے مرکزِ علم و ہنر
ہے یہاں کے شہریوں پر سب زبانوں کا اثر
باہمی اخلاص کی تہذیب پلتی ہے یہاں
بیسیوں کلچر دکن میں سانس لیتے ہیں مگر
ایک ہی کلچر کی شہرت ہے ہمارے شہر میں
آئینے! تیری ضرورت ہے ہمارے شہر میں

اک طرف مایوسیاں، محرومیاں، مجبوریاں
اِک طرف جمہوریت کی آڑ میں ہٹ دھرمیاں
رہزنی، ہڑتال، ہنگامے، فساد و قتل و خوں
زندگی کی اِتنی ساری تلخیوں کے درمیاں
شاعروں کا دم غنیمت ہے ہمارے شہر میں
محفلِ طنز و ظرافت ہے ہمارے شہر میں

تنگ سڑکوں پر ہیں رکشے، کار، سیکل بھی بہت
آدمی کے ساتھ ہیں چوپائے پیدل بھی بہت
اس قدر دھوکا ہمیں دینے لگے ہیں فاصلے
جس مسافت کیلئے ہوتے ہیں دو پل بھی بہت

وہ بھی گھنٹوں کی مسافت ہے ہمارے شہر میں
آدمی کو کتنی فرصت ہے ہمارے شہر میں

کس قدر محفوظ ہیں دیکھو ہماری بستیاں
ہر محلّے میں ہیں سوّر اور کتے پاسباں
کوڑا کرکٹ پیش کرتا ہے صفائی کا ثبوت
جس پہ پلتے ہیں معزز مچھروں کے خانداں

مستقل ان کی سکونت ہے ہمارے شہر میں
تندرستی کی ضمانت ہے ہمارے شہر میں

جنگِ آزادی میں سب سے تیز تھا جسکا قلم
رفتہ رفتہ ہوگیا ہے ختم اُس کا بھی بھرم
ہر جگہ اپنے وطن میں ہے جو ٹھکرائی ہوئی
شکر ہے کہ آج بھی ایسی زباں میں کم سے کم

بات کرنے کی اجازت ہے ہمارے شہر میں
کس قدر ہم پر عنایت ہے ہمارے شہر میں

اک نئی تاریخ تھوپی جارہی ہے بار بار !
من گھڑت قصّے بھی داغے جارہے ہیں بیشمار
عصرِ نو کے مُنہ پہ کالک پوت کر کچھ ناسمجھ
کر رہے ہیں اپنے مستقبل پہ ماضی کو سوار

آمدِ فصلِ قدامت ہے ہمارے شہر میں
کیا کوئی تازہ شرارت ہے ہمارے شہر میں

اس کی مٹی میں بسی پنجاب کی خوشبو بھی ہے
مستیاں گجرات کی، بنگال کا جادو بھی ہے
یاد ارباب حکومت کو دلانا ہے مجھے!
ساتھ تلگو کے یہاں، ہندی بھی ہے اردو بھی ہے

مختصر یہ روحِ بھارت ہے ہمارے شہر میں
اِک یہی زندہ حقیقت ہے ہمارے شہر میں

احمد جمال پاشا
(سیوان، بہار)

(نثری سہرا)

باندھ کر صحرا سے آیا ہے مجنوں سہرا

بہ ہنگام شادی
شہر آبادی نوشۂ مجنوں
مناظر عاشق، عاشق خان پوری
خان پور ضلع سارن (بہار) ہندوستان
بروز جمعہ بتاریخ یکم جنوری ۱۹۸۶ء
مطابق ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ بروز بدھ
نوشتہ : حضرت احمد جمال پاشا
حسب فرمائش : دیگر احباب نوشہ

یہ حضرتِ نوشہ جو اس وقت سہرے
میں ڈول رہے ہیں، ان کے ہاتھ پیر
دیکھ کر کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا کہ
یہ حضرت ماڈرن مجنوں بھی ہو سکتے ہیں۔
اور ان کا سلسلۂ نسب آدم و حوّا کے بعد
براہِ راست سوہنی مہینوال سے ملتا ہے۔
یہ ہماری آپ کی خوش قسمتی ہے
کہ جہاں لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا

وامق عذرا اور
مرزا صاحبان وغیرہ کی نہ
ہو سکنے والی شادیوں میں شرکت
کی سعادت نہ حاصل ہو سکی، اس تاریخی
شادی میں شرکت کا فخر بیٹھے بٹھائے
حاصل ہو گیا ——— ہمارا پہلوان نما نوشاہ
جو اس مبارک گھڑی سہرا سَن کر سہرے
کی لڑیوں میں سے غرّا رہا
ہے۔ اب ہمارے بھی نٹ بولٹ
کسنے کی فکر میں ہے مگر شکر ہے کہ
مسکرا بھی رہا ہے۔ اس کی خوشی چھپائے
نہیں چھپتی کہ رُخِ روشن سے زیادہ ان
کی فالتو بتیسی نظر آ رہی ہے۔ اس کا
اُبھار دیکھ کر ڈر ہے کہ کہیں نکل نہ
پڑے۔ سہرا کا کیا ٹھیک کہ کب
لڑھک جائے ـــ

افواہ ہے کہ عاشق
لکھنا پڑھنا چھوڑ کر اس لیے
جنگل میں نکل گئے کہ شادی ہو گی تو
بس یہیں۔ ورنہ شاعری ہو گی۔ گاؤں
والوں کا چشم دید بیان ہے کہ "عاشق جب
بھی جنگل سے بیامن سنبھالے لوٹتا تو دور
ہی سے موٹر سائیکل کا ہارن بجاتا ہوا اس
طرح اپنی ہونے والی سسرال
کے سامنے سے سرپٹ گذر جاتا جیسے
کوئی تالی بجاتے میں بھاگ کھڑا ہو۔ متعدد
بار گاؤں والوں نے اسے مارتے مارتے
چھوڑا" ـــ مزید افواہ ہے کہ "عاشق نے
برسوں ہزار ڈنڈ بیٹھک لگا، بالٹیوں دودھ
اور خون کے آنسو پی پی کر گزار دیئے۔
مگر اِدھر سے ایک نہیں تو ہزار نہیں۔
عاشق نے اپنے دُور کے بزرگوں

تک کو اتنا دوڑایا کہ اُن کی جوتیاں گھس گئیں۔ خود بھی دوڑتا۔ جب بیڑی میں کاربن آجاتا تو پا پیادہ بھی دوڑتا۔"

نوشاہ کے خاص تازہ بہ تازہ عرب پلٹ سالے حکیم پتنگا شمع پوری اور اُن کے ہونہار اُبھرتے ہوئے بھتیجے حضرت کامران بارپوری، جو اُس زمانے میں فقط پتنگا اور کامران ہوا کرتے تھے۔ اِس خوف سے راتوں رات گھربار چھوڑ چھاڑ کر سدھارت کی طرح نکل گئے کہ کہیں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ جائے اور ایک جھیلی کے منڈوے تلے۔ . . . اور اب تک اِن کا شمار آوارگانِ خاک میں ہے۔ مگر ہمارا یہ اکھاڑیہ دولہا اِسی گاؤں میں چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔ اور بقول حضرت اشرافِ منشی فاضل "دولہا کاروبارِ عشق میں مصروف رہا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اِس دوران اس لیے کاروبار زیادہ کیا یا عشق یا محض زبانی آہ وزاری۔ . ."

ابتداءً ہم ناواقفِ اسرارِ عشق تھے۔ اور نوشہ کو محض ایک بے مزہ ہنس مکھ ٹیکنیکل لڑکا گردانتے۔ جو کبھی کبھار منہ بھی دھولیتا، دانت تو نہیں مانجھتا مگر حجامت بنوالیتا۔ اکثر بالوں میں کنگھی تک کرلیتا۔

جب ہم سعادت دارین حاصل کرنے کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ تو خلافِ معمول نوشاہ نے تن تنہا درِ دولت پر حاضری دی اور عرض کیا کہ وہ ہم سے تنہائی میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے نوعیت جاننا چاہی تو دُعائے شادی کی جانب کچھ مبہم سا اِشارہ کردیا۔ ہم سمجھے کہ لوگ اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے دُعا کرنے پر بہت زور دے گئے ہیں۔ یہ صاحبزادے بھی اپنی کسی عزیزہ کی دُعا کے لیے التماس کریں گے۔ تخلیے میں اُنہوں نے لپک کر ہمارے پاؤں پکڑ لیے اور اس طرح رو رو کر لپٹ گئے گویا کسی بلڈیر کو دلبوچے ہوئے ہوں۔ جب ہم نے سر تھپتھپا کر بڑی مشکل سے انہیں تسلی دی تو اِن کی ہچکی اور پھر گھگھی بندھ گئی۔ جب کافی حد تک اس میرے بچے کی نکل گئی تو وہ یوں گویا ہوا۔

"حضور! خانۂ خدا میں غلافِ کعبہ پکڑ کر دعا فرمادیں کہ اس گناہ گار کی شادی فلاں بنتِ فلاں سے ضرور ہوجائے۔ اور حضور میرے والدین کے ساتھ ساتھ، میرے ہونے والے سالے سالیوں کے دلوں میں میری جانب سے خداوندتعالیٰ بہت نرمی پیدا کردے۔ حضور! میرے گھر والوں میں سے کوئی اس ہونے والے رشتے کی مخالفت نہ کرے۔ ورنہ میں اصلی زہر کھالوں گا۔ حضور! لڑکی والوں میں سے کوئی میری شادی کی مخالفت نہ کرے ورنہ میں دریا میں چھلانگ لگادوں گا۔ اور حضور! گاؤں والے اس رشتے کی مخالفت نہ کریں۔ نہ حضور مذاق اُڑائیں، ورنہ میں ویرانے میں چچا مجنوں کے پاس واپس چلا جاؤں گا۔ بس حضور جا کر سب ضروری باتوں کے لیے دُعا کردیں!"

میں نے عاشق کو تسلی دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"میاں کہاں شادی کرنا چاہتے ہو۔؟"

"جناب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ یہ تو گاؤں کا دودھ پیتا بچہ بھی بتادے گا۔ آپ پتنگا وغیرہ کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا۔ وہ بتادیں گے۔"

"پھر بھی ۔۔؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو ۔۔۔"

شرماتے ہوئے بولے۔

"وہی جن کا میں نے ابھی ابھی نام لیا ہے۔"

"بھئی! حکیم صاحب لاکھ شاعر سہی مگر وہ تو بہت ہی پڑھے لکھے اور انتہائی شریف لوگ ہیں اور غالباً آپ انگوٹھا چھاپ . . . ؟" عاشق کی پھر گھگھی بندھ گئی اور وہ یوں گویا ہوئے۔

"سسر! اصلیت کا مذاق نہ اڑائیے! یہ تو سدا سے ہوتا آیا ہے۔ جب شریف لوگ دوڑ کر کمینوں کے یہاں شادی کر دیتے ہیں۔ بڑی ذات والے بذاتوں کا گھر گھیر لیتے ہیں۔ دلی کے گھر میں شیطان کا رشتہ ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہے تو میں شادی کے بعد اسکول میں نام لکھا لوں گا ــــ!"

چنانچہ ہم نے وعدہ کر لیا کہ "جہاں آتی زنانیوں کے لیے دعائے شادی کرتا ہے۔ وہاں ایک مردانہ کے لیے بھی"۔ صاحب جب ہم حج بیت اللہ سے بخیر واپس لوٹے تو دنگ رہ گئے۔ ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے عاشق موجود تھے۔ ہم اِن کی اس سعادت مندی سے بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے ہمارا سامان ٹیکسی پہ رکھتے ہوئے پنا کان ہمارے منہ میں داخل کرتے ہوئے نہایت آرزو مندی سے پوچھا۔

"سسر! میری شادی کے لیے آپ نے دعا کر دی تھی نا ــــ؟"

ہم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا ــــ

"میاں تمہارے لیے جو دعا کی تھی وہ انشاء اللہ قبول بھی ہو گئی ہوگی ــــ

اب جاؤ تم شادی کی تیاری کرو۔"

عاشق مارے خوشی کے چھلانگیں لگاتے ہوئے فوراً غائب ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم سے پہلے وہ نہ صرف چھپرہ پہنچ گئے بلکہ گاؤں میں لڑکی والوں کا گھیراؤ بھی شروع کر دیا۔

ایک دن یہ مٹھائی کی ٹوکری لے کر پہنچے۔ ہم نے پوچھا ــــ

"خیر باشد ــ؟"

بولے ــــ

"آپ کی دعا جو قبول ہو گئی تھی اُس کی یہ پہلی قسط ہے ــ"

"یعنی ــ؟"

"یعنی کے معنی۔ دعا تو قبول ہو ہی چکی تھی۔ بس میں عمرے پر گیا۔ صاحب بڑی بڑی مخالفتیں ہوئیں۔ کئی بار تو بھول تک جھاڑنی پڑی۔ آخر خدا خدا کر کے منگنی ہو گئی۔ میں نے بھی اعلان کر دیا ہے۔ کہ مجھے صرف لڑکی چاہیئے ہے لڑکی۔! جہیز تک نہ منشی اثرات کی طرح فرمائشوں کی فہرست۔ نہ کامران کی طرح یہ شرط کہ پہلے متعدد ایم اے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کرلوں پھر پروفیسر ہو جاؤں تو ہاتھ پیلے کر دوں ــ"

عاشق بہت جوش میں تھے۔ اور بولے چلے جا رہے تھے۔ "میں دولہا بننے کے لیے "حلیا" تک بننے پر تیار ہوں صاحب خطِ غلامی لکھوا لیجئے۔ زندگی بھر سسرال کی جوتیاں سیدھی کروں گا۔ خدمت پر خدمت کروں گا۔ نقد اُدھار تک ے دیا کروں گا۔ کبھی واپس نہ مانگوں گا۔ آخر کبھی میں نے کامران سے تقاضہ کیا۔ ۔ ۔ ؟"

غرض وہ مارے خوشی کے آپے بلکہ جامے سے باہر تھے۔ میاں اثرات، جناب صاحب اور ایک کے ساتھ رفوچکر ہو گئے۔

عرصے بعد ایک سہانی صبح کو نوشاہ مسکراتے ہوئے اس شان سے داخل ہوئے کہ آگے آگے وہ اکڑ کر پہلوان کی طرح جھومتے جھامتے چلے آ رہے تھے۔ پیچھے پیچھے مزدور کے سر پر مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ جس میں ہمارا جوڑا اور قیمتی تحائف تھے۔ آتے ہی یوں گویا ہوئے:

" سر! آپ کی دعا تو قبول ہو ہی چکی تھی۔ طرفین میں زبردست جنگ مغلوبہ ہوئی۔ میں نے تو سورس سفارش میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے گاؤں کے سرپنچ اور مکھیا تک کو محاذِ جنگ میں جھونک دیا۔ نوبت یہ انیجا رسید کہ اِدھر قاضی نکاح پڑھا رہا تھا۔ اُدھر میرے اور اُن کے سرپرستوں میں فوجداری ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ تو قاضی تک بچک کر کھڑا ہو گیا۔ مگر میں نے پاؤں پکڑ لیے کہ " جلدی سے پڑھا دیجئے "

اور میرا نکاح ہو گیا۔!!!" اِن کا نکاح پر اس قدر زور تھا گویا ہاکی ورلڈ کپ میں انڈیا کو گولڈ میڈل مِل گیا ہو۔

نوشاہ پرسوں اپنے احباب کے ساتھ نازل ہوئے اور فرمائش کی — "سر میرا سہرا لکھ دیجئے۔ پرسوں میری رخصتی ہے۔ آپ کو ضرور شرکت کرنی ہے۔ سہرے میں یہ ضرور لکھ دیجئے گا کہ یہ تاریخی شادی تین قسطوں میں کیسے کیسے، آخرکار ہو ہی گئی۔ مگر فان پور بلٹ پروف پہن کر آیئے گا۔ رُخصتی کے وقت فائنل جھگڑا ہوگا۔ دو چار لاٹھی پڑ بھی جائے تو میری خاطر سہہ لیجئے گا۔ کیوں کہ آپ ہی کے طفیل یہ بیل منڈھے چڑھی۔ نہ آپ دُعا کرتے۔ نہ قبول ہوتی۔ اسی لیے خاص طور پر آپ کے واسطے مُرغ مُسلّم کا بھی اہتمام ہے۔"

تو صاحبان اب ہم اِس عاشق صادق کو اِس دُعائے رُخصتی کے ساتھ اس کے گھر سے رُخصت کرتے ہیں کہ اللہ کرے، میرے حبیب کے صدقے میں نوشہ سُسرال میں پھلے، پھولے اور پھیلے۔ خداوند تعالیٰ نے جیسا خوش مزاج، محنتی، محبتی، حجتی، مخلص، پہلوان، کاروباری اور کامیاب داماد اِس گھر کو عطا کیا ہے۔ سب کو ایسا ہی دے اور اس کے ساتھ سب کو خوش رکھے۔ سب بولیں آمین ہ اور میں کہوں ثم آمین ہ

■■

چندہ آسام و نیلگری
کے باغات سے راست منگوائی ہوئی
چائے
اسٹرانگ و خوش ذائقہ
آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد :-
یاقوت محل ٹاکیز

یاقوت پورہ حیدرآباد

فون :
۵۲۵۴۴۴
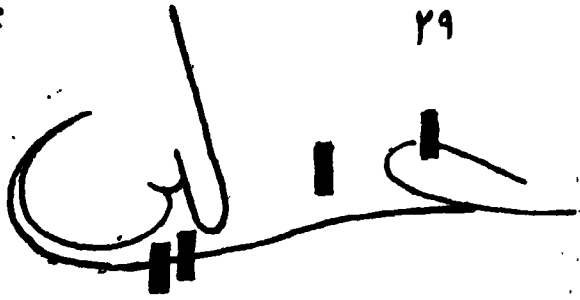
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
(نئی دہلی)

جب تک ہیں شیخ و شباب خدا خیر کیا کرے
نازل ہے اک عذاب خدا خیر کیا کرے

ہے ضعف سیٹھ جی کے ہر اک عضو پر سوار
بیوی ہے پُر شباب خدا خیر کیا کرے

دربان جن کو دور سے پھٹکارتا رہا
اب وہ ہیں باریاب خدا خیر کیا کرے

اسّی برس کی عمر میں اب شیخ محترم
کرنے لگے خضاب خدا خیر کیا کرے

بیٹی سے کیا اُمید کہ پردہ کرے گی وہ
اماں ہے بے نقاب خدا خیر کیا کرے

بیوی کبھی بھی حشر کی قائل نہ تھی نہ ہے
مانگے ہے اب حساب خدا خیر کیا کرے

اتنی سی بھی تمیز جو باقی نہ ہو سحر
ہڈی ہے یا کباب خدا خیر کیا کرے

○

مفلس فاروقی (بارکس ٹیکلی)

عاشقی میں کون اب پرفیکٹ ہے
پیار تو بس ایک بزنس ٹیکٹ ہے

باقی سب ہے آپشنل اپنے لیے
عشق اک کمپلسری سبجیکٹ ہے

ہم جو کہتے ہیں غلط ہے، رانگ ہے
آپ جو کہہ دیں رئیل ہے فیکٹ ہے

شیخ کرتے ہیں پریئر بھی اٹنڈ
اور ساقی سے بھی ان کا پیکٹ ہے

ایک ٹریجڈی ڈرامہ ہے حیات
اور ٹیئر فل جس کا ہر اک ایکٹ ہے

وصل کی جب ہم نے کی اس سے ڈیمانڈ
کر گیا وہ ٹوٹلی ریجیکٹ ہے

اے سویٹ ہارٹ کیا تجھے پریزنٹ دوں
جو بھی میرے پاس ہے نگلیکٹ ہے

رکھا ہے ہم کو سیاست نے بزی
آج ہے گھیراؤ کل پروٹیکٹ ہے

میں پھول کیوں مسند پہ تو کیوں ٹاٹ پر
یہ تو ڈیئر اپنا اپنا ٹیکٹ ہے

گھول دیں ہر شہر میں یو رین بار
اپنے کنسیڈر میں اک پروجیکٹ ہے

پرسنل لائف ہم اپنی کیا کہیں
ایک اک پل جس کا نو آبجیکٹ ہے

ڈاکٹر راہی قریشی

ذوقِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ

کھول آنکھ، یہ گھر دیکھ اور اس گھر کی فضا دیکھ
ہر کمرے میں اولاد کا اک سلسلہ سا دیکھ
پھر بیگم بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
اور ان کی محبت کا ثمر دیکھ عطا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

کیوں ہیں ترے حصے میں پڑوسی کی بلائیں
ہنگاموں سے معمور ہیں کیوں ساری فضائیں
کر خفیہ ملاقات کے بارے میں دعائیں
رکھ پیشِ نظر ویسے پڑوسن کی ادائیں
آئینے میں لیکن ابھی بیگم کی ادا دیکھ

سمجھے گا محلہ ترے پوشیدہ اشارے
ہمت یہ مگر کس کی کہ تجھ کو کبھی مارے
محدود نہیں تیری شرارت کے کنارے
بھاگیں گے ترے خوف سے احباب بچارے
لے ہاتھ میں ڈنڈا، اثرِ نعرہ ذرا دیکھ

لوگوں کی ہیں سب قیمتی چیزیں ترے گھر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے "ہنر" میں
جچتی نہیں بس اس لیے تنخواہ نظر میں
دولت تری پنہاں ہے ترے اپنے ہی گھر میں
اس جہدِ مسلسل کی عطا دیکھ، جزا دیکھ

نالندہ ترے بچوں کا ہر تار ازل سے
اور تو کہ پڑوسن کا پرستار ازل سے
گھر ہے ترا وابستۂ اسرار ازل سے
بیگم ترے حق میں ہے دل آزار ازل سے
ہے اس کی رضا میں ہی مگر تیری رضا دیکھ
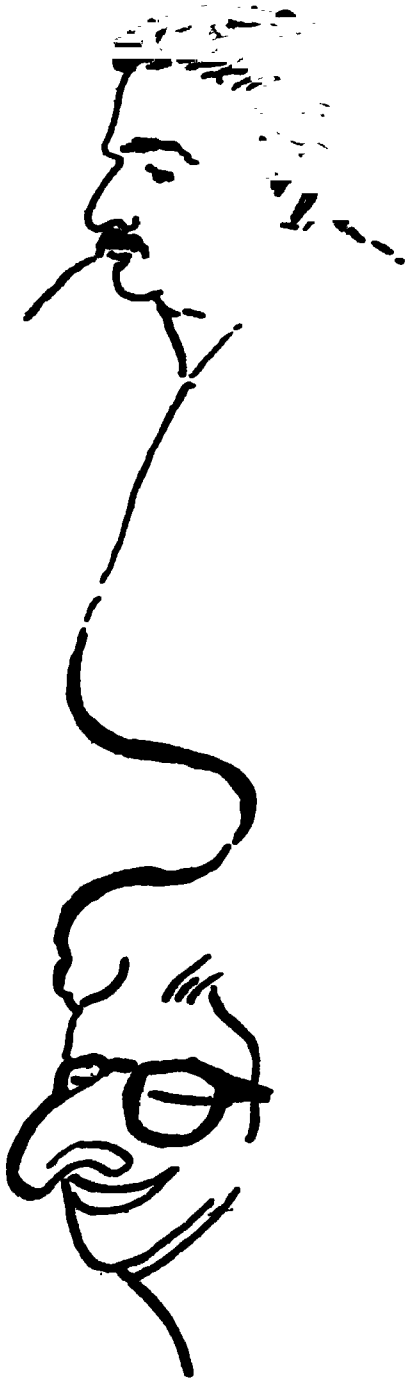
رشید قریشی
(حیدرآباد)

کُبریٰ بیگم کی واپسی

○

[تعارف : کبریٰ بیگم حیدرآباد کے ایک اوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ جب وہ بال سُکھانے کے لیے اپنے گھر کی چھت پر جانے لگیں تو وہیں سے اُنھوں نے اپنی زندگی کا ساتھی چُن لیا۔ شادی طے ہُوئی تو لڑکے والوں نے گھوڑے جوڑے اور جہیز کی بات چھیڑی اور شادی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اس اثناء میں کراچی سے ایک نوجوان آیا، اور گھوڑے جوڑے اور جہیز سے دستبردار ہوکر، کبریٰ بیگم کو اپنی دُلہن بنا کر، کراچی لے گیا۔ کم و بیش ۳۰ برس ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد، وہ بیوہ ہوکر، حیدرآباد لوٹیں۔ اُنھوں نے اپنے مرحوم والد کی قبر پر پھول چڑھائے اور اپنی محبت کے کھنڈر میں بھی ایک چراغ جلانا چاہا —]

کبریٰ بیگم کے ویزے کی مدّت کو ختم ہونے کے لیے صرف تین دن رہ گئے تھے اور وہ چپ چپ اداس اداس رہنے لگی تھیں اُس بیوہ کی طرح جسے سسرال والوں نے نکال دیا اور میکہ والے اُسے پھر سسرال واپس بھیج رہے ہوں۔

میں نے ہمت بندھانے کے خیال سے کہا "کراچی بڑا شہر ہے، وہاں سمندر ہے کلفٹن کا ساحل ہے۔ دل کہیں نہ لگے تو وہیں چلی جایا کرو۔" کبریٰ بیگم نے ایک لمبی آہ بھری "وہ تو ٹھیک ہے لیکن جو لُطف سرمئی بادلوں کی رم جھم میں، گنڈی پیٹ کے ایک کنارے جھولے کی پینگیں اُڑانے میں آتا ہے، وہ کسی ساحل کی سیر میں نہیں آتا۔" کبریٰ بیگم بکھر گئیں — "میں نہیں جاتی۔ مجھے یہیں رہنے دو۔" اس آزردہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے میں نے پوچھا "وہاں عقدِ بیوگان کے تعلق سے کیا رویّہ ہے؟"

کبریٰ بیگم کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی اک لکیر کھنچ گئی۔ "ہمارے اک رہنما ہیں؛ ان کا اعلان ہے۔ اگر انشاءاللہ ان کی بیوی بیوہ ہو جائے تو وہی اس سے عقد کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔" کبریٰ بیگم سنجیدہ ہو گئیں "لیکن ہم مہاجر ہیں ۴۰ برس سے مہاجر ہی بنے ہوئے ہیں۔ ہماری لڑکیوں سے وہاں کے نوجوانوں کی شادیاں نہیں ہوسکتیں۔ ہم بیواؤں سے عقد وہاں کے لوگوں کے لیے جائز نہیں؟" میں نے کہا "انتظار کے بعد انتقال آتا ہے۔ بس اس مرحلہ سے گزر جاؤ پھر تمہاری بھی زمین ہوگی تمہارا بھی آسمان ہوگا۔ تم پھر مہاجر نہیں رہوگی" کبریٰ بیگم ہنسنے لگیں "اب تو یہ نقشہ ہے کہ کوئی ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں منتقل ہوتا ہے تو وہ دوسرے محلہ میں مہاجر ٹھیرتا ہے۔" میں نے کہا "ہٹاؤ اِن باتوں کو یہ خدا کی خدائی میں بندہ کی لب کشائی ہے۔ چلو کچھ اور باتیں کرو۔" کبریٰ بیگم سوچنے لگیں "آپ نے اس مسئلہ پر کبھی غور کیا ہے کہ براتوں کی یک طرفہ تجارت جاری ہے۔ جو بھی دُلہا آتا ہے اُدھر ہی سے آتا ہے۔ اِدھر سے اُدھر کوئی کیوں نہیں جاتا؟" کبریٰ بیگم نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر جما دیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو... سرمئی بادل گلابی گلابی ہو رہے تھے۔ اور یم جھم کا پانی کناروں سے چھلکنے کو تھا۔ کبریٰ بیگم آنکھیں صاف کرتی ہوئی اندر چلی گئیں تو میں سوچتا بیٹھ گیا۔ "یہ کبریٰ بیگم مجھے کس طرف ہانک رہی ہیں؟" نہ رستہ صاف، نہ منزل روشن، اندھیرا ہی اندھیرا۔ یہ اندھیرا اور گہرا ہوگیا۔ جب کبریٰ بیگم سامنے آکھڑی ہوئیں۔

"یہ لیجیے، میرے شوہر کی آخری نشانی، ان کا عوامی سوٹ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ۔"

میں نے کانپتے ہاتھوں پر، ناسی رنگ کے ریشمی شرٹ شلوار کو قبول کیا "اس لباس میں آپ کو ملبوس دیکھوں گی تو معلوم ہے آپ مجھے کون نظر آئیں گے؟"

یہ سوال میرے اندر کلی کی طرح چٹک کر پھول بنا اور پھول تیتری بن کر میرے دل پر جا بیٹھا۔

"اپنے حیدرآباد میں جن کو "اجی" پکارا جاتا ہے نا۔ وہ .... "اجی" آپ نظر آئیں گے۔"

کبریٰ بیگم گھنگھرو کی طرح بج اُٹھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ تھام لیا:

"کبو تم نے بہت تکلف سے کام لیا۔ مجھ سے صرف مجھی کو مانگ رہی ہو۔ میں تو تمہارے مقابل ایک ذرّۂ بے مقدار ہوں۔ تم مجھے روند سکتی ہو۔ تم کو مجھ سے کچھ لینا ہی ہے تو مجھ سے میری محبت مانگ لو۔ یہ ہمالہ کی طرح بلند اور اٹل اور ساتویں آسمان کی طرح پاک اور روشن ہے۔"

کبریٰ بیگم نے کہا "اب لین دین کی بات چھڑ گئی ہے تو سنو، میں تم سے ایسی نسبت چاہتی ہوں... جس سے میری شناخت ہو سکے اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ میں جس ملک کی ہوں۔ وہاں محبت کے رشتہ کو نکاح کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاتا۔"

میں چکرا گیا۔ یا اللہ، یہ محبت کی باہیں تو گلا گھونٹنے کو ہیں۔

شکاری بھوؤں کو کمان بنا کر کبریٰ بیگم نے پوچھا "کیا دنیا کا سب سے آسان کام بھی آپ کے لیے مشکل ہوگیا۔"

میں سنبھل گیا "مشکل تو نہیں۔ لیکن عمر کی اس منزل میں ہوں کہ..." کبریٰ بیگم بیچ میں بول اُٹھیں "میں کون سی کم عمر ہوں۔ اور یہ محبت کا نکاح ہے۔ بس یہ ہوگا کہ میں آپ کو دیکھتی رہی، آپ مجھے دیکھتے رہے۔ میں بولتی رہی۔ آپ سنتے رہے۔ میں آپ کی موجودگی کو محسوس کرتی رہی۔ آپ میری موجودگی کو محسوس کرتے رہے۔ دو دل دھڑکتے رہے... دھڑ... دھڑ... دھڑ.... اور عمر تمام۔ اور سنیئے۔ میرے جانے میں اب صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ یہ انتظام کل ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"کل ہی" میں پریشان ہوگیا۔ "کیا بھابی کا ڈر ہے؟" میں نے سینہ پھُلایا "اب کسی کا ڈر نہیں رہا اور بھابی اب بھابی کہاں رہیں، نانی دادی بن گئی ہیں اور بچے تو اپنی معصوم زبان میں انہیں نانا جان کی نانی جان بھی پکارتے ہیں۔ ان کی طرف سے تم اندیشہ مند نہ ہو، میں انہیں سنبھال لوں گا۔" ہنستے ہنستے کبریٰ بیگم نے شوخی سے پوچھا "کس کس کو سنبھالیں گے آپ؟" یہ ہنسی مجھ پر آتشبازی کے انار کی چنگاریوں کی طرح برسی، لیکن ابھی نکاح نہیں ہوا تھا اس لیے اس چٹکی کو سہہ گیا۔
کبریٰ بیگم کی بےباک تجویز نے مجھے ہولی کا جلتا پُتلا بنا دیا۔ اور جب میں گھر پہنچا تو مجھے محسوس ہوا، میں اپنے دونوں ہاتھوں میں مشعل اٹھائے دوڑتا ہوا آیا ہوں۔ میں نے کبریٰ بیگم کے مرحوم شوہر کے کپڑے پہنے اور آئینہ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بیوی تالیاں بجاتی اندر آئی "چشمِ بد دور، ڈیرے میں چوہا!..."
میں نے کھنکارتے ہوئے کہا "شرٹ تو خیر ٹھیک ہی ہے لیکن شلوار بہت عریض اور بہت عمیق ہے۔"
"میں پوچھتی ہوں ان کپڑوں کو بہ یک وقت کتنے آدمی پہنتے ہیں؟" میں نے کہا "یہ سب مت پوچھو۔ اس شلوار کا کرشمہ دیکھو۔" میں ناچنے لگا۔ بیوی ہنستی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔
جاپان سے میرے ایک بھانجے نے، ایک خاص کمپیوٹر میرے لیے بھیجا ہے۔ اس کو ایک مقررہ تکنک کے مطابق چالو کردیا جائے تو وہ مشکل کا حال بتاتا ہے۔ مشورے دیتا ہے، نصیحت کرتا ہے۔ پلنگ پر لیٹ کر، میں نے کمپیوٹر چالو کردیا کمپیوٹر آواز دینے لگا۔

"بوالہوس بڈھے، مرنا ہے تو موت سے مر۔ خودکشی کیوں کرتا ہے"
"عمر تیری ساٹھ سے آگے نکل گئی ہے اور تو پھر نکاح کرنے چلا ہے۔"
"بال تو کالے کر ہی چکا۔ اب کیا منہ بھی کالا کرنا چاہتا ہے؟"

"جانتا ہے کبریٰ بیگم کیسی عورت ہے؟ دُھن کی پکی۔ آزاد مردوں کو شوہر بنانے والی۔ تجھے تو وہ بندر کی طرح نچائے گی۔ اور تو ناچے گا۔ کیونکہ تو ایک بے وقوف بوڑھا بندر ہے اور ناچتے ناچتے جب تو بیدم ہوکر گر جائے گا۔ کبریٰ بیگم ٹھوکریں مارتی ہوئی، تجھے موت کے گڑھے میں ڈال دے گی۔ اپنے مرحوم شوہر کے عوامی سوٹ میں جیسے تو نکاح کے دن پہننے والا ہے۔ یہ کیا ہوگیا ہے تجھے، جتنا زیرک تھا، اتنا ہی مورکھ بن گیا تو... تھو۔ تھو۔ تھو۔"
میں نے کمپیوٹر بند کر دیا۔ مجھے ڈر ہوا۔ کپڑوں سے نکل کر مرحوم کی روح کہیں کمپیوٹر میں نہ سما گئی ہو۔ نکاح کے بعد کی زندگی کا خوشنما نقشہ جمتے جمتے بکھرنے لگا تو میں نے پھر کمپیوٹر چالو کردیا۔
"پاک محبت کے جھانسے میں نہ آ۔ ہر محبت کے لیے جوانی درکار ہے اور بڑھاپا کسی بھی محبت کے کام کا نہیں ہوتا اصل میں کبریٰ بیگم اپنی پہلی ناکامی کے صدمے کو مٹانے کے لیے تجھ پر قبضہ جما کر۔ اپنی فتح کا پرچم لہرانا چاہتی ہے۔ یہ جو محبت کی حرارت تجھ میں سنسنا رہی ہے۔ وہ گیلی لکڑی کی آنچ کی طرح.... نکاح کی کارروائی کے ختم ہوتے ہوتے ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔" میں نے پھر کمپیوٹر بند کردیا۔ لیکن بند کردینے کے باوجود کمپیوٹر سے آواز برابر نکلتی رہی۔
"آنکھوں میں موتیا بند۔ منہ میں مصنوعی دانت۔ گردن، کمر، اور گھٹنوں میں درد اور چلا ہے نکاح کرنے کے لیے۔ سُن، تیرے بچے تجھ پر تھوکیں گے۔ تیرے بچوں کے بچے۔ تیرے اطراف دولا۔ دولا کھیلیں گے۔ سنبھل جا تو کیا

بیوی کے پاس جا۔ اس کی کمر اکڑ گئی ہے۔ اُس سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا ہاتھ تھام۔ اُسے اٹھا۔ اُسے دغا نہ دے۔ اُس کا ساتھ دے۔ بستر لے، دلہن کی سیج کے قابل اب تو نہیں، قبر کے فرش پر لیٹنے کی تیاری کر۔۔۔"

میں نے دل میں سوچا "مشین آٹومشین ہوتی ہے۔ وہ میرے دل کا حال کیا جانے!"

"کیا سمجھے۔۔۔؟" میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "اے دلِ بے قرار سنبھل" "کل تک سنبھل، کل تک مجھے سنبھال۔ تجملِ تمنا کے اس آزمائشی موقع پر میرے حوصلے کو سہارا دیتا رہ! عمر بھر تیرا احسان مند رہوں گا!"

دوسرے دن میں قاضی صاحب سے ملنے گیا۔ حکیم عبدالحکیم بھی مجھے وہیں ملے۔ ان دونوں کا مشترکہ کاروبار چل رہا تھا اور زوروں پر چل رہا تھا۔ حکیم عبدالحکیم میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے اپنی کیفیت اور ضرورت بیان کر دی۔ اتنے میں چارپائی پر پڑے ہوئے ایک شخص کو اندر لے آئے۔

حکیم صاحب نے اس شخص کو دیکھا۔ میں نے بھی دیکھا۔ عمر ستر سے متجاوز تھی اور کمزوری کا یہ عالم تھا کہ سانس لمبے لمبے وقفوں سے چل رہی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا "یہ گٹھیا کے پیدائشی مریض ہیں۔ اب جو ان کا چوتھا عقد طے پایا ہے تو میرے پاس آئے ہیں۔ میں اپنا "روغنِ منجنیق" ان پر آزماؤں گا۔"

میں نے حیرت سے دہرایا "روغنِ منجنیق"

حکیم صاحب کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ "جی ہاں! روغنِ منجنیق، یہ میری خاص ایجادوں میں سے ایک ہے۔ پہاڑ کو بھی گٹھیا کا مرض لاحق ہو جائے تو اس کی مالش سے پارہ پارہ ہو جائے۔ اسی روغن سے آپ کے بھی جوڑوں کو کھولنا پڑے گا۔ میں نے حکیم صاحب کی طرف سوالیہ نظریں جما دیں تو انھوں نے اطمینان دلایا "آپ کے لیے بھی میرے پاس ایک خاص چیز ہے۔" حکیم صاحب آگے بڑھے اور دیواری الماری کو کھول کر اس میں سے دو شیشیاں نکالیں۔ میں دیکھا دونوں شیشیاں ایک ہی رنگ اور ایک ہی سائز کی تھیں۔" قاضی صاحب باہر آ گئے تو ان سے میں نے بات طے کر لی اور حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھی محفلِ عقد میں شریک ہوں اور اپنے ساتھ دو گواہوں کو بھی لیتے آئیں۔ حکیم صاحب نے دوا کی شیشی میرے ہاتھ میں تھما دی۔۔۔

نکاح کے لیے کبریٰ بیگم دلہن بن کر سامنے آ بیٹھیں۔۔۔ انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پنجرہ میں بند طوطے کو بلی جس طرح دیکھتی ہے مجبور، معصوم۔ بلانے والی محبت سے بیوہ عورت بھی اگر دلہن بنتی ہے تو دوسری جنگ عظیم کے سپاہی سے کم ہتھیار بند نہیں ہوتی۔ میں نے ان سے نظر ملائی تو پسینے چھوٹ گئے۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج پھیلنے لگا! منہ سے کف جاری ہو گیا۔ ایسا نظر آیا، کبریٰ بیگم گھومنے لگیں۔ میرے اطراف بھونرے کی طرح گھومنے لگیں اور میں نقاہت کے سمندر میں، کنکر کی طرح ڈوبنے لگا۔ حکیم صاحب میرے پاس آنے کے لیے اُٹھے تو دروازہ میں سے ایک چارپائی اندر لائی گئی۔ حکیم صاحب اس طرح لپکے "ارے۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔" چارپائی والے مریض کے ساتھ آنے والے ایک شخص نے کہا "آپ کی دی ہوئی دوا کی مالش کر کے تیز گرم پانی سے غسل دیا گیا۔ اور اب دیکھئے ان کی یہ حالت ہے" حکیم صاحب نے مریض کو دیکھا اور سرہانے پڑی ہوئی شیشی کو کھول کر سونگھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگے۔

"غضب ہوگیا۔ یہ میرا روغنِ منجنیق نہیں، یہ تو اُس دولہے کی کھانے کی دوا ہے۔" وہ میری طرف آئے "حکیم صاحب میں نے آپ کی دی ہوئی دوا پی۔" "پی لی تم نے، ہائے وہ روغن منجنیق تھا بابا۔ روغن! شیشیوں کی یکسانیت سے دوائیں اِدھر اُدھر ہوگئیں۔" میں نے پوچھا "اب میرا کیا ہوگا۔؟" حکیم صاحب نے قاضی صاحب کو بلایا اور دونوں نے مل کر، مجھے، پہلے مریض کے بازو چارپائی پر لٹا دیا۔

"حور! حور! میری حور!!" میں چیخنے لگا۔ کبریٰ بیگم میرے سرہانے آکھڑی ہوگئیں "آپ کو خدا کی قسم اِن علاجوں سے توبہ کر لیجئے۔ یہ لوگ تو غلط دوائیں کھلا کھلا کر آپ کو مار ڈالیں گے۔ یہ ایٹمی زمانہ ہے۔ ایٹمی انجکشن لیجئے۔ میں تو کل جارہی ہوں۔ ایک سال بعد پھر آؤں گی۔ علاج کراتے رہئے۔ اور زندہ رہئے۔"

اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔ شاید میں بے ہوش ہوگیا یا ممکن ہے، میں بھی مرگیا۔ !! ▲▲

مطبوعاتِ زندہ دلانِ حیدرآباد

نامور مزاح نگار

نریندر لوتھر کے

اِنشائیوں کا تازہ مجموعہ

الف تحاشا

قیمت ۱۶ روپے

مشہور و ممتاز مزاح نگار

رشید قریشی

کے

مضامین کا مجموعہ

مزاحِ لطیف

قیمت ۲۰ روپے

نیاز سواتی
(پاکستان)

معلوم ہوتی ہے

○

مکاں کی پہلی منزل دوسری معلوم ہوتی ہے
نشے میں مجھکو ہر شے گھومتی معلوم ہوتی ہے

نشے میں ذہن کی جو کیفیت ہے مجھ سے مت پوچھو
جو موٹر چل رہی ہے وہ کھڑی معلوم ہوتی ہے

جوانی میں نظر آتا ہوں بُوڑھا نشے کے باعث
چھوارے کی طرح صورت مری معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم مجھ کو فرق کیا ہے "ہی" میں "اور" "شی" میں
وہ شی ہے پر، نشے میں مجھ کو "ہی" معلوم ہوتی ہے

نشے میں میر بھی غالب مجھے معلوم ہوتے ہیں
غزل غالب کی ہے اور میر کی معلوم ہوتی ہے

کیا ہے جب سے ہیروئن کا میں نے مشغلہ جاری
مرے چہرے پہ اب کالک ملی معلوم ہوتی ہے

نشے میں دھت پڑا ہوں گیہوں کی سرسبز کھیتی میں
مگر مجھکو نشے میں وہ دری معلوم ہوتی ہے

جو میرا دوست مجھ سے گفتگو کرتا ہے محفل میں
نشے میں اُسکی ہی مجھ کو کمی معلوم ہوتی ہے

"گزار" نے مرے دانتوں کا ستیاناس کر ڈالا
بتیسی اب مری ہلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

جو ڈیزل میں پکا کر دی ہے مچھلی شیخ صاحب نے
نشے میں وہ مجھے گھی میں پکی معلوم ہوتی ہے

میں اک صوفے پہ بیٹھا ہوں سمجھتا ہوں یہ موٹر ہے
کھڑی بھی چیز مجھکو گھومتی معلوم ہوتی ہے

سسر صاحب! یقیں کیجیے نہیں میں توتلا ہرگز
زباں میری نشے میں توتلی معلوم ہوتی ہے

کسی نے سچ کہا ہے روکتا ہے نشہ پیری کو
جوانی میں قضا آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

لکھی ہے گو کہ کاتب نے، مگر نشے کی حالت میں
عبارت پاؤں سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے

نشے میں جانے کس نے جیب سے نقدی نکالی ہے
مجھے اب جیب میں اُس کی کمی معلوم ہوتی ہے

مجھے کہنا تھا "سر" لیکن نشے میں کہہ گیا "میڈم"
نشے میں چھوکرا بھی چھوکری معلوم ہوتی ہے

خدا جانے مرا کیا حشر ہوگا عہدِ پیری میں
کمر میری جوانی میں جھکی معلوم ہوتی ہے

چرس ہو، بھنگ ہو، رگڑا ہو، ٹھرا ہو یا ہیروئن
نشہ آور مجھے ہر شے بُری معلوم ہوتی ہے

مسیح انجم

دُمدار سِتارہ "ھیلی" کی یاد میں!

دُم دار ستارہ "ہیلی" نمودار بھی ہوا اور غائب بھی ہوگیا۔ لیکن ہم ہیں کہ اُس کی دُم کو ابھی تک پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ــــ سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ ہم لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ دنیا میں ایسے کتنے لوگ نہیں جن کے سامنے سے سانپ بھی گزر جاتا ہے اور لکیر بھی مٹ جاتی ہے، تب کہیں انھیں اپنا فرض یاد آتا ہے تو بیوی کا اور بچوں کو پیٹنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن ادیبوں اور شاعروں کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ معمولی واقعہ کو بھی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اور عصری حسیت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ادیب ہو کہ شاعر جو کچھ بھی محسوس کرے اُس کا یہ پیغمبرانہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ دوسروں کو آگاہی بخشے۔ یہی وہ نازک مقام ہوتا ہے جہاں سے مضحک واقعات اور لطیفے جنم لیتے ہیں ــــ اندھیری رات میں ایک گنوار گلی سے گزر رہا تھا۔ گنوار سے پہلے ایک بھینس بھی اسی گلی سے گزری تھی جس نے ساکنانِ کوچہ و بازار کے لیے ایک ایسا تحفہ چھوڑا تھا جس سے اُپلے بنائے جاتے ہیں۔ گنوار کے پیر میں چپل نہیں تھے۔ اتفاق سے گنوار کا پیر بھینس کے چھوڑے ہوئے ثبوت پر پڑا۔ وہ ٹھہرا گنوار۔ اُسے یہ کیا فکر کہ کھوج لگائے چنانچہ اس نے فوراً ثبوت کو جھٹک دیا اور آگے چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی گلی سے ایک دانشور کا گزر ہوا۔ دانشور ننگے پیر تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے پاس جوتے خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ عصرِ جدید کا ایک جدت پسند دانشور تھا۔ دراصل وہ رات کے وقت زمین کے لمس کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس کا پیر بھی بھینس کے چھوڑے ہوئے اسی ثبوت پر پڑا۔ یوں بھی گنوار کے گزرنے کی وجہ سے ثبوت تھوڑا پھیل بھی چکا تھا۔ دانشور کو ایک عجیب قسم کی نمی کا احساس ہوا اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو پیر کی نمی کو انگلی سے چھوکر دیکھا (سیدھے ہاتھ کی انگلی سے نہیں بلکہ بائیں ہاتھ کی اُنگلی سے) پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تب اس نے قوتِ شامہ کو زحمت دینے کے لیے وہی انگلی ناک کے قریب لائی۔ ناک بھی تھوڑی سی آلودہ ہوگئی۔ اتنی ساری جستجو کے بعد بالآخر اُس نے اپنا گوہرِ مقصود پا ہی لیا۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ دونوں میں عقلمند کون تھا؟ آیا وہ گنوار جو اپنا پیر جھٹک کر چل دیا تھا؟ یا وہ دانشور جس نے تحقیق کے تین مراحل طے کئے تھے؟ اگر آپ گنوار کو عقلمند ٹھہراتے ہیں تو معاف کرنا آپ نے عصری حسیت کا مفہوم ہی نہیں سمجھا۔ اگر آپ دانشور کی تائید کرتے ہیں تو ہم آپ کی فہم و فراست کی داد دیتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ

ہے کہ عصری حسیت کے بغیر ادب عالیہ تخلیق نہیں پاتا۔

چنانچہ اسی عصری حسیت کے تقاضے کے پیشِ نظر ہم نے دُم دار ستارے "ہیلی" کو دیکھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" ۱۹۸۵ء کے اواخر میں آسمان پر نمودار ہونے لگا تھا۔ مہینہ اور تاریخ بھی ہم ہی بتادیں تو پھر محققین کی روٹی اور روزگار کا کیا ہوگا؟ سائنس دانوں نے اس کے وزٹنگ ویزا کی جو مدت بتائی تھی وہ کوئی چھ ماہ کی تھی۔ وہ ہر روز رات کے پچھلے پہر نمودار ہوتا اور پھر یہ مژدہ سُناتا:

اُٹھو سونے والو کہ میں آگیا ہوں

مگر ہماری مشکل یہ تھی کہ اس کا ٹائم ٹیبل ہمارے ٹائم ٹیبل سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کی سواری یعنی دم جس وقت برآمد ہوتی تھی وہ ہمارے سونے کا وقت ہوتا تھا۔ ان ہی دنوں ہم شہر چھوڑ کر کالونی میں منتقل ہوئے تھے۔ ہم کالونی والوں کے لیے نووارد تھے۔ اور دُم دار ستارہ "ہیلی" ہمارے لیے نووارد تھا۔ ہمارے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اُن ہی دنوں کالونی اور اس کے مضافات میں ڈاکے پڑنے لگے تھے۔ ڈاکوؤں کے حُلیئے کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ لُنگی اور بنیان میں آتے ہیں اور تلگو بولتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہم ریلیکس (RELAX) ہونے کے لیے لُنگی استعمال کرتے ہیں اور تلگو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ بلکہ اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں۔ اس طرح ڈاکوؤں کی اہم شناخت اور حُلیہ ہماری شناخت اور حُلیئے سے بڑی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ اب آپ ہی غور کیجئے کہ ایسی "اظہر من الشمس" قسم کی مماثلت رکھ کر اگر کوئی شخص رات کے پچھلے پہر دُم دار ستارے کے درشن کے لیے نکلے تو اس کے نحس اثرات شخص مذکور پر نہیں پڑیں گے؟ (یہ الگ بات ہے کہ ہم توہمات کے قائل نہیں ہیں)۔

ہم نے دُم دار ستارے "ہیلی" کے مشاہدے کے لیے جس رات کا انتخاب کیا تھا، اتفاق سے وہ بہت کالی تھی۔ اور حسنِ اتفاق سے برقی بریک ڈاؤن بھی اُسی وقت ہوا تھا جو ہمارے شہر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ایک عجیب بے خودی کے عالم میں بیوی بچوں کو سوتے چھوڑ کر لنگی اور بنیان پہنے ہی گھر سے نکل پڑے۔ لباس کا اہتمام کرنے میں بیوی اور بچوں کے جاگ پڑنے کا اندیشہ تھا۔ ویسے ہمیں جانا ہی کتنی دور تھا۔ صرف ایک آدھ فرلانگ تک! ابھی کچھ دُور جا بھی نہیں پائے تھے کہ یاد آیا کہ عینک گھر پر ہی بھول آئے ہیں چنانچہ عریاں آنکھ سے ہی "ہیلی" کو دیکھنے کا ارادہ کرلیا۔ ابھی ہم دُم دار ستارے "ہیلی" کو دیکھنے کے لیے سمت کا تعین کر ہی رہے تھے کہ ایک پولیس والے پر نظر پڑی جو کندھے پر رائفل لگائے اور لاٹھی ٹیکتے ہماری طرف آرہا تھا۔ اچانک ہماری نظریں آسمان کی طرف اُٹھنے کی بجائے پولیس والے کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس طرح پولیس والا دُم دار ستارہ بن کر ہمارے اور "ہیلی" کے درمیان حائل ہوگیا۔ جس کے نحس اثرات کو سب سے پہلے زائل کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے لنگی اور بنیان میں ہماری جو عجیب و غریب ہیئت دیکھی تو تلگو میں تحکمانہ انداز میں پوچھا "اے ورُو (? ఎవరు)" — کون ہے؟

ہم نے سوچا کہ تلگو دانی کے دریا بہاکر دنداں شکن جوابات دینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اس کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ یوں بھی ہم دنداں شکن جوابات دیتے دیتے اب تک بارہ دانت گنوا چکے ہیں!

ہم تلگو میں دنداں شکن جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہے تھے کہ اچانک ڈاکوؤں کا خیال آیا جن کی ایک اہم شناخت تلگو دانی بتائی گئی تھی۔ پھر تو ہم نے تلگو دانی ذ طلبک کے لیے انکسار کیا اور مادری زبان میں جواب دیا "میں ایک رائٹر ہوں"!

پولیس والے کے منہ سے بے ساختہ اردو جملہ نکلا "اچھا! راشٹر منشی! پھر اتنی رات کو کہاں جا رہا تھا؟"
پھر تو ہم خوش ہوئے کہ وہ شرفا کی زبان اردو میں بھی گفتگو کرنا جانتا ہے۔ پولیس والے چاہے اردو بولیں، چاہے تلگو، چاہے انگریزی ـــ ان کی ایک عادت ہوتی ہے بے تکے سوالات کر کے پریشان کرنا۔ اور یہ عادت نہ صرف نیشنل بلکہ انٹرنیشنل سطح پر بھی پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے کہ پولیس والوں کے بے تکے سوالات کے جوابات بھی بے تکے انداز میں "فٹافٹ" دینے سے ہی منطق کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے اور نجات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ گُر نہیں جانتے وہ اکثر پولیس کے چالانات اور جُرمانے بھرتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ سبق ہمیں یاد نہیں رہا تھا اس لیے صاف صاف کہہ دیا "ذرا دُم دار ستارے کو دیکھنے جا رہا تھا!"
پولیس والے نے پوچھا "وہ دُم دار ستارہ کہاں ہے؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں!"

ہم نے آسمان کی طرف نظریں دوڑائیں۔ ہماری روح فنا سے بقا کی طرف جاتے جاتے رہ گئی۔ آسمان پر دُم دار ستارہ "ہیلی" نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر تو ہمیں یوں لگا جیسے آسمان پر "ہیلی" کی جگہ پولیس والا "ہیلا" بن کر چمک رہا ہو اور چاروں طرف حدِ نظر تک بس اُسی کی دُم پھیلی ہوئی ہو۔ جی میں آیا کہ کہہ دیں کہ تم ہی دم دار ستارہ ہو اور خاکی ڈریس پہننے کی وجہ سے آسمان پر پہنچ گئے ہو۔ مگر یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ چوں چرا کرنے کی صورت میں شبہ کی علت میں دھر لیے جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ہم نے صاف صاف کہہ دیا "دُم دار ستارہ اتنی آسانی سے نہیں نظر آتا۔ اس کو تو دوربین سے دیکھنا پڑے گا۔" "اچھا تو پھر دوربین کہاں ہے؟" پولیس والے نے ایک اور سوال کیا۔

ہم نے تھوڑی سی لیاقت بگھارتے ہوئے کہا "وہ تو میری آنکھ میں ہے"۔ یہ سن کر پولیس والا اپنی اصلیت پر اُتر آیا اور بولا "کسے اُلّو بنا رہا ہے؟ سچ سچ بتا کہاں جا رہا تھا۔ ورنہ چالان کر دوں گا!"

پھر تو ہماری ساری لیاقت دھری کی دھری رہ گئی۔ اخبارات میں صاف طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" عریاں آنکھ سے نہیں نظر آئے گا۔ صرف دوربین سے نظر آئے گا۔ ہمیں اپنی بھول پر بڑا افسوس ہونے لگا۔ مگر وہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا۔ پولیس والے کے چنگل سے بچ نکلنا نہایت ضروری تھا۔ ہم نے سوچا کہ اب سائنس اور دوربین سے کام نہیں چلے گا۔ خدا کو درمیان میں لانا ہی چاہیئے۔ کئی دنوں سے نمازیں بھی نہیں پڑھی تھیں۔ قضائے عمری ادا کرنے کا بہترین موقع تھا۔ اور ذرا سا حیلہ بھی۔ طہارت سے تو تھے ہی۔ اور لنگی بھی باندھے ہوئے تھے! [illegible] فرق صرف اتنا تھا کہ ہماری لنگی گھبراہٹ کی وجہ سے ٹخنوں کو کراس کر کے سترِ عورت کی تعریف میں آگئی تھی۔ صرف اسی کو ذرا سترِ مرد میں لا کر تیمم کر کے نیت کر لینے کی دیر تھی۔ واقعی خدا نے بھی ہم جیسے کاہلوں کے لیے عبادت کی کیا کیا سہولتیں دے رکھی ہیں؟ اس وقت تو ہم عبادت کے پورے حدود میں تھے۔ صرف پولیس والا ہی حدود میں حائل تھا۔ چنانچہ ہم نے پولیس والے سے کہا "میں تو نماز کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں تم حائل ہو گئے"۔
"پھر تو ٹوپی کہاں ہے"؟ پولیس والے نے ایک اور سوال کیا۔

ہم نے کہا "تم کو ٹوپی سے کیا غرض؟ یہ میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔ دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل [illegible] چاہیئے"۔ یہ سُن کر پولیس والا ذرا نرم پڑ گیا اور پھر بولا "پہلے ہی کاہے نہیں بولتا تھا، نماز کو جا رہا ہوں۔ جب سے کیا کیا بول رہا تھا ـــ دُم دار ستارہ، دُم دار ستارہ، دوربین۔ ہُنہہ!" اس عرصہ میں پولیس والا کسی حد تک [illegible] پر اس کی لیاقت بھی ہمارے سامنے بالکل عریاں ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم نے [illegible] قابلیت کو جانچنے کے لیے

تھوڑی سی ترقی دے کر پوچھا "جمعدار صاحب! کیا آپ نے سائنس پڑھی ہے؟" جھٹ سے اعتراف کرلیا "سائنس پڑھتا تو پولیس میں بھرتی کیوں ہوتا تھا؟" اس عرصے میں تھوڑی سی بے تکلفی کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہم پولیس والے سے معذرت چاہ کر اور دُم دار ستارے "ہیلی" کے مشاہدے کو اگلے وقت پر ٹال کر گھر کی طرف چل پڑے۔ دعا یہ کررہے تھے کہ بیگم صاحبہ بیدار نہ ہوں۔ بیوی اگر پڑھی لکھی ہو تو دُم دار ستاروں اور ستاروں کے ملن کے بارے میں سمجھانا کوئی مشکل کام نہیں۔ بلکہ وہ خود سمجھ لیتی ہے۔ اور بُرا وقت آپڑنے پر شوہر نامراد کو بھی سمجھا دیتی ہے۔ مگر ہماری بیگم تو پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ ہر بات کو مثالوں اور ڈیمانسٹریشن کے ذریعہ سمجھانا پڑتا ہے۔ ۱۹۸۰ میں جب سورج کو گہن لگا تھا تو ہماری بیگم نے ڈیمانسٹریشن کے ذریعہ سورج گہن کو سمجھانے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ چاند کو زمین اور سورج کے درمیان لانے کے لیے ہمیں ایک عدد چاند سلطانہ سے فرضی عشق کرنا پڑا تھا۔ سارے لوگ سورج کو گہن لگنے دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف تھے تو اِدھر ہم چاند سلطانہ کے فراق میں تڑپ رہے تھے، آہیں بھر رہے تھے - - - - - - - - - - - - - - - - اس طرح ہمارے اور بیگم صاحبہ کے درمیان ایک چاند سلطانہ آگئی تھی جس کا سایہ مہینوں ہماری بیگم پر پڑتا رہا۔ بہت سے ٹوٹکے کروائیں اور ہمارا دیوالیہ نکل گیا۔ تب ہماری بیگم کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ گہن کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے گھر میں کبھی بھی سائنسی موضوعات پر بحث نہیں کرتے اور نہ کوئی سائنس گریجویٹ دوست کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ ہم نے پڑھ رکھا ہے کہ سائنس دانوں کے تعلقات اپنی بیویوں سے کبھی بھی اچھے نہیں رہے اور نہ رہتے ہیں۔ لہذا سوچ یہی رہے تھے کہ بیگم اگر بیدار ہوں تو دُم دار ستارے "ہیلی" کے بارے میں کس طرح ڈیمانسٹریشن کرکے سمجھائیں گے؟ اور پھر ہمارے پاس دوربین بھی تو نہیں تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ پولیس والے سے چھٹکارا پاکر جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے، بیگم صاحبہ ہمیں باتھ روم میں تلاش کرکے بڈ روم کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ ہم پہ نظر پڑتے ہی پوچھ بیٹھیں "یہ آدھی رات کو کہاں گئے تھے؟ اور وہ بھی لنگی میں!"

ہم نے جھنجھلا کر کہا "کیا ساڑی پہن کر جانا چاہیے تھا؟"

بیگم نے ہمارے جو تیور دیکھے تو کچھ سٹپٹا سی گئیں اور پھر ملائم لہجے میں بولیں "آخر آپ گئے کہاں تھے؟ میری تو بس جان ہی نکل گئی تھی!"

ہم نے صاف گوئی سے کام لیا "ذرا "ہیلی" کو دیکھنے گیا تھا؟"

لفظ "ہیلی" پر وہ چونک پڑیں۔ ان کا چونک پڑنا بھی اپنی جگہ واجبی تھا۔ ادھر ہمارے سسرالی عزیزوں کے بعض گھرانوں میں بے فکرے اور بے کار پھرنے والے نوجوان کو "ہیلا" کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ "ہیلا" ہماری بیوی کی ادبی میراث ہے۔ شک بھری بیوی کو "الف" کو گرا کر "ی" لگانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ چاہے وہ مونث بعد میں مذکر ہی کیوں نہ نکلے۔ چنانچہ ہماری بیگم نے "ہیلی" کو عورت ذات سمجھ کر یوں کہا "اچھا تو یہ چکر ہے! میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ کہاں رہتی ہے وہ بدذات ہیلی؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں! نام سے تو انگریزنی معلوم ہوتی ہے!"

ہم نے چھیڑنے کے لیے کہا "ہاں! انگریزنی ہی ہے۔ اور ہے بھی بڑی بد۔ حال ہی میں آئی ہے!"

بیگم نے پوچھا "کہاں رہتی ہے وہ؟ فلیٹ میں رہتی ہے یا کوارٹر میں؟"

ہم نے کہا "وہ کوارٹر میں نہیں بلکہ اپنے ہیڈکوارٹر خلا میں رہتی ہے!"

Accession Number. 12885
Date 11.12.87

بیگم نے پوچھا "شوہر والی ہے یا کوٹھے والی؟"

ہم نے علمی برتری جتانے کے لیے کہا "کوٹھے والی ہے۔ اور بہت ہی اونچے اور عالیشان کوٹھے پہ رہتی ہے! میری تو کیا حیثیت، بڑے بڑے سائنس داں اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں!"

بیگم نے کہا "پھر تو بڑی بے حیا معلوم ہوتی ہے! کیا عمر ہوگی اُس کی؟"

ہم نے کہا "عمر پوچھ کر کیا کروگی؟ بہرحال نپتے کچے والی ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جبکہ تمہارے پوتے اور نواسے اس کو اور اس کے بچوں کو دوربینیں لگا لگا کر دیکھیں گے!"

اس پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہم نے اخبار میں دُم دار ستارے "ہیلی" اور اس کی دُم کی تصویر بتائی اور کہا کہ "صبح میں تم اپنے بچوں سے پوچھ لینا۔ وہ تمہیں اچھی طرح سمجھائیں گے"!

دُم دار ستارہ "ہیلی" ۱۹۸۵ء کے اواخر میں جو نکلنا شروع کیا تو ۱۹۸۶ء کے اوائل تک ہر روز نکلتا ہی رہا۔ اس کے دورۂ خیرسگالی کے آغاز پر تو کچھ ہلچل سی رہی اور پھر اس کے بعد ایک جمود سا طاری ہوگیا۔ بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے — روز روز کا آنا جانا قدر کو کم کر دیتا ہے! اب ہم لوگ وَن ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میچ کے عادی ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا ادب بھی اب "ون ڈے میچ" ہو کر رہ گیا ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے شاعر جب شعر کہتے تو سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے تھے۔ اب جدید شاعروں کے پاس کوزہ ہی نہیں ہے جس میں سمندر کو بند کیا جاسکے۔ خدا بھلا کرے جدید شاعری کا کہ اب تو ایک سطری نظمیں بھی کہی جانے لگی ہیں۔ جب ایک سطری نظموں کا رواج چل پڑے گا تو ظاہر ہے، ہماری تنقید بھی ایک سطری ہو جائے گی۔ یوں بھی آج کل تنقیدی مقالوں میں کام کی سطر صرف "ایک" ہی ہوتی ہے۔ باقی سب تو حوالوں اور حواشیوں کا پلندہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں، جدید شاعر۔ وہ "ایک سانس کی نظم" کہتے ہیں۔ اور واقعی وہ ہیں بھی ایک ہی سانس کے شاعر۔ جب کبھی وہ اپنا کلام سناتے ہیں تو باضابطہ اعلان کرتے ہیں کہ "اب آپ مجھ سے 'ایک سانس کی نظم' سنیے"۔ ان کی نظم کا وقفہ ایک سانس کے آجانے کے وقفے کے برابر ہوتا ہے۔ ترقی پسند شاعر اُن کو "ایک سانس کا شاعر" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جس دن بھی وہ جذبے میں آکر "دو سانس والی نظم" کہنے کی غلطی کریں گے، اُس دن اُن کی سانس ہی اُکھڑ جائے گی۔ دیکھا آپ نے! ہمارے ادب میں کیسے کیسے دُم دار ستارے نمودار ہوتے جارہے ہیں؟

غالباً آپ نے پڑھا ہوگا کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" ہر پچھتر سال میں ایک بار نمودار ہوتا ہے۔ پچھلی بار وہ ۱۹۱۰ء میں نمودار ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں جب دُم دار ستارے "ہیلی" کو دیکھا تو اُس وقت کی عصری حیثیت کے تقاضے کے تحت یوں فرمایا تھا "اگلی بار میں دُم دار ستارے "ہیلی" کو اپنے پوتے کی آنکھ سے دیکھ سکوں گا"۔ اقبال چونکہ شاعر ہونے علاوہ فلسفی بھی تھے، اس لیے اپنے تسلسل کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا تھا۔

اب ذرا براعظم ایشیاء سے باہر قدم نکالیے۔ امریکہ میں ایک مشہور ادیب گزرے ہیں جن کا نام ہے مارک ٹوئین۔ اُن کا تعلق ہمارے قبیل سے تھا۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ وہ انگریزی میں مزاح لکھتے تھے۔ اُن کی ولادت ۱۸۳۵ء میں اُس دن ہوئی جس دن دُم دار ستارہ "ہیلی" آسمان پر جلوہ افروز ہوا تھا۔ اُس واقعہ کے تہتر (۷۳) سال بعد مارک ٹوئین نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور احباب سے کہا تھا کہ "میں اور "ہیلی" ۱۸۳۵ء میں ظہور میں آئے تھے۔ اور اب ۱۹۱۰ء میں ہم دونوں کا ساتھ اکھٹا رہے گا"!

مارک ٹوین نے جب یہ بات کہی تھی تو کسی نے بھی اُن کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اور اُن کی بات کو "مسخرے پن" پر محمول کیا تھا۔ مزاح نگاروں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ مزاح نگار مزاح کے پردے میں جب کوئی پتے کی بات کہہ جاتا ہے تو لوگ اُس کی بات کو "مسخرے پن" پر محمول کرتے ہیں۔ آخر وہی ہوا جس کا ہونا تھا۔ ادھر اپریل ۱۹۱۰ میں دُم دار ستارہ "ہیلی" آسمان پر نمودار ہوا، ادھر اُس کے اگلے روز ہی مارک ٹوین اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

دوسری طرف ہمارے شاعروں کو لیجئے۔ وہ بھی اپنی بیماری کے زمانے میں اپنی موت کی پیشن گوئی کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض شاعر تو قطعہ تاریخ بھی نکال لیتے ہیں۔ لیکن مرتے ور تے نہیں۔ اور جیسے ہی علاج کے لیے مالی امانت کی سبیل نکل آتی ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جاتے ہیں۔

ہم نے بزرگوں سے سنا اور کتابوں میں پڑھا بھی ہے کہ دم دار ستارے سربراہانِ مملکت اور نیتاؤں پر بھاری ہوتے ہیں۔ پچھلی صدیوں میں جب کبھی دُم دار ستارہ نمودار ہوتا تو راجے، مہاراجے، ظلِ الٰہی، ظلِ سبحانی، پرنس، پرنسس حتیٰ کہ ایمپریس تک اپنی ایکٹنگ بھول کر توبہ تلاّ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اور پھر ہر طرف لنگر خانے، دسترخوان، بھوجن جیسے فلاحی کاموں کا آغاز ہو جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی غرضکہ ساری رعایا اپنے نیتا کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتی۔ اور اُن دُعاؤں کا ایک سیکولر ہالہ، یہ ڈیفنس فورس بن کر نیتا کی حفاظت کرتا۔ ویسے کہنے کو آج بھی لفظ "سیکولر" نعرے کی شکل میں موجود ہے لیکن دعاؤں کا حفاظتی سیکولر ہالہ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اب دُنیا کے بڑے بڑے حکمراں اور نیتا دُعاؤں کے ہالے کی جگہ بلٹ پروف، فائر پروف، واٹر پروف، ساؤنڈ پروف اشاک پروف یونیفارم پہنتے ہیں اور دُم دار ستارے بن کر عالمی امن کے نام پر ساری دنیا میں نحوست پھیلاتے ہیں۔

دُم دار ستارہ "ہیلی" آیا اور چلا بھی گیا۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کی آمد سے دنیا میں ایک ہلچل سی مچ جائے گی۔ اور ہمارے نیتا راہِ راست پر آجائیں گے۔ اور پھر فلاحی اور خیر خواہی کے کاموں کا ایک نیا پنج سالہ منصوبہ روبہ عمل لایا جائے گا۔ ہم تو یہ بھی توقع کر رہے تھے کہ ادیبوں اور شاعروں کو کچھ نہیں تو کم از کم ایک عدد فلیٹ یا کوارٹر الاٹ کرنے کے احکام جاری کر دیئے جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ دُم دار ستارے "ہیلی" کا دورہ تو انتہائی خیر سگالی دورہ ثابت ہوا۔

نجومیوں نے کہہ رکھا ہے کہ دُم دار ستارہ جب بھی نمودار ہوتا ہے تو کچھ لے جاتا ہے اور کچھ دے جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دُم دار ستارے "ہیلی" نے دنیا کو کیا دیا اور یہاں سے کیا لے گیا؟ تو عرض ہے کہ دُم دار ستارہ "ہیلی" دنیا کے سارے "سیاسی سرغنوں" کو ان کے حال پر چھوڑ گیا اور اپنی دُم صاف بچا لے گیا۔ البتہ جاتے جاتے مجھے ضرور دے گیا ہے۔ اب ہماری ساری تہذیب حسین ساگر کے تٹ پر آکر منجمد کھڑی ہے۔ اگر مجسموں پر خرچ کی گئی رقم ہمیں دی جاتی تو ہم خود حسین ساگر کے تٹ پر لسانی ہم آہنگی کی خاطر مہا کوی ویمنا کی جگہ میک اپ کر کے کھڑے ہو جاتے۔ اور ہر آنے جانے والے کو ویمنا کے تصوف اور اخلاق سے بھرے پدیالو (نظمیں) سناتے۔ تحت میں نہیں بلکہ ترنم سے۔ یہ دیکھ کر ویمنا کی روح بھی خوش ہو جاتی کہ چلو کوئی اور نہ سہی کم از کم ایک اردو والا تو میرے پیام کو عوام تک پہنچانے کو ملا۔ اور وہ بھی ترنم سے!

امریکہ امریکہ!

(سفرنامہ)

* نریندر لوتھر

زندہ دلانِ حیدرآباد کے صدر اور نامور مزاح نگار جناب نریندر لوتھر گذشتہ سال بائی پاس سرجری کیلئے امریکہ گئے تھے۔ دل کے آپریشن کیلئے اختیار کئے گئے اس سفر کی داستان لوتھر صاحب نے بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنے خاص انداز میں قلمبند کی ہے۔ اس سفرنامہ کی چند قسطیں روزنامہ سیاست، ماہنامہ آجکل اور شگوفہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ نظر چھٹی قسط ... جس میں آپریشن کے فوری بعد کے واقعات اور ڈسچارج ہونے کا ذکر ہے ——— (ادارہ)

* * *

اگلے دن تڑکے، ہمیں بستر سے اسٹریچر پر منتقل کیا گیا۔ یہ یاد بھی ہی دھندلی سی ہے۔ اس عالم غنودگی میں پہیوں کے چلنے کی مدہم سی آواز تھوڑی دیر تک آئی۔ اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا؟

جب ہماری آنکھ کھلی تو سامنے دیواری گھڑی ساڑھے چھ کا وقت بتا رہی تھی۔ ہمارے دونوں طرف دو لوگ ڈاکٹروں کے لمبے کوٹ پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ ہم نے دائیں طرف کھڑے ہوئے شخص سے پوچھا۔

کیا شام ہو گئی؟

اُس نے کہا یہ شام نہیں اگلے دن کی صبح ہے۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ 'اوہ' نکل گیا۔ یہ 'اوہ' حیرانی اور درد دونوں کیلئے تھا۔ اسی کے ساتھ ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں بستر پر جکڑ کر باندھا گیا ہے۔ ٹانگیں اور کلائیاں بستر سے بندھی ہوئی تھیں اور جسم کے مختلف حصوں سے کئی قسم کی نالیاں جسم میں پہنچائی گئی تھیں۔ سخت سردی لگ رہی تھی۔ ہم نے بلاتا

چاہا تو گلے سے آواز نہ نکلی کیونکہ گلے میں نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ گردن کی ایک طرف سوئی چبھ رہی تھی۔ ہاتھ کا اشارہ ہم کر نہیں سکتے تھے کیونکہ ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے بمشکل تمام ڈاکٹر کو بتانے کی کوشش کی کہ ہمیں سردی لگ رہی ہے۔ ہمارے دانت بج رہے تھے اور جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے دوسرے سے کہا کہ اس کا ٹمپریچر لو۔ پھر ہمیں آواز آئی کہ اسے 103 بخار ہے۔ دوسرا ڈاکٹر ایک گیلی چادر لے آیا اور دونوں نے مل کر اسے ہمارے اوپر ڈال دیا۔ ہم نیم گرم کمبل چاہ رہے تھے اور یہ لوگ ہمارے اوپر گیلی چادر ڈال رہے تھے۔ اس سے ہماری کپکپی اتنی بڑھ گئی کہ لوہے کی چارپائی ہلنی شروع ہوگئی۔ لیکن ڈاکٹر تھے کہ گیلی چادر پر پانی کا چھڑکاؤ ایسے کئے جارہے تھے گویا ہم لان ہوں۔ پھر ایک ڈاکٹر ہم سے مخاطب ہوا۔

آپ کا نام کیا ہے ؟

آپ اس وقت کہاں ہیں ؟

آج کونسا دن ہے؟

اب کتنے بجے ہیں ؟

ہم نے سب سوالوں کے جواب صحیح دیئے۔ اس پر بھی اُن کی تسلی نہ ہوئی۔ دوسرا ڈاکٹر آیا۔ اُس نے بھی وہ سب سوال دہرائے۔ ہم نے سب جواب صحیح دے دیئے۔ پھر اُس نے پوچھا۔ " میں کون ہوں ؟"

ہم نے کہا۔ پولیس کا انسپکٹر۔

اُس نے پوچھا "کیوں ؟" ہم نے کہا۔ "یہ جو ہمیں ٹارچر کر رہے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟" ہم نے اپیل کی کہ "ہمیں اس اذیت سے چھٹکارا دلاؤ۔ ہم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی کسی بھی اقبالنامہ پر دستخط کرنے کو تیار ہیں۔ یہ ہسپتال ہے یا جیل خانہ ؟" ڈاکٹر نے ایک خبیث سی مسکراہٹ سے کام لیا، جیسے فلموں میں ڈاکوؤں کا سرغنہ ہیرو کو ٹارچر کرنے کے بعد مسکراتا ہے۔ یہ ڈراما کوئی آدھ گھنٹہ چلا ہوگا۔ آخر ہم مزید سردی اور درد کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے فلموں میں ہیرو بے ہوش ہوجاتا ہے۔

جب آنکھ کھلی تو ہم ایک دوسرے کمرے میں تھے۔ جسم میں سے تقریباً بیس نالیاں اور ٹیوبیں نکالی جاچکی تھیں۔ سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ ایک بہت ہی حسین نوجوان ہماری دیکھ بھال کررہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم اور ہماری میزبان داخل ہوئیں۔ دونوں نے ہمارا حال پوچھا۔ ہم نے پوچھا کہ ہمارے ٹارچر کے وقت آپ لوگ کہاں تھے۔ وہ ہنسیں اور ہمارے بچ نکلنے پر ہمیں مبارکباد دی۔ ٹارچر میں ظاہر ہے اُن کا بھی کچھ ہاتھ تھا ورنہ اس آسانی سے وہ ہمارے سوال کو ٹال نہ جاتیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چلی گئیں۔ بیمار پُرسی میں دو چار سوالوں کے بعد اور کچھ پوچھنے کو ہوتا بھی نہیں اور دو چار سوالوں کے جواب بھی اسٹینڈرڈ ہوتے ہیں۔

کیسا حال ہے ؟

بہتر ہوں ۔

کچھ کھایا ؟

نہیں (یا ہاں)
کیوں ؟ (اگر جواب نفی میں ہو)
بھوک نہیں لگتی (اگر جواب نفی میں ہو)
کچھ کھانا چاہیئے ورنہ صحت کیسے ٹھیک ہوگی۔ اگر کوئی خاص چیز کھانے کو دل کرتا ہے تو لاؤں ؟
جی نہیں۔ یہاں بہت کچھ مل جاتا ہے۔
اور کوئی بات ۔ کسی چیز کی ضرورت ؟
جی نہیں ۔

اس کے بعد مزاج پُرس اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ چھت کو تکتا ہے اور پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد ۔ اچھا تو ہم چلتے ہیں۔ کل پھر آئیں گے۔ تب تک ٹھیک ہو جانا۔ ہیں؟

اور پھر بیمار آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ اگر غنودگی طاری ہو تو سو جاتا ہے۔ نہیں تو پڑھنا شروع کر دیتا ہے یا کسی اور دلچسپ شخص سے باتیں کرنے لگتا ہے ۔

جو نوجوان ہماری دیکھ بھال کر رہا تھا وہ بہت ہی حسین تھا۔ یہ بات ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں۔ اُسے دُہرا اس لئے رہے ہیں کہ وہ واقعی بہت حسین تھا۔ آخر ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے کہا۔

" تم بہت خوبصورت ہو ۔ امریکن نہیں ہو سکتے۔ کہاں کے باسی ہو ؟"
" شکریہ ۔ میں اطالوی ہوں "

ہمارا خیال صحیح ثابت ہوا۔ اطالوی واقعی دنیا کی سب سے خوبصورت قوم ہے۔ اس کا تجربہ ہمیں پہلے بھی ہو چکا تھا[1]

" تمہیں عورتوں کی دیکھ بھال کے لئے تو نہیں رکھا جاتا ؟"
" جی ہاں ۔ مجھے ایسی ڈیوٹی پر بھی لگاتے ہیں !
" وہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ عورتیں تو مرجاتی ہوں گی "
" جی نہیں ۔ میری ڈیوٹی صرف بوڑھی عورتوں کے ساتھ لگاتے ہیں۔ اور وہ میری دیکھ بھال میں جلد ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

ہمیں ہسپتال والوں کی یہ حکمت عملی پسند آئی۔ بوڑھی عورتیں ایسے نوجوان کو دیکھ کر اپنے اندر ایک بار پھر جینے کی خواہش پیدا ہوتی محسوس کرتی ہیں اور اسی خواہش کے ہوتے وہ پھر ٹھیک ہو جاتی ہیں۔

ہم واقعی بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کس وقت پھر سو گئے۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے کمرے میں واپس پہنچ چکے تھے۔ غالباً اگلا دن تھا۔

ڈاکٹر کولی ہمیں مبارکباد دینے آیا۔ ڈاکٹر ماتھر اور کئی اور ڈاکٹر اور ان کے مددگار بھی آئے۔ ایک ڈاکٹر نے بتلایا کہ ہمیں تین بائی پاس ہوئے ۔ " تین ؟ " ہمیں بہت حیرانی ہوئی۔ اس نے کہا کہ آپ کے خون کی گردش میں چار جگہ رکاوٹ تھی۔ لیکن چونکہ دو رکاوٹیں ایک ہی رگ میں تھیں۔ اس لئے اُن دونوں کو ملا کر ایک ہی بائی پاس کر دیا گیا۔ اس کو سن کر ہمارے

---

[1] اس موضوع پر ملاحظہ ہو، ہمارا مضمون " سفر گو یورپ "۔

منہ سے بے اختیار یہ شعر نکل گیا ؎

مصحفی ہم تو سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ڈاکٹر نے مزید کہا کہ " اگر آپ بروقت نہ آتے تو ایک سال کے اندر اندر آپ کا جنازہ اُٹھ سکتا تھا۔"
ہمیں یہ سُن کر تسلی ہوئی۔ مزید تشفی کیلئے ہم نے پوچھا۔ " اور اب؟"
اُس نے کہا۔ " اب آپ کسی بھی وقت سدھار سکتے ہیں۔"
ہم اُس کے مذاق پر ہنسے اور پھر پوچھا۔" کیوں۔ اور پھر اس آپریشن کا کیا فائدہ ہوا؟"
اُس نے ہمیں سمجھایا کہ " ہم نے آپ کی بیماری کا علاج نہیں کیا۔ صرف گردش میں جو رکاوٹیں تھیں، اُن کو دور کیا ہے۔ یہ رکاوٹیں دوبارہ بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔"
" تو اس کا مطلب ہے ہم آپ کے دائمی گاہک بن گئے۔"
" نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر آپ احتیاط برتیں تو بیماری پر قابو پایا جاسکتا ہے۔"
جہاں تک احتیاط اور پرہیز کا تعلق ہے ہم نے کہا کہ " پہلے سے زیادہ احتیاط اور پرہیز تو ہم کر نہیں سکتے۔ ہم اپنے معمولات میں نہایت محتاط تھے اور کھانا پینا بھی ناپ تول کے ہوتا تھا۔ ہم سیر بھی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ گویا ہم ایک آئیڈیل قسم کے شخص تھے۔"
" شائد آپ کو آئیڈیل بنے رہنے کی خواہش کی وجہ سے ٹینشن (Tension) تھی اور اسی وجہ سے یہ بیماری بھی۔"
اب اس کا کیا علاج ہے؟ نا جائے ماندن نہ پائے رفتن۔
ڈاکٹر نے ہمیں یہ کہہ کر دلا سا دیا کہ اس بیماری کیلئے غالبًا ہم ذمہ دار نہیں تھے۔ ہمارے والدین کی طرف سے اور خاندان کے مختلف افراد اور حتیٰ کہ بھائیوں کی طرف سے بھی سب اس روگ کا شکار ہو چکے تھے۔ گویا یہ بیماری ہمیں وراثت میں ملی تھی۔ ہم نے اس سرٹیفکیٹ کیلئے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔
اُس رات نرسوں نے ہمیں سونے نہیں دیا۔ ہر چند منٹوں کے بعد کسی نہ کسی ملک کی گوری، کالی، پیلی، نیلی (سوائے ہندوستان اور پاکستان کے) نرسیں آتیں۔ کوئی ہماری حرارت دیکھتی، تو کوئی خون کا دباؤ یا کوئی خون کا بہاؤ۔ اور کوئی صرف ہماری کلائی پکڑ کے چند منٹ کھڑے رہ کر مایوس ہو کر چلی جاتی۔ گویا " جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات " والا معاملہ تھا۔ صرف مقابلہ برابر کا نہیں تھا۔ ایک کا کئی ایک سے تھا۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ " مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔"
اگلے دن ڈاکٹروں اور نرسوں کا تانتا کچھ کم ہوگیا۔ ہسپانوی نرس آئی۔ اُس نے کہا، اُٹھیے تھوڑی سیر کیجئے۔ اور نہائیے۔ ہم نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔" تمہارا ہوش کی بات کرو۔ ابھی ہمارے آپریشن کو تین دن ہوئے ہیں۔ اور تم ہمیں سیر کرنے کہہ رہی ہو۔" اُس نے کہا" جی ہاں سیر سے آپ جلدی ٹھیک ہوں گے۔" نہانے کی صلاح پر ہم نے اُسے کہا " ابھی تو ہمارے زخم تازہ ہیں۔ ابھی کیسے نہا سکتے ہیں۔"
ہمارے انکار کرنے پر وہ ڈاکٹر کو بُلا لائی۔ ڈاکٹر نے بھی وہی بات دہرائی اور کہا کہ زخموں کیلئے پانی اور صابن مفید ہوتے ہیں

امریکہ کی ہر بات اُلٹی ہی ہے۔ ہندوستان میں تو زخموں پر پٹی باندھی جاتی ہے اور یہاں پانی چھڑکنے کو کہہ رہے ہیں۔

نرس پھر آئی اور کہنے لگی "چلیئے میں آپ کو نہلاتی ہوں"۔ ہم نے کہا کہ "ابھی ہم تمہارے ہاتھوں نہلائے جانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اگر یہی آفر چند دنوں کے بعد کرو تو ہم بخوشی قبول کرلیں گے"۔ وہ شرارت آمیز لہجے میں مسکرائی اور بولی "نہیں ابھی اور اسی وقت"۔ یہ کہہ کر وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں باتھ روم میں لے گئی۔ وہاں اس نے ٹب کے اندر پلاسٹک کی ایک کرسی رکھ دی۔ ہمارا چوغا اتارا۔ ہماری پیٹھ پر صابن ملا اور پھر صابن کی ٹکیہ ہمارے ہاتھ میں تھما کر بولی "اب باقی کا کام آپ خود کیجئے اور جب نہا چکیں تو مجھے بلا لیجئے میں آپ کے لیے نیا چوغا لے آؤں گی"۔

اس 'غسل صحت' کے بعد ڈاکٹروں اور نرسوں کی توجہ ہم پر اور بھی کم ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے تو آنا بالکل ہی کم کردیا۔ نرسیں بھی صرف دوائی دینے کے لیے آتی تھیں یا بلانے پر۔ ہم نے پوچھا "اس رویے کی کیا وجہ ہے۔ کیا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے"۔ ایک نرس نے بتایا کہ اب ہم روبہ صحت ہیں اور انھیں ہمارے علاوہ دوسرے کئی بیماروں کو بھی دیکھنا ہے۔

ہم نے پچھلے چار پانچ دن داڑھی نہیں بنائی تھی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے دو چار بار شیو کرنے کے لیے کہا۔ ایک نرس نے تو یہ بھی کہا کہ وہ ہماری شیو کرنے کو تیار ہے۔ ہم بیبلٹگت ٹالتے رہے۔ پانچویں دن ایک نرس بجلی کا شیوہ لے آئی اور ہمارے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اُس دن ہم نے بجلی سے شیو کیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو کافی صحت مند پایا۔

ڈاکٹر اور نرسیں روز آکر پوچھتیں کہ ہم نے آج کتنی سیر کی ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی بتلاتے کہ فلاں مریض نے تو روزانہ ایک میل تک سیر کرنی شروع کردی ہے۔ ہر کمرے کے باہر ایک چارٹ لگا ہوا تھا جس پر جتنی سیر بھی کوئی مریض کرتا اُس کا اندراج وہ خود یا اُس کا اٹینڈر کرتا۔ اس طرح مریضوں میں ایک طرح کا مقابلہ ہوجاتا۔ ہسپتال کی ہر منزل پر ایک کاریڈور تھی اور اُس کے چودہ چکر لگانے سے ایک میل بنتا تھا۔

ہم نے پہلی بار ایک چکر لگایا تو تھک گئے۔ کاریڈور میں ہر قوم کے ہر عمر کے اور ہر جنس کے سیر کرتے ہوئے ملے۔ کوئی اپنی بیوی، کوئی بیٹے اور کوئی نرس کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ کئی سینئر مریض بغیر کسی سہارے کے سیر کرتے دیکھے جاسکتے تھے۔ جب بھی کسی مریض یا عملہ کے کسی ممبر کا سامنا ہوتا تھا تو اُسے سلام کیا جاتا۔ دوسری چکر میں سامنا ہونے پر صرف مسکرا کر 'ہائے' کہا جاتا۔ اس طرح سیر کرنے میں جسمانی تھکان سے زیادہ بار بار مسکرانے کی وجہ سے منہ اور چہرے کی تھکان زیادہ محسوس ہوئی۔ ہم نے وہاں بے شمار قسم کی نئی نئی بیماریوں سے بھی جانکاری حاصل کرلی۔ تیسرے دن ہی ہم نے ایک میل سیر کرلی اور ہر روز فاصلہ بڑھاتے گئے حتیٰ کہ ایک دن ایک نرس آئی اور کہنے لگی آپ اپنی سیر ذرا کم کردیں کیونکہ اسپتال میں دوسرے مریضوں کو بھی سیر کرنے کے لیے جگہ چاہیئے"۔

ہاں! یہ بتانا تو ہم بھول ہی گئے کہ آپریشن کے بعد ہمیں بہت ہی اچھا کھانا دیا جاتا۔ لیکن ہمیں اُس کی طرف دیکھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ چار یا پانچ دن تک نرسوں اور ڈاکٹروں نے ہمیں ہر قسم کی ترغیب دی

لیکن ہم کھانے کی طرف راغب نہ ہوسکے۔ ہم اور بیگم دونوں مل کر بھی اُسے ختم نہ کر پاتے۔ ہسپتال والے ہمیں پوچھتے کہ ہمیں کیا پسند ہے؟ اور ہم جس کھانے کا بھی نام لیتے وہ فوراً مہیا کر دیتے لیکن اُس کو دیکھتے ہی ہماری ساری بھوک مر جاتی۔ یہ امیری کی نشانی ہوتی ہے۔ خیر آہستہ آہستہ ہم غربت کی طرف لوٹ آئے اور ہمیں بھوک لگنا بھی شروع ہو گئی۔

نویں دن ڈاکٹروں کا ایک قافلہ ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ ہمارا معائنہ کیا گیا اور پھر ڈاکٹر ناصر نے کہا "کل آپ کو ڈسچارج کیا جائے گا۔ آپ نے بڑی اچھی ترقی کی ہے۔ آپ ایک ہفتہ ہسپتال کے باہر رہیں اور اس کے بعد آپ کا ایک اور معائنہ کیا جائے گا۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔

اُس کے جانے کے بعد ایک بھاری بھرکم اسسٹنٹ آئی اور اُس نے ہمیں ہمارے بارے میں بہت کچھ بتایا اور ہمیں کئی قسم کی ہدایتیں دیں۔ سب سے پہلے اُس نے بتایا کہ ہمارے دل کا پٹھا (مَسَل) مضبوط تھا۔ اس لیے آپریشن میں آسانی رہی۔ ہم نے کہا یہ کیا بات ہوئی کہ دل کمزور اور دل کا پٹھا مضبوط!" وہ مسکرا کے بولی "نہیں آپ کا دل بھی مضبوط ہے صرف رگیں اُس کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھیں۔"

اس نے چھ تا آٹھ ہفتے تک کوئی بوجھ نہ اٹھانے کی ہدایت کی کیونکہ سینہ کی اگلی ہڈی جو کاٹی گئی تھی پھر ٹوٹ سکتی ہے۔

آج ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ہماری ہڈی چیری گئی تھی۔ یہ سنتے ہی ہم بے ہوش ہونے لگے۔

چھ تا آٹھ ہفتے تک کار نہ چلانے کی تاکید کی گئی کہ اس سے بھی سینہ کی ہڈی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ گوشت کھانا کم کر دو۔ لال گوشت بالکل ترک کر دو اور صرف سفید گوشت یعنی مرغی اور مچھلی کا گوشت کھائیے ــــ اعتدال کے ساتھ شراب بھی پیو۔ اُس نے پھر مسکرا کر کہا۔ نہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ شراب پئیں لیکن اگر پینا چاہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔

آپ کے سسٹم میں لوہے کی کمی ہے۔ اس لیے ایک مہینے تک لوہے کی گولیاں کھائیے۔

ہم نے کہا کہ ہمارے دانت اِتنے مضبوط نہیں کہ لوہے کی گولیاں چبا سکیں۔ وہ مسکرائی اور بولی آپ اُن کو پانی یا دودھ کے ساتھ نگل جائیے۔

ہم نے پوچھا کیا آپ ہمیں اگلی بار پیٹ کے آپریشن کے لیے یہاں بلوانا چاہتی ہیں۔

اُس نے ہمارے سوالات اور اعتراضات پر قدرے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں اگنور کر دیا۔

پھر اُس نے اپنے ہاتھ میں کاغذوں کے پلندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ سیر جاری رکھیئے۔ بلکہ اُس کو بتدریج تھوڑا تھوڑا بڑھاتے جائیے۔ سیر دنیا کی بہترین ورزش ہے۔

ہم نے پوچھا "سویرے یا شام کی؟"

"کسی بھی وقت۔"

جی ہاں۔" اور پھر خود ہی اضافہ کیا۔ "اگر آپ چاہیں تو دوپہر کو بھی سیر کر سکتے ہیں یا آدھی رات کو بھی۔ ضروری نکتہ یہ ہے کہ سیر ہونی چاہیئے۔"

ہم نے کہا "ہم نے یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کہ شام کی سیر تو ہم برسوں سے کر رہے ہیں۔ اُن کے

بالآخر یہ بیماری ہوگئی تو ظاہر ہے ہمارے سیر کے وقت میں کوئی نقص ہے۔ ہمارے کئی دوست جو اصولاً سیر کے خلاف ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہماری سیر ہی ہماری بیماری ہے۔ اس بیماری کے بعد تو واقعی ہم اُن کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے" اُس نے کہا اگر آپ کو اپنا منہ دکھاتے میں کچھ تامل ہے تو بہتر ہے۔ آپ سویرے تڑکے سیر پر جائیں۔ اس وقت لوگ پہچان نہیں پاتے اور خود بھی اپنا منہ چھپاتے پھرتے ہیں" امریکیوں اور ہندوستانیوں کی اس معاملہ میں یکسانیت کے بارے میں جان کر ہمیں خوشی ہوئی۔ ہم ضرور اپنی حکومت کو اس کے متعلق ایک رپورٹ بھیجیں گے تاکہ مستقبل میں لیڈروں کی تقاریر میں جب اتفاق اور تفرلق کے نکتے گنوائے جائیں تو وزن بڑھانے میں مدد کرے۔۔۔ دنیا کی دو سب سے بڑی جمہوریتیں، جہاں عوام کو مکمل شخصی آزادی حاصل ہے۔ جہاں صحافت آزاد ہے۔ جہاں عوام میں مذہب، زبان اور فرقے کی بناء پر کوئی تفرلق نہیں کی جاتی۔۔۔ جہاں وہ لوگ جو دوسروں سے اپنا منہ چھپانا چاہتے ہیں، تڑکے سیر کو جاتے ہیں۔۔۔ جہاں۔۔۔ جہاں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُس نے ہمارے خیالات کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

"مرغن اشیاء سے پرہیز کریں"

ہم نے کہا یہ تو ہماری عادت ہے۔

اپنا نارمل کام آہستہ آہستہ شروع کریں اور بیچ میں آرام کریں"

ہم نے کہا "عین مناسب۔ بہتر ہوگا کہ ان ہدایات کی ایک کاپی حکومت کو بھی بھیج دی جائے"

"کوئی بات دل کو نہ لگا بیٹھیں" اور رُک کر کہا۔ "آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

ہم نے کہا "بغیر پوچھے ہی آپ نے اِتنا کچھ بتا دیا۔ اب اور کیا رہ گیا؟"

پھر اُس نے بیگم کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداع کہا۔

بیگم نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔

"ان کے ازدواجی فرائض۔۔۔"

اُس نے بات کاٹتے ہوئے شرارت بھری نگاہ سے ہماری طرف دیکھ کے کہا۔

"جب بھی یہ چاہیں"

شگوفہ پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر لئیق صلاح کی ایک اور تحقیقی کتاب!

عہدِ ارسطو جاہ

علمی ادبی کارنامے شائع ہو چکی ہے۔

دفتر شگوفہ سے حاصل کی جا سکتی ہے

مقدمہ: پروفیسر سیدہ جعفر، ضخامت: ۵۵۶، قیمت: ۵۰ روپے

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

شائستگی کے ساتھ

اخلاقی دور ختم ہے اب اس صدی کے ساتھ
اکیسویں گزاریئے داداگری کے ساتھ
داداگری بھی چاہیئے دانشوری کے ساتھ
آپس میں ہاتھ دیجیئے شائستگی کے ساتھ
پہلے کسی کے ساتھ تھے اب ہیں کسی کے ساتھ
پکچر میں تھے نواب نئی پھلجھڑی کے ساتھ
تقدیر اپنی جڑ گئی اک سرپھری کے ساتھ
ویسے گزر رہی ہے مگر کرکری کے ساتھ
بخشا ہوا ہے کوئی تو ہے کوئی نمبری
ہر آدمی کی بات ہے ہر آدمی کے ساتھ
بھائی سے ایسی ویسی توقع نہیں مگر
ہنس ہنس کے بات کرتے ہیں گلزاری کے ساتھ
پکچر کا بھوت جن کے سروں پر سوار ہے
وہ خواب میں بھی رہتے ہیں فلمی پری کے ساتھ

بس آئی وہ سوار ہوئے اور چل دیئے
فرہاد ٹاپتا ہی رہا بے بسی کے ساتھ
پکچر میں نانی اور نواسی تھے ایک ساتھ
ہوتی ہے زرد گھاس بھی اکثر ہری کے ساتھ
نوشہ نے لونا مانگی ہے باوا کے واسطے
ہے کار کا سوال بھی بارہ دری کے ساتھ
دل میں برائی اور بظاہر ہے دوستی
پیوند دشمنی کا لگا دوستی کے ساتھ
سائے سے تاڑ کے کوئی پاتا نہیں ہے فیض
اُمید باندھیئے نہ بڑے آدمی کے ساتھ
تیار مال بیچتا ہوں تیمناً حضور
خدمت ادب کی کرتا ہوں سوداگری کے ساتھ
چربے چرا کے لوگوں کے مفہوم مار کر
تو نے ظریف جبر کیا شاعری کے ساتھ

ظفر کمالی
(پٹنہ)

غزل

چار سو چھایا ہوا ہے بس تعصب کا دھواں
زندگی بھر دوسروں کے سامنے کھودا کیا؛
ہر برس ہوگی ولادت یہ خدا کی دین ہے
دم بہ دم کم ہوتے جاتے ہیں تمازی اے ظفر

اے دلِ ناداں بتا جاؤں تو میں جاؤں کہاں!
چیختا کیوں ہے کھدا ہے تیرے آگے جب کنواں
کر رہا ہے تو کرے فاقوں پہ فاقے خانداں
لاؤڈ اسپیکر سے گرچہ ہو رہی ہے اب اذاں

سرور جمال
(سیوان بہار)

دانش وری کی تلاش میں!

حق تو یہ ہے کہ انسان غلطیوں کا نہیں بلکہ
تلاش و جستجو کا پتلا ہے۔ کچھ نہیں ہمسایوں کی ٹوہ لینا ہی سہی۔ سوال
ہوسکتا ہے کہ تلاشِ دانش وری ہی کیوں تلاشِ دانش وراں کیوں نہیں۔ عرض ہے کہ ڈیمانڈ
وسپلائی کے اصول کو سامنے رکھیے جواب خود ہی مل جائے گا سچ تو یہ ہے کہ دانش وری کی تلاش
صدیوں سے چلی آرہی ہے اور اس کی تلاش میں بڑے بڑے علمائے کرام اور دانش ورانِ زمانہ جنھیں
عرفِ عام میں انٹلکچوئل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سرگرم عمل ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تلاشِ دانشوری میں سیمینار و عالمی
کانفرنس تک برپا کرنے سے باز نہیں آتے ـــــ دراصل اب وہ بھی اس بات کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں کہ دانش وہ تھا
اور بات ہے اور دانش وری چیزے دیگراست۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سقراط بے قصور ہونے کے باوجود زہر کا پیالہ ہنستے ہوئے
نہ پی لیتا۔ اور مشہور و معروف انٹلکچوئلس خریداری کرتے ہوئے دوکاندار کی لوٹائی ہوئی رقم بار بار گننے کے باوجود صحیح حساب
نہ لگا سکتے ـــــ کیا آپ برنارڈ شا کی دانش وری کے قائل نہ ہوں گے کہ اس نے ایک خوبصورت لیکن عقل سے عاری
خاتون کی شادی کی پیش کش کس حکمت سے رد کردی ـــــ کبھی کبھی تو انسان بالکل چکرا کر رہ جاتا ہے کیونکہ اس
کے نزدیک یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ جناب محمد فاضل بی۔ ایس سی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہم کو زیادہ دانشور
مانیں۔ یا ان کی تقریباً ناخواندہ اور ناقص العقل بیگم کو۔ کیونکہ ان کے قریبی پڑوسیوں کی عین شہادت ہے کہ جناب
محمد فاضل ہمہ وقت قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھانے کے بجائے صرف غم کھاتے رہتے ہیں۔ اس کا یہ
مطلب ہرگز نہیں کہ وہ حکام کے ساتھ ڈنر کھانا پسند نہیں کرتے بلکہ یہ زمانہ کی الٹی چال کا قصور ہے کہ اب
حکام ہی ایسے نکتہ رس نہیں پائے جاتے جیسا کہ اکبرالہ آبادی کے زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ لہٰذا اب
عوام کو لیڈری چلانے میں خاصی دشواریاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ ہاں تو بات قوم کے غم کی تھی۔
جناب محمد فاضل نے قوم کی اصلاح کے غم کو اپنے اندر بالکل مدغم کرلیا ہے اور
ان کی اصلاح کے لیے انہوں نے تربیت الاخلاق طریقہ کار
کو اختیار کر رکھا ہے۔

اور ہمیشہ ایسے مضامین لکھنے میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں جو روح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ منظرِ عام نے اب تک ان مضامین کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تو صاحبو! و صاحبات! محمد فاضل اپنے جوشیلے مضامین لکھنے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ اپنے بچوں کا غم بھول چکے ہیں۔ ان کے سامنے قوم کے لیے حساب بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہے۔ جو انہیں ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔ اپنے بچوں کی فیس کی مانگ انہیں بے وقت کی شہنائی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بھلا ہو ان کی کم عقل بیگم کا کہ وہ صرف اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور فیس کا خیال رکھتے ہوئے ان کے غم کے سمندر میں ان قطروں کو بھی ملا دیتی ہیں۔ اور اس طرح محمد فاضل بی۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی کی قوم کی ناؤ کو پار لگانے میں مدد دیتی رہتی ہیں۔

اور ہمیں تو دو دانشوروں کا وہ حالیہ واقعہ نہیں بھولتا۔

"ایک سیمینار میں شریک دو دانش وروں نے مصروفیت کی بناء پر سیمینار کے دوران ہی واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ اور سیمینار کے بعد والے تفریحی پروگراموں کو کٹ کیا۔ اگرچہ دوسرا دانشور جو دانشور نمبر ا کے مقابلہ میں دانشوری کی حیثیت سے نسبتاً کم تھا اس بات پر بضد تھا کہ تفریحی پروگراموں کے بعد واپسی کا پروگرام بنائیں لیکن دانشور نمبر ا بالکل تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ڈنر کے پہلے ہی دونوں روانہ ہوگئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد حاضرین نے دیکھا کہ دونوں لڑتے جھگڑتے۔ ایک دوسرے پر الزام لگاتے چلے آرہے ہیں۔ دونوں کے منہ سے کف جاری ہے، مٹھیاں بھینچی ہوئی مکے ہوا میں لہراتے ہوئے گویا سیمینار میں زیرِ بحث موضوع پر بحث جاری و ساری ہے۔ پتہ چلا دانش مندی نہیں کچھ کجی آگئی ہے۔ دانش ور نمبر ا کو ریزرویشن کی صحیح تاریخ یاد نہیں رہی جس کی وجہ سے محض ایک دن کا فرق پڑ گیا جس کے نتیجے میں دونوں دانش ور پورے چوبیس گھنٹے پہلے اسٹیشن پر پہنچ کر تقریباً ایک گھنٹہ تک سیٹ کے نمبر تلاش کرنے میں سرگرداں رہے۔

دانش وری کی ایک بے نظیر مثال ہمیں پچھلے دنوں ملی کہ ہمارا ایک دانش ور ملک کا مشہور و معروف انٹلکچوئل قبیل کا شاعر اپنی بیمار بچی کی دوا کے لیے بیوی کی آخری جمع کی ہوئی پونجی کو لے کر گھر سے چلا راستہ میں رگِ دانشوری پھڑکی شفا خانے کے بجائے مے خانے کا رُخ کیا ساری رات اہلِ علم و دانش کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ صبح ہوئی۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کی اکلوتی پونجی بڑی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکی تھی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دانش وری اور سوشل کنٹکٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ چند دانشمندوں کا کہنا ہے کہ سوشل کنٹکٹ تو ہمارے انٹلکچوئلس کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جس انٹلکچوئل کا سوشل کنٹکٹ SOCIAL CONTACT۔ جتنا وسیع ہوگا اس کی دانش وری اتنی ہی بڑھے گی۔ چنانچہ سوشل کنٹکٹ بڑھانے کا ایک آسان طریقہ یہ نکالا گیا ہے کہ ہر مشاعرہ، ہر کانفرنس، ہر سیمینار حتیٰ کہ چھوٹی موٹی میٹنگ و جلسہ کے بعد بڑی بڑی دعوتیں ہوتی ہیں۔ تاکہ ہمارے دانش وروں کا سوشل کنٹکٹ وسیع ہو۔ لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ ان دعوتوں اور پارٹیوں میں اہلِ دانش و بینش پارے کی طرح ادھر سے اُدھر پھسلتے رہتے ہیں۔ کرسیاں اور ساتھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ اصولِ سوشل کنٹکٹ میں اوّل و آخر یہی اصول آتا ہے کہ اپنوں سے بیگانگی اور غیروں سے یگانگت اختیار کرو۔ چنانچہ اس اصول پر عمل کرنے والا ہمیشہ فائدہ میں رہتا ہے اور اس کو توڑنے والا ہمیشہ گھاٹے میں کہ بالکل اپنوں میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جو ڈھونڈے وہ پاتا ہے یعنی کہ جب ہم دانش وری کی تلاش میں سرگرداں ہو ہی گئے تو تازہ بہ تازہ دانش وریاں ہمارے سامنے آنے لگیں۔ گزشتہ ہفتہ کی بات ہے کہ ہمارے ایک عزیز ملک کے بڑے ادیب و دانش ور ہمارے یہاں بپھرے ہوئے پہنچے۔ بے حد گرم آپے سے نہیں بلکہ جامے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی اور گرم چائے سے انہیں آپے کے اندر لایا گیا۔ پرسشِ احوال پر پتہ چلا کہ فلاں بک ڈپو سے چلے آ رہے ہیں۔ وہاں جو نقشہ اُنہوں نے وہاں دیکھا وہ عبرت ناک و قیامت خیز ہی نہیں بلکہ ناقابلِ بیان ہے۔ خیر صاحب انہیں سمجھا بجھا کر قابلِ بیان بنایا گیا۔ اب ان کا بیان جو نکلا تو اس کا لب لباب یہ تھا کہ جو کتاب انہوں نے بصد خلوص و محبت جناب و ضاحت جھیلوی کو پیش کی تھی وہ فلاں بک ڈپو میں برائے فروخت پائی گئی۔ ہمارے عزیز دانش ور کا پارہ اس لیے پائی نہیں تھا کہ انہوں نے ان کی نذر کی ہوئی کتاب بیچ ڈالی بلکہ اس بات پر تھا کہ کتاب کے اوراق جوں کے توں یوں ہی بند پڑے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے دوست کی کورذوقی پہ فاتحہ پڑھتے ہوئے اپنی کتاب سیکنڈ ہینڈ قیمت پر خرید لائے۔

مجھے اپنے اس عزیز دانش ور کی اس معصومیت پر ہنسی نہیں بلکہ رونا آیا کہ تم وہیں پر رہے اور زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ اب اس غفلت کی نیند پڑے دانش ور کو کون سمجھائے کہ یہ بھی ایک دانشورانہ کام ہے۔ اور صاحبو و صاحبان ہم اپنے عزیز دانش ور کا دل یہ کہہ کر بھی نہیں توڑ سکتے کہ ہمارے اہلِ قلم دانش وروں کا یہ ٹریڈ سیکرٹ قسم کی بالائی آمدنی ہے جن کے جملہ حقوق ان کے نام محفوظ ہیں۔ ان ہدیۂ تبریک، بصد خلوص، بصد احترام، از راہ محبت، برائے مطالعہ و ملاحظہ، نیک تمناؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ پیش کی گئی تخلیقات پر انہیں اور تو کچھ کرنا نہیں پڑتا بس اپنے نام کے اُوپر روشنائی کی ایک لکیر کھینچ کر صرف اپنے اور صاحبِ تخلیق کی محبت و خلوص کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دینا پڑتا ہے۔

ہمارے ایک دانش ور نے تو یہاں تک بتایا کہ جب کتابوں کو پیش کرنے والا خود ہی لکھ کر دیتا ہے کہ "برائے نقد و تبصرہ" تو بھلا اس کے وسیلہ سے کچھ "نقد" حاصل کر لینا کہاں تک خلاف دانش وری ہے۔ ان کی اس دانش وری پر ہم یوں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ع

"پیسہ تو کما کھائے کسی طور دانش ور"

ہاں ایسے موقعوں پر اکبرؔ الہ آبادی کی یاد ضرور آجاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو کس محبت اور خلوص کے ساتھ لنگڑے آموں کا پارسل لاہور بھیجتے ہیں۔ اور جب علامہ اقبال کا شکریہ کا خط آتا ہے تو آموں کے بخیریت لاہور پہنچنے پر کیسا خوش ہو کر لکھتے ہیں۔

اثر یہ تیرے انفاس مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہونچا

ایک خاتون، ڈاکٹر صاحب کے پاس آئیں اور بولیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد ہے ایک ماہ پہلے جب میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو آپ نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کیا تھا تو اب میری ٹانگ بالکل ٹھیک ہے کیا اب میں سیڑھیاں چڑھ سکتی ہوں؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "جی بالکل چڑھ سکتی ہیں"

اس پر خاتون بولیں۔ "شکر ہے ویسے بھی گندے پانی کے پائپ سے اُوپر چڑھ چڑھ کر میں تنگ آ چکی تھی"

فینانس منسٹر

رشید عبدالسمیع جلیل

نئی اسکیم پر ظاہر کرے پیسے کی مجبوری
غنیمت ہے اگر دے ففٹی پرسنٹ پر بھی منظوری
تناسب خرچ کا نامُد ہو انکم سے تو بس دوری
رکھے انداز جمہوری کرے ہر بات دستوری

بڑھائے ٹیکس سالانہ غریبوں کی امیری پر
گھٹائے ٹیکس سالانہ امیروں کی فقیری پر

تصوّر میں مسلسل اک حسابی دائرہ ہوگا!
کریڈٹ اور ڈیبٹ کا بھی ہمیشہ تذکرہ ہوگا!
کوئی پے منٹ ہو جب ہیوی کٹنگ کا شوشہ ہوگا!
نہ آڈٹ میں نہ اخباروں میں جس پر تبصرہ ہوگا!

پلاننگ کا وہ بتلائے اوریجنل نکسٹ ٹو سی. ایم
نہیں بے جا اگر سمجھیں کہ ہی از نکسٹ ٹو سی. ایم

خزانہ اس کو ملتا ہے نکالے جو دِوالہ بھی
کبھی مسجد کو دے چندہ بنائے دھرم شالہ بھی
نہیں آتی اگر تقریر لکھوائے مقالہ بھی
کرے وہ کام جس میں ہو کوئی گڑبڑ گھٹالہ بھی

کسی جمہوریت میں جب بنا پرجا کا ہے راجہ
ضرورت پر بجادے جو حکومت ہی کا بینڈ باجہ

خزانہ کاغذی گھوڑوں پہ لدوا کر کرے اعلان
کئی خفیہ گڑھے رستے میں کھدوا کر چلے انجان
اٹھائے ہر قدم ایسا کہ پیدا ہو کوئی بحران
حکومت اور پبلک کے خطا ہو جائیں بس اوسان

جھلستی، چلچلاتی دھوپ میں شب گشت پر نکلے
قلمدانِ وزارت بھی علیحدہ طشت پہ نکلے

عموماً ہر بجٹ سیشن میں سیونگ لازمی کردے
پرانی لائبلیٹی ہو تو بائیں ہاتھ سے دھر دے
اگر ایسٹس ہوں غائب فریزنگ کا بھی آرڈر دے
اور اپنے پیشرو کے سابقہ سوراخ سب بھر دے

خسارہ جب زیادہ ہو بجٹ کا بیچ دے کم کم
اگر ہو سرپلس انکم تو فیگر کھینچ دے کم کم

ڈاکٹر حبیب ضیاء
(حیدرآباد)

ہ ل م ٹ

ہلمٹ کب، کیوں اور کس نے بنائی یہ تحقیق طلب موضوع ہے۔ کونسے ممالک میں لازمی ہے اور کونسے ممالک میں اختیاری، اس بات کا سروے بھی کوئی ریسرچ اسکالر ٹھیک ڈھنگ سے کرسکتا ہے حیدرآباد میں بہت دنوں کی خاموشی کے بعد ہلمٹ نے پھر دھوم مچائی۔ جن لوگوں کے پاس پرانی نہیں تھی ان میں سے چند نے فوراً خرید لی اور چند لوگوں نے اس کے لزوم کی تاریخ آنے تک مختلف طریقوں سے پولیس والوں کو مصروف رکھا۔ پھر سروں کے مقابلے میں ہلمٹس کا تناسب بڑھ گیا۔ ذات پات، مذہب فرقہ چھوٹے بڑے غرض کہ من و تو کا فرق مٹ گیا۔ لوگ بے اختیار کہہ اُٹھے ؎

ہندو مسلم اور عیسائی + لگتے ہیں سب بھائی بھائی

کبھی ایسا ہوا کہ ہلمٹ کی آڑ میں ایک شخص نے دن دھاڑے کسی سے ہزاروں کی رقم چھین لی اور فرار ہوگیا۔ خبر چھپ گئی کہ پولیس کو اس ہلمٹ والے اسکوٹر سوار کی تلاش ہے۔ ہلمٹ اُتار پھینکنے کے بعد بھلا وہ کیسے ہاتھ لگ سکتا ہے!

ہلمٹ کے لزوم سے پہلے ترغیبی مہم کا زور وشور سے چرچا تھا۔ مختلف سروں پر مختلف طریقوں سے ہلمٹ چڑھائی جارہی تھی۔ کھلے سروں کو روک کر ایک ذمہ دار شخص کہہ رہا تھا۔ بہن لو میرے بھیا ہلمٹ! یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سودے سلف کے کام آتی ہے۔ پیچھے بیٹھی ہوئی بیوی کی بک بک اور اس کی فرمائشوں سے بچاتی ہے۔ راستے میں موقع پڑے تو بچوں کو بھی فراغت دلاتی ہے اور دعوتوں میں تو اس کا بالکل صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ہلمٹ کا سب سے بڑا فائدہ یہ بتایا جاتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہوجائے تو سر سے ٹل جاتا ہے۔ اسکوٹر لاکھ احتیاط سے چلائے، پیچھے سے ٹکر مارنے والے بس یا لاری ڈرائیور کو کون روک سکتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ لاری موٹر کو مارتی ہے موٹر آٹو کو اور آٹو اسکوٹر کو۔ پیدل چلنے والوں کے لیے کسی کا اجارہ نہیں، انھیں کوئی بھی مار سکتا ہے۔ اس لیے ہلمٹ کا لزوم تو سب سے پہلے پیدل چلنے والوں ہی کے لیے ہونا چاہیے۔

کچھ دن ایسے بھی گزرے کہ ہلمٹ موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی لازمی نہیں کی گئی تھی۔ مختلف گوشوں سے اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔ نت نئے انداز سے احتجاج کیا جارہا تھا۔ ایک دن اخبار میں لکھا دیکھا کہ اسکوٹر راں ۲۰ ستمبر ۸۶ء کو پگڑیاں باندھ کر "بصیرت کے فقدان کا دن" منانے والے ہیں۔ ہم خوش ہوگئے کہ رنگ ریزوں کا بھلا ہوگا۔ رنگ برنگی

پگڑیاں سڑکوں پر اچھلتی نظر آئیں گی۔ ۳۰ ستمبر گزر گیا، بڑی مایوسی ہوئی اس لیے کہ اس دن صرف نو ہی افراد گرفتار کیے گئے۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ لوگ پگڑیوں پر لیمپ جلا دیں اور اسی قسم کی کچھ چیزیں رکھ لیتے تو گرفتاری کی آفت سر سے ٹل جاتی۔

ہلمٹ لازم ہوئی تو کچھ دن شور رہا کہ مخصوص نشان والی ہلمٹ ہی پہنی چاہیئے دوسری ہلمٹس کو شمار نہیں کیا جا رہا تھا۔ لوگوں نے حسبِ دستور احتجاج کیا کہ مخصوص نشان والی ہلمٹ کا لزوم کیوں تو پتہ چلا کہ کسی ایم والے منسٹر نے اپنے سالے کے بیروزگار بہنوائی کو روزگار سے لگایا تھا۔ چند برسوں سے ہلمٹ کو کتا بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ یکایک زمانے نے پلٹا کھایا، پولیس حرکت میں لائی گئی جرمانے کا خیال آیا تو ایک صاحب نے صبح آفس جانے سے پہلے بیوی کو آواز دی "سنو! جلدی سے میری ہلمٹ تو دینا"۔ بیوی نے کہا "آپ بڑے بے رحم ہیں، ترس کھائیے ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر"۔ شوہر سٹ پٹا گئے۔ بولے "میں نہ صرف بچوں پر رحم کھا رہا ہوں بلکہ تمہیں بھی دل و جان سے چاہتا ہوں اسی لیے تو ہلمٹ مانگ رہا ہوں"۔ بیوی نے وضاحت کی "آپ کی عقل ماری گئی ہے، میں ان چوہے کے بچوں کی بات کر رہی ہوں جو آپ کی ہلمٹ میں پروان چڑھ رہے ہیں، بڑے پیارے بچے ہیں، چھلّہ نہ سہی کم از کم چھٹی تو ہو جانے دیجیے"۔

مختلف چیزوں کے بکنے کے مخصوص مقام ہوتے ہیں، مخصوص دکانیں ہوتی ہیں، جیسے مہذب گھروں کے لڑکے دولت مند گھرانوں میں بکتے ہیں، غریب اور مجبور لڑکیاں سعودی عرب میں بکتی ہیں، لیکن ہلمٹ کے بکنے کی کوئی مخصوص دکان نہیں۔ اسپورٹس کی دکان، پرس اور سوٹ کیس کی دکان، کھلونے کی دکان، کرانہ کی دکان، یہاں تک کہ ہلمٹ کی دکان پر بھی ہلمٹ فروخت ہو رہی ہے۔ ایک کرانہ کی دکان پر پلاسٹک کی پاکٹوں میں کچھ چیزیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک بچہ دکان پر آیا ایک پاکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "پچیس پیسے کے تِل کے لڈو دو"۔ دکان والے نے اپنی ہتک محسوس کی۔ غصہ سے کہنے لگا "یہ کھو کھلا لڈو تمہارے کھانے کے لیے نہیں، تمہارے باپ کے سر کو بچانے کے لیے ہے"۔

جس طرح آٹو، سیکل رکشا اور لاریوں کے پیچھے مختلف قسم کے معنی خیز بلکہ ذومعنی اشعار لکھے ہوتے ہیں اسی طرح آج کل ہلمٹ بنانے اور بیچنے والی مختلف کمپنیوں اور ایجنسیوں نے دکانوں پر مختلف اشعار لکھوا رکھے ہیں۔ ایک صاحب دو تین مرتبہ پولیس والوں سے آنکھ مچولی کرنے اور چالان دینے کے بعد ہار مان کر ہلمٹ کی دکان پہنچے۔ ہلمٹس کے سامنے اِملا کی بے شمار غلطیوں میں ڈوبا ہوا یہ شعر لکھا تھا۔

میرا وقت مقرر ہے وقت پہ لینے آؤں گی ÷ ہلمٹ پہنو یا نہ پہنو ساتھ تمہیں لے جاؤں گی

اس شعر سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ جھٹ سے ایک سرخ رنگ کی ہلمٹ خرید کر پہن لی۔ آئینے میں اپنے چہرے کو پڑھا۔ جلی حرفوں میں لکھا تھا "لیطڑھا بندر"۔ اس بات کی انھوں نے مطلق پرواہ نہ کی۔ ان کی ساری توجہ دل کو چھو لینے والے اس شعر پر تھی۔ ادھیڑ پن میں کسی غیر خاتون کی طرف سے یہ پہلا بلاوہ تھا۔ واہ واہ کہتے ہوئے دکاندار سے پوچھا "بڑی اچھی شاعرہ ہیں، کیا تخلص کرتی ہیں"؟ جواب ملا "موت"!

ایک ملازم سرکار اپنے تین بچوں اور بڑی بیوی کو روزانہ اسکوٹر پر بٹھا کر اسکول اور آفس کو چھوڑتے ہیں۔ چھوٹی نان میٹرک بیوی امورِ خانہ داری انجام دیتی ہے۔ اچھے خاصے سر پر لوہے کا شیٹ دیکھ کر بچے نے

سوال کیا: "ڈیڈی! آپ یہ کالی ٹوپ کیوں پہننے لگے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "پولیس والوں کا کہنا ہے کہ اسکوٹر سے گروں گا تو میرا سر محفوظ رہے گا۔" بچے کا سوال تھا "ہمارے سر دل کا کیا ہوگا ڈیڈی؟"

ویسے ہلمٹ ہے بڑے کام کی چیز ہمارا شعور ذرا سا بھی بیدار ہو جائے تو اس سے بہت سے بامقصد کام لیے جا سکتے ہیں۔ سر پر ہو تو اوندھی، اتار کر پلٹا دیں تو کاسہ بن جاتی ہے۔ اردو کے جلسوں میں اس کا صحیح استعمال ہو سکتا ہے۔ ایسے معزز حضرات جو بڑے فخر سے اردو کو مادری زبان کہتے ہیں، بڑے بڑے جلسے منعقد کر کے حکومت سے اس کی ناانصافی کا دھکڑا روتے ہیں، اس زبان کے ختم ہو جانے کا مصنوعی اور پیشگی غم کرتے ہیں، ان کے سامنے یہ کاسہ پھیلا کر کہتی ہوں کہ وہ خدا کے لیے کبھی یہ بات زبان پر نہ لائیں کہ اردو ختم ہو رہی ہے۔ اس کی بجائے وہ اپنے گریباں کی طرف نظر کریں۔ ان کا بچہ اگر "فنٹی ٹو" کا ترجمہ "بامن" کر سکتا ہے تو میں یقین دلاتی ہوں کہ اردو زبان کبھی ختم نہ ہوگی۔

ہلمٹ کے بارے میں یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہلمٹ متعلقہ عہدیداروں کی فرض شناسی کی ایک علامت ہے۔ اس کے لزوم میں کتنی صداقت، کتنی سنجیدگی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جب ہوڈا یا چالان کیا اور جب جی چاہا انجان ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ چالان کرنا ہی ٹھیرا تو اُن لاریوں کو کریں جو رات دن سڑکوں پر دھوئیں کے بادل بکھیر کر دندناتی چلی جاتی ہیں۔ لوہے کی خطرناک سلاخوں سے بھری اُن گاڑیوں کو روکیں جو کبھی بھی لمحہ کسی راہرو کی زندگی کو موت سے بدل دیتی ہیں۔

ہلمٹ جی کا جنجال ہے۔ اکثر لوگ پہننے کے بجائے اسکوٹر پر ٹانگ رہے ہیں یا بیوی کے ہاتھ میں تھما رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استعمال میں سلامتی کا تصور کم اور جرمانے کا خوف زیادہ ہے۔ بعض صاحبین سفید پوشاک اور سفید ہلمٹ دیکھتے ہی ٹریفک پولیس کا شبہ کر کے اپنے چکنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اولوں کے خیال سے اسکوٹر کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ وقتی طور پر اپنے آپ کو بچا کر خوش ہوتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سڑک کے کھڈے انھیں صحیح سلامت نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اگر ایماندار عہدہ داروں کی نگرانی میں سڑکیں بن جائیں، عوام سڑک کا صحیح استعمال کرنے لگیں تو پھر انشاء اللہ نہ پیدل چلنے والوں کو ہلمٹ کی ضرورت ہوگی نہ اسکوٹر سواروں کو۔ اب رہا ہلمٹ بنانے والوں کے روزگار کا مسئلہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ خدا رزاق ہے۔ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

□□

ماہنامہ "پیامِ تعلیم" نئی دہلی ۲۵ کا

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

جشنِ ذاکر (۲ جنوری ۸۰ء تا ۸ فروری ۸۰ء) کے موقع پر ماہنامہ "پیامِ تعلیم" کا ایک خصوصی نمبر
ذاکر صاحب بچوں کے ادیب بھی تھے اور بڑوں کے بھی، ماہرِ تعلیم بھی تھے اور غیر معمولی دانشور بھی، شفیق استاد بھی تھے اور قومی رہنما بھی۔ "پیامِ تعلیم" کا ذاکر نمبر اسی عظیم الشان اور رنگا رنگ شخصیت کی زندگی کا مرقع ہوگا۔

ماہنامہ "پیامِ تعلیم" جامعہ نگر۔ نئی دہلی، ۲۵

غزل — سرپٹ حیدرآبادی

پریشاں عاشقی ہے، حُسن کا کردار زخمی ہے
کبھی اقرار زخمی ہے، کبھی انکار زخمی ہے

دلوں میں زخم ہیں سب کے دلوں کا پیار زخمی ہے
جہاں تک دیکھتا ہوں سارا کاروبار زخمی ہے

تھی کل تک جامہ زیبا شاعری کی دید کے قابل
مگر اب تو لباسِ شعر کا، ہر تار زخمی ہے

اسی میخانۂ ہستی میں کل تک رنگ رلیاں تھیں
اسی میخانہ میں، کیوں آج ہر میخوار زخمی ہے

غریبی کے مصائب سے ہیں دل زخمی غریبوں کے
لیئے دل میں محبت، زر کی ہر زردار زخمی ہے

عقیدے آج ہیں ذہن میں عقیدتمند میں ڈل مل
کہیں تسبیح زخمی ہے، کہیں زنّار زخمی ہے

یہ ہر شئے بدمزہ کیوں ہے ملاوٹ کیوں ہے ہر شئے میں
یہ آخر کس لیئے بھنڈار کا بھنڈار زخمی ہے

حسین کوئی نہیں آیا لبِ بام ایک مدت سے
نظر کس کی لگی، کیوں جلوہ گاہ یار زخمی ہے

گئی فصلِ جوانی، آگیا موسم بڑھاپے کا
میرے جذبات کی اب گرمیٔ بازار زخمی ہے

خدا معلوم کب ڈھا جائے بوسیدہ ہے کہنہ ہے
میں اب جس گھر میں ہوں اس گھر کی ہر دیوار زخمی ہے

جو مریل ٹٹوؤں کے ساتھ دوڑ نے دوڑ کیا اُسکی
اسی سے آج کل سرپٹ کی بھی، رفتار زخمی ہے

بولو کیا کروں

مجیب الرحمٰن بزمی

ہائے تم سے ہوگیا ہے پیار بولو کیا کروں
اُن سے ہے لاحق عشق کا آزار بولو کیا کروں

پھبتیاں کسنے لگے ہیں دوست اور احباب جب
راہ چلنا ہوگیا دشوار بولو کیا کروں

وہ فقیہہ شہر ہو یا رہنمائے قوم ہو
انکا جب مشکوک ہو کردار بولو کیا کروں

ہر طرف ہے چھینا جھپٹی، ہر طرف دنگا فساد
ہے زمانہ درپئے آزار بولو کیا کروں

جب لبِ انصاف پر رشوت کے تالے ہیں پڑے
حق پرستوں کی جگہ ہے دار بولو کیا کروں

کس طرح پوری کروں میں آپ کی فرمائشیں
پے بڑھاتی ہی نہیں سرکار بولو کیا کروں

حسرتوں سے دیکھتا ہوں میں فقط شوکیس کو
بن گئی ہے مفلسی دیوار بولو کیا کروں

موڈرن تعلیم اور تہذیب نو کا ہے کمال
بے دھڑک ہے عشق کا اظہار بولو کیا کروں

جیب میں کوڑی نہیں اور گھر میں مہمانوں کی بھیڑ
دال، چاول کچھ نہیں ہے یار بولو کیا کروں

بھول سے اک مہ جبیں سے ہوگئی ٹکر مری
پھر تعاقب میں ہے تھانے دار بولو کیا کروں

ہے زمانے کا ستایا آپ کا بزمی غریب
چغلیاں کھانے لگے اشعار بولو کیا کروں

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

نفسیاتی نکتہ

کردار :۔ ۱. شاداب ——— (جج صاحب کا نوجوان بھتیجہ)
۲. شگفتہ ——— (جج صاحب کی نوجوان لڑکی)
۳. بیگم صاحبہ ——— (جج صاحب کی بیوی)
۴. جج صاحب

بیگم :۔ (جھنجلائے ہوئے لہجے میں) صاحبزادی کا مزاج تو کسی سے ملتا ہی نہیں کوئی نظر میں جچتا ہی نہیں یہ سب باپ کے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے . . . .
میں تو شروع سے ہی سمجھاتی رہی ہوں کہ دیکھو لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے سدا ماں باپ کی چھاتی سے لگ کر بیٹھنا نہیں ہے اسے ایک دن دوسرے گھر جانا ہے سر نہ چڑھاؤ مگر کوئی میری بات مانے تب نا...

شاداب :۔ (چاپلوسانہ لہجے میں) آپ بجا فرماتی ہیں چچی جان لڑکی تو سارے خاندان کی ناک ہوتی ہے سارے میکے کی لاج اس کے ہاتھ ہوتی ہے ایک سگھڑ سلیقہ مند لڑکی اپنے میکے کا نام روشن کرتی ہے اور ایک پھوہڑ منہ پھٹ بدتمیز لڑکی . . . توبہ . . . توبہ۔

بیگم :۔ اور نہیں تو کیا شاداب میاں اب تم ہی کہو لڑکا ڈاکٹر ہے تین ساڑھے تین ہزار کی ماہانہ پریکٹس ہے شریف ہے صاحب جائداد ہے اور پھر اکلوتا ہے نہ نندوں کا جھمیلہ نہ جیٹھوں دیوروں کا میلہ اب اس سے بہتر پیام آسکتا ہے بھلا . . . . ؟

شاداب :۔ ہرگز نہیں ایسے چھٹے چھانٹے اُمیدوار تو سورج کی لالٹین لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے میں تو کہتا ہوں چچی جان آنکھ بند کر کے بلکہ انصاف کی دیوی کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر شگفتہ کو اس ڈاکٹر کی ازدواجی ڈسپنسری میں داخل کر دیجئے ...

شگفتہ :۔ (کمرے میں داخل ہو کر) یہ میرا نام فاتحہ میں کیوں لیا گیا۔

شاداب :۔ (سٹ پٹا کر) او۔ او شگفتہ . . . . .

بیگم :۔ (چڑتے ہوئے لہجے میں) ہائے ہائے اس لڑکی کی زبان کو تو لگام نہیں جو منہ میں آتا ہے انا پشنانا بک دیتی ہے۔

شگفتہ :۔ (شوخی سے) صاف گوئی ہمارا مسلک ہے۔ آپ جو چاہیں سمجھیں بندہ نواز . . کیوں شاداب ...

شاداب :۔ (مسکرا کر) بجا پیر و مرشد . . .

بیگم :۔ (غصے سے) پہلے یہ بتا کم بخت تو نے آخر اس رشتے سے انکار کیوں کیا ؟

شگفتہ :۔ (برجستگی سے) کیونکہ مجھے اس کا حق تھا...

بیگم :۔ (جھلا کر) ارے کوئی اس لڑکی کی دیدہ دلیری تو دیکھئے میں پوچھتی ہوں کیا شرم و حیا تجھے چھو کر بھی نہیں گئی۔

شگفتہ :۔ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے میں شرم کیسی ممی؟ شادی مجھے کرنی ہے زندگی بھر کا روگ پالنے سے پہلے کیا مجھے جانچنے اور پرکھنے کا بھی حق نہیں . . .

شاداب :۔ کیوں نہیں تمہیں پورا پورا اختیار ہے شگفتہ مگر چچی جان بھی تمہاری کوئی دشمن نہیں ماں ہیں

شگفتہ :۔ اس سے مجھے انکار نہیں یہ میری ماں ضرور ہیں لیکن ان کا برتاؤ تو یہ ہمیشہ دشمنوں جیسا سلوک کرتی آئی ہیں مجھ سے ....

بیگم :۔ (واویلا کرتے ہوئے) ہائے ہائے کوئی اس نالائق لڑکی کی الزام تراشی تو دیکھے اپنی ماں کو دشمن بتا رہی ہے نافرمان ذرا یہ تو بتا آخر کیا سلوک میں نے تیرے ساتھ دشمنوں جیسا...

شگفتہ :۔ یہ دشمنی نہیں تو اور کیا ہے جو بیسوں گھنٹے مجھے اس گھر سے نکال باہر کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔

شاداب :۔ پتا نہیں شگفتہ . . . تمہارا الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ میں نہیں مانتا ایک جوان جہان بیٹی کی شادی کی فکر ماں کو نہیں ہوگی تو کیا اڑوسیوں پڑوسیوں کو ہوگی۔ کیوں چچی جان؟

بیگم :۔ جیو بیٹے اللہ تمہاری عمر دراز کرے یہ بات تم نے خدا لگتی کہی ہے . . .

شگفتہ :۔ میں پوچھتی ہوں میری مرضی کے خلاف مجھے شادی پر مجبور کرنے والی یہ کون ہوتی ہیں (میز پر مکہ جڑتی ہے)

بیگم :۔ (غصہ سے) میں کون ہوتی ہوں . . . میں . . . یہ بات اپنے باپ سے پوچھ . . . (جواباً میز پر گھونسہ لگاتی ہیں)

شاداب :۔ بھئی جان چچی جان ٹیبل کا خیال کیجئے کمزور ہے ٹوٹ جائے گا غصہ تھوک دیجئے تھوک دیجئے پلیز . . . (شگفتہ سے) تم بھی ذرا ٹھنڈے دل سے کام لو شگفتہ ماں کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتی۔

شگفتہ :۔ ممی کی بے جا حمایت میں تم یہ بھول رہے ہو شاداب کہ یہ مجھے دیکھتی دکھاتی مکھی نگلنے کو کہہ رہی ہیں۔

بیگم :۔ گستاخ۔ بے زبان مکھی کسے کہہ رہی ہے۔

شاداب :۔ آپ کو نہیں چچی جان آپ کو نہیں . . . وہ جو ڈاکٹر کا پیام آیا ہے نا اسے مکھی کہہ رہی ہیں کیوں شگفتہ۔

شگفتہ :۔ ہاں . . . بالکل مکھی بلکہ شہد کی مکھی زہریلے ڈنک والی۔

شاداب :۔ ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔ بہر حال میری بات مانو شگفتہ چچی جان کی ممتا کو شک کی نظر سے مت دیکھو . . . تمہارے تئیں ان کی محبت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ شادی جسے تم زندگی بھر کا روگ سمجھتی ہو اس روگ کے علاج کے لیے چچی جان نے تمہارے واسطے ایک ڈاکٹر ہی کا انتخاب کیا۔

بیگم :۔ ہاں شاداب میاں اب تم ہی سمجھاؤ اسے میں تو ہار گئی۔

شگفتہ :۔ آپ تو بس ہر بات میں یہی کہتی ہیں میں تو ہار گئی مگر پیچھا نہیں چھوڑتیں جن ڈاکٹر صاحب کی بے جا سفارش کو آپ نے اپنا فرض سمجھ رکھا ہے ان کی حالت دیکھئے۔ آپ نے پورے پچیس ہزار کا سوال کیا ہے وہ بھی نقد!

بیگم :۔ ہاں ہاں یہ تو دستور ہے زمانے کا اس میں مانگنے والوں کا کیا قصور اور پھر ہماری حیثیت دیکھ کر ہی تو کوئی سوال کرے گا . . . میں پوچھتی ہوں کیا ہم خدانخواستہ فقیر ہیں کنگال ہیں شاداب میاں۔

شاداب :۔ بالکل نہیں چچی جان آپ بھلا فقیر کنگال کیوں ہونے لگیں فقیر اور کنگال تو یہ مانگنے والے لوگ ہیں جو شادی کو سودے بازی سمجھتی ہیں میں تو کہتا ہوں پچیس ہزار کم ہیں بے چارے ڈاکٹر صاحب کو شاید آپ کی حیثیت کا صحیح اندازہ نہیں ورنہ پچاس ہزار سے کم کی مانگ نہ کرتے آخر چچا جان منصف مجسٹریٹ ہیں منصف کوئی مفلس و قلاش منصف نہیں۔

شگفتہ :۔ مانا کہ ہم اس قابل ہیں کہ ہم سے اتنی مانگ کی جائے مگر میں کہتی ہوں مانگنے والوں کو بھی تو اپنی حیثیت دیکھ لینی چاہیئے۔

بیگم :۔ (جھنجھلاکر) ارے تو اِن کی حیثیت کو کیا ہوا... اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

شگفتہ :۔ ہاں کھاتے پیتے تو ہیں۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی ہوگیا یوں لگا جیسے کوئی گینڈا (سیاں تڑاکر) ZOO سے بھاگ آیا ہو۔

بیگم :۔ ہائے ہائے میں تو بھر پائی اس منہ پھٹ لڑکی سے کبھی اس بے چارے کو مکھی کہہ رہی ہے تو کبھی گینڈا مانا کہ غریب حیوانات کا ڈاکٹر ہے مگر ہے تو آدمی کا بچہ...

شاداب :۔ بالکل... بے شک چچی جان نہ اس کے سر پر سینگ ہیں نہ اس کی ناک سونڈ جیسی (شگفتہ سے) تمہیں خواہ مخواہ اس سے الرجی ہوگئی ہے شگفتہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں شادی کے بعد وہ تمہیں گھر میں ہی رکھے گا چڑیا گھر میں نہیں...

شگفتہ :۔ (غصہ سے) نان سنس، آئی ڈونٹ کیر — دنٹ بگر —!

بیگم :۔ لواب انگریزی میں غصہ اتارنے لگی...میں کہتی ہوں یہ تیری ساری بدتمیزیاں اس انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

شاداب :۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں چچی جان کالج کا آزاد ماحول اس پر بھانت بھانت کی لڑکیوں کی صحبت کا اثر دیکھ لیجئے سو چڑھ کر بول رہا ہے۔

بیگم :۔ ارے میں نے تو اس وقت ٹوکا تھا جب یہ کالج میں داخلے کے لیے ضد کررہی تھی مگر کوئی میری بات پر کان دھرے تب نا... باپ تو لاڈلی کو بی اے ایم اے کرانے پر تلے ہوئے تھے میں پوچھتی ہوں کیا اس دن کے لیے ایم اے کرایا تھا!...

شاداب :۔ کہ ایک دن اماں باوا پر ہی ریسرچ شروع کردو۔

شگفتہ : (غصہ سے) — بہت ہوگیا۔ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے والے۔

بیگم :۔ (غصہ سے) چپ کر بدتمیز... میں بتاتی ہوں تجھے یہ کون ہوتا ہے... تیرا چچا زاد بھائی تجھ سے عمر میں بڑا رشتے میں بڑا آداب اخلاق میں بڑا... کیا کسی نے تجھے بڑوں کا ادب کرنا بھی نہیں سکھایا... جا دفان ہو جا یہاں سے.....

شگفتہ :۔ (غصہ سے) جاتی ہوں۔ لیکن سمجھا دیجئے اپنے بارُتبہ بااخلاق بھتیجے صاحب کو آئندہ اگر میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کی کوشش کی تو انجام اچھا نہیں ہوگا... منہ... بڑے آئے دہی بڑے...

(شگفتہ چلی جاتی ہے)

بیگم :۔ (متفکر لہجے میں) مجھے تو اب اس لڑکی کے تیور سے ڈر لگنے لگا ہے... خواہ مخواہ تمہارا دل دکھا گئی۔ میں اس کی طرف سے معافی مانگتی ہوں بیٹے...

شاداب :۔ (ہڑبڑاکر) ارے ارے چچی جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں... خدارا آپ اپنے دل پر اس کی کسی بات کا اثر مت لیجئے۔ کیا میں شگفتہ کو نہیں جانتا۔ اس کے ساتھ تو کھیلتے کودتے لڑتے جھگڑتے بڑا ہوا ہوں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں وہ الّھڑ بچی ہے نادان ہے...

بیگم (خوش ہوکر) جیتے رہو میاں تمہارے اس اپنے پن کی وجہ سے تو تمہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔

شاداب :۔ شکریہ چچی جان۔

بیگم :۔ (رازدارانہ لہجے میں) ایک بات تو بتاؤ میاں کیا وہ ڈاکٹر واقعی بہت موٹا ہے...

شاداب :۔ ارے نہیں چچی جان۔ آپ بھی کن دشمنوں کے بہکاوے میں آگئیں۔ لڑکا تو ہیرا ہے ہیرا ذرا تندرست ضرور ہے اور پھر کیوں نہ ہو۔ گاؤں سے اصلی گھی اور باریک چاول وافر مقدار میں آتے ہیں اس لیے ذرا سی توند باہر کی طرف نکل آئی ہے.....

بیگم :۔ (منہ بناکر) بس کرو میاں میرا تو سُن کر ہی جی بیٹھ گیا...

شاداب :- سوچ لیجئے آج کے زمانے میں ڈاکٹروں کے پیام آسانی سے نہیں آتے لڑکی والے تو ڈاکٹر پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے لوگ راشن کی دکان پر مٹی کے تیل اور شکر پر جھپٹتے ہیں۔

بیگم :- ہوگا میاں مگر اس کی توند . . .

شاداب :- ایک بار پھر سوچ لیجئے . . . داماد ڈاکٹر ہو تو سارا محلہ جھک کر سلام کرتا ہے کیونکہ بیماری اور موت پوچھ کر نہیں آتے . . .

بیگم :- اب تم چاہے لاکھ اس ڈاکٹر کی سفارش کرو میں اپنا ارادہ بدل چکی۔

شاداب :- یعنی آپ نے بھی شگفتہ کی طرح اسے رد کر دیا۔

بیگم :- بالکل۔ تم خود سوچو میاں توند والا داماد کیسا عجیب نہیں لگے گا . . .

شاداب :- گویا یہ پیام بھی گیا ہاتھوں سے . . . افسوس . . .

بیگم :- اس میں افسوس کا ہے کا۔ کیا ایک یہی پیام تھا۔ آٹھ دس پیام اور آئے ہوئے ہیں مگر یہ لڑکی مانے تب نا۔ ہر بات میں مین میخ نکالے بغیر تو اسے چین نہیں پڑتا . . .

شاداب :- چچی جان دراصل یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔

شاداب :- جی ہاں اگر آپ تھوڑا سا اپنے دماغ پر زور ڈالیں تو یہ بات خود آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

بیگم :- کون سی بات۔

شاداب :- یہی کہ جو چیز جو بات آپ پسند کرتی ہیں شگفتہ اسے رد کر دیتی ہے اب یہی دیکھئے جس لڑکے کو آپ پسند کرتی ہیں وہ اسے REJECT کر دیتی ہے . . .

بیگم :- (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں یہی تو رونا ہے۔

شاداب :- اور یہی وہ نفسیاتی نکتہ ہے۔ دراصل آپ کی مخالفت کرنے میں وہ فخر محسوس کرتی ہے آپ کی بات کو ٹھکرانا ایک شان سمجھتی ہے۔

بیگم :- شاداب میاں سچ پوچھو تو اس لڑکی کو بگاڑنے میں اس کے باپ کا ہاتھ ہے وہ اس کے ساتھ مل کر مجھے ہر معاملہ میں نیچا دکھانا چاہتے ہیں . . . ہائے میں کیا کروں۔

شاداب :- ہمت سے کام لیجئے۔ اگر آپ حوصلہ کھو بیٹھیں گی تو پھر شگفتہ آپ پر چھا جائے گی۔

بیگم :- (گھبرا کر) یہ کیا کہہ رہے ہو میاں . . .

شاداب :- وہی جو سچ ہے اگر آپ نے ایک بار اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو بس پھر جی حضور کرتی رہ جائیں گی۔

بیگم :- پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں . . .

شاداب :- میری مانیئے شگفتہ کی کوئی بات کبھی نہ مانیے بلکہ اپنی ہر بات اس سے منوانے کی کوشش کیجئے یاد رکھیئے اگر آپ اس میں ناکام ہو گئیں تو پھر زندگی بھر اس کی تلافی ممکن نہیں آپ تو جانتی ہی ہیں اپنی لاڈلی کی فطرت کہیں اس نے گھر کے ہونے والے داماد کو بھی آپ کے خلاف ورغلا دیا تو . . .

بیگم :- (گھبرا کر) تو . . . تو . . . تو کیا ہوگا شاداب میاں۔

شاداب :- یہ پوچھئے کہ کیا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں داماد تو غیر کا شہزادہ آپ کی طبیعت اور فطرت کیا جانے وہ بھی آپ سے اس طرح پیش آئے گا جس طرح آپ کی لاڈلی پیش آتی ہے۔

بیگم :- (گھبرا کر) ایسا نہ کہو میاں وہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگا . . .

شاداب : خدا نہ کرے کہ ایسا ہو مگر چچی جان جب پیٹ کی اولاد ہی باغی ہو تو پھر غیر کا کیا بھروسہ۔

بیگم :- (مایوس لہجے میں) ہائے مجھ نصیبوں جلی کا کوئی غم گسار نہیں ہائے اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی ہمدرد نہیں۔

شاداب :- ہے کیوں نہیں چچی جان مانا کہ میں اس قابل نہیں کہ آپ کی برابری کر سکوں غریب ہوں لیکن دل کا ہیرا ہوں میرے پاس دھن دولت بھلے ہی نہیں مگر تن من سے آپ کے ساتھ ہوں سچ کہتا ہوں اگر میری کھال کی جوتیاں بھی اگر آپ کے کسی کام آسکیں تو خود کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا . . . .

بیگم :۔ (خوش ہوکر) جیتے رہو شاداب میاں خدا تمہیں سلامت رکھے اس گھپ اندھیرے میں ایک تم ہی تو امید کی کرن ہو۔

شاداب :۔ شکریہ چچی جان۔ میری اس بات کو گرہ میں باندھ لیجیے۔ چاہے کچھ ہوجائے آپ ہمت نہیں ہاریں گی شگفتہ کے آگے کبھی ہتیار نہیں ڈالیں گی انشاء اللہ جیت آپ ہی کی ہوگی۔۔۔

بیگم :۔ (خوشی سے) تمہارے منہ میں گھی شکر۔۔

(میوزک ابھرتی ہے۔ پہلا ایکٹ ختم ہوتا ہے)

میوزک فیڈ آوٹ ہوتی ہے۔

شاداب :۔ (بیٹھک میں داخل ہوکر روہانسی آواز میں پکارتے ہوئے) چچی جان۔۔۔ میں نے کہا چچی جان کہاں ہیں آپ۔۔۔ یہاں میری جان پر بن آئی ہے چچی جان اور آپ (زور سے) چچی جان۔۔۔

بیگم :۔ (دور کی آواز) میں یہاں باورچی خانے میں ہوں شاداب میاں۔

شاداب :۔ (اپنے آپ سے) ٹھیک ہے وہیں رسوئی میں آکر اپنی رسوائی کی روداد سناتا ہوں آپ کو۔۔۔۔۔۔

(قدموں کی آواز)

بیگم :۔ کیا بات ہے شاداب میاں۔۔۔ ارے یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے۔۔۔

شاداب :۔ (روہانسی لہجے میں) ابھی تو صرف منہ ہی لٹکا ہوا ہے چچی جان انشاء اللہ تھوڑی دیر میں آپ مجھے سیلنگ فین سے بندھی رسی سے لٹکا ہوا پائیں گی۔۔۔

بیگم :۔ (گھبراکر) یہ کیا انٹ شنٹ بک رہے ہو میاں آخر ہوا کیا۔

شاداب :۔ پانی سر سے گزر چکا چچی جان۔۔۔ سچ کہتا ہوں آج آپ کو شگفتہ کے ظلم اور میرے صبر کی ایک حد مقرر کرنی ہوگی۔

بیگم :۔ (حیرت سے) یہ کیا کہہ رہے ہو شاداب میاں۔

شاداب :۔ فلم مغل اعظم کا ڈائیلاگ جو اس وقت مجھ پر سو فیصدی فٹ ہوتا ہے۔

بیگم :۔ تمہاری اس اول جلول بکواس سے مجھے تو ہول ہونے لگا۔ سیدھی طرح بولو ہوا کیا۔

شاداب :۔ کل رات بھری پارٹی میں شگفتہ نے میری عزت اتار دی کہنے لگی میں چاپلوس ہوں خوشامد پرست ہوں آپ کے تلوے چاٹتا ہوں جادو ٹونے کا چکر چلا کر آپ کو اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔۔۔ اور۔ اور۔ اور۔

بیگم :۔ اور کیا میاں۔۔۔ صاف صاف کہو ڈرو مت۔۔۔

شاداب :۔ اور یہ کہ آپ کی۔۔ آپ کی دولت پر نعوذباللہ میری نظر ہے۔۔۔

بیگم :۔ (غصہ سے) اس کم بخت کی یہ مجال۔۔۔ میں ابھی ٹھیک کرتی ہوں اسے۔ (باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھاتی ہے)۔

شاداب :۔ وہ اس وقت گھر میں نہیں ہے۔۔۔

بیگم :۔ اچھا اچھا۔۔۔ آنے دو اسے آج اگر اس کے غرور کے غبارے کی ہوا نہ نکال دی تو نام بدل دینا میرا۔۔۔

(اچانک پریشر کوکر آواز کے ساتھ بھاپ خارج کرتا ہے)

شاداب :۔ ہوا۔۔۔ ہوا۔۔۔ نکل گئی۔۔

بیگم :۔ شاداب میاں اس پریشر کوکر کی طرف دیکھو جب یہ حد سے زیادہ گرم ہوتا ہے تو بھاپ اگلنے لگتا ہے۔ انسان بھی اسی کوکر کی طرح ہوتا ہے کسی کی ہمدردی کی گرمی پاکر اپنا سارا غم و غصہ اگل دیتا ہے۔۔۔ شگفتہ نے تمہیں جو تکلیف پہنچائی جو دکھ دیئے ہیں انہیں اپنا بوجھ مت بناؤ نکال پھینکو بھول جاؤ۔

شاداب :۔ یہ اتنا آسان نہیں چچی جان۔ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کیا اس دنیا میں غریب ہونا جرم ہے۔ گناہ ہے۔

بیگم :۔ کون کہتا ہے کہ تم غریب ہو۔ ارے تم تو دل کے غنی ہو قسمت کے دھنی ہو۔

شاداب :۔ شکریہ چچی جان خدا گواہ ہے میں نے کبھی دولت کا

لالچ نہیں کیا مجھے تو آپ سے صرف ہمدردی ہے اس میں لالچ کا شائبہ تک نہیں . . .

بیگم :۔ میں جانتی ہوں بیٹے تم پرائے بل میں نہیں اپنے بل پر یقین رکھتے ہو۔ جہاں ٹھوکر مارو گے دولت کے دریا بہا دو گے دریا . . .

شاداب :۔ لیکن فی الحال تو میں ہی ٹھوکروں میں ہوں۔ لوگ سچ کہتے ہیں چچی جان یتیم آدمی فٹ بال کی طرح ہوتا ہے جب جس کا جی چاہتا ہے ٹھوکر لگا دیتا ہے۔ . . .

بیگم :۔ ایسے نہیں کہتے شاداب کون کہتا ہے کہ تم یتیم ہو چچا کیا باپ کے برابر نہیں ہوتا۔ تم غیر تھوڑے ہی ہو ہمارے اپنے ہو یہ دھن دولت جائداد کیا تمہاری نہیں . . . اور پھر سب سے بڑھ کر میں تمہاری ماں نہیں۔

شاداب :۔ آپ ہی کی شفقت اور ممتا کے سہارے تو جی رہا ہوں چچی جان سچ کہتا ہوں اگر آپ کا آسرا نہیں ہوتا تو کب کا سر کھپا گیا ہوتا . . .

بیگم :۔ میں تمہارے دشمن . . . میں آج فیصلہ کر کے ہی دم لوں گی۔ اس گھر میں ایک ایسا انقلاب آئے گا جو چھوٹے بڑے امیر غریب کے فرق اور امتیاز کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے گا۔

شاداب :۔ (گھبرا کر) چچی جان گھر کے انقلاب سے پہلے پتیلی کے انقلاب کو روکیے چاول ابل رہے ہیں۔

بیگم :۔ (سٹپٹا کر) ارے رے رے . . .

(میوزک ابھرتی ہے۔ دوسرا ایکٹ ختم ہوتا ہے)

- - - - - -

(تیسرا ایکٹ)

میوزک فیڈ اوٹ ہوتی ہے۔

بیگم :۔ (بیلن سے میز پر ضربیں لگاتے ہوئے) آرڈر آرڈر۔

جج :۔ (چونک کر) آئیں۔ ارے بیگم یہ کیا مذاق ہے۔

بیگم :۔ (طنز سے) مذاق نہیں (بیلن دکھا کر) یہ بیلن ہے اور یہ میز۔ (پھر بیلن سے میز کو دو تین ضربیں لگا کر) اور یہ میز۔ (پھر بیلن سے میز پر دو تین ضربیں لگا کر) اور یہ آرڈر . . . آرڈر . . . نہیں سمجھے . . .

جج :۔ سمجھ گیا۔ سمجھ گیا . . . اس وقت آپ کی نظر میں یہ گھر نہیں بلکہ عدالت کا اجلاس ہے۔

بیگم :۔ بالکل ٹھیک سمجھے جج صاحب آپ آئے دن عدالتوں میں الٹے سیدھے فیصلے سنایا کرتے ہیں آج میرے مقدمہ کا بھی فیصلہ کر دیجئے . . .

جج :۔ او کے او کے ضرور کریں گے۔ پہلے یہ بیلن عدالت کی تحویل میں دے دیجئے۔ لائیے۔

بیگم :۔ (طنز سے) ایک معمولی بیلن سے ڈر گئے جج صاحب (بیلن حوالے کرتے ہوئے) خیر لیجئے۔

جج :۔ (بیلن لیتے ہوئے) شاباش اب بے خوف ہو کر اپنا مقدمہ پیش کرو فریادی۔

بیگم :۔ اس گھر میں ویسے بھی میری حیثیت ایک فریادی کی ہے ایسا فریاد جس کی نہ کوئی داد ہے نہ فریاد۔

جج :۔ مایوس نہ ہو فریادی . . . عدالت تمہاری فریاد ضرور سنیں گے یقین رکھو تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔ بتاؤ کس نامعقول نے تم پر ظلم کیا . . .

بیگم :۔ آپ نے جج صاحب۔

جج :۔ (گڑبڑا کر) م۔ م۔ م میں نے۔

بیگم :۔ دیکھا کیسا جھٹکا لگا۔ اپنا نام سنتے ہی بکری کی طرح مین۔ مین۔ مین۔ مین کرنے لگے . . .

جج :۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں . . . میں کچھ سمجھا نہیں۔

بیگم :۔ اب میری بات آپ کی سمجھ میں کیوں آنے لگی آپ کی سمجھ تو صرف اپنی بیٹی کے اشاروں پر بھارت ناٹیم کرتی ہے۔

جج :۔ (ہکلا کر) بھ۔ بھ۔ بھارت ناٹیم . . .

بیگم :۔ کان کھول کر سن لیجئے۔ اب اس گھر میں یا تو میں

چلے گی یا پھر میں ہمیشہ کے لیے اس گھر سے چلی جاؤں گی۔

جج :۔ افوہ آخر ہوا کیا کچھ پتہ تو چلے۔

بیگم :۔ میں پوچھتی ہوں کیا تمہاری بیٹی کے بھلے برے کا فیصلہ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

جج :۔ کیوں نہیں بیگم تم اس کی ماں ہو . . .

بیگم :۔ (چڑکر) وہ مجھے اپنی ماں سمجھے تب نا۔ خیر میں نے ابھی فیصلہ کرلیا ہے اس کی شادی ہوگی تو بس اس لڑکے کے ساتھ جو مجھے پسند ہے . . .

جج :۔ مگر بیگم . . .

بیگم :۔ اگر مگر کچھ نہیں اس چاند کی بائیس تاریخ کو ہوگی اس کی شادی۔

جج :۔ (حیرت سے) بائیس تاریخ کو۔ مگر کس سے۔

بیگم :۔ شاداب سے۔

جج :۔ (مزید حیرت سے) کس سے . . .

بیگم :۔ (زور سے) شاداب سے اب کیا اونچا بھی سننے لگے ہو۔

جج :۔ (گڑبڑاکر) شا۔ شا۔ شاداب سے کون شاداب۔

بیگم :۔ (چڑکر) کیا تمہارے خاندان میں آٹھ دس شاداب ہیں جو پوچھ رہے ہو کون شاداب تمہارا بھتیجہ شاداب . . . .

جج :۔ اپنا۔ اپنا شاداب۔

بیگم :۔ ہاں ہمارا شاداب جسے تمہاری لاڈلی کنگال یتیم یسیر سمجھ کر خاطر میں نہیں لاتی . . .

جج :۔ بیگم تم ہوش میں ہو کہ نہیں۔

بیگم :۔ (غصہ سے) کیا تمہیں بے ہوش نظر آتی ہوں۔

جج :۔ (حیرت سے) یا حیرت۔ تم وہی ہو نا بیگم جنہوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ شگفتہ کی شادی اپنے سسرالی رشتہ داروں میں ہرگز نہیں کروں گی کیونکہ بقول تمہارے میرے خاندان کے لوگ جھگڑالو ہیں، مفلس اور کنگال ہیں جن میں تم غلطی سے پھنس گئی ہو اور اب اپنی بیٹی کے معاملے میں وہی غلطی پھر نہیں دہراؤں گی بلکہ اس کی شادی کسی اونچے خاندان میں کسی ڈاکٹر یا انجینئر سے کروں گی . . .

بیگم :۔ ہاں ہاں میں نے ہی کہا تھا یہ سب اور اب یہ بھی میں ہی کہہ رہی ہوں کہ شگفتہ کی شادی ہوگی تو صرف شاداب سے سمجھے۔

جج :۔ یعنی اس شاداب سے جو نہ ڈاکٹر ہے نہ انجینئر بس بی اے ایل ایل بی ہے بے کار ہے اور بقول تمہارے مفلس اور کنگال ہے۔

بیگم :۔ اجی مفلس اور کنگال ہوں اس کے دشمن کیا یہ ساری جائداد دھن دولت ہم قبر میں ساتھ لیجائیں گے۔

جج :۔ (حیرت سے) تمہارے اٹل ارادوں میں ایسا زبردست انقلاب بھی آسکتا ہے مجھے تو اس کا یقین نہیں آرہا بیگم۔

بیگم :۔ تمہیں یقین کیوں آنے لگا۔ لیکن میں کہے دیتی ہوں اگلی بار اگر تمہاری لاڈلی نے انکار کیا تو اس کی اور اپنی جان ایک کردوں گی۔

جج :۔ (جوش سے) اجی وہ کیا اب کی بار اس کا باپ بھی انکار نہیں کرے گا۔ (جوش میں بیلن سے میز پر ضربیں لگاکر) آرڈر آرڈر . . .

. . . (میوزک ابھرتی ہے۔ تیسرا ایکٹ ختم ہوتا ہے) . . .

(چوتھا ایکٹ)

میوزک فیڈ آوٹ ہوتی ہے۔ ملی جلی ہنسی ابھرتی ہے۔

جج :۔ بھئی خوب شاداب میاں مان گئے تمہاری حکمت عملی کو۔

شاداب :۔ شکریہ چچا جان۔

جج :۔ تم نے اپنی زندگی کے پہلے مقدمے کی نہ صرف خوبصورتی سے پیروی کی بلکہ کیس جیت کر ثابت کردیا کہ مستقبل میں ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے خوب نام کماؤ گے . . .

شاداب :۔ مجھے بس آپ کی رہنمائی چاہیئے چچا جان اگر اس مقدمے میں قدم قدم پر آپ کے قیمتی مشورے نہ ملے ہوتے تو یقین جانیئے میرے لیے یہ جیتنا ناممکن ہوتا . . .

شگفتہ :۔ یہ سب تو ٹھیک ہے ڈیڈی۔ لیکن اب میں

کیا کروں شاداب نے مجھے ممی کی نظر میں خواہ مخواہ دشمن بنادیا . . .

شاداب :- ہاں یہ مسئلہ ذرا گمبھیر ہے مگر اس کے سوائے کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا چچی جان کی برین واشنگ ضروری تھی اس کے بغیر وہ شادی پر ہرگز راضی نہ ہوتیں . . . (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے طنز سے) ہاں چچی جان بھلا کیوں راضی ہوتی . .

شاداب :- (گڑبڑاکر) چ . چ . . . چچی جان . . .

بیگم :- میں تو اپنی ہی بیٹی کی سوتیلی ماں ہوں . . .

شگفتہ :- م . م . ممی . . .

بیگم :- میرے ہی گھر میں میرے ہی خلاف سازش . .

جج :- خفا مت ہو بیگم . . . تم نے غالباً چھپ کر ساری بات سن لی . . .

بیگم :- واہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے . . . چھپ کر تو آپ سبوں کو الٹی پٹی پڑھا رہے ہیں . . .

جج :- (سٹپٹاکر) نہیں بیگم میں خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ بچے دراصل تم سے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے گھبرا رہے تھے اس لیے . . .

بیگم :- مانا کہ بچے مجھ سے گھبرا رہے تھے مگر آپ تو بچے نہیں پھر آپ نے آج تک کیوں چھپائی مجھ سے . . . آپ سے مجھے عمر بھر گلہ رہے گا .

جج :- ناراض مت ہو بیگم .

شگفتہ :- (گڑگڑاہٹ سے) ممی پلیز معاف کردیئے مجھے . میں جان بوجھ کر آپ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئی . بہت بدکلامی اور گستاخی کی ہے میں نے زندگی بھر مجھے اس کا دکھ رہے گا پلیز معاف کردیجئے . میری اچھی ممی ہیں نا آپ . . .

بیگم :- (پیار سے) ادھر آمیرے پاس . .

شگفتہ :- (خوشی سے) اوہ ممی مائی سویٹ ممی . .

بیگم :- (شگفتہ کو لپٹاتے ہوئے) پگلی اگر تو اپنے دل کی بات مجھے بتادیتی تو کیا میں تیری مرضی پوری نہ کرتی . ارے میں تیری ماں ہوں ماں . . .

شاداب :- (برجستگی سے) میں بھی تو یہی کہتا تھا چچی جان کہ آپ ماں ہیں نہ صرف شگفتہ کی بلکہ میری بھی .

بیگم :- واہ میاں اچھے بھتیجے ہو خوب نفسیاتی نکتہ نکالا . . . مجھے ہی اُلّو بناتے رہے .

جج :- کوئی بات نہیں بیگم یہ تمہیں چچی سمجھ کر اب تک اُلّو بناتے رہے آج سے تم انہیں اپنا داماد سمجھ کر اُلّو بنانا شروع کردو . . . حساب برابر ہوجائے گا . .

(ہلکی ہنسی)

شاداب :- تو اس بات پر ہوجائے چچا جان . . . .

جج :- (زور سے) آرڈر . . . آرڈر . . . .

بیگم :- آرڈر نہیں امید . اب بائیس تاریخ تک ان دونوں کے ملنے پر کرفیو آرڈر . . .

جج صاحب زوردار قہقہہ . . .

(میوزک ابھرتی ہے . . . .)

نامور مزاح نگار

پرویز یداللہ مہدی

کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ :

ٹائیں ٹائیں فش

قیمت :

۱۵ روپے

فیاض احمد فیضی*
(بمبئی)

لڑکیاں میرے شہر کی

میں جس مشہور و معروف شہر میں رہتا ہوں انگریزی میں اس کا نام BOMBAY ہے، مراٹھی والے اسے ممبئی کے نام سے پکارتے ہیں اور ہندی میں اسے بمبئی کہا جاتا ہے لیکن لے دے کر ایک اُردو زبان بے چاری رہ جاتی ہے جس میں اس شہر کا کوئی نام نہیں۔ خیر اردو زبان کی بے چارگی کی داستان سنانے کے لیے یہ صدی قطعی غیر مناسب ہے اس لیے کہ اکیسویں صدی میں ملک کے بچے بچے کی زبان پر اردو زبان کی ناچاری اور کس مپرسی کی کہانیاں ہوں گی۔ ہندوستان کے نقشے میں ہو بہو لومڑی کی شکل کا یہ شہر، شہر بمبئی گو ریاستِ مہاراشٹر کا مرکز ہے مگر دراصل اس شہر میں ہمارے ملک کا تجارتی دل دھڑکتا ہے۔ اس جنت کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی محض دل کے بہلانے کو اسے عروس البلاد یعنی شہروں کی دلہن کہا جاتا ہے۔ بہت سے شہروں کی ایک دلہن ــ حالانکہ شادی کا یہ طریقہ مہذب دنیا عرصہ ہوا ترک کر چکی ہے اور نہ جانے یہ کیسی دلہن ہے جس کے کچھ حصے تو بے انتہا خوب صورت اور دل فریب ہیں مگر باقی بیشتر حصے اتنے بھیانک اور بدصورت کہ آنجہانی آرم اسٹرانگ کا چاند بھی شرما جائے یا یوں کہیے دنیا کی بیشتر دلہنیں شادی کے کچھ عرصہ بعد ایسی ہی ثابت ہونے لگتی ہیں۔

میرے شہر میں جو لوگ دیہاتوں سے آتے ہیں اگر وہ ذرا پڑھے لکھے ہیں تو وہ یا تو چندہ مانگنے آتے ہیں یا ملازمت کرنا اختیار کرتے۔ اور اگر انھیں دیہاتی اسکولوں کی پتھریلی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ٹوٹی ہوئی سلیٹوں پر لکھنا اور مدقوق ماسٹروں کی گالیاں کھانا نصیب نہیں ہوا ہے تو وہ یہاں محنت کی روزی کی تلاش میں آتے ہیں اور روزی (ROSY) یا میری (MARY) نام کی لڑکیاں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں لیکن جیسے ہی پیٹ میں تر لقمے پہنچتے ہیں شہر کی لڑکیوں کا حسن انھیں مخمور کرنے لگتا ہے اس لیے کہ ہمارے یہاں ہمیشہ خوش حالی اور فارغ البالی کے پیچھے پیچھے رنگین مزاجی ہاتھ باندھے چلی آتی ہے۔ اس کے برعکس یہاں جو لوگ دوسرے شہروں سے اور دوسرے چند مخصوص ممالک سے تشریف لاتے ہیں ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اس شہر کو پریوں کا دیس مان کر آتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس شہر کی تمام لڑکیاں انتہائی خوب صورت اور تمام مرد انتہائی بدصورت ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی جیبیں نوٹوں سے، پیٹ مرغن غذاؤں سے اور سانسیں آرزوؤں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور ان کے خشک لبوں پر

یہ شعر ہوتا ہے ؎

لڑکیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لیے ؎ لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لیے

اور جیسے ہی میرے شہر کا ٹیکسی ڈرائیور ان مہانوں کو ہوٹل پہنچانے کے لیے ٹیکسی غلط سمت میں موڑتا ہے کسی بھری پری شاہراہ کی طرف، تو ان مہانوں کی ایک سرد آہ بے اختیار نکل جاتی ہے اور وہ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ یا الٰہی اس شہر میں کیسی پیاری پیاری صورتیں پائی جاتی ہیں حالانکہ ان صورتوں کو پیاری بنانے میں خدا اور والدین سے زیادہ کاسمیٹکس بنانے والی کمپنیوں کے کمال اور بیوٹی پارلرز کی محنت کا ہاتھ ہوتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر علی الصبح چار بجے اگر ان لڑکیوں کا دیدار کیا جائے تو یہ لگے گا کہ اس شہر میں جتنی سانولی، سیاہ فام، معمولی شکل و صورت اور قد و قال کی لڑکیاں ہیں وہ شاید ملک کے کسی کونے میں نہیں ہوں گی لیکن علی الصبح ان پریوں کا دیدار اسی صورت میں ممکن ہے جب شہر میں اس وقت زلزلہ آجائے ورنہ اتنی صبح تو صرف ایئر ہوسٹسوں کے ہی درشن ہوسکتے ہیں جو اس وقت بھی ایئرپورٹ پر اپنا چھوٹا سا میک اپ باکس اٹھائے، بجلیاں گراتے ہوئے، اِدھر سے اُدھر چابی بھری گڑیاؤں کی طرح دوڑتی نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں بمبئی شہر کالے روپے اور اس سے ملتی جلتی لڑکیوں پر ٹکا ہوا ہے۔ ان دونوں کو اس شہر سے ہٹا دیجئے، اڑا ڑا دھڑام کرکے پورا شہر منہ کے بل آگرے گا۔ ویسے عام طور پر لوگ ان لڑکیوں کا مطالعہ اوپر یعنی چہرے سے شروع کرتے ہیں اور راستہ ہی میں کہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں، پیروں کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا ورنہ دراصل بے حد حسین نظر آنے والی لڑکیوں کے پیر نہ جانے کیوں ٹیڑھے میڑھے، سیاہ اور بدشکل ہوتے ہیں۔ پر ان لڑکیوں کو اپنے پیروں کی بدصورتی کا ذرا سا بھی غم نہیں ہوتا اور وہ سارے شہر میں مورنیوں کی طرح ناچتی پھرتی ہیں۔ خیر یہ ناچ تو اتنا برا نہیں لگتا لیکن جب سچ مچ کی ڈروانی لڑکیاں اپنے حسن پر غرور کا برملا اظہار کرتی ہیں تو اپنے شہر کے لڑکوں کی رواداری اور بھلمنساہٹ پر رشک آنے لگتا ہے۔ اِدھر بہت سے ٹی وی سیریلز کی عجیب و غریب ہیروئنوں کو دیکھ دیکھ کر بمبئی کی کالی پیلی لڑکیوں نے احساسِ کمتری کے لبادہ کو پھینک کر احساسِ برتری کی چادر اوڑھ لی ہے۔

میرے شہر کی لڑکیوں کی ان گنت قسمیں ہیں، بلکہ یوں سمجھئے جتنی لڑکیاں ہیں شاید اتنی ہی قسمیں ہیں۔ سب سے پہلی قسم ان لڑکیوں کی ہے جو پردہ نشین کہلاتی ہیں۔ ان پردہ نشین لڑکیوں میں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو خوشی خوشی راضی بہ رضا برقعہ اوڑھ کر نکلتی ہیں اس لیے کہ ان کا خیال ہے کہ اگر انھوں نے برقعہ پہننا چھوڑ دیا تو وہ لڑکے جو ابھی تجسس کی نگاہ سے انھیں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی ان کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں گے گویا برقعہ ان کے لیے ایک ایسی چمک دار ڈھال ہے جو پیارے دشمن کو پاس بلاتی بھی ہے اور اس کے وار سے بچاتی بھی ہے۔ دوسری طرف وہ لڑکیاں ہیں جن کا یہ حسنِ ظن ہے کہ برقعہ ان کے حسن کو چھپا دیتا ہے چنانچہ اس کا توڑ انھوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے اپنے برقعہ کو بھی اپنی ہی طرح حسین تر بنانے میں لگی رہتی ہیں اور اب تو ایسے ایسے قیمتی ریشمی برقعے ملنے لگے ہیں کہ ان پر سے بزرگ سے بزرگ اور کھردری سے کھردری نگاہیں بھی پھسل پھسل جاتی ہیں۔ پھر تراش خراش ایسی کہ برقعہ کا برقعہ اور اشتہار کا اشتہار اور اشتہار بھی کیسا کہ جس میں تمام تفصیلات مزے لے لے کر بیان کی گئی ہوں۔ یہ معصوم اور قدرے مظلوم پردہ نشین لڑکیاں جب راستہ پر چلتی ہیں تو اُن کی نگاہیں ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ کبھی بس کی آرزو ہے، کبھی ٹیکسی کی امید تو، کبھی ٹرین کا انتظار اور ان سب کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش۔ تعلیم یافتہ، ماڈرن اور وجیہہ جو بھلے کروڑپتی نہ ہو لیکن عمر بھر نان نفقہ تو بہم پہنچا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ

پردہ نشین شہزادیاں خوب جانتی ہیں کہ آخر کار ان کی قسمت میں ان کے ابا سے ملتی جلتی شکل کا دولہا ہی لکھا ہے جو ہو سکتا ہے انھیں شادی کے بعد بھی ایک وقت بھوکا ہی رکھے۔ ایسی لڑکیاں عموماً بڑی اردو نواز ہوتی ہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری، رضیہ بٹ کے ناولوں اور ایک اور خاتون افسانہ نگار کے حیدرآبادی افسانوں پر جان دیتی ہیں لیکن ان لڑکیوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی روٹیاں گول نہیں ہو پاتیں، کہیں کہیں سے جل بھی جاتی ہیں، ان کے اُبلے ہوئے چاول ذرا سے سخت رہ جاتے ہیں اور گوشت کا سالن ایسا کہ بوٹی پر لوراندور حرف کر دیجیے تو آخر دو ٹکڑے ہو ہی جاتا ہے۔ سسرال میں شوہر کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں اور اگر شوہر ہر ہفتہ پکچر نہ دکھائے اور ہوٹل لے جا کر مزیدار کھانا نہ کھلائے تو اسے بھی خاطر میں لانا چھوڑ دیتی ہیں۔ حالاں کہ ان تمام لڑکیوں کو جہیز میں بہشتی زیور اور رضیہ کا شاہی دسترخوان لازمی طور پر دیئے جاتے ہیں۔

آئیے اب ان بے پردہ لڑکیوں کی بات کریں جن کے بارے میں عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ پردہ نشین لڑکیوں کے مقابلے میں تیز و طرار اور ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں حالانکہ بے وفائی وہ جوہر ہے جسے آپ لاکھ پردوں میں چھپائیں، ہزار تالوں میں بند کر دیں، اپنا رنگ دکھا کر ہی رہتا ہے۔ ان بے پردہ لڑکیوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو دوپٹہ اوڑھتی ہیں اور دوسری وہ جنھیں دوپٹہ کی قید سے نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ایک اور قسم لڑکیوں کی وہ ہوتی ہے جو اپنی گلی سے پچھلی صدی کا برقعہ پہن کر نکلتی ہیں، کالج پہنچ کر برقعہ اتار کر پرس میں رکھ دیتی ہیں اور پرس میں سے تہہ کیا ہوا دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیتی ہیں اور جب پکنک پر جاتی ہیں تو دوپٹہ، برقعہ اور شرم تینوں کو لپیٹ کر احتیاط سے بیاگ میں رکھ دیتی ہیں۔

ادھر پچھلے چند برسوں میں جہاں بڑھتی ہوئی مہنگائی نے دوپٹہ کے کپڑے کو ہی اور سائز کو ذرا چھوٹا کر دیا ہے وہیں ترقی پذیر فیشن نے دوپٹہ اوڑھنے کے کئی طریقے بھی ایجاد کر لیے ہیں۔ ایک تو وہی دقیانوسی طریقہ ہے کہ ممی کے بتائے ہوئے طریقے سے دوپٹہ کو پھیلا کر چادر کی طرح لپیٹ لیجیے اور اپنا حسن غارت کر لیجیے۔ ایسی لڑکیوں کو آج کل لوگ بڑی رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ دوسرا ذرا بہتر طریقہ یہ ہے کہ لڑکیاں دوپٹہ کو رسی کی طرح بل دے کر پتلا کر لیتی ہیں اور پھر اسے بیچوں بیچ گردن کے پیچھے پھنسا کر اس کے دونوں سرے سامنے کی طرف جھولنے کے لیے اس طرح چھوڑ دیتی ہیں جیسے سانپ لہرا رہے ہوں۔ کچھ لڑکیاں اس سے ایک قدم آگے ہوتی ہیں۔ وہ اسی رسی کی طرح بل دیئے ہوئے دوپٹہ کو سامنے سے گردن میں پہنا کر اس کے دونوں سرے پیٹھ پر لہرانے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو دور سے دیکھ کر لوگ بے تاب ہو جاتے ہیں اور اپنی چال تیز کر دیتے ہیں تاکہ جلدی سے جلدی انھیں اوورٹیک کر کے صحیح صورت حال کا جائزہ لے سکیں۔ لیکن ان سب سے بہتر طریقہ دوپٹہ اوڑھنے کا وہ ہے جس میں لڑکیاں دوپٹہ کے ایک سرے سے اپنی گردن میں ہلکی سی گرہ لگا لیتی ہیں اور ایک جھٹکے سے دوسرے سرے کو سامنے جسم پر اس طرح اتار دیتی ہیں [illegible] اردو کا نمبر 9 ہوا کرتا ہے۔ اس طریقے میں آدھے جسم کا آدھا حصہ چھپ جاتا ہے [illegible] الدین کی

ایک شخص سے اس کی بیوی نے پوچھا: "تمہارے اتنے عزیز دوست کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور تم نے اس سے تعزیت تک نہ کی؟"
"کس منہ سے جاؤں بیگم! وہ مجھے اپنی تیسری بیوی کے جنازے میں بلا رہا ہے جبکہ میں اسے ایک بار بھی نہیں بلا سکا۔" شوہر نے جواب دیا۔

○

بات بھی رہ گئی اور لڑکوں کا ارمان بھی نکل گیا۔ ویسے سُنا ہے ہندوستان کے کسی حصہ میں لڑکیاں ایک ہی دوپٹہ سے پورا سر اور آدھا جسم چھپا کر نکلتی ہیں۔ بمبئی میں عرصہ ہوا یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے البتہ کچھ لڑکیاں گھروں میں جلدی جلدی نماز پڑھتے ہوئے یا اپنے والدین کے لیے اپنی پسند کا داماد بھیجنے کی دعا کرتے ہوئے اور عید کا چاند دیکھتے وقت اس طرح کا حُلیہ ضرور بنالیتی ہیں۔

آپ میں اُن بے پردہ لڑکیوں کا کیا ذکر کروں جو دوپٹہ کو قید سمجھتی ہیں اور مزید آزادی کی تمنا کرتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کی تصویریں تو آپ روزانہ صابن، تیل، منجن، پنسل، بال پن، فونٹین پن، ٹائر، ٹرک، کار، اسکوٹر اور سیکل کے اشتہارات میں دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ ان لڑکیوں کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ کم سے کم کپڑوں میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش میں وہ ناکام رہیں۔ ایسی لڑکیوں کو یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ کم سے کم لباس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ مرد انھیں دیکھتے ہیں۔ انھیں یہ پتہ نہیں کہ جب مرد کسی لڑکی کو نگاہِ خاص سے دیکھتا ہے تو پھر اسے لباس —— چاہے کم ہو یا زیادہ —— دکھائی کہاں دیتا ہے؟ یہی وہ خوش فہم لڑکیاں ہیں جو میرے شہر کے ہر گلی کوچے، سڑکوں اور شاہراہوں پر اپنی کامیابی کے نشہ میں چور گھٹاؤں کی طرح لہراتی رہتی ہیں اور لوگوں کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ یہ گھٹائیں کہیں بھی کسی بھی وقت برسنے لگیں گی۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے شہر کی ساری لڑکیاں گھٹاؤں کی طرح لہرا لہرا کر ہی چلتی ہوں۔ جی نہیں کچھ لڑکیاں نگاہیں نیچی کیے، آہستہ آہستہ، بے آواز قدموں سے اس طرح چلتی ہیں جیسے بلی کبوتر کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ دوسری چند لڑکیاں دائیں بائیں جھولتے ہوئے ایسی تیز رفتار سے چلتی ہیں جیسے غنڈے ان کا پیچھا کر رہے ہیں حالاں کہ حلیہ ان کا ایسا ہوتا ہے کہ غنڈے تو کیا شُرفا بھی پیچھا کرنے کا خیال دل میں نہ لائیں مبادا وہ مڑ کر کہہ دیں، آپ میرے پیچھے پیچھے کیوں چل رہے ہیں، ساتھ کیوں نہیں ہو لیتے؟ مزید کچھ لڑکیاں ہیں جو فوجیوں کی طرح لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کرتی ہوئی چلتی ہیں اور لڑکوں کی فوج کی فوج کا قتلِ عام کرتی جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں بڑے نازو انداز سے اپنے سر پہ بنے ہوئے اُونچے سے گھونسلے کو دونوں ہاتھوں سے چلتے چلتے ٹھیک کرتی جاتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پنگھٹ پہ گوری مٹکا لیے پانی بھرنے جارہی ہو۔ ایسی چال دیکھ کر بھی آوازوں کے کنکر مارتے رہتے ہیں لیکن اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا۔ بعض لڑکیاں اتنی موٹی ہوتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری کی یاد آتی ہے۔ یہ جب تیز چلتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے پھُدک رہی ہیں۔ کچھ محض صحت مند لڑکیاں بھی شوقیہ اور شرارتاً پھُدک پھُدک کر یوں چلتی ہیں کہ ہر دو قدم چلنے پر دیکھنے والوں کے دل اچھل کر حلق میں آ اٹکتے ہیں۔

لڑکیوں کو گھورنا مَرد کا پیدائشی حق ہے اور اکثر مرد اپنے اس حق کو پیدائش کے وقت سے ہی استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں جبھی تو اکثر بچے اسپتال میں نرس کو دیکھتے ہی رونا شروع کر دیتے ہیں اور ماں کے بہلائے نہیں بہلتے مگر جیسے ہی نرس گود میں اُٹھا کر پچکارنا شروع کر دیتی ہے انھیں اسلاف کے اتا لیقوں کو قرار آنے لگتا ہے۔

مختلف لڑکیوں پر مردوں کے گھورنے کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان کا جو ردِّ عمل ہوتا ہے اس سے ان کے کردار کا غلط اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ میرے شہر کی بعض لڑکیاں اس قدر حسین اور دھان پان ہوتی ہیں کہ اگر کوئی مرد انہیں قاعدے سے گھورے تو انہیں (یعنی لڑکیوں کو) طبّی امداد کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

ویسے بمبئی کی مشہور لڑکیاں وہ ہیں جن سے کوئی لڑکا جیسے ہی آنکھیں چار کرتا ہے ان لڑکیوں کی ایک آنکھ نہ جانے کیسے بند ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ لڑکا سنبھلے وہ فوراً کہتی ہیں "ہائے ہینڈسم، ہاؤ آر یو" اور وہ ہینڈسم وہیں بے دست و پا ہو جاتا ہے۔ ایسی لڑکیاں بہت نیک اور وفادار ہوتی ہیں اور کم از کم اس وقت تک بے وفائی نہیں کرتیں جب تک کہ انھیں کوئی زیادہ امیر لڑکا نہیں مل جاتا۔ ان سے بھی زیادہ شریف اور پارسا لڑکیاں وہ ہوتی ہیں جنھیں اگر کوئی نگاہ اٹھا کر دیکھ لے تو فوراً عظہر کر دیکھنے والے سے دریافت کر کے اطمینان کر لیتی ہیں کہ اس کے گھر میں اس کی والدہ اور ہمشیرائیں موجود ہیں یا نہیں۔ اب اگر کوئی منچلا اس پر مزید چھیڑ خانی پر اتر آئے تو ایسی لڑکیاں سچ مچ اپنی جوتی اتار کر چھیڑنے والے کی مرمت کر دیتی ہیں۔ یہ دراصل شرافت کی انتہا ہوتی ہے۔ ایسی لڑکیاں بہت اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں اور جب تک شوہر آفس نہ چلا جائے دوسرے مردوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ کچھ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں ذرا دور سے جیسے ہی احساس ہوتا ہے کہ کوئی انھیں دیکھ رہا ہے تو غلطی سے ان کے دوپٹہ کا پلو گر جاتا ہے اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر قریب آتے آتے اچانک نگاہ اٹھا کر گھورنے والے کو دیکھتی ہیں اور کبھی گھبرا کر کبھی مسکرا کر دوپٹہ ٹھیک کر لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ذرا خطرناک ہوتی ہیں اور اپنے بوائے فرینڈ یا شوہر کو دوپٹہ کے پلو کی طرح ہی کبھی کبھی نادانستگی میں گرا سکتی ہیں۔ کچھ اور لڑکیاں ہیں کہ اگر کوئی انھیں دیکھے تو فوراً بھر لو۔ نگاہوں سے اپنے آرزو مند کو دیکھتی ہیں اور پھر ہونٹ اور ناک کو سکیڑ کر حقارت کا اظہار کرتے ہوئے نکل جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں سے لڑکے بالکل ناامید ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط رویہ ہے۔ دراصل یہ لڑکیاں اپنے اس عمل سے یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ارے تم سے زیادہ خوبصورت نوجوان میرے بوائے فرینڈز رہ چکے ہیں۔ مجھے پانے کے لیے تم کتنی دولت مجھ پر خرچ کر سکتے ہو، تمہارے پاس کون سی کار ہے، وغیرہ۔ البتہ سب سے خطرناک وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے گھورنے والوں کا نوٹس ہی نہیں لیتیں اور سر جھکائے دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو رام کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اس لیے یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیے کہ ممکن ہے وہ پہلے ہی کہیں دل لگا بیٹھی ہو اور اب مجبور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں لڑکیاں سب سے پہلے مرد کے جسم پر مرتی ہیں، اس کے بعد دولت پر اور پھر قابلیت پر۔ بمبئی کی لڑکیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ صرف دولت پر مرتی ہیں کہ ان کے نزدیک قابلیت اور جسم دونوں ہی دولت سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ قابلیت تو گھر گھر ٹیوشن پڑھانے والے ماسٹروں میں بھی ہوتی ہے اور مضبوط جسم تو چوکیداروں، مزدوروں اور ڈرائیوروں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے بمبئی میں دولت مند لڑکیاں بھی دولت کی دیوانی ہیں۔ غریب لڑکیوں کا تو خیر ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں انھیں اچانک خزانہ مل جائے، لاٹری لگ جائے یا کوئی ارب پتی ان پر فریفتہ ہو جائے تو ان کا ہارٹ تو نہیں فیل ہو جائے گا۔ امیر لڑکیاں البتہ زندگی کے کسی امتحان میں فیل نہیں ہوتیں، اگرچہ جیسے جیسے آپ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں دیکھیں گے، بدشکلی کی حدوں کو چھوتی ہوئی معمولی شکلیں دکھائی دیں گی۔ پھر اس کریلے پر نیم یوں چڑھتی ہے کہ یہ اکثر ناک پر عینک جمائے رہتی ہیں لیکن یہ ان سب سے یوں بے نیاز رہتی ہیں کہ ان کی بدصورتی کے آگے بارسوخ باپ کی دولت ڈھال بن جاتی ہے کہ دولت جس کی دوست ہو جائے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟ البتہ غریب لڑکیوں کو بارسوخ بننے کے لیے حسین ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اسی لیے عام طور پر یونی ورسٹی کے امتحانات میں یا ملازمت کے انٹرویو میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی لڑکیاں

یا تو مقابلۂ حسن کے لائق ہوتی ہیں یا پھر اُن کے والدین دنیا کا ہر حسن اُن کے لیے خریدنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

میرے شہر میں گھریلو اور ملازمت پیشہ دونوں ہی قسم کی لڑکیاں موجود ہیں۔ گھریلو لڑکیوں کی زندگی انتہائی آسان ہوتی ہے۔ اِدھر والے پڑوسیوں کے راز اُدھر کے پڑوسیوں تک پہنچانا، زندگی کے اہم مسائل پر پڑوسنوں سے چیخ چیخ کر جنگ لڑنا، صفائی کی خاطر کھڑکیوں کو زور زور سے اس طرح بند کرنا اور کھولنا کہ سامنے کی کھڑکیوں میں ہلچل پیدا ہو جائے، وقت ملے تو کھانا پکا لینا وغیرہ۔ ان سب مصروفیتوں میں دن بڑے آرام سے کٹ جاتا ہے۔ ملازمت پیشہ لڑکیوں کا وقت البتہ کاٹے نہیں کٹتا۔ کام تو جو کچھ ہوتا ہے وہ افسران پہلے ہی مردوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اب ان افسروں کی طویل بے معنی گفتگو اور پُرانے لطیفوں پر یہ بے چاری لڑکیاں کب تک مُسکراتی رہیں، آخر جماہیاں آنے لگتی ہیں۔ بار بار میک اپ درست کرنے میں یوں کچھ وقت نکل جاتا ہے کچھ ایک دوسرے کو سچی کہانیاں سنانے میں۔ خیر ملازمت میں یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی ملازمت اختیار کرنے کا اوّلین مقصد ان لڑکیوں کا یہ ہوتا ہے کہ جس دولھے کی تلاش میں کالج میں کئی برس برباد کر دیئے وہ شاید یہیں کسی دفتر میں چھپا ہو یا جہاں کہیں بھی ہو لڑکی کی تنخواہ پر رال ٹپکاتا ہوا چلا آئے۔

آج بھی وہ لوگ جو کسی بھی مقصد سے میرے شہر میں تشریف لانا چاہیں وہ اس مضمون کو پڑھ کر ہرگز مایوس اور بد دل نہ ہوں۔ اگر انھیں ہر اعتبار سے اچھی اور مثالی لڑکیوں کی تلاش ہے تو وہ انھیں ہر اتوار کو انگریزی اخبار کے مینا بازار یعنی MATRIMONIAL یعنی ضرورتِ رشتہ کے صفحہ پر سینکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گی!

زندہ دلانِ حیدرآباد کی
تازہ پیش کش!
ممتاز انشائیہ نگار
ڈاکٹر رشید موسوی
کے بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ

کاغذی ہے پیرہن

قیمت: بیس روپے

* خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور
* صفحات: ۱۴۰ (ڈیمائی)

پاگل عادل آبادی

وہ ہائی جمپ کے ماہر دکھائی دیتے ہیں — کہ موقع ملتے ہی سر پر دکھائی دیتے ہیں

حضور آپ کی یہ بندہ پروری ہے کہ ہم — ہیں ٹھوک پر تمہیں چلّر دکھائی دیتے ہیں

بنے ہیں چندہ کمیٹی کے جب سے وہ خازن — زمیں پہ وہ کے فلک پہ دکھائی دیتے ہیں

اُچھل اُچھل کے دکھاتے ہیں ڈالس پرکرتب — جناب شیخ بھی جوکر دکھائی دیتے ہیں

حرام خوری میں نمبر ہے اُن کا اب اوّل — جو دیکھنے میں قلندر دکھائی دیتے ہیں

چمن کا کیوں نہ ہو پھر ستیاناس اے لوگو — ہر ایک ڈال پہ بندر دکھائی دیتے ہیں

تو کیوں نہ آئے گا جاڑا میری رضائی میں — جدھر بھی دیکھئے پنچر دکھائی دیتے ہیں

تمہارے شہر کا سنتے ہیں حال اُلٹا ہے — کہ دن میں تارے بھی اکثر دکھائی دیتے ہیں

ہوا ہے حال یہ مٹکے میں چھوٹے خالو کا — کہ خود بھی مٹکے کا نمبر دکھائی دیتے ہیں

کیوں آپ حضرت پاگل بھری بہاروں میں
خزاں رسیدہ چقندر دکھائی دیتے ہیں

غزلیں

اِدھر ففٹی ففٹی اُدھر ففٹی ففٹی — ہے دونوں کو دردِ جگر ففٹی ففٹی

جو چیک پوسٹ پہ مال پکڑا گیا تھا — نظر آرہا ہے مگر ففٹی ففٹی

ہے مالِ غنیمت کفن کا یہ ٹکڑا — چلو بانٹ لیں پھاڑ کر ففٹی ففٹی

سیاہی بدن پر تو چہرے پہ لالی — بلاک اور ٹکنی کلر ففٹی ففٹی

ہے سِیل بند بوتل تو لیبل بھی اصلی — ملاوٹ ہے گھی میں مگر ففٹی ففٹی

کمیٹی میں خازن کا عہدہ نہیں ہے — جو ہے معتمد اور صدر ففٹی ففٹی

شبِ وصل اُن کے لبوں پہ تھا ہر دم — اگر ففٹی ففٹی مگر ففٹی ففٹی

نہ پردہ ہی پورا نہ جلوہ ہی پورا — مجھے آرہے ہیں نظر ففٹی ففٹی

کبھی شیر ہے تو کبھی ہے وہ گیدڑ — ہے جورو کا اُسکو بھی ڈر ففٹی ففٹی

اِدھر سے اُدھر سے یہاں سے وہاں سے — تُجھکی جارہی ہے کمر ففٹی ففٹی

اِدھر اِن کو سَردی اُدھر اُن کو کھجلی — ہے موسم کا اُنپر اثر ففٹی ففٹی

تڑی کے بھی ہیں اس میں اشعار تھوڑے — ہے فکر و نظر معتبر ففٹی ففٹی

یہ ڈِسکو دِوانی وہ ڈِسکو دِوانہ
ہیں دونوں تجھی پاگل مگر ففٹی ففٹی

غزلیں

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

باپ بھی جواری ہے ، بیٹا بھی جواری ہے
گھر میں اک جواں لڑکی خیر سے کنواری ہے

نقل جانے کس کس کی آپ نے اُتاری ہے
آپ کی حکومت ہے یا مزاح کاری ہے

ٹیکس وہ لگاتے ہیں جن کی ذمّہ داری ہے
ٹیکس ہم چُراتے ہیں اپنی ہوشیاری ہے

کھود لاؤ نہریں تم، ہم نے بُت بِٹھا ڈالے
راج ہٹ کے پردے میں بال ہٹ بھی جاری ہے

اب تو مردہ خانوں میں زندہ بھی پہنچتے ہیں
آج کوئی پہنچا ہے ، کل کسی کی باری ہے

چاہے کاتیئے چرخہ ، چاہے کاٹیئے جیبیں
یہ بھی دستکاری ہے وہ بھی دستکاری ہے

کالا دھن کماتا ہوں دان پُن بھی کرتا ہوں
یہ بھی کام جاری ہے وہ بھی کام جاری ہے

دعوتیں اُڑا کر تم ، موج میں ہو نیتاؤ
اور تمہاری جنتا پہ اک غشی سی طاری ہے

پہلے صبح کھاتے تھے ہاشمی مگر اب تو
صبح بھی نہاری ہے شام بھی نہاری ہے

شاطرؔ گورکھپوری

کیا جس نے اسے پٹ، اس کو پٹکا
محبت ہے کہ اُف ، بجلی کا جھٹکا

ہر اک لمحہ ہے پٹ جانے کا کھٹکا
ارے توبہ، کہاں دل جا کے اٹکا

گھٹی جاتی ہے مُلّانی کی کُرتی
بڑھا جاتا ہے مُلّا جی کا پٹکا

بڑی پُر پیچ ہیں اُلفت کی راہیں
گیا وہ کام سے جو اِن میں بھٹکا

زمین و آسماں مُنہ تک رہے ہیں
میں یوں شاخِ تمنا میں ہوں لٹکا

جو مل جائے کہیں پھوکٹ کی تاڑی
چڑھا لیں شیخ جی مٹکے پہ مٹکا

سب اپنے تھے مگر جب آ پڑا وقت
مرے نزدیک کوئی بھی نہ پھٹکا

میں اُلفت کا وہ دروازہ ہوں جس میں
نہ ہنجس ہے نہ قبضہ ہے نہ کھٹکا

غزل سنتا تھا لے کر مزے وہ
مگر مقطع مرا سنتے ہی چٹکا

بہت آسان ہے اُن تک رسائی
نہ ہو دل میں جو پٹ جانے کا کھٹکا

نہ سمجھیں آپ مجھ کو کاغذی نوٹ
پُرانا ہوں مگر سکّہ کلکتا

مری تشنہ لبی پہ ہنسنے والے
لگے اک دن تجھے بھی کاش گھٹکا

یہ حالت ہے اسمبلیوں کی شاطرؔ
تماشا ہو رہا ہو جیسے نٹ کا

بانو سرتاج
[چندرپور]

میں شکرگذار ہوں.....

ہمارے
پاس پی ایچ ڈی
کے مقالے جانچ کے
لیے مختلف یونیورسٹیوں
سے آتے ہی رہتے ہیں اور ہم
مصروف ممتحنوں کی طرح ابتدائی ایک
مہینہ اُس پر نظر بھی نہیں ڈالتے۔ جلد از جلد
رپورٹ وہ ممتحن بھیجتے ہیں جنھیں یا تو یہ زرین
موقع پہلی مرتبہ ملا ہوتا جنھیں اہم ذمہ داریاں ہمیشہ
نہیں سونپی جاتیں۔ بلکہ کبھی کبھار غلطی سے ایسا ہو جاتا ہے۔
بڑا ممتحن وہ ہوتا ہے جو نہایت مصروف رہتا ہے یا ظاہر
کرتا ہے۔ ہم مصروف ممتحنوں کی فہرست میں اپنا نام
درج کرانے کے لیے کوشاں تھے اِس لیے مقالہ
موصول ہونے پر ہم اُسے فوری طاق پر رکھ
دیا کرتے، ایک دو ماہ بعد پیکنگ
کھول کر مقالے کے درشن کرتے
تیسرے مہینے میں ایک
بیجا و غلط انداز
ڈال کر مقالہ
نگار

کے نام
و مقام سے
واقفیت حاصل کرتے
چوتھے مہینے میں مقالے
کی جانچ کرتے پانچویں مہینے
میں رپورٹ تیار کرتے۔ تب تک
یونیورسٹی سے یاد دہانی کے دو تین خطوط
آجاتے۔ مگر ہم انتظار کرتے تار کا۔ جیسے ہی
یونیورسٹی کا تار آتا کہ رپورٹ بھیجو۔ ہم رپورٹ
ارسال کر دیتے۔ مگر ان دنوں ہم پر اداسی کے دورے
پڑ رہے تھے۔ بیگم میکے سے لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی
تھیں اس لیے موضوعِ بحث مقالہ ہمارے پاس آیا
تو ہم نے فوراً اُسے کھول لیا کہ کچھ تو ہو جس
سے دل بہلایا جائے۔ دوسرے محقق
سب سے پہلے مقالے کا خلاصہ
پڑھتے ہیں ہم تہنیت نامہ
پڑھتے ہیں۔ ہم چاہتے
ہیں کہ خوشگوار
موڈ میں
مقالے

کو جانچیں اور موڈ خوشگوار بنانے کے لیے تہنیت نامے سے زیادہ دلچسپ اور کون سی تحریر ہو سکتی ہے مقالہ نگار اپنے گائیڈ سے آغاز کر کے اپنے خاندان کے افراد اور ہر اُس شخصیت کے تئیں اپنی ممنونیت کا اظہار کرتا ہے جس سے تحقیق کے دوران اُس کا ذرا سا بھی بھلا ہوا ہو گا ئیڈ کی نگاہِ کرم (دستخط) کے بغیر تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں جمع نہیں ہو سکتا اس لیے ابتداء گائیڈ کی مدح سے ہوتی ہے۔ بلا تامل اُسے جیّد عالم، با صلاحیت رہنما، زائچ دل شخصیت کے خطاب عطا کر کے وہ گائیڈ کی پتنی کی طرف روئے سخن کرتا ہے اور دو تین جملوں ہی میں سہی مگر اُن کی مدح کرنا ہرگز فراموش نہیں کرتا۔ بعد اس کے کالج کے پرنسپل اور اگر کسی ادارہ میں ملازم ہے تو صدر، سکریٹری اور دیگر ممبران کو مکھن لگاتا ہے پھر اپنی فیکلٹی کی چند بھاری بھرکم شخصیات کا ذکر کرتا ہے کہ ڈاکٹر فلاں اور ڈاکٹر پروفیسر فلاں فلاں نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا . . . . شریکِ حیات کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ گھر میں چاہے جوتیوں دال بٹتی ہو مگر تہنیت نامہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کی قربانیوں کے طفیل ہی تحقیق کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ خواتین زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ بے انتہا نفرت کرتی ہیں تو محبت کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ تہنیت نامے میں مجازی خدا کے ساتھ ساتھ اپنے جگر گوشوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حال کے ساتھ مستقبل پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ایک تحقیقی مقالے میں ایک خاتون نے کچھ اس طرح اظہارِ ممنونیت کیا تھا . . . . کہ . . . . میرے جنت نشیں نانا جان (سابق ایم ایل اے) کی خواہش پر میں نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا ہر چند کہ ہائیکورٹ جج چچا اور کمشنر ماموں کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔ اکاؤنٹس آفیسر شوہر اور انجینئرنگ کے طالب علم دونوں فرزندوں نے اعداد و شمار میں مدد کی۔ ڈاکٹر بھائی جان نے گائیڈ کیا۔ پرنسپل خالہ نے لائبریری کی سہولیات بہم پہنچائیں، وغیرہ وغیرہ۔ سات صفحات کا تہنیت نامہ تھا . . .

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ایک دوست کے مطابق ہم نے مقالے کی جانچ کی بجائے تہنیت نامہ سے کی اور خود فراموش ہو گئے۔ کیا جدت طراز ذہن تھا! کیا غضب کا انداز بیاں تھا! کیسی الوکھی تحریر تھی! آپ بھی پڑھیئے . . . . لکھا تھا۔

" اظہارِ ممنونیت نہایت ہی فضول لیکن ضروری رسم ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا ہر مقالہ نگار کے لیے لازم ہے۔ تحقیقی کام مکمل کرنے کسی کا بھی مشکور نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے دنیا میں آ کر پیدا کرنے والوں (خدا، ماں باپ) کی حقیقت سے انکار کر دینا۔ ہر چند کہ دنیا میں کچھ ایسے شخص بھی ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ آسمان سے ٹپکے یا زمین سے اُگے ہیں مگر کوئی تحقیقی مقالہ بغیر تہنیت نامہ کے پیش نہیں ہوتا۔

تحقیق کی کتابوں میں لکھا ہے (کس نے لکھا ہے؟ کون سی کتاب میں لکھا ہے یہ اس وقت ہمیں یاد نہیں) کہ اگر گائیڈ سے تمہارے تعلقات خوش گوار ہیں تو اظہارِ ممنونیت کرو۔ اگر تعلقات خوشگوار نہیں ہیں تو ضرور یہ ضرورِ ممنونیت کا اظہار کرو یعنی خوب مکھن لگاؤ . . . مگر میں اپنے گائیڈ کے تئیں شکریے کا اظہار کیوں کروں میں نے پورے ساڑھے پانچ برس تک انہیں مکھن لگایا ہے . . . جب بھی ان کے گھر گیا آنند بھنڈار کے دس گلے ضرور لے گیا۔ اُن کے فرزند کی شادی میں دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اُن کی نواسی کی سالگرہ میں چاندی کی پازیب نذر کی اُن کی بیگم کا بلڈ پریشر چیک کرانے تین مرتبہ اسپتال لے گیا۔ وغیرہ۔

میں اپنے کالج کے پرنسپل اور اسٹاف کے ممبران کا جھوٹ موٹ بھی شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ لوگ میرے منہ پر تو کچھ نہ کہتے تھے میرے پیچھے طعنہ زنی کرتے تھے کہ (مجھے میرے معتمد چپراسی نے بتایا) دیکھتے ہیں پی ایچ ڈی

کیسے کرتا ہے؟ دیکھ لی صورت پی ایچ ڈی کرنے والوں کی!

جن افراد نے میرے تحقیقی کام میں میری مدد کی، اُن سب کی کوئی نہ کوئی غرض اس میں پوشیدہ تھی (ورنہ کون کسی کے کام آتا ہے) مثال کے طور پر میری نصف بہتر۔ اُس نے پورے ساڑھے پانچ برس، تحقیقی کام کے دوران مجھے مکمل تعاون دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو ڈاکٹر شوہر ملے تھے اور وہ سخت احساس کمتری میں مبتلا تھی وہ جلد از جلد میرے نام کے آگے ڈاکٹر کا اضافہ چاہتی تھی۔ میں اُسے احساسِ کمتری سے نجات دلانے جا رہا ہوں اس کے لیے اُسے میرا مشکور ہونا چاہیئے نہ کہ مجھے اُس کا۔

جن یونیورسٹیوں کی لائبریری میں جا کر میں نے مطالعہ کیا اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت میں نہیں سمجھتا۔ لائبریرین کا تقرر ہی اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ مطالعے کے لیے کتب بہم پہنچائے (کتب فراہم کرتا ہے تو کوئی احسان نہیں کرتا)

ٹائپسٹ نے مانا کہ ٹائپ بہت عمدہ کیا ہے مگر یہ اُن کے پیشے کے لیے ضروری ہے۔ (خراب ٹائپ کرے گا تو اُس کے پاس جائے گا کون) پھر اُس نے تمام رقم پیشگی وصول کی تھی۔ مقالہ ٹائپ کرنے سے پہلے ہم میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ اگر میں کسی صفحے کی ٹائپنگ سے مطمئن نہ ہوا تو صفحہ اُسے دوبارہ ٹائپ کرنا ہوگا اور اگر کسی صفحے کی ٹائپنگ نے مجھے خوش کر دیا تو فی صفحہ پچیس پیسے میں اُسے انعام دوں گا۔ اُس چالاک نے ایک بھی صفحے سے غیر مطمئن نہ ہونے دے کر اپنی محنت تو بچائی ہی پچھتر روپے انعام کے بھی جھٹک لیے۔

میں میرے سبجکٹ کے ماہرین اور اساتذہ حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی فضول سمجھتا ہوں جنھوں نے میرے سوالنامے کا خاطر خواہ رسپانس نہیں دیا۔ البتہ میں شکر گزار ہوں . . . ـــ سوالنامے کو رسپانس نہ دینے والوں کا ـــ انہوں نے سوالنامے کو چاہے ردی میں فروخت کیا ہو، بچوں کو ناؤ بنا کر دی ہو، چولھے میں جلایا ہو چاہے جو کیا ہو مگر اُلٹے سیدھے بے تکے جوابوں سے بھر کر یا غلط نشانات خود یا بچوں سے لگوا کر نہیں بھیجا اور میرا سر درد ہونے سے بچایا۔ ساتھ ہی ان حضرات نے واپسی کے لیے رکھے گئے لفافے کو ۲ روپے دس پیسے کے ڈاک ٹکٹوں کے ساتھ ہضم کر کے مجھ پر احسان کیا کیونکہ وہ اس طرح زندگی بھر کے لیے میرے مقروض ہو گئے۔ اِس تحقیقی کام کے فیض سے آج ڈھائی سو سے زیادہ اشخاص میرے مقروضوں کی فہرست میں آگئے ہیں۔

مشہور مزاح نگار مارک ٹوئین نے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے بتایا۔ "میرے بچپن کا زمانہ انتہائی مفلسی کا زمانہ تھا۔ ہم لوگ اس قدر غریب تھے کہ اپنے گھر کی حفاظت کیلئے ایک کتا بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ رات کو جب کوئی آہٹ سنائی دیتی تو ہمیں خود ہی بھونکنا پڑتا تھا۔"

★

اپنے گائیڈ کے گھر پر موجود رہ کر نہ ملنے کی وجوہات کا۔ جنھوں نے مجھ میں قوتِ برداشت کو فروغ دیا۔ غصہ پی جانے اور ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی اہلیت پیدا کی۔ میری خودداری جو ہر جگہ میرے آڑے آتی تھی بالائے طاق رکھنے میں مدد کی ـــ اُس روڈ ٹرانسپورٹ کمپنی کا۔ جس نے میرے شہر سے گائیڈ کے شہر تک پہنچنے کے لیے پانچ سو پچاس چکروں میں سے پانچ سو بار اپنی ڈائریکٹ خدمات سے مجھے مستفیض کیا۔

ـــ ریلوے کے محکمے کا۔ جس نے پانچ سو پچاس چکروں میں سے پچاس بار بس چھوٹ جانے پر اپنی ریلوں میں مجھے سفر کرنے کا موقع دیا۔

ـــ اُس بھورے کتے کا۔ جس نے گائیڈ کے گھر سے مجھے بے نیل و مرام لوٹتے دیکھ کر کبھی میرا مذاق نہیں اڑایا بلکہ دُم..

دف کر کے ہمدردی کا اظہار کیا۔

— اس سبزی والے کا۔ جس کی دکان پر کھڑا ہو کر میں گائیڈ کے لوٹنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ جہاں مجھے سبزیوں اور اُن کے داموں کی اتنی پہچان ہو گئی تھی کہ بُرا وقت پڑنے پر (خدانخواستہ) میں اس سے پوری طرح فیض یاب ہو سکتا تھا (یعنی پروفیسری نہ ہوتی تو سبزی بیچ کر گزارا کر سکتا تھا) اور جہاں مجھے ایک مرتبہ پرول دکھائی دے گئے تھے اور آگرہ چھوڑنے کے دس برس بعد میں اپنی والدہ کی خدمت میں پرول پیش کر سکا تھا۔

— اُس رکشے والے کا۔ جو بس اسٹانڈ پر مجھے منجدھار میں کبھی نہ چھوڑتا... مجھے وہاں پہنچا کر وہ میرا منتظر رہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گائیڈ گھر پر ملیں گے نہیں اور مجھے فوراً لوٹنا ہوگا۔

— اُس بنگلے کا۔ جو گائیڈ کے کوچے میں دیکھتے ہی 'چڑیا اُڑ گئی' کا نعرہ لگاتا دراصل جس طرح بجلی چمک کر بادل کی گرج کا پتہ دیتی ہے وہ مجھے اشارہ" واضح کر دیتا تھا کہ بیٹا' وہاں تک جا کر کیا فائدہ؟ یہیں سے لوٹ جاؤ۔"

— جمہوری کی اُس آرگنائزیشن کا۔ جس نے اپنی صد سالہ تقریبات کے لیے میرے گائیڈ کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا۔ اور جس کی وجہ سے میری تین دنوں کی چھٹی ایل۔ ڈبلیو۔ پی ہونے سے بچ گئی۔ اُن دنوں گائیڈ نے مجھے فوری طلب کیا تھا مگر خود تقریبات میں شریک ہونے چلے گئے تھے اس لیے لوٹ کر میں نے ڈیوٹی جوائن کر لی اور تین دن کی تنخواہ بچالی۔

— گائیڈ کی دھرم پتنی کا۔ جو میرے ساتھ نہایت رحم دلی سے پیش آتی تھیں۔ گائیڈ کی عدم موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ٹھنڈے پانی کا گلاس مزید پیش کرتی تھیں مگر گھر کے بھیدی کی طرح لنکا نہ ڈھاتی تھیں یعنی کبھی نہ بتاتی تھیں کہ اُن کے "پتی دیو" کہاں گئے ہیں؟ کب لوٹیں گے؟

— محکمہ تار کا۔ جس نے میرے پہنچنے کی اطلاع گائیڈ کو بروقت کبھی نہ دی اور اس ٹھوس عذر کی وجہ سے گائیڈ کو میرے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔

— ڈاکٹر الف کا۔ جنھوں نے گائیڈ کے خواہ مخواہ دوڑ کرانے پر بھی میرا بلڈ پریشر نارمل رکھا۔

— ڈاکٹر بے کا۔ جنھوں نے ایک مرتبہ گائیڈ کے انتقال کی جھوٹی خبر سننے کے بعد بھی میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے سے بچایا۔

— ڈاکٹر پے کا۔ جنھوں نے جھوٹے میڈیکل سرٹیفکٹ دے کر مجھے چھٹی دلائی۔ سرٹیفکٹ میں نئی نئی بیماریوں کے نام لکھ کر میرے علم میں اضافہ کیا۔

اس تہنیت نامے کو پڑھ کر ہم پر تین باتیں واضح ہوئیں: اوّل تو یہ کہ مقالہ نگار اور اُس کے گائیڈ "طول شب فراق" کی طرح خاصی دوریوں پر بستے ہیں۔ دوئم یہ کہ ہر گائیڈ کی طرح اِس گائیڈ نے بھی اسٹوڈنٹ کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ سوئم یہ کہ... تحقیق نگار، تحقیق سے کم، اِن چکروں سے زیادہ عاجز آیا۔

ہم نے مقالے کا جائزہ کر کے رپورٹ تیار کی۔ ساتھ ہی یونیورسٹی کو لکھ دیا کہ مقالہ نگار کو زبانی امتحان کے لیے ہمارے پاس بھیجا جائے۔ وہ بے چارہ فوراً سے پیشتر پہنچا۔ تیس بتیس برس کا سنجیدہ جوان تھا۔ ہم نے کہا "ہم تم سے صرف دو سوالات پوچھیں گے جوابات تشفی بخش ہوئے تو سمجھو تم پاس ہو گئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس تہنیت نامے کے ساتھ تم نے گائیڈ کے دستخط حاصل کرنے میں کیوں کر کامیابی حاصل کی؟ دوسرے کیا تم اَدب میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

وہ ہکا بکا ہمیں دیکھتا رہ گیا۔ کئی منٹ کی خاموشی کے بعد کہا، "میں تنگ آگیا تھا۔۔۔ سر! میرا پرہوش رک گیا تھا۔۔۔"

ہم نے قطع کلام کیا۔ "وہ ہم سمجھ گئے۔ تم سوال کے جواب دو۔ یہ دیکھو او۔ کے رپورٹ ہم نے تیار رکھی ہے۔ تمہارے جواب سے ہم مطمئن ہوئے تو رپورٹ ابھی اسی وقت تمہارے سامنے پوسٹ کر دیں گے۔"

"اب جو ہوگا سو ہوگا" وہ طویل سانس لے کر بولا "سنئے۔ گائیڈ کو جو کاپی ہم نے دی تھی اس میں مدلل اعلیٰ انداز کا تہنیت نامہ تھا۔ بقیہ چار جلدوں میں اس طرح کا تہنیت نامہ شریک کیا وہ آپ کے سامنے ہے گائیڈ نے اپنی والی کاپی کا تہنیت نامہ پڑھ کر سب پر دستخط کر دیئے۔"

"بہت خوب!" ہم نے تعریفی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔۔ "دوسرے سوال کا جواب"!

"میں طنز نگار ہوں۔ فلاں فلانوی کے نام سے لکھتا ہوں۔"

"گڈ! تو ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔۔۔ یہ لو۔۔۔ تمہارے مقالے کی رپورٹ ہم ابھی یونیورسٹی کو روانہ کر رہے ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

وہ تذبذب کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس تجربے سے ہم نے دو باتیں گرہ میں باندھیں کہ کبھی کسی طنز نگار کو گائیڈ نہیں کریں گے دوسرے جب ہمارے اسٹوڈنٹ تحقیقی مقالہ ہمارے پاس دستخط کے لیے لائیں گے تو ہم مقالے کی سبھی جلدوں کا تہنیت نامہ پڑھ کر ہی دستخط کریں گے۔ ▭▭

قمرالزماں قمر (کراچی)

نذرانۂ عقیدت

حضرت برق آشیانوی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر

ہے گلستانِ ظرافت میں بہت آہ و فغاں
آشیاں گریہ کناں، "ہے مزہ جلنے میں کہاں"

ہنستے ہنستے بھی دیا جس نے تبسم کو وقار
جسکی امواجِ تبسم تھی زمانے میں رواں

جو تھا میدانِ ظرافت کا درخشاں تارا
اور اَدب ہائے ظرافت پہ تھا جس کا احساں

اُس کے اک ہاتھ میں روشن تھا ظرافت کا چراغ
دوسرے ہاتھ میں وہ طنز کی رکھتا تھا سِناں

جس کی تحریر میں تھی کامِ و دہن کی لذت
جسکے اشعارِ ظرافت تھے ہی خواہِ زماں

برق وہ برق کہ جو آج تہہ خاک گئی
لئے آوازِ ظرافت سرِ افلاک گئی

محبوب مانجھومی (بلاسپور)

غزل

مسکا انہیں لگائیے فوراً سے پیشتر
یوں بانس پر چڑھائیے فوراً سے پیشتر

ندے میں لنچ کھائیے فوراً سے پیشتر
مرغ و مٹن اڑائیے فوراً سے پیشتر

لانا جو آپ کو ہے اگر سبز انقلاب
اک پیڑ خود اگائیے فوراً سے پیشتر

پہلی ہے آج ماہ کی تنخواہ کا ہے دن
دفتر کو آپ جائیے فوراً سے پیشتر

حاضر گدھا ہے جب بھی ضرورت پڑے کبھی
اس کو "پتا" بنائیے فوراً سے پیشتر

گنیئے نہ پیڑ، وقت کو ضائع نہ کیجئے
بس آم آپ کھائیے فوراً سے پیشتر

اے شیخ گر ہے آپ کو جمناسٹک کا شوق
تھوڑا وزن گھٹائیے فوراً سے پیشتر

محبوب لٹ رہی ہے مئے ناب بے دریغ
فیض آپ بھی اٹھائیے فوراً سے پیشتر

"نیتا"

بھاشن ہو اگر دینا تو تیار ہے نیتا
"جو لام پہ جانا ہو تو بیمار ہے نیتا"

لگتا ہے کہ ہے جاہلِ مطلق وہ سراسر
الٹا جو لئے ہاتھ میں اخبار ہے نیتا

کیا قوم کی بربادی کا احساس ہے اسکو
کیا دیش کی حالت سے خبردار ہے نیتا؟

بس وعدے ہی وعدے ہیں دلاسے ہی دلاسے
لگتا ہے فقط غازیٔ گفتار ہے نیتا

گھپلا جو نہ کر پائے کروڑوں کی رقم کا
میدانِ سیاست میں وہ بیکار ہے نیتا

پھر پانچ برس بعد مرے گاؤں ہے آیا
پھر دیکھئے ووٹوں کا طلبگار ہے نیتا

چمچے کی طرح کیوں نہ رہوں ساتھ میں اسکے
بچپن کا پرانا جو مرا یار ہے نیتا!

کرسیٔ صدارت کہ قلمدانِ وزارت
اس کے لیے لڑ مرنے کو تیار ہے نیتا

کیا دَور الیکشن کا قریب آیا ہے محبوب
جنتا کی خوشامد میں گرفتار ہے نیتا

عابد معز
(حیدرآباد)

سگ گزیدہ

انگریزوں کو کتّے پالنے
کا شغف ہے تو اردو مزاح نگاروں
کو کتّوں پر مضمون لکھنے کا شوق ہے۔ کتّوں پر
مضمون لکھنا ایک روایت بن گئی ہے۔ اگر اردو مزاح
کا کتّوں سے اسی طرح اُنس باقی و برقرار رہا تو عجب نہیں کہ مستقبل
میں "کتّے" پر مضمون لکھنا مزاحیہ نگاری کی شرط ٹھہرائی جائے گی۔ جس نے بھی
کتّوں پر مضمون لکھا وہ مزاح نگار ہوا۔ بصورت دیگر اُسے ادب کی کسی اور صنف میں طبع آزمائی
کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ پچھلے چند سال سے ہم مزاح لکھ رہے ہیں۔ نقادوں نے ابھی ہمیں مستند
مزاح نگار کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا ہے چنانچہ ہم نے اپنی حیثیت منوانے اور اپنا مقام متعین کروانے کے لیے
کتّوں پر مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ ہمارے نزدیک کتّوں پر مضمون لکھنا "KEY TO URDU HUMOUR" کے مترادف
ہے۔ کئی دن اور کئی رات بے چین و بے قرار رہے کہ کتّوں پر کیا لکھیں۔ اردو مزاح نگاری میں کتّوں کے تعلق سے
شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچا ہوگا جس پر مزاح نگاروں نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ مزاح نگاری کے باوا آدم
پطرس نے کتّوں کا ایسا شاندار مشاعرہ منعقد کیا کہ مشتاق احمد یوسفی کو کہنا پڑا "کتّے کی
تخلیق کا واحد مقصد پطرس کا مضمون ہے اور اس مضمون کے بعد اس نسل کو زندہ
رہنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔ پطرس کے لاجواب مضمون کے بعد جب
کتّوں کی نسل کو ہی زندہ رہنے کا حق نہیں ہے تو پھر کتّوں
پر مضمون لکھنے کا سوال کہاں اُٹھتا ہے۔
اگر کچھ کسر باقی بھی رہ گئی تھی تو وہ
پیش رو مزاح نگاروں

نے پوری کردی تھی۔ ہمارے لیے کتوں کے تعلق سے سوائے مایوسی اور ناامیدی کے کچھ بچا نہ تھا۔

ایک شام پبلک گارڈن کے خاموش گوشہ میں تنہا بیٹھے گھنٹہ دو گھنٹہ سوچنے کے بعد، ہم ملنبیا یہ مزاح نگار بن سکنے کی محرومیوں کا طوق گلے میں ڈالے کتوں پر مضمون لکھنے کا ارادہ ترک کئے بوجھل قدموں سے لڑکھڑاتے گھر لوٹ رہے تھے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بحیثیت مزاح نگار ہمارا مستقبل تاریک ہو چکا تھا کہ ناگاہ ہمارے اوپر قیامت ٹوٹ پڑی۔ لوگوں کی "ہائے ۔ ۔ ۔ ہائے ۔ ۔ ۔" کتے کا بھونکنا اور ہماری ران سے بہتے ہوئے خون نے ہماری سوچنے اور بولنے کی قوت جیسے سلب کردی تھی۔ لوگوں نے سہارا دے کر سمنٹ کی کرسی پر بٹھایا۔ پینے کے لیے پانی دیا۔ دبی آواز میں ہم نے پوچھا "کیا ہوا؟" چند ایک نے ہمیں ڈانٹا "کیا ہوا! کتے نے کاٹا ہے۔ جناب اپنے خیالوں کی دنیا آباد کئے جھومتے آرہے تھے لیٹے ہوئے کتے پر نظر نہیں پڑی، اس پر پیر رکھ دیا۔ کتے نے بھی جواباً مسلم ران کو نوالہ بنالیا" ہمارے منہ سے بے اختیار نکلا "شکر ہے" محسوس ہوا اردو مزاح نگاری میں ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔ ہماری زبان سے شکر ہے سن کر لوگوں نے فقرے کسے "میں نہ کہتا تھا کہ یہ شخص پیا ہوا ہے" ادھر کتے نے کاٹا ادھر دیوانہ پن شروع ہوا۔ اس فقرے نے ہمیں مزاح نگاری سے نکال کر ہوش و حواس کی دنیا میں لا پٹکا۔

لنگڑاتے ہوئے ہم ڈاکٹر کے یہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب زخم دیکھنے کے بجائے واردات کے تعلق سے تفتیش کرنے لگے۔ "کتا کیسا تھا؟ کس کا تھا؟ کتے نے بھونک کر کاٹا ہے کہ بغیر بھونکے کاٹا ہے؟ وہ عقل مند تھا کہ پاگل؟ آپ کے علاوہ اس کتے نے کسی اور کو بھی کاٹا ہے؟ کتے نے کیوں کاٹا، کیا آپ نے پہل کی تھی؟ اس سے پہلے بھی کیا آپ کو کسی کتے نے کاٹا تھا؟" ڈاکٹر صاحب کے ہر سوال کا جواب ہمارے پاس "اردو مزاح نگاری" تھا لیکن ہم ہر سوال کے جواب میں "نہیں معلوم" کہتے گئے۔ ڈاکٹر صاحب ہماری نادانی کا فائدہ اٹھا کر ہمیں ڈرانے لگے۔ ہمیں ڈاکٹر اور واعظ اس لیے پسند نہیں آتے کہ اول الذکر موت سے ڈرا دھمکا کر بیماری کا علاج کرتے ہیں تو موخر الذکر دوزخ کا نقشہ کھینچ کر متقی و پرہیزگار بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب گویا ہوئے "کتا کاٹنے سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ آپ کتے کا پتہ لگیئے۔ اس کی چال چلن اور عادات و اطوار پر نظر رکھیے۔ آنے والے دس دن بہت خطرناک ہیں۔ اس دوران اگر کتا مر گیا تو سمجھئے ـــ

آج وہ، کل ہماری باری ہے

ان دس دنوں میں آپ کو ہر روز ایک انجکشن لینا پڑے گا۔" موت کے تصور سے ہمارا روم روم لرز اٹھا اور ادھر ڈاکٹر صاحب لحیم شحیم انجکشن لیے ہمارے سر پر آ ٹھہرے۔ کتے کی مناسبت سے انجکشن بڑا حیوانی تھا۔ کتا، انجکشن اور ڈاکٹر صاحب کے مثلث سے دس دن میں ہونے والی موت INSTANT COFFEE کی طرح آناً فاناً تیار ہوتی نظر آئی لیکن ہمیں کتے کی موت مرنا گوارا نہ تھا اس لیے انجکشن لینے کے لیے اپنا بازو آگے کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے آفر کو ٹھکراتے ہوئے شرٹ اٹھا کر پیٹ میں انجکشن دے دیا۔ انجکشن کی تکلیف بھی کتا کاٹنے کے درد سے کم نہ تھی اور انجکشن کی سوئی اتنی موٹی تھی کہ ہمیں لگا محمد علی کلے نے پیٹ میں مکہ مارا ہے۔ فیس کے نام پر ڈاکٹر صاحب نے اتنی ہی رقم اینٹھ لی جتنی کہ ہمیں یگرانٹ الاونس کے طور پر ملتی ہے۔

کتے اور ڈاکٹر صاحب کا ظلم و ستم برداشت کرکے رات دیر گئے گھر پہنچے۔ بیوی کو ہم نے کتا کاٹنے کی روداد سنانے کی بجائے حادثہ کی ایک فرضی داستان سنادی۔ یہ احتیاط ہم نے اس لیے برتی کہ کتا کاٹنے کی پریشانیوں سے کم از کم بیوی محفوظ رہے۔ لیکن ہمارا (۳) سفید جھوٹ کا اثر الٹا نکلا۔ بیوی نے زخم دیکھا اور منہ پھلائے، پیر پٹکتے ہوئے بستر

میں چھپ کر ہمیں بُرا بھلا کہنے لگی "اس عمر میں عشق لڑاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ سفید بالوں اور بچوں کا تو خیال کرو۔ کلموہی نے کس بے دردی سے کاٹا ہے" چاروناچار ہمیں حقیقت اگلنا پڑا لیکن بیوی نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ہم نے کہا "بندۂ خدا تم دوسری طرف کاٹ کراپنے دانت کے نشان لگاؤ اور دونوں کا تقابل کرو" بیوی چراغ پا ہوگئیں "میں تمہاری بیوی ہوں کوئی دشمن نہیں کہ ایسا کروں" پھر ہم نے اپنا پیٹ دکھایا جہاں پر انجکشن کی جگہ مزید ایک چھوٹا پیٹ ابھر آیا تھا۔ اپنی اور اپنی بیوی کی قسم کا اعتبار تو تھا نہیں، بچوں کی قسمیں کھائیں تب کہیں بیوی نے یقین کیا۔ زخم کو غور سے دیکھا اور کتے کو کوسنے لگیں "۔ ۔ مواکسی لاری کے نیچے آکر مرجائے" ہم نے فوراً بیوی کا منہ بند کیا "ایسی بدشگونی نہ نکالو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میری جان کتے میں ہے دس دن کے لیے" پھر ہم نے انھیں ڈاکٹر کی ہدایات سمجھائیں۔ بیوی اپنے سہاگ کی خاطر کتے کی درازی عمر کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انھوں نے یہ بھی دعا کی "میری عمر اس کتے کو لگ جائے"!

> ساس کو شکایت تھی کہ اس کا بیٹا بہو کو اس سے زیادہ چاہتا ہے۔ ایک دن اس نے بیٹے سے امتحان لینے کے لیے پوچھا "بیٹے اگر میں اور بہو دریا میں ڈوبنے لگیں تو تو کس کو پہلے بچائے گا؟" ـــ لڑکا پریشان ہوکر بیوی کو دیکھنے لگا۔ بیوی نے مشورہ دیا کہ تم اپنی بوڑھی ماں کو بچالینا۔
> "تجھے کیوں نہیں؟" ساس نے پوچھا۔
> "مجھے نکالنے کیلئے تو بہت سے آدمی دریا میں کود پڑیں گے!"
> بہو نے اطمینان سے جواب دیا۔

دوسرے دن ہم لکڑی کا سہارا لیے کتے کی تلاش میں نکل پڑے۔ ہر کتے پر گمان گزرتا کہ ہمارا شریک زندگی یہی کتا ہے۔ پریشانی میں ہمیں کتے کا حلیہ بھی یاد نہ رہا۔ اگر کتے کی جنس کا ہی اندازہ ہوتا تو ڈھونڈنے میں پچاس فیصد سہولت حاصل ہوجاتی۔ یادوں کے سہارے اس مقام پر پہنچے جہاں کتے نے ہمیں کاٹا تھا۔ ایک صاحب جنھوں نے شاید ہماری مدد کی تھی، ہمیں پہچانا اور کہا کیوں اہنسا وادی! آج دوسری ٹانگ پیش کرنے آئے ہو؟ ہم نے سوچا انھیں انسانوں سے دشمنی اور کتوں سے ہمدردی ہے۔ ہمارے درمیان اس قسم کے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جن کی ترجمانی ایک فرانسیسی ادیبہ نے یوں کی ہے "آدمیوں کو جتنا قریب سے دیکھتی ہوں اتنا ہی کتے اچھے لگتے ہیں" ہم نے ان کے جذبۂ حیوانی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "بھائی ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کررہا ہوں۔ میری زندگی کے لیے اس کتے پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ کتا کہاں ہے اور کس کا ہے؟ ابھی ہم اپنا سوال مکمل بھی کرنہ پائے تھے کہ ایک نحیف وناتواں کتا ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ کتے نے اپنے شکار کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی کتا تھا جس کے دانت ہمارے جسم میں پیوست ہوچکے تھے۔ ہم نے اُسے بغور دیکھا کتا ہمارا ہم جنس تھا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کتا ہماری بیوی کا ہم جنس نہیں ہے ورنہ جذبہ رقابت میں ہمارا حشر بُرا ہوتا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ کتے کا مالک ایک فقیر منش انسان ہے۔ جس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ اس نحیف وناتواں کتے کا نام الکزینڈر ہے۔ نام سن کر خوشی ہوئی کہ ایک نامی وگرامی کتے نے کاٹا ہے۔ اُسے خراج پیش کرنے کے لیے ہم نے الکزینڈر کے ساتھ دی گریٹ کا اضافہ کردیا۔ کتے کے مالک سے ملاقات ہوئی۔ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے پہلے ہی وہ ہمارے سر ہوگئے "آپ نے کتے کی عادت خراب کی ہے۔ اب تک یہ ویجیٹرین تھا۔ میرا بچا کچا کھانا کھالیا کرتا تھا لیکن آپ نے اُسے نان ویجیٹرین لقمہ پیش کرکے اس کا ذائقہ بدل دیا ہے۔ کل سے وہ نان ویج غذا کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے" ہم انھیں جتنا سمجھاتے کہ کتا پیدائشی طور پر نان ویج مخلوق ہے، اتنا ہی وہ طیش میں آتے۔ آخر ہم نے معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے کچھ روپیہ ان کے ہاتھ میں رکھے۔ پیسے ہاتھ میں آتے ہی موصوف نے کتے کو ڈانٹ کر خاموش کیا

جواب تک ہم پر بھونکے جا رہا تھا۔ کتے کی عادات و اطوار اور دوسری چند ضروری اور غیر ضروری معلومات اکٹھا کر کے ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ انھیں تفصیلات بتلائیں جس پر انھوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا اور مزید لوذن لونی کتے پر نظر رکھنے کی تاکید کی۔ وہ ہمارے پیٹ میں انجکشن دینا نہیں بھولے۔

دوسرے دن جب ہم کتے سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے تو بیوی نے ایک عرصہ بعد بڑے پیار سے ہاتھ میں ایک توشہ دان دیا۔ پرانا پیار لوٹ آنے پر ہم بھی پیار بھرے کلمات ادا کرنا چاہتے تھے کہ بیوی نے کہا "اوپر کے ڈبے میں چیچھڑوں کا دلیا اور نیچے کے ڈبے میں دہی کھانا ہے۔ پیٹ بھر کھلا کر آیئے۔" ہم لاحول پڑھنا چاہتے تھے لیکن اپنی موت کے خیال سے جزاک اللہ کہنا پڑا۔ معہ توشہ دان ہم کتے اور اس کے مالک کی خدمت میں پہنچے۔ کتے کے مالک نے اپنے لیے کچھ نہ لانے پر نقل مقام کی دھمکی دی۔ ہم نے انھیں سمجھایا کیوں کل مرنے والے کو آج مارتے ہو۔ ہم ایک شریفانہ معاہدہ کرتے ہیں۔ جب تک تم یہاں رہو گے ہم تمہیں بھتہ دیں گے۔ وہ آمادہ ہوئے اور دہی کھانا کھا کر ڈکار لی۔ ادھر کتے نے چیچھڑوں کا دلیا ختم کر کے دُم ہلائی۔ ہم دونوں کو شاد کر کے ڈاکٹر صاحب کے پاس انجکشن لگوانے گئے۔

ہمارے دفتر میں اطلاع ہو چکی تھی کہ ہمیں کتے نے کاٹا ہے۔ دوست احباب منہ موڑنے لگے۔ لنچ پر ہمیں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے اور ہماری بیماری کے تعلق سے کھسر پھسر ہونے لگی۔ کسی نے کہا "کتے کے کاٹے کا علاج نہیں ہے اور اب تک میں نے کسی کو زندہ بچتے نہیں دیکھا ہے۔ اچھا بھلا انسان کتے کی طرح بھونکنے اور ہانپنے لگتا ہے۔ جو بھی سامنے آتا ہے اُسے کاٹتا ہے۔ دُم نکلنے کی کسر باقی رہتی ہے"۔ کسی نے ہماری بیوی اور بچوں کے تعلق سے ہمدردی کی۔ سبھی نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہم سے حتی الامکان دور رہیں گے۔ جب بھی ہم کسی کے پاس جاتے وہ ہم سے دور بھاگتا اور جب ہم کسی کو بلاتے وہ سہمے ہوئے ایسے آتا جیسے ہم اُسے کاٹ کھائیں گے۔ شام میں آفیسر صاحب نے ہمیں بلوا بھیجا۔ ہم ان کے کمرے میں پہنچے۔ انھوں نے چپراسی سے دروازہ کھلا رکھنے کو کہا اور ہم سے مخاطب ہوئے "تمہیں کتے نے کاٹا ہے۔ بہت خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ بیماری متعدی ہے۔ تم بچے کچھے دن گھر پر گزار دو۔ رخصت کی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سنبھال لوں گا۔" دفتر سے ہم گھر پہنچے اور سیدھے بستر میں گھس گئے، دیر تک سوچتے رہے۔ ہمارے بعد بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا۔ دو آنسو بھی ٹپک پڑے کہ خدا نے ہمیں اتنا بے بس کیوں بنایا ہے کتا کاٹے اور ہم مر جائیں! مرنا ہی ٹھہرا تو انجکشن کی تکلیف برداشت کر کے کیوں مریں؟ لہٰذا ہم نے انجکشن سے بچنے کی ٹھان لی۔ لیکن بیوی اپنا اور اپنے بچوں کا واسطہ دے کر ہمیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ہمیں انجکشن دیا گیا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے باہر بٹھا کر ہماری بیوی نے کچھ دیر ڈاکٹر صاحب سے بات چیت کی۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے ہماری بیوی کو کیا باور کروایا کہ وہ باچشم نم گھر آئیں۔ ہمارے برتن الگ کر دیئے۔ پانی پینے کے لیے گلاس مقرر کر دیا اور ہمارے پیر دباتے ہوئے بولیں "احتیاط بہتر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ یہ مرض متعدی ہے۔ جراثیم تھوک کے ذریعہ پھیلتے ہیں۔ میں نے آپ کے برتن الگ کر دیئے ہیں۔ آپ بچوں کو پیار بھی نہ کریں۔ تھوڑے دن کی بات ہی تو ہے"۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ہم خود بھی ایک کتا بن چکے ہیں۔ ہمارا نام الکزینڈر ہے۔ گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنا ہوگا۔ زبان باہر نکلی ہوئی اور رال ٹپکتی ہوئی، گھر کی رکھوالی کرنی پڑے گی۔ دن میں سونا اور رات کو جاگنا پڑے گا۔ بچوں کا دل بہلانا ہوگا۔ دور گران کے پھینکے ہوئے گولے اور لکڑی کو منہ میں پکڑ کر لانا ہوگا۔ اپنوں اور غیروں میں تمیز کرنا ہوگا۔ اجنبیوں کو کاٹنا اور اپنوں کے قدموں میں لوٹنا ہوگا۔ بچے کھانا برتن میں رکھ دیں گے، پانی گلاس میں ڈال دیں گے۔ کھاتے

کے بعد دُم توڑتے نہیں کہ ہلائیں گے شاید شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس تصوّر سے ہمارا روم روم کانپ اُٹھا۔ ہم نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا "دفتر میں ساتھیوں نے ناطہ توڑ لیا۔ اب شریکِ حیات بھی منہ موڑ رہی ہے"؟ ہماری بیوی دور سے منہ پر ہاتھ رکھنے کا انداز اختیار کرتے ہوئے بولیں "خدارا ایسے نہ سوچئے۔ بچوں کا کیا ہوگا۔ معصوموں کا خیال ہے ورنہ مجھے آپ کاٹ کھاتے، اُف تک نہ کرتی"۔

دو چار دنوں میں الکزینڈر ہم سے مانوس ہوتا گیا۔ وہ ہمارا انتظار کرتا رہتا ہمیں دیکھتے ہی دُم ہلاتے ہوئے قریب آجاتا۔ اب تو ہماری سنگیت میں وہ باقاعدہ اپنے مالک پر بھونکنے بھی لگا تھا۔ واپسی میں ہمیں دور تک چھوڑنے آتا۔ مالک کے مسلسل پکارنے پر بادلِ ناخواستہ واپس لوٹتا۔ ہماری بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر وہ تر و تازہ ہوتا گیا اب تو ماشاء اللہ چھلانگیں بھی مارنے لگا ہے الکزینڈر کی صحت کے تعلق سے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے تذکرہ کیا تو ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے جیسے انہی کے علاج کا فیض ہے۔ جبکہ موصوف کے انجکشنوں سے ہمارے ہاتھ اور پیر دُبلے ہو گئے تھے لیکن پیٹ پر جہاں وہ انجکشن دیتے تھے ہر دن ایک گولا اُبھرتا تھا۔

زندگی اور موت کے درمیان اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ شام ہم الکزینڈر سے ملنے جا رہے تھے کہ ہمارے بچے سر ہو گئے ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ ہم نے انہیں ٹالنا چاہا۔ بیوی نے کہا "انھیں کیوں مایوس کرتے ہو۔ بچے صبح سے تیاری کر رہے ہیں۔ پپو نے اپنے حصّہ کی ٹافی الکزینڈر کے لیے اُٹھا رکھی ہے' چھوٹو نے بازار سے گلے کے دو پٹے خرید لائے ہیں۔ ایک الکزینڈر اور دوسرا آپ کے لیے۔۔"۔ اولاد کی فرمانبرداری دیکھ کر ہمیں ایکدم غصّہ آیا اور ہم چھوٹو کو مارنے جھپٹے۔ بس پوچھئے نہیں گھر میں کہرام مچ گیا۔ بیوی نے سمجھا اب ہمارا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ہم پر پانی پھینکنے لگیں۔ یہ ترکیب ڈاکٹر صاحب نے بتلائی تھی۔ سرما کے موسم میں ٹھنڈا پانی جسم پر پڑنے سے ہمارا غصّہ کافور ہوا۔ چُپ چاپ اپنے لیے مختص کردہ گوشے میں جا بیٹھے۔ گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ بیوی نے میکے سے لوگوں کو بلوا بھیجا۔ عزیز و اقارب آتے اور ہم سے کترا کر نکل جاتے۔ ہم بھی خاموش گنگناتے بیٹھے رہے۔ کتّے کی بھونکنے کی آواز آئی ہم نے اُٹھ کر کھڑکی سے دیکھا تو الکزینڈر کو کھڑا پایا۔ آج ہم الکزینڈر کا حق ادا کرتے اس کے پاس نہ جا سکے تھے سو وہ خود ہمارے یہاں چلا آیا۔ ہم نے اسے پچکارا۔ وہ کھڑکی کی راہ سے ہماری گود میں آبیٹھا۔ گھر والوں پر بن آئی ایک نہیں دو پاگل کتّے یکجا بیٹھے ہیں۔ ہمیں اور الکزینڈر کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ خیر سے ہم کو کھانا اور پانی دیا گیا۔ وقت گزارنے کے لیے ہم الکزینڈر سے کھیلنے لگے۔ ہمارے ایک سسرالی بزرگ نے دروازے کی سوراخ سے ہم دونوں کی عادات اور اطوار کا بغور مطالعہ کیا اور رائے دی کہ کسی بھی صورت کتا پاگل نظر نہیں آتا۔ کتا بالکل ٹھیک ہے لیکن انہیں ہماری جانب سے تشویش لاحق رہی۔

رات آئی سب دُعاؤں میں مصروف ہو گئے۔ بیوی بار بار آکر ہمیں دیکھ جاتی کہ ابھی دم غنیمت ہے۔ موقع پاکر ہم نے انھیں پکارا اور کہا "خدارا مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اگر تم لوگوں کا یہی رویہ برقرار رہا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اور پھر کبھی گھر کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں"۔ بیوی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تو کیا آپ پاگل نہیں ہیں" ہم نے نرمی سے انھیں سمجھایا کہ ہم یقیناً پاگل نہیں ہیں۔ ثبوت کے طور پر ہم نے انہیں اپنی شادی کی تاریخ، ان کا مہر، بچپن میں پڑھی ہوئی نظمیں اور کتوں پر لکھے گئے مزاحیہ مضامین کی تفصیل بھی سنائی۔ یہ سب سن کر انھوں نے ہم سے التجا کی کہ اب صرف ایک دن باقی ہے گزار لیجئے۔ کل شام ڈاکٹر آئے گا۔ تمام کوششیں ناکام ہونے پر ہماری رگ

ظرافت بھڑک اٹھی اور ہم نے کہا "ٹھیک ہے" آخری دن جو کوئی ہمیں دیکھتا ہم نے اُسے چڑایا۔ بجلی کو دیکھ کر ہم باقاعدہ بھونکنے لگے۔ چپڑ چپڑ کی آوازوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہاتھ اور پیروں سے چوپائے کی طرح چلتے رہے۔ بیوی بچے اور عزیز و اقارب رونے لگے۔ ڈاکٹر بلوایا گیا۔ گویا ہمارا شکار ہاتھ آگیا۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی ہم اور الکزینڈر بھونکتے ہوئے ڈاکٹر پر جھپٹے۔ ہم نے دیکھا ڈاکٹر صاحب اپنا بیاگ چھوڑ کر دُم دبا کر یہ جا وہ جا غائب ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کو روانہ کرنے کے بعد ہم نے گھر کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اعلان کر دیا کہ ہمیں کتا کاٹے دس دن گزر چکے ہیں۔ اس دوران ہمیں اور نہ ہی کتے کو کچھ ہوا ہے اسی لیے ہم بہوش و حواس اور صحت مند ہیں۔ عزیز و اقارب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بیوی بچے کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ اسی لیے وہ گھر پر رہے۔ جلد ہی انھیں یقین آگیا کہ ہم جسمانی اور دماغی طور پر چاق و چوبند ہیں۔ گھر کے حالات معمول پر آگئے۔ الکزینڈر اب ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہتا ہے اس کے گلے میں دو پٹے پڑے ہیں ایک خود اس کا اور ایک ہمارا۔ یہ مضمون لکھتے وقت وہ ہمارے پیروں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے ہم نے اس سے پوچھا "الکزینڈر دی گریٹ بتا اردو مزاح نگاری میں ہمارا کیا مقام ہے" الکزینڈر آنکھیں بند کیے سوچ میں ڈوب گیا اور کسی نقاد کی طرح ابھی تک سوچ رہا ہے کہ اردو ادب میں مزاح کا کیا مقام ہے!

□□

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مجموعے

قصہ مختصر ۱۲ روپے　آدمی نامہ ۱۲ روپے

بالآخر ۱۴ روپے　تکلف برطرف ۱۴ روپے

قطع کلام ۱۲ روپے　جاپان چلو (سفرنامہ) ۱۴ روپے

بتوسط

شگوفہ حاصل کی جا سکتی ہیں!

خامہ بگوش

آج کل کے ادیب لفظوں کو اُن کے معنوں سے جدا کرنے کا فن جانتے ہیں؟

شخصی خاکہ نگاری کا ایک مشکل فن ہے۔ یہ غزل
جیسی صنفِ ادب نہیں کہ ردیف و قافیہ کے گلدان میں
پامال مضامین کو کاغذی پھولوں کی طرح سجا دیا جائے۔ یہ نثری نظم
بھی نہیں کہ لفظوں کو ان کے معنوں سے جدا کر کے چھوٹی بڑی سطروں میں دفن
کر دیا جائے۔ یہ علامتی افسانہ بھی نہیں کہ نثری نظم والوں کے دفن کردہ الفاظ کو جھاڑ پونچھ
کر دوبارہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا جائے۔ یہ جدید سفرنامہ بھی نہیں کہ سفرنامہ نگار خود تو ایئر ہوسٹسوں
کے جھرمٹ میں پرواز کرتا ہے، اور بیچارہ قاری حیرت و استعجاب کی وادیٔ پُرخار میں پیدل چل چل کر اپنے
تلوے لہولہان کرلے۔ —— شخصی خاکہ نگاری کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو ایسی آنکھ چاہیئے
جو کسی شخص کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کر سکے۔ پھر وہ بصیرت چاہیئے جو ان عوامل کا تعین کر سکے جو کسی شخصیت کی تعمیر میں
بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری چیز حقیقت بیانی ہے، یعنی موضوع کو اسی طرح پیش کیا جائے جیسا وہ ہے۔
نہ کہ لکھنے والا اپنی منشا کے مطابق اس کے خدوخال سنوارے یا بگاڑے۔ چوتھی اور سب سے اہم چیز یہ ہے
کہ خاکہ نگار کو لکھنے کا فن آتا ہو۔ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے کے ہنر سے
واقف ہو —— ہمارے بہت کم خاکہ نگار ان چار شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس مشاہدہ ہے تو اسے
یہ معلوم نہیں کہ اسے کس طرح پیش کیا جائے۔ یا پھر اکثر خاکہ نگاروں نے یہ فارمولا بنا رکھا ہے کہ موضوع کی خوبیوں
کے ساتھ دو چار خامیاں بھی بیان
کر دی جائیں تاکہ توازن برقرار رکھا جا سکے۔ بعض
توازن کے قائل نہیں، وہ موضوع کو ہیرو بنا کر پیش
کرتے ہیں جیسے وہ کسی اور کا خاکہ نہیں لکھ رہے بلکہ اس سے اپنا
خاکہ لکھوا رہے ہیں۔ —— لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو میں اچھے

خاکے نہیں لکھے گئے۔ لکھے گئے ہیں اور خاصی تعداد میں۔ مثلاً پچھلے ڈیڑھ سال میں کم از کم دو مجموعے ضرور ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں اچھے خاکے، خراب خاکوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ پاکستان میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ہندوستان میں۔ پاکستانی مجموعہ بزرگ افسانہ نگار ممتاز مفتی کا ہے "اَدکھے لوگ" (اَدکھے' پنجابی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مشکل") ہندوستانی مجموعے کا نام "خاکے" ہے اور اس کے مصنف ہیں عوض سعید۔

ممکن ہے عوض سعید کا نام ہمارے بعض پڑھنے والوں کے لیے نیا ہو۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ بعض پڑھنے والوں کے لیے غالب کا نام بھی نیا ہوتا ہے۔ غالب کا تعارف نامہ تو ہم پھر کبھی پیش کریں گے۔ فی الحال عوض سعید کے بارے میں عرض ہے کہ وہ خاصے پرانے اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ پاکستانی رسالوں خصوصاً میرزا ادیب کے زمانے کے "ادب لطیف" میں اُن کی کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے چار مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جنھیں اَدبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ان چاروں مجموعوں کو ہندوستان کی مختلف اردو اکیڈیمیوں کے انعامات بھی مل چکے ہیں۔ یہ بات ہم نے قیاساً لکھی ہے۔ ہمارا قیاس اس لیے غلط نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں اردو کتابوں پر کثرت سے انعامات دیئے جاتے ہیں۔ یہ انعام اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ کتابیں کم پڑ جاتی ہیں۔ تب مسودوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے آخر میں ان کتابوں کی باری آتی ہے جو ابھی بطنِ مصنف میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بھی گنجائش رہ جائے تو کتابوں کی بجائے افراد کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، جیسے حال ہی میں مجوزہ عالمی اردو کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بعض دوسرے ادیبوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس انعام کی خوبی یہ ہے کہ انعام لینے والے ہی نہیں، دینے والے بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ اس لیے وہ دوہری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آیئے اب اصل موضوع کی طرف لوٹیں۔ اگر اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ کچھ دیر اور چلتا رہا تو ڈر ہے کہ کہیں عوض سعید کی کتاب "خاکے" پر بھی کسی انعام کا اعلان نہ ہو جائے۔ لہٰذا انعام ملنے سے پہلے اس کتاب پر اظہار کر لیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ بعد میں کسی کو اس کتاب میں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شخصیات کے حوالے سے حیدرآباد دکن کی ثقافتی فضا اور ادبی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہم نے تو حیدرآباد دکن کو مرزا ظفر الحسن مرحوم یا پھر خواجہ حمید الدین شاہد کے حوالے سے دیکھا ہے۔ مرزا صاحب نے حیدرآباد کی تہذیبی زندگی پر بہت سی یادگار تحریریں چھوڑی ہیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد کو خدا سلامت رکھے کہ حیدرآباد کی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ اس شہر بے مثال کے بارے میں اب عوض سعید نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ قاری اپنے کلبۂ احزاں سے دور، حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی گلیوں، کوچوں اور ادبی محفلوں کی سیر کر رہا ہے۔ کہیں کسی ہوٹل میں ادیب جمع ہیں، اور کہیں کسی قیام گاہ پر محفل گرم ہے۔ غرض ہر طرف گہما گہمی دکھائی دیتی ہے۔ اور زبان بھی وہی سنائی دیتی ہے جو حیدرآباد میں بولی جاتی ہے۔

عوض سعید نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں، ان میں بیشتر معروف اَدبی شخصیات ہیں۔ مثلاً مخدوم محی الدین، ابراہیم جلیس، عالم خوندمیری، سلیمان اریب، قاضی سلیم، اقبال متین، مغنی تبسم، جیلانی بانو، عزیز قیسی، وحید اختر وغیرہ ہم نے ان ادیبوں کے صرف نام سنے تھے، اب عوض سعید کی مہربانی سے انہیں ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو جی خوش ہوا۔ بعض بالکل نئی اور دلچسپ باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً۔

مخدوم محی الدین: طبعاً بڑے سادہ مزاج تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کی چیزیں رسائل کی زینت بنتی تھیں تو وہ

بلا جھجک بک اسٹال پر جاکر سارے پرچے خرید لیتے۔ ایسے وقت وہ بڑے معصوم لگتے، یہ معصومیت ہی دراصل ان کی شخصیت کی سب سے بڑی پہچان تھی۔ . . . مخدوم عرب نژاد تھے۔ ان کا خاندانی نام "ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری" تھا۔ عربوں کی بے پناہ خوبیوں کے ساتھ ان کی ذات میں چند کمزوریاں بھی در آئی تھیں۔ . . ان کے جذباتی ہونے کا عکس جابجا ان کی پرجوش تقریروں میں کہیں نہ کہیں عیاں ہو جاتا تھا۔ تنقید سننے یا سہنے کا حوصلہ ان کی ذات میں ذرا کم کم ہی پایا جاتا تھا۔ وہ (کمیونسٹ) پارٹی سے کچھ اتنے جڑے ہوئے تھے کہ ذرا بھی کسی نے ایک چبھتا ہوا جملہ کسا، وہ آپے سے باہر ہو گئے پھر انہیں لاکھ سمجھائیں وہ اکھڑ سے جاتے تھے۔ مجھے اورینٹ کی وہ سلگتی شام آج بھی یاد ہے، جب انہوں نے غصے کے عالم میں اپنے ہی ایک ساتھی کے گال پر طمانچہ جڑ دیا تھا۔

قاضی سلیم جس زمانے میں وہ اورنگ آباد میں وکالت کیا کرتے تھے، انہی دنوں اتفاق سے انور معظم سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب انور نے ان سے پوچھا کہ وکالت کیسی چل رہی ہے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا، خوب چل رہی ہے۔ آج ہی ایک آدمی کو چار سال قید کروادی ہے۔ پھر انور نے پوچھا وکیل کون تھا تو انہوں نے کہا میں تھا۔ انور نے حیرت سے پوچھا چار سال کی سزا کیسے ہو گئی؟ انھوں نے جواب دیا چار سال سے کم ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

مغنی تبسم: انھوں نے اپنے لیے ایک شیڈول بنالیا ہے جو ہر سال تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی شاذ کو فیض پر فوقیت دے دی تو کبھی دبلے پتلے مصحف اقبال کو اچانک پہلوانوں کے اکھاڑے میں کھڑا کر دیا۔ کبھی ایک کا ہاتھ تھاما تو کبھی دوسرے کا گریبان چاک کیا۔ کبھی کھائی میں گرے ہوئے کسی ادھ موئے شاعر کو آواز دی تو دوسری طرف خاصے بھلے شاعر کو کنویں میں دھکیل دیا۔

وحید اختر: اپنے آگے دوسروں کو ہیچ اور حقیر سمجھنے کا جذبہ وحید کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے کبھی آپ اس سے مل کر دیکھئے۔ وہ مصافحے کے دو منٹ بعد ہی فقرہ بازی پر اُتر آئے گا۔ پہلے آپ کو خاص انداز سے دیکھے گا۔ پھر مسکرائے گا۔ (اگر آپ شاعر ہیں، اسے اپنا مجموعہ پیش کریں گے تو وہ کہے گا) ہم نے آپ کا مجموعہ بادلِ ناخواستہ پڑھا ہے۔ ہمارا خیال ہے بعض کتابوں کی عدم اشاعت ہی میں ادب کی خدمت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ آپ نے اپنی اوقات سے کہیں زیادہ پیسہ فضول اس مجموعے میں لگا دیا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اپنے لیے کچھ نئے کپڑے سلوا لیتے۔

اگر کوئی اس سے کہے کہ وحید اختر ہم نے آپ کا شعری مجموعہ خریدا ہے اور آج کل وہی زیرِ مطالعہ ہے۔ اس پر وہ خوش نہیں ہو گا کہ ایک کتاب فروخت ہو گئی اور نہ اس بھلے مانس سے وہ اپنی نظموں اور غزلوں کے متعلق پوچھے گا۔ اس کا جواب تو یہی ہو گا کہ آپ نے خواہ مخواہ ہمارا مجموعہ خریدنے کی حماقت کی۔ ہماری شاعری آپ کے پلے پڑنے سے تو رہی!

■■

ساس ہر وقت بہو کو منحوس کہا کرتی تھی لیکن جب بہو کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو ساس بہت خوش ہوئی۔
بہو نے حیرانی سے پوچھا۔
"آپ لڑکے کی بجائے لڑکی کی پیدائش پر کیوں اتنی خوش ہیں؟"
ساس بولی: "اس لیے کہ اگر لڑکا ہوتا تو ایک اور منحوس گھر میں آجاتی؟"

غزلیں

رؤف رحیم

اک بلائے ناگہانی ہے ہمارے شہر میں
جنگیت جو زعفرانی ہے ہمارے شہر میں

بھوک سستی، مہنگا پانی ہے ہمارے شہر میں
پھر بھی ہر سو باغبانی ہے ہمارے شہر میں

دیکھتے، سُنتے نہیں اور کچھ سمجھتے بھی نہیں
ان بتوں کی حکمرانی ہے ہمارے شہر میں

قتل چوری اور ڈکیتی روز ہوتا ہیں فساد
رنگھڑانی زندگانی ہے ہمارے شہر میں

اپنے کلچر کو مٹانے کوششیں ہر سو ہیں آج
ذم غنیمت شیروانی ہے ہمارے شہر میں

شاعروں کو ہوٹ ملتی ہے یہاں بے انتہا
بس یہی تو قدر دانی ہے ہمارے شہر میں

تھیٹریں سب ہاؤس فل ہیں پھر گیلے بیں کہ دیں
کون کہتا ہے ا گرانی ہے ہمارے شہر میں

شیپ لے کر ہاتھ میں اب پھر رہے ہیں شیخ جی
پھر کسی کا عقد ثانی ہے ہمارے شہر میں

ایک چھوٹا موٹا شاعر جس کو کہتے ہیں رحیم
اُس کی صورت جانی مانی ہے ہمارے شہر میں

۱ چاول ۲ ادرک ۳ زرق ۴ چاپایانی

لاغر نرملی

ایسی انکم بھی کوئی انکم ہے
جس میں خود جاب کا ہی جوکھم ہے

ہے یہ کیسا مذاق قسمت کا
باپ C.M ہے بیٹا T.M ہے

اُن کے جلنے سے VOLTAGE گیا
زندگانی کی لائٹ مدھم ہے

یہ بھی اک چال ہے سیاست کی
دو روپے فی کلو جو ہیٹم ہے

تاج پوشی علاج اُلفت ہے
اور صفرے کا گوڈ آلم ہے

رات دن ہم گناہ کرتے ہیں
پھر بھی دیتا وہ ہم کو انعام ہے

بیویاں چار چار ہیں لیکن
گھر میں لاغر کے ایک مٹیم ہے

سراج نرملی

مجھے میرے مالک! منسٹر بنا دے
تو سالے کو پولیس کمشنر بنا دے

مقدّر کا مجھکو سکندر بنا دے
رقیبوں کو ہٹلر، اَنڈر بنا دے

امیتابھ بچن سا ایکٹر بنا دے
نہیں تو کم از کم جیتندر بنا دے

تمنّا ہے میری کہ او گاڈ میرے
مجھے امرتا سنگھ کا شوہر بنا دے

ہے میریج ڈے میرا گرمی بہت ہے
ہے مئی کا مہینہ۔ ڈسمبر بنا دے

ہے بیروزگاری۔ اے ہوٹل کے مالک
ہے بی۔ اے کی ڈگری۔ تو ویٹر بنا دے

سراجؔ! اُردو پرچے میں لڑکے کو میرے
ملے سات نمبر تو ستر بنا دے

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار
(پاکستان)

(کلام اقبال کی روشنی میں)

خودی کا سِرِّ عیاں

بہت سی مصدقہ اور چند ایک
غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق خودی
کی پیدائش بار اوّل کلام اقبال میں ہوئی.
بچپن بانگ درا میں گزرا جہاں وہ "ہمالہ" کے
دامن میں "پہاڑ اور گلہری" کے سنگ کھیلتی رہی
شاید کودتی بھی رہی ہو. بانگ درا کے
آخری اوراق والے دنوں میں خودی
لڑکپن کی حدود کو چھوڑ کر بلکہ
پھلانگ کر اپنی اٹھارہ بہاریں
یا وہ طاقت کی جوانی کا شاہکار
لے چکی تھی. ضرب کلیم میں اس
نے کچھ پر پرزے نکالے اسرار و
رموز میں یہ اپنے جوبن پر تھی. اقبال
کے بعض اشعار میں اس کا چرچا آہستہ آہستہ
کم ہوتا گیا کہ پھر کسی نے اسے پنپنے کا چانس نہیں
دیا. بانگ درا والے زمانہ میں نوجوان مسلم
کے ساتھ اس کی کبھی کبھار پینگ تھا
پر بھی دونوں ایک ساتھ دیکھے گئے

لیکن سرعام میل جول ثابت
نہ ہو سکا. اقبال دل سے چاہتے
تھے کہ خودی اور نوجوان مسلم ایک ساتھ
رہیں باہم شیر و شکر ہو کر زندگانی گزار دیں یہ
ایک خواب سا تھا جس سے اقوام عالم میں مسلم قوم
کی قدر اور محترمہ خودی صاحبہ کی عزت افزائی
ہو سکتی تھی ـــــ اقبال نے جوان
مسلم کو سمجھایا بجھایا لیکن وہ اس
معاملے میں "لفٹ" ہی نہیں لگاتا
تھا. ہم نے تصور کے کانوں
سے یہ گفتگو سنی! ـــــ

اقبال : خودی کو قبول کر لو ـــــ

نوجوان : جناب بات تو آپ ٹھیک کہتے
ہیں لیکن میں نے سرعام قبول نہ کیا. کہہ دیا
تو اس کے ماں لفنگے سمجھ کر نذرِ داد گردانا جائے گا.

اقبال : کوئی بات نہیں بیٹا. قلب و نظر شکار
کرنا. پکا کر کھانا اشعار تو ویسے بھی
مزیدار ہوتا ہے. خودی کا ساتھ

رہا تو انا جاگ اُٹھے گی ہمارے شعور میں وحدتِ اُمت کا احساس اودھم مچائے گا۔ تم اور خودی اکٹھے ہو گئے تو آنگن میں رنگا رنگ پھول کھلیں گے۔ احساسِ ذمہ داری پیدا ہو گا مروت جنم لے گی۔ دلیل صبح روشن بھی معرض وجود میں آئے گی پھر جب یہ تینوں ہر سال اپنی برتھ ڈے منائیں گے۔ تم دونوں تالی بجا کر ان کو ہیپی برتھ ڈے۔ لو لو کہو گے۔ تو اسلام دشمن قوموں کا دل جل جائے گا۔ فرنگی جل بھن کر خاکِ دا ھگنڈ بن جائے گا۔ کلیسا کی دیواریں ہل جائیں گی۔

جواں مسلم : جناب دراصل بات یہ ہے طبیعتِ آزاد پابندیوں کی خوگر نہیں۔ قیدِ رمضان بھاری نظر آتی ہے سحر خیزی کی بجائے دن چڑھے بیدار ہونا معمول ہے۔ سارا دن آوارگی میں ریگ رواں کی مانند ہوتا ہوں۔ رات کو گھر دیر سے آیا کروں گا۔ لڑائی مارکٹائی ہو گی۔ فسادِ آدمیت شروع ہو گا۔ میں غصے سے چلاؤں گا ہائے دل ہائے ہل نالہ بیباک سارا محلہ سنے گا۔ ہو سکتا ہے جوشِ جنوں میں ایک آدھ ہاتھ مار دوں۔ آپ تو اندازہ کر سکتے ہیں میرے زورِ بازو کا۔ کسی بابھی آویزش سے ہو سکتا ہے میرا دل ٹوٹ جائے یا دل کے شیشے میں بال آجائے۔

اقبال : کونسا بال ؟

نوجوان : (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ کو واقعی پتہ نہیں! لیکن آپ تو اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ آپ نے پھر سچ ہی کہا تھا کہ ؎

اقبال بھی اک بال سے آگاہ نہیں ہے ✣ کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اقبال : تم اب بھی بات کو نہیں سمجھ سکے۔ اپنے انداز و اطوار بدلو۔ سوچ کی ٹیوننگ کراؤ ورنہ تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانِ امیر حمزہ میں کبھی اپنے لیے بھی جینا کوئی جینا ہے۔ امت کے اجتماعی فائدے کے لیے جیو اور زیادہ دیر جیو۔ جہاں میں اہلِ ایماں کسی نہ کسی طرح جیتے ہیں۔ کبھی جھگڑوں کے طوفان میں ڈوبے کبھی خوشی کے زمزموں میں سے ابھر کر آئے۔ تو ذرا خودی کو سٹڈی کر۔ اس کی گہرائی کو ناپے گا تو سراغِ زندگی پا جائے گا۔ میں تو تمہیں واقفِ کن فکاں سمجھتا ہوں۔ خودی سے راہ و رسم بڑھاؤ۔

؎ خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

جواں مسلم : حضرت آپ نے خودی کے گھر کا رہن سہن دیکھا ہے۔ اُن کے گھر کا تمدن موہنجوداڑو کی تہذیب کو بھی مات دے رہا ہے۔ مجھے شوخ چنچل اور آزاد خیال شخصیات پسند ہیں۔ وہ عبودیت کی حدوں میں قید ہو کر رہتی ہے کسی مخلوط اوارے کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی۔ میں تو ڈھیلی ڈھالی (GEENS) جینز پہننا پسند کرتا ہوں وہ کلف لگے کپڑے پہنتی ہے اُن کپڑوں کی اندرونی خودی اتنی بیدار ہو چکی ہوتی ہے کہ ذرا سی بھی بے ترتیبی یا شکن برداشت نہیں کرتے ہر وقت اکڑے رہتے ہیں حد تو یہ ہے کہ چند دن پیشتر اس نے مجھے چاول پکا کر کھلائے وہ بھی نرم نہ تھے۔ خودی کے بے جا استعمال کی وجہ سے شاید وہ بھی سخت خو ہو گئے تھے۔

اقبالؒ : برخوردار حد ہو گئی ہے۔ تم غلط سمجھے ہو بڑھاپے سے پہلے ہی تمہارے دماغ کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ میری مراد خودی سے۔ ایک اندرونی احساس کا پیدا کرنا ہے۔ یہ تو ایک قسم کا ضبطِ نفس ہے یہ عرفانِ ذات کا دوسرا نام ہے۔ یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو ستاروں پر پے در پے بہت سی کمندیں ڈالنے پر اکساتی ہے۔ تم کیا سمجھے تھے۔

جواں مسلم : سوری سر! میں سمجھا آپ خودی نامی کسی دوشیزہ پاکیزہ کا ذکرِ خیر کر رہے ہیں اور اُسے میری ہم جائی کے لیے پسند فرما رہے ہیں ـــــ فرض کیجئے منشائے اقبال کی تکمیل میں ہر کسی میں خودی کی فراوانی ہو جائے یا کسی مصنوعی مشینی طریقے

سے پیدا کرلی جائے تو معاشرے کی کیا تصویر بنے۔ پہلے تو بازاروں میں اس عنوان سے کاروبار شروع ہوں۔ جا بجا بورڈ اور نیون سائن آویزاں ہوں جن پر اس قبیل کی عبارتیں رقم ہوں۔

" اپنے اندر سو فی صد خودی پیدا کروانے کے لیے ہماری خدمات حاصل کریں — بازار سے بارعایت "یا اس قسم کا اشتہار نظر سے گزرے۔

" جدید آٹومیٹک پلانٹ میں اپنا سر داخل کریں اور چند منٹ میں حضرت اقبال کی تصور کردہ اصل خودی پیدا کرائیں۔ نقالوں سے ہوشیار"

یہ کاروبار خوب چمک اُٹھے تو حالات دلچسپ ہوں گے۔ آپ کسی دفتر میں اپنا جائز کام کرانے، فائل بغل میں دبائے منہ میں رام رام کہتے داخل ہوئے ہیں تو یہ دیکھ بہت حیران ہوں گے کہ وہی کلرک جو آج سے چند سال پہلے صرف اپنے دستخط کرنے کے لیے چائے پانی طلب فرماتا تھا نہایت اطمینان اور اعتماد سے کرسی پر جلوہ گر ہے۔ خندہ پیشانی سے تھوڑا سا سیٹ سے اُٹھ کر ملتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی نظر میز پر پڑتی ہے تو یہ دیکھ کر اوسان خطا ہو جائیں گے کہ نکونی لکڑی کے ٹکڑے پر سفید روشنائی سے لکھا ہے "رشوت دے کر شرمندہ نہ ہوں اس سے میری خودی مجروح ہوتی ہے" آپ خوشی خوشی اپنا کام ختم کرا کے باہر آئیں گے تو سگریٹ خریدتے ہوئے بھی بہت مناسب دام ادا کریں گے۔ ہو سکتا ہے اُس دکان میں بھی اس قسم کی تختی آویزاں ہو" ناجائز منافع خوری سے میری خودی پر آنچ آتی ہے"

گھر آنے کے لیے بس پر سوار ہوتے ہیں تو اندرونی جانب جہاں پہلے لکھا ہوتا تھا" بغیر ٹکٹ سفر کرنا جرم ہے" وہاں جو تختی لگی ہے اس پر لکھا ہوا ہے "ٹکٹ کے بغیر سفر کرنا اسرارِ خودی کے منافی ہے" اسی اُدھیڑبن میں گھر آئیں گے شام تک بدلے ہوئے حالات کے متعلق سوچتے رہیں گے اور ذرا توجہ ہٹانے کی خاطر ٹی وی آن کریں گے تو مزید حیران ہوں گے۔ کہ وہ گھسے پٹے اشتہارات جنھیں دیکھ کر آپ آنکھیں اور کان بند کر لیا کرتے تھے ٹی وی سکرین سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو چکے ہیں۔ اُن کی جگہ اس قسم کے اشتہار دکھائے جارہے ہیں۔

" فصلوں کی خودی بیدار کرنے کے لیے سونا یوریا استعمال کریں"

" تم آگئی ہو آپا۔ اب بہت مزہ آئے گا۔"

" شادی نے تو تم کو بالکل بدل دیا۔ تم پہلے سے کتنی گوری نظر آرہی ہو۔"

" نہیں یہ تو خودی کا کمال"

" کیا"

" یہ گورے پن کی بجائے خود میں انا پیدا کرنے کا طریقہ ہے جس کی وجہ سے کالے کے رنگ کے ساتھ بھی تم خوش رہو گی"

" سچ"

" ہاں میں تمہارے لیے بھی خودی پیدا کرنے والی ایک مشین لائی ہوں"

> ایک صاحب کو وزارت کی پیشکش ہوئی تو اُنھوں نے فوراً اپنی بیوی کو فون کیا اور کہا "کیا تم ایک وزیر کی بیوی بننا پسند کروگی؟"
> بیوی نے جواب دیا "یقیناً۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میری اچھی آپا۔ ہی ہی۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ خودی پیدا کروں بے شک کالی کالی دلہن بنوں"۔
خودی کی بہتات کے چند ایک فوائد ہیں۔ بندہ اپنی اکڑفوں میں رہتا ہے۔ کسی کے ہاں نہیں جاتا یہی جی چاہتا ہے کہ ہر کوئی بقلم خود اس کے پاس چل کر آئے۔ رکشے کا کرایہ بچتا ہے افسروں کو سلام نہیں کرنا پڑتا۔ ان کے گھر سبزی گوشت پہنچانے سے جان چھوٹتی ہے اس طرح توانائی کی بچت ہوتی ہے۔ آپ تو اکثر سنتے رہتے ہیں کہ مہذب قوموں نے اقبال سے کوئی خاص تعاون نہیں کیا۔

اس کے تہذیب و تمدن کے متعلق صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ کھانے میں عقل و خرد پسند کرتا ہے جب کہ عشق دھنوں سے تیار شدہ ڈشنز اتنی رغبت سے نہیں کھاتا۔ رہن سہن میں طریق خانقاہی کو ناپسند کرتا ہے پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کی بجائے رہ رسم و کجکلاہی کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے گلبرگ یا ڈیفنس ایریا میں کوٹھی بنانا اچھا خیال کرتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت کے لیے فکر کی سرعت رکھنے والی براقی سواری کے حق میں نہیں کیوں کہ اس میں جرأت رندانہ کا کچھ احساس جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہنڈا ایکس ھنڈرڈ اسپیشل چلانے کو ترجیح دیتا ہے۔ لباس کے معاملے میں بھی بیچارہ انفرادیت پسند نہیں۔ ذرا گریبان کافی مضبوط بنواتا ہے۔ دوہری سلوائی کراتا ہے تاکہ یہ تار تار نہ ہو سکے۔ شہید ازل والے خونیں کفن کی بجائے لیڈیا لو ننیز کے ملبوسات پہننے کو بہتر خیال کرتا ہے۔

جسمانی حالت کے متعلق بانگ درا کے چند اوراق سے اتنا سا اشارہ ملتا ہے کہ کسی زمانے میں کافی کسرتی بدن کا مالک تھا۔ ایک ٹھوکر لگاتا تو صحرا و دریا دونیم ہوجاتے۔ پہاڑ ڈر کے مارے ھائے ھائے کرتے سمٹ جاتے۔ آج کل اس قسم کی ٹھوکر لگانے کے لیے اونچی ایڑی والے بوٹ استعمال کرتا ہے۔ ہائی جمپ بڑا اچھا لگاتا تھا۔ صرف اکلوتے جمپ میں قصہ تمام ملے۔ خودی اگر طبیعت میں جلوہ گر ہو جائے تو آدمی کسی مقام پر نہیں جھکتا حتی کہ راہ چلتے کوئی چیز بھی گر پڑے تو شاید جھک کر اٹھانا دل خود بیں کو ناگوار گزرے اور اس مقصد کے لیے کسی راہگیر کو کہنا پڑے گا۔ ہمیں اگر کوئی ایسا آدمی نظر آئے تو اسے گلی کی نکڑ پر لے جائیں گے اور پیار سے سمجھائیں گے کہ بھلے مانس خودی کے چکر میں پڑے رہے تو دال روٹی بھی مشکل سے ملے گی اس لیے جو چیز بھی ہاتھ لگے بیچ ڈالو قومی حمیا ذاتی۔ منافع کماؤ بلکہ اک مشورہ مانو تو ضمیر بھی بیچ ڈالو۔ مزے کرو گے۔ اور ثبوت کے طور پہ میرزا محمود سرحدی کے یہ اشعار پڑھ دیا گے۔ ~

ہم نے اقبال کا کہا مانا　：　اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں　：　ہم خودی کو بلند کرتے رہے

جب کسی قوم میں اجتماعی خودی پیدا ہوتی ہے تو اسے اپنے مطالبات منوانے کا سلیقہ آجاتا ہے وہ قوم جلوس نکالتی ہے۔ چاہے اس کوشش میں اقوام عالم میں اس کا اپنا "جلوس" ہی کیوں نہ نکل جائے۔ تنخواہوں میں لمبے چوڑے اضافے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسمبلی ہال کے سامنے نعرے لگاتی ہے اور اقبال کے شعر پڑھتی ہے۔ گھیراؤ اور جلاؤ سے اپنا دل بہلاتی ہے اس طرح سے دیکھا جائے تو پاکستانی قوم کے ہر شعبہ نے پچھلے چند سالوں میں ذہنی بیداری کا قوی ثبوت فراہم کیا۔ اساتذہ۔ پولیس۔ ڈاکٹر۔ نرسیں۔ اور کلرک سبھی لوگ باری باری ہڑتالوں پر آمادہ ہوئے۔ پولیس مقابلے کیے پرامن جلوس نکالے۔ جن میں حسب توفیق توڑ پھوڑ بھی کی۔ ہڑتالی ملازمین پہ پولیس لاٹھی چارج کرتی تو وہ بھاگ کھڑے

ہوتے راستے میں کہیں مظاہرین کو اینٹوں اور پتھروں کی کھیپ میسر آتی تو پلٹ کر غنیم پر حملہ کرتے پھر سپاہی بھاگ کھڑے ہوتے اور مظاہرین ان کے پیچھے پیچھے۔ علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر لیے ہوئے کہ ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ماہرین کے اندازوں سے پتہ چلا ہے کہ جب مظاہرین آگے آگے اور پولیس پیچھے بھاگتی ہے تو جوشِ رفتار پولیس میں کم ہوتا ہے۔ کہ وہ تنخواہ کے لیے دوڑتی ہے جب کہ مظاہرین "موسلا دھار" دوڑتے ہیں کہ اپنی جان اور ٹانگیں کسے عزیز نہیں ہوتیں۔ اصلی خودی کا تقاضا تو یہ ہے کہ لاٹھیاں مارنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر "چھینی" کھائی جائے لیکن یہ اعلیٰ کوالٹی کی خودی ہم فی الحال افورڈ نہیں کرسکتے کہ بعد ازاں ہونے والے ہسپتال اور دواؤں کے اخراجات سے ڈر لگتا ہے۔

خودی اگر غلاموں کو حریت کے ذوق سے آشنا کرتی ہے تو نوکروں اور گھریلو ملازمین کی عادتیں بھی بگاڑتی ہوگی مثلاً تابع فرمان نوکر اگر اس چیز کے زیرِ اثر آجائے تو چشمِ تصور سے دیکھئے۔ کیا ہوتا ہے۔ گھریلو ملازم "بگو" جو کہ ازل سے مسکین صورت بنائے رکھتا تھا (اب اچانک خودی کا بیدار ہونے کے نتیجہ میں اکڑ کر ہمارے سامنے کھڑا ہے)

ہم — ایک گلاس پانی لانا۔
بگو — مجھ سے یہ چوچلے برداشت نہیں ہوتے۔ اپنے کام خود کیا کریں۔
ہم — بھئی ہوا کیا۔
بگو — میرا شعور جاگ اٹھا ہے۔ وجدان کانپ اٹھا ہے۔ مسلسل اور تابڑ توڑ بے قدری کی وجہ سے اندر کا انسان "ہانپ اٹھا" ہے
ہم — لیکن تم تو سالہا سال سے ہمارے پاس ہو۔ تم خوش رہتے تھے۔
بگو — کیا میرے ابا بھی آپ لوگوں کی خدمت کرتے تھے؟
ہم — ہاں۔
بگو — اور ان کے والد بھی؟
ہم — ہاں۔
بگو — تو خاندان سے یہ غلامانہ رسم کب ختم ہوگی۔ کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ۔
ہم — تم تو سیدھے سادے آدمی تھے یہ پُر پیچ باتیں کہاں سے سیکھیں۔
بگو — زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات۔ جب ہر طرف خودی کا دور دورہ ہوگا تو کوئی بھی طبقہ اس کی دسترس سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ سادھو عیاری پیروں فقیروں کو سب سے زیادہ عجیب حالات کا سامنا ہوگا۔ وہی مرید جو سادہ لوحی کی بنا پر اپنے دل و جان بلکہ سب کچھ پیر صاحب کے حضور پیش کرنے کو اولین سعادت سمجھتے تھے اب سوچنا شروع کریں گے کہ پیر صاحب سے کیسے نجات پائیں۔ پیر بھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں اس لیے کہ موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں۔ چشمِ تصور سے پھر دیکھئے کہ پیر صاحب اپنی لانبی زلفوں سمیت رنگین پایوں والی چارپائی پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے ہیں۔ ایک نوجوان کہ باوقار شکل و صورت کا حامل ہے اندر

داخل ہوتا ہے۔ اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ اک شانِ استغنا سے پیر صاحب کی طرف دیکھتا ہے۔ چند ایک مرید جو پاؤں دبا رہے ہیں زمین پر بیٹھے ہیں (ان پیرانِ کرام کے دین میں چارپائی پر بیٹھنا حرام سمجھا جاتا ہے) ہمارا خیال ہے کہ یہ وہی باغی مرید ہے جس کا تذکرہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم کے آخری صفحات میں کیا تھا۔

وہ نوجوان ہنکارتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور پیر صاحب کی پنڈلیاں دبانے والوں کو کان سے پکڑ کر کہتا ہے

اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

تمہاری خودی وفات پا چکی ہے۔ آنجہانی ہو چکی ہے۔ کوئی باشریعت پیر ہو تو اس کی خدمت شوق سے کرو لیکن اس ہٹے اکٹے کی پنڈلیاں دبانے کی بجائے گلا دباؤ تاکہ فلاح پاؤ اور سیدھے کامیابی کی منزل پر بخیر و عافیت پہنچو۔ اس کے بعد دیوار پر لگی ڈبے لائٹ ٹیوب اُتار کر کہتا ہے ؎

کو تو بہتر نہیں مٹی کا دیا بھی ؛ گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

پیر صاحب اٹھ کر بھاگنے لگتے ہیں تو دبوچ لیتا ہے اور اعلامیہ جاری کرتا ہے کہ اب زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن نہیں رہیں گے۔

اکثر و بیشتر یہی کہا جاتا ہے کہ خودی کی دافر پیدا وار ہونا چاہیے یہ جنس گراں انتہائی ارزاں داموں ہر کسی کی ذات میں گھسیڑ دی جائے تو قوم کی تقدیر سنور جائے لیکن بعض اوقات خودی کی بیخ کنی بھی بہت ضروری ہو جاتی ہے۔ مثلاً افسری برقرار رکھنے کی خاطر اور شان و شوکت کو طول دینے کے ضمن میں ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد کچھ ایسے طریقے دریافت کیے ہیں کہ جن سے بڑے احسن طریقہ سے خودی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں یہی ہتھکنڈے فی سبیل اللہ عوام الناس کے فائدے۔ دُکھی افسروں اور پریشان حال چودھریوں کی دلجوئی کے لیے صرف اور صرف نیک نیتی کی بنیاد پر درج کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ اپنا دفتر بلڈنگ کی دسویں منزل پر بنائیں اور کسی طرح سے بل ملا کر لفٹ بند کرا دیں۔ اب جو کوئی بھی آپ سے ملنے آئے گا سو سے زائد سیڑھیاں چڑھے گا۔ جوں جوں اوپر چڑھتا جائے گا سانس پھولتی جائے گی۔ گردن اور کمر کے تناؤ میں خاصا فرق پڑے گا۔ اس ترکیب کو زیادہ موثر بنانے کے لیے سیڑھیاں زیادہ اونچی اونچی بنوائی جائیں تو عزتِ نفس آسانی سے مجروح ہو سکے گی۔ جب یہ حضرت آپ کے آفس میں آئیں گے تو سراپا نیاز مند ہو چکے ہوں گے انا اور اکڑفوں رخصت ہو چکی ہوگی اللہ کے فضل و کرم سے سیدھے کھڑے ہی نہ ہو سکیں گے تو خودداری کہاں سے آئے گی۔ ۲۔ دوستوں میں سے جو شخص خودی سے مالامال نظر آئے اس کی دو چار پُرتکلف دعوتیں کریں جب آپ کا نمک خوار ہو جائے پھر ہر جائز و ناجائز کام اور ہر قسم کی بیخ حرکت اس سے کرالیں۔ ۳۔ رشوت لینے کے جملہ فوائد چڑھتے سورج کی پوجا کرنے پر ملنے والی ازلی و ابدی خوشیوں کے متعلق اور تنخواہ کے اندر رہتے ہوئے گزارا کرنے کے نقصانات پر طویل لیکچر دیں۔ ۴۔ جس طرح انگریز مسٹر نگا ہم کے قلعہ کے دیک پوائنٹس تلاش کرتے رہتے تھے اُسی طرح ہر خوددار آدمی کی کمزوریوں پر نظر رکھیں اور وقت آنے پر نہایت اطمینان سے اپنی کمزوریوں کا حوالہ دے کر اس کی شخصیت کچل دیں فلہٰذا اس کارِ خیر میں آپ کا حامی و ناصر ہو۔ ہماری بھی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں!

رؤف خوشتر (بیدر)

"ہمارا زمانہ"

سیاست (بلدی انتخابات میں
پے در پے شکست سے) ——
اطاعت (اپنے ضدی اور خود سر بچوں کی ہر
خواہش پوری کر کے)، شرافت (ہوٹل کے
خوبصورت چمچے چھوڑتے ہوئے)، سخاوت (دریاگاری
کے علاوہ بھی بیروں کو ٹپ دیتے
ہوئے)، شجاعت (کسی طرح گھر کے
چوہوں کا صفایا کر کے) سے بھی جب یوم الدولہ
کا دل نہیں بھرا تو زندگی کے بقیہ دن صحافت کے
ساتھ (شرافت کے ساتھ تو ہر کوئی اپنے آخری دن
گزار لیتے ہیں) گزارنے کا اعلان
کر دیا. اور اردو اخبار کے اجراء کے ذرا
پہلے کے ڈرامہ کا پہلا منظر بلکہ پس منظر اُن کے
پس دفتر یعنی مکان کے اندرونی حصہ میں کھیلا جا رہا
تھا. جب ہم چپکے سے پہنچے تو دیکھا کہ اُن کی بیگم پیہم رو
رہی ہیں. اور یوم الدولہ نغمہ سرا ہیں
ع دے دے ہار دے، ہار سنہرے
ہار دے، ہار دے بیگم ہار دے
اور بیگم جو زود رو کر نڈھال ہو رہی تھی، صحافت کو
زرد و سرد ہونے سے بچانے کے لیے پہلے شوہر کو آخری
زیور دے کر ہچکیاں لیتی رہیں.
یوں زیورِ زوجیت سے زیورِ طباعت
کے مرحلہ تک اخبار پہنچ سکا. گویا ایثارِ زنا
اخبارِ زمانہ کو زندگی بخشا. سچ ہے ہر بڑے کارنامے
کے پیچھے عورت کا ایثار (ہار) ہے —— تو صاحبو یوں
ایک ایسے اخبار کا اجراء عمل میں آیا
جس کے یوم الدولہ لاشریک حصہ دار
و قصہ دار تھے. کتابت، طباعت اور سجاوٹ
اُن کے معروف و مبارک ہاتھوں سے ہو رہی تھی.
اعلان کر دیا کہ وہ شہر کے سارے باشعور شہریوں کو
(جن کی تعداد اُن کے رشتہ داروں
اور دوستوں تک محدود تھی) ایک مکمل اخبار
دیں گے. مکان کا وہ حصہ جسے وہ دیوان خانہ
کہنے اور ثابت کرنے پر مُصر رہتے، اخبار کا دفتر
ثابت ہوا. وہاں ایک اونگھتی ہوئی سہمی سہمی سی میز جو
شاید طوفانِ نوح سے نکال لائے
تھے اور ایک لڑکھڑاتی ہوئی تیموری
کرسی رکھی ہوئی تھی. حاضرین، ناظرین، قارئین
اور شارحین (مبہم اور غیر واضح کارٹون سمجھانے والے)
کے لیے بلا لحاظ ملت اور بوجہ مالی قلت بوریئے بچھا دیئے

گئے۔ وہ بار بار اپنی تقدیر کی طرح سوتی زلفوں کو پریشان کرتے اور ہاتھ میں نیم سوختہ سگریٹ لیے ایسے بدحواس نظر آتے جیسے اخبار کا خصوصی ضمیمہ ترتیب دے رہے ہوں۔ میز کی سیف میں تین چار "بورڈ" رکھ چھوڑے تھے۔ جب کوئی اشتہار کے لیے آتا تو "منیجر برائے اشتہارات" کا بورڈ میز پر سجاتے جب کوئی (غلطی سے) اپنے گھر اخبار جاری کروانے کے لیے آتا تو جھٹ "سرکیولیشن منیجر" کا بورڈ میز پر جماتے۔ بقیہ وقت "مدیرِ اعلیٰ" کی نیم پلیٹ میز پر ڈٹی رہتی۔ "آیا بورڈ گیا بورڈ" کی سیاست تھی کچھ سوچے سمجھے بغیر لوم الدولہ نے اپنے اخبار کا نام زمانہ رکھا۔ اور اب وہ زمانہ کو چھپوانے اور لھپانے کی فکر میں رہتے۔ "زمانہ" اُن کے لیے بوریئے کے علاوہ اوڑھنا بچھونا بن گیا (سچ مچ اخبار کے کتنے فائدے ہیں)

اشاعت کے پہلے دن سے ہی وہ سرورق پر تکون میں سرخ دائرہ لگا کر چندہ اور اپنی مالی قلت اور آبادی میں تخفیف کا اعلان کرنے لگے۔ اب وہ حضرت جگر مرادآبادی کی روح کا خیال کئے بغیر کہتے کہ "ہم زمانہ سے ہیں زمانہ ہم سے نہیں۔" اُن کی پوری کوشش ہوتی کہ اخبار کا اداریہ بلدی حدود (بلدی مسائل) سے تجاوز نہ کر جائے سینما کے اشتہارات طلاق نامے اور چٹخارے دار خبریں نمایاں شائع کرتے۔ تنگ داماں کا سہارا لے کر اقوالِ زرّیں اور سدا بہار جوانی کے آزمودہ نسخوں کو پاس پاس شائع کرنے کہ یہ دونوں بوڑھوں اور ادھیڑوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ ایک چوتھائی اخبار تو "چھپتے چھپتے" کالم کے تحت خالی رکھتے جب ہم نے اس تنگ دامنی کی طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے۔ "میاں تیسری جنگِ عظیم کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اِس کھُلے کالم میں جنگ کی خبر فوراً شائع کر دوں اور یوں دوسرے اخبارات پر سبقت لے جاؤں"!

اخبار چہ "زمانہ" ہمارے لیے توشبا نہ تھا۔ رات کے کسی بھی حصہ میں گورکھا کی طرح ڈنڈا بجاتے ہمیں جگاتے اور اخبار تھماتے۔ ہم اس مڈنائٹ ٹائمز کو رات کا بقیہ حصہ مچھروں کی بھنبھناہٹ، بیگم کی غراہٹ اور بچوں کی بڑبڑاہٹ سے بچنے کے لیے بطور ڈھال استعمال کرتے۔

ایک بار دن کی روشنی میں جب "زمانہ" ہمارے ہاتھوں آگیا تو یقین نہیں آیا۔ تاریخ دیکھی تو معلوم ہوا کہ دو روز پہلے کا اخبار ہے جو لوم الدولہ کے چھوٹے صاحبزادے کے عقیقہ کے باعث آج شائع ہو سکا۔ الغرض مکان اور محلّہ کی کسی بھی تقریب، سرکاری و غیر سرکاری تعطیلات عیدین، بارش طوفان، کرفیو مہینہ کی پہلی اتوار اور سال کے آخری چہارشنبہ کو اخبار "زمانہ" پابندی سے بند ہوتا۔ دفتر کے سامنے سے پولیس کی گاڑی گزرتی تو دفتر بند کر دیتے اور ریڈیو کھول دیتے۔ ریڈیو اور نیوز ایجنسیوں پر اُن کا ایمان آندھی طوفان زلزلہ اور بارش سے بھی متزلزل نہیں ہوتا۔ جس کا ثبوت ہمیں ایک واقعہ سے ہوا۔ بارش ہو رہی تھی اور لوم الدولہ کارٹون بنانے میں مصروف تھے۔ لاچار اُن کی بوسیدہ چھت نے شانِ کریمی کے قطروں کو دفتر میں ٹپکانا شروع کر دیا تو ہمیں پانی پت یاد آیا۔ ہم نے کہا دیکھئے اخبار کے کاغذات بھی دفتر کا حال دیکھ کر قطرۂ انفعال سے نم ہو کر بارش کا پتہ دے رہیں۔ سن کر کہا۔

ع تر کاغذی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

جھٹ ریڈیو کھول کر خبروں سے تصدیق کرلی کہ واقعی بارش ہو رہی ہے۔ اخبار اور خود کو بارش سے بچانے کے لیے دفتر میں چھتری کھول دی اور کہنے لگے۔

" برخوردار میں اور میرا اخبار دوسروں کی چھتری کے زیرِ سایہ نہیں رہیں گے۔ سیاسی ہو یا غیر سیاسی ہم اپنی

ہی چھتری کی پناہ میں رہیں گے۔"

دنیا بھر کے اخبارات اپنے خصوصی نمبر چاہے کسی بھی موضوع پر نکالتے ہوں۔ لوم الدولہ اپنے "زمانہ" کو زمانے بھر کے اخبارات سے اس معاملہ میں منفرد و متضاد رکھتے ہیں جب ہم نے خصوصی نمبر کے موضوعات کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے۔

"جس طرح سال کے بارہ مہینوں پر تین موسم مسلط ہیں۔ اُسی طرح اپنے قارئین پر بھی اُن کی پسند کے مطابق تین موضوعات حاوی رہیں گے۔ اس سال رواں کے تین موضوعات ہیں فلمی خواتین، مثلاً فلسطین اور کرکیٹر ظہیرالدین بیہا۔ آئندہ سال کے تین موضوعات ہوں گے۔ یوسف خاں (دلیپ کمار) اردو زبان اور ہمارے پان (جن پر خوب چونا لگا کر آمدنی کر لوں گا)۔

خبروں کی سُرخیاں لگانے میں وہ یدطولیٰ رکھتے تھے۔ جس میں اُن کی صحافت کے علاوہ شرارت کا بھی کافی دخل ہوتا تھا۔ یہاں ایک دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ شہر میں شادی تھی۔ کرنل جوشی (جو گرم مزاج تھے) صنعت کار مہرا کی لڑکی (جو خشک مزاج تھی) سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہی تھی۔ لوم الدولہ نے اس شادی کی سرخی یوں لگائی۔

"گرم جوشی اور سرد مہری کا دائمی ملاپ"

بس کچھ نہ پوچھئے مہرہ اور جوشی دونوں "زمانہ" کو دکھانا ہے۔ کہتے ہوئے دفترِ زمانہ پر ٹوٹ پڑے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اخبار زمانہ پندرہ روز بند رہا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ اشتہارات مل گئے! اور یوں اخبار پھر سے شائع ہونے لگا۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ دفترِ زمانہ پہ دنیا بھر کے لوگ ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔ وائے حیرت کہ کیا اب ایسے بھی دن دیکھنے نصیب ہوئے کہ اردو کے قاری اخبار خرید کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس حیرت انگیز انقلاب کا سہرا صاحب زمانہ کے سر باندھنا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے زنانہ آواز سُنائی دی۔ لپک کر اندر پہنچے تو دیکھا کہ ایک خوش پوشش اور خوشش شکل خاتون لوم الدولہ پہ برس رہی ہیں۔ بدقت تمام ہم نے خاتون کو اُن کی بچی ہوئی گالیوں کے ساتھ رخصت کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ کچھ گالیاں تو شوہر کے لیے رکھ چھوڑیئے۔ پھر صاحبِ زمانہ سے عذابِ زمانہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے "میاں میں کیا جانوں۔ وہ اخبار لیے آئیں اور آتے ہی برس پڑیں کہ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ آپ نے کیا سمجھ کر خبر اور سُرخی چھاپ دی۔ ہم نے اخبار زمانہ دیکھا۔ گلشن اینڈ کمپنی کا اشتہار تھا کہ ہمارے پاس ہر قسم کا مال مناسب دام پر ملتا ہے۔ پھر حسبِ روایت و شرارت لوم الدولہ نے اس سُرخی پر خبر ختم کر دی تھی کہ

ع چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

معلوم ہوا کہ اُن خاتون کا نام گلشن ہے اور یوں اخبار زمانہ ہفتہ عشرہ سے بند ہے۔ یوں تو خوشحالی اور سکون ہماری زندگی میں ہے۔ لیکن لوم الدولہ کے کاغذی پیرہن اُن کے زمانہ کے بغیر ہم اپنی زندگی میں کمی محسوس کر رہے ہیں۔

خدا کرے ہماری سکھ چین اور خوشتر زندگی میں لوم الدولہ کا بھی زمانہ جلد آجائے ۔۔!

ایک کاشتکار کی گھوڑی نے اُسکی بیوی کو دولتی مار کر ہلاک کر دیا۔ بستی کے بہت سے لوگ اُس کے پاس تعزیت کیلئے آئے۔ کاشتکار کا ایک دوست اس سے کہنے لگا۔ "لگتا ہے تمہاری بیوی بہت مقبول و ہر دلعزیز تھی کہ اتنے لوگ تعزیت کیلئے آرہے ہیں" "یہ سب لوگ تعزیت کیلئے نہیں بلکہ میری گھوڑی خریدنے کیلئے آرہے ہیں"۔ کاشتکار نے جواب دیا۔

انّ پڑھ بھونگیری

آپ نے آج کیا پکایا ہے
بندہ چورن بھی ساتھ لایا ہے

جاکے دوبئی کو جب سے آیا ہے — اب وہ سب کے لیے پرایا ہے
ہاف الکم تو دے رہا ہوں میں — کتنا کم گھر کا اب کرایہ ہے
اس کے گھر روشنی ہوئی کیسی — جس نے گھر غیر کا جلایا ہے
بدگمانی ہوئی ہے بیگم کو — سری دیوی سے دل لگایا ہے
گھوڑے جوڑے کی مانگ ہے اسکی — اک بھکاری ہے گھر کو آیا ہے
RICE کافی نہو گا دو کنٹل — سارا سسرال گھس کے آیا ہے
تم لٹاؤ نہ عیش میں اس کو — باپ دادا نے جو کمایا ہے
کم سے کم رش بڑھا ہے مسجد میں — اتنا بچپن میں جو ہٹایا ہے
میری تاریخ لکھنے والے سن — میں نے بھی اپنا خون بہایا ہے
حاجی صاحب سے سن کے حیراں ہوں — صرف ہم نے کھجور لایا ہے
کیا پڑوسی کا بچہ کھانے کو — عید کے دن بھی بلبلایا ہے
کام یونہی نہیں بنا اپنا — کچھ کھلایا ہے کچھ پلایا ہے
روز ہوٹل میں میرے سسرے کی — تازہ کلیجوں کے ساتھ پایا ہے
لکھنا پڑھنا ہی ہو گیا رخصت — میرے گھر میں جو ٹی وی آیا ہے
صفرہ پھرتا ہے دیکھ کر تجھ کو — جب سے الّم مربّہ[1] کھایا ہے
ہو گئی اس کو بھی غلط فہمی — اس سلیقے سے مسکرایا ہے
ناچتا تھا کبھی وہ فلموں میں — اب عدالت نے بھی نچایا ہے
وائف لائی تھی جو پلنگ اس کا — تین پائی ہے ایک پایا ہے

صرف خشکہ مجھے ملا انّ پڑھ
جب بھی بڈھوں کیساتھ کھایا ہے

---

[1] ادرک کا مربّہ

حلیمہ فردوس
(بنگلور)

"آنکھیں ہماریاں"

قدرت نے ہم پہ بےشمار کرم فرمائے ہیں، کتنی نعمتوں سے مالامال کیا ہے۔ سوچنے کے لیے سر کے قید خانے میں ایک دماغ مقید کیا۔ سننے کے لیے کانوں کے دو لازوال خزانے بخشے۔ سونگھنے کے لیے ایک ناک دی۔ جاہل جس سے صرف سونگھتے ہیں اور عاقل اس سے سانس بھی لیتے ہیں۔ منہ چلانے کے لیے بتیس ۳۲ دانت عطا کئے جس میں عقل داڑھ کا شمار نہیں کیونکہ وہ چالیس سال بعد ہی آتا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ ان بتیس دانتوں کے درمیان صرف ایک زبان رکھ دی۔ جس میں شمشیر کی سی تیزی اور شبنم کی ٹھنڈک موجود ہے اور دنیا کے حسن کا مشاہدہ کرنے کے لیے دو آنکھیں عطا کیں

زندگی بھر کام کرنے کیلئے دو ہاتھ دیئے اور زندگی کا فاصلہ طے کرنے کے لیے دو پیر بخشے۔ زبان اور ناک کی طرح آنکھ بھی ایک عدد ہوتی تو واقعی دنیا کا حسن ادھورا رہ جاتا۔ یہ دو آنکھیں جو کبھی چار ہو جاتی ہیں۔ کبھی پردے کے پیچھے کا منظر بھی دیکھ لیتی ہیں اور کبھی دونوں آنکھیں ایسی بند ہو جاتی ہیں کہ "صد جلوہ روبرو" ہونے کے باوجود کوئی چیز نظر نہیں آتی آج انسان کچھ اس قدر منطقی بن گیا ہے کہ اس کے چہرے پر تیسری آنکھ بھی نکل آئی ہے لیکن وہ دکھائی نہیں دیتی صرف محسوس کی جاتی ہے البتہ ایک آنکھ کا انسان کسی کو بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کوئی بات اسی وقت مصدقہ کہلائی جاتی ہے جب زبان

کہلائے کان سنیں اور آنکھ دیکھے۔ سنی سنائی باتیں محض افواہ کہلاتی ہیں مگر ہمارے محلے اور گلیوں میں ایسی بھی لڑکیاں بکتی ہیں کہ لوگ شیر آیا شیر آیا اور آسمان گرا، آسمان گرا جیسی افواہوں کو بھی حقیقت کا روپ دے دیتے ہیں اور ایسی افواہوں پر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو دیکھا خواب تھا اور جو سنا افسانہ تھا۔ زندگی جتنی بھی گزری ہے (خواہ وہ بےکار ہو یا کارآمد) مگر آنکھوں نے جو دیکھا اسے زبان پہ لانا مشکل ہے اور جب زبان پر آ جائے تو پھر دیکھنا وہ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں زبان اس کی گواہی دیتی ہے لیکن عدالت کے کٹہرے میں ٹھہرنے والا گواہ پیسوں کی لالچ میں آنکھوں دیکھی

حقیقت پر پردہ ڈال کر جھوٹی گواہی دیتا ہے اور بے گناہ یوسف کو زنداں میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ قانون تو وہی دیکھتا ہے جو اُسے دکھایا جاتا ہے۔ آنکھیں اگر سچ بولنے لگیں تو وکلاء کی روزی بند ہو جائے۔

ہماری آنکھوں نے بھی وہی سب کچھ دیکھا ہے جو آپ کی آنکھوں کے آگے گزر چکا ہے۔ ہولی میں رنگ کا چھینٹا ہو یا دیوالی میں آتش بازی کا دھماکہ یا شہر کے فٹ پاتھ پر جنم لیتے ہوئے بچے اور خوشنما فلیٹ کی دبیز قالینوں پر کھیلتے ہوئے روئی کے گالے جیسے سفید کتے سب ہماری آنکھوں کو درسِ عبرت دیتے ہیں۔ کیا ہم گوتم بدھ ہیں جو ان سب حقیقتوں سے آنکھیں چُرا کر نروان حاصل کریں۔ ہمیں تو اپنی دو آنکھوں سے اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں تو ہوا کرتی ہیں لیکن جتنی آنکھیں اتنی کہانیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ ہمارے پڑوس کی خالہ بی سے اگر یہ کہانیاں سُنیں تو آپ دنگ رہ جائیں حالانکہ اُن کے زمانے میں مرد کا آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بڑی بی کی آنکھیں سب جانتی ہیں کہ کس کا بیٹا کس پر عاشق ہے کون کس کے ساتھ بھاگنے والی ہے۔ اسی لیے تو وہ کہتی ہیں "ہائے رے یہ آفت کی پُڑیاں پہلے نظر ملتے ہی آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرلیتی ہیں اور پھر وہ ڈسکو شہزادہ آنکھوں کے جھروکے سے گزر کر من مندر کا دیوتا بن جاتا ہے۔ خاک پڑے موئی آنکھوں پر جس نے اب تک کیا کیا نہیں دیکھا۔ بٹیا رانی اگر تم کسی سے نا کہو تو ایک راز کی بات بتادوں جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پڑوس کی شادی شدہ بی بی ہیں نا اپنے جانِ جوان شوہر کے رہتے ہوئے سنگھار کئے کھڑکی کی اوٹ سے غیروں سے آنکھیں لڑاتی رہتی ہیں۔ ہائے ہائے یہ ظلم ہم سے دیکھا نہ جائے۔" بس بس کہہ کر ہم نے خالہ بی کو یہیں روک دیا۔ اگر ہم ذرا بھی تنبیہہ نہ کرتا تو خالہ بی کی قینچی جیسی زبان چلتی ہی رہتی۔ ہر وقت اُن کا آنکھوں دیکھا حال اُن کی زبانی سُنتے وقت ہم یہی کہتے کہ خالہ بی دوسروں کی خبر گیری میں دُبلی کیوں ہوتی ہو یہ کام تو قاضی جی کو زیب دیتا ہے آپ کو نہیں۔ بس خالہ بی منہ بسورے پان کھائے بنا اپنی ہاتھی جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مچمچاتی چلی جاتیں۔

دولت چرائی جاتی ہے، دل چرایا جاتا ہے حتیٰ کہ آنکھیں بھی چرائی جاتی ہیں محبوب دل چراتا ہے قرض دار آنکھیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بلڈ بینک کی عمر آئی بینک سے بڑھ کر ہے۔ آنکھوں کا عطیہ آج کل ایک فیشن بن گیا ہے۔ لوگ بنا سوچے سمجھے بھی اپنی آنکھیں بطور عطیہ دینے لگے ہیں۔ ہمیں تو کچھ عجیب نظر آتا ہے۔ ایک زندہ دل شخص کی آنکھیں ایک قنوطی کو لگائی جائیں اور ایک مفکر کی آنکھ سائنس دان کو لگائی جائے اور ایک لیڈر کی آنکھ شاعر کو لگادی جائے تو بس ایک تماشہ ہو جائے۔ وہ کچھ اور دیکھنا چاہیں گے اور اُنھیں اُس کے برعکس نظر آئے گا۔ پھر لوگ خوف سے آنکھیں ہی نہ کھولیں گے!

انسان چوری کرتا ہے اُس کے نزدیک یہ کوئی بُرائی نہیں۔ لیکن چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے میں وہ بڑی ذلت محسوس کرتا ہے۔ انسان اور بلی میں یہی تو فرق ہے وہ آنکھیں موند کر دودھ پیتی ہے اور انسان آنکھیں کھول کر غلطی کرتا ہے۔ بس یہی اُس کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔

اعضائے رئیسہ میں آنکھ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنے کان اور منہ بند کرکے کام چلا سکتے ہیں لیکن جیتے جی کسی کی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ اگر آنکھیں بند بھی ہو جائیں تو سمجھ جائیے کہ وہ شخص جلد ہی ملٹن کی طرح "فردوسِ گمشدہ" کی تخلیق کرے گا۔ گاندھی جی نے بندروں کے ذریعہ بُرا مت دیکھو بُرا مت کہو اور بُرا مت سنو کا سبق سکھایا ہے۔ ممکن ہو یہ سبق بندروں نے سیکھا ہو تو سیکھا ہو لیکن ہم ہندوستانیوں نے تو نہیں سیکھا۔ ورنہ وزراء کی جان مٹھی میں نہ ہوتی۔ موہن داس کرم چند گاندھی ہوں کہ اندرا گاندھی اپنے ہی ہم وطنوں کی گولی کا نشانہ نہ بنتے۔

بتیس دانتوں کے علاوہ زاید داڑھ جو بے وقت آتا ہے اُسے عقل داڑھ کہتے ہیں۔ جس کی تکلیف دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ بیوی کے زور دار تھپیڑ سے جس مرد کا گال پھول گیا ہو وہ عقل کے داڑھ کا بہانہ کرکے بآسانی حقیقت کو چھپا لیتا ہے۔ حالانکہ عقل کا داڑھ عمر میں صرف ایک ہی وقت آتا ہے جبکہ آنکھ کبھی بھی آسکتی ہے یہ ایک متعدی مرض ہے۔ آپ جب اس مریض کے آنکھ میں آنکھ ڈال کر باتیں کرتے ہیں تو بس آنکھ آجاتی ہے۔ آنکھ آجائے تو گھبرانے کی بات نہیں آپ بآسانی اپنی سرخ آنکھ سے دوسروں کو بھی اس کا شریک بنا سکتے ہیں۔ مہینے کا پہلا ہفتہ ہو تو علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جائیے ورنہ مہینے کے آخری ہفتے میں خشکہ اور گھی ڈال کر پوٹلی بنا کر اس سے آپ آنکھ کی تواضع کیجئے۔ آنکھ آنے کی کوئی اہمیت نہیں البتہ آنکھ پھڑکنے کو بُرا شگون قرار دیا جاتا ہے۔ حتی کہ گھوڑی پہ بیٹھے ہوئے دولھے کے کان میں جب یہ بھنک پڑتی ہے کہ کنیادان میں کنیا کے علاوہ کچھ نہیں دان دیا جارہا ہے تو وہ آنکھ پھڑکنے کا بہانہ بنا کر اُلٹے پاؤں گھر لوٹ جائے گا اور ادھر بیچاری دلہن زندگی بھر دُلہے کی راہ میں آنکھ بچھائے انتظار کرتے بوڑھی ہو جائے گی۔

ناک سے جو پانی بہتا ہے اُسے حرفِ عام میں نزلہ کہتے ہیں۔ جس کے تدارک کے لیے آپ دِکس، بام، امرت انجن کا استعمال کرتے ہیں اور آنکھ سے جو پانی گرنا شروع ہو تو دنیا آنسو کے نام سے پہچانتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں مرد کو رام کرنے کے لیے آنکھوں سے آنسو کی ندیاں بہاتی ہیں جب کہ مردوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو آنکھوں سے لہو ٹپکانے کو جوانمردی کا ثبوت گردانتا ہے۔ آنکھ سے آنسو لہو بن کر اسی وقت ٹپک سکتا ہے جبکہ انسان بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتا ہو۔ یاد رہے کہ چشمہ لگانے سے کوئی اہلِ بصیرت نہیں بن سکتا۔ یہ چشمہ بھی عجیب شئے ہے یہ شناخت کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ چشمہ لگانے سے غزالی آنکھیں نرگسی اور نیم خواب آنکھیں مگرمچھ کی طرح نظر آتی ہیں۔

آخر میں ہم یہ بتا کر رخصت ہوتے ہیں کہ ہمیں تو وہ آنکھیں پسند ہیں جو دل کا حال صاف صاف بتائیں! □□

---

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف
اور ہزاروں کی دل پسند چائے۔
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب۔

لاسا اسپیشل چائے
لاسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس :- نیلگری ٹی ایمپوریم، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد، اے پی انڈیا۔

ہم
بھارت کے لوگ
اپنی جمہوریہ کے محبوب آدرشوں،
جمہوریت
سوشلزم
سیکولرزم
انصاف
آزادی
مساوات
اخوت
ہم آہنگی
اتحاد
سالمیت
امن اور
ترقی
کے علمبردار ہیں
ہم ہمیشہ ان پر قائم رہیں گے

ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی

کُتّا

کُتّا وہ جانور ہے جو دنیا کے تقریباً ہر خطّے میں پایا اور پالا جاتا ہے۔ وہ پہلا خلا باز ہے جس نے ثابت کیا کہ انسان بے خوف و خطر خلائی سفر کر سکتا ہے، بہت سی ادویات کی تیاری سے متعلق تجربے وہ جھیلتا ہے۔ مالک کو صبح کا اخبار پہنچاتا ہے۔ قرض خواہوں پر بھونکتا ہے۔ ریس کے میدان میں جیک پاٹ ثابت ہو کر لاکھوں کے وارے نیارے کرتا ہے۔ شکار میں مالک کی مدد کرتا ہے۔ جنگلی جانوروں کو دیکھ کر دور ہی سے بھونکنے لگتا ہے اس کی آواز سن کر جانور بوکھلا جاتے ہیں اور جدھر منہ ہوتا ہے دوڑ پڑتے ہیں۔ اکثر اس اندھا دھند دوڑ میں شکاری کے آگے سے گزر جاتے ہیں۔ شکاری بندوق سے پھونک دیتا ہے۔ جانور زخمی ہو کر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ جنگل میں قیام کے دوران رات میں خونخوار جانوروں کی بُو پا کر بھونکتا ہے اور شکاری کو شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اس لیے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

کُتّے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پالتو، دوسرے خود رو پودوں کی طرح فالتو۔ جن کی پرورش کی ذمّہ داری محلّے والوں کی ہے اور آخری رسومات کی ادائیگی کا ذمّہ کارپوریشن والوں نے لے رکھا ہے۔ کتّے لاوارث نہیں مرتے اِن کی تکفین کے لیے چندہ نہیں کرنا پڑتا۔

برسوں پہلے کارپوریشن کا قانون تھا کہ ہر پالتو کتّے کے گلے میں پٹّے بندھے ہوتے تھے تاکہ اس سے کسی کو ضرر پہنچے تو مالک سے پُرسش کی جا سکے۔ مالکان نے چالاکی کی اور احتیاطاً محلّے کے آوارہ کتّوں کے گلے میں بھی پٹّے ڈال دیئے۔ ضرورت پڑنے پر کتّے کے ذریعے مالک کی پہچان ہوتی اور قانونی کارروائی کی جاتی ہے۔

طوطے کی طوطا چشمی اور گرگٹ کی رنگ بدلتی کھال کی طرح کتّے کی دُم کا ٹیڑھا پن مشہور ہے۔ لیکن اس کی دُم کا ٹیڑھا پن دوسروں کے تئیں ہے اُسے کوئی اس کے مالک کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا۔ ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ ٹیڑھا پن اس کی وفاداری کا ثبوت ہے۔ مالک کی نوازشوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے وہ دُم ہلاتا رہا اور اس کی دُم میں ٹیڑھا پن آتا چلا گیا۔ اپنے مالک کو 'خوش آمدید' اور 'خدا حافظ' کہنے کے لیے بھی وہ دُم ہلاتا رہتا ہے۔ گویا دُم سے زبان کا کام لیتا ہے۔ کچھ لوگوں کو پریشانی ہے کہ اس کی دُم ٹیڑھی کیوں؟ (انھیں یہ پریشانی تو بے چارے اُونٹ کیلئے

ہونی چاہیئے جس کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں) ان لوگوں کو شاید نہیں معلوم کہ کتوں کی ایک نسل ایسی بھی ہے جن کے دُم برائے نام ہوتی ہے۔ یہ کتے جاسوسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ لفافہ سونگھ کر مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ جراثیم کا سراغ لگانے میں انھوں نے اشرف المخلوقات کو شرمندہ کر رکھا ہے۔ امراء جان ومال کی خاطر انہی کتوں کو پالتے ہیں۔

دُم وہ آلہ ہے جس سے مختلف حالتوں میں کتے کے موڈ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ نہیں ہل رہی ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ موڈ نارمل ہے۔ ہلے تو اِسے عجز وانکسار پر محمول کیا جائے۔ لیٹا ہوا ہو، آنکھیں بند ہوں اور کبھی کبھار دُم ذرا ہل جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سستا رہا ہے۔ لیکن ذہنی طور پر پوری طرح چوکس ہے۔ دُم اگر پھول جائے اور بال کھڑے ہوجائیں تو یہ غصہ کی علامت ہوگی۔ غرّانے لگے تو جان لیجئے کہ وہ کسی چیز پر جھپٹنے کی تیاری میں ہے۔ اس کے کان ٹرانسمیٹر کے سگنل کا کام کرتے ہیں۔ ماحول میں ذرا سی صوتی تبدیلی پر یہ اٹینشن کی پوزیشن میں آجاتے ہیں۔ دوسری صورت میں آرام کرنے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ کتے لڑائی میں اس اصول پر کاربند رہتے ہیں کہ پہلی دھونس اگر جم جائے تو آخری دھونس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے لڑائی کی ابتداء میں ہی زوردار غراہٹ کے ساتھ مقابل کی طرف بڑھتے ہیں اور حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ حربہ کام آجائے تو مقابل دُم دبا کر اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور اگر وہ بھی اس حربے سے واقف ہو تو پھر لڑے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ عموماً کتے ہاتھا پائی کے قائل نہیں ہوتے۔ بول چال کے ذریعے دل کی بھڑاس نکالنے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ لڑائی کے آداب سے واقف ہیں اس لیے مقابل کو برابری سے لڑنے کا موقع دیتے ہیں۔ اپنے پرائے میں تمیز کرتے ہیں، آپس میں اُلجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ دوسری گلی کے کتوں سے مل جل کر اور ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک کتا دوسری گلی کے کتے کو قبول نہیں کرتا اپنے علاقوں میں سبھی کتے شیر ہوتے ہیں۔

موسم گرما کی خنک راتوں میں ان کی طبع نازک گدگداتی ہے جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً شعروشاعری کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یہ محفلیں فی البدیہہ ہوتی ہیں۔ کوئی بزرگ کتا ایک فی البدیہہ مصرع باوازِ بلند پڑھتا ہے۔ تمام حاضرین اسے کورس میں دہراتے ہیں پھر اساتذۂ سخن کتے گرہ لگا کر شعر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسے ہی ملی جلی کوشش سے شعر پورا ہوتا ہے۔ نومشق کتے داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں۔ اس کے بعد محفل باقاعدہ گرم ہوجاتی ہے استاد کتے اپنی کہنہ مشقی کا سکہ جمانے کے لیے اس قدر اشعار ارشاد کرتے ہیں کہ نومشق کتوں کو کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس صورتحال کو کبھی تو وہ برداشت کرجاتے ہیں اور کبھی بغاوت پر اُتر آتے ہیں اور آدابِ محفل کا خیال نہ کرتے ہوئے اشعار پڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ اگر نوجوان کتے اخلاقی حدود میں رہ کر اساتذۂ سخن کا کلام سنیں تو جب تک محلے والوں کی قوتِ سماعت جواب نہ دے جائے یہ نشستیں بڑی کامیابی سے اور دیر تک چلتی رہتی ہیں۔ لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ ان نشستوں کی خصوصیت یہ ہے کہ غیرشاعر کتوں کے لیے ان میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کتے وقت کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ اس لیے گلے بازی میں اپنا اور دوسروں کا وقت برباد نہیں کرتے۔ تحت اللفظ میں کلام پیش کرتے ہیں، یہ نشستیں ہفتے میں دو تین بار منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

کتے پالنا آج کل فیشن میں شامل ہوگیا ہے۔ اس لیے کتے بھی بکنے لگے ہیں۔ پہلے تحفتاً بل جاتے تھے۔ کسی رئیس کی پوزیشن کا اندازہ پہلے قیمتی کپڑوں۔ عالیشان مکانات۔ کاروں اور گھوڑوں سے کیا جاتا تھا۔ اب ان چیزوں میں کتوں کا اضافہ ہوگیا ہے جس کے پاس جتنے اعلیٰ نسل کے کتے ہوں گے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہوگا۔

وفاداری میں اس نے تمام جانداروں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر دھوبی کے کتے کو لیجئے اس نے تو وفاداری کی انتہا کر دی اور اپنی اس وفاداری کی بدولت نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ مالک پیٹ بھر روٹی نہ دے تب بھی اس سے بدظن نہیں ہوتا۔ در در گھوم کر پیٹ بھرتا ہے اور لوٹ کر اپنے مالک کے گھر ہی آتا ہے۔

کتے کو دوسری تمام قوموں نے اپنایا سوائے مسلمانوں کے۔ ان کے نزدیک یہ ناپاک جانور ہے۔ اس کی رال کو تو وہ شیطان کا لعاب دہن سمجھتے ہیں۔ رال پر یاد آیا کہ غالباً اس کی رال کو لے کر محاورہ "رال ٹپکانا" گھڑا گیا ہوگا "دُم ہلانا" تو یقیناً اُس کی دُم کی دین ہے۔ دُم ہلانا کے معنی چاپلوسی یا چمچہ گری کرنے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے چمچے قسم کے لوگوں کو عوام الناس "کتے" کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کاٹنا بھلے ہی ہر کتے کی عادت نہ ہو لیکن بھونکنا تو ہر کتے کی فطرت ہے۔ بھونکنا گویا اس کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ جس کا استعمال وہ بیجا اور بے جا طور پر کرتا رہتا ہے اور اپنی برادری والوں کو بھی اس حق کے استعمال کا پورا موقع دیتا ہے۔ بلکہ اکثر اخلاقاً ساتھ بھی دیتا ہے۔ نتیجتاً عوام الناس کو کورس سننے کو ملتا ہے۔ یہ کورس لو (LOW) بلیڈ پریشر کے مریض کا پریشر بڑھا کر نارمل کر دیتا ہے۔ اور ہائی (HIGH) بلیڈ پریشر کو مزید ہائی۔

کچھ کتوں نے عالمگیر شہرت پائی جیسے لیلیٰ کا کتا۔ لیلیٰ کا عاشق قیس اسے بے پناہ پیار کرتا تھا! انگلینڈ کے دو ماؤتھ کا کتا بھی اپنا جواب آپ تھا۔ اسے اس کے مالک نے ایسی تربیت دی تھی کہ وہ منہ میں اخبار دبا کر ہر گھر میں پھینک آتا۔ دنیا کا یہ پہلا اور شاید آخری اخبار فروش کتا تھا۔ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں دو کتوں نے بڑی شہرت پائی۔ ایک پطرس کا کتا، دوسرا وہ کتا جس نے کرشن چندر کو لاہور میں کاٹا تھا۔ اور انھوں نے اپنی ایک کتاب اس کے نام معنون کر دی تھی کہ دوسری مرتبہ نہ کاٹے۔

انسانی زندگی میں جن پالتو جانوروں کی اہمیت دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے ان میں کتا سرفہرست ہے۔ کہیں کہیں تو وہ انسان سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل نظر آتا ہے۔ ایک مالدار شخص کے کتے کی پرورش و پرداخت کے لیے ملازم ہوتے ہیں۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں فوم کے بستر پر سوتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے بسکٹ اور دوسری چیزیں نوش کرتا ہے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر سفر کرتا ہے۔ مالک کی نوجوان اور خوبصورت لڑکی اسے گود میں لیے پھرتی ہے۔ پیار آنے پر ہونٹوں سے چومتی ہے جبکہ اسی گھر میں کام کرنے والا ملازم، انسان ہوتے ہوئے جانور سے بدتر زندگی گزارتا ہے۔ اس کے پاس پہننے کے لیے ڈھنگ کا کپڑا ہوتا ہے نہ سونے کے لیے کھاٹ۔ وہ برآمدے کے فرش کو بستر بنا کر صبر و تحمل اوڑھ لیتا ہے۔ اور اسی گھر میں ایک کتے کے ٹھاٹ دیکھ کر اکثر سوچتا ہے کہ خدا نے اسے انسان بنا کر پتہ نہیں کس پاپ کی سزا دی ہے؟ وہ اُسے انسان نہ بناتا، کتا ہی بنا دیتا تو کتنا اچھا ہوتا!!

نامور مزاح نگار مسیح انجم کے مضامین کا تیسرا مجموعہ:

چنانچہ

۱۲ روپے

ناشر:
زندہ دلان حیدرآباد۔

شکیل اعجاز (اکولہ)

یہ کہاں کی دوستی ہے!

امتحانات کا زمانہ تھا میں اسٹڈی سے گھبرا کر چہل قدمی
کے لیے باہر نکلا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس سال نقلیں نہیں
چلیں گی۔ امتحانات میں گھپلوں کے باعث بڑے بڑے
لوگ کرسیوں سے کھینچے جا رہے ہیں۔ بڑے آدمی کی کرسی
سرک سکتی ہے تو چھوٹے آدمی کا تو بستر ہی گول ہوگا۔ خیال
آیا امتحانات دینا اور پاس ہونا تو معمول بن ہی گیا ہے اب
کی دفعہ اسٹڈی بھی کرلی جائے۔ چنانچہ شام کو چہل قدمی
کے لیے باہر نکلا۔ ایسے وقت دوستوں سے
بچنا چاہتا تھا کیوں کہ دوست دنیا کی وہ واحد
مخلوق ہے جو بہت پیار سے پیٹھ پر ہاتھ
پھیر کر اندھے کنویں میں دھکیل دیتی ہے۔ اور ہم فیصلہ بھی کر
نہیں پائے کہ یہ انجانے میں ہوا یا منصوبہ بند تھا۔ دوستوں
کی نازل کردہ مصیبتیں بھی محض اتفاقاً نہیں آتیں بلکہ فسادات
کی طرح منعقد کرائی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ ہم گھر سے پانچ
روپے لے کر داڑھی بنانے کا ضروری سامان خریدنے نکلے
ہیں اس لیے کہ داڑھی بڑھی ہوئی ہونے کے باعث سی آئی
ڈی کے آدمی کنکھیوں سے دیکھنے لگے ہیں اور ایسی حالت
میں ہم خود خوبصورت لڑکیوں سے
چھپتے پھر رہے ہیں جبکہ
عموماً وہ ہم سے چھپتی پھرتی ہیں۔ داڑھی بنا کر شریفوں کی صف
میں آنا ضروری ہے اور اس کے لیے بلیڈ وغیرہ خریدنا ضروری۔
ہم چھپتے چھپاتے، گلیوں اور خفیہ راستوں سے ہو کر جنہیں
بعض ان پڑھ لوگ خفیہ راستے بھی کہتے ہیں) دکان کے
سامنے پہنچنا چاہتے ہیں کہ پگلے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی
ہے وہ پوچھتے ہیں۔ ارے کیوں ادھر؟

جی ہاں ادھر۔

یار اچھا ہوا تم مل گئے۔ ہم لوگ گھنٹے بھر سے
چائے کے لیے ترس رہے ہیں۔

لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

تو کیا بھیک مانگنے نکلے تھے۔

بھیک تم مانگا کرو۔ ہم تو بلیڈ وغیرہ خریدنے نکلے ہیں۔

آدھار خرید کر کتنی دکانیں بند کرواؤ گے؟

یہ کام بھی تم کو مبارک ہو۔ میری جیب میں نقد پیسے ہیں۔

اچھا کتنے ہوں گے۔

پانچ روپے —

تب تو بہت اچھی بات ہے پانچ روپے میں ہم تمام کی چائے ہو سکتی ہے۔

اور اس سے پہلے کہ ہم دکاندار کی طرف
بڑھتے، ایک دوست

ہمیں بازو سے پکڑ کر ہوٹل کی طرف گھسیٹنے لگتے ہیں۔ اب ہم مسلسل انکار کر رہے ہیں اور دوست ہمیں مذاق کا نشانہ بنا رہے ہیں اس دوران سڑک پر ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ہمیں ایک معزز اور مہذب شخص کی حیثیت سے دیکھا ہے ہم ان لوگوں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتے اس لیے دوستوں سے حجت کر کے مجمع اکٹھا کرنے کی بجائے چپ چاپ ہوٹل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ زمانے کی نظروں میں عزت دار بنے رہنے کے لیے عزت ہی گروی رکھنی پڑتی ہے بے وقعتی۔ اب ہماری پُر وقار زندگی کے لیے ایسے ہی ضروری ہو گئی ہے جیسے پانی کے لیے ہائیڈروجن۔ محلہ میں تمکنت سے پھرنے والا وارڈ ممبر کسی M.L.A کا چمچہ ہے۔ M.L.A چیف منسٹر کا اور چیف منسٹر؟ ...... عزتیں دے کر عزتیں کمانے کا سلسلہ دراز ہے۔

نئے اور پرانے دوستوں میں یہی فرق ہے کہ نئے دوست، خود کی عزت ہم سے بچائے رہتے ہیں اور پرانے دوستوں سے ہم، اپنی عزت بچائے بچائے پھرتے ہیں۔ ہم کسی نئے دوست کے ہاں جائیں اگر موسم گرمی کا ہو تو گفتگو اس طرح ہو گی۔ ہم کہیں گے آپ کا گھر بہت INTERIOR میں ہے۔ آس پاس اونچی عمارتوں کے سبب گرمی بہت ہوتی ہے۔

(دوست) جی ہاں۔ شہر سے دور ہمارا ایک مکان کرائے سے دیا ہوا ہے۔ وہاں ہم لوگ ایک برس رہے ہوا خوب چلتی تھی لیکن سودا سلف کے لیے اس طرف آنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر اُدھر آنے کی فیس زیادہ لیتا تھا اور رشتہ دار ایک دفعہ آجاتے تو جلدی واپس جانے کا نام نہ لیتے تھے۔ اس لیے ہم لوگ یہاں چلے آئے۔ اس محلہ میں گرمیوں میں گرمی ضرور ہوتی ہے لیکن سردیوں میں بالکل سردی نہیں لگتی۔ البتہ برسات میں آس پاس کی بلڈنگوں کا پانی ہمارے ہی آنگن میں گرتا ہے تب چار مہینے خاص چہل پہل رہتی ہے۔

(ہم) خیر گرمی کا علاج تو پنکھے سے ہو جائے گا آپ پنکھا آن کر دیجئے۔

حسنِ اتفاق دیکھئے۔ آج ہی صبح بچے پنکھا ریپیر کے لیے دیا ہے۔ شاید کل واپس آجائے۔

(ہم) جی نہیں۔ میں کل تک یہاں نہیں بیٹھ سکوں گا۔ فی الحال ٹھنڈا پانی پلا دیجئے۔

فریج ہم نے خرید لیا ہے لیکن ابھی پیسے چکاتے ہیں اس لیے دکان پر ہی رکھا ہے۔ سادہ پانی چلے گا؟ ہم نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن پہلے دیکھ لیجئے۔ کہیں اس دوران مٹکہ پھوٹنے سے پانی بہہ نہ گیا ہو۔ رہی ٹھنڈے اور گرم پانی کی بات تو صاحب! جب آدمی کے پیچھے آدم خور شیر لگا ہو تو وہ کسی گہرے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے سے نہیں چوکتا۔ ہمارے ایک دوست نے نجومی کو ہاتھ دکھایا۔ اُس نے بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ پھر پانچ روپے مانگے۔ انھوں نے حجت کر کے ایک روپیہ دیا اور جانے لگے تو اُس نے ان کی ہتھیلی زبردستی اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچی اور کہا دیکھئے آپ کینسر یا ٹی۔ بی سے مریں گے۔ ذرا ہشیار رہیئے۔ وہ فیملی ڈاکٹر کے پاس بار بار جاتے اور کہتے ڈاکٹر صاحب آپ ذرا غور سے دیکھئے کہیں ٹی۔ بی یا کینسر سے نہ مر جاؤں۔ آپ سب کو توجہ سے دیکھتے ہیں بس میرے ساتھ لاپرواہی کرتے ہیں پوچھوں کھانے میں کیا احتیاط کرنا ہے تو کہتے ہیں سب کھاؤ۔ پوچھوں کیا بیماری ہے تو کہتے ہیں کچھ نہیں۔ جانچ کرنے کا وہ آلہ جس کے دو سرے آپ کے کان میں اور ایک سرا میرے پیٹ پر ہوتا ہے اُسے ایک انچ اوپر ہی رہنے دیتے ہیں۔ اور اگر کسی دن پیٹ سے لگا دیتے ہیں تو اگلے دو سرے آپ کے کانوں میں نہیں ہوتے، گلے میں پڑے رہتے ہیں اور اُدھر آپ کہتے ہیں سانس لو۔ اور

زور سے سانس لو۔ اب اوندھے لیٹ جاؤ۔ اب اور سانس لو۔ ہم خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے چاہا تو آج بیماری کا کچھ نہ کچھ سراغ ملے گا لیکن آخر میں آپ شربت روح افزا یا وِکس (VICKS) کی گولیاں لکھ کر دے دیتے ہیں۔ خدا کے لیے توجہ دیجیے میں ٹی۔ بی یا کینسر سے مرنا نہیں چاہتا۔

عاجز آکر ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اپنے پندرہ سالہ ڈاکٹری تجربے کی بناء پر اس بات کی گیارنٹی دے سکتا ہوں کہ اگر آپ زہر پی کر مر جائیں تو ٹی بی یا کینسر سے ہرگز نہیں مر سکیں گے۔

دوست نے خوش ہو کر کہا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ فوراً ایک کپ زہر دے دیجئے۔ لیکن ذرا اُبال کر۔ کہیں اُس میں ٹی بی کے جراثیم نہ ہوں۔

اتنی تقریظ اپنے نئے دوست کے سامنے کرنے کے بعد ہم گرم پانی کا گلاس اُن سے لے کر پی جاتے ہیں۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ہم نے اس نئے دوست سے جو گفتگو کی وہ آپ نے ملاحظہ فرمائی اب یہی گفتگو کسی پُرانے دوست کے سامنے ہوتی تو وہ جھوٹ بول کر اپنی عزت بچانے کی بجائے کس بے شرمی کا مظاہرہ کرتا۔ ایک جھلک وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(ہم) آپ کا گھر بہت INTERIOR میں ہے آس پاس اونچی عمارتوں کے سبب بہت گرمی ہوتی ہے۔

(دوست)۔ اس میں قصور ہمارا نہیں۔ آس پاس کی اُونچی عمارتوں کا ہے۔ ویسے آئندہ آپ دوستی کرنے سے پہلے دیکھ لیا کریں کہ دوست کے مکان کے آس پاس اونچی عمارتیں نہ ہوں۔ یہ مکان ہمارے دادا کے زمانے کا ہے۔ والد کے عہدِ حکومت میں اس کی دیواروں اور فرش میں شگاف پڑے اور اب ہمارے عہدِ سکونت میں اس کی چھت بھی گر سکتی ہے۔ اگلی گرمیوں میں آپ کو یہاں دھوپ میں بیٹھنا پڑ سکتا ہے۔

(ہم) پھر تمہاری طرح چبر ے چالے کرنا ہماری عادت نہیں۔ لڑائی جھگڑے کرنا ہمارے لیے ایک کوفت ہے اور تمہارے لیے ایک بھرپور تفریح۔ تم چاہے ریگستان میں جاکر رہو ہمارے لیے تو پنکھا آن کر دو۔ بہت گرمی ہو رہی ہے۔

(دوست) ہمارے ہاں پنکھا وکھا نہیں ہے۔

(ہم) وہ کیا سامنے رکھا ہے۔

(دوست) وہ ہمارا نہیں پڑوسی کا ہے۔ تم اپنی قمیص اتارو اور خود ہی ہوا کر دو اور قمیص اتارنے میں شرم آتی ہو تو پھر پینٹ اُتار لو۔

(ہم) ہوا کا بھی بندوبست ہم کر لیں گے۔ تم فریج کا ٹھنڈا پانی پلا دو۔

(دوست) ہم دن بھر محنت مزدوری کر کے حلال کماتے ہیں۔ اور حلال کمائی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کپڑے بھی ڈھنگ کے بنانا مشکل ہے۔ پھر فریج کہاں سے لائیں۔ البتہ مٹکا ہے۔ پہلے وہ مٹی کا تھا پھر اس میں جہاں جہاں دراڑیں پڑیں ہم سمنٹ لگاتے گئے اب وہ مکمل سمنٹ کا مٹکا بن چکا ہے اور گرمیوں میں انڈے اُبالنے کے کام آتا ہے۔ کہو تو پانی پلادوں؟

(ہم) کسی پڑوسی کے ہاں سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی نہیں پلا سکتے؟

(دوست) پڑوسیوں سے ہمارے تعلقات خراب ہیں گلیوں میں بچے گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ فٹ بال کھیلتے ہیں۔ آج تک جتنے فٹ بال۔ گلیاں اور گالیاں آنگن میں آئیں ہم نے ایک بھی واپس نہ کی۔ پتنگیں کٹ کر آئیں یا ہمارے آنگن

کے درخت میں اٹکیں وہ ہم نے نکالنے نہ دیں۔ اب تک ان پتنگوں کے ڈھانچے ایسے ہی لٹکے ہوئے ہیں جیسے آدم خوروں کے گھروں میں انسانی کھوپڑیاں سجی ہوتی ہیں۔ محلہ کے نادان بچوں نے ہمارا کوڈ ورڈ، پتنگ خور ہی رکھا ہوا ہے۔ محلے کے سارے آدمی وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے لڑتے اور حسب استطاعت گالم گلوچ کرتے رہتے ہیں ہم نے آج تک کسی کو منہ نہیں لگایا اس لیے لوگ سخت ناراض ہیں کہ یہ آدمی کوئی اور تعلق نہیں رکھ سکتا تو کم از کم جھگڑا بھی نہیں لڑ سکتا۔ مغرور کہیں کا۔

دوست کی باتوں سے تنگ آکر ہم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دروازے تک آتے جاتے کہتے ہیں اچھا میرے بھلائی۔ تمہارے اس غریب خانے پہ ہم تشریف لائے بڑی غلطی ہوئی ہم سے۔

(دوست) گناہ یا غلطی کا احساس ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ ورنہ خدا جن لوگوں کے دلوں پہ مہر لگا دیتا ہے۔ وہ گناہ کو بھی ثواب سمجھتے ہیں اور اولاد کو غلطی سمجھتے ہیں۔

بات ہماری آہنک وادی کی طرح اس سرحد سے اس سرحد پہ نکل گئی۔ ہم دراصل یہ عرض کر رہے ہیں کہ اسٹڈی کے لیے موڈ بنانا اور اس کے لیے چہل قدمی کرنا تھا اس لیے ہم دوستوں سے بچنے کے لیے گمنام گلیوں سے ہوتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی خوبصورت سڑک کی طرف چلے۔ جب بھی ہم کسی گلی میں پہنچتے وہاں کے دو تین کتے ہمارا استقبال کرتے اور دوسری گلی تک چھوڑ دیتے۔ وہاں سے اس گلی کے کتے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اگلی گلی تک پہنچاتے۔ اس طرح گلیوں کا وہ فاصلہ جو ہم یوں پندرہ منٹ میں طے کرتے۔ کتوں کی بدولت صرف پانچ منٹ میں طے ہوا۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی اور ابھی دو تین قدم چلے ہوں گے کہ قہقہوں کی آوازیں آئیں۔ یہ تو پرانے دوستوں کی آوازیں لگتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم چوکنا ہو کر کوئی احتیاطی تدبیر کرتے ہماری صورت پر ایک کار کی روشنی پڑی اور مسرور کی آواز آئی۔

ارے شکیل ذرا ادھر آنا۔

اب ہماری حالت اس شوہر کی سی تھی جو رات ایک بجے جوتے ہاتھ میں لیے چپکے سے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو اور عین اسی وقت جب اس کا ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر ہو، بیوی کمرے کی بتیاں جلا دے۔ شوہر کی یہ حالت کہ نہ واپس بھاگا جائے نہ اندر آنے کی ہمت ہو۔ اب اگر مسرور کی آواز نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں تو وہ لوگ پیچھا کریں گے اور شرارت کا اک نیا شوشہ ہاتھ لگے گا پھر یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے آدھی رات تک پھیل سکتا ہے یعنی اسٹڈی کا ستیاناس۔ ہم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے چہرے کی دیوار پر مسکراہٹ کی سینری سجائیں اور دوستوں کے ڈرائینگ روم کی آگ میں کھڑے رہیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ پھر جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی ہم نے کہا —

السلام علیکم۔

وعلیکم السلام۔ اچھا یہ بتاؤ آتی رات گئے اس کم آباد علاقے میں کیا کر رہے ہو کیا کوئی نیا چکر شروع ہوا ہے؟

چکر وکر کوئی نہیں یار۔ میں پڑھنے کے لیے بیٹھ رہا تھا۔ سوچا تفریح کر لوں تاکہ دماغ تر و تازہ ہو جائے۔

اب چھوڑو بھی یار۔ تم اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ پڑھو گے تب ہی پاس ہو گے۔ ہمیں کو دیکھ لو۔ امتحان تو ہم بھی دے رہے ہیں لیکن تمہاری طرح فکر میں گھلے نہیں جا رہے ہیں۔ اب امتحانات میں فیل ہونے والے وہ نہیں جن کو پڑھنا نہیں آتا بلکہ وہ ہیں جو یا تو غریب ہیں یا غیر ضروری اصولوں کو پالتے ہیں۔ اس زمانے میں جیل میں

سڑنے والے لوگ عموماً بے گناہ اور بے صلاحیت ہوتے ہیں۔ گناہ گار اور صلاحیتوں والے لوگ تو بھاری پہروں سے بھی فرار ہو جاتے ہیں۔ چارلس سو بھراج ، ماڈرن آیڈیل کیا فرار ہوا تھا وہ جیل سے۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی تھی اور اس دن میں نے کھانا نہیں کھایا جب وہ پکڑا گیا۔ ہاؤ ڈلے ہو شنگ۔ ہاؤ اسمارٹ۔ کاش وہ ایک بار پھر فرار ہو جائے۔ ہم نے تمسخر کے انداز اور حقارت بھرے لہجے میں کہا کیا وہ زمانہ آگیا ہے کہ اب ہیرو شپ، شریفوں سے نکل کر بدمعاشوں اور غنڈوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اب ہم کسی مجرم کے فرار ہوتے کو قلم کاسین سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ ہیرو ہے اس لیے خواہش کرتے ہیں کہ وہ کبھی پکڑا نہ جائے۔"

مسرور بولے چھوڑو، بحاثش بازی چھوڑو۔ آرام سے بیٹھو۔ کچھ اور باتیں کریں گے۔ ہم نے کہا نہیں نہیں بھائی۔ اس سے پہلے بھی تمہاری باتوں سے بہت نقصان اٹھا چکا ہوں اب کی دفعہ تو میں اسٹڈی ضرور کروں گا۔ بولے تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ اتنی بے فکری سے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کان ادھر لاؤ۔ راز کی بات بتاؤں۔ ہمارے پاس پرسوں ہونے والے پرچے کی گیس ہے۔ تمہیں چاہیئے تو کل اقبال بھائی کے گھر یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور شمال کی طرف جو ہلا دیہات ہے وہاں آجانا۔ پولیس اسٹیشن کے بغل میں ان کا گھر ہے۔ کسی پولس والے سے پوچھ لینا ہم لوگ وہیں اسٹڈی کرتے ملیں گے۔

پرچے کی گیس والی خوش خبری اپنے دوستوں سے سنی تو ہم نے اسٹڈی کا ارادہ ترک کر دیا۔ دوستوں کی محفلوں میں بارہ بجے رات تک بیٹھے رہے پھر گھر آکر سو گئے کہ کل دیہات جانا ہے۔ صبح صبح اُٹھے۔ ایک کاپی اور قلم سنبھالا۔ موٹر سائیکل میں تیس کلومیٹر کے پُرتا پٹرول بھروایا اور شمال کی طرف نکل گئے۔ صبح صبح کا وقت تھا ہوا زوروں سے چل رہی تھی آبادی پیچھے چھوڑ کر جب ہم کھیتوں کی معیت میں پہنچے خوشبوؤں کے جھونکے اور تیز ہوا ہم سے باتیں کرنے لگی۔ پھر ہماری موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستہ میں جب کبھی دیہاتوں کی نوعمر لڑکیاں ہمیں دیکھ کر چلتے چلتے رک جاتیں تب یہ دنیا بہت حسین معلوم ہوتی۔ ایسا لگتا جیسے ہمیں ہر پرچے میں سوفی صد نمبر مل گئے ہوں۔ اس طرف ہم زندگی میں پہلی دفعہ آئے تھے اور دل میں دوستوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ یہ حسین علاقہ ان کی وجہ سے دیکھنے کو ملا۔ جگہ جگہ آموں اور سنتروں کے باغات کی خوشبو ہمارا سواگت کرتی۔ سڑک کے دونوں طرف آراستہ نیم کے درختوں سے گرے ہوئے پیلے پیلے پتے ہمارے پیچھے دوڑتے ہوئے تھوڑی دور تک آتے۔ پھر تھک کر کہیں گر جاتے۔ تب دوسرے پتے پیچھا کرتے۔ ہم ان کو پیچھے مڑکر دیکھتے تو ایسا لگتا جیسے یہ پتے تالیاں بجا بجا کر خوشیاں منا رہے ہوں۔ شاید ان کا یہی معمول ہے کہ جب بھی کوئی سواری قریب آئے تالیاں بجا بجا کر تھوڑی دور اس کا پیچھا کرنا پھر ہنستے ہوئے ادھر اُدھر لوٹ پوٹ ہو جانا۔ ہوا کے دوش پر ایک دوسرے پر گرنا۔ اٹھکیلیاں کرنا۔ اور اگلی کسی گاڑی کے آتے ہی فوراً اس کا پیچھا کرنا ہم اس کھیل سے محظوظ ہو رہے تھے کہ ہمارا ہاتھ خود بخود بریک پر لگا۔ موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ پتہ چلا کہ سامنے ایک نوعمر لڑکی ہاتھوں میں کتابیں لیے کھڑی ہے۔ ہلکے جامنی رنگ کے صاف ستھرے کپڑے۔ بھرا بھرا سا گورا چٹا جسم۔ چھوٹا قد لیکن لمبے لمبے بال جو ہوا سے اُڑ کر اس کے چہرے پر آتے جب وہ انھیں ہٹاتی تو فضا میں چوڑیوں کا ترنم بکھر جاتا۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائی اور ہمارے دل کی دھڑکن جو موٹر سائیکل کی اسپیڈ کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور بھی بڑھ گئی۔ ہم نے پوچھا۔
یہاں پندرہ کلومیٹر پر کوئی دیہات تھا نا؟

ہاں تھا۔ لیکن اس وقت گھومنے کے لیے سات کلومیٹر دور نکل گیا ہے۔ قدرے توقف کے بعد مسکرا کر بولی
جناب! پہلے دیہات کا جانا تھا، اسی سڑک پر بائیس کلومیٹر پر پڑتا ہے۔ پھر دو کلومیٹر کچے راستے پر اندر جانا پڑتا ہے۔
ویسے آپ ادھر کیا کر رہی ہیں اور اکیلی؟
وہ سامنے ہمارا فارم ہے۔ میں یہاں روز اسٹڈی کرنے آتی ہوں اور شام کو واپس ہوتی ہوں۔ میرے ساتھ میرے بھیا بھی ہیں۔ وہ بندوق لینے گئے ہیں۔
بندوق کا نام سنتے ہی گاڑی خود بخود اسٹارٹ ہو گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بندوق سے میرا مطلب تھا، پرندے مارنے کے لیے۔
ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ اس وقت ہم جلدی میں ہیں۔ انشاء اللہ شام میں ملاقات ہوگی۔ اور آگے بڑھ گئے، سات کلومیٹر کے بعد واقعی ایک کچا راستہ نظر آیا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی جی خوش ہوا ہے راہ کو مڑ ہوا دیکھ کر۔ چھوٹے بڑے پتھروں کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ۔ اور پتھر بھی ڈھول اور چھوٹے میں اس طرح ڈوبے ہوئے جیسے آنگن کے شوربے میں آلو۔ تھوڑی دیر دم بخود رہنے کے بعد اپنی موٹر سائیکل کو اس راہ پتھرات میں ایسے ڈال دیا جیسے لوگوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے ڈال دیئے تھے۔ اب یہاں سے وہ نیا تجربہ شروع ہوا جس سے ابھی تک واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ہم نے ٹی وی پر دیکھا تھا کہ موٹر سائیکل ریس میں جان بوجھ کر اوبڑ کھابڑ راستے بنائے جاتے ہیں اور سواران سب سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ راستے تو پھر بھی تھوڑی دور تک سیدھے اور سپاٹ ہوتے تھے۔ یہاں تو ہر بھی قدم پڑتا تھا کانٹا گڑتا تھا۔ کبھی کبھی ہم اچھل کر سیٹ سے اتنے اونچے ہو جاتے کہ جب واپس گرتے تو پچھلی سیٹ پر پڑتے۔ ہینڈل آنی دور ہو جاتا کہ لگتا سو کر گاڑی چلا رہے ہیں۔ پھر اگلا پتھر اچھال کر دوبارہ سیٹ پر بٹھا دیتا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے ہینڈل کو مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ جیسے ڈو نمبر کے بیوپاری منسٹروں کو تھامے رہتے ہیں، ورنہ پتہ نہیں ہمارا کیا ہو جاتا۔ ڈھول نے سر سے پاؤں تک بھوت بنا ڈالا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور کپڑے تو دور کی بات ہے پلکیں اور بھنویں تک بھوری ہو رہی تھیں۔ ہم نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس خوبصورت لڑکی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا جو پندرہ کلومیٹر پر ملی تھی جس سے ہم نے شام میں ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ اب اس حلیہ میں ہم خود اس سے ملنا نہ چاہیں گے۔ خدا خدا کر کے دو کلومیٹر کا راستہ طے ہوا۔ ابھی ہم خرکی اور موٹر سائیکل کی ڈھول جھٹک ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ہم خوش ہو گئے کہ جن کو ڈھونڈ کر گھر کا پتہ پوچھنا تھا وہ خود ہی مل گئے۔ عرض کیا میں آپ کی طرف آنے والا تھا۔
بولے — ہم بھی آپ ہی کو ڈھونڈ رہے تھے۔
کیا سب لوگ آ چکے ہیں؟
جی ہاں۔ بس آپ کا انتظار تھا۔
مسرور ہیں۔
ہاں سب مسرور ہیں۔ ہم بھی مسرور ہیں اور اب حوالات میں چل کر آپ بھی مسرور ہوں گے۔
ح۔ حوالات میں ک۔ کیوں؟
وہاں چلیے تو پتہ چلے۔

حوالات پہنچ کر اس نے پولیس انسپکٹر سے تعارف کراتے ہوئے کہا "مل گیا صاب"!
"ہاں اندر لے چلو"! ہم نے پوچھا کہ آپ یہ بتائیے میں نے کیا کیا ہے؟ بولا امتحان کے پرچے چُراتے ہو۔ بیچتے ہو۔ اور پوچھتے ہو کیا کیا ہے؟
میں نے تو کوئی پرچے نہیں چُرائے۔
کوئی مجرم یہ نہیں کہتا کہ میں نے جرم کیا ہے اگر ایسا ہونے لگے تو وکیلوں اور عدالتوں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ہمیں فون پر اطلاع ملی ہے کہ بیس بائیس برس کا ایک لڑکا پرچوں کی نقل لے کر آ رہا ہے اور یہاں بچوں کو بیچنے کی کوشش کرے گا۔ چلو نکالو۔ کہاں چھپائے ہیں؟
مجھے میرے دوستوں نے خود یہ کہہ کر بلایا ہے کہ یہاں پرچے ملیں گے۔ مجھے کیا معلوم پرچے کہاں ہیں۔
"ویسے آپ کو ٹیلیفون کس نے کیا؟
مسرور نام کے کسی لڑکے نے ـــ!
مسرور کا نام سن کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم نے انسپکٹر کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ اور ہمیں اندر بھجوا دیا۔ وہاں ایک آدمی رسّی سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ بُری طرح چلّا رہا تھا سپاہی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سائیکل چور ہے۔ ہم نے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا کہ پرچے چور کے ساتھ کیا ایسا ہی سلوک ہوتا ہے؟ بولا نہیں۔ اس سے بھی بُرا ہوتا ہے۔ اب تو ہم گھبرا گئے اور ایسا لگا جیسے ہر پرچے میں ہمیں صفر ملا ہے۔ امتحان میں بُری طرح ناکام ہو گئے ہیں بلکہ دو سال کے لیے RESTICATE کر دیئے گئے ہیں۔ پسینہ سوکھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جیب سے رومال نکالا تو ایڈمیشن کارڈ نکل آیا۔ فوراً انسپکٹر کے پاس گئے اُس سے درخواست کی کہ آئندہ دوستوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ دشمنوں کی ہر بات مانیں گے لیکن دوستوں کو گھاس نہ ڈالیں گے۔ اب کی دفعہ چھوڑ دیجئے۔ ویسے تو ہم نے پرچے چُرائے ہی نہیں لیکن خیر آپ کہتے ہیں تو آئندہ نہیں چُرائیں گے۔ بلکہ چُرانا تو در کنار پرچے دینے تک نہیں جائیں گے۔ ساری زندگی جاہل رہیں گے۔ کھیتوں میں بھینسیں چرائیں گے لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں گے۔ وغیرہ اُس نے ترس کھا کر واپس جانے کی اجازت دے دی لیکن موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے پر پتہ چلا کہ سارا پٹرول ان بائیس کلومیٹر میں ختم ہو گیا۔ اور تھوڑا بہت جو بچا وہ پتھریلی زمین پر گاڑی اُچھلنے سے باہر گر گیا۔ اب ہم پولیس کی طرف سے آزاد تھے لیکن موٹر سائیکل کی وجہ سے قید تھے۔ تھانے میں داخل ہو کر درخواست کی کہ پولیس کی جیپ میں شہر بھجوا دیجئے۔ وہ بولے پولیس کا محکمہ، اور محکمے کی ہر چیز چوروں اور لفنگوں کی سہولت کے لیے ہے۔ پولس کی جیپ میں کوئی چور اچکا ہی شہر جا سکتا ہے شریفوں اور بے گناہوں پر ہمارا محکمہ ترس نہیں کھاتا۔ البتہ کل صبح اس سائیکل چور کو عدالت لے جائیں گے تب تم جیپ کے ایک کونے میں بیٹھے رہنا اور کوئی بڑا افسر پوچھ لے تو کہنا کہ میں جیب کترا ہوں۔ رات بھر حوالات میں آرام کر سکتے ہو۔ آخرکار ہم نے ایسا ہی کیا۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ زنداں

اس وقت ہم زندگی میں پہلی دفعہ پولیس جیپ میں سوار شہر کی طرف جا رہے ہیں۔ موٹر سائیکل پیچھے ایک بیل گاڑی پر آ رہی ہے ممکن ہے گھر پہنچتے پہنچتے اسے پہچاننا مشکل ہو جائے جیسے CUSTODY کے بعد مجرم کی صورت۔

جیپ تیزی سے شہر کی طرف اُڑی جا رہی ہے۔ وہ سائیکل چور' بار بار ہماری ہوائیاں اُڑاتی صورت کو دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ "بزدل۔ پولیس اور حوالات سے ڈر گیا! زندگی کیسے گزارے گا؟" سڑے ہوئے سنترول اور پلپلے آموں کی خوشبو ناک کو خراب کر رہی ہے۔ سڑک پر پڑے ہوئے نیم کے پتے جیپ کا پیچھا کر رہے ہیں اور ہمارے حالِ زار پر ہنس ہنس کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ کم ظرف کہیں کے۔ کسی کی زندگی برباد ہو رہی ہے اور ان کو گلا بیاں کھانے کی سوجھی ہے لیکن میں اس کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ گرمی کے موسم میں تمہارے جو رشتہ دار لاکھوں کی تعداد میں باغیچوں، اسکول کے میدانوں اور سڑکوں پر بسیرا کرتے ہیں ان کو پکڑ پکڑ کر ڈھیر لگایا کروں گا پھر اُس میں آگ لگا دیا کروں گا۔ وہ زمانے لد گئے جب لوگوں میں انسانیت اور شرافت تھی۔ وہ مظلوموں پر ترس کھانے اور ان کے لیے اپنی جانیں دے دیا کرتے تھے۔ اب تو ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے کہ جو جہاں' جس کو دبا سکتا ہے دبا لیتا ہے۔ امریکہ میں لیبیا والوں کی زندگی خطرے میں ہے اور امریکہ نوازوں کی لاشیں لیبیا میں نظر آ رہی ہیں۔ ہم کنکھیوں سے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہیں وہ شاید آئینہ میں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ جیپ اب امتحان ہال کی سڑک پر مڑ گئی ہے اور ہماری آنکھوں میں دوستوں کے ہنستے ہوئے چہرے گھوم رہے ہیں جو ہمیں پولیس کے ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن میاں مسرور، آپ تم بھی اپنی خیر مناؤ کیونکہ پولس کو جھوٹا ٹیلیفون کرنے کی دفعہ ہم نے تم پر لگوادی ہے۔ پرچہ ختم ہونے کے بعد جب پولیس والے اس جیپ میں تم کو لے جائیں گے تب دیکھوں گا۔ تم اپنے کھیبڑے دانتوں سے کیسے ہنستے ہو اور ہنستے ہوئے کیسے لگتے ہو!

▭▭

ممتاز ادیب و شاعر
محمد منظور احمد
کے ۱۳ مضامین
اور ۴۰ انشائیوں کا مجموعہ
مضامین
محمد منظور احمد
صفحات : ۱۷۰　قیمت : ۲۰ روپے
شگوفہ کے توسط سے حاصل کیا جا سکتا ہے

طنز و مزاح کے ایوان میں
گونجتی ہوئی نئی آواز —
ماشاءاللہ
حلیمہ فردوس کی پہلی کتاب
قیمت : پندرہ روپے
پبلیشر :
پیش رفت پبلیشرز، مسلم چوک، گلبرگہ

وے کے خط.....[مراسلے]

ڈاکٹر شگوفہ!

مجھے معلوم نہیں تھا کہ خدا (جسے میں ابھی تک نہیں مانتا) نے انسانی جسم میں بہت سی ہڈیاں بنا رکھی ہیں جن میں کوئی بھی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ رائٹرز تک مستثنیٰ نہیں۔
چنانچہ دائیں ٹانگ کی ایک ٹوٹی ہڈی کے ساتھ پلستر کی قید میں پڑا ہوں۔ ڈیڑھ دو ماہ سے ٹانگ کے ساتھ ذہن بھی ٹوٹ چکا ہے۔
تمہارے دونوں خطوں کا کیا یہ مثبت جواب نہیں؟

فکر تونسوی!

"شگوفہ" سے جناب برق آشیانوی کی وفات کی خبر ملی۔ دکھ ہوا۔ آپ کی بے مثال عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے موقع پر اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اُن جی دار لوگوں میں سے تھے کہ جن کی زندگی کا شعلہ آخری سانس تک جیتا جاگتا رہتا ہے۔ آپ نے اُن کی یاد میں "شگوفہ" کا ایک شمارہ مخصوص کر کے ادب دوستی میں وفاداری کا حق ادا کیا ہے۔
ہاں آپ یہ خبر دلچسپی سے سُنیں گے کہ اسلام آباد میں بھی ۱۷ اکتوبر کو ایک کل پاکستان طنز و مزاح کا جشن برپا ہوا۔ مقالات و مشاعرے کی الگ الگ نشستیں رہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی کانفرنس کا تذکرہ بھی آیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کا تذکرہ اگلے دن کراچی میں "ایوانِ ادب" کے پروفیسر خواجہ حمیدالدین شاہد مُدیر "سب رس" کے یہاں بھی ہوتا رہا۔ پچھلے دنوں محترمہ جیلانی بانو اور اُن کے شوہر بھی یہاں تشریف لائے۔ وہ صدرِ مملکت کی ہدایت پر پاکستان کے سرکاری مہمان تھے۔ ہماری ادبیات کی اکاڈمی اُن کی میزبان تھی۔ والسلام آپکا

ضمیر جعفری (اسلام آباد، پاکستان)

سلام مسنون۔
آپ نے تو واقعی کمال کر دکھایا۔ شگفتہ شگفتہ سہانی سہانی تحریروں کا مرقع نکالنا اور وہ بھی بڑی باقاعدگی سے بڑے دل گردہ بلکہ پتے اور بڑے جگرے کا کام ہے غیر لکھے مضامین و کتابت شدہ مسودات اس قدر کثیر و شدید

ہوتے ہیں کہ تھوڑی ہمت والا آدمی (یا عورت) بڑی جلدی "ھف" جاتا ہے۔ دسمبر کا شمارہ مجھے ملا تو دل و نگاہ کو تراوت بہم ہوئی کہ سبھی تحریریں مقویِ قلب و مفرحِ دماغ تھیں۔ جناب عطاء الحق قاسمی صاحب عرصہ سے عمدہ کالم نگاری کر رہے ہیں میرے خیال میں اُن کی تحریریں "انشائیہ" سے بھی کوئی چار ہاتھ آگے ہیں۔ پنجابی الفاظ کی پچی کاری بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وفیق صلاح کا مضمون "بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے" پڑھا۔ میں اسے بلا خوفِ تردید انشائیہ کہہ سکتا ہوں۔ شگوفہ کے شروع میں فہرست دیکھی تو آپ نے بھی انشائیہ ہی جانا اس طرح اپنی بات وزن بھی رکھتی ہے اور جگہ بھی گھیرتی ہے۔ "دنیا کے غفور زد ایک ہو جاؤ" شگفتہ سفرنامہ ہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب کو ہماری مبارکباد پہنچائیں۔ ناشاد صاحب کے اشعار جو غالب و اقبال کی مشہور غزلوں کی درگت بناتے ہوئے لکھے گئے پڑھ کر بہت جی خوش ہوا کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں جو زندہ دل ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار (گوجرانوالہ، پاکستان)

اِداریہ

ملک کے تقریباً تمام نامور مزاح نگاروں کی شعری و نثری تخلیقات سے آراستہ محفل سالنامہ کی صورت میں سجی ہے۔ بعض بعض تخلیقات عدم گنجائش کی وجہ سے شامل نہ کی جاسکیں جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ قلمی معاونین اور اس شمارہ کے حُسن کار طالب خوندمیری کے بھی ممنون ہیں جن کے تعاون کے بغیر یہ شمارہ وقت پر شائع نہ ہو پاتا۔
گزشتہ مہینے شگوفہ سے ماضی میں وابستہ ممتاز خوشنویس مولوی ولی الدین صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم نہ صرف بہترین کاتب تھے بلکہ زود نویس بھی تھے۔ وقت کے نہایت پابند۔ خلیق و ملنسار ــ اِن کا انتقال ادارے کا اور ذاتی طور پر میرا شدید نقصان ہے۔ جس کی تلافی ممکن نہیں۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۲۰
شمارہ : ۲
فبروری ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

سرورق :
طالب خوندمیری

منیجر : سمیع جلیل

منیجر اعزازی : (بمبئی)
فیاض احمد فیضی

فی پرچہ : ۲ روپیے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ : ۲۵ روپیے
عرب ممالک سے [illegible] پچاس روپیے

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۲۴۔ بیچلرز کوارٹرز
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

کتابت : [illegible] محمد عبدالرؤف

فون آفس : 557716 ، مکان 521064

طباعت : [illegible] پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-

۱۔ موہن میکن بریوریز ۲۔ اجنتہ ڈیری آگرہ ۳۔ انڈین الیسٹ کمپنی لمیٹڈ ۴۔ ہارکو بسری نگر
۵۔ لیکو کیننگ انڈسٹریز بیجور ۶۔ میٹڈ ناکیننگ کمپنی ۷۔ جمپین وہائٹ روٹس ۸۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس
۹۔ ڈرگ ہندستان فوڈ پراڈکٹس ۱۰۔ SIL سل (جمیس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان :-

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض۔ حیدرآباد

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

چنندہ آسام دنیلگری کے باغات سے راست منگائی ہوئی چائے

اسٹرانگ و خوش ذائقہ ۔
آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد

یاقوت محل ٹاکیز، یاقوت پورہ
حیدرآباد

فون ۵۲۵۴۴۳

پانی، پانی، پانی!

آج ہمارے شہر میں پانی کی یہ حالت ہے کہ

صرف دو بوند پڑوسی سے جو مانگا پانی
اس کی آنکھوں میں اچانک امڈ آیا پانی

(طالب خوندمیری)

لیکن آپ پڑوسی سے پانی مانگ کر اسے اور اپنے آپ کو کیوں شرمندہ کریں؟
قدرت نے زمین میں بھی آپ کے لئے وافر مقدار میں پانی چھپا رکھا ہے۔
جسے باہر نکالنے اور آپ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہم آپ کو
آپ ہی کے صحن سے پانی بہم پہنچا سکتے ہیں۔

ہماری فنی اور ماہرانہ خدمات سے استفادہ کے لئے ربط پیدا کیجئے!

موبائل ڈرلنگ کمپنی

MOBILE DRILLING COMPANY

حسینی علم، موسیٰ باؤلی۔

پتہ: جلو پیر سوپ فیکٹری مکان نمبر 20-3-637/5

پروپرائٹر: ـــ محمد عباس
ایگزیکیٹو: ـــ سید عبدالعلی

Ph. 521517

یوسف ناظم

کنور مہندر سنگھ بیدی ایک فاصلے سے

حیدرآباد میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ کانفرنسوں اور مشاعروں کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۲ء سے شروع ہوا دوسری سالانہ کانفرنس کی صدارت راجندر سنگھ بیدی کے ذمے تھی اور مشاعرے کے سربراہ تھے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ بس اسی کانفرنس کے موقع پر میری پہلی تفصیلی ملاقات کنور صاحب سے ہوئی ورنہ اس سے پہلے بھی شر سنگار کے مشاعروں کے سلسلے میں بمبئی میں ان سے نیاز حاصل ہو چکا تھا لیکن مشاعرے کی ملاقات کو ملاقات کہنا ایسا ہی ہے جیسے شاٹ کو تصویر کہنا۔ مشاعروں میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے ضرور ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بکثرت مسکراتے ہیں۔ اپنے کھانے کے دانت دکھاتے ہیں، ہیلو اور ہائے بھی کہتے ہیں۔ شانہ بشانہ چلتے اور زانو بہ زانو بیٹھتے بھی رہیں لیکن ملاقات نہیں کرتے ۔۔۔ کنور مہندر سنگھ بیدی، جلسوں اور مشاعروں کے لازمی مضمون ہیں۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں کوئی مشاعرہ ہو تو دیکھئے اس کی روئیداد میں کنور صاحب کا نام ضرور ہوگا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس نکتے پر میں نے پہلے مزاحیہ انداز میں اور بعد میں سنجیدگی سے غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا (آدمی کسی مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ خود کبھی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے) کہ مشاعرہ کس طرح "رو بعمل" لایا جاتا ہے اور کس طرح نیچے سے اوپر اور اوپر سے مزید اوپر پہنچایا جاتا ہے یہ گر دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں گے لیکن اس معاملے میں کنور صاحب "گرو" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے داؤ پیچ میں وہ داؤ شامل ہے جسے ڈیتھ لاک کہا جاتا ہے لیکن ان کا "ڈیتھ لاک" مشاعرے اور سامعین کے لیے جان لیوا نہیں جاں فزا ہوتا ہے ۔۔۔ مزا تو جب ہے کہ گر تول کو تمام لسانی گر، کنور صاحب جانتے ہیں اور ۱۹۶۲ء میں پُر بہار تھے۔ آواز میں کھنک تھی۔ خوش لباس تو ماشاء اللہ وہ اب بھی ہیں لیکن آج سے ۲۰ سال پہلے کی بات ہی اور تھی۔ میں تو سمجھتا ہوں شملہ باندھنے کے معاملے میں کنور صاحب حرفِ آخر ہیں اتنا سیجے مقطع شملہ۔ کیا مجال اس میں کوئی سکتہ آ جائے۔ مہندر سنگھ بیدی کو بیسیوں شعر یاد ہیں اور بیسیوں لطیفے از بر ہیں۔ لطیفے وہ گڑھتے بھی ہیں۔ بر محل۔ سامعین ان سے بے حد خوش رہتے ہیں خواہ مشاعرہ نہ ہو۔ وہ

کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوں۔ کچھ سامعین تو انتظار میں رہتے ہیں کہ شاعر اپنا کلام ختم کرے تو کنور صاحب کا کمال دیکھیں
ـــ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کنور صاحب صرف مشاعرہ سنبھالتے ہیں۔ عنانِ مشاعرہ ضرور ان کے ہاتھ میں رہتی
ہے لیکن وہ خود بھی شعر کہتے ہیں اور مشاعرے میں جب اپنا کلام سناتے ہیں بافراط داد حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے
اپنے حافظے کی حفاظت میں ایسا معلوم ہوتا ہے سیروں بادام اور پستے خرچ کئے ہیں۔ طویل سے طویل نظم انھیں زبانی
نہیں منہ زبانی یاد رہتی ہے۔ اب اس وقت کا حال تو مجھے نہیں معلوم لیکن حیدرآباد کے جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں
اس وقت شہ نشین ہی پر ان کے لیے مشروب کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ عین مشاعرے میں جب سوز و گداز آگیا
تو ایک کشتی میں دو چائے کی پیالیاں اور ایک کیتلی ان کی خدمت میں پیش کی گئی لیکن اس کیتلی میں چائے نہیں تھی۔
کنور مہندر سنگھ بیدی نے جب ایک پیالی میں یہ مشروب منتقل کر کے راجندر سنگھ بیدی کو پیش کیا تو بیدی صاحب نے
کہا میں رات میں چائے نہیں پیتا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی بولے میں آپ کو چائے کب پلا رہا ہوں۔ تب تک مہک راجندر سنگھ
بیدی کے نتھنوں میں اور بھنک شہ نشین پر بیٹھے ہوئے شاعروں کے کانوں میں پہنچ چکی تھی بلکہ سامعین کی طرف سے
بھی استفسار کیا گیا تھا کہ کیتلی سے آپ کیا پی رہے ہیں اور غالباً کنور صاحب نے جواباً عرض کیا تھا کہ تجھ کو کیا پڑی
اپنی نبیڑ تو۔ اب یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا تو ایک شعر وارد ہو گیا۔

ظرف جو ہاتھ میں آیا وہی پیمانہ بنا ؎ جس جگہ بیٹھ گئے ہم وہیں میخانہ بنا

اگر مشاعرے میں مذکورہ بالا انتظام نہ کیا گیا ہو تو کنور صاحب حسب دستور، باقی کا نصف بہتر مشاعرہ کسی اور کے سپرد
کر کے "حسب دستور" چلے گئے ہوتے۔ رات میں ساڑھے تین گھنٹے تک وہ خشک حالت میں کبھی نہیں بیٹھ سکتے اور
خاص طور پر اس وقت جب ان کے کاندھوں پر گرتے شاعروں اور گرتے مصرعوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ہو۔

ایک مرتبہ ناندیڑ میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ ناندیڑ کی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ حیدرآباد
سے شاذ تمکنت (مرحوم) بھی آئے ہوئے تھے۔ بمبئی سے میں، عزیز قیسی، حسن کمال اور مینا قاضی مشاعرے
سے پہلے کنور صاحب نے سب شاعروں کو ناندیڑ کے گوردوارے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے طلب کیا تھا۔ کوئی
دس بارہ شاعر موجود تھے ہم سب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سب کے سروں پر صافے باندھے گئے۔ کچھ تحفے بھی عطا
ہوئے۔ بڑا روح پرور سماں تھا۔ ناندیڑ کا گوردوارہ ہندوستان کا سب سے بڑا گوردوارہ ہے۔ میں تو چونکہ مرٹھواڑہ
ہی کا رہنے والا ہوں اس لیے اس سے پہلے بھی کئی بار یہاں آچکا تھا لیکن جن لوگوں کو پہلی مرتبہ (اور وہ بھی اس
شان سے) یہاں آنے کا موقع ملا ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس ملاقات میں کنور مہندر سنگھ کا الگ ہی روپ سامنے
آیا جو غالباً ان کا اصلی روپ ہے۔ وہ بھگتی کے آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے رکے ہوئے کاموں کو پایۂ
تکمیل تک پہنچانے میں کبھی ہچکچاہٹ یا تامل سے کام نہیں لیا۔ کسی ایک یا دو سے نہیں میں نے کتنوں سے یہ بات
سنی ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سفارش کے معاملہ میں کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ جوش جب تک ہندوستان میں رہے
یہی کرتے رہے۔ ان کا مشغلہ بس اتنا ہی تھا کہ جہاں جہاں تک بھی ان کی رسائی تھی وہاں وہ پہنچ جاتے اور کسی
نہ کسی کا کام کروا کے لوٹتے اور لوگ جانتے ہیں کہ ان کی رسائی کہاں کہاں نہیں تھی۔ لیکن ان کے ساتھ گڑبڑ یہ تھی
کہ انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کس معاملہ میں وہ کس کی سفارش پہلے کر چکے ہیں اور وہ ایک ہی مخلوعہ جائداد کے لیے دو
دو آدمیوں کی سفارش فرما دیا کرتے تھے۔ شکر ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا حافظہ، جوش ملیح آبادی کے

حافظے سے بہتر ہے۔ (یہ میرا خیال ہے خدا کرے حسب معمول ناقص نہ ہو)

زندہ دلانِ حیدرآباد سے انھیں بڑا شغف ہے جو ایک لحاظ سے معاشقے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ وہ مصطفیٰ کمال ہوں یا مجتبیٰ حسین، مصطفیٰ علی بیگ ہوں یا لوگس۔ ان کا عشق نیاگرا آبشار کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ جس طریقے سے وہ ان لوگوں سے گلے ملتے ہیں اگر اس کی تصویر کھینچی جائے تو ہمارا سنسر بورڈ یقیناً اس تصویر کی نمائش کو ممنوع قرار دے گا۔ حیدرآباد میں پچھلے سال یعنی ۸۵-۱۹۸۴ء میں عالمی مزاح کانفرنس ہوئی۔ کنور مہندر سنگھ کچھ کچھ علیل تھے یا مضمحل تھے لیکن بہرحال حیدرآباد آئے۔ اس سال جو مشاعرہ ہوا وہ اردو اور ہندی کا مشترکہ مشاعرہ تھا۔ آندھرا پردیش کے گورنر شنکر دیال شرما نے صدارت کی اور اردو حصے کی نظامت کنور صاحب نے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جس کے دو ناظم تھے۔ ایک ہندی کے لیے اور ایک اردو کے لیے۔ مجھے تو یہ مشاعرہ اچھا خاصا ٹورنامنٹ معلوم ہوا۔ جب کبھی کنور مہندر سنگھ بیدی کی ٹیم جیتے ہیں یا دفاع میں کردو پڑتی، کنور صاحب کے جملے ان کی ہمت بندھاتے۔ لیکن سچ پوچھئے تو خود کنور صاحب کی وہ زندہ دلی تو برقرار ہے لیکن وہ "چہل" اب باقی نہیں ہے جو انھیں "ذاتِ بزرگ" بناتی تھی۔ اب وہ صرف بزرگ ہیں۔ مدنا الہٰی بیدی صاحب کو میں نے سرسنگار کے مشاعروں کی نظامت کرتے اس عالم میں دیکھا ہے کہ جب بھی وہ کسی شاعرہ کا تعارف کرنے کھڑے ہوتے تو ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھتے اور ان کی "ممدوحہ" لٹ کر رہ جاتیں۔

ایک شاعر یا ایک عدد مشاعرہ کو زمین سے خلا میں اور خلاء سے آسمان تک پہنچانا کنور صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی ہمہ جہتی دلچسپیوں اور کثیرالاضلاع مصروفیات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب آج سے کئی سال پہلے میں نے اخباروں میں ان کا نام پہلوانی کے مقابلے کے "ممتحن" کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ پہلوانی کے مقابلے کے ممتحن بننے کا شوق انھیں کیوں ہوا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ گھر میں تو انھوں نے اس کی اطلاع دی نہیں ہوگی اور دوست احباب انھیں روک نہیں سکے ہوں گے۔ یہ مقابلہ "ہند کیسری" کا مقابلہ تھا [illegible] میں منعقد ہوا تھا۔ دو پہلوانوں کے بیچ عین میدان کارزار میں کھڑے ہونا اور پھر "فتح و شکست" کا فیصلہ کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ہند کیسری کا خطاب اصل میں ممتحن ہی کو ملنا چاہیئے تھا جان تو اس کی عذاب میں رہتی ہے۔ یہ کام کنور صاحب نے شاید پہلی اور آخری مرتبہ انجام دیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا نام دوبارہ پڑھنے کو نہیں ملا۔

زندگی کے پچھتر سال اس بات کے لیے بہت کافی ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے گرد مخالفین اور دشمنوں کی ایک فوج کھڑی کر لے لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی زندگی گزارنے کا فن جانتے ہیں۔ خوامخواہ کی دشمنی کی بات اور ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کنور صاحب کی گرہ میں ہر قسم کا مال موجود رہتا ہے۔ وہ مخدوم محی الدین کی شہرہ آفاق نظم "چاند تاروں کا بن" کے وہ چارہ گر نہیں ہیں جن سے پوچھنا پڑے کہ تیری زنبیل میں فلاں نسخہ موجود ہے یا نہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کے نسخے بکھرے پڑے ہیں۔

ادھر کئی سالوں سے انھوں نے بمبئی آنا ترک کر دیا۔ اصل میں بمبئی شہر اب کلچرل سے زیادہ پولی ٹیکل شہر ہو گیا ہے۔ مشاعرے یہاں کم ہونے لگے ہیں اور شاید کنور صاحب نے بھی اپنے سے بھارت درشن کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ بہرحال میرا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا وہ اتفاق سے پچھلے تین سالوں میں مجھے ہی دلی جانے کا برابر

موقع مل گیا اور ہر بار کنور صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ سرسری ہی سہی لیکن کبھی کبھی شبنم بھی پیاس بجھانے کے لیے کافی ہوتی ہے (آدمی کو قناعت پسند ہونا چاہیئے) اب بھی وہ راست قد ہیں۔ ان کے ان کے اخلاق حمیدہ نے انھیں کرمیدہ ہونے نہیں دیا۔ وہ سب سے جھک کر ملتے ہیں لیکن اتنے نہیں جھکتے کہ جھک ہی جائیں۔ انھیں ہشاش بشاش دیکھ کر کون ہوگا جو اپنے اندر بجلی کا کرنٹ دوڑتا محسوس نہ کرلے۔ یہ کرنٹ اے سی، ڈی سی نہیں ہوتا۔ جے سی ہوتا ہے۔ یعنی جولائے کرنٹ۔

میں نے انہیں قریب سے نہیں دیکھا لیکن عجیب بات ہے کہ کبھی بھی محسوس نہیں ہوا۔ وہ کیوں اس قدر "اپنے" معلوم ہوتے ہیں میں نے اس پر غور بھی نہیں کیا۔ یہ میں نے البتہ دیکھا ہے کہ لوگ ان کے پاس کھینچے چلے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جو کچا دھاگہ ہے وہ اصل میں اس خام مال سے بنا ہوا ہے جس سے بنگلور سلک کی ساڑیاں بنتی ہیں۔

ایک مرتبہ یہ خبر بھی اڑی تھی کہ کنور مہندر سنگھ بیدی، بمبئی میں ایک فلم بنا رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ خبر، خبر تھی یا افواہ۔ بڑے شہروں میں چونکہ گنجائش زیادہ ہوتی ہے اس لیے افواہوں کے پھلنے پھولنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ انھوں نے بمبئی آنا ترک کردیا ایک لحاظ سے فائدے میں رہے۔ دلی میں نیکیاں کرکے انھیں دریا میں ڈالنے کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ سب نیکیاں محفوظ رہتی ہیں اور ان کا اندراج اس جگہ ہوتا رہتا ہے جہاں کتابت وطباعت کی غلطیوں کا امکان نہیں ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن اس ملک میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن ان کی اپنی زبان اردو ہے۔ کنور صاحب انہی لاکھوں میں سے ایک ہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہیں۔ (آپ کا جی چاہے تو اسے مبالغہ سمجھ لیجیئے)

میں چاہوں گا کہ اکیسویں صدی کا جو بھی پہلا مشاعرہ ہو اس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی کریں۔ اور میں بھی اس میں بحیثیت شاعر شریک رہوں!

نامور مزاح نگار
یوسف ناظمؔ
کے مضامین کا مجموعہ

البتہ

قیمت: دس روپے

بتوسط

شگوفہ حاصل کیجیے!

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

(چھٹی قسط)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

اولادِ نرینہ کے لیے منّت : یہاں کے لوگ اپنی مرادیں پوری کرنے کے لیے منّت مانگتے ہیں اور ان میں سے بعض منتیں بہت عجیب ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی کے ہاں اولادِ نرینہ نہ ہو تو وہ منّت مانتا ہے کہ لڑکے کی پیدائش سے لیکر اس کے سات سال کی عمر میں پہنچنے تک وہ اپنے اس لاڈلے بیٹے کو مانگے تانگے کے کپڑے پہنائے گا، چنانچہ مُراد برآنے پر یہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور جوٹھے کپڑے پہناتے ہیں۔ ایک روز میرا گزر پُرانے کپڑوں کی ایک بہت بڑی مارکٹ لنڈا بازار سے ہوا تو میں نے یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو دیکھا۔ یقیناً ان سب نے اولادِ نرینہ کے لیے منّت مانی ہوگی جو پوری ہوگئی ہوگی چنانچہ اب وہ یہاں دھڑا دھڑ اپنے لاڈلے بچّوں کے لیے جوٹھے کپڑے خریدنے میں مشغول تھے!

ہر بار خلاء پیدا کرنا : لاہور میں میری موجودگی کے دوران کئی مشہور شخصیتوں کا انتقال ہوا۔ میں نے اخباروں میں مختلف لوگوں کے بیان پڑھے جن میں ہر مرنے والے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ مرحوم کے انتقال سے ایک خلاء پیدا ہوگیا ہے۔ دراصل یہ مشرقی لوگ الفاظ کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے ہیں ورنہ ان میں سے ایک آدھ مرحوم ضرور ایسا بھی ہوگا جس کی موت سے کوئی خلاء پُر ہو گیا ہوگا۔ لیکن یہاں کسی مرحوم کے بارے میں ایسی بات کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے!

ایک مقبول رواج : یہاں شاعری کا ایک انتخاب میری نظر سے گزرا جس میں مختلف شاعروں کے علاوہ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصویریں بھی شائع کی گئی تھیں۔ حالاتِ زندگی میں ایک شاعر کا سنِ پیدائش ۱۸۲۳ء درج تھا اور اس کے ساتھ اس کی جو تصویر شائع کی گئی تھی وہ بھی غالباً ۱۹۲۳ء ہی کی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں شعراء کے ہاں اپنی نوعمری کی تصویریں شائع کرانے کا خاصا رواج ہے!

اشتعال انگیز نعرے : میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بازار میں سے چیختے چلّاتے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کچھ اور لوگ بھی اس سڑک پر سے گزرے۔ ان کے چہرے تنے ہوئے تھے اور وہ بھی بہت بُری طرح چیخ رہے تھے۔ میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ ہے اور یہ لوگ چیخ چیخ کر کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ "ہم تمہارے گھروں کو آگ لگادیں گے" "تمہارے بچوں کو قتل کرکے ان کی انتڑیاں

ہوائیں اچھالیں گے، تمہاری لاشوں پر بھنگڑے ڈالیں گے اور تمہاری لڑکیاں نکال کر لے جائیں گے" کے کلمات ادا کر رہے ہیں۔ میں یہ سن کر بہت حیران ہوا کیونکہ بازار میں موجود لوگوں میں سے کسی کے چہرے پر اتنے اشتعال انگیز نعروں کے باوجود کوئی تشویش نہیں تھی اور نہ ہی ارد گرد کے دکانداروں میں کسی قسم کا خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ اس پر میزبان نے وضاحت کی اور مجھے بتایا کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ دراصل قریبی سینما میں ایک فلم کا شو ٹوٹا ہے اور یہ لوگ اس فلم میں سے اپنے پسندیدہ ڈائیلاگ اس فلم کے ہیرو کی "ٹون" میں دہراتے ہوئے گزر رہے ہیں!

اسی مر گئے آں؟: قیام لاہور کے دوران میری ملاقات عاشقوں کے ایک گروہ سے بھی ہوئی۔ انہوں نے یہ ملاقات کسی وفد کی صورت میں نہیں کی بلکہ مجھے ان سے انفرادی ملاقاتوں کا موقع ملا اور میں نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ منفرد خصوصیات کا مالک پایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بنیادی حقوق سے محروم ہیں اور خاصی کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ محبوبہ کے اہل خاندان اور ان سے بھی زیادہ اہل محلہ ہیں۔ اہلِ محلہ اپنے محلہ میں کسی دوسرے محلہ کے عاشق کے داخلے کو پسند نہیں کرتے، اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ "اسی مر گئے آں ہا"۔ میں نے کئی لوگوں سے اس جملہ کی رمزیت دریافت کی مگر تمامتر تشریح کے باوجود میں پوری طرح اس جملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ یقیناً اس کا کوئی کلچرل پس منظر ہوگا!

ڈبل ڈیوٹی: یہاں میں نے محبوبہ کے بھائیوں کو بہت شکی پایا، وہ اپنی کڑی نگرانی میں انہیں کالج تک چھوڑنے جاتے ہیں اور پھر کالج سے واپس لے کر آتے ہیں تاہم وہ یہ کام جلدی سے جلدی نپٹانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کے بعد انھوں نے خود کسی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر کسی اور کو کالج تک چھوڑنا اور پھر اسے واپس گھر تک پہنچا کر آنا ہوتا ہے۔ یہ ڈبل ڈیوٹی ان کے لیے خاصی اعصاب شکن ہوتی ہوگی۔

کزن: یہاں 'کزن' کا رشتہ مجھے خاصا اُلجھا ہُوا محسوس ہوا، ایک شخص نے اپنی ساتھی خاتون کا تعارف مجھ سے کرایا اور کہا "یہ میرے کزن ہے"۔ اس وقت میرے پاس ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے کان میں کہا "پچھلے سال یہ میری کزن تھی"! رشتے کی یہ "ریلیشن" میں نے اسی خطے میں دیکھی ہے۔ مشرق واقعی بہت پُراسرار ہے۔

علمی فضا: مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے علیٰحدہ علیٰحدہ کالج ہیں جب کہ یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے لڑکیاں کلاس روم میں استادوں کے لکھائے ہوئے نوٹس ایک دوسرے سے طلب کرتے ہیں اور پھر نوٹس کے تبادلے کی صورت میں وہ اکثر کسی گوشۂ تنہائی میں پوری محویت کے ساتھ ان پر تبادلۂ خیال کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہاں کے اہلِ دانش یونیورسٹیوں میں علمی فضا کے فقدان کا رونا روتے رہتے ہیں۔ تاہم ایک اہلِ دانش نے میرے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا: "آپ بھولے بادشاہ ہیں"۔ خدا جانے یہ "بھولا بادشاہ" کیا ہوتا ہے؟

میٹنگ پوائنٹ: اندرون شہر کے عشاق اپنی محبوبہ سے عموماً اپنے یا اس کے گھر کی سیڑھیوں میں ملاقات کرتے ہیں یا میٹنگ پوائنٹ طے کرنے کے لیے اپنے مکان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر کسی ڈھیلے میں رقعہ لپیٹ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں جس کے نتیجے میں اکثر اوقات رقعہ گلی میں جا گرتا ہے اور ڈھیلا کسی بزرگ کو جا لگتا ہے۔ سیانوں سے سنا ہے اس میں اکثر و بیشتر خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

رانگ نمبر: ملاپ کی ایک صورت ٹیلیفون پر رانگ نمبر ملنے کی صورت میں بھی ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں بسا اوقات نوبت شادیوں تک بھی پہنچ جاتی ہے مگر مجھے بتایا گیا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد طرفین محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے رانگ نمبر ہی پر گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں!

لول بچن: مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جب یہاں کوئی کسی سے کہتا ہے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" تو اس کا مطلب ضروری نہیں کہ واقعی یہی ہو بلکہ یہ فقرہ یہاں عموماً رومانی فضا پیدا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جب کہ ہم لوگوں کی ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی نے ہماری زندگیوں سے رومانس کی چاشنی ختم کردی ہے۔ یہاں کے لوگ اس قسم کی رومانی گفتگو کو "لول بچن" کہتے ہیں جس کا صحیح مفہوم مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوسکا۔

ایک میان میں ایک تلوار: یہاں میں نے ایک عجیب رواج دیکھا کہ لوگ جس سے محبت کرتے ہیں، اس سے عموماً شادی نہیں کرتے اور جس سے شادی کرتے ہیں اس سے محبت نہیں کرتے۔ شاید یہ لوگ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک چیز ہوسکتی ہے، چنانچہ وہ شادی اور محبت میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں۔

فرسٹ کم، فرسٹ سرو: قیام لاہور کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عشق کرنے کے لیے یہاں کے عشاق چکروں میں نہیں پڑتے بلکہ زندگی میں پہلی بار جس سے ملاقات کا موقع میسر آجائے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ یہاں کی معاشرتی زندگی میں ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ اس "فرسٹ کم، فرسٹ سرو" کے اصول کو یہاں "فرسٹ سائٹ لو" کہا جاتا ہے۔

ذاتی مسئلہ: میں نے یہاں کئی لوگوں کو متعدد مواقع پر یہ فقرہ بولتے سنا کہ "مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا" جب کہ میں نے بیک وقت متعدد مومنوں کو ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے بھی دیکھا ہے۔ بہرحال یہ اُن لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے یا پھر اجتماعی مسئلہ ہے!

صاحب اور صاحبِ اختیار: لاہور میں قیام کے دوران مجھے ایک روز کے لیے اپنے سفارت خانے جانا پڑا۔ مگر اسلام آباد جانے کے لیے مجھے پی آئی اے کا ٹکٹ دستیاب نہ ہوسکا کیونکہ جس فلائٹ میں میں جانا چاہتا تھا، پی آئی اے کے عملے کے مطابق اس میں جگہ نہیں تھی۔ میرا ایک شناسا مجھے پی آئی اے کے ایک بہت بڑے افسر کے پاس لے گیا جو اس کا دوست تھا اور اسے میری ایمرجنسی سے آگاہ کیا۔ وہ ایک خوش خلق انسان تھا۔ اس نے ہمیں کافی پلائی اور اسی دوران ٹیلی فون پر ماتحت عملے سے فلائٹ کی صورتِ حال دریافت کی اور کہا جس طرح بھی ہو ایک سیٹ کا بندوبست کیا جائے، مگر اسے بتایا گیا کہ اس فلائٹ میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ اس نے مجھ سے معذرت کی اور کہا کہ اگر تھوڑی بہت گنجائش بھی ہوتی تو آپ کے لیے سیٹ کا بندوبست یقیناً ہو جاتا۔ اس گفتگو کے دوران صاحب کا چپڑاسی کافی کے برتن سمیٹ رہا تھا جب اس نے اپنے باس کے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے تو وہ اس کے پاس جاکر مؤدب کھڑا ہوگیا اور کہا "سر! اگر اجازت ہو تو میں کچھ کوشش کروں۔" اس پر اس کے باس نے ہنس کر کہا "میاں، میں پوری کوشش کر چکا ہوں، مگر تم بھی کر دیکھو!" تھوڑی دیر بعد جب چپڑاسی واپس آیا تو ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ خاصا اثرورسوخ والا شخص ہے! میرے دوست نے بتایا کہ یہاں بعض افسروں سے زیادہ ان کے چپڑاسی بااختیار ہوتے ہیں!

قومی ہیرو؟: لاہور ائیرپورٹ اس عظیم تاریخی شہر کے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو چھوٹے سے لاؤنج میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں نے یہاں ایک مسافر دیکھا کہ وہ ہار وں سے لدا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی پوری طرح نظر نہیں آرہا تھا، اس کے ساتھ سو ڈیڑھ سو کے قریب عورتیں، مرد اور بچے تھے، کوئی خاصا امیر آدمی تھا، غالباً پورا جہاز چارٹر کرا کر لے جا رہا تھا مگر میرے دوست نے مجھے بتا کر جلد ہی میری غلط فہمی دور کر دی کہ مسافر تو صرف یہ ہے، باقی لوگ تو اسے الوداع کہنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی قومی ہیرو ہے جسے پورے اعزاز کے ساتھ کسی بڑی مہم کے لیے رخصت کیا جا رہا ہے، مگر میرے دوست نے ایک بار پھر مجھے بتایا کہ ایسی بات نہیں ہے اس شخص نے ملازمت کے لیے بیرونِ ملک جانا ہے اور اس وقت اسلام آباد ویزا لگوانے کے لیے جا رہا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔

میڈیکل چیک اپ: یہاں جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ہر مسافر کا میڈیکل چیک اپ کیا جاتا ہے کہ آیا وہ سفر کے قابل ہے بھی یا نہیں! چنانچہ دوسرے مسافروں کی طرح مجھے بھی ایک کیبن میں لے جا کر میرے بازو، ٹانگیں اور سینہ وغیرہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھے گئے تاہم میں پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ میڈیکل چیک اپ تھا یا مسافروں کی تلاشی لی جا رہی تھی، غالباً یہ میڈیکل چیک اپ ہی تھا، کیونکہ تلاشی تو اس طرح نہیں لی جاتی!

قربانی: فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے پر میں اپنا بیگ اٹھا کر دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف جا رہا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود پی آئی اے کے ایک افسر نے مجھے روک کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بھی اسے پہچان لیا مجھ سے اس کی ملاقات چند برس قبل میرے ملک میں ہوئی تھی اور اس سے روابط بڑھ جانے پر حتی المقدور اس کی مہمانداری کی تھی، وہ مجھ سے بڑی دیر تک میرے ملک کے لوگوں کی تعریف کرتا رہا کہ بڑے فرض شناس لوگ ہیں کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کرتے ہیں۔ دریں اثنا جہاز کی روانگی کا وقت ہو چلا تھا صرف میری وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی مگر میرا دوست مجھے اتنی جلدی رخصت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ بضد تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پی جائے۔ مجھے متامل دیکھ کر اس نے مجھے بتایا کہ جہاز کی طرف سے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کے بغیر یہ پرواز نہیں کرے گا کیونکہ اس نے عملے کو کہہ دیا ہے۔ مجھے اور جہاز کے دیگر مسافروں کو اس کی یہ مہمان نوازی ہمیشہ یاد رہے گی کیونکہ جہاز مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا، ہم مادہ پرست مغربی لوگ اپنے مہمانوں کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتے!

ائیر ہوسٹس: میں جب پاکستان میں آیا تھا اس وقت مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں سوشلزم نافذ کیا جا رہا ہے۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اب یہاں اسلام کے نفاذ کی تیاریاں ہو رہی ہیں ائیر ہوسٹس کی شباہت دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ یہاں واقعی نفاذِ اسلام کی کوششیں جاری ہیں کیونکہ اسے دیکھ کر دل میں کسی قسم کے فاسد خیالات کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا البتہ سٹیورڈ خاصا دلکش نوجوان تھا۔ مجھے پالیسی کا یہ دوغلا پن سمجھ نہ آیا کیونکہ آخر خواتین بھی تو جہاز میں سفر کرتی ہیں!

احساسِ کمتری: میں نے سفر کے دوران محسوس کیا کہ جہاز کے مسافر میزبان عملے سے زیادہ خوش نہیں ہیں کیونکہ میرے پاس بیٹھا ہوا مسافر مسلسل گریبل کر رہا تھا کہ مسافروں کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہوتی تاہم مجھے یہ شخص قنوطی لگا کیونکہ میزبان عملے کا رویہ میرے ساتھ نہایت خوشگوار تھا اور اس وقت تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص قنوطی ہے جب اس نے میری بات کے جواب میں کہا کہ تمہارے ساتھ ان کا سلوک اس لیے اچھا ہے کہ تم "گوری چمڑی والے" ہو! تم بھی اگر "دیسی" ہوتے تو تمہیں ان کی میزبانی کا صحیح اندازہ ہوتا۔ مجھے اس مسافر کی اس بات سے احساس کمتری کی بو آئی۔

ایک دلچسپ واقعہ: ابھی جس مسافر کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا نام مسٹر ملک تھا۔ یہ محکمۂ زراعت کا کوئی افسر تھا۔ یہ اپنے باس سے بہت نالاں تھا اور اس کی نالائقی کی داستانیں اسے ازبر تھیں۔ اپنے اس باس کے بارے میں اس کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگتا تھا اور اس دوران اس کی آواز خاصی اونچی ہو جاتی تھی۔ دریں اثنا ہم سے اگلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک مسافر اپنی جگہ سے اٹھا اور مسٹر ملک کے پاس آکر اس سے ہاتھ ملایا اس کی خیریت دریافت کی اور پھر باتھ روم کی طرف چلا گیا! اسے دیکھ کر مسٹر ملک کا رنگ فق ہو گیا اور زبان گنگ ہو گئی، کیوں کہ جس شخص نے آکر اس سے ہاتھ ملایا تھا یہ اس کا وہی باس تھا جسے وہ گزشتہ آدھ گھنٹے سے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میں اس صورتِ حال سے بہت محظوظ ہوا۔

لوکل جوک: جس روٹ پر میں سفر کر رہا تھا اس روٹ پر عموماً فوکر کی فلائٹ ہوتی ہے۔ طیارہ ساز کمپنیوں نے ایک عرصے سے یہ طیارہ تیار کرنا بند کر دیا ہے، چنانچہ ان کی حیثیت اب "اینٹیق" کی سی ہے۔ فضائی میزبانوں نے جب مہمانوں کو چائے سرو کرنے کے لیے ٹرے گرانا شروع کیں تو ایئر پاکٹس شروع ہوگئیں جس کی وجہ سے جہاز ہچکولے کھانے لگا چنانچہ ایک اعلان کے ذریعہ معذرت کی گئی کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے مہمانوں کو چائے "سرو" نہیں کی جا سکے گی، مگر میرے قنوطی ہم سفر نے ایک بار پھر زبان کھولی اور کہا "یہ جہاز ہمیشہ میں اس وقت ہچکولے کھانے لگتا ہے جب چائے پیش کرنے کا وقت ہو"! انہی ہچکولوں کے درمیان میں نے اپنی اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اس سے ایسے ہی پوچھا کہ "جہاز کتنے بجے اسلام آباد پہنچ جائے گا"؟ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا "اگر پہاٹک کھلا ہوا تو ہم اور پندرہ منٹ تک اسلام آباد پہنچ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہنسنے لگا۔ مجھے اس مذاق کی سمجھ نہیں آئی لوکل جوک LOCAL JOKE ہوگا!

○○

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے لیل و نہار (سال ۸۶-۱۹۸۵ء)

۱۲ راگست ۱۹۸۵ء

o تشکیل جدید

o مطبوعات پر انعامات
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کی (۲۵) بہترین تصانیف نظم و نثر مطبوعہ ۸۲ء، ۸۳ء، ۸۴ء کو انعامات دیئے گئے۔

o طلبہ و طالبات کو میرٹ اسکالرشپ
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے ساتویں جماعت سے ایم اے تک کے سرکاری امتحان میں کامیاب (۱۵۹) طلبہ و طالبات کو اردو مضمون میں میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دیئے گئے۔

o سیمنار، سمپوزیم اور مشاعروں کے انعقاد کے لیے اداروں کو امداد
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۸) اداروں کو سیمنار، سمپوزیم اور مشاعروں کے لیے امداد دی گئی۔

o شاعروں، ادیبوں، صحافیوں وغیرہ کو علاج و معالجہ کے لیے امداد
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں اردو کے (۵) ممتاز شاعروں، صحافیوں، فن کاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو علاج معالجہ کے سلسلہ میں امداد دی گئی۔

o لائبریریوں کو امداد
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۴۶) عوامی کتب خانوں اور لائبریریوں کو بہ شکل کتب امداد دی گئی۔

o رسائل اور جرائد کو امداد
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۷) علمی ادبی رسائل اور جرائد کو امداد دی گئی۔

o اشاعتی پروگرام
سال ۸۶-۱۹۸۵ء تلگو اور اردو زبان و ادب کے مابین باہمی ارتباط کے اہم مقصد کے پیش نظر تلگو کے ایک مشہور ناول کے اردو ترجمہ "روشن سائے" کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔

o شعراء کی عزت افزائی اور مشاعرہ
سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں یکم نومبر یوم تاسیس آندھرا پردیش کی سرکاری تقاریب کے ساتھ، زیر اہتمام اردو اکیڈمی، حکومت کی طرف سے ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا، اس موقع پر ریاست کے (۱۶) شعراء کی عزت افزائی کی گئی۔ گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے شرکت کی۔

o مہمان شعراء اور دانشوروں کا خیر مقدم
ایک پر اثر تقریب میں روس، پاکستان اور ملک کے مہمان شعراء اور دانشوروں کا اردو اکیڈمی کے دفتر میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک محفل شعر بھی منعقد کی گئی۔

محمد خلیل الرحمن
ڈائرکٹر و سکریٹری

11-4-637 اے سی گارڈز، حیدرآباد ۴...۵۰۰ (اے پی)

انوار انصاری (رانچی)

"گواہی دینا بھی ایک فن ہے"

جس طرح جھوٹ بولنا ایک فن ہے، حقیقت کو جھوٹ میں بدل دینا عمدہ آرٹ ہے اور سچائی کا خاتمہ کر کے صرف جھوٹ ہی کے وجود کو باقی رکھنا فائن آرٹ ہے اسی طرح گواہی دینا بھی ایک فن ہے اور صرف جھوٹی گواہی دینا ایک عمدہ آرٹ ہے اور لفظوں کی بازی دکھلا کر مقدمے کا رُخ یکسر موڑ دینا فائن آرٹ ہے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ آج کل ہر فن میں ترقی ہو رہی ہے۔ کچھ دنوں پہلے تک جھوٹ بولنے والے شخص کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا مگر جب سے جھوٹ نے فن کی شکل اختیار کی ہے اب ہر جھوٹ بولنے والا قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اسی طرح چوری کرنا بھی اگلے وقتوں میں جرم تصوّر کیا جاتا تھا مگر جب سے چوری کرنے والوں نے فنونِ لطیفہ، ادبِ عالیہ، فلسفہ، تاریخ اور امتحان میں دخل دینا شروع کیا ہے چوری کے فن میں نمایاں ترقی ہونے لگی ہے۔ اب تو چوری کا چلن، اسکول، کالج، دفتر، بازار، سیاست میں زور و شور سے ہونے لگا ہے اور چوری کرنے والوں ہی کا بول بالا ہر جگہ ہو رہا ہے۔ اب چوری کرنے والے حضرات اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے صرف چوری کے بل بوتے پر سماج میں بلند و بالا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور کورٹ کچہری جانا اپنی ہتک سمجھتے تھے مگر جب سے گواہی دینا ایک فن تسلیم کر لیا گیا ہے اب گواہی دینے والے حضرات ذوق و شوق سے گواہی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور اس فن کے کچھ ماہر تو اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کب موقع ملے کہ وہ اپنے فن کا کرتب دکھانا شروع کر دیں۔

یوں تو گواہی دینے کی بہت سی قسمیں ہیں مگر ان میں چند کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گواہی دینے کی پہلی قسم "چشم دید گواہی کی" ہے۔ اس لیے چشم دید گواہ کی گواہی خاصی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ چشم دید گواہ کی گواہی اس کے موڈ اور حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر چشم دید گواہ حق اور انصاف کا خونِ ناحق دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے تو وہ اپنی گواہی کا رُخ بدل دیتا ہے اور سچ بولنے کی قسم کھا کر ایسی گواہی دیتا ہے کہ حق اور انصاف کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ میرے محلّے میں ہونے والے ایک حالیہ واقعے سے چشم دید گواہی کا یہی راز منکشف ہوا۔ ایک صاحب کئی برسوں سے میرے پڑوس میں مقیم ہیں۔ گھر تو اُن کا ڈہری۔ اون۔ سون ضلع رہتاس ہے مگر وہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ چند دنوں پہلے بیچارے اچانک ایک آفتِ ناگہانی میں مبتلا ہو گئے اور پولس ان کے

پیچھے پڑ گئی ان کی روز مرّہ کی زندگی کا معمول دیکھتے ہوئے پولیس کا چکّر لگانا اپنی جگہ بالکل درست تھا کیونکہ حضرت دن کے اُجالے میں لوگوں کی آنکھوں میں پارسائی کا دھول جھونک کر اپنا اُلو سیدھا کرتے تھے۔ وہ ایک جرم کے سلسلے میں ایک کیس میں ملوّث ہو گئے اور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ انھوں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور چشم دید گواہوں کو خرید لیا اور چشم دید گواہوں کی ماہرانہ انداز میں گواہی دینے کی وجہ سے وہ حضرت بال بال بچ گئے۔ پیسہ کے بل بوتے پر جیل جانے کی بجائے عزّت وآبرو سے مسکراتے ہوئے محلّے میں نمودار ہوئے اور محلّے میں لڈو تقسیم کروائے۔ یہ تھا چشم دید گواہی کا کمال کہ ایک مجرم کو صرف گواہی دینے کے فن نے عزت وآبرو دلوائی۔

گواہی دینے کی دوسری قسم "کشتی گواہوں" کی ہوتی ہے۔ ایسے حضرات کورٹ کچہری، مارکٹ، ہسپتال، پوسٹ آفس، گانجا، بھانگ اور افیون کے دوکانوں کے اِردگرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ موقع پڑنے پر یہ حضرات اپنی بیش بہا خدمت دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

گواہی دینے کی تیسری قسم "میرکو" جیسے گواہی دینے والے حضرات کی ہوتی ہے۔ ایسے حضرات موقعہ واردات پر نہ تو حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کو مقدمے کی نوعیت کا علم ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی دانش مندی کے ذریعے ایسی گواہی دیتے ہیں کہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا شخص بھی ان کی ذہانت کا قائل ہو جاتا ہے۔

گواہی دینے کی چوتھی قسم بھرتی کے گواہوں کی ہوتی ہے۔ ایسے گواہ جب اور جہاں ضرورت ہو پکڑ لیے جاتے ہیں اور گواہی کے لیے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ آج کل بس (BUS) میں سفر کرنا کئی آفتوں کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ ہوائی جہاز کا اغواء تو پلان بنا کر کیا جاتا ہے مگر بس کا اغوا یا لوٹ مار یا چھینا جھپٹی بغیر نوٹس کے کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔ ایک بار میں پٹنہ سے رانچی کے لیے بس میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک جھمری تلیا ڈیم کے نزدیک ہم لوگوں کی بس روک دی گئی اور دو نوجوان منہ پر نقاب ڈالے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار لے کر مسافروں کی تلاشی لینے لگے۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ سڑک پر اکّا دکّا مسافروں کی آمدورفت بھی جاری تھی مگر بس کے مسافروں کی دُرگت بن رہی تھی۔ مسافروں کی اچھی طرح دُرگت بننے کے بعد جب وہ بس لُٹ لٹا کر نزدیکی پولیس چوکی پہنچی اور گواہی درج کرانے کی نوبت آئی تو بس کے سارے مسافر گواہی دینے سے مکر گئے۔ بس کے لٹے ہوئے مسافر یہی کہتے کہ مال تو الگ گیا اور اب گواہی دینے کے چکر میں کون پھنسے گا۔ مگر معاملہ چونکہ پولیس چوکی میں درج ہو چکا تھا اور اب پولیس کی عزت اور بچاؤ کا سوال تھا اس لیے مقامی پولیس چوکی والوں سے مقامی لوگوں کی بھرتی کے گواہ کی حیثیت سے اندراج کر کے کیس کھڑا کیا۔ یہ کیس صرف اس لیے درج کیا گیا کہ پولیس کو اپنا حصّہ وصول کرنے میں سہولت ہو ورنہ چوری اور لوٹ کا سامان واپس دلانے سے کیا واسطہ۔

ایک عاقل کا قول ہے کہ گواہی دینے والا انسان مختلف قسم کی بداعمالیوں کے شکنجے میں پھنس کر اپنی خاندانی قدرو منزلت کو تو کھو ہی دیتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ملک وقوم، اڑوس پڑوس اور رشتہ داروں کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔

ایک مفکر کا قول ہے کہ کسی ملک کی خوبی وعمدگی اور قدر ومنزلت زیادہ تر اس ملک کی رعایا کی چال چلن، اخلاقیات، تہذیب وشائستگی پر منحصر ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جس ملک میں بات بات پر مقدمے درج کرائے جائیں گے اور قدم قدم پر گواہی دینے کی نوبت آئے گی ظاہر ہے اس ملک کی ترقی کا عالم کیا ہوگا

آج کے عہد کا زیادہ تر کاروبار جھوٹ کی دلکش اور رنگین گواہی کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔

رفتارِ زمانہ کی ترقی کے ساتھ گواہی دینے کے فن میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹا باپ کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ شاگرد استاد کے خلاف گواہی دیتا ہے، بھائی بھائی کے خلاف گواہی دیتا ہے اور پڑوسی اپنے پڑوسی کے خلاف گواہی دے کر اس فن میں چار چاند لگا دیتا ہے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

سوچ کر دو گے گواہی تو کچھ اور نکھر جاؤ گے
ورنہ تنکوں کی طرح خود ہی بکھر جاؤ گے

ماہنامہ شگوفہ
کا ایک نادر تحفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

مہمان مدیر : ——— یوسف ناظم

ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ مزاح نگاروں کی تخلیقات کے تراجم !
ہندوستان کی پندرہ اہم زبانوں کے مزاحیہ نثری سرمایہ کا جائزہ!!
اردو طنز و مزاح (نثر) کا تنقیدی جائزہ !
عصری اردو طنز و مزاح کے موضوع پر سوالنامہ!!

خوبصورت ٹائیٹل (دو رنگی) سعادت علیخان، ضخامت : ۳۸۶ صفحات، قیمت پچاس روپے

سالانہ خریداروں سے [illegible] روپے (بشمول رجسٹرڈ پوسٹ)

غزلیں

نسیم سحر
(واہ کینٹ)

طلب اپنی رقم کیجیے جناب آہستہ آہستہ
چکا دوں گا میں سارا ہی حساب آہستہ آہستہ

کہیں یکلخت صورت دیکھ کے دہشت نہ کھا جاؤں
پلٹیے اپنے چہرے سے نقاب آہستہ آہستہ

تری فرقت میں ڈر ہے گھُل کے غائب ہی نہ ہو جاؤں
گھٹا جاتا ہے یوں میرا شباب آہستہ آہستہ

جناب شیخ جل جائے گا منہ دم لیجیے تھوڑا
بہت ہی گرم ہیں کھائیں کباب آہستہ آہستہ

ذرا سوچو محلے دار کیا کچھ سوچتے ہوں گے
کرو نازل ذرا اپنا عتاب آہستہ آہستہ

ہیں قاتل آپ کی نظریں مرا جھٹکا نہ ہو جائے
"حضور آہستہ آہستہ جناب آہستہ آہستہ"

یہ کالک جا نہ پہنچے دل کی جانب سوچ لو اتنا
ملو تم اپنی داڑھی پر خضاب آہستہ آہستہ

کسی کی یاد میں فی الحال تو پیتا ہوں سیون اپ
شروع کر دوں گا اب پینا شراب آہستہ آہستہ

روز خوابوں کا محل ایک بنایا کر تو
اِس میں شہزادی نئی لا کے بسایا کر تو

میں نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا منانے کا تجھے
میں کبھی روٹھوں تو مجھے آ کے منایا کر تو

چھوڑ۔ کیا شوق ہے یوں داڑھی بڑھائے رکھنا
لے یہ جلیٹ کا بلیڈ، اس کا صفایا کر تو

مانتے ہیں کہ ترا حُسن قیامت ہے مگر
ہم پہ ہر روز قیامت بھی نہ ڈھایا کر تو

میں تو کہ چھتری بھی نہیں حُکم مجھے اُن کا ملا!
آج ہے دھوپ بہت تیز، تو سایا کر تو

ایک خواہش ہے مری مان لے بس اور نہیں
اُن کا گو بلما بھی کسی روز، خدایا کر تو

کیسے تسکین کا فائر بریگیڈ آ سکے گا!
عشق کی آگ نہ یوں دل میں لگایا کر تو

سوچ لے یہ کہ کسی روز پشیمانی ہی نہ ہو
کوئے جاناں میں سحر روز نہ آیا کر تو

اے. جی. گارڈنر (انگریزی)
مترجم: رشید الدین

برِبنائے سگ

"اے. جی. گارڈنر انگریزی اَدب کا ایک ممتاز انشائیہ نگار تھا. اس کا پورا نام الفریڈ جارج گارڈنر
تھا تاہم وہ "الفا آف دی پلو" کے قلمی نام سے لکھتا تھا لیکن اسے ادب میں شہرت اپنے اصل نام ہی سے حاصل
ہوئی. وہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۴۶ء میں اس کا انتقال ہوا یعنی ہندوستان کے آزاد ہونے سے
صرف دو سال قبل. اس طرح اس کا شمار جدید دور ہی میں کیا جا سکتا ہے. گارڈنر ایک صحافی بھی تھا اور وہ کئی
سال تک ڈیلی نیوز کا ایڈیٹر بھی تھا. اس کے لکھے ہوئے انشائیے، خاکے اور مختلف ادیبوں اور شاعروں
کی سوانح حیات انگریزی ادب میں کافی مشہور ہیں. زیرِ نظر انشائیہ "برِبنائے سگ" اس کے مشہور انشائیہ
"All a bout a do" کا اردو ترجمہ ہے جس میں اس نے اپنے مخصوص انداز اور بے حد لطیف پیرائے میں یہ
بتایا ہے کہ قاعدے اور قانون انسانوں کے لیے بنائے جاتے ہیں انسان ان کے لیے نہیں۔ (رشید)"

رات بے حد سرد تھی مشرق سے فراٹے بھرتی ہوئی آنے والی ہوا بس کے آخری حصہ میں سیٹیاں
بجا رہی تھی. اِتنے میں بس آئی اور دو عورتیں اور ایک مرد بس میں ایک ساتھ سوار ہوئے اور خالی نشستوں
پر جا بیٹھے، ہو گئے. اِن میں ایک عورت نوجوان تھی جو کسی جانور کی کھال کی پوستین پہنے ہوئے تھی اور اس کی
گود میں ایک چھوٹا سا کتا بھی تھا. کنڈکٹر آیا. اور اس نے کرایہ وصول کیا. پھر اس کی آنکھیں کتے کی چھوٹی چھوٹی
شرارتی آنکھوں سے چار ہوئیں جو عورت کے ہاتھ میں موجود باسکٹ میں دبکا بیٹھا تھا. کنڈکٹر کی آنکھوں میں جذبہ
مخاصمت صاف عیاں تھا. میں نے محسوس کیا کہ ہنگامہ شروع ہونے کو ہے. یہ وہ موقع ہے جس کے وہ
انتظار میں تھا اور اس سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہتا تھا میں نے اسے ایچ. جی. ویلس کا وہ شخص تھا اور کشیدہ
خاطر ملازم پایا جسے عام طور پر ہر چیز سے اور خصوصیت سے ان مسافروں سے شکایت رہتی ہے جو ایسے وقت
کی بس میں آرام سے سفر کر رہے ہوں جب وہ دروازہ میں کھڑا سردی سے کپکپا رہا ہو.

"آپ کو اس کتے کو اُوپر لے جانا ہوگا" اس نے بے حد تلخ لہجے میں کہا:

"میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی. آپ میرا نام اور پتہ نوٹ کر سکتے ہیں" عورت جو [illegible] کسی [illegible] کی [illegible]

ہوئے تھی اور جس کے پاس پہلے سے جواب تیار تھا لب کشا ہوئی۔

"آپ کو اس کتے کو اوپر لے جانا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے" کنڈکٹر کی آواز پھر گونجی۔ "میں ایسے موسم میں اوپر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں بے موت مر جاؤں گی"۔ عورت نے جواب دیا "یقیناً نہیں" اس کی ساتھی عورت نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی "اسے پہلے سے کھانسی بھی ہے۔" "یہ سب بکواس ہے۔" اس کا مرد ساتھی کنڈکٹر کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی اور اس کے ساتھ ہی بس رُک گئی۔

"یہ بس اس وقت تک ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گی جب تک کتا بس میں موجود رہے"۔ کنڈکٹر نے اعلان کیا۔

بس سڑک کے بازو روک دی گئی اور انتظار شروع ہوگیا۔ یہ لمحہ اُس کی کامیابی کا تھا۔ ایک طرف وہ تھا جس کے ساتھ قانون تھا اور دوسری طرف بس کے تمام مسافر — بے بس اور پریشان۔

کنڈکٹر کی ایذا رساں روح خوشی سے جھوم رہی تھی۔

اندر طوفان شدید ہوگیا:

"شرم ناک"

"جرمن کہیں کا"*

"فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوگیا"۔

"پولیس کو بلاؤ"

"یہ ساری باتیں اس سے صاف اور برملا کہہ دینی چاہئیں"۔

"اس سے کہنا ہمارا کرایہ واپس کرے"۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس سے یہی کہنا چاہئے کہ ہمارے پیسے دے دو"۔

تمام مسافر عورت اور کتے کی تائید میں تھے۔

اور وہ چھوٹا سا جانور اس طوفان سے بے خبر جو اس کی وجہ سے اٹھا تھا بس کی مدھم روشنی میں تیز تیز پلکیں جھپکاتا ہوا اطمینان سے دبکا بیٹھا تھا۔

اتنے میں کنڈکٹر (جو اب تک بس کے نیچے اُتر کر ٹہل رہا تھا) دروازہ میں داخل ہوا۔

"تمہارا نمبر کیا ہے"؟ ایک مسافر نے بے حد مرعوب کر دینے والے انداز میں جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"یہ رہا میرا نمبر" کنڈکٹر نے بغیر کسی پس و پیش اور تشویش کے اپنا نمبر تھما دیا۔

"ہمارا کرایہ واپس کیا جائے۔ تم نے ہمیں منزل پر لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ تم ہمیں یوں ساری رات یہاں نہیں ٹھہرا سکتے"۔ ایک اور صاحب گرجے؛

---

* دوسری جنگِ عظیم کے دوران (جبکہ یہ انشائیہ لکھا گیا) انگلستان میں کسی کو جرمن کہنا گالی دینے کے مترادف تھا۔ (رشید)

"کرایہ واپس نہیں ہوسکتا" کنڈکٹر نے بغیر مشتعل ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

دو یا تین مسافر بس سے اُتر کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ کنڈکٹر نے سڑک پر ایک چکر لگایا اور پھر ڈرائیور کے پاس جا کر باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ایک اور بس جو اس رُوٹ پر چلنے والی آخری بس تھی ٹھیری ہوئی بس کے مسافروں کے "رُوکو" "رُوکو" کے شور کے درمیان بڑی بے اعتنائی سے گزر گئی۔

"یہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ بدمعاش کہیں گے"

ہوا کی لہروں پر تبصرہ نشر ہوا۔

کسی نے گھنٹی کی ڈوری کھینچ دی۔ ڈرائیور نیچے اُترا اور پیچھے سے دروازہ میں آکر کہا کون ہے بھائی اس بس کا کنڈکٹر؟"

کوئی جواب نہ ملنے پر وہ پھر اپنی نشست پر واپس چلا گیا اور دونوں ہاتھ بغل میں دبا لیئے۔ اس طرف سے بھی کوئی اُمید نہیں رہی تھی۔ ایک پولیس والا لاپرواہی سے گھومتا ہوا آیا۔ اور کھڑی ہوئی بس کے دروازہ میں سے جھانکنے لگا بے شمار شکایتوں کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا گیا۔

"اوہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ اس کے اپنے قواعد ہیں؟"

کانسٹبل نے سب کچھ سُننے کے بعد دوستانہ لہجہ میں مسافروں سے کہا پھر وہ عورت کی جانب مخاطب ہو کر بولا ــــ "آپ ایسا کیجئے آپ کنڈکٹر کو اپنا نام اور پتہ دے دیجئے؟"

"اس کی پیشکش تو وہ بے چاری پہلے ہی کر چکی ہیں جسے شرفِ قبولیت نہیں بخشا گیا؟"

کسی نے عورت کی طرف سے جواب دے کر طنز کی دھار تیز کی۔

"اوہ! ــ" اتنا کہہ کر پولیس والا وہاں سے چلا گیا اور چند گز کے فاصلہ پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں دو کانسٹبل اور آ گئے۔

اور وہ چھوٹا سا کتّا ابھی تک بس کی مدھم روشنی میں تیز تیز پلکیں جھپکا رہا تھا اور کنڈکٹر سڑک پر اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے کوئی کیپٹن کوئی بحری جنگ جیتنے کے بعد اپنے جہاز کے عرشہ پر ٹہلتا ہے۔ ایک نوجوان تھا تو تھا نے جس کی آواز اندر کے شور و غل میں سب سے اونچی ہو گئی تھی اسے قاتلوں کی نسل سے تک وابستہ کر دیا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ رات کی طرح سرد اور سڑک کی طرح سخت تھا بے بس غصہ کے ساتھ وہ عورت ان تین کانسٹبلوں کی جانب چل پڑی جو مجسموں کی طرح جامد و ساکت کھڑے یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ واپس آئی۔ تحکمانہ لہجہ میں اپنے نوجوان مرد ساتھی کو آواز دی جو اس کے غصہ کو خاموشی سے بیٹھا دیکھ رہا تھا اور غائب ہو گئی۔ دیگر لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ بس خالی ہونی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ دلاور شخص بھی جس نے کنڈکٹر سے اس کا نمبر پوچھا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ انھیں اس طرح ساری رات یہاں نہیں روک سکتا بس کی سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔

اس اثناء میں کتے والی بڑھیا لڑائی کے تمام حربے آزما چکنے کے بعد کامل شکست کے مرحلے میں داخل ہو گئی۔

"میں اُوپر جاؤں گی" جانور کی کھال کی پوستین پہنے ہوئے نوجوان عورت نے بالآخر کہا۔

"میں جاتا ہوں تمہیں نمونیہ ہو جائے گا۔ لاؤ یہ کتّا مجھے دے دو" یہ ملتجیانہ مرد کی جانب سے تھی جیسے

غصہ کے عالم میں تقریباً چیختے ہوئے عورت نے مسترد کر دیا۔
"ہرگز نہیں۔ میں کتے کے ساتھ مر جاؤں گی"
جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئی تو کنڈکٹر اندر آیا گھنٹی کی ڈوری کو جنبش دی اور بس اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔ وہ ایک فاتح کی طرح بس میں کھڑا تھا مگر باقی مسافر اس کے منہ پر اس کے اس عمل کو غیر شائستہ قرار دے رہے تھے۔
کچھ دیر بعد بس کا انجن خراب ہوگیا اور کنڈکٹر ڈرائیور کی مدد کو پہنچ گیا۔ یہ ایک طویل اور اکتا دینے والا کام تھا جس کے دوران اوپر بیٹھی ہوئی خاتون مع اپنے کتے کے نیچے آگئی اور دوبارہ بس کے اندر بیٹھ گئی۔ جب انجن ٹھیک ہوگیا تو کنڈکٹر پھر بس میں آگیا اور گھنٹی کی ڈوری کھینچی۔ اتنے میں اس کی نگاہ کتے پر پڑی اور اس کا ہاتھ پھر گھنٹی کی ڈوری پر تھا۔ ڈرائیور نے بس روکی اور پیچھے مڑکر سوالیہ نگاہوں سے کنڈکٹر کو دیکھا۔ کنڈکٹر نے کتے کی جانب اشارہ کر دیا اور ایک بار پھر وہی ڈرامہ دہرایا گیا۔ کنڈکٹر نے اُتر کر سڑک پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ پھر بغلوں میں چلے گئے۔ کتے نے پھر تیز تیز پلکیں جھپکانی شروع کر دیں۔
نوجوان خاتون نے اعلان کیا کہ "میں اوپر نہیں جاؤں گی"!
اور پھر آخر میں اوپر چلی گئی۔
"ہمارے بھی کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں"۔ کنڈکٹر نے بڑی دیر بعد مجھ سے کہا کیونکہ اب میں بس میں آخری مسافر رہ گیا تھا۔ اس نے لڑائی میں فتح حاصل کر لی تھی مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کے اس عمل کو کوئی اور بھی حق بجانب ٹھہرائے۔
"قاعدے قانون یقیناً ضروری ہیں" میں نے کہا "مگر ان میں بھی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بعض قاعدے بے حد سخت اور غیر لچک دار ہوتے ہیں جیسے ٹرافک کے قواعد جنھیں توڑنے سے جان کو خطرہ تک لاحق ہو سکتا ہے۔ مگر بعض قواعد محض رہبری کے لیے ہوتے ہیں جن پر عمل کرانا یا جنھیں نظرانداز کر دینا محض عقلِ سلیم پر مبنی ہوتا ہے۔ جیسے کہ یہ بس میں کتے کے سفر کے تعلق سے قواعد ہیں۔ ان کا مقصد مسافروں کو غیر ضروری تکلیف میں مبتلا کرنا نہیں ہے بلکہ نفاجاتی حالات میں انھیں استعمال کرنا ہے۔ ان قواعد کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے الفاظ پر گرفت رکھنے کی نہیں۔ تم نے الفاظ کو پکڑ لیا مگر ان کی روح مجروح کر دی۔ قواعد کی عمل درآمد میں ہی کچھ خوش اخلاقی اور نیک نیتی کو بھی شامل رکھنا چاہیے۔
کنڈکٹر نے میرے اس خیال کا شاید مثبت اثر قبول کیا کیونکہ جب میں اُترنے لگا تو اس نے بڑی شائستگی سے کہا "شب بخیر"!

نامور مزاح نگار پرویز یداللہ مہدی
کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ!
ٹائیں ٹائیں فش
قیمت: ۱۵ روپے

جہانگیر انس (بہار)

صَبر

صَبر ایک تین حرفی لفظ ہے۔ جبر بھی ایک تین حرفی لفظ ہے اور قبر بھی ایک تین حرفی لفظ ہے۔ تینوں ہم وزن ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ صبر، جبر اور قبر کی درمیانی کڑی ہے۔ یعنی جبر کی کوکھ سے صبر کی پیدائش ہوتی ہے اور قبر کی گود میں تمت بالخیر۔ بزرگوں کی زبانی ہم نے سُنا ہے کہ صبر ایک ایسا درخت ہے جس کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ میں نے بذاتِ خود صبر کے پھل کا ذائقہ نہیں چکھا ہے اس لیے بزرگوں کی بات کی موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا اندھیرے میں تیر چلانے یا لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے مترادف ہے کیونکہ دونوں حالتوں میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر رہتی ہے۔

لاٹری کے ٹکٹ پر یاد آیا۔ ایک کمزور دل شخص نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد اس نے روزانہ صبح و شام خدا سے دُعا مانگنا اپنا معمول بنالیا "یا خدا! لاٹری کا پہلا انعام میرے نام نکل آئے۔ میں داتا فراڈ شاہ کی کچی قبر پر پختہ مزار بنا کر ولایتی شراب کی بوتل اور ڈبے کا گوشت نذر کروں گا۔ اس کی یہ دُعا سُن کر فولاد کا جگر رکھنے والی بیوی کا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اسے اپنے شوہر کی سلامتی کو خطرہ نظر آنے لگا۔ وہ بھی دُعا کرنے لگی "یا خدا لاٹری کا پہلا انعام میرے شوہر کے نام ہرگز نہ نکالنا۔ ان کا دل کمزور ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو وہ برداشت نہیں کرپاتے تو اتنی بڑی خوشی کیوں کر برداشت کرپائیں گے میں ابھی بیوہ کے بجائے بیوی ہی رہنا چاہتی ہوں۔" لیکن بیوی کی دُعا سے زیادہ شوہر کی دُعا میں تاثیر تھی۔ اس کے نام پہلا انعام نکل آیا۔ وہ تو اس خوشی کو ولایتی شراب کی طرح ہضم کر گیا لیکن فولاد کا جگر رکھنے والی بیوی اس خوشی کو برداشت نہیں کرپائی اور خواہ مخواہ حضرت ملک الموت کو زحمت اٹھانی پڑی۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا صبر کے پھل کا۔ اس کے چکھنے والوں کا حلفیہ بیان ہے کہ یہ شیریں کے بجائے تلخ و ترش ہوتا ہے۔ بعض پھل زہریلے بھی ہوتے ہیں جنھیں کھانے والے مرتے تو نہیں مفلوج ضرور ہو جاتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

صبر کرنے والوں کو صابر کہتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے بچوں کا نام صابر اس لیے رکھتے ہیں کہ ان میں صبر کا مادّہ زیادہ سے زیادہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے نام کی عزت رکھے گا۔ لیکن میں نے اکثر دولت خاں کو بھیک

مانگتے، رستم علی کو کمزوروں کے ہاتھوں پٹتے اور شیخ عالم کو جاہل میاں سے خط پر پتہ لکھواتے دیکھا ہے۔ میرے نفقت بہتر کے ایک بھائی کا نام صابر ہے لیکن وہ اتنے بے صبر ہیں کہ صبح آنکھ کھلتے ہی پہلے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لیتے ہیں۔ مزدیات سے بعد میں فارغ ہوتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں گھر والے ان کے حصّے کی بھی چائے ختم نہ کر دیں۔ شادی کے معاملے میں بھی ان سے صبر نہ ہو سکا۔ بڑے بھائی سے پہلے ہی نوشہ بن گئے۔ بچّے پیدا کرنے کے معاملے میں بھی صبر کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ بڑے بھائی کے دو کے مقابلے میں آٹھ بچوں کی ٹیم کھڑی کر چکے ہیں۔ نواں عنقریب آنے والا ہے۔ دو کی کمی جلدی پوری کر کے ٹیم مکمل کر لیں گے یہ مجھے ہی نہیں بلکہ انھیں بھی امید ہے۔

کتابوں میں صابر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے یعنی روٹی اور دال میں خوش رہتا ہے۔ ما یا جال میں نہیں پھنستا۔ مرغ ماہی اور پلاؤ کی آرزو نہیں کرتا۔ جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا۔ صابر کی فضیلت بھی بہت زیادہ بیان کی گئی ہے صبر کے جال میں لوگوں کو پھنسانے کے لیے طرح طرح کے سبز باغ دکھائے گئے ہیں اور اس رشوت کی بھی پیش کش کی گئی ہے کہ صبر کا بدلہ ضرور ملتا ہے اور ایک کے بدلے سو ملتا ہے۔ لیکن کب ملتا ہے اس کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے اگر اس کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہوتی تو آج صابروں کی تعداد صفر کے کئی گنا ہو گئی ہوتی۔

ہو سکتا ہے پچھلے زمانے میں تعلیم کے فقدان اور فرسودہ تہذیب و تمدن کے طفیل ایک دو صابر ہوئے ہوں لیکن آج کل تو تعلیم عام ہے۔ تہذیب و تمدن بلندی کی چوٹی پر ہے۔ مشین کی ایجاد نے وقت کو انسان کا غلام بنا دیا ہے۔ آج کے مشینی دور میں ہر شخص چٹ منگنی پٹ بیاہ کا قائل ہے۔ انتظار کے کرب میں مبتلا ہونے کے بجائے چت یا پٹ کا فیصلہ فوراً کر لینا چاہتا ہے تیرہ ادھار سے نو نقد کو بہتر سمجھتا ہے کیونکہ ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

صبر کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس کی تعریف ہر شخص کرتا ہے لیکن خود صابر بننا کوئی نہیں چاہتا۔ جیسے رشوت کو ہر شخص برا کہتا ہے لیکن موقع ملنے پر رشوت لینے سے کوئی باز نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو وہی لوگ صبر کی تلقین کرتے ہیں جو خود بے صبر ہوتے ہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی دوسروں کو صبر کا درس دیتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اگر دوسروں نے صبر سے کام نہ لیا تو ان کی عظمت، دولت، ایمان داری یا پرہیزگاری کی ہانڈی بیچ چوراہے پر پھوٹ جائے گی۔ ویسے آج کل صبر کا درس دینا ایک فیشن بن چکا ہے۔

صبر کا مرتبہ مذہبی، اخلاقی یا سماجی نقطۂ نظر سے خواہ کتنا ہی بلند ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے طفیل ظلم کو اور زیادہ سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور حق داروں کا حق زیادہ سے زیادہ غصب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ صبر کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے فولاد کا جگر چاہیئے لیکن آج کل سارا فولاد تعمیری اشیاء اور تخریبی اسلحہ بنانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً فولاد کا جگر نہیں بن پاتا اور جب فولاد کا جگر ہی نہیں بن پاتا تو صبر کی عمارت بھی نہیں تعمیر ہو پاتی اس لیے آج ہر شخص بے صبر بن گیا ہے۔

صبر ایک اندیکھی قوت کا نام ہے۔ یہ بجھتے ہوئے چراغ کو امید کی روشنی عطا کرتا ہے۔ تیمار داروں کو اس خوشی میں مبتلا کرتا ہے کہ "بیمار کا حال اچھا ہے"، بھوکوں کے لیے "من و سلویٰ" کی امید ہے۔ کمزوروں اور بے سہاروں کا تانک ہے بیماروں کا مسیحا ہے۔ بیکاروں کے لیے ایمپلائمنٹ اکسچینج ہے۔ مفلسوں کی یہ امید ہے کہ اللہ کے یہاں

دیر ہے اندھیر نہیں" مظلوموں کے لیے یہ وہ لاٹھی ہے جس میں آواز نہیں ہوتی۔

دال میں نمک کی طرح ہر شخص کے اندر صبر کا مادّہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے اگر نہیں ہوتا تو ماں اپنے بیٹے کی موت پر رو رو کر خود بھی جاں بحق ہو جاتی۔ بہن بھائی کی موت پر تڑپ تڑپ کر خود بھی جان دے دیتی۔ اپنے عزیز شئے کی جدائی فردِ واحد بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ صبر کے طفیل نہ جانے کتنے انقلاب رونما ہونے سے قبل ہی دم توڑ دیتے ہیں اگر انسان کے اندر صبر کا مادّہ نہیں ہوتا تو فلک بوس عمارتیں نظر نہیں آتیں، پر غرور سر کا وجود نہیں ہوتا۔ ظالم اور مظلوم جیسے الفاظ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی لغت میں نہیں ملتے۔ یہ دنیا یک رنگی کا شکار ہوتی ہر شخص خود میں مگن ہوتا، کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوتا۔ کسی کو مدد کی طلب ہوتی نہ کوئی مددگار ہوتا۔ کوئی حاکم ہوتا اور نہ کوئی محکوم ہوتا۔ سبھی ایک کشتی پر سوار ہوتے۔ دُنیا کے حمام میں سبھی ننگے نظر آتے۔ پھر یہ دنیا، دنیا نہ ہو کر کچھ اور ہوتی۔ اگر سچ پوچھا جائے تو صبر کا وجود ہی دُنیا کے وجود کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود غرض اور دنیا پرست حضرات صبر کے نام سے اس طرح بھڑکتے ہیں جیسے چاندنی رات میں گھوڑا اپنے سائے سے بھڑکتا ہے اور دُنیا سے بیزار حضرات صبر کو اس طرح سینے سے لگائے رہتے ہیں جیسے کرسی پرست کرسی سے چپکے رہنا چاہتے ہیں۔

---

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف!
اور ہزاروں کی دل پسند چائے!!
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب!!!

ہیڈ آفس:۔
تیلگری ٹی ایمپوریم، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد اے پی، انڈیا۔

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (ڈونچی)

مجھے لیڈروں سے اُلفت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی
کسی مرحلے میں حاجت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی

تو لاکھ بن سنور کر میرے سامنے جو آئے
میرے دل میں تیری چاہت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی

میرے عشق کے سفر میں کبھی بھول کر بھی حائل
تیرے حسن کی تمازت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی

ہر وقت سر جھکا کر تیرا ہر ستم اُٹھایا
تیری ذات سے شکایت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی

تیری ہر ادا کا مارا، کیا ہر ستم گوارا
تجھے میری قدر و قیمت نہ ہوئی نہ ہے نہ ہوگی

میری صدی کے لوگ

مجیب الرحمٰن بزمی

قول و عمل سے دُور ہیں میری صدی کے لوگ
بغض دانا میں چور ہیں میری صدی کے لوگ

کرتے ہیں فعلِ بد یہ ترقی کی آڑ میں
کس درجہ بے قصور ہیں میری صدی کے لوگ

اخلاق اور خلوص سے جن کو نہیں غرض!
ایسے بھی کچھ ضرور ہیں میری صدی کے لوگ

غارت گری و قتل کا بازار گرم ہے!
انسانیت سے دُور ہیں میری صدی کے لوگ

بہتر معاشرہ کی نہیں ڈھونڈتے سبیل
کہتے مگر ضرور ہیں میری صدی کے لوگ

کینہ، حسد، نفاق کو دیتے ہیں یہ فروغ
کہنے کو ذی شعور ہیں میری صدی کے لوگ

پیروڈی

افروز عالم (بہار)

یکتا ہے بوتلوں میں خزانِ گراں ہمارا
بیحد دھنی وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہے جیب خالی پھر بھی محفل میں بیٹھے ہیں
یکتا ہے اپنے فن میں زورِ زباں ہمارا

غربت میں بھی ہے ٹی وی، اُٹھتے ہیں ہم ہلا میں
کیوں کر نہ ہو وطن پھر رشکِ جہاں ہمارا

ہم کیا ہیں یہ نہ دیکھو ہم کیا تھے یہ تو دیکھو
ساری زمیں ہماری سارا زماں ہمارا

کھاتا کھُلے گا جلدی اب بینک میں ہمارا
فرزند ہو گیا ہے بالکل جواں ہمارا

افروز کوئی مسٹر اپنی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو عشقِ نہاں ہمارا

غزل

محمد حنیف انصاری (بھیونڈی)

پاؤں گا اِتنا جہیز، ایسا تو اندازہ نہ تھا
میں تھا اک مجبور و بیکس، کوئی شہزادہ نہ تھا

ایک موٹر گاڑی بھی لائے گی، دلہن ساتھ میں
رکھ سکوں، اِتنا بڑا تو گھر کا دروازہ نہ تھا

چند سکوں کے لیے، ٹھکرا گئے وہ پیار کو
عمر بھر کی، عاشقی کا، یہ تو خمیازہ نہ تھا

قید سے اُن کی فرار ہوتے بھی کیسے؟ اے حنیف
ان کا گھر سب چھان مارا، چور دروازہ نہ تھا

غلام جیلانی
حیدرآباد

بیک لاگ

[ایک کھیل ——— تین سین میں]

افراد: شیام؛ شیلا؛ ماتا؛ پتا ——— (موہن، راجندر، انور، کیشو) شیام کے دوست

پہلا سین

[اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں شیلا کا کمرہ سجا وٹ ایسی کہ وہ سونے کا کمرہ بھی دکھائی دے سکتا ہے اور ساتھ ہی اسٹڈی روم بھی
شیلا میز کے پاس کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے۔ شیام دروازے میں داخل ہوتا ہے]!

شیام: شکریہ، آج آپ گھر پر مل گئیں، ورنہ آپ کو اپنی سہیلیوں سے فرصت ہی نہیں.

شیلا: (پلٹ کر) خوب!... وہ ایک ذرا کل شوبھا سے ملنے چلی گئی تھی. ورنہ میں تو گھر پر ہی رہتی ہوں.

شیام: دو دن سے چکر لگا رہا ہوں.... اور جناب کا پتہ ہی نہیں.

شیلا: مگر خیر تو ہے مسٹر شیام... بات کیا ہے جو اتنے پریشان تھے میرے لیے!

شیام: بات وات کیا ہوتی! بس یونہی ذرا... دیکھو شیلا تم سے باتیں کر لیتا ہوں نا، تو دماغ کو چین سا مل جاتا ہے. مگر... تمہارے یہاں آؤ تو.... پہلے تو موسی سے.. یعنی تمہاری ماتا جی سے ملو. ان کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر، چپکے سے کھسکو تو..... جناب کا پتہ نہیں. (رک کر) شیلا وہ، اصل میں... کل ہمارا RESULT...

شیلا: (بات کاٹ کر) اچھا!... اب میں سمجھی. کل آپ کا رزلٹ (result) آرہا ہے. ایسی پریشان کر رکھا ہے ہماشے کو! مگر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے. اس دفعہ تو آپ کے PAPERS اچھے ہوئے تھے نا؟

شیام: ہاں... آں... PAPERS تو اچھے ہی ہوئے تھے....

شیلا: UNEXPECTEDLY

شیام: ہاں UNEXPECTEDLY... مگر.....

شیلا: مگر کیا —؟

شیام: ابھی مجھے آخری سال کے آخری سمسٹر کے ساتھ ساتھ پچھلے سمسٹر کے بھی کچھ PAPERS دینے تھے.

شیلا: (حیران سی) جی —؟

شیام: جی. تم بے چاری کیا سمجھو گی ان باتوں کو! جتنا مشکل بی. ای پاس کرنا ہے، اتنا ہی مشکل ان سمسٹروں کے گورکھ دھندوں کو سمجھنا ہے۔ ذرا سی بھول چوک ہوئی کہ سر پر دو تین سمسٹر آدھمکے. جانتی ہو اس کا مطلب؟ اس کا مطلب ہے پانچ کی جگہ دس، اور دس کی جگہ پندرہ

PAPERS کا امتحان! ان سمسٹروں کے PAPERS کی تعداد
یوں بڑھتی جاتی ہے جیسے دمدار سیارے کی دم۔ (خود
ہی ہنستا ہے) وہ... (زور سے ہنستا ہے) وہ بے چارہ
رمیش...

شیلا: کیا ہوا اسے؟... اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے؟

شیام: POOR RAMESH... اسے تو یہ بھی یاد
نہیں تھا کہ وہ کون کون سے سمسٹر میں کون کون سے پرچے
میں فیل ہوا تھا! ایک دم وہ تین درجن پرچوں کی تیاری
کرنی تھی۔

شیلا: پھر کیا ہوا؟

شیام: پھر یہ ہوا کہ... ہمارے کالج کے امتحان جس
دن سے شروع ہوئے ہیں، وہ برابر کوئی نہ کوئی امتحان دے
رہا ہے۔ دو مہینے ہونے کو آئے ہیں، مگر وہ ابھی تک فری
نہیں ہوا۔ اور مجھے تو لگتا ہے، زندگی بھر فری نہیں ہوگا۔
(لہجہ بدل کر) خیر چھوڑو ان باتوں کو... شیلا مجھے فکر
RESULT کی نہیں ہے...

شیلا: پھر کاہے کی ہے؟

شیام: میں سوچتا ہوں، یہ پتا جی کو میرے انجینئر بن جانے
کی اتنی ضد کیوں ہے! وہ اتنے پڑھے لکھے، روشن خیال،
BROAD-MINDED آدمی ہیں، مگر اس بات پر بچوں
کی طرح اڑے ہوئے ہیں۔

شیلا: مگر ان کا کہنا بھی ٹھیک ہے۔

شیام: ٹھیک ہے؟... یہ بھی کوئی بات ہے کہ بغیر
بی ای پاس کئے شادی ہی نہیں ہو سکتی! گویا دنیا میں سارے
نوجوان شادی سے پہلے انجینئر بن جایا کرتے ہیں!

شیلا: مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو فیل ہوتے رہنے
کی عادت کیوں ہے! میں نے بھی پچھلے سال بی۔اے کا امتحان
دیا تھا اور پاس بھی ہو گئی۔

شیام: بھئی لڑکیوں کی بات اور ہے! انہیں تو پاس ہونا
ہی چاہیئے۔

شیلا: جی!

شیام: جی۔ انہیں کتابوں میں لگے رہنے کے سوا کام ہی
کیا ہوتا ہے! اور پھر... EXAM میں منہ سے نقل
بھی وہ کر سکتی ہیں... اس پر پاس نہ ہونگی تو کیا فیل ہونگی!
بلکہ میں نے تو سنا ہے انہیں سوالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں!

شیلا: (بگڑ کر) جی ہاں (طنزاً) انہی کی تو حکومت چلتی
ہے... یہ ساری جھوٹی باتیں وہ لوگ اڑاتے ہیں جو کبھی
STUDY نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ لڑکیاں ہوتی
ہی ذہین ہیں۔

شیام: اچھا بھئی معاف کرو۔ تم تو خواہ مخواہ برا مان گئیں۔
تم تو جانتی ہو، مختلف وقتوں میں میرے فیل ہونے کی وجہیں
بھی مختلف تھیں۔ کبھی ATTENDENCE پوری نہیں تھی،
کبھی سسشن مارکس بہت کم تھے۔ اور کبھی... تیاری ٹھیک
سے نہیں ہو سکی...

شیلا: (درمیان میں)... نقل ٹھیک سے نہیں کر سکے...

شیام: (بگڑ کر) خیر یونہی سہی، اور پھر پچھلی مرتبہ تو تم جانتی
ہو کہ پریکٹیکل کے ایک پرچے میں اگزامنر نے زبردستی مجھے
فیل کر دیا۔

شیلا: یہ میں نہیں مانتی... اگزامنر جان بوجھ کر کسی
کو فیل نہیں کرتے۔

شیام: ارے تم کیا جانو اگزامنر کسے کہتے ہیں!...
ملک الموت کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے انہیں دیکھ کر...
... یہ لوگ امتحان لینے نہیں بلکہ روح قبض کرنے آتے ہیں۔
(شیلا کچھ کہنا چاہتی ہے روک کر) نہیں، نہیں، تم ان کی حمایت
میں کچھ نہ کہو... تم نہیں سمجھ سکتیں... پچھلی مرتبہ
انہوں نے مجھے وہی EXPERIMENT چھانٹ کر دیا
جو مجھے نہیں آتا تھا۔

شیلا: جی ہاں! انہیں معلوم تھا...

شیام: (بات کاٹ کر، اپنی دھن میں)۔ اور جب میں نے
ادھر ادھر سے پوچھ کر جیسے تیسے کر کے ٹھیک ANSWER

بھی نکھٹو! لاؤ یہ صاحب پوچھنے لگے، یہ صحیح جواب
لیسے آگیا؟ تمہارا PROCEDURE تو غلط تھا!
شیلا: (ہنس کر) کسی واقعی اچھے اگزامنر سے سابقہ
پڑ گیا تھا آپ کا!... خیر، ان پرانی باتوں سے کیا حاصل!
اس مرتبہ تو آپ پاس ہو ہی جائیں گے.... ہے نا؟
شیام (رک رک کر) ہاں... ں،... دُعا کرو۔
شیلا: دُعا تو میں روز ہی مانگتی ہوں۔
شیام (خوش ہو کر) سچ؟ پھر تو میں ضرور پاس ہو جاؤں گا۔
.. ایک دم کلیر پاس... مجھے پورا یقین ہے۔
شیلا: تو پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟
شیام: پریشان؟... نہیں تو... میں تو صرف یہ
سوچ رہا تھا کہ پتا جی نے ہماری شادی میں یہ شرط کیوں...
شیلا: (بات کاٹ کر) پھر وہی بات... اب چھوڑیئے
بھی اسے... میرا دل کہہ رہا ہے اس دفعہ آپ ضرور پاس
ہو جائیں گے.... کل مٹھائی لے کر آیئے گا۔
شیام: ارے مٹھائی تو تمہیں اتنی کھلاؤں گا کہ عمر بھر منہ
میٹھا رہے۔ مگر کہیں وہ وقت بھی آئے!... (چونک کر)
ایسے ہوسی شاید ادھر آرہی ہیں... اچھا اب میں چلتا
ہوں... (پلٹ کر) شیلا... دعا کرتی رہو... سمجھیں!

دوسرا سین

[شیام کے گھر کا ایک کمرہ، پرانی اور نئی وضع سے سلیقہ
سے ساتھ سجا ہوا۔ شیام کی ماں تخت پر بیٹھی ہے اور
پتا جی آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہیں]
پتا: یہ شیام ابھی تک نہیں آیا؟.... (ماں خاموشی
سے پلٹ کر دیکھتی ہے، پھر پان لگانے میں مصروف ہو جاتی
ہے) RESULT تو اب تک لگ گیا ہوگا... مجھے تو
لگتا ہے، تمہارے لاڈلے اس سال بھی پاس نہیں ہوئے۔
ماتا: بھگوان کے لیے اس وقت تو ایسی بری فال منہ
سے مت نکالو۔ اس کا نتیجہ نکلنے والا ہے.... اور
یہ تم ہر وقت اسے میرا لاڈلا کیوں کہتے رہتے ہو؟ میں
اس کے ساتھ کونسا لاڈ پیار کرتی ہوں۔ دنیا اکلوتی اولاد
کے لیے کیا نہیں کرتی... کیسے چاؤ سے پالتی ہے
پوستی ہے، بیاہ کر کے ارمان پوری کرتی ہے۔
پتا: چپ رہو۔ تم نے شروع سے اس کی طرفداری
کر کے اسے بگاڑ دیا۔ ہاسٹل سے وقت بے وقت آ کر تم
سے جتنے روپے مانگے، تم نے مجھ سے چھپا کے دیدیئے۔
کالج کھلا ہوتا اور وہ کئی کئی دن یہاں رہتا، شیلا کے
یہاں ملنے جاتا رہتا... پھر بھی تم کچھ نہ کہتیں... نتیجہ
یہ کہ بی۔ اے کا چار سالہ کورس وہ آٹھ سال میں بھی پورا نہ
کر سکا۔ اور اگر اس کی... شادی بھی ہو جاتی تو بس کالج
کا نام بھی نہ لیتا....
ماتا: بس بس رہنے دو (بگڑ کر) ہر وقت اس کے
پیچھے پڑے رہتے ہو میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے باپ
دادا سدا کالجوں میں ہی پڑھتے آئے تھے؟... اور تم
نے ہی کونسے بڑے امتحان پاس کئے تھے شادی سے
پہلے؟... میں تو اب اس کی شادی کر کے ہی رہوں گی
چاہے فیل ہو یا پاس!
پتا: میں اپنے بھائی کی بچی کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا۔
ماتا: اوہو۔ بڑا خیال ہے تمہیں اپنے بھائی کی بچی کا!
... شیلا کو وہ لوگ کب تک گھر بٹھائے رکھیں گے...
بہت ہو چکا، میں خود جا کر تاریخ پکی کرتی ہوں، اتنی اچھی
بچی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔
پتا: اسی لیے تو میں کہتا ہوں شیام پہلے شیلا کے قابل تو
ہو جائے!
ماتا: کیوں جی؟ انجینیری پاس کر کے اسے نوکری تو کرنی
نہیں، بھگوان کا دیا سبھی کچھ ہے اس کے پاس۔ بیاہ کے
بعد اسے کسی کاروبار میں لگا دینا... پھر تم ان انجینیری
کی بات کا بتنگڑ بنا کر کیوں بیٹھے ہو؟... اور پھر وہ
کس لائق ہے۔ کیسی لاکھوں میں ایک ہے، اس کی فکر تو بیٹی والوں

کو ہونی چاہیئے ... (اُٹھ کر قریب آکر، رُکتے ہوئے)
... میرا بیٹا اب بھی لاکھوں میں ایک ہے،
پتا : (ہنستا ہے، بات کاٹ کر)، لاکھوں میں ایک !۔
ماتا : (ہنستے ہیں)، بس اب چُپ رہو، میں نے جو
سوچا تھا وہی ہوگا ... (رک کر) یہ شیام اب تک کیوں
نہیں آیا! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے ... (دروازہ کھلنے
کی آواز آتی ہے)
شیام : (آتے ہوئے): ماتا جی میں پاس ہوگیا۔
ماتا : شکر ہے بھگوان تیرا۔ میرے بچے کی محنت ٹھکانے
لگی۔
شیام : میں تو پہلے ہی کہتا تھا اس مرتبہ میرا پاس ہونا
یقینی ہے۔
پتا : مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم پاس ہو گئے۔
شیام : پتا جی، آپ تو بس ... یقین نہ ہو تو یہ دیکھ
لیجئے ... (RESULT کی فہرست کا کاغذ بڑھاتا ہے
جو پھٹ گیا ہے) ... لے ... یہ رہا میرا نمبر ایک سو تین ...
پتا : (حیران سا)، بھئی حیرت ہے۔ اگر تم پاس ہو گئے
تو اس سال شائد ہی کوئی فیل ہوا ہو!
ماتا : ائے ہے ... تم نے اپنی عمر میں کسی وقت بھی کوئی
سیدھی بات کی ہے؟ (شیام سے) ... تو کیہ لینے دے
بیٹا جوان کا جی چاہے، اور جا ... اپنے دوستوں کو شام
کی دعوت دے آ ... سب دوستوں کو۔ اور ہاں، اپنے
چچا کے یہاں بھی ضرور ہو آیا، کہنا شام کا کھانا یہیں کھائیں
سمجھا؟ ... (باہر کی طرف جاتے ہوئے) ارے منگلو ...
کہاں مرگیا؟ ... سارا انتظام کرنا ہے جھٹ پٹ ...
(چلی جاتی ہے، شیام اور پتا خاموش ایک دوسرے کو
دیکھتے رہتے ہیں)

تیسرا سین

(بڑے سے کمرے میں دعوت کا منظر، کوئی سات آٹھ
دوستوں کے ساتھ شیام میز اور کرسیوں پر بیٹھا کھا رہا

ہے ... چھری کانٹوں، پلیٹوں کی آوازیں، دونوں کا انتظام
میں لگے ہوئے ہیں۔ سب لوگ کھاتے ہوئے باتیں کرتے
اور ہنستے رہتے ہیں ۔)
موہن : راجندر ... ذرا وہ ڈش اِدھر تو بڑھانا ...
انور اکیلا ہی ختم کئے جا رہا ہے۔
انور : ارے لے یار ... مرا کیوں جا رہا ہے، ابھی بہت
کچھ ہے اس میں۔
راجندر : شیام۔ تم نے تو بڑی بھاری دعوت کر ڈالی۔
یاد نہیں پڑتا ایسی GRAND SCALE کی دعوت پچھلی
مرتبہ کس کے پاس ہونے کی خوشی میں کھائی تھی!
انور : تجھے کیوں یاد ہوگا؟ بس دعوتیں کھانا یاد رہتا
ہے، اور کچھ نہیں ... ارے چندر، بھول گیا راجیش
کی دعوت؟ ... جب دس سال میں اس نے بی۔ اے
COMPLETE کرلیا تھا؟
موہن : ہاں، ہاں ... ٹھیک ہے۔ مگر یار شیام کا معاملہ
الگ ہے۔
راجندر : ہاں بھئی ... شیام کا معاملہ ہی اور ہے ... اور
اسی لیے ہم دُعا مانگتے ہیں کہ بھگوان ایسے دن روز دکھائے۔
شیام : کیا مطلب ہے جناب کا؟
انور : مطلب یہ کہ بس فوراً شادی کر ڈالو، اور تم جانو شادی
کا دوسرا نام دعوت ہے، ادھر شادی ہوئی اُدھر دعوتوں
کا سلسلہ شروع ہوا ... آج دولھے والوں کے ہاں ڈنر
ہے تو کل ... دلہن والوں کے یہاں ...
موہن : پرسوں منے کی سالگرہ ہو رہی ہے ... (سب
ہنستے ہیں)۔
شیام : ارے بھئی وہ دن بھی جلد ہی آجائے گا، اطمینان
رکھو ... لو یہ میٹھا اور لو ...
انور : نہیں بھائی ... اب اور گنجائش نہیں ہے، بہت
کھا چکا ہوں۔
راجندر : شکر ہے، ایک تو کم ہوا ...

شیام : یار کیشو، تمہیں کیا ہو رہا ہے، کس سوچ میں بیٹھے ہو؟ ...

کیشو : (چہرے پر سنجیدگی) میں سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگ یہ دعوت کس خوشی میں کھا رہے ہیں!

شیام : خوب! گویا آپ کو معلوم ہی نہیں ہے!

کیشو : یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں، تم نے آخر یہ ڈھونگ کیوں رچایا ہے؟ ...

شیام : (گھبرا کر، آہستہ سے) ارے کم بخت، آہستہ بول، پتا جی سُن لیں گے ...

انور : مگر پاس تو تم ہو ہی گئے ہو، گھبراتے کیوں ہو؟

کیشو : گھبرائیں گے کیسے نہیں؟ پتاجی کو جو رول نمبر بتایا ہے وہ دوسرے سمسٹر کا ہے، پہلے سمسٹر کا جو بیک لاگ رہ گیا ہے، اس کا ذکر نہیں کیا ان سے ...؟

انور : کیشو، تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ... اس بیچارے کی شادی کے پیچھے پڑا ہے؟ ... اگر اس کے پتا کو پتہ چل گیا کہ وہ ابھی پاس نہیں ہوا ہے تو ...

شیام (بدحواس ہو کر) : ارے بھائی ... بند کرو اس قصّے کو .... [پتاجی اس دوران میں دروازے کے اندر آ کر کھڑے ہوتے ہیں]

پتا : گھبراؤ مت شیام ... اس قصّے کو بند مت کرو ... میں نے سب سُن لیا ہے۔

شیام (گھبرا کر) : پتاجی ــــ!

پتا : پہلے یہ بتاؤ یہ بیک لاگ کیا بلا ہے؟

شیام (آہستہ آہستہ) : پچھلے سمسٹر کے ... ایسے پرچے ... جن میں میں ... ابھی پاس نہیں ہوا ہوں .. (جلدی سے) مگر پتاجی مجھے پورا یقین ہے اس سمسٹر میں میرا اگریگیٹ فوراً آ گیا ہوگا ــــ

پتا : اگریگیٹ ــــ؟

شیام : جی ہاں۔ اس کا مطلب ہے مجھے پورا امتحان دینے کی ضرورت نہیں، صرف ان پرچوں میں بیٹھوں گا جن میں فیل ہوا ہوں ... ویسے آخری سمسٹر میں تو ...

پتا : (بات کاٹ کر) بس ــ اب آگے کچھ نہیں، آگے ... بیک لاگ ... آخری سمسٹر ... پہلا سمسٹر! پتہ نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو! مجھے اس سے کوئی سروکار بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تم فیل ہوئے ہو۔

شیام : نہیں پتاجی۔ میں پاس بھی ہوا ہوں۔

پتا : ٹھیک ہے۔ تم پاس بھی ہوئے ہو، اور فیل بھی ... اور اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی ہو گی بھی، اور نہیں بھی ... شیلا سے تمہاری صرف منگنی ہو گی ... اور جب تم وہ اپنا ... کیا نام ہے اس کا ... بیک لاگ، مکمل کر لو گے ... تو شادی کر دی جائے گی۔

شیام : (رندھی ہوئی آواز میں) : جی!؟

پتا جی : ــــ جی۔

[سارے دوست کھانے کی میز پر بیٹھے خاموش تکتے رہتے ہیں۔] ☐☐

جدید آہنگ کے منفرد شاعر
حمید الماس
کا نیا مجموعۂ کلام
برف شجر آواز
قیمت : تیس روپے
ناشر :
موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ گولا مارکٹ۔
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

منظوم لطیفے

جگت پرکاش ماتھر (جودھپور)

کون سالا ؟؟

فیصلے کے وقت قیدی زور سے چلّا اُٹھا
"دیکھتا ہوں، کون سالا ہے مجھے جو دے سزا"
جج نے جب تیوری چڑھا کر اس سے پوچھا کیا کہا؟
عرض کی یوں "کون سا لا" (LAW) ہے مجھے جو دے سزا؟

سلیم جہانگیر (چندراپور)

مُرغا

ایک دن مُلّا جی مُرغا ذبح جب کرنے لگے
بیوی بولی "ہائے ہائے! ذبح کیوں کرتے ہیں آپ؟"
بولے "دیتا ہے اذاں پڑھتا نہیں ہے یہ نماز
کُفر کی ڈرتا ہوں اس پر کوئی لگ جائے نہ چھاپ"

ووٹ

ایک صاحب کو الیکشن میں ملے کُل تین ووٹ
غصّہ ہو کر بیوی بولی آج میں سمجھی ہوں کھوٹ
دو تو ہم دونوں کے ہیں لیکن یہ جو ہے تیسرا
ہو نہ ہو ہوگا کسی کمبخت کلموہی کا ووٹ"

○

غزلیں

روشن لال روشن (بنارسی)

○

کچھ بھی نہ کہا جائے تو آزاد غزل کہہ
جب شعر نہ ہو پائے تو آزاد غزل کہہ
جب فکر کی راہوں میں ترا ذہنِ شکستہ
چلتے ہوئے لنگڑائے تو آزاد غزل کہہ
یا نہلہ غزل چھاپنے والا کوئی پرچہ
غزلیں تری ٹھکرائے تو آزاد غزل کہہ
کچھ فرق نہیں ڈِسکو د آزاد غزل میں
ڈسکو جو نہ کر پائے تو آزاد غزل کہہ
ویسے تو کوئی خاص ضرورت نہیں اس کی
روشن کی ہے یہ رائے تو آزاد غزل کہہ

مجید بیدار (اورنگ آباد)

○

بیوی کے ہو کے ماں سے جھگڑنے لگے ہیں وہ
پائے خُسر پہ ناک رگڑنے لگے ہیں وہ
دولت جہیز کی جو فری ہاتھ لگ گئی!
ہتھیا کے اس کو خوب اکڑنے لگے ہیں وہ
چوہے کی طرح ڈرتے رہے ساس سے مگر
کتّے کی طرح بھائی سے لڑنے لگے ہیں وہ
اپنا وجود کھو کے ہوئے شادماں مگر
شوہر بنے تو خود سے بھی لڑنے لگے ہیں وہ
دھوتے ہیں روز گھر میں وہ بیگم کی ساڑیاں!
بولا جو زن مُرید جھگڑنے لگے ہیں وہ!

ڈاکٹر مرزا انور بیگ (ممبئی)

مجمع لگا کر دوا بیچنے والے!

ہر مجمع لگا کر اپنی روزی کا پیدا کرنے والا یا تو لیڈر کو آتا ہے یا مداری کو۔ لیکن مجمع لگا کر دوا بیچنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ تاہم ہر مرض کی دوا بیچی بھی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ پول کھل جانے کا اندیشہ سو فیصد کا بڑھ جاتا ہے۔ البتہ طاقت کی دوا بیچنے میں کوئی خطرہ نہیں وہ اس لیے کہ طاقت کی دوا استعمال کرنے والا ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ دوا نقلی ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ طاقت کی دوا فروخت کرنے والے بہت کماتے ہیں۔

جنسی بیماری ایک ایسا مرض ہے کہ مریض کسی دوسرے شخص کو اپنی بیماری کے بارے میں بتلاتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ لیکن مجمع لگا کر دوا بیچنے والوں کے پاس جانے سے کبھی نہیں ہچکچاتا البتہ وہ دوا خریدتے وقت ذرا جلدی میں ہوتا ہے کیوں کہ اسے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی واقف کار دیکھ نہ لے۔ دوا بیچنے والا اپنے گاہکوں کی اس کمزوری سے خوب واقف رہتا ہے اس لیے منہ مانگے دام بھی طلب کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بندر یا ریچھ نچانے والا سارا دن شہر کے مختلف محلوں میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے حالانکہ بعض اوقات وہ بھی دوا بیچتا ہے۔ ہم نے بارہا ریچھ نچانے والوں کو اس کے بال یا ناخن بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔ لوگ بال اور ناخن کو متبرک سمجھ کر خرید لیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ان سے دنیا بھر کی بلاؤں سے انسان محفوظ رہتا ہے پھر بھی ریچھ یا بندر والا اتنا ہی پیسہ کما پاتا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی مہیا کر سکے کیونکہ ان کے مجمع میں زیادہ تعداد بچوں کی ہوتی ہے اور بچے ایسی تفریحات پر پیسہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ کھانے پینے کی اشیاء خریدنے کو ہی پیسے کا بہترین مصرف خیال کرتے ہیں۔

مجمع لگا کر کامیابی حاصل کرنے میں بڑی محنت کی ضرورت پڑتی ہے اور عوام کے سامنے کھڑے ہو کر بڑے بڑے مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عجیب و غریب انداز سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ

کرتے ہیں۔ ان کے پاس جب چالیس پچاس آدمیوں کا جمگھٹا ہوجاتا ہے تب وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور دواؤں کا اپنا میڈیکل اسٹور سے جو کہ چھوٹے بڑے سائز کے رنگ برنگ کے ڈبوں اور شیشوں میں بند ہوتا ہے اور ان میں خدا جانے کیا کیا بھرا ہوا ہوتا ہے نایاب دوائیں نکال کر تماشائیوں کو راغب کرلیتے ہیں اور اپنی تیار کردہ ان دواؤں کی صفات کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ گاہک جال لنسے میں آہی جاتے ہیں اور خریدنے کے بعد اسے آزمانے کی غرض سے فوراً وہاں سے روانہ بھی ہوجاتے ہیں لیکن یہ دوائیں کہاں تک کس مرض کا مداوا کرتی ہیں کسی گاہک نے آج تک اس سلسلے میں کوئی بات نہیں بتائی۔

مجمع لگاکر دوا بیچنے والوں میں اچھی خاصی تعداد سرمہ بیچنے والوں کی بھی ہے۔ بقول اُن کے سرمہ آنکھوں کی ہر بیماری کے لیے مفید ہے اور اس سے بینائی بھی تیز ہوتی ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اندھا بھی اسے لگالے تو اُسے دُور کی سوجھتی ہے۔ رہا ان کی اپنی آنکھوں کا معاملہ تو وہ اکثر گہرے رنگ کا چشمہ لگائے رہتے ہیں وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ دوسرے کی آنکھ میں سرمہ جھونکنے میں پہچان لئے جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔ اکثر سرمہ بیچنے والے باوقار نظر آتے ہیں ان کے سر پر ٹوپی بھی ہوتی ہے اور کسی مسجد کے سامنے مجمع لگاتے ہیں۔ ان کا جسم شیروانی سے آراستہ ہوتا ہے جس میں سرمے سے زیادہ گردگی ہوتی ہے یا پھر شیروانی ہی سُرمئی ہوتی ہے تاکہ خضاب آلود داڑھی سے میچ ہوجائے۔

مجمع لگاکر دوا بیچنے کا بزنس کرنے والے یوں تو ہر چھوٹے بڑے شہر میں مل جاتے ہیں۔ وہ اکثر کسی ریلوے اسٹیشن یا بس ڈپو کے پاس اپنی دوکانیں سجاتے ہیں لیکن شہر بمبئی میں یہ ہر جگہ نظر آتے ہیں کیونکہ اس شہر میں خریدنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بس ذرا "ہفتہ" کا انتظام پہلے کرنا پڑتا ہے پھر اس کے بعد جہاں جی چاہے دوکان سجایئے۔ لیکن اگر بڑا مجمع لگانا ہو تو آزاد میدان یا کراس میدان کا رُخ کرنا ہوگا۔ کراس میدان کی تو یہ خصوصیت ہے کہ ہر لمحہ لوگوں کے غول وہاں سے کراس کرتے رہتے ہیں اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک روز غالباً کچھ مہینے پہلے کی بات ہے کہ ہمارا گزر بھی وہاں سے ہوا۔ اس میدان کے ایک سرے پر ایک خان صاحب اپنی دوکان سجائے ہوئے بیٹھے تھے۔ سُرخ و سفید رنگ اور موٹے جسم کے اس افغانی پٹھان کے پاس مختلف شیشوں اور کانچ کے برتنوں میں عجیب و غریب شکل کی پہاڑی جڑی بوٹیاں تھیں اور چھوٹی بوتلوں میں رنگ برنگ کی موم نما چیز رکھی ہوئی تھی جسے وہ مختلف جانوروں کی چربی کہہ رہے تھے۔ ہر چند کہ وہاں کچھ لوگ جمع تھے لیکن ابھی مجمع والی بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک ساز بجانے لگ گئے تھے۔ اور وہ ساز بھی ایسا تھا جو بمبئی والوں کے لیے بالکل نیا تھا افغانستان کے علاقے میں شاید اسے چلغوزہ کہتے ہیں جس میں ایک ساتھ چار بانسریاں ہوتی ہیں جنھیں منہ میں رکھ کر بجایا جاتا ہے۔ ایک ساتھ چار بانسریاں بجانا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن خان صاحب اس میں بہت ماہر نظر آرہے تھے اور جو کچھ وہ بجا رہے تھے سُر میں تھا۔ اچھے سُر ہماری کمزوری ہیں لہٰذا ہم وہاں رُک گئے۔ چلغوزے پر بج رہی اس سُریلی دُھن میں بلا کی کشش تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی۔ اب خان صاحب نے ساز اُٹھا ایک طرف رکھ دیا اور کھڑے ہوگئے سب سے اپنا تعارف کروایا پھر اپنے ہاتھ میں ایک شیشی اُٹھائی اور ہانک لگائی۔ "آؤ آؤ اصلی سلاجیت کھاؤ اور صحت کا ٹکٹ کٹاؤ۔ ام پہاڑوں سے آیا اور پہاڑ کا پسینہ لایا اصلی سلاجیت لایا۔" بمبئی والوں کے لیے سلاجیت (شلاجیت) بالکل نیا نام تھا خود ہمارے لئے بھی

وہ کوئی جانی پہچانی شے نہیں تھی البتہ طب یونانی کی کتابوں میں یہ نام کہیں پڑھا تھا کہ سلاجیت جسمانی کمزوری اور ضعفِ باہ کے لیے بڑی پُراثر دوا ہے۔ یہ پہاڑوں سے نکلتی ہے اِسے پہاڑ کا پسینہ اس لیے کہتے ہیں کہ پہاڑوں کے اندر کی گرمی سے کھینچ کر پسینے کی شکل میں باہر آتی ہے۔

مجمع میں خاموشی تھی کچھ لوگ وہاں سے کھسکنے کی سوچ رہے تھے۔ خان صاحب اگر اپنے ساتھ سانڈے کا تیل لائے ہوتے تو اس کی کچھ شیشیاں ضرور بک جاتیں کیونکہ اس نام سے بمبئی کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔ خان صاحب برابر ہانک لگا رہے تھے۔ "امارا سلاجیت بڈھا کائے نوجوان کے ماپک چلے جوان کائے تو پٹھا پہلوان بنے اور ڈنڈ پیلے۔ یہ اصلی سلاجیت ہے جو شیر اور لنگور سے مقابلے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔"

لیکن اِن جملوں کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ عین ممکن تھا کہ مجمع چھٹ جاتا کہ خان صاحب نے پہلو بدلا شاید اُن کی دور بین آنکھوں نے بھانپ لیا تھا۔ اُنھوں نے وہ شیشی رکھ دی اور اپنی گدی پر بیٹھ گئے اور اپنے مونچھوں کی نوک درست کرنے لگے۔ پھر اپنی باسکٹ کی جیب سے ایک سُرخ رنگ کا ریشمی رومال نکالا اس کے ایک سرے پر ایک سُرخ رنگ کا پلاسٹک کا گولا باندھا پھر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو ایک طرف کرتے ہوئے کچھ پڑھا اور وہ گولا اُوپر اُچھال دیا اس کے ساتھ ہی وہ رومال بھی اُوپر گیا پھر رُومال کو نیچے گرتے ہوئے تو سب نے دیکھا لیکن وہ گولا واپس نہیں آیا۔ خان صاحب بولے "کیا سمجھے امارے پاس اس سے بھی بڑا جادو ہے۔ ہم جن اور بھوت کو بھی شیشی میں بند کر سکتا ہے اور جن کیا ہے ہم اس کے پیر کو بھی قابو میں کر لیتا ہے۔" پھر اُنھوں نے ایک چھوٹا سا ڈبہ اُٹھایا اور اس میں رکھی ہوئی باریک باریک قاشوں کی طرح کی کوئی شے نکالی اور اُسے ہاتھ میں لیکر سب کو بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ "یہ کوتے کا زبان ہے۔ گھر میں اگر لڑاکا بیوی ہے جو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا تو یہ کوتے کا زبان ہمیشہ اپنے پاس رکھو اور جب بیوی لڑنے لگے تو یہ زبان ہاتھ میں لے کر خود بھی بولنا شروع کر دو اس نیلی چھتری والے کے فضل سے آپ کا زبان ایسا تیز چلے گا کہ بیوی ہار مان جائے گا۔ اس کو چاہو تو تعویز بنا کر گلے میں ڈالو یا اپنے پرس میں رکھو مگر رکھو اپنے پاس ہی۔"

مجمع اب گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے لگ گیا تھا۔ کچھ لوگ اب بھی کانا پھوسی کر رہے تھے ان کے خیال میں وہ پلاسٹک کا گولا خان صاحب کی باسکیٹ کے جیب میں رہ گیا تھا لیکن کچھ کو اب بھی اس سُرخ گولے کے زمین پر گرنے کا انتظار تھا۔ خان صاحب کا یہ شعبدہ کارگر ثابت ہوا۔ شاید مجمع میں موجود سبھی لوگ اپنی بیویوں سے خوف زدہ تھے اس لیے پہلے کچھ نے بڑھ کر وہ قاش نما کوتے کی زبانیں خریدیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا مجمع اُن زبانوں کی خریداری میں مصروف ہو گیا۔

ہم اس مضمون کی آخری سطریں لکھ ہی رہے تھے کہ کھڑکی کے اُس پار ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کرتا نظر آیا گویا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ خان صاحب کا دعویٰ سراسر جھوٹا تھا ورنہ اب تک تو ہر کوا بے زبان ہو چکا ہوتا۔

شگوفہ کی سالانہ خریداری جنوری ۸۷ء سے ۴۵ روپے ہوگی!
وی پی کی صورت میں ۵۰ روپے!

غزل

غافل انصاری سنارپوری

یہ تو ہم ہیں جو نہیں لیتے ہیں خدمت کوئی　　ورنہ میدانِ سیاست میں ہیں خدام بہت
پیسہ تو ہر جگہ ملتا ہے گو محنت کے عوض　　نوکری میں ہے مگر خیر سے آرام بہت
جو تھکتی ہیں انھیں ملتی ہے جھڑکی گالی　　کام چوروں کو ملا کرتے ہیں انعام بہت

ہم نے ناکوں انھیں چبوا دیئے لوہے کے چنے
تنگ کرتے رہے غافلؔ کو جو حکام بہت

مولوی نہیں

ہم کیوں کریں غرور کہ ہم مولوی نہیں　　آئے بھی کیوں شعور کہ ہم مولوی نہیں
فطرت کے ہے خلاف کسی امرِ خاص کا　　ہو کس طرح ظہور کہ ہم مولوی نہیں
خواہ خامیاں ہزار سہی ہم میں اے جناب　　اتنا تو ہے ضرور کہ ہم مولوی نہیں
محفل میں ان کی میری ہو قابلِ قبول بات　　کیا کم ہے یہ قصور کہ ہم مولوی نہیں
طاقت کہاں حرام کو کر پائیں ہم حلال　　ہیں اتنے کب غیور کہ ہم مولوی نہیں
ہر چند ہم کو دین کی ابجد کا ہے پتہ　　باقی ہے پر فتور کہ ہم مولوی نہیں
ہم کو تو خود بھی رہتا ہے احساسِ کمتری　　کہہ تو دیا حضور کہ ہم مولوی نہیں
تاویل کے حقوق فقط مولوی کو ہیں !　　ہوں کیسے بے قصور کہ ہم مولوی نہیں

غافلؔ وہ جب سے ہو گئے پڑھ لکھ کے مولوی
رہتے ہیں دور دور کہ ہم مولوی نہیں

غزل

چکر نظام آبادی

میری کٹیا میں جس دن وہ مہمان تھے
کھٹملوں، مچھروں سے پریشان تھے

میرے محبوب کے گھر کے سب لوگ ہی
راستے کی ہمارے وہ چٹان تھے

میری چکر میں کوئی بھی آیا نہیں!
قرض لیکر ڈبونے کے ارمان تھے

فاروق شہاب
(قطب چھپرہ بہار)

ٹیڈی زمانہ

واہ واہ ! کیا ٹیڈی زمانہ آ لگا ہے۔ پہلے صرف ٹیڈی گرل ٹیڈی بوائے اور اُن پر ہنسنے والے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب تو آوے کا آوا ہی ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ پہلے لوگ آم کھا کر گٹھلیاں پھینک دیا کرتے تھے۔ مگر اب تو گٹھلیوں کے دام بھی وصول کئے جانے لگے۔ یعنی کھانے والے ایک دوسرے کو گٹھلیوں سے مارتے ہیں۔ کہ جس کے لگ جائے وہی دام بھی ادا کرے۔ گٹھلی نہ ہوئی چپت ہو گئی۔ یوں بھی مہنگائی ادا کرنے کو "چپت پڑنا" کہتے ہیں۔ مرزا غالب کو جب پیسے خرچ کرنے پڑ گئے تو انھوں نے بھی اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا "لو ایک اور چپت پڑ گئی"!

یہ زمانہ ایسا ہے کہ بلا دل لگائے کام نہیں بنتا۔ دل چاہے نہ لگائے جس کا دل مُردہ ہو چکا ہو ـــــ لیکن نئی زمانہ بیویوں کا نقشہ ہی کچھ عجیب ہے۔ ادھر کوئی تازہ ترین مانگ پوری نہیں ہوئی تو آنکھوں میں سمندر اُبلنے لگا اور آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔ اِن آنسوؤں میں تازہ ترین شاپنگ کی خواہشات چھپی ہوتی ہیں اِدھر شوہر صاحب نے آنسوؤں کے سامنے ہتھیار ڈالے اور آنسوؤں و غم کے بادلوں میں سے مطالبات کا چاند زبان کی نوک پر طلوع ہو گیا۔

یوں تو کپڑوں کی الماری، سنگھار میز۔ بیگم صاحبہ کا کمرے کا کمرہ ساڑیوں۔ کپڑوں۔ جوتوں۔ سامانِ آرائش سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ہے۔ ایسے ایسے ہائی ہیل کے امپورٹیڈ چپل جن کی ہیل پر کھڑا ہو کر راج مستری بلا سیڑھی کی مدد کے گھر کی مرمت تک کر سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہی رونا۔ کہ "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے"۔

خریداری اور فرمائشوں کے سلسلے میں ہمارا تجربہ ہے کہ شوہر چوہا خصلت ہوتے ہیں۔ اور بیویاں اگر شیر نہیں تو شیر کی خالہ بلی خصلت ضرور واقع ہوا کرتی ہیں کہ غُراتی بھی ہیں اور دُم بھی ہلاتی ہیں۔ مگر یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ بیویاں اچھی ہوتی ہیں یا شوہر۔ زمانہ نیا ضرور ہے مگر بقول ایک تجربہ کار شوہر کے آخر اسے چلا تو بیویاں ہی رہی ہیں۔

نئے زمانے میں شوہروں اور بیویوں میں شناخت آسان نہیں۔ میک اپ کے لیے عموماً بیویاں بلکہ خواتین بدنام ہیں۔ اکثر دکھنے والے اس خوف سے کہ آج کے کھاتے میں صرف ایک ہی مزدوری اور فاقے کا سامنا نہ کرنا پڑے

[illegible] باگ کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر نے فیشن کے شوہروں کو ہم نے باقاعدہ میک اپ اور کنگھی چوٹی کرتے دیکھا ہے۔ عموماً ٹیڈی شوہر زلفیں سنوارنے کے بعد ہونٹوں پہ لالی، گالوں پہ لالی، چہرے پر اسنو، کریم اور پوڈر لگا کر اس طرح اپنے چہرے کو ملتے رہتے ہیں جیسے کہ گھوڑے کو ملا دلا جاتا ہے۔ اور اچھا بھلا کالا کلوٹا دولہا بھی سانولا دکھائی دیتا ہے۔ یہ واقعہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ایسے ہی ایک نام نہاد شوہر، بیوی کے ساتھ شاپنگ اور ہوا خوری کے پروگرام سے تیار ہو رہے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ آئینہ بیگم کے پنجۂ قدرت میں تھا اُدھر وہ بگڑ رہی تھیں کہ۔ "جا کر رکشا لائیے!" عجلت اور گھبراہٹ میں صاحب بہادر نے بجائے ہونٹوں کے ناک کی پھنگی پر سُرخی مل لی۔ اب جو وہ گھر سے نکلے تو اِس نئے زمانے کے ٹیڈی شوہر کو جو ہرے رنگ کے سوٹ میں تھے۔ "کسی نوجوان نے جملہ چپکا دیا۔

"میم صاحب آج کل توتا پالے ہوئے ہیں۔" اب جو میم صاحب نے غور کیا تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ وہ رومال سے اپنی ناک کی پھنگی صاف کر رہے تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ کیا زمانہ آگیا ہے!

△▽

نامور مزاح نگار

نریندر لوتھر

کے

انشائیوں کا تازہ مجموعہ

الف تماشا

* قیمت: ۱۶ روپے * صفحات: ۱۷۴

* مطبوعہ زندہ دلانِ حیدرآباد

مختار یونس (مالیگاؤں)

"ڈیما قریشی"

میں جمہوریت ہوں میں نے عوام کی بھلائی اور دُھلائی کا ٹھیکہ لیا ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود اور معیشت آباد
رے دم سے ہے۔ انگریز مجھے ڈیماکریسی کہتے ہیں مگر میرا ذائقہ چکھنے والے مجھے "ڈیما قریشی" کہتے ہیں۔ میں ایسی
ریشی ہوں جس کا تعلق نہ قبیلۂ قریش سے ہے نہ قریشی برادری سے۔ میں جب حاکم بنتی ہوں تو دھیمے دھیمے ملک و
وم کی خوشحالی کی بوٹیاں بناتی ہوں اور ایوانوں کی منڈیر پر بیٹھے چیل کوؤں کو کھلا دیتی ہوں۔ بھونکنے والوں
ے آگے ہڈی پھینک دیتی ہوں لہٰذا وہ کباب میں ہڈی بننا بند کر دیتے ہیں اور ہڈی کے لیے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔
غریبوں کو سوالات اٹھانے پر لات ملتی ہے یا حوالات۔

جب کسی قوم کو الیکشن کا پریم روگ لگتا ہے تو ملک میں حلقۂ انتخاب کا جال بچھ جاتا ہے۔ بالغوں کو ووٹر بنایا جاتا ہے
ر ووٹروں کو بالغ بنایا جاتا ہے۔ عوام کے ہمدرد بلوں سے نکل نکل کر اُبل اُبل کر قوم کا ٹمپریچر بڑھاتے ہیں۔
ہامی مسائل، مخالفوں کے خصائل، اپنے فضائل اخبار و رسائل میں چھاپتے ہیں۔ عوام کو دھن دولت سے مائل و
ائل کرتے ہیں یا پھر دھونس دھمکی سے گھائل کرتے [illegible] تمام وسائل استعمال کرکے عوام کا آئل (تیل) نکال لیا جاتا ہے۔
ر ان کے ووٹوں کو فائل کر لیا جاتا ہے اس طرح اپنا مستقبل رائل (بادشاہی) کیا جاتا ہے۔

الیکشن کا چاند نظر آتے ہی سارا دیش سلاٹر ہاؤز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیڈر قریشی بن جاتے ہیں اور بھانت
ا چارہ ووٹروں کے آگے ڈالتے جاتے ہیں۔ الیکشنی منشور کے دانے ڈالتے ہیں۔ ایک قریشی دوسرے قریشی کے بھانڈے
وراہے پر پھوڑتا ہے اپنا [illegible] ووٹروں کو بکرا بنا دیتا ہے الیکشن کے زمانے میں تو ہمارے لیڈر راون
ا روپ دھار لیتے ہیں۔ عوام کو رام کرنے کے لیے کتنے راون لکشمی دیوی کا سہارا لیتے ہیں اور الیکشن ریکھا پھلانگ
ر ایوان میں گھس جاتے ہیں۔ کرسی کے لیے کبھی یہ آیا رام بنتے ہیں کبھی گیا رام اور آخر میں نیا رام! جی ہاں یہ نیا رام جمہوری
یودھیا میں پیدا ہوا کرتا ہے ور کرسینا تشکیل پاتی ہے۔ تب جلسے اور جلوس کا بازار گرم ہوتا ہے۔ ع

جلسہ کیا چیز ہے؟ جلوس کیا ہے؟

جب جلوس چلتے چلتے تھک کر بیٹھ جائے تو جلسہ بن جاتا ہے اور جب جلسہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور سڑکوں پر ناچنے

لگے تو جلوس بن جاتا ہے۔ جلوس اپنے قائد کے پیچھے پیچھے مخالفوں کی غیبت کرتا ہے اور زندہ باد، مُردہ باد کا باآواز بلند وِرد کرتا ہے۔ جلسہ میں قائد بیانِ ہٰذا [illegible] مخالفوں پر بہتان تراشتا ہے اور اپنا قصیدہ پڑھتا ہے۔

جمہوریت میں جلسہ اور جلوس الیکشن کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں جلسے اور جلوس کے کئی فائدے ہیں۔ عوام کو دھرنا دے کر بیٹھ جانے کی مشق ہوتی ہے ورکروں کو دری اور "پٹی" بچھانے کی تربیت حاصل ہوتی ہے دری اور پٹی بچھانے والے آنکھیں بچھانا بھی سیکھ لیتے ہیں۔ تقریریں اتنی گرم اور پُرجوش ہوتی ہیں کہ جلسہ گاہ میں آگ لگ جاتی ہے بعض اوقات پورا شہر اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے جلوس بھی بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ جلوس جتنا لمبا چوڑا ہوگا حکومت اتنا دبے گی جلوس کی لمبائی بڑھانے میں بچوں کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے نعرہ بازی کا فن فروغ پاتا ہے۔ نعرہ وہ "طرح مصرعہ" ہے جس پر اہلِ جلوس "جمہوری غزل" پڑھتے ہیں۔ جلوس میں شریک ہونے سے سست الوجود قوم پھرتیلی بنتی ہے۔ [illegible] سائن بورڈ اور جھنڈا لے کر چلنے سے ہاتھوں میں طاقت آتی ہے غرض جلسہ و جلوس "مقوئ قوم و ملک" ہوتے ہیں۔ جلسہ و جلوس میں ایڈمیشن فیس یا ڈونیشن کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ جلسہ و جلوس کے سپانسر اور کرتا دھرتا پارٹیاں بڑی دریا دل ہوتی ہیں۔ پبلک کو شرکت کی رغبت دلانے کے لیے وظیفہ اور اسکالرشپ دیتی ہیں۔ فی گھنٹہ یا فی دن کے حساب سے چائے پان کا ناشتہ دیا جاتا ہے۔

جمہوری حکومت میں ہاتھوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ہاتھ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جب اُٹھتے ہیں تو کبھی قانون بنتے ہیں کبھی عدم اعتماد کی تجویز پاس ہوتی ہے کبھی ہاتھا پائی ہونے لگتی ہے۔ لیڈروں کا قول ہے "ہر سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی معاملہ میں بیرونی ہاتھ ہوتا ہے"۔ یہ بیرونی ہاتھ بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے پورے ملک میں شرارتیں کرتا ہے یہ صرف خاص خاص لوگوں کو نظر آتا ہے عوام اس کے دیدار سے محروم ہوتے ہیں۔ اسے گرفتار کرنا یا ہتھکڑیاں پہنانا اور سزا دینا فی الحال ممکن نہیں۔

ایوانوں میں کوئی قانون دماغ کی بجائے "ہاتھ شماری" سے بنتا ہے نتیجہ ہاتھوں کی اکثریت اگر بلند نہ ہوں تو حکومت کی کرسی کی ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں اگر عدم اعتماد والے ہاتھ اکثریت میں اُٹھ جائیں تو کابینہ تابینا ہو جاتی ہے۔ منسٹر یتیم ہو جاتے ہیں سرکاری لوگ ترکاری ہو جاتے ہیں۔ یہ جمہوری ہاتھ اپنی مرضی سے اُٹھ نہیں سکتے کیوں کہ یہ کٹھ پتلی ہاتھ ہوتے ہیں پارٹی لیڈر کے ہاتھ میں ان ہاتھوں کی لگام ہوتی ہے۔

جمہوری نمائندہ اپنی مرضی سے عوامی مسائل پر زبان نہیں کھول سکتا۔ اس کے منہ پر پارٹی ڈسپلن کا تالا لگا ہوتا ہے اگر وہ ووٹروں کی حمایت میں بولے تو پارٹی ناراض ہو جاتی ہے اگر پارٹی کو خوش کرے تو ووٹر ناراض ہو جاتے ہیں اس لیے آج کا ایم ایل اے اور ایم پی ایوان میں گونگا بنا رہتا ہے۔ جب عوام اُسے پکارتے ہیں تو بہرا ہو جاتا ہے اور جب اس کے حلقہ میں دن دھاڑے انصاف کا خون ہوتا ہے تو اندھا بن جاتا ہے۔

جمہوریت کے دروازے ہر حرب زبان شہری کیلئے کھلے ہیں بشرطیکہ چرب زبانی ہو دماغ توڑ جوڑ والا ہو دل کالا اور دل دادہ ہو۔ اگر آپ خوددار ہیں آپ کی آنکھ کا پانی مرا نہیں ہے تو آپ ارسطو ہوں یا افلاطون آپ کو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینا پڑے گا جمہوری حلقۂ انتخاب [illegible]

راجندر سنگھ سروج (ہندی)

مترجم: کمالیکا پرشاد

کامیاب لیڈر بنئے

آج کل ہمارے ملک میں لیڈری کے میدان میں سب سے زیادہ گنجائش ہے اور اس کا میدان روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ہر میدان میں لیڈروں کا ہی بول بالا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لیڈر کا بیٹا لیڈر ہی کیوں بنتا؟ وہ جانتا ہے کہ جو اعزاز اس میں مل سکتا ہے، کرسی مل سکتی ہے وہ نوکری میں ممکن نہیں ہے۔ وہاں پر خوشامد کرنی پڑے گی اور یہاں خوشامد ہوگی۔ اور ملازمت اتنی آسانی سے ملتی بھی کہاں ہے؟ اس دھندے میں تو کام کرانے کی جو رقم ملے گی وہ الگ۔ گھر سے باہر تک ہر جگہ لیڈری کی دھوم رہتی ہے۔

کسی بھی دفتر میں جاکر دیکھ لیجئے۔ جو شخص یونین میں ذرا بھی کارگزار ہے وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ ادھر سے ادھر گھومتا ہے۔ چائے پیتا رہتا ہے، گپیں مارتا رہتا ہے۔ ایسا موضوع تلاش کرتا رہتا ہے جس سے ہڑتال، مظاہرہ، دھرنا اور نعرے بازی شروع کی جاسکے اور لیڈری کی دھاک جمائی جاسکے۔

گھر میں آپ کی آواز بیوی کے سامنے دب جاتی ہے۔ اس لیے آپ کی بیوی مذاکرتی ہے اور آپ؟ خیر جانے دیجئے اس موضوع کو۔ اگر آپ بھی ملازمت نہ ملنے کے سبب کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب ہیں اور لیڈری کے مزے دیکھ کر لیڈر بننے کے لیے کوشش کر رہے ہیں تو پھر درج ذیل نسخوں پر غور فرمائیں اور پھر ان کے سہارے کامیاب لیڈر بن کر اپنا اور اپنے خاندان کا اور عزیز و اقارب کو فائدہ پہنچائیں۔ کوٹھی، کار اور بنک میں کافی سے کچھ زیادہ دولت آپ کے پاس ہوئی تو پھر آپ کا لیڈر بننا بھی بے کار ہے۔ انھیں چیزوں کے لیے تو لوگ لیڈر بنتے ہیں۔ کامیاب لیڈر وہی ہے ان سب میں دوسروں سے آگے رہے اور اپنی زندگی کا حساب کتاب صحیح بنا سکے۔

سب سے پہلے آپ فاقہ کرنے کی مشق کیجئے کیوں کہ اس میں کامیاب ہونے کے لیے نئے نئے لیڈر کو بھوکا رہنا آنا چاہیے یا پھر آپ کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہو کہ آپ کو اس وقت تک کھلا سکیں جب تک آپ کامیاب لیڈر نہ بن جائیں۔

گھر میں اور باہر ہر وقت یعنی چوبیس گھنٹے آپ جھوٹ بولنے اور ڈینگ مارنے کی مشق کیجیے جس سے اس فن میں کوئی آپ کو نیچا نہ دکھا سکے۔ سبب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ لیڈر کو صرف دلاسا دینا ہوتا ہے۔ ایسے وقت اور

موقع دیکھ کر جھوٹ بولنا ہوتا ہے۔ جب اِتنا ہی کرنا ہے تو پھر اس میں پیچھے کیوں رہیں؟

ہر جگہ غلط کاموں کو کروانے پر دباؤ ڈالیں کیوں کہ صحیح کام کروانے کے لیے لیڈر کے پاس کوئی نہیں آتا غلط کام کروانے کے لیے آپ ہر طریقہ کام میں لائیں جس سے آپ کا یعنی جو آپ کے پاس آیا ہے اس کا کام ہوسکے۔ جہاں آپ نے ایک بار غلط کام کروانا شروع کیا نہیں کہ آپ کے پاس چمچے مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگیں گے یعنی آپ ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔

اُونچی آواز میں گالی دینے کی اور دوسروں کی گالیاں سننے کی اور چلّانے کی عادت ڈالیے جس سے دوسروں کی آواز دب جائے۔ ضرورت پڑنے پر آپ مارپیٹ کرنے پر بھی اُتر آئیں خواہ آپ کی صحت اِس کی اجازت نہ دیتی ہو۔ آپ کو تو بس اس سمت میں صرف کام شروع کرنا ہے۔ آپ کا اِشارہ پاتے ہی باقی کام تو آپ کے چمچے سنبھال لیں گے۔ پھر آپ اپنا کام کر کے انجام کی پروا نہ کریں اور وہاں سے رفوچکر ہوجائیں۔ ہر لیڈر یہی کرتا ہے۔ آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تاکہ آپ کہیں پٹ نہ جائیں۔

گھر کے سامنے کی سڑک، نالی بنوانے، صفائی کروانے، بجلی ٹھیک کروانے، پانی یا بجلی نہ آنے کے مستقل مسائل کو لے کر روز بروز بڑھتے ہوئے جرائم کو لے کر آپ آئے دن ضلع کلکٹر، پولیس کمشنر سے ملاقات کیجیے۔ میمورنڈم پہ میمورنڈم دیجیے، مظاہرہ کیجیے اور ضرورت ہو تو مرن برت، خودسوزی تک کی نوٹس دیجیے۔ ویسے عموماً اِس کی نوبت نہیں آئے گی۔ آپ کو اُمید دلا دی جائے گی بس یہ آپ کی جیت ہے۔ پھر دیکھیے روز ہی کسی نہ کسی بہانے سے آپ کا نام اخباروں میں آتا رہے گا۔ جگہ جگہ سے دعوت نامے ملیں گے۔

لیڈروں جیسا لباس پہننا شروع کر دیجیے اِس سے آپ زیادہ لیڈر نظر آئیں گے اور کئی لوگ سلام بھی کرنے لگیں گے۔ اِس کا اثر ہونا لازمی ہے۔ نتیجتاً آپ کی گردن اکڑنے لگے گی۔

کوئی حادثہ ہوجائے یا کوئی بات ہوجائے تو آپ موقع واردات پر پہنچ جائیں اور انتظامیہ اور سرکار کو جی بھر کر کوسیں۔ اِس سے آپ کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ صحافیوں کی چمچہ گری کیجیے۔ ان سے خوش گوار تعلقات قائم کریں۔ وہ آپ کی خبروں کو اپنے اخباروں میں شائع کریں گے۔

چندہ لینے اور پھر اُسے ہضم کرنے کی مشق بھی شروع کر دیں۔ اور نئی نئی رسید بکیں چھپوا کر اپنے پاس رکھیں۔ لیڈر بننے کے لیے چندہ ہضم کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔ اِس وصف کو جِلا دیے بغیر کوئی لیڈر نہ تو کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ ہی ترقی کرسکتا ہے۔ پارٹی کو چندہ دلوائیے اور اُسی چندے میں آپ اپنا بھی حساب بنا لیجیے جس سے بدہضمی نہ ہونے پائے۔ عام طور پہ پارٹی والے ہر رسید کا حساب نہیں مانگتے۔ پارٹی کے دفتر میں بھی آپ جیسے لوگ بیٹھے ہیں وہ بھی آپ جیسی حالت سے گزر چکے ہیں۔ وہ بھی آپ کی مشکلات کو سمجھتے ہیں۔

دو چار دن گھر سے غائب رہیے اور پھر آکر خبر اُڑا دیجیے کہ آپ راجدھانی گئے تھے۔ ضروری کام سے فوری بُلایا گیا تھا۔ اس سے پارٹی میں آپ کا وقار بڑھے گا۔ آپ کی اہمیت اور دبدبہ بھی بڑھے گا۔ اپنی تقاریر میں گاہے بگاہے اپنے چوٹی کے لیڈر کے تئیں اپنے غیر متزلزل ایقان کا اظہار کرتے رہیے۔ انھیں کامیاب بنانے اور ان کے ہاتھوں کو مضبوط بنانے کا عہد موقع بے موقع دہراتے رہیں۔

طلبا کے لیڈروں سے اور بدمعاشوں سے اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ قریبی بنائیے۔ اس کے لیے آپ

اِن کی ضمانتیں کروائیں، پولس سے بچائیں تاکہ وقت آنے پر ان سے توڑ پھوڑ اور بدنظمی پیدا کرنے کا کام لیا جاسکے۔ طلباء لیڈروں کے تعاون کے بغیر کوئی جلسہ یا میٹنگ کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ویسے دوسروں کے جلسوں کو ناکام بنانے کے لیے سڑے انڈے، ٹماٹر پھینکنے کے لیے بھی ان کا تعاون ضروری ہوتا ہے۔

دوسروں کو اُلّو بنانا اور اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہر لیڈر کا دینی فرض ہے۔ آپ کو بھی یہ فن آنا چاہیئے۔ اگر آپ اِس فن کے ماہر نہیں ہوسکتے تو بہتر یہی ہے کہ آپ لیڈر بننے کا خیال ترک کردیں۔ پھر آپ کچھ اور کام یا کاروبار کا انتخاب کریں۔ یہ میدان دوسروں کے لیے چھوڑ دیں۔

موقع پڑنے پر روپوش ہونے کا طریقہ بھی آنا چاہیئے۔ اِس کے لیے آپ برسرِ اقتدار پارٹی میں شامل ہوجائیں۔ اگر پہلے سے ہی اُسی پارٹی میں ہیں تو اسی میں رہیں۔ پھر کوئی آپ کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ برسرِاقتدار پارٹی میں ہونے سے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور آپ کی آواز کو سُنا جائے گا۔ آپ کے کام کردیئے جائیں گے خواہ مخالفین چلّاتے رہیں۔

پارٹی کے ارکانِ پارلیمان اور ارکانِ اسمبلی سے خوش گوار تعلقات بنائیے تاکہ وہ آپ کے کام آسکیں۔ اور آپ ان کے۔ جب وہ آپ کے علاقے میں آئیں تو آپ اِن کے شاندار استقبال کا انتظام کریں۔ کرائے کی بھیڑ جمع کریں تاکہ اِن پر اثر پڑے۔ پھر موقع ملتے ہی ان کی جڑیں کاٹنا شروع کردیں تبھی تو آپ کو موقع ملے گا۔

تعلیمی، مذہبی اور سماجی اداروں میں عمل دخل دیجئے تاکہ کہیں منتظم اور کہیں صدر بنا جاسکے۔ اگر عمل دخل میں کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں تو پھر بدعنوانی، اقربا نوازی کا نعرہ بلند کیجئے۔

جو آپ کی ذرا بھی تنقید کرے اُسے آپ اپنا دشمن خیال کریں۔ اُس سے انتقام لینے کے لیے اندر ہی اندر اس کی جڑیں کاٹیں تاکہ وہ اُبھر کر نہ آسکے۔ آپ کو موقع نہیں ملا تو پھر مخالف کو بھی نہیں ملنا چاہیئے۔ نہ آپ ہی کھا پائیں اور نہ ہی وہ کھا پائے۔

اِن نسخوں کو آزما کر نہ جانے کتنے ہی لیڈر آج نمبر ایک کے لیڈر بنے ہوئے ہیں اور موج کر رہے ہیں۔ اب آپ مزید تاخیر مت کیجئے۔ اسے کاٹ کر اپنے پاس رکھیئے اور صبح شام اسے پڑھتے رہیئے۔

اگر ان پر عمل کریں گے تو یقیناً آپ کامیاب ہوں گے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے۔ ناکام ہونے پر لیڈری چھوڑ کر دوسرا کام کریں۔ بے کار اس میں وقت برباد نہ کریں۔ کیوں کہ ایک بار اس کا چسکا لگنے پر کوئی دوسرا کام ہوگا ہی نہیں۔ افرادِ خاندان کو بھوکا نہ ماریں۔ اسی میں آپ کی اور آپ کے خاندان کی بھلائی ہے۔ بس اِن نسخوں پر عمل کرکے لیڈری کریں ــــ!

زندہ دلانِ حیدرآباد کی تازہ پیش کش :
ممتاز انشائیہ نگار
ڈاکٹر رشید موسوی
کے
بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ !!

کاغذی ہے پیرہن

قیمت : ۲۰ بیس روپے

* خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور
* صفحات : ۱۴۰ (ڈیمائی)

غزل

غالبؔ حیدرآبادی ——— (جلیل مانک پوری کی زمین میں)

"دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی"
دیدارِ تھانیدار سے لیکن سنبھل گئی

مثلِ رقیب اصل میں ابھرا تھا، تھانیدار
ایسی سمائی سر میں طبیعت نکل گئی

تھا کوتوال حضرتِ غالبؔ کا جو رقیب
بے وجہ اُس کی حضرتِ غالبؔ سے چل گئی

تھا اُن کا کوتوال رقیب اپنا تھانیدار
حسبِ مراتب ایسی ہی صورت نکل گئی

لاکپ میں دونوں ہی کو بہت آگیا مزا
دِل اپنا بہلا، اُس کی طبیعت بہل گئی

سیکھے تھے فارسی جو وہ اب بیچتے ہیں تیل
زیست اُن کی آج تیل میں تلہن میں تل گئی

جس کے سمائے سینگ وہیں جاکے پھنس گیا
جس کی جہاں بھی دال گلی اُس کی گل گئی

ہے شان اک فقط، گئیں اُن کی نوابیاں
رسّی کے بل وہیں رہے رسّی تو جل گئی

یہ عاشقوں کی قوم بھی ہے یوگیوں کی قوم
جو کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گئی

بچہ نہیں یہ قوم کہ گھٹنوں کے بل چلے
یہ ہر جگہ جہاں بھی گئی سر کے بل گئی

"گلیا میں گڑ کو پھوڑنے" والے ہیں اُن کے کام
میری اک ایک بات بیانگِ دُہل گئی

تاثیر ایک گونا ہے باہر کے مال میں
باہر کا مال کھایا تو ہیئت بدل گئی

سیکھے تھے سو ہنر تو کبھی غالبؔ آپ نے
آخر کتابت آپ کی قسمت میں ڈھل گئی

○

دو شعر

جوشؔ ہما

جوانی میں نہ جانے چھوکرے کیا گل کھلائیں گے
جو کم عمری میں پینے کے لیے گانجہ چلم نکلے

سُنا ہے شیخ جی کے گھر پہ جب مارا گیا چھاپہ
نشیلی گولیاں اور دیسی دارو کے ڈرم نکلے

خورشید ملک (شاہجہاں پور)

عشق، تاج محل، عشق

حضرت آدم کی اولادوں میں عشق کے جراثیم کچھ اس طرح خود بخود انجکٹ ہوگئے ہیں کہ ان سے آج تک گلوخلاصی حاصل نہیں ہوسکی ہے اور غالباً کرۂ ارض کے آخری دن تک بھی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ ویسے عشق بنیادی طور پر ہے کیا بلا؟ ناچیز کے ناقص خیال کے مطابق یہ محض مخالف جنسوں کے ایک دوسرے کی طرف مائل ہونے کی حماقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ننانوے فیصد عشق جنسی کشش کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں۔ اس حماقت کی جلد جلد میں اگر وصل ممکن ہو گیا تو جذبۂ عشق ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر محبوبہ نے لفٹ نہ ماری تو جذبۂ عشق میں تبدیلیٔ سرگرمی آتی جائے گی اور اس کی آہ و بکا میں تند رفتاری آئے گی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک محبوبہ ٹھینگا دکھاتی رہے گی۔ بسا اوقات عشق کا اختتام نہایت اندوہناک حادثہ پر ہوتا ہے یعنی دونوں کو شادی جیسی افتاد سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے۔ انجام کار برق رفتاری سے کئی بچے پیدا ہو جاتے ہیں اور جذبۂ عشق کا کچومر نکل جاتا ہے۔

یہ تو ہے ننانوے فیصد کا حال مگر ایک فیصد ایسے سرپھرے بھی ہوتے ہیں جو واقعتاً روگِ عشق کو اپنے جسم ناتواں سے لگا بیٹھتے ہیں۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا شمار بھی اسی زمرہ میں ہو سکتا ہے۔ ہے کوئی ایسا عاشق طلاقی جو اپنی اس محبوبہ سے عشق چالو رکھے جو پورے تیرہ عدد اس کی نسل کو آگے گھسیٹنے کے لیے پیدا کر چکنے کے بعد بھی اکتفا نہ کرے اور چودھویں عدد کی تیاری میں ہمہ تن گوش ہو؟ عاشق کے جذبۂ عشق کا بھرکس تو ویسے ہی نکل چکا ہوگا اور ساتھ ہی اسٹیمنا (STAMINA) ٹمین ہو چکا ہوگا، پھر وہ اس زرخیز محبوبہ سے عشق جاری رکھنے کی ہمت کہاں سے لائے گا؟ مگر شاہجہاں نے یہ حرکت نادیہ فرمائی اور علی الاعلان فرمائی۔ وہ کرتا بھی کیا؟ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اس وقت کوئی سوچتا بھی نہ تھا۔ اسی لیے ان طریقوں کی ایجاد بھی نہ ہوئی تھی۔ اعتراض والی یہ بات نہیں ہے کہ مثل بکری کے تیرہ اولادیں پیدا کرنے والی اور چودھویں کو پیدا کرنے کا ارادہ رکھنے والی وہ اپنی محبوبہ ممتاز محل سے عشق کیوں کرتا رہا بلکہ یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کی یاد میں تاج محل بنانے کی فضول خرچی کیوں کی؟ بھلا کوئی تک بھی ہے اس سرپھرے پن کا؟ اس کارِ سرپھری کو قابلِ تحسین بھی سمجھا جا سکتا تھا اگر اس نے خود اپنے دست خاص سے ایک پتھر بھی اس عمارت کی تعمیر کے دوران اٹھا کر لگایا ہوتا۔ پرائے فن اور پرائی محنت پر شاہجہاں کو داد کیوں دی جائے؟ اس کی تو صرف

دولت صرف ہوئی جس کی اس کے پاس افراط تھی۔ جس طرح تاج محل بنوا کر اس نے اپنی محبوبہ کی تشہیر کا مستقل انتظام کردیا، کیا اس کی زندگی میں بھی اسی طرح کھلے عام اس کی نمائش کرنے کی جسارت کرسکتا تھا؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اتنی زمین، اتنی دولت اور اتنا وقت فضول میں برباد کرنے کی بجائے وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی ٹھوس کام کرجاتا جس طرح کہ شیر شاہ سوری نے گرانڈ ٹرنک روڈ بنوا کر کیا!

خیر وہ تو تاج محل بنوا کر فنا فی اللہ ہوگیا مگر بھائی لوگوں کو دیکھو کہ اپنی علمی قابلیت کا ڈھنڈورہ پیٹنے کی غرض سے تاج محل پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر اصلیت جانے ہوئے بس شروع ہوگئے۔ شعراء حضرات نے کتنے ہی اشعار کا اخراج اس سلسلہ میں کیا۔ بیشتر نے تو اس کی تعریف میں قصیدے بگھارے ہیں، لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اکثریت سمجھداروں کی آج تک ہوئی ہی نہیں۔ توپ قسم کے شاعر سے لے کر معمولی طفلچہ قسم کے شاعر تک اس نعرہ سے آگے نہیں کئے جاسکتے۔ سب کے سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور محمود و ایاز میں تفریق کرنا مشکل ہے۔

ساحر لدھیانوی نے ایک زبردست نظم تاج محل پر لکھی ہے مگر افسوس کہ اس نظم کے لکھنے کا اصل مقصد ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ سوشلزم کے حامی ہونے کی وجہ سے ایک طرف تو وہ شہنشاہی نظام پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

؎ اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر ٭ ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہ بات کسی حد تک درست بھی محسوس ہوتی ہے مگر دوسری طرف وہ اپنے محبوب کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ تاج محل کے اطراف ان سے ملنے سے اجتناب کرے۔ سوال یہ ہے کہ وہ تو بمبئی کی سکونت اختیار کئے ہوئے تھے تو کیا وہ آگرہ میں عشق کیا کرتے تھے اور اپنے محبوب سے ملنے بذریعہ طیارہ وہاں آیا کرتے تھے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ آگرہ میں کسی کے قرضدار تھے جو ان کو تاج محل کے اطراف میں ہی قرض وصول کرنے کے لیے تلاش کیا کرتا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے ہی وہ اپنے محبوب کو کہیں دوسری جگہ ملنے کے لیے کہتے ہیں۔ بہرحال انھوں نے وہ نظم لکھ کر لافانی شہرت تو اختیار کرلی مگر ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے نظم تو تاج محل پر ہی کہی ہوگی مگر اپنے محبوب کو تاج محل ہوٹل بمبئی میں ملنے سے منع کیا ہوگا کیونکہ اس زمانہ میں تاج محل ہوٹل کے مصارف برداشت کرنا ان کے بس میں نہ رہا ہوگا۔

سحر شاہجہانپوری کی لن ترانی پر غور کیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

ہمت کے تو سلطاں تھے، طاقت ہوتی دولت ہوتی

شہروں شہروں عشق و وفا کے تاج محل بنوا دیتے ہم

معلوم نہیں ان حضرت کے کتنے محبوب ہیں جو وہ ہر شہر میں تاج محل تعمیر کرانے کی نیت رکھتے ہیں؟ ساتھ ہی سخت تعجب نیز افسوس کی بات ہے کہ ان کے سب محبوب بیک وقت مرنے والے ہیں یا عنقریب مستقبل میں مرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سب کی کھوپڑیوں میں یہ لالچ دخول کرگیا ہو کہ وہ بھی ممتاز محل کی طرح لافانی شہرت حاصل کرلیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب دولت، طاقت اور ہمت کسی اولادِ آدم کو اللہ میاں بخش دیں گے تو وہ اپنے محبوب (یا محبوبوں) کے لیے تاج محل بنوانے کی حماقت کیوں کرے گا؟ کیا وہ اپنی اولاد دل رشتہ داروں اور دوست احباب کو ایک سرے سے نظرانداز کردے گا؟ سحر شاہجہانپوری کے لیے ایک بہت مفید مشورہ ہے کہ اگر خدانخواستہ

وہ دولت اور طاقت یکجا کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو ان دونوں کی مدد سے اپنے ان گنت محبوبوں کو مرنے سے بچانے کی ہمت کریں اور ہمت کے سلطان ہونے کا دعوہ انہیں ہے ہی۔ اس طرح اگر وہ اپنی سعی میں کامیاب ہوگئے تو وہ اپنے محبوبوں کے ساتھ کافی عرصہ تک گلچھرے اُڑا سکتے ہیں۔

صبیحہ سنبل فرماتی ہیں ؎

کہہ رہا ہے صدیوں سے تاج کا حسین چہرہ :: فن اگر مکمل ہے بولتی ہیں تصویریں!

ذرا سوچنے کا مقام ہے کہ اگر تصویروں اور عمارتوں نے بولنا شروع کردیا تو بے چارے اولادِ آدم پر کیا بیتے گی؟ (بیویاں تو سر ہی پیٹ لیں گی) اس کو اس طرح سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کمرہ میں بیٹھے ہوئے سوچ رہے ہیں کہ آج دیر سے آنے پر بیوی سے کیا بہانہ تراشیں گے۔ یکایک سامنے دیوار پر ٹنگی مونالیزا کی تصویر میں حرکت پیدا ہو اور اس کی پراسرار مسکراہٹ کا مظاہرہ کرنے والے ہونٹ قدرے پھیل جائیں اور پھر وہ آپ کو آنکھ مار دے تو آپ پر کیا بیتے گی؟ اسی طرح فرض کیجئے کہ آپ تاج محل کے احاطہ میں چہل قدمی کر رہے ہیں اور اچانک ایک مینار جھک کر آپ کے کان میں سرگوشیانہ انداز میں ارشاد فرمائے، ہائے! کیسے مزاج ہیں؟ تو کیا آپ کا قلب دوسری حرکت کرنے کی پوزیشن میں رہ جائے گا؟ لہٰذا موصوفہ سے درخواست ہے کہ وہ تصویروں کو محض تصویریں ہی رہنے دیں۔ خواہ مخواہ ان کو بولنے کی سہولت دے کر ان کی خاموش اور پرسکون حیثیت میں ردّ و بدل کر کے انسانوں کے زمرہ میں لانے سے کیا فائدہ۔ بولتا ہوا انسان ہی کونسا بہت خوش ہے؟ رہ گیا فن کا سوال تو ان محترمہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کوئی بھی فن آج تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہر فن میں تبدریج ترقی ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر فنِ عشق کو ہی لے لیجئے۔ اس فن میں اولاد آدم اتنی ایڈوانس ہوگئی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو جھٹ پٹ پھانس کر اس سے شادی کر لیتی ہے اور بغیر خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں پر عمل کئے ہوئے کئی بچے پیدا کر کے اسے محبوب سے محض ہر وقت لڑنے والی بیوی بنا دیتی ہے۔

ذکر تاج محل کا چل رہا تھا۔ ایک شاعر ہیں راہیؔ شہابی۔ موصوف کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ایک انسان نے محبت کا سہارا لیکر :: ورقِ سنگ پہ تاریخ وفا لکھی ہے۔

اب کوئی ان سے پوچھے کہ کیا محض محبت کے سہارے پر تاج محل بنوانے کی فضول خرچی ممکن تھی؟ ویسے بھی شاہجہاں کوئی سنگ تراش نہیں تھا کہ پتھروں کو کاٹ کر ورق بناتا۔ (کیا آپ نے کبھی پتھر کا ورق دیکھا ہے؟) اور وفا کی خدانخواستہ اگر کوئی تاریخ ہوتی تو وہ لکھتا بھی۔ اس نے تو آیاتِ قرآن کھدوائی ہیں نہ کہ وفا کے بارے میں لچر بکواس۔

خیر۔ کوئی تاج محل کی تعریف میں قصیدے کہے یا اس پر طنز کرے مگر شاعروں کو حقیقت کے دامن کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ شاعر کی قوم عموماً بھولی ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ اپنی معشوقہ کے لیے محبوب کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ابتدائی درجات میں ماسٹر صاحبان یہ کہہ کر بچوں کو بہلا دیتے ہیں کہ محبوب خدا کے لیے استعمال ہوا ہے مگر سن شعور کو پہنچنے کے بعد مزید احمق بننے کی تاب نہیں ہے۔ کوئی شاعروں سے پوچھے کہ عشق کرتے ہو، اوپر سے شاعری بھی فرماتے ہو تو پھر بزدلی کا مظاہرہ کیوں؟ سینہ ٹھونک کر محبوبہ کا ذکر کرنا چاہیئے۔ محبوب لفظ دیکھ کر خواہ مخواہ شاعر کے ہم جنس ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ شاعر تو حقائق کی ترجمانی کرتا ہے مگر عشق کے معاملے میں گول مال کر کے دوسروں کو مغالطہ میں کیوں ڈالتا ہے؟!

بات عشق سے شروع ہوئی تھی۔ عشق کے جراثیم اولادِ آدم کو ورثہ میں ملے ہیں لہٰذا عشق کرنا اس کا پیدائشی حق ہے۔ مگر عشق شادی کے بعد کرنا چاہیئے۔ نہیں صاحب! بیوی سے عشق کرنے کا کون احمق مشورہ دے رہا ہے؟ بیوی تو ایسی گھر کی مرغی ہے جو چند برسوں بعد ساگ سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد آدمی کے اُوپر شرافت کا لیبل لگ جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تاک جھانک پر لڑکیوں کے باپ سنجیدگی سے غور نہیں کرتے ہیں۔ لہٰذا شادی کے بعد جہاں بھی، جب بھی اور جیسی بھی ملے بس شروع ہو جایئے مگر احتیاط لازم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود شروع ہو جائے آپ پہ — اپنی سینڈلوں کی مدد سے۔ ایک اور بھی احتیاط کرنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو آپ کو دوسری نوعیت کی افتاد کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ ایک صاحب کا عبرت ناک حشر ملاحظہ ہو۔ وہ اکثر اپنے احباب کے سامنے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

وصل تو ممکن ہوا مگر یہ مشکل ہو گئی
اس بت کافر کو شوق روز مرّہ ہو گیا

عشق ہو جانے کے بعد شاعری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر آپ کی شاعری میں حقیقت پسندی کی جھلک نمایاں طور پر نظر آنا چاہیئے۔ آپ کے شعر کا ہر لفظ سچائی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس میں ملامت، مبالغہ یا اُلٹا سیدھا کوئی بھی لفظ نہیں ہونا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ شعر عام فہم ہونا چاہیئے۔ او ہو — آپ مثال چاہتے ہیں۔ لیجئے مثال بھی حاضر ہے ؎

نہ وہ ہوتیں، نہ اُن کی والدہ، نہ عشق میرا
خدا دراز کرے عمر ان کی نانی کی —!

اُمید ہے کہ آپ اسی طرز کی شاعری عشق کرنے کے بعد شروع کریں گے اور اس طرح سچے عاشقوں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے اور شاعر بھی کہلانے لگیں گے۔ مگر خُدا کے لیے تاج محل بنوانے کے بارے میں نہ غور فرماتے لگیے گا۔

طنز و مزاح کے ایوان میں
گونجتی ہوئی نئی آواز!

مَاشاءاللہ

حلیمہ فردوس کی پہلی کتاب

قیمت:۔ ۱۵ روپے

پبلیشر:۔
پیش رفت پبلیشرز، مُسلم چوک، گلبرگہ

محمد رفیع انصاری (بھیونڈی)

مائیکروفون

مائیکروفون کی ایجاد ۱۸۸۸ء میں ہوئی اور آئندہ برس یعنی ۱۹۸۸ء میں اس ایجادِ ستم ایجاد کے سو سال پورے ہوجائیں گے۔

مائیکروفون کی اس پہلی صدی کے موقع پر ہم اپنے بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اس کی عمر دراز ہو اور یہ قیامت سے پہلے اسی طرح قیامت برپا کرتا رہے۔

ہمیں جن چیزوں نے متاثر کیا ان میں سے ایک اسٹیج اور دوسرا مائک ہے۔ اسٹیج اور مائک کا رشتہ بہت پرانا تو نہیں لیکن بہت گہرا ضرور ہے۔ ہمیں اس رشتے سے اپنا تعلق جوڑنے کی خواہش ابتدا ہی سے رہی ہے۔ پہلے پہل جب ہم نے اس کے قریب جاکر اور اس کے منہ سے اپنا منہ لگاکر "ہیلو" کہا تھا تو ہمیں جو خوشی نصیب ہوئی تھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے۔

بعض آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو مائک کی متحمل نہیں ہوتیں ایسی آوازوں کے مالک جب مائک کے روبرو ہوکر گویا ہوتے ہیں تو اُن کی گویائی کی تاب نہ لاکر مائک جلد ہی معذرت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ معذرت جب حاضرین کی سماعت سے گزرتی ہے تو اُن کی نگاہیں آپریٹر کو ڈھونڈھنے لگتی ہیں۔ اور بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی آواز مائک ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ مائک کے بغیر وہ اپنے احساسات و جذبات کا اظہار سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسی ہستیوں کو جب کسی میٹنگ، اجلاس یا پروگرام میں مدعو کیا جاتا ہے تو وہ منتظمین سے یہ ضرور دریافت کرلیتی ہیں کہ مائک کا بندوبست رہے گا یا نہیں۔

مائک کی اچھی بُری، اور چھوٹی بڑی کئی قسمیں ہیں۔ ایک مائک تو وہ ہوتا ہے جس کے پاس بولنے والے کو خود ہی چل کر جانا پڑتا ہے۔ ایک مائک وہ ہوتا ہے جو بولنے والوں کے تابع ہوتا ہے۔ اس کا استعمال اسٹیج پر وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں گاتے گاتے رقص کرنے کی بیماری ہوتی ہے۔ یہ دراصل اُن کے رقص و نغمہ کا ایک حصّہ ہوتا ہے اور اسے ہاتھ میں تھامے بغیر وہ یہ ناخوشگوار فریضہ ہرگز انجام نہیں دے سکتے۔ اس سلسلے میں مغربی پاپ سنگرس کا ذکر ضروری ہے جو اپنی بدزبانی اور بدعملی سے مائک کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں کہ الاماں! ویسے بھی یہ لوگ

سائنسی ایجادات کے ساتھ کون سا انسانی سلوک کرتے ہیں جو مائک کو بخشیں۔

ہمارے دوستوں میں ایک صاحب سیّد بھائی ہیں۔ سیّد بھائی کو مائک پر بولنے کا عارضہ ہے۔ وہ ہر اُس محفل میں جہاں مائک کا انتظام ہو پہنچ جاتے ہیں۔ اور جب انہیں دُور، نزدیک ایسا کوئی منظر نظر نہیں آتا تو خود ہی کسی تقریب کا بہانہ ڈھونڈھ کر اپنے علاقے میں مائک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی اس بے تکلفی کی وجہ سے گھر والوں کو بڑی تکلیف ہے۔ سب سے زیادہ اذّیت میں مُبتلا ان کی بیگم صاحبہ رہتی ہیں۔ چنانچہ سیّد بھائی جب کبھی غلطی سے باورچی خانہ میں داخل ہوتے ہیں تو بیگم صاحبہ کی تقریر شروع ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے عالم میں بھی سیّد بھائی کے حواس بجا رہتے ہیں اور وہ باورچی خانے سے کوئی پتیلی اُٹھا کر اور یہ نہ ہوئی تو بیلن ہی کو مائک سمجھ کر ہیلو ہیلو کرنے لگتے ہیں۔ سیّد بھائی جب دوستوں کے درمیان بولتے ہیں تو اُن کے دائیں ہاتھ کی مٹھی اُن کے منہ کے قریب ضرور ہوتی ہے اور اگر اُن کا یہ ہاتھ اِس قابل نہ ہو (یعنی کہیں معروف ہو) تو احباب میں سے کوئی اپنا ہاتھ بڑھا کر اِن کی مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔

مائک کے قد قامت کی مناسبت سے بولنے والے کے قد کی مطابقت از حد ضروری ہے۔ اِس سے ہمیشہ برابری کی سطح پر گفتگو کرنی چاہیئے۔ وہ اگر آپ سے پست یا بلند ہے تو دونوں صورتوں میں خطرناک ہو سکتا ہے۔

مائک کے سامنے کھڑے ہونے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ مائک سے اگر نظر چُرالی جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اِس سے منہ نہیں پھیرنا چاہیئے۔ ہمارے ایک شاعر دوست مرزا کی یہ عادت ہمیں بالکل پسند نہیں کہ جب وہ اسٹیج پر مائک کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ٹھیک رہتے ہیں لیکن جب شعر پڑھنے لگتے ہیں تو انہیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کہ ہر بار مصرعِ ثانی اپنی پُشت کی طرف منہ کر کے میرِ مشاعرہ کی جانب ہو کر پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے کلام کے باوجود وہ مشاعرہ میں ناکام رہتے ہیں۔ اُن کی اِس حرکت پر ہم نے کئی مرتبہ توجہ دلائی۔ مگر افسوس! دفورِ مسرّت میں اسٹیج پر پیچھے مُڑنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

اِس کے برخلاف میر صاحب کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ وہ ہمیشہ مائک کے روبرو کھڑے رہتے ہیں۔ چھینکتے بھی ہیں تو منہ الگ نہیں کرتے اور اُن کی چھینک دور، بہت دُور تک سُنائی دیتی ہے۔ چھینک جاری رکھتے ہوئے وہ الحمدللہ بھی کہے جاتے ہیں۔ کچھ سامعین یہ منظر دیکھ کر لا حول ولا... کہے بغیر نہیں رہتے۔

شور و غل کے اِس ماحول میں ہر جگہ یعنی خلوت، جلوت، سفر، حضر وغیرہ میں مائک کی ضرورت ہے اب تو ریلوے اسٹیشنوں پر مائیکروفون کے ذریعے لوگوں کو اطلاعات پہنچائی جا رہی ہیں۔ کچھ دنوں بعد ٹرینوں کے اندر بسوں کی ایک ایک نشست پر مائک لگ چکے ہوں گے۔ بلکہ گھروں تک میں مائک کا انتظام کرے گا جس کے ذریعہ نظم و ضبط اور صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کی جائے گی۔ جب دو دوست ملیں گے تو کچھ کہنے سُنے بغیر اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک عدد مائک ایک دوسرے کے حوالے کریں گے اور حال و احوال دریافت کر کے اپنی اپنی راہ لیں گے۔

مضامین صاف اور خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھے ہوں تو انتخاب و کتابت میں سہولت ہوگی۔ (ادارہ)

احمد جمال پاشا

حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما

حیدرآباد فرخندہ بنیاد اُردو کی ابتداء سے طنز و مزاح میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اُسکے قدیم تذکروں اَدبی گلدستوں اور رسائل میں، ہمیں تواتر کے ساتھ طنز و مزاح کے نمونے نظم و نثر میں ملتے ہیں۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی نگرانی پروفیسر مجاہد حسین رضوی ہکی سرپرستی اور سید مصطفےٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ کے عملی تعاون اور ڈاکٹر گیان چند جین کی حوصلہ افزائی سے انیسہ سلطانہ صاحبہ نے اپنی تازہ بہ تازہ تصنیف "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما" میں بڑے سلیقے، محنت اور جانسوزی سے طنز و مزاح کے بنیادی فن سے اور اس کی تکنیک سے بحث کی ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کا پہلا باب خاصا متوازن ہے کہ اِس میں انھوں نے خالص فنی بحث کی ہے جس سے اِس فن کے سمجھنے میں قاری کو اب کوئی خاص دشواری نہ محسوس ہوگی۔

دوسرے باب میں فاضل مصنفہ نے ۱۹۰۵ء سے پہلے حیدرآباد میں طنز و مزاح کی ابتداء اور ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔ اور حیدرآباد میں قدیم ترین طنز و مزاح کے نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ اور سید عبدالکریم قاذ کو سب سے پہلا مزاحیہ شاعر حیدرآباد کا قرار دیا ہے۔ اور نثر میں پہلا مزاح نگار فرحت اللہ بیگ کو قرار دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں، جلال الدین اشک۔ عصمت اللہ بیگ۔ ناصر۔ نذیر دہقانی۔ امجاد حسین کھٹا۔ قاضی زین الدین تمکین کاظمی۔ آصف جہاں بیگم شاکر مرزا شکور بیگ اور ابراہیم جلیس کے حالات انھوں نے بڑی محنت سے جمع کئے ہیں پھر ان ظریفوں کی فکر سے بڑی بے لاگ بحث کی ہے۔ انیسہ سلطانہ صاحبہ کے یہاں تنقید میں جو نکتہ سب سے پہلے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اپنے موضوع کے مواد پر پوری دسترس حاصل ہے۔ دوئم یہ اُسے بڑی کفایت سے استعمال کرنا جانتی ہیں تیسرے غالباً یہ ناموں اور شخصیات یا شخصی اثرات سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوتیں۔ سماجی زندگی میں تو یہ بات نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے مگر مصلحت وقت کا اسیر نہ ہونا۔ لٹریچر و ادب کو دائمی حیات عطا کرتی ہے۔ اور ایسے کاموں کی حیثیت مستقل اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔

چوں کہ میرا ڈی یا ریسرچ کے سلسلے میں میرا پالا انیسہ سلطانہ سے پڑ چکا ہے اس لیے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بے حد تلاش اور تجسس کا مادہ ہے۔ اور تحقیق کرانے والے کو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

مگر یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ اور ان کے حق میں تعریف ہے کہ یہ پہلے گہرائی تک جاتی ہیں پھر قلم اٹھاتی ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی ہیں۔ ایک نقاد اور محقق اور نقادیں اگر یہ خصوصیت ہو تو پھر اُسے ہم ہونہار قرار دے سکتے ہیں۔

تیسرے باب میں "دکنی شاعری" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علی میاں صاحب۔ سرور ڈنڈا۔ حمایت اللہ۔ ڈھکن رائچوری۔ سلیمان خطیب۔ گلی نلگنڈوی۔ اشرف خوندمیری کا جائزہ لے کر انہوں نے اردو ادب کے قارئین کو ایک بالکل نئے ذائقہ سے آشنا کرایا ہے۔ حیدرآباد یا آندھرا میں تو یہ مقبول شعرا رہیں گے مگر باہر کی دنیا کے لیے بھی اس شاعری میں لطف اندوز ہونے کا بہت کچھ مواد ہے جیسے سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب کی شاعری میں سلیمان خطیب تو سماجی بصیرت اور معاشرتی عکاسی میں سید محمد جعفری سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اور اردو کی مزاحیہ شاعری میں بھی نہایت درجہ محترم ہیں اور رہیں گے۔

چوتھے باب میں مزاحیہ نثر نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ برق آشیانوی۔ خواجہ عبدالغفور۔ اسحاق الیوبی۔ یوسف ناظم۔ مسیح انجم۔ اظہر افسر۔ پرویز یداللہ مہدی۔ ایم۔ اے حنان۔ ارشد علی خاں۔ لئیق صلاح۔ بھارت چند کھنہ۔ احسن علی مرزا۔ رشید قریشی۔ نریندر لوتھر۔ عاتق شاہ۔ مجتبیٰ حسین۔ ایم اے نعیم۔ رشید الدین۔ حبیب ضیاء کی شخصیت اور فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس فہرست میں ہندوستان کے تقریباً ساٹھ فیصد مزاح نگار آجاتے ہیں۔ اور کم از کم ایک درجن نامور مزاح نگار شامل ہیں۔ حیرت اور مسرت اس پر ہے کہ لئیق صلاح اور حبیب ضیاء اچھے اچھوں سے اچھا لکھتی ہیں ان کی ظرافت اور فن قابلِ توجہ ہے۔

پانچویں باب میں حیدرآباد کے مزاحیہ شعراء کے فکر و فن اور شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سرپٹ حیدرآبادی۔ اسمٰعیل ظریف۔ بگڑرائچوری۔ قادر حیدرآبادی۔ گڈبڑ حیدرآبادی۔ فیض الرحمٰن فیض۔ طالب خوندمیری۔ بوگس حیدرآبادی۔ برق آشیانوی۔ مسافر نلگنڈوی۔ گلیم میدکی۔ صبغۃ اللہ بھباٹ۔ محمد علی منگی ـــــ عظمت بھلاواں۔ مصطفیٰ علی بیگ۔ اور حفیظ خاں مذاق۔ ان مزاحیہ شعراء میں طالب خوندمیری۔ بوگس حیدرآبادی۔ برق آشیانوی اور مصطفیٰ علی بیگ کی شہرت حیدرآباد سے نکل کر اردو دنیائے ظرافت میں پھیل چکی ہے اور اب یہ کسی تعارف کی اردو دنیا میں ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ ان شعراء کے نمائندہ کلام نے بھی اس باب کی آرائش میں اضافہ کیا ہے۔

چھٹے باب میں مزاحیہ کالم نگاری کے عنوان سے قاضی عبدالغفور "پیام" حیدرآباد میں سربراہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ شاہد صدیقی اور مجتبیٰ حسین روزنامہ سیاست حیدرآباد میں شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

اس کے بعد مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" زندہ دلان حیدرآباد نے نکالا تو جس طرح اردو ادب میں سرسید تحریک رومانی تحریک۔ ادب لطیف تحریک۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی تحریک چلی اسی طرح ظرافت کی تحریک شگوفہ سے شروع ہوئی جس نے نئے مزاح نگار پیدا کئے اور اردو ادب کو قد آور مزاح نگار بخشے۔ اس کے مدیر سید مصطفیٰ کمال گھر بار چھوڑ کر اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

انیسہ سلطانہ نے حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما کا بڑے حسن و خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

مجھے توقع ہے کہ جہاں ان کی یہ کتاب حیدرآبادی ظرافت کے تعارف کا ہمیشہ ایک اچھا ذریعہ رہے گی۔ اور ہماری معلومات میں اضافے کا باعث ہوگی۔ وہاں جب بھی انہیں "اردو ادب میں پیروڈی کا ارتقاء" سے چھٹکارا

یلے تو وہ اردو ادب میں طنز و مزاح کی نشوونما پر بھی ایک کتاب ضرور لکھیں جس کے لیے میری ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی لائبریری اور مصنف کے مشورے ابھی سے حاضر ہیں ۔

مجھے یقین ہے کہ ظرافت میں دلچسپی رکھنے والے اہلِ نظر "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشوونما" کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے ۔ اہلِ ذوق داد دیں گے ۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی اور دوسرے ادارے مصنفہ کو اس کے واجب انعام و اعزاز سے نوازیں گے ۔ جس کی عمل ابتداء یہاں سے ہونی چاہیئے کہ آپ مصنفہ سے براہِ راست یا ادارہ شگوفہ حیدرآباد سے اِسے زیادہ سے زیادہ خرید کر پڑھیں اور اپنے قیمتی مشوروں سے مصنفہ کو براہِ راست نوازیں !

٭

ادارہ **شگوفہ** کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں !

کتاب	مصنف	صنف	قیمت
الف تماشہ	نریندر لوتھر	مضامین	۱۶ روپے
کیوڑے کا بَن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵ 〃
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۱۲ 〃
جاپان چلو	〃 〃 〃	سفرنامہ	۱۴ 〃
بالآخر	〃 〃 〃	مضامین	۱۴ 〃
تکلف برطرف	〃	〃	۱۴ 〃
قطع کلام	〃	〃	۱۲ 〃
البتہ	یوسف ناظم	〃	۱۰ 〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸ 〃
سنی سنائی	لئیق صلاح	〃	۱۰ 〃
مزاح لطیف	رشید قریشی	〃	۲۰ 〃
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	〃	۱۲ 〃
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	〃	۱۵ 〃
چنانچہ	مسیح انجم	〃	۱۲ 〃
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعہ کلام	۱۲ 〃
ماشاء اللہ	حلیمہ فردوس	مضامین	۱۵ 〃
کاغذی ہے پیرہن	رشید موسوی	〃	۲۰ 〃

طاہرہ محبوب

دھجیاں

"معصوم" :۔ ایک صاحب بلدیہ میں ملازم اپنے ایک دوست سے محکمہ بلدیہ کی غلاظت اور مچھروں کی کثرت کی شکایت کر رہے تھے۔ دوست بولے "محکمہ بلدیہ کیا کریگا؟ سارا قصور تو مچھروں کا ہے"۔ ان صاحب نے حیران ہوکر پوچھا "سارا قصور مچھروں کا کیا مطلب؟" دوست اطمینان سے بولے "ہاں! وہ فیملی پلاننگ ہی نہیں کرتے!"

"فیملی پلانر" (FAMILY PLANNER)

فیملی پلاننگ سنٹر میں کام کرنے والے ایک صاحب نے اپنی شادی کے بعد چھ سال تک فیملی پلاننگ کی۔ ساتویں سال انھیں باپ بننے کی خواہش ہوئی۔ یہ بھی خواہش تھی کہ پہلا لڑکا ہو۔ جیسے ہی نرس لیبر روم سے باہر آئی وہ بیتاب ہوکر آگے بڑھے اور نرس سے پوچھا "سسٹر! لڑکا ہے یا لڑکی؟" نرس بولی "ایک لڑکا اور دو لڑکیاں!"

"دریافت" :۔ ایک صاحب کی اکلوتی لڑکی کے لیے حیوانات کے ایک ڈاکٹر کا پیام آیا۔ مہر پدری سے مجبور ہوکر ان صاحب نے لڑکے کی تعلیم، خاندان، کردار، اخلاق و عادات گھر کا ماحول اور مزاج کے بارے میں اتنی چھان بین کی کہ کیا کوئی جاسوس کریگا۔ جب انکی تسلی ہوگئی تو انھوں نے اپنی لڑکی کی شادی ڈاکٹر سے کردی۔

شادی کے دن ڈاکٹر نے اپنی شریک حیات سے کہا "مجھے تو امید نہ تھی کہ ہماری شادی ہوگی۔ آپ کے والد صاحب نے دس ہزار لوگوں سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ شکر خدا کہ انھوں نے میرے بارے میں میرے مریضوں سے دریافت نہیں کیا۔!"

"احتیاط ضروری" :۔ ایک ڈاکٹر نے ٹیلی فون حاصل کرنے کیلئے یوں درخواست لکھی "میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اپنے مریضوں کے تعلق سے مجھے ہر وقت فون کی سخت ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے سنیرٹی لسٹ نہ دیکھی جائے بعد جلد از جلد مجھے فون الاٹ کیا جائے۔"

ٹیلی فون کے محکمہ نے تحقیقات کروائیں۔ پتہ چلا درخواست گزار حیوانات کے ڈاکٹر ہیں!

"خبردار" :۔ ایک کشمیری صاحب نے اپنے ایک عزیز میسوری دوست کو ان کی شادی پر کشمیری سوئیٹر اور ان کی شریک حیات کو کشمیری شال تحفے میں دی۔ میسوری دوست بولے۔

"اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟"

کشمیری دوست نے جواب دیا "اس میں تکلیف کی کیا بات ہے یارا! یارا! میری خوشی ہے ... بس!"

میسوری دوست بولے "خیر۔ اس بار تمہاری خوشی کی خاطر رکھ لیتا ہوں۔ مگر ... خبردار! آئندہ ایسی تکلیف نہ کرنا!"

غلطی :۔ ایک ادیب نے ایک خوش مزاج دوست کو اپنی مطبوعہ کتابیں تحفے میں بھیجیں اور ساتھ میں اپنے شہر کی مشہور مٹھائی بھی۔ دوست نے اپنے ادیب دوست کو شکریہ کا خط اس طرح لکھا "تم نے دونوں چیزیں میری پسندیدہ بھیجیں۔ مٹھائی پہلے کھالی اور کتابیں بعد میں پڑھیں۔ مگر کتابیں پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ غلطی کی۔ کتابیں پہلے پڑھنا چاہیئے تھا اور مٹھائی بعد میں کھانی چاہیئے تھی!"

"بائیکاٹ" :۔ محلے کے چند لڑکے جن کی عمریں دس تا پندرہ سال کے درمیان تھیں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کسی کھلاڑی کے آؤٹ ہونے کے سلسلے میں جھگڑا شروع ہوا۔ دونوں ٹیموں کے چند لڑکوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کیں۔ محلے کے ایک بزرگ ادھر سے گزر رہے تھے۔ گالیاں سن کر وہ رک گئے اور لڑکوں کو بلاکر کہا "جو بچہ زیادہ گالی دیگا اسکو ٹیم سے نکال دیں۔ اسکے ساتھ کوئی نہ کھیلے سب اسکا بائیکاٹ کریں"۔ ایک ہفتہ بعد ایک لڑکا ان بزرگ کے گھر گیا اور بولا "ان تمام لڑکوں نے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے اور خود سب مل کر کھیل رہے ہیں"۔ وہ بولے "گالیوں کی یہی سزا ہے"۔ لڑکے نے بات کاٹی "جی میں گالیاں نہیں دیتا۔ اسی لئے سب نے میرا بائیکاٹ کر دیا۔"

دوے کے خط ....(مراسلے)

مصطفیٰ کمال صاحب!

سب سے پہلے شگوفہ دی گریٹ کے ۱۹ سال مکمل کرلینے کی مُبارکباد قبول کیجئے۔ سالنامہ سے یہ رسالہ بیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ اتنے طویل عرصہ تک کسی اردو رسالہ اور وہ بھی مزاحیہ کا مسلسل شائع ہونا کسی معجزہ سے کم نہیں۔ کیونکہ چند سال قبل پاکستان کے ایک بڑے ایڈیٹر اور پبلشر نے (جو بیک وقت کئی رسالے کامیابی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں) اپنے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر میرے سامنے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ حیدرآباد سے کس طرح ایک مزاحیہ رسالہ پابندی سے نکل رہا ہے اور انھیں کس طرح مضامین مل جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ وہ صاحب (جو مزاح کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور خود بھی ہلکے پھلکے مضامین لکھتے ہیں) آج تک اپنے ادارہ سے کوئی مزاحیہ رسالہ نکالنے کی ہمت نہ کرسکے۔ بیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے شاید "شگوفہ" کے لئے اس سے بڑا COMPLIMENT اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

رشید الدین۔ حیدرآباد

شگوفہ کا سالنامہ دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے آپ نے ۱۹ سال مکمل کرلئے۔ طنز و مزاح کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ پرچہ خوبصورت ہے۔ سرورق معنیٰ خیز ہے۔ مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، مسیح انجم اور فیاض فیضی کے مضامین اچھے لگے۔ احمد جمال پاشا نے خوب لاجواب لکھا ہے۔ یوسف ناظم کا صدارتی خطبہ خوبصورت تنقیدی انداز کا انشائیہ ہے۔ ہند و پاک کے اہم مزاح نگاروں کو یکجا کرنے پر آپ کو مبارکباد۔

سلیم چشتی، بمبئی

محترمی مصطفیٰ کمال صاحب۔

گلہائے عقیدت۔

مجتبیٰ حسین کا "دنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ" میں غفورو کا کردار جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ [illegible] سادے اور اوٹ پٹانگ بکنے والے کردار ہر محلے اور گلی کوچوں میں کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے غفورو کے ذریعے ان اردو والوں پر بھی خوب طنز کیا ہے جو اپنی قابلیت جتانے کے لیے اردو کے مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی ثقیل زبان بولنے سے اردو کا مستقبل روشن ہوگا اور ان کی شخصیت "بڑی" کہلائے گی!

اس "سفرنامہ" میں خصوصاً غفورو کی "کتابی اردو" ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے، واقعی مجتبیٰ حسین نے ایک ایسا دلچسپ کردار ڈھونڈ نکالا ہے جو برسوں یاد رکھا جاسکے گا!

ضیاء جعفر، نجیب آباد

جناب مصطفیٰ کمال صاحب۔

شگوفہ کے سالنامہ پر جناب یوسف ناظم کا لکھا ہوا تبصرہ "سیاست" مورخہ ۱۶ فروری میں پڑھا۔ آپ نے اس پرچہ کو کمال عروج تک پہنچا دیا۔ اس کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تبصرہ نگار نے بہتر ہی اچھے انداز میں ترجمانی کی ہے اور یہ آپ ہی کا حق ہے کہ اس قدر مشکلات کے باوجود اس پرچے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں طنز و مزاح میں اس سے بڑھ کر کوئی پرچہ شاید ہی ہوگا۔

شاہ علی، حیدرآباد

شگوفہ اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی مسلسل تہنیت پر بخش کامیابیوں پر پُرخلوص مبارکباد۔ گذشتہ شمارے میں مالی سرخرو کے تحت عطاء الحق قاسمی اور عبداللہ حسین ڈار کی تخلیقات آپ کے حسنِ نظر کا ثبوت ہیں۔ لاہور کے سفرنامہ میں جناب قاسمی صاحب کا "نثری تجاہلِ عارفانہ" لاجواب ہے۔

مختار یوسفی صاحب سے زندہ دلان کی سالانہ تقاریب کی پوری تفصیل معلوم ہوچکی ہے۔ آپ حضرات کو خلوصِ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مزاحیہ ادب میں اس قدر ثابت قدمی کے ساتھ پیش قدمی کرتے [illegible] [illegible] قدمی کے ذریعے نہیں بہتر رفتاری کے ساتھ

الیاس صدیقی، [illegible]

محترم ڈاکٹر مصطفےٰ کمال صاحب

تسلیم و نیاز!

جنوری ۱۹۸۷ء کا تحفہ سالنامہ "شگوفہ" موصول ہوا۔ پڑھ کر جی خوش ہوگیا اور جب تک شگوفہ کا مطالعہ کرتا رہا دنیا کے غم و آلام سے آزاد رہا۔ سالنامہ کی تعریف کس طرح اور کیسے کروں۔ یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، لو جعفر صاحبان کے بارے میں کیا لکھوں۔ سورج کو چراغ ہی دکھانا ہے۔ مالِ مفت میں احمد جمال پاشاہ۔ رشید قریشی۔ سیح انجم بانو سرتاج اور عابد معز۔ صاحبان کی تخلیقات سے طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ سچ ہے شگوفہ ہمارے ملک کی آبرو ہے۔

الواس انصاری، رانچی

محترم ڈاکٹر کمال صاحب!

"شگوفہ" کا سالنامہ ماہ جنوری ۸۷ء کا نظر نواز ہوا یوں تو میں اس جریدے کا عرصہ سے قاری ہوں۔ یہ امر ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آپ روزِ اوّل سے ہی خوب سے خوب تر بنانے کی سعی پیہم میں منہمک ہیں اور اس سعی میں صد فیصد کامیابی بھی ملی ہے۔ جریدہ سر ورق سے لیکر آخری صفحہ تک خوب صورت دیدہ زیب کے علاوہ مقالے اور منظومات وقت اور ضرورت کے پیش نظر حقیقی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ جس کے لیے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ثانیاً ان مقالہ نگار حضرات کو کہ جو عصر حاضر کی صحیح صحیح عکاسی کر کے قارئین شگوفہ کو محظوظ فرما رہے ہیں۔

سالنامہ ماہ جنوری ۸۷ء کے شمارے میں پہلا مقالہ "ایک خطبۂ صدارت" یوسف ناظم بہت ہی عمدہ رہا علاوہ ازیں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا خاکہ مجتبیٰ حسین صاحب نے بہت اچھے پیرایے میں معلومات افزاء پیش فرمایا ہے جس کے لیے یہ دونوں حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کے بعد نمبر آتا ہے مالِ مفت کا۔ جن میں "دانش وری کی تلاش میں" سرمد جمال "لڑکیاں میرے شہر کی" فیاض احمد فیض۔ "میں شکرگزار ہوں" ڈاکٹر بانو سرتاج، "خودی کا سیڑھیاں" ڈاکٹر سلیمان عبداللہ۔ "آنکھیں ہماریاں" حلیمہ فردوس اور "کتے" ڈاکٹر رحمٰن صاحب وغیرہ بہت اچھے اسلوب بیان کے حامل انشائیے لگے۔ یہ حضرات قابلِ ستائش ہیں۔ حصّوں میں ظفر کمالی۔ اسمٰعیل ظریف صاحب اور بیدی سحر صاحب کے چند شعر عمدہ لگے برادرم خوندمیری کی نظم "ہمارے شہر میں" پوری نظم اچھی لگی مگر آخری تین بند بہت خوب ہیں احباب نے بھی ستائش کی۔

یہ تلخ حقیقت بھی عرض کر دینا اپنا منصبی فرض سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے جرید سے میں انھیں ادیبوں اور شاعروں کے نام دائمی اور مستقل طور پر پڑھتا آرہا ہوں کہ جن کا نام رسالے کے اردگرد چسپاں ہے۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے راقم کا ایک مقالہ اشاعت کے لیے منظوری دینے کے ساتھ ساتھ منی آرڈر فارم زر سالانہ کے لئے بھی ارسال فرمایا۔ آپ خود سمجھ لیں کہ راقم نے کیا جواب دیا ہوگا۔ افسوس کہ آج ادب کی خدمت غیر اخلاقی طور سے کی جارہی ہے۔ خدا آپ کی عمر کے ساتھ جریدہ کی عمر میں آفتِ ناگہانی سے بچا کر مداومت عطا فرمائے۔ رضوان انصاری

"شگوفہ" میرا پسندیدہ پرچہ ہے۔ اسے ہر ماہ خرید کر پڑھنا میرا محبوب مشغلہ بن گیا ہے! اسمیں طنز و مزاح کا بہترین ادبی مواد پڑھنے کو ملتا ہے۔ جو پژمردہ دلوں کو کلیوں کی طرح کھلا دیتا ہے۔ اس وقت اکتوبر ۸۶ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ نثری حصّے میں۔ یوسف ناظم اور عطاالحق قاسمی کے نوکِ قلم سے نکلی ہوئی تحریریں کافی پسند آئیں۔ اور منظومات میں حفیظ بنارسی۔ بھچڑ عادل آبادی اور رحمت بخاری مستحقِ داد ہیں۔ رفیق عثمانی بیودی بھی "شگوفہ" دیکھنے کو ملا بھئی واہ۔ اردو دشمنی کے اس دور میں طنز و مزاح سے بھرپور پرچہ آپ نکال رہے ہیں۔ بہت بہت مبارکباد۔

خورشید ملک، شاہجہاں پور

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ!

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد!

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اعبنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین الیٹ کمپنی لمیٹڈ
۴. ہارکوسری نگر ۵. کیکوکیننگ انڈسٹریز ٹرچور ۶. میڈو ناکینگ کمپنی
۷. چمپئن وہائٹ روٹس ۸. بیری سوئٹس اینڈ ٹافیس ۹. ڈرگ بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سیل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ!

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:

پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض ــــ حیدرآباد.

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

نہیں آتی تو یاد ... (یادِ رفتگاں)

چورن (منظومات)

چُندہ آسام ویلگری کے
باغات سے راست منگوائی چائے!
اسٹرانگ و خوش ذائقہ!!
آپ کے ذوق کے عین مطابق!!!

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد
یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ حیدرآباد
فون ۴۴۴۰۵۲۵

ڈلہن کی خوب صورتی کو نکھارنے کے لیے مَن پسند دوپٹہ!
ڈلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے
وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے۔ایچ۔زری والا

کا ہوگا۔

اس کے علاوہ
ہمارے شوروم کا کیثر اسٹاک

• بنارسی سلک ساڑیاں • تنچوی • ساٹن • جاجٹ
• آرگنزا • ٹشو • شفان • پٹولہ • بروکیڈ • دھرماورم • کانچی ورم • پوچم پلّی • نارائن پیٹھ
• میسور کریپ • ایمبرائیڈری ، اور ڈریس میٹریل۔

خصوصی کاونٹر میاچنگ کے لیے بلوز، دوپٹہ، کرتے اور فالس
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے۔ایچ۔زری والا لاڈ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
فون: 525232 کیبل "زری والا"

اُردو میں خط لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ پتہ بھی اُردو ہی میں لکھا کریں۔ یقین ہے کہ خط بلا تاخیر اور وقت پر ہی پہنچے گا۔

قلندر رضوی
سکریٹری تنظیم "رضا انعامات"
عطاء ازہری بک ایجنسی کمہار محلہ ہبلی ۲۸

عطاء الحق قاسمی (پاکستان)

(آخری قسط)

ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

خوشگوار سفر: دریں اثنا ہم اسلام آباد کی فضائی حدود میں داخل ہو گئے تھے، انہی ہچکولوں کے درمیان اعلان کیا گیا "ہم تھوڑی دیر بعد اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ امید ہے ہمارے ساتھ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔" اس پر میرے ہم سفر نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا اور کہا "یہ روٹین کا اعلان ہے، اس کا برا نہ ماننا!"

اسپورٹسمین سپرٹ: میں چند روز کے لیے جس گھر میں قیام پذیر تھا اس کے بالکل سامنے ایک مسجد تھی جس کے ایک مینار پر چار لاؤڈ سپیکر فٹ تھے۔ ایک روز رات کو یہاں کوئی جلسہ تھا جس میں مقررین کی گونج دار آوازوں سے سارا علاقہ لرز رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور جب نیند آئی تو یہ جلسہ دیکھنے کے لیے مسجد میں داخل ہو گیا تاکہ اپنے سفرنامے میں اس پہلو کا احاطہ بھی کر سکوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک مقرر نہایت پُرجوش انداز میں تقریر کر رہے تھے اور ان کے اردگرد پانچ چھ لوگ بیٹھے سر دھن رہے تھے۔ میں نے ان سامعین میں سے ایک سے پوچھا کہ یہ مقرر کون صاحب ہیں اور آپ کون لوگ ہیں۔ اس نے کہا: "خوش نصیب مقرر کا نام علامہ ہے جو ایک گھنٹے سے تقریر کر رہا ہے اور ہم وہ ہیں جنھوں نے ابھی تقریر کرنی ہے۔ بس اب باری آیا ہی چاہتی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔"

زندہ دل لوگ: میں ایک روز بازار میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ لوگوں نے ایک شخص کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کر رکھا تھا اور شہر کے بچے اس کے پیچھے پیچھے شور مچاتے جا رہے تھے۔ گدھے پر سوار شخص خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنا کیمرہ درست کیا اور تصویر کھینچنے کے لیے جھکا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ گدھے پر سوار شخص کے چہرے پر پریشانی غائب ہو گئی ہے، چنانچہ اس نے اپنا پوز درست کرنے کے لیے یک دم اپنی گردن اونچی کی اور پھر مسکرانے لگا۔ میں نے فوراً تصویر اتاری اور وہاں سے چلنے ہی کو تھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے کہا "گدھے پر سوار شخص نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور فرمائش کی ہے کہ اس تصویر کی ایک کاپی اسے ضرور دیں۔" میں نے اس سے پتہ حاصل کیا اور پھر [illegible]

معاملہ کیا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ چند روز پیشتر ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ آج یہ محلے والوں کے قابو آیا ہے۔ انھوں نے اسے سزا دینے کے لیے منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دیا ہے اور اب اسے تھانے لے جا رہے ہیں۔

سراسر ناانصافی: یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگلے ہی روز میں نے پھر یہی منظر دیکھا۔ اس بار ایک شخص گھوڑے پر سوار تھا، تاہم اس نے اپنا منہ ریشمی رومال سے ڈھانپا ہوا تھا اور بہت سے بچے شور مچاتے ہوئے اس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان بچوں کے ساتھ مختلف عمروں کے لوگ بھی تھے۔ علاوہ ازیں گھوڑے کے آگے آگے ایک شخص ڈھول بجا رہا تھا اور کچھ دوسرے لوگ مختلف ساز بجا رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے ایک بہت بڑے باجے کو بغل ماری ہوئی تھی اور اس میں سے انتہائی خوفناک آواز نکلتا تھا۔ غالباً یہ آواز گھوڑے پر سوار شخص کو خصوصی اذیت دینے کے لیے تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص معاشرے میں قدرے برتر مقام کا حامل ہوگا۔ تبھی اسے گدھے کے بجائے گھوڑے پر سوار کیا گیا ہے، نیز اسے یہ سہولت دی گئی ہے کہ وہ اپنا منہ ریشمی رومال سے ڈھانپ لے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ایک جیسے جرم پر دو طرح کی سزائیں دینا عدل کے اصولوں کے منافی ہے اور یوں میرے نزدیک یہ فعل سراسر ناانصافی کے زمرے میں آتا ہے۔ اہلِ پاکستان کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

معذور افراد: لاہور میں مجھے ایک خاصی تعداد معذور لوگوں کی نظر آئی جس پر مجھے بہت دکھ ہوا۔ لگتا ہے حفظانِ صحت کا محکمہ اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے رہا ہے۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اس کا اثر پھلوں پر بھی ہونے لگا ہے۔ چنانچہ میں نے یہاں ایک آم دیکھا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ لنگڑا آم ہے۔ میں نے تجربے کے طور پر اسے کھا کر دیکھا تو بے حد لذیذ پایا۔ میں نے سوچا ابھی یہ آم لنگڑا ہے اور یہ عالم ہے۔ اگر یہ لنگڑا نہ ہوتا تو خدا جانے کس قدر لذیذ ہوتا؟

اہلِ فن کی بے قدری: لاہور کی سڑکوں پر قسمت کا حال بتانے والے، بندر نچانے والے اور جادو کے کمالات دکھانے والے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ میں یہاں کے ایک مشہور بازار بیڈن روڈ سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک ریڑھی کے گرد چند لوگ کھڑے دیکھے وہاں ایک جادوگر کھلی فضا میں اپنے کمالات دکھا رہا تھا اور اس نے لمبے بازوؤں والا چوغا بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا کہ اس جادوگر نے مٹی کے ایک برتن کو تین چار مرتبہ ہلایا اور پھر اس پر سے ہاتھ اٹھایا تو ایک موسمی پھل جو غالباً جامن تھا، کثیر مقدار میں اس مٹی کے برتن میں سے برآمد ہوا جو اس نے وہاں کھڑے لوگوں میں بانٹ دیا۔ یہ جادوگر بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ باکمال شخص یورپ میں ہوتا تو یقیناً لاکھوں میں کھیلتا۔

بے مثال خطیب: اہلِ فن کی ناقدری کی صرف یہی ایک مثال نہیں، بلکہ میں نے لاہور کے قیام کے دوران ایسے بہت سے واقعات کا مشاہدہ کیا۔ مثلاً میں ایک روز گھر سے نکلا تو باہر سڑک پر ایک بے مثال خطیب ایک بڑے مجمع کو خطاب کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں اتنا سحر تھا کہ لوگ بت بنے کھڑے تھے۔ میں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر تقریباً پانچ گھنٹے کے بعد واپس اسی جگہ آیا۔ یہ خطیب اسی طرح شعلہ فشانی میں مشغول تھا اور لوگ اسی محویت کے عالم میں اس کی تقریر سن رہے تھے۔ مجھے ایک شخص نے بتایا کہ یہ خطیب مقوی ادویات بیچ کر اپنا گزارا کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال یقیناً افسوسناک ہے۔

مونچھیں: پاکستان میں مونچھیں رکھنے کا رواج عام ہے۔ بیشتر نوجوانوں کے چہروں پر مونچھیں بھی ہوتی ہیں۔ جو انھیں اچھی لگتی ہیں، ان کی دیکھا دیکھی تو کئی لڑکیاں بھی مونچھیں رکھنے لگی ہیں۔ اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔

زندہ دلانِ لاہور: لاہور میں فوٹو سٹیٹ اور وزن ظاہر کرنے والی مشینیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ مجھے کسی دستاویز کی فوٹو سٹیٹ کرانے کی ضرورت تو محسوس نہ ہوئی۔ البتہ انارکلی میں سے گزرتے ہوئے ایک روز میں وزن کرانے کے لیے یوں ہی ایک جگہ رک گیا۔ وزن کیا تو ایکسو تیس پونڈ نکلا۔ اس پر مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ ان کے برابر بیٹھے ہوئے ایک اور شخص کی مشین سے وزن کیا تو اب کے ڈھائی سو پونڈ تھا۔ جس پر میرا دل دھک سے رہ گیا، مگر پھر ایک اور مشین والے نے وزن کی سوئی اوپر نیچے ہوتی دیکھی تو مجھے تسلی دی اور کہا، "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل زندہ دلانِ لاہور بہت جذباتی واقع ہوئے ہیں؛ چنانچہ ان کا وزن ذرا سی بات پر بڑھ جاتا ہے، ذرا سی بات پر گھٹ جاتا ہے۔ یہ اس شہر کا خاصا ہے۔ آپ اپنے سفارت خانے سے اپنا وزن کرائیں۔ یہ مشینیں تو مقامی لوگوں کے لیے ہیں۔"

□□

مظہر فلمز کے بیانر تلے "فلم نفرت کی آگ"

کی شوٹنگ

نواب مظہر الدین علیخان ہونہار تعلیم یافتہ ساتھ میں حیدر آباد کے اعلیٰ جاگیردارانہ خاندان سابق نواب آف کرنول کے چشم و چراغ ہیں بارہ برس تک متحدہ عرب امارات دبئی UAE میں امریکن فرینچ انگلش ہالینڈ جیسی فرمس میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے اور حیدرآباد لوٹنے پر اپنی ذاتی نگرانی میں "مظہر ٹراولیس" قائم کیا پانچ سال کے مختصر عرصہ میں مظہر ٹراولیس نے جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے اپنی مثال آپ ہے۔ جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔

نواب مظہر الدین علیخان جو حیدرآبادی گنگا جمنی تہذیب کا نہ صرف نمونہ ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک فراخ دل ہمدرد اور صاف گو ملنسار شخصیت کے حامل بھی ہیں جنھوں نے کئی برسوں سے بلا لحاظ مذہب ملت حیدر آبادی فنکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے دامے درمے سخنے مدد کرتے آئے ہیں ۔۔۔ ۲ مارچ ۹۸ء کو بمقام انڈا ہمپیہ درشنی حیدرآباد میں ۷ بجے شام مظہر فلمز کی رنگین فلم "نفرت کی آگ" کی مہورت عزت مآب کے پرکاش راؤ صاحب میئر بلدیہ عظیم تر حیدرآباد کے ہاتھوں عمل میں آئی اور عزت مآب نواب کاظم نواز جنگ بہادر صاحب (علی پاشا) کے مبارک ہاتھوں کیمرہ کا بٹن آن ہوا مہورت کا پہلا شاٹ فلم کے ہیرو نواب مظہر الدین علیخان پر فلمایا گیا۔ تمام معزز مہمانان نے مظہر فلمز کے بیانر تلے قومی یکجہتی پر مبنی پہلی رنگین فلم "نفرت کی آگ" کی ستائش کی۔ فلم کے پروڈیوسر نواب مظہر الدین علیخان کو مبارکباد پیش کی اور فلم کے مصنف و ہدایت کار ملک الوز نے فلم کی کہانی کے بارے میں تفصیلات بتلائیں اور فلم کے فنکاروں کا تعارف کروایا۔ آخر میں نواب مظہر الدین علیخان نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا ۔۔۔!

تنگ عنایت پوری (سیوان)

"ہم انہیں دیکھا کریں"

○

جب نہیں اسکوپ کوئی آنکھ ہی سینکا کریں
"وہ نہیں دیکھیں نہ دیکھیں ہم انہیں دیکھا کریں"

جب عیاں آئے نہیں کوئی تو بولو کیا کریں
سوچتے ہیں دوسروں کے شعر کا چربا کریں

شاعری کے شہر میں بھی اب سیاست گھس گئی
کیوں نہ شاعر کرسیوں کے واسطے جھگڑا کریں

ایک مصرع بھی نہ کہہ پائے تو اس سے کیا ہوا
بات کرنے پر مگر استاد سا نخرا کریں

اس کا بچہ کھائے گا دے گا دعائیں آپ کو
یوں نہ باسی روٹیوں کو صبح دم پھینکا کریں

نیچتی ہے جسم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے
آپ کو جو بھی سمجھ میں آئے وہ سمجھا کریں

ماننے جو فیصلہ تو تنگ ہی کا مانیئے
جو غزل خود لکھ کے دے استاد وہ پکڑا کریں

"آجکل"

بہنے لگا ہے جسم کا وہ خون آج کل
انسان مفلسی کا ہے مضمون آج کل

کہنے کے واسطے یہ کسانوں کا دیش ہے
ملتی نہیں ہیں روٹیاں دو جون آج کل

شاعر ظفر کے بعد ظفر ہو گا کیا کوئی
جائے گا کون مرنے کو رنگون آج کل

انصاف کی ترازو بھی اب کام آگئی!
بکنے لگا ہے تول کے قانون آج کل

میدانِ شاعری کے جو تھے پہلوان کبھی
وہ کھا رہے ہیں فکر کا معجون آج کل

کاٹے گا وہ ضرور شرافت کے سر کا بال
کھولی ہے ایک نیتا نے سیلون آج کل

استادوں نے چھوڑ دیا بیچنا کلام
وہ بیچتے ہیں گھوم کے بیلون آج کل

اے تنگ تنگ ہو گئی پوشاک زیست کی
میں بن گیا ہوں ڈسکو پتلون آج کل

گرنام سنگھ تیر (پنجابی)
ترجمہ: راز سنتوکھ سری

چھوٹی موٹی بے ایمانیاں

دفتر میں بیٹھے ہوئے ایمانداری کے موضوع پر کہانی لکھنے کے لئے ایک پلاٹ میرے ذہن میں آیا۔
میں نے بلا تامل الماری میں سے سرکاری کاغذوں کا ایک دستہ لیا اور کہانی لکھنے کے لئے گھر لے آیا۔
جب کہانی مکمل ہوگئی تو مجھے خیال آیا کہ بظاہر میں کتنا دیانتدار نظر آتا ہوں لیکن فی الحقیقت دیانتداری کا بنیادی طور پر مخالف ہوں۔
اگر غور کیا جائے تو چھوٹی موٹی بے ایمانیاں بھی چھوٹی بچتوں کی مانند آخر بڑھتی بڑھتی رنگ لاتی ہیں۔
میں مسہری پر دراز اپنی خیالات میں غرق رہا کہ بعض چوریاں ہم اپنے آپ کو چور سمجھے بغیر کرتے رہتے ہیں۔
اپنا اخلاقی جائزہ لینے کی خاطر میں نے ڈائری ہاتھ میں لی اور ایک دن کی کارگزاری دیکھنے لگا۔ صبح میں گردوارے گیا۔
مجھے یاد آیا کہ گزشتہ ماہ میں نے سوا روپے کی منت مانی تھی۔ اس کی ادائی ابھی باقی تھی۔
میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔
کرنسی نوٹوں کے علاوہ [illegible] پندرہ پیسے ریزگاری تھی۔
مجھے پچیس پیسے کی ضرورت تھی۔

میں نے دل میں کہا، گروجی کے ہاں کیا کمی ہے۔
اور دس پیسوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔
چلئے، ایک روپیہ پندرہ پیسے گولک میں ڈال کر سوا روپے کے کڑاہ پرشاد (حلوہ) کی منت پوری کر لیتے ہیں۔
گردوارے کا گرنتھی مجھے بہت بھلا آدمی سمجھتا تھا۔
اُس نے گنے بغیر رقم گولک کے حوالے کی اور میری دِلی آرزوئیں پوری کرنے کے لئے واہگورو سے ارداس (گذارش، دعا) کی
میں نے خِفت کا احساس کئے بغیر مونچھوں پر تاؤ دیا اور باہر چلا آیا۔

صبح کے وقت اخبار کا ایجنٹ جلدی میں تھا۔
وہ تین کی جگہ چار اخبار گھر میں رکھ گیا۔
مجھے پتہ چل گیا کہ اخبار تعداد میں چار ہیں۔
ایک ہی اخبار کی دو کاپیاں تھیں۔
وہی خبریں اور آؤٹ ڈیٹنگ گپ شپ دوسری کاپی میں بھی تھی۔ لیکن میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ دو پیسے مول کی ردی ہی سہی۔
ہاکر کو پندرہ پیسے کا نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے [illegible] پیسے کی ردی سے میری آمدنی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس کے بعد دودھ والا آیا۔
وہ افیم کی پینک میں مست رہتا ہے۔
کلو کی گنتی خریدار کے ذمے ہے۔
اُس نے دو کلو زاید دودھ دے دیا۔
میں چپ رہا۔
میرے ضمیر نے دریافت کیا: "اس بیچارے کا دو کلو دودھ پی کر تم پہلوان بن جاؤ گے؟
میں نے جواب میں کہا: "یہ کونسی بے انصافی ہے، وہ بھی تو دودھ میں پانی ملاتا ہے اگر میں نے ایک آدھ کلو زائد لے لیا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے؟"

"خریدیئے آلو، بینگن، گاجر" کی آواز لگاتا ہوا کنجڑا ہمارے گھر کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔
میں نے ٹوکری لی اور سبزی خریدی
میں نے کُل چھ سبزیاں خریدیں
بھاؤ تاؤ کرتے وقت بھی خاصی بحث کی
ایک روپیہ فی کلو بھاؤ کی سبزی لڑ جھگڑ کر اسّی پیسے میں خریدی۔
جب قیمت کا میزان کیا جانے لگا تو میں نے چھ کی بجائے پانچ سبزیوں کی قیمت ادا کی۔
چھٹی چیز ٹماٹر تھے اڑھائی سو گرام
ٹماٹر کی قیمت تھی ساٹھ پیسے
اس فریب کاری سے ساٹھ پیسے کی بچت ہوئی
سبزی کی ٹوکری لے کر میں گھر کو یوں لوٹا گویا سکندر اعظم دنیا کو فتح کرکے آرہا ہو۔

میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا
اتنے میں دھوبی کپڑے لے کر آگیا
اکتیس عدد کپڑے لوٹانے تھے لیکن وہ بتیس کپڑے واپس دے گیا۔
یہ بتیسواں کپڑا ایک زنانہ پیٹی کوٹ تھا۔
پہلے مجھے خیال آیا کہ اس کا کیا کروں گا
کیوں کہ میری بیوی ساڑھی تو پہنتی نہیں
ہمارے کسی کام آئے گی۔
پھر دوسرا خیال آیا کہ واپس کیوں کیا جائے۔
مفت میں مل رہا ہے۔
اہلیہ اگر ساڑھی نہیں پہنتی تو نہ سہی ہم خود وقت بے وقت پیٹی کوٹ پہن لیا کریں گے۔
اس میں بُرائی بھی کیا ہے؟
ان دنوں جب لڑکیاں پینٹ پہنتی ہیں اگر ہم نے پیٹی کوٹ پہن لیا تو کیا حرج ہے۔
آخر یہ مروّج فیشن ہی تو ہے آج کل کا
دھوبی گیا تو مالی آگیا۔
وہ سبزیوں کے بیجوں کی قیمت کا حساب کرنے کے لئے آیا تھا۔
اس سے اس کے بیجوں کی قیمت اسی طرح بچا لی جلتی جیسے کنجڑے سے ٹماٹروں کی قیمت بچائی تھی۔

دفتر کا وقت ہو چکا تھا۔
لیکن مجھے ابھی بجلی کا بل ادا کرنا تھا۔
بل تھا نو روپے بیاسی پیسے کا جسے
بل وصول کرنے والا کلرک غالباً رات کا آخری شو (لوٹتا بارہ بجے) دیکھ کر آیا تھا۔
میں نے اس کی غنودگی کے بدلے اسے پچاس پیسے کا چل دیا؛ نو روپے بیاسی پیسے کی بجائے نو روپے تیس پیسے ادا کرکے رسید حاصل کرلی۔

ایک بابو سے میں اپنی کہانیاں دس پیسے فی صفحہ کے حساب سے ٹائپ کرواتا تھا جب میں نے آخری تحریری طور پر حساب کیا تو چالیس صفحے کم کیئے۔
اس پر بھی وہ "تھینک یو" کہہ کر جو اُجرت ہم نے دی لے کر چلتا بنا۔ جاتے ہوئے کہنے لگا جناب! آپ آیندہ کام کیلئے

کب حاضر ہوں؟"

دفتر کی ڈاک چپراسی نے میری میز پر ڈال دی
مقصد یہ تھا کہ میں اپنی چٹھیاں اس میں سے علیحدہ کرلوں
اور باقی ماندہ ڈاک لوٹا دوں ہم نے اس موقع کا پورا فائدہ
اٹھایا۔
دوسرے ملازموں کے نام موصول ہوئے دو اعلیٰ پایہ کے
رسالے اپنے پاس رکھ لیے۔
ریپر اُتار کر پھاڑ دیئے اور رسالے دراز میں محفوظ کرلیئے
دوپہر میں ڈیڑھ تا دو بجے کھانے کے لیے چھٹی
ہوتی ہے۔
ہم نے ایک بجے ہی کام کرنا بند کردیا گویا لنچ بریک نہ ہو
ہڑتال ہورہی ہو
دو بجے دفتر کا کام پھر سے شروع ہونا تھا۔
لیکن ہم کافی پینے کا عذر لیے ایک دوست کے پاس اس
کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں کافی اور گپ شپ کا دورِ
لامتناہی چلتا رہا گویا ہم دفتر میں نوکری کرنے کی غرض سے
نہیں آئے بلکہ کسی سدا سے مجرد کی تقریبِ شادی میں شریک
ہوں۔

میں نے اپنے چپراسی کو اپنے نجی لفافوں پر ٹکٹ چسپاں
کرنے کو کہا۔
پندرہ پیسے کا ایک ٹکٹ کم پڑتا تھا
میں نے پرانے لفافے دیکھنے شروع کیئے
آخر ایک پرانا ٹکٹ اُتارا اور گوند کی مدد سے لفافے پر
جڑ دیا۔ دل میں کہا، پندرہ پیسے کے خسارے سے ڈاک
خانہ پر قیامت ٹوٹنے سے رہی۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو جرم
ہے، اس کے بدلے میں سزائے قید ہوسکتی ہے
احساسِ فریب کاری نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔" دیکھا جائیگا
ڈرنے کی ضرورت نہیں"

شام کے وقت کینٹین پر چائے پینے کے لیے گئے۔
چالیس پیسے پیشگی ادا کرکے پرچی لی تھی، لیکن پچاس پیسے
کا الم غلم ڈکار کر چلتے بنے۔
میں زینوں سے اُتر رہا تھا کہ میرے ذہن میں یہ کشاکشی ہونے
لگی کہ اگر بالوشاہی بیچنے والی لڑکی کو گنتی کے حساب سے
رقم جمع کرانی پڑتی ہوگی تو اُسے دس پیسے کا نقصان رہیگا
لیکن پھر خیال آیا کہ لڑکی ہوشیار ہے، چھوٹے موٹے
ٹکڑوں کو ملا کر ایک بالوشاہی گنوا دے گی۔

اس کے بعد رات میں کالکا جانا تھا
ریلوے اسٹیشن پر پہنچا
تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدا
سب ڈبوں میں جگہ بہت خالی تھی
اِدھر اُدھر دیکھ ڈالا، کوئی چیکر بھی ساتھ نہیں تھا
چپکے سے اپنے اعلیٰ سوٹ کے سہارے اول درجے میں
جا بیٹھا کالکا پہنچے تو دو روپے کی بچت کی بابت خیال
کرکے خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے

ہاکی کا میچ ہو رہا تھا
مجھے ریفری مقرر کیا گیا
چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم انصاف کا دامن تھامتے
لیکن ایک ٹیم کے ساتھ ہماری ہمدردی ہونے کے باعث دوسری
ٹیم کے خلاف بلاوجہ "فاؤل" دے کر انھیں شارٹ کارنر
کا موقع فراہم کیا اور انھوں نے گول کر دیا۔
اس پر ہم نے "بے ایمانی ہی ہمارا مسلک ہے" کہہ کر دل کو تسلی
دے لی۔
بس میں کوئی سواری سرسوں کا ساگ رکھ کر اُسے ساتھ لیجانا
بھول گئی کنڈکٹر نے آہستہ سے مجھ سے دریافت کیا:
"وہ سامنے ساگ کی تھیلی آپ کی ہے؟"

اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر میں نے کہا: ہاں، میری ہی تو ہے اور کس کی ہوسکتی ہے؟ اس کے بعد رکشا میں سوار ہوئے اور تیزی سے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

میں چارپائی پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا
کہ میں کیسی انواع و اقسام کی بے ایمانیوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہوں
بول وقت کے سلسلے میں۔
انصاف کے تئیں
سودا سلف خریدتے وقت
جھوٹ بول کر
حساب کتاب کرتے وقت
حتیٰ کہ خدا کے ساتھ بھی بے ایمانی
ان میں سے اکثر کو میں اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہوں
بعض کو میں معمولی سانحات گِنتا ہوں

سوچتے سوچتے مجھے خدا پر رحم آنے لگا۔
صبح سویرے جب میں عبادت خانے جاتا ہوں تو پرشاد نذر کرکے خدا کے حضور استدعا کرتا ہوں:

"اے پرماتما! تو یہاں مندر ہی میں قیام کیجو۔ میرا پیچھا کرنے کی زحمت نہ اٹھائیو میں بے شمار بے ایمانیوں کا ارتکاب کروں گا اور اپنے عقیدت گزار کی کارگزاری دیکھ کر"
تیری پوزیشن بے حد "ایمبرسنگ" ہوگی
میرا یہیں انتظار کیجو
میں کل علی الصبح پھر پرشاد لیکر حاضر ہوں گا اور تیرے حضور سر بسجود ہونگا
میں نے "لچھمن ریکھا" کھینچ دی ہے
اس سے باہر مت جائیو ورنہ سیتا کی مانند پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا
یہ چھوٹی موٹی بے ایمانیاں میرا ہی نہیں اس دنیائے دنی کے اکثر لوگوں کا پیدائشی حق ہے۔
چھوٹی موٹی بے ایمانیاں زندہ باد!
چھوٹے موٹے بے ایمان پائندہ باد!

نامور مزاح نگار
نریندر لوتھر
کے انشائیوں کا تازہ مجموعہ
الف تحاشا
صفحات: ۱۴۴ * قیمت: ۱۶ روپے
: مطبوعہ :
زندہ دلانِ حیدرآباد

نامور مزاح نگار
یوسف ناظم
کے مضامین کا مجموعہ
البتہ
دس روپے
بتوسط: شگوفہ حاصل کیجیے!

مفلس قادری
(پارسی ٹاکی)

دل ہی تو ہے...

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

ترسوں میں دال بھات کو وہ شیواں کھائے کیوں   میرا بدن لہو لہو وہ عطر میں نہائے کیوں
کٹیا کے سامنے مری بلڈنگ وہ بنائے کیوں   روتا رہوں میں ہر گھڑی پیہم وہ مسکرائے کیوں
تقدیر رات دن مجھے کرتب یہ سب دکھائے کیوں

بندر کی طرح رات دن بیوی مجھے نچائے کیوں   بریانی آپ کھائے کیوں بینگن مجھے کھلائے کیوں
تفریح خود منائے کیوں گھر میں مجھے بٹھائے کیوں   ہنستی رہے وہ ہر گھڑی پیہم مجھے رلائے کیوں
خود سوئے لمبی تان کر تنہا مجھے جگائے کیوں

جاکر اسمبلی میں وہ جانتا نہیں ہے جب   پہچان کر بھی وہ ہمیں پہچانتا نہیں ہے جب
جائز مطالبات بھی وہ مانتا نہیں ہے جب   قیمت ہمارے ووٹ کی پہچانتا نہیں ہے جب
مانگنے بھیک ووٹ کی گاؤں ہمارے آئے کیوں

سب کو پتہ ہے سیٹھ وہ مکھی کی کھال کھائے ہے   اپنے لئے حرام کو کہہ کر حلال کھائے ہے
کچا کسی کو کھائے ہے یا پھر ابال کھائے ہے   جو کچھ بھی آئے سامنے بے قیل و قال کھائے ہے
سوچو مگر وہ مولوی چندے کا مال کھائے کیوں

بھینگی ہوئی تو کیا ہوا باپ اس کا ساہوکار ہے   بزنس کا جس کا شہر میں لاکھوں کا کاروبار ہے
برسوں ہوئے کنوارپن اک اس کے سر پہ بار ہے   تجھ کو ملا نہ سے اسے شوہر کا انتظار ہے
جاکر تو اس کے در پہ پھر قسمت نہ آزمائے کیوں

بے قابو ہو کے دل بھلا کیسے مچل نہ جائے پھر   تلوار اک نگاہ کی پھر اس پہ چل نہ جائے پھر
نیت ہماری کس طرح آخر بدل نہ جائے پھر   دامن ضبط ہاتھ سے کیوں کر نکل نہ جائے پھر
خود کو بنا سنوار کر وہ گیلری میں آئے کیوں

دعوت کسی کے گھر تجھے مل جائے ہے تو ڈٹ کے کھا   اٹھ کر لپک لپک کے کھا چھین کے کھا جھپٹ کے کھا
پھر آگے آگے بڑھ کے کھا کچھ پیچھے پیچھے ہٹ کے کھا   آندھی کی طرح ٹوٹ کر طوفان کی طرح پھٹ کے کھا
ایسا سنہرا چانس اگر مل جائے تو گنوائے کیوں

جلتی ہے بھوک پیاس سے گھبرائے ہے تو شعر کہہ   غم ہجر کو میرے ہم نشیں تڑپائے ہے تو شعر کہہ
تنہائی میں تجھے کوئی یاد آئے ہے تو شعر کہہ   اپنے کئے پہ تو اگر پچھتائے ہے تو شعر کہہ
روتا ہے زار زار کیا کرتا ہے ہائے ہائے کیوں

دھندہ بلیک جس کا ہے کھوٹا ہر ایک کام ہے
حاصل اسے سماج میں اعزاز کا مقام ہے
ہر دم اس کا ذکر ہے ہر لب پہ اس کا نام ہے
منسوب اس کے نام سے ہر صبح اور شام ہے
مجھ جیسے فاقہ مست کو پھر کوئی منہ لگائے کیوں

آٹا ہے اور نہ تیل ہے چاول ہے اور نہ دال ہے
بیوی عذاب جاں ہے تو ہر بچہ اک وبال ہے
میں جانتا ہوں خرچ سے تو کس قدر نڈھال ہے
لیکن اے میرے ہمنشیں تجھ سے بس اک سوال ہے
ہر سال اپنے گھر کی تو آبادی پھر بڑھائے کیوں

مہنگائی کا ہمارے سر جنجال ہے تو کیا ہوا
بتلا ہمارا قرض سے جو حال ہے تو کیا ہوا
گوشت نہ ہو تو کیا ہوا بس دال ہے تو کیا ہوا
مفلس کچھ اور ان دنوں کنگال ہے تو کیا ہوا
آجائے اس کے گھر تو پھر مہمان جلد جائے کیوں

○

عثمان غنی بلاسپوری کی

غزلیں

ہیں شاعروں میں کئی گوبھی اور مٹر کی طرح
بنا دیا مجھے یاروں نے کیوں صفر کی طرح

میں اپنے گھر کو بھی ہوٹل سمجھ کے رہتا ہوں
اڑاتا کھانا ہوں ہوٹل میں اپنے گھر کی طرح

ہمارے آتے ہی کیوں منہ کو لگ گیا تالا
دہاڑتے تھے ابھی تک جو شیر نر کی طرح

ہماری زیست کھلی اک کتاب ہے یوں تو
پڑھا کسی نے تو دیکھا کسی نے خر کی طرح

نہیں طویل ہے روداد مختصر اپنی
بیان غنی کا ہے راوی معتبر کی طرح

کاٹتے ہے کون کس کا گلا ہم سے پوچھئے
کھوٹا ہے کون کون کھرا ہم سے پوچھئے

ہے کون کتنے پانی میں معلوم ہے ہمیں
کتنا ہے کون پہونچا ہوا ہم سے پوچھئے

میں مبتلا بخار میں پسلی میں درد ہے
بارش میں بھیگنے کا مزا ہم سے پوچھئے

لکھوا کے دوسروں سے یہاں پڑھ رہا ہے کون
پڑھتا ہے کون اپنا کہا ہم سے پوچھئے

اپنے لنگوٹیا ہیں زمانے سے ساتھ ہیں
عثمان غنی کا کیا ہے پتہ ہم سے پوچھئے

عابد معز (حیدرآباد)

شناختی بحران

آبادی میں بے تحاشہ اضافہ کی وجہ سے ہر ایک انسانوں کے جنگل میں گم ہے۔ زندگی کے جھمیلوں نے انسان کی رہی سہی قدر بھی کھو دی ہے۔ آج انسان کی شناخت ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ شناخت کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے فوٹو کا لزوم عائد کیا جاتا ہے آپ کون ہیں کیا ہیں اور کیوں ہیں۔ آپ کی شناخت آپ کی فوٹو ہے۔ دو بٹا تین انچ کے مستطیل کاغذ پر کھینچی ہوئی تصویر کی خود سے کوئی اہمیت نہیں۔ اپنی تصویر ساتھ رکھتے ہوئے بھی کسی ذی حیثیت آدمی سے تصدیق کروانی پڑتی ہے کہ یہ کاغذی پیراہن فلاں ابنِ فلاں کا ہے۔ یہ تصویر فلاں ابن فلان عمر؟ سال کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہے۔ کسی دوسرے شخص سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوسکتی ہے جس کے لیے صاحب تصویر یا تصدیق کنندہ ذمہ دار نہیں ہے۔

قومیت کی شناخت کے لیے پاسپورٹ دیا جاتا ہے۔ تصویر کے بغیر پاسپورٹ مکمل نہیں ہوتا۔ پاسپورٹ میں تصویر اور نمبر کی اہمیت ہوتی ہے۔ نام اور ولدیت کو کم پوچھا جاتا ہے۔ یہی کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی شہری نمبر فلاں کی تصویر یہ ہے سُنتے ہیں چند ممالک میں ہر شہری کو اپنے ہی ملک میں اپنی شناخت کے لیے تصویر کے ساتھ ایک کارڈ رکھنا پڑتا ہے۔ خیر سے ابھی ہمارے ملک میں ایسی افسوسناک حالت نہیں ہوئی کہ خود اپنے ملک میں شناخت مسئلہ بن جائے بغیر پاسپورٹ یا شناختی کارڈ جو بھی انسان سرزمین ہند پہ پایا جاتا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ پاسپورٹ جیسے اہم شناختی فوٹو کے علاوہ قدم قدم پر ہمیں اپنی شناخت کروانے کے لیے کئی قسم کے شناختی کارڈ رکھنے پڑتے ہیں۔ صبح نیند سے بیدار ہونے کے بعد دودھ لانے جائیے تو دودھ کے کارڈ پر صاحب خانہ کی تصویر ہوتی ہے۔ دودھ والا تصویر دیکھ کر دودھ دے گا چاہے صاحب تصویر کے دودھ کے دانت بلکہ اصلی دانت بھی غائب ہوں، منہ سے دودھ کی بو آتی ہو اور نہ ہی چہرے سے شیر خواری ٹپکتی ہو۔ بس اور ریل میں سفر کرنے کے لیے "پاس" پر اپنی تصدیق شدہ فوٹو چسپاں کرنا پڑتا ہے۔ دودھ کے کارڈ والی تصدیق شدہ فوٹو یہاں کام نہیں آتی۔ الگ سے بس اور ریل کا کارڈ بنوانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی جہاں آپ کام کرتے ہیں یا پڑھتے ہیں وہاں سے الگ ایک شناختی کارڈ معہ فوٹو ملے گا۔ سواری چلانے کے لیے لائسنس پر آپ کی تصویر چسپاں ہوگی جسے صرف ٹریفک والے پہچان سکتے ہیں۔ امتحان یا انٹرویو دینے جائیے تو اس مقصد کے لیے بھی تصدیق شدہ فوٹو سے

اپنی شناخت کروائیے۔ روزگار کے کارڈ پر بھی فوٹو لازم ہے۔ وظیفہ کے کاغذات پر تصدیق شدہ فوٹو کے ساتھ اس بات کی تصدیق بھی چاہیئے کہ فوٹو ابھی زندہ ہے اور فوٹو کو زندہ رکھنے کے لیے صاحب فوٹو کو وظیفہ ملنا چاہیئے۔ ڈگری اور دیگر سرٹیفکیٹ پر بھی قابل شخص کی تصویر ہوتی ہے۔ آپ کے سرٹیفکیٹ و دستاویز قابل اعتراض ہوں تو شناخت کے لیے پولیس والوں کے پاس آپ کی تصویر ہوتی ہے۔ غرض آج ایک شخص کے کئی چہرے ہیں ہر چہرہ ایک دوسرے سے مختلف اور بے تعلق ہوتا ہے۔ دودھ کے کارڈ کی تصویر بس پاس کے لیے نہیں چلتی۔ ایمپلائمنٹ کارڈ ملازمت ملنے کے بعد شناختی کارڈ کی طرح استعمال نہیں ہوسکتا سواری چلانے کے لیے آپ کا اپنا ایک الگ چہرہ ہوتا ہے جسے کسی اور مقام پر اپنی شناخت کے لیے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اب ہماری ریاست میں انسان کے مختلف محکمہ جاتی چہروں میں دو نئے چہروں کا اضافہ ہوا ہے۔ راشن کارڈ اور رائے دہی کے کارڈ پر تصویر کا لزوم عاید کیا گیا ہے۔ راشن کارڈ پر صدر خاندان کی تصدیق شدہ تصویر چسپاں کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

راشن کارڈ پر صدر خاندان کے تمام افراد کا راشن ملے گا لیکن تصویر صرف صدر خاندان کی ہوگی جبکہ دوسرے شناختی کارڈوں پر متعلقہ شخص کی تصویر ضروری ہوتی ہے۔ ہونا تو یوں چاہیئے تھا کہ راشن کارڈ پر تمام گھر والوں کی تصاویر یا گروپ فوٹو چسپاں ہوتا۔ تصاویر صرف چہروں کی نہ ہو بلکہ مکمل سرتاپا تصویر کم سے کم کپڑوں کے ساتھ لی گئی ہوتا کہ تن و توش کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ تصاویر میں جسمانی حالت کو دیکھ کر راشن مقرر کیا جانا چاہیئے آج کل چونکہ راشن کارڈ پر مکمل راشن نہیں ملتا شکر، تیل اور غذائی اجناس کا ایک حصّہ ملتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے کارڈ پر صرف صدرِ خاندان اور وہ بھی اُن کے چہرے کی تصویر کا لزوم ہے۔

تصویر کا دوسرا لزوم رائے دہندہ کارڈ پر عائد کیا گیا ہے۔ جو بھی بالغ شہری اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ اپنی تصویر کھنچوائے۔ حکومت بھی گاؤں گاؤں اور گلی گلی فوٹو گرافروں کو بھیج کر رائے دہندوں کی تصاویر لے کر انھیں رائے دہی کے حق سے استفادے کے قابل بنا رہی ہے۔ یہ سیاست عام آدمی یا کم از کم ہماری سمجھ سے تو باہر ہے۔ گاؤں میں پینے کے لیے محفوظ پانی میسر نہیں، بیمار پڑیں تو ڈاکٹر نہیں ملتا لیکن اب ووٹوں کی خاطر گاؤں والوں کی تصاویر بنائی جائیں گی بے چارے معصوم گاؤں والے جو کبھی آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر مسکرا بھی نہیں پاتے اب کیمرے کے سامنے کھڑے ہوکر "JUST SMILE" اور کلک کی آوازیں سنیں گے۔ ویسے گاؤں والوں کے لیے خوشی کی بات بھی ہے کہ اب ان کی تصویریں بطور یادگار محفوظ رہیں گی۔ باپ اپنے بیٹے کو دادا کی تصویر دکھا کر کہے گا "یہ تمہارے دادا جان کی تصویر منڈل الیکشن کے لیے لی گئی تھی اور میری یہ تصویر اسمبلی الیکشن کے وقت کی ہے پارلیمنٹ الیکشن تک چہرے میں کتنی تبدیلیاں آگئی ہیں"۔ گاؤں کی گوری اپنی تصویر دیکھ کر بجا طور پر اپنے حسن کی سادگی پر فخر کرے گی۔

رائے دہندہ کارڈ پر تصویر کا لزوم اس لیے عائد کیا گیا ہے کہ رائے دہندہ صرف ایک ہی ووٹ ڈالے لیکن جناب اداکاری اور میک کے ذریعہ ایک ہی رائے دہندہ کی کئی تصویریں کھینچی جاسکتی ہیں اور ہر تصویر ایک مسلمہ ووٹ بن سکتی ہے۔ داڑھی مونچھ کی تصویر کا ایک ووٹ بنے گا تو بغیر داڑھی مونچھ دوسرا ووٹ ہوگا۔ سر کے بالوں کے مختلف انداز کی تصویریں الگ الگ ووٹ کی ضامن ثابت ہوں گی ٹوپی پہنے ہوئے تصویر ایک الگ ووٹ ہوگی تو شملہ باندھنے سے مزید ایک ووٹ کا اضافہ ہوگا۔ جس طرح اداکار فلم میں کئی رول کرتے ہیں اسی طرح رائے دہندے

انتخابات کے دوران تصویروں کے مطابق بھیس بدل کر کئی مرتبہ حق رائے دہی کا فائدہ اٹھائیں گے۔ فلمی اداکاروں کے سیاست میں وارد ہونے کا یہ بھی ایک فائدہ ہے۔ اس لیے این ٹی آر کی ریاست میں اس سمت سب سے پہلے قدم قدم اُٹھایا گیا ہے۔

تصویر انسانی شناخت کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے باوجود اس سے چند ایک مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تصویر نہیں بدلتی لیکن انسانی چہرہ بہت جلد بدل جاتا ہے۔ ہم اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔ تین چار سال قبل کی تصویر میں ہمارے سر پہ بال ہیں جبکہ آج ہم فارغ البال ہیں۔ تھوڑی سی بینائی رکھنے والا شخص بھی تصویر سے ہماری مشابہت کا اقرار نہیں کرسکتا۔ تصویر جوان رہتی ہے جبکہ صاحب تصویر بوڑھا ہوجاتا ہے۔ ہم نے اکثر بوڑھے شاعروں کے مجموعۂ کلام پر جوانی کی تصویریں دیکھی ہیں۔ بعض لوگوں کی تصویریں خوب اُترتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست کو اپنی بیوی کے فوٹو جینک چہرے کا اندازہ شادی کے بعد تصویر اور گوشت پوست کے حقیقی چہرہ کا تقابل کرنے پر ہوا تھا۔ بعض چہرے اچھے بھلے ہوتے ہیں لیکن ان کی تصویریں بچوں کو ڈرانے کے کام آتی ہیں۔ ان مسائل کے باوجود اگر آپ کا اصرار ہے کہ انسانی شناخت تصویر سے ہی کرائی جائے تو پھر ہمارا مشورہ ہے کہ جس طرح کتابوں کے "اپ ٹوڈیٹ ایڈیشن" نکلتے ہیں اسی طرح ہر سال یا چھ مہینے میں انسانی چہرے کی تصویر لی جائے تصویر لینے کا انداز اور مسکرانے کا زاویہ مقرر کیا جائے۔ مختلف اقسام کے کارڈ اور تصاویر رکھنے کے بجائے ایک ماسٹر شناختی کارڈ دیا جائے جس پر تصویر ہر چھ مہینے میں نئی لگائی جائے۔ یہ کارڈ بطور راشن کارڈ اور ووٹ ڈالنے کے کام آئے، بس میں سفر اور پلیٹ کی شناخت کے لیے استعمال ہو، قومیت عمر اور جنس کی گواہی دے، بینک میں اور پولیس تھانے میں چلے۔ اس کارڈ سے دودھ اور مٹی کا تیل حاصل ہو، اور اسی کارڈ سے امتحان دینے اور ڈگری اور نوکری حاصل کرنے کا شرف بھی حاصل ہو۔ اسم نویسی کے بجائے یہی کارڈ سے کام چلے اور گم شدہ انسان کا یہی کارڈ اشتہار بھی بنے ____!

عبدالحفیظ لقب عمران

غزلیں

ا قدر حوصلہ دکھائے کون
شمنوں کو مزہ چکھائے کون

عشق سے میں بھی توبہ کرلوں تو
ماہ پاروں کے ناز اٹھائے کون

شرارت اگر نہیں ان کی
یر سے مجھ کو خط لکھائے کون

ایک بجلی سے کوند جاتی ہے
تیرے جلوے کی تاب لائے کون

یرا محبوب رونی صورت ہے
سوچتا ہوں اسے ہنسائے کون

جب نظر آئے جان کا خطرہ
پھر تمہاری گلی میں آئے کون

کون اُن سے لڑا رہا ہے عشق
جیتی مکھی جہاں میں کھائے کون

کس میں اس درجہ قابلیت ہے
انگلیوں پر مجھے نچائے کون

اس نے ٹھکرایا مجھ کو یہ کہہ کر
ایسے ویسے کو منہ لگائے کون

ہوگیا ہوں پچاس سال کا میں
راہ میں آنکھیں اب بچھائے کون

جان لی میں نے اصلیت ان کی
اب ہوائی قلعے بنائے کون

وہ تو کرسی کا تھا مری اعزاز
اب ڈنر پر مجھے بلائے کون

زندگی اپنی کس کو پیاری نہیں
مجھ سے آکر لقب کھجائے کون

میرے سوا کسی کو بھی وہ دیکھتا نہ تھا
کیوں کر حسین مجھ سا کوئی دوسرا نہ تھا

کیا ہوگیا اگرچہ تھی اس کی ادھیڑ عمر
میں بھی تو پندرہ سال کا کچھ لونڈا نہ تھا

باقی تو ساری باتیں مری طرح اس میں تھیں
لیکن وہ دل کیا مری طرح موکلا نہ تھا

اس کے سوا مرا بھی نہ تھا کوئی خواستگار
میرے سوا اسے بھی کوئی پوچھتا نہ تھا

اس کے سبب نہیں ہیں مری نامرادیاں
حالات ہی خلاف تھے وہ بے وفا نہ تھا

القصّہ تخلیہ نہ میسّر ہوا نصیب
کس دن تری گلی میں بھلا جمگھٹا نہ تھا

کچھ سکّے اس نے دیکھ لئے مرے ہاتھ میں
پھر کیا تھا جیسے درمیاں کچھ فاصلہ نہ تھا

ترکِ تعلقات کا پابند میں نہیں
یہ تیرا فیصلہ تھا مرا فیصلہ نہ تھا

کہتے ہیں کچھ عجیب خریدار تھا لقب
جو شئے پسند آتی اُسے چھوڑتا نہ تھا

○

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

انسان فطرتاً خود پرست واقع ہوا ہے ۔ اس کی خود پرستی نے خوش فہمی اور غلط فہمی کو جنم دیا۔ خوش فہمی اور غلط فہمی ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں ۔ غلط فہمی حد سے تجاوز کر جائے تو خوش فہمی ہو جاتی ہے اور خوش فہمی میں حماقت کا عنصر شامل ہو جائے تو خوش فہمی غلط فہمی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری غلط فہمی کو لوگ خوش فہمی کا نام دے دیتے ہیں اور خوش فہمی کو غلط فہمی کا ۔ چونکہ خود پرستی انسان کی فطری کمزوریوں میں سے ہے اس لیے ازل سے اور ابد تک رہے گی ۔ کم و بیش ہر انسان خود پرست ہے اور اپنی خود پرستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ خوش فہمی یا غلط فہمی میں مُبتلا ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے ہم خیال ہو جائیں ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ معاملہ غلط فہمی کا ہو یا خوش فہمی کا، اپنی بڑائی پیشِ نظر ہوتی ہے ۔ اس لیے آئے دن وہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی معاملے میں اس کی تعریف کا کوئی پہلو نکل آئے اور اس کی انا کی تسکین ہو۔ لیکن ایسے مواقع اسے بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ دوسروں کی خود پرستی آڑے آتی ہے۔ ایک خود پرست کا دوسرے کی تعریف کرنا، دوسرے کے مقابل اپنا قد کم کرنے کے مترادف ہے۔ دوسرے کی تعریف اسے اپنی تضحیک محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے کی بجا تعریف سے بھی گریز کرتا ہے۔ بے شک کچھ لوگ ہیں، جو دوسرے کی بجا تعریف کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے لیکن ان حقیقت اور انصاف پسند لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

تعریف ٹانک کا کام کرتی ہے۔ اگر ہفتہ میں ایک مرتبہ چار شناساؤں اور ناآشناؤں کے بیچ، کسی سے اپنی تعریف سُننے کو ملے تو یہ خواہ مخواہ کے بد خواہوں کا بلڈ پریشر بڑھانے اور اپنی صحت بنانے کے لیے کافی ہے۔ دوسروں کی زبانی تعریف سُننے یا داد حاصل کرنے کی خواہش نے ہی انسان کو کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے اکسایا۔ تعریف ہی کی سیڑھی پر چڑھ کر اس نے ترقی کی اُونچائیاں سر کیں۔ نام کمایا۔ مثال کے طور پر تاج محل کو لے لیجیے۔ یہ درست کہ شہنشاہ شاہجہاں نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کی یاد میں اسے تعمیر کروایا۔ لیکن کیا اس عمارت کی تعمیر کے پسِ پردہ شہنشاہ کی یہ خواہش ظاہر نہیں ہوتی کہ لوگ رہتی دُنیا تک اس عمارت کی بدولت اس کے حُسنِ انتخاب کی تعریف

کرتے رہیں ؟

انسانوں میں خود پرستی سب سے زیادہ شاعروں میں پائی جاتی ہے۔ شعرائے کلام شاعرانہ تعلّی کے نام پر اپنے منہ میاں مٹھو بنتے رہتے ہیں۔ غالب ہو کہ میر یا اقبال کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ شاعروں کے بعد بادشاہوں اور نوابوں کا نمبر آتا ہے۔ اردو شاعری کو صنف قصیدہ انہی کی دین ہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ ہم بھی تھوڑے بہت خود پرست ہیں۔ لیکن چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے نسبتاً ایک عام آدمی کے ہماری خود پرستی کے چرچے عام نہیں۔ کیچرکم (C U M) ادیب ہونے کے ناطے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر ہماری نظر ہے۔ اس لئے ہم کچھ نفسیاتی حربے استعمال کرتے رہتے ہیں کہ شہر میں کسی نہ کسی طرح ہماری تعریف کا سلسلہ چلتا رہے۔ اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ جیب پر بار نہ پڑے اور شرافت و انسانیت کا ڈھنڈورہ پٹ جائے۔ مسٹر 'الف' آئے دن ہماری تعریفوں کے پُل باندھتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمانداری اور لین دین کے معاملے میں بڑے صاف آدمی ہیں۔ کیوں نہ کہیں گے ؟ ہم نے ان سے خواہ مخواہ ہزار روپے جو اُدھار لے رکھے ہیں! جب تک اس رقم کی پائی پائی ادا نہ ہو جائے گی وہ ہماری ایمانداری کا راگ اسی طرح الاپتے رہیں گے۔ ایک دوسرے صاحب مسٹر 'ب' ہیں۔ یہ بھی ہماری تعریف کرتے نہیں تھکتے کہ ہم اچھے پڑوسی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہماری تعریف کا یہ سلسلہ جاری نہیں رکھا تو انہیں صبح کا اخبار مُفت پڑھنے نہیں ملے گا۔ جو آج کل ہماری بدولت مل جاتا ہے۔ مسٹر 'ج' محلے والوں کے آگے وقتاً فوقتاً ہماری انسانیت پسندی کی گواہی دیتے رہتے ہیں ہم ان کے ساتھ ہر مہینے یہ نیکی کرتے ہیں کہ اپنے راشن کارڈ کا گھٹیا تیل اور آٹا انہیں دے دیتے ہیں۔ عوام الناس یہ تو جانتے ہیں کہ مسٹر الف۔ ب۔ ج ہماری تعریفیں کرتے رہتے ہیں لیکن کیوں ؟ یہ نہیں جانتے۔ ان کے اس 'کیوں' کا جواب ہم تو دینے سے رہے اور یہ حضرات بھی کیوں دیں گے ؟ اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کا پول وہ خود کیوں کھولنے لگے ؟ اس حربے کا بڑا نقص یہ ہے کہ تعریف ہوتی ضرور ہے لیکن پیٹھ پیچھے۔ اور اپنی اَنا کی تسکین کی خاطر اسی پر اکتفا کرنی پڑتی ہے کہ سامنے نہ سہی، تعریف ہوتی تو ہے نا! کبھی کبھی کسی تیسرے شخص کے ذریعے یہ تعریف ہم تک پہنچ جاتی ہے اور تعریف سُننے کا پچاس فیصدی سُکھ مل جاتا ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ دوسرا حربہ یہ شکایت بھی دُور کر دیتا ہے کہ اپنی تعریف ہم نہ سُن سکے۔ کیونکہ یہ حربہ اس اصول پر مبنی ہے کہ "تم میری تعریف کرو، میں تمہاری ___ دونوں خوش" اس حربے کے استعمال کے لیے پہلوان قسم کے لوگ لازمی سامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم بارہا آزما چکے ہیں، یہ حربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ آپ کسی محفل میں اپنے زورِ بیاں کے زور سے، فرضی اکھاڑے میں دو چار نامی گرامی پہلوانوں کو، پہلوان مذکورہ سے چت کرا دیجئے پھر دیکھیے کہ پہلوان کس فراخدلی سے آپ کی تعریف کے ڈونگرے برساتا ہے۔ اس کی زبانی اپنی تعریف سُن کر آپ کو جسم میں خون کی مقدار بڑھتی ہوئی محسوس ہوگی۔ تھوڑی ہی دیر میں لگے گا کہ خون کی اس زائد مقدار کی سُرخی گالوں پر جھلک آئی ہے۔ پھر تُرنت سرورِ انبساط کے سمندر میں غوطے لگانے لگے گی۔ پہلوان آپ کی شان میں قصیدے پڑھ رہا ہے۔ محفل میں موجود افراد کبھی پہلوان کو دیکھتے ہیں، کبھی آپ کو۔ سب کو ہمہ تن گوش پا کر پہلوان اپنے لب و لہجہ میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ ہیں کہ بے تحاشا تعریف سُن کر شرمائے جا رہے ہیں، لجائے جا رہے ہیں بلکہ بوکھلائے جا رہے ہیں اور اس بوکھلاہٹ میں کبھی دائیں ہاتھ کی انگلی کا ناخن دانتوں سے کترتے جاتے ہیں تو کبھی بائیں پیر کے انگوٹھے سے زمین

کُھرچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ پہلوان زورِ بیان پیدا کرنے کے لیے اپنی علمی استطاعت سے بڑھ کر دقیق الفاظ، غلط معنوں میں استعمال کرنے لگتا ہے۔ تب آپ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے یہ کہہ کر اسے روک دیتے ہیں کہ "پہلوان جی! اب بس بھی کیجئے۔ ہم کس لائق ہیں؟ تعریف اس خدا کی جس نے ہمیں اور آپ کو بنایا۔" اس سچوئیشن (SITUATION) کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پہلوان ہماری تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے کے لیے جو جی میں آئے ہانکے جارہا ہے۔ اور حاضرینِ محفل پوری توجہ سے اس کی بکواس سُن رہے ہیں یا سُننے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ جان کس کو پیاری نہیں۔ پہلوان کی بکواس سے بیزاری ظاہر کر کے یا کوئی اعتراض اُٹھا کر کون اپنی ہڈی پسلی تڑوانا پسند کرے گا؟ لہٰذا ہمیں تعریف کا پورا پورا سُکھ ملتا ہے۔

کبھی کبھی تعریف کا سُکھ حاصل کرنے کے لیے، کسی چیز سے محرومی کا دُکھ بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ ہمارے لڑکپن کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ ان کے لیے دسترخوان بچھا تو اسپیشل ڈِش کے طور پر گلاب جامن پیش کیے گئے تھے۔ گلاب جامن ہماری کمزوری ہے۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ہماری بن آئی ہے۔ امّی سوچ رہی تھیں کہ ہم گلاب جامنوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ممکن ہے ہم سے کوئی بدتمیزی سرزد ہو جائے اور مہمان پر اس کا بُرا تاثر قائم ہو۔ اس لیے جیسے ہی ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے امّی ہمارے پاس آبیٹھیں اور مہمان سے کہنے لگیں "میٹھی چیزیں گلے اور آواز کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کے استعمال سے دانت کمزور ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی شکر کا موذی مرض بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے منّا (یعنی ہم) میٹھی چیزیں بالکل نہیں کھاتے۔ بڑے ہی سمجھدار بچے ہیں!" امّی کی بات سُن کر ہم سکتے میں آگئے۔ کبھی گلاب جامن کی ڈِش کو دیکھتے کبھی امّی کو۔ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ مہمان ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھ رہے ہیں تو گلاب جامنوں سے محرومی کا احساس یکلخت کافور ہو گیا اور امّی نے جو تعریف کی تھی اس کی مٹھاس رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ ہم مانتے ہیں کہ امّی نے سفید جھوٹ بولا تھا لیکن مہمان کے لیے تو وہی سچ تھا ۔۔۔!

رشید عبدالسمیع جلیل

صحافت کی پری

مرے کمرے میں روزانہ اُترتی ہے نزاکت سے
جگاتی ہے سویرے نیند سے مجھ کو نفاست سے
مرے چہرے پہ پھیلاتی ہے پَر اپنے شرارت سے
اُٹھا کر جھٹ بٹھادیتی ہے بستر پر شرافت سے
صحافت کی پَری ہے کاغذی ہے پیرہن اس کا
سراپا شوخیٔ تحریر ہے نقشِ بدن اُس کا

"سیاست" "رہنما" "منصف" کے تازہ روپ میں نکلے
سحر کی اوّلیں ساعت میں چھکے دھوپ میں نکلے
مگر جب شام ہو جائے کسی بہروپ میں نکلے
کبھی چھلنی میں چھَن جائے پُرانے سوپ میں نکلے
نگارِ شہر ہے لیکن نہیں کوئی چمن اُس کا
بکے ردّی کے داموں دوسرے دن سیم تن اُس کا

غزل سیرت ہے غالب سی روانی ہے مگر کم کم
ادیبوں، شاعروں پر مہربانی ہے مگر کم کم
بہت چوڑی ندی ہے جس میں پانی ہے مگر کم کم
چلے ہر روز کشتی بادبانی ہے مگر کم کم
ہوا یخ بستہ، ساحل دور قائم حسنِ ظن اُس کا
نہ ہو گر صاف مطلع بھی تو جاری ہے سخن اُس کا

سیاسی رنگ کے ملبوس میں وہ فرد لگتی ہے
بدل کر جلد کی رنگت کبھی تو زرد لگتی ہے
وہ اپنے عاشقوں کے حق میں بالکل سرد لگتی ہے
بگڑ جاتی ہے جب ظالم بڑی بے درد لگتی ہے
وہ اُڑتی ہے خلاؤں میں بہت اونچا ہے فن اُس کا
نظارا دور سے کرلیں محبانِ وطن اُس کا

دھماکہ خیز خبروں میں وہ صبح و شام کرتی ہے
الیکشن، کرفیو، طوفاں میں بھی کام کرتی ہے
کوئی تحریک چل جائے تو اپنا نام کرتی ہے
اگر تہوار آ جائیں تو بس آرام کرتی ہے
صداقت اور ترشی کے تجسس میں ہے مَن اُس کا
اسی باعث گوارا ہے ہمیں چال و چلن اُس کا

کوئی موسم ہو لمحوں کا نہیں رہتی کبھی ناشاد
اکیلی دشتِ امکاں سے گزرتی ہے ستم ایجاد
ادارے، چائے خانے، مکتبے، کوچے سبھی آباد
اُسی کی رونمائی ہے وہ ہر محفل میں ہے آزاد
قد و گیسو میں باقی ہے اگر کچھ بانکپن اُس کا
نہ جانے حشر کیا کردیں مدیرانِ کہن اُس کا

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ
(پاکستان)

تُو نے پی ہی نہیں؟

[چائے "پینے پلانے" اور بنانے والوں سے معذرت کیساتھ]

"یہ بے شمار خوبیوں والی لاجواب چیز ہے جو قوم بھی اسے اپنائے گی سرخرو ہوگی دُنیا میں اس کا ڈنکا
اسے چھوڑنے والے فوراً اندوہناک عذاب میں مُبتلا ہو جائیں گے۔ جو مغلیہ خاندان کے زوال سے بھی
ا ہوگا آپ کی صحت کا راز اسے پینے میں پوشیدہ ہے اسی لیے کمپنی نے اسے مہر بند پیکٹ میں پیش کیا ہے"

مندرجہ بالا سطور نہ تو کسی انقلابی شاعر کے کلام کا ترجمہ ہیں اور نہ ہی یہ کسی لیڈر کے قوم کے نام پیغام
ہیں بلکہ یہ فقرات چائے کے ایک مشہور زمانہ اشتہار سے اغواء کئے گئے ہیں ذرا اندازہ تو لگائیے کہ
کے خوفناک اور گمراہ کُن اشتہار دینے والے چائے کو زندگی کا یوں لازمی جزو قرار دیتے ہیں جیسے چائے
کے بغیر خوشگوار ازدواجی زندگی کا تصوّر ہی ناممکن ہو حالانکہ ہماری ناقص رائے کے مطابق چائے کو اگر
پر اٹھا لیا جائے تو لوگوں کی زندگیوں میں چین کا دور دورہ ہو (وہ سائیکل والا چین نہیں) نوکروں کو
مرز کے لیے۔ میزبانوں کو اپنے مہمانوں کے لیے اور بیویوں کو اپنے شوہروں کے لیے قطعاً چائے بنانے کی زحمت
ے چہروں پر مسکراہٹیں آ جائیں اور دُنیا جنّت کا نمونہ بن جائے۔

چائے اور پانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہماری سوسائٹی میں آج کل "چائے پانی" کے الفاظ انتہائی غیر قانونی
نعمال ہو رہے ہیں جب کسی دفتر میں آپ کا کام نہ ہو رہا ہو تو متعلقہ کلرک کی مٹھی میں چند ہرے بھرے
دار لوٹ تھمائے جاتے ہیں نتیجتہً فائل چیونٹی کی رفتار چھوڑ ایک دم الیف سولہ بن جاتی ہے اور میزوں کا سفر
تیز رفتاری سے طے کرتی ہے حالانکہ "تیز رفتاری موت انجام" والی نصیحتیں زبان زد عام ہیں۔ رشوت دیتے
کثر زیر لب یہی کہا جاتا ہے "رکھیں حضور آپ کا چائے پانی کا خرچ ہے" چائے کوئی اچھی اور مقدس چیز ہوتی
کے اس غلط موڑ پر کبھی اس کا تذکرہ نہ ہوتا۔

بے راہ روی اتنی ہو گئی ہے کہ اکثر دفاتر میں صرف چائے بنانے اور پلانے جیسے مذموم مقاصد کی خاطر علیحدہ
جاتا ہے پھر معاشرے کے ادیب نامی طبقے کی تو جان ہی چائے کے اندر ہے جس طرح کوہ قاف کے دیو کی
نجرے میں بند استراحت طوطے کے اندر ہوتی تھی ادھر شہزادے نے طوطے کی گردن مروڑی ادھر نزاعہ

میاں ڈوڑ ولیہ صاحب آنجہانی ہوئے "لکھاریوں" کے لیے چائے کو اتنا ضروری گردانا جاتا ہے کہ چائے کی پیالی کی عدم موجودگی میں کسی نادر خیال کا ذہن کی دسترس میں آنا بعید از قیاس سمجھا جاتا ہے۔ جتنی اچھی چائے ہوگی اتنی اچھی نثر لکھی جائے گی اور نظم کہی جائے گی۔

چائے پینے والی اقوام عالم اس کے اجزائے ترکیبی کو مختلف تناسب سے ملانے کی عادی ہیں مثلاً کراچی کے ہر دم اماں یار اماں یار الا پنے والے انتہائی باریک جسموں کے مالک لوگ پہلے چائے کا قہوہ کشید کرتے ہیں اور پھر بھینس کا دودھ۔ بعد ازاں انتہائی احتیاط کے ساتھ قہوے سے اٹے ہوئے کپ میں دودھ اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ ایک قطرہ بھی ضرورت سے زائد کپ میں شامل نہ ہونے پائے اور چائے کے اندر جانے نہ پائے" گھر میں بے شک دودھ کی ندیاں بہتی ہوں لیکن چائے پینے والے کی قسمت میں صرف دو ہی قطرے آئیں گے جیسے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم

(ہاں وہ فلموں والی شبنم نہیں) ماہرین کا خیال ہے کہ بعض لوگ تو اس مقصد کے لیے ڈراپر تک استعمال کرتے ہیں پھر اس حساب سے آدھ پاؤ دودھ کی کثیر مقدار پچاس ساٹھ آدمیوں کی چائے کے لیے ضرورت سے زائد ہوتی ہے شمالی علاقوں میں بلیلتے والے لوگ انگریز سے ساری عمر دشمنی کرتے رہے بلکہ دشمنی مول لیتے رہے (ریتہ نہیں کتنے روپے فی کلو کے حساب سے مول لیتے تھے) مگر اُس کے اسمگل کردہ چائے کے تحفے کو دل و جان سے قبول کیا ان کا بس چلے تو جنت میں خدا سے مانگیں کہ دودھ اور شہد کی بجائے چائے کی نہریں چلیں اور ساتھ نسوار کے پہاڑ کھڑے ہوں۔ ڈرائیوروں کا طبقہ ایک خاص قسم کی چائے نوش جاں کرنے کا عادی ہو چکا ہے جس میں قہوہ اور دودھ تو برائے نام ہوتے ہیں لیکن ایک کپ چائے میں چھ ٹرک پتی ٹھونسی جاتی ہے اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ ڈرائیور کا ذہن اونچی اڑان شروع کر دیتا ہے۔ نیچے نہیں دیکھتا اور اسی اثنا میں بس کبھی "ٹکڑے" سے درخت کے ساتھ بغلگیر ہو چکی ہوتی ہے۔

ہمارے ایک دوست کو بھی نصیب دشمناں چائے کی ایسی لت پڑ گئی کہ بس اسی ہی کے ہو کر رہ گئے موصوف چائے بڑے اسٹائل سے پینے کے عادی تھے۔ (اپنی دانست میں) خالص دودھ کا انتظام کرتے پھر الائچیوں کی خوشبو سے مزین چائے کے کپ پر بالائی کا ایک ٹکڑا آویزاں کرتے بعد ازاں اتنی شدید چسکی لیتے کہ اوٹ میں کھڑا آدمی سمجھتا کوئی خراٹے لے رہا ہے جب کبھی وقت پر چائے نہ ملتی تو ماہی بے آب کی طرح تڑپتے۔ مائع دودھ کا ڈبہ جب آخری داموں تک پہنچ جاتا تو آستیں چڑھا جبڑے بھینچ کر اس معصوم ڈبے پر پل پڑتے اور ذرا سی دیر میں اس کا گریباں چاک کر کے کسی نہ کسی طرح ایک کپ چائے پیدا کر ہی لیتے آخرکار جب دودھ کا ڈبہ بالکل تہی دست ہو جاتا تو اس ویران اور بنجر ڈبے کو چائے کے برتنوں کے ساتھ رکھے پُرہوس نگاہوں سے تکتے رہتے جیسے کہہ رہے ہوں ؎

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

چائے کی تعریف کرتے تو زندگی کی اصل ثابت کرنے کی کوشش کرتے بلکہ فرماتے کہ زندگی چائے کی پیالی کی مانند ہے جس میں قہوے کی تلخیاں اور چینی کی شیرینیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ دنیائے اسلام کے لیے چائے کو از حد ضروری قرار دیتے ہوئے کہتے کہ روزانہ بیس پچیس کپ تو ہر مسلمان پیئے اس کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو کر [illegible]

میں گھوڑے دیا گیا تھا کہ اس ... چائے پینے سے دماغی ہیجان پیدا ہو تو پھر اونچی ایڑی والے جوتے پہن کر سامنے آنے والی ہر چیز کو ٹھوکریں مارتے جائیں۔ ؎

دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

اس طرح چلتے چلتے اسرائیل پر چڑھ دوڑیں اور اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر پھر چائے کی دو چار چسکیاں لے کر دوسری مسلم دشمن اقوام سے ہاتھا پائی شروع کر دیں۔ اسی طرح کی دوسری جذباتی باتیں کرنے کے بعد دعا مانگتے ؎

یارب لبِ مسلم کو وہ چائے کا پیالہ دے ؛ جو آنت کو تڑپا دے جو پیٹ کو گرما دے

اخلاقی انحطاط کے اس زمانے میں چائے مہذب ہونے کی دلیل بن چکی ہے۔ کسی شخص پر انتہائی خلوص اور مروّت کا بے دریغ استعمال کیجئے لیکن چائے کی پیش کش نہ کریں تو حلقۂ یاراں میں کبھی ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ چائے پینے کے شوق میں بارہا بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی چائے کے بڑے مداح تھے لیکن پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ ہمارے چائے کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ایک بار کسی ملنے والے کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک انھوں نے ہماری پسند و ناپسند پوچھے بغیر چائے کا کپ پیش کر دیا جس کی صورت پر نظر پڑتے ہی جسم کے روئیں روئیں میں کھجلی محسوس ہونے لگی میزبان کا اصرار حد سے بڑھا تو کپ اُٹھایا اور زہر ہلاہل کو قند سمجھ کر پینا شروع کر دیا پوچھا گیا۔

"چائے آپ کو بہت پسند ہے"

"جی نہیں میں تو آپ کی خوشی کے لیے مسکرا کر پی رہا ہوں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔"

بات چیت کسی شگفتہ موضوع کی طرف چلی گئی تو شامتِ اعمال ہنسی آ گئی ساتھ ہی چائے نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ کپ کے اندر موجزن چائے کے بحر الکاہل کی چند خودسر موجوں نے پہلے تو کناروں سے جھانکا پھر زقند بھر کر دامن پر آ گریں قمیص تر ہو چکی تھی۔ میزبان نے تر دامنی کا سبب پوچھا تو عرض کیا۔

تر دامنی پر شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے پھسل پڑیں

آج بھی کبھی ہم چائے سے محبت کرنے والوں کو اس کی چیرہ دستیوں کی داستان سناتے ہیں تو وہ ان مبالغہ اور تعصب سے پُر باتوں پر کان ہی نہیں دھرتے اور زبانِ حال سے کہتے ہیں ؎

لطفِ چاء تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

▲▼

نامور مزاح نگار
مسیح انجم
کے
مضامین کا
تیسرا مجموعہ
چنانچہ
۱۲ روپے
ناشر: زندہ طلسم حیدرآباد

رحمٰن ربانی
(دکالبی)

میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

میر کا سال منایا گیا دنیا بھر میں
جشن اقبال منایا گیا دنیا بھر میں
خسرو و غالب و چکبست و جگر فیض و نظیر
جشن کس کا نہ منایا وہ ہوں اکبر کہ صفیر
اس حقیقت سے کوئی کر نہیں سکتا انکار
جشن اُن کے بھی منائے جو تھے ٹوکس فنکار
کون ہے جشن منایا نہ گیا جس کا مگر ؟
کیا غضب ہے کہ مجھی پر نہ پڑی کوئی نظر
اس تعصب کا سبب مجھ کو بتایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

عہد کرتا ہوں کہ میں تم سے نہ کچھ بھی لوں گا
جو مجھے دو گے وہ "تھیلی" بھی تمہیں دیدوں گا
مجھ کو شہرت کی بلندی پہ چڑھاؤ تو سہی
ایک ہی بار مرا جشن مناؤ تو سہی
اس کے چندے کے لیے میں بھی کروں گا محنت
تم خسارے میں رہو گے نہ کسی بھی صورت
جشن کے بعد بھی میں تم سے نہ مانگوں گا حساب
اپنی تعریف میں تم مجھ سے لکھا لینا کتاب
دوستو ، اب تو ترس مجھ پہ بھی کھایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

جشن میں جس کو بھی تم چاہو بُلا سکتے ہو
اپنے احباب کو شعراء میں گنا سکتے ہو
شوق سے جیب میں رکھ لیجئے اکاؤنٹ
دل اگر چاہے تو دیدیجئے ففٹی پرسنٹ
مجھ کو ہرگز نہ کسی بات کا صدمہ ہوگا
ہاں مگر اپنے لئے میں نے یہی ہے سوچا
شعر پڑھنے کے لئے چاہیئے اچھی آواز !
وہ مرے پاس نہیں اس لئے لے نبرہ نواز
میرے شعروں کو گویوں سے گوایا جائے
میں بھی شاعر ہوں مرا جشن منایا جائے

مرزا کھونچ (بیتیا)

"ھزل"

مُرغے کی غٹرغوں ہوں کبوتر کی اذاں ہوں
میں ڈِسکو تمدن میں پلا ایک جواں ہوں
بیگم سے بغاوت کا نتیجہ ہے تو یہ ہے
دو سال سے اب اپنے ہی ابا کے یہاں ہوں
بیمار کسی اک روح کا اس میں ہے بسیرا
بوسیدہ سا مخدوش کرائے کا مکاں ہوں
ہر ماہ کی پہلی کو کہا کرتی ہیں بیگم
تم میرے جہاں گیر ہو میں نور جہاں ہوں
لکھوں گا غلط اُردو پڑھوں گا غلط اُردو
یہ حق ہے میرا کیوں کہ میں اک اہلِ زباں ہوں
مجھے ہو منسٹر کے تمہیں شرم ہو کیسا کھونچ
پوچھے جو کبھی کوئی کہو شان سے ہاں ہوں

سلطان جمہوری (بنگلور)

پروفیسر حیرت

پروفیسر حیرت جو حکومت کی جانب سے کوسٹل تعلیم دینے پر مقرر تھے، ڈاکیہ سے بڑے گھبراتے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی اُن کی آدھی جان نکل جاتی تھی اور خطوط کا پلندہ اس طرح لیتے تھے جیسے موت کا پروانہ ہو۔

"اوہ! میرے خدا!" ڈاکیہ کو سامنے سے آتا دیکھ کر وہ بڑبڑائے۔ چشمے کو دو ایک بار ہلا کر کوشش کی کہ کم از کم بصارت تو غلط ثابت ہو اور ڈاکیہ اپنے وجود میں غیر ڈاکیہ نظر آئے۔ مگر نہیں وہ سر سے پاؤں تک ڈاکیہ ہی تھا اور خطوں کا پلندہ تھماتے ہوئے کہا "پروفیسر صاحب! آج آپ کے نام بہت کم خطوط آئے ہیں!"

خطوں کی تعداد کم تھی، مگر ہر خط ایسے سوالات سے پُر تھا جن کے جواب کے لیے ہزاروں ارسطو و سقراط بھی ناکافی تھے۔ ایک صاحب نے سوال کیا تھا "کیا زمانے میں علمائے سائنس اس باب میں کہ قانونِ ثقل سیب ہی کا کیوں مرہونِ منت ہوا؟" پروفیسر صاحب نے عینک اُتار دی اور قلم اُٹھا کر لکھنے لگے۔ (نامعقول سوال پر وہ ہمیشہ عینک اُتار کر لکھا کرتے تھے تاکہ وہ خود اپنے نامعقول جواب پر شرمندہ نہ ہوں!)

انھوں نے لکھا، برخوردار! میں حکومت کی جانب سے آپ جیسے تشنگانِ علم کے ایسے علمی سوالات کے جوابات دینے پر مامور ہوں جو آپ کے تحصیلِ علم میں معاون ثابت ہوں۔ یہ نہیں کہ آپ ایسے سوال کریں جو نہ صرف اس تعلیمی اسکیم کا مضحکہ اُڑائے بلکہ عقل اور سمجھ آ جانے پر خود آپ اپنے آپ سے شرمندہ ہو جائیں! بے شک دنیا میں سیب کے علاوہ اور بھی پھل پھول تھے جن کے سر پر قانونِ ثقل کا تاج رکھا جا سکتا تھا، مگر مجھے یقین ہے اس کی جگہ کوئی اور بھی پھل ہوتا تو آپ کے اعتراض سے بچ نہیں سکتا تھا —— کیا آپ کو سیب سے اس لیے چڑ ہے کہ اس شجرِ ممنوعہ نے انسان کی وہ درگت بنائی ہے کہ ہر کوئی اپنا الزام دوسرے کے سر تھوپتا ہے!

دوسرا سوال تھا "کائنات کی ابتدا دھماکے سے ہوئی —— کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس دھماکے سے جو چیزیں تخلیق ہوئیں وہ بھی انسانی ذہن کی طرح ارتقائی تھیں؟"

پروفیسر نے جواب لکھا "آپ کا سوال نہایت جدید ہے —— اتنا جدید کہ اسے ہندوستانی درسگاہوں کے نصاب میں آتے آتے دس برس تو لگ ہی جائیں گے (معاف فرمائیں میں یہ نہیں کہتا کہ وزارتِ تعلیم کچھوے پر سوار ہے، بلکہ اتنی مدت کا ذکر اس لیے کیا کہ ہماری حکومت تعلیم کے معاملے میں تجرباتی چھلانگ کے بعد خرگوش کی طرح سو جاتی

ہے اور جب جاگتی ہے تو دیکھتی ہے کہ ولایتی کچھوے آسمانوں کی سیر کر رہے ہیں ــــ اگر وہ نصاب میں تبدیلی نہ کریں تو پاتال میں پہنچ جائیں گے اور اسی جلد بازی میں چند اور چھلانگ لگاکر قلابازی نمبر ایک یعنی 2+10 اور قلابازی نمبر دو یعنی 5+2+10 لگاکر مطمئن ہو جاتی ہے کہ اب ہمارے بچے امریکہ اور روس کی ہمسری پر تیار ہوں گے۔

مگر اساتذہ کی محیطِ عقل اس وجدان کا کہاں احاطہ کر سکتی ہے جو پھیلتی ہوئی کائنات سے منسلک ہے ــ کیوں کہ وجدان تو اپنے اندر کے دشمنوں کی سرکوبی کے بعد ہی ہاتھ آتا ہے) بلکہ ہو سکتا ہے کہ اور زیادہ وقت لگ جائے کیونکہ سائنس کی ترقی سے تعلیمی میدان میں ایسی مستقل علمی نمائش لگ گئی ہے جس میں نئے علوم ملبوساتی فیشن اور بال رکھنے کے نئے نئے ڈھنگ سے دکھائے جا رہے ہیں۔ روز روز کی سائنسی تھیوریوں میں ترمیم و تحریف دیکھ کر اگر حکومت اس انتظار میں رہے کہ جب یہ عمل ترمیم و تحریف، حذف و اضافہ ختم ہوگا تو اطمینان سے نصاب میں مستقلاً تبدیلی اور اساتذہ کی تربیت کر دی جائے گی ــــ تو اس میں بیچاری حکومت کا کیا قصور؟!

یہ تو یورپ و امریکہ کی سائنسی تیز گامی کا فتور ہے کہ وہ کسی منزل پر اطمینان سے قیام نہیں کرتی۔ بلکہ میں تو اسے ایک سیاسی چال ہی کہوں گا کہ وہ پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کو دوڑاتے رہنا چاہتے ہیں تاکہ وہ فرصت نہ ملے جو ترقی کا موجب بنتی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر اس لکچر کا مطلب ــــ؟ پروفیسر ہوں اس لیے لکچر دینا میرا اہم فریضہ ہوتا ــــ اور ابھی تو آپ کے سوال پر مقدمہ لکھنا باقی ہی ہے کیونکہ ایسے سوالات تو منیندی حضرات یا طلباء نہیں کر سکتے وہی کر سکتے ہیں جو پہلے سے جوابات جانتے ہوں۔ ہم لوگ ذہانت کو عمل پر ترجیح دیتے آئے ہیں اور اسی لیے آج اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اپنی بے عملی اور بے ضابطگی کی پردہ پوشی کے لیے دوسروں کی کمزوریوں کا پتہ لگانا سب سے پہلا کام سمجھتے ہیں۔ بہر حال!

سائنس کی بنیاد مشاہدہ اور مطالعہ پر ہے، مگر تصورات سے بھی اسے بلکسر مبرا نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے انسان اپنے طور پر حقائق کی جستجو میں اپناتا ہے۔ آفرینشِ کائنات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جس پر اب تک بہت سے مفروضے وضع ہو کر ردی کی ٹوکری میں پھینکے جا چکے ہیں۔ موجودہ مفروضہ "عظیم دھماکہ" ہے اور امید ہے کہ اس کی بازگشت تا دیر سنائی دیتی رہے گی اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ صورِ اسرافیل پھونکا جائے اور اس کے سامنے "عظیم دھماکہ" نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جائے ــــ مگر اس عالم میں اپنی ہائے ہُو سے کسے فرصت ہوگی کہ وہ ان میں تمیز کر سکے!

سائنس والوں کا کہنا ہے کہ دھماکہ سے سب سے پہلے جو چیز پیدا ہوئی وہ گراویٹی فورس یعنی قوتِ ثقل تھی جس کو نیوٹن نے شجرِ ممنوعہ کے ذریعہ معلوم کیا۔ اس کے بعد جیسے جیسے مزاجِ کائنات کی گرمی سرد پڑنے لگی دوسری "قوتیں" سر اٹھانے لگیں۔ ان میں بعض تو تیل اب تک سائنس والوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ پروفیسر بود کی اٹامک تھیوری اور روشنی کا دو رُخی وجود (کہ یہ مادہ ہے یا لہر) ایسی مثالیں ہیں جو یہاں پیش کی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے کُن کہہ کر کائنات پیدا کر دی اور اب خاموش بیٹھا بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے کہ کس طرح اس کے بندے کائنات اور حیات کے راز معلوم کرنے کے لیے پاپڑ بیلتے جا رہے ہیں ــــ ــــ دراصل لفظ "کُن" ایسا لفظ ہے جو صوتی اعتبار سے ایک دفعہ زبان سے ادا ہو جانے کے بعد اپنے ہر حرف کو ترتیب وار بغیر کسی بریک کے آواز کو برقرار رکھتا ہے ــــ جیسے کوئی بم کا دھماکہ ہو تو اس دھماکے کی فلک شگاف

آواز وقت کے ساتھ معدوم نہ ہوجائے بلکہ قائم رہے ـــــ "کُن" کہہ کر کائنات پیدا کی گئی تو یہ خالق کے سامنے منجمد ہوکر رہ گئی مگر بندوں کے سامنے اُن کی محدود بینائی کی وجہ سے کائنات کا تھوڑا تھوڑا حصّہ گزر رہا ہے۔ جو نیا حصّہ سامنے آتا ہے وہ ہمارے لئے نئی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ بہت سے ستارے اتنی دوری پر ہیں کہ اُن کی روشنی ہنوز سفر میں ہے اور زمین تک نہیں پہنچ پائی ہے۔

ثقلی قوت کی دریافت سے پہلے ہی یونان نے عناصر کی ترتیب ذرّات پر بنیادی تھی جسے بعد کے سائنسدانوں نے نیوٹرون، پروٹون اور الکٹرون کے نام دیئے۔ برسوں تک یہ ذرّات مربوط رہے، پھر کسی نے چھیڑا تو جامے سے باہر ہوگئے اور غیر منقسم ایٹم نے نقاب اُلٹ کر سائنسی بصیرت کو جو نظارا پیش کیا تو معلوم ہوا کہ ایٹم بنیادی ذرّہ نہیں ـــــ!! بلکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! مذکورہ تثلیث میں کوئی بھی بنیادی ذرّہ نہیں ـــــ!

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ سائنس دانوں کی ذرّہ نوازی ختم ہوگئی ہے۔ نہیں، بلکہ ذرّہ اور بھی ریزہ ریزہ ہونے کو تیار ہے یہاں تک کہ اس کی مادی خصوصیت قطعی معدوم ہوجائے اور سائنس داں حیراں و پریشاں چلا اُٹھے

۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

بہر حال عظیم دھماکہ جس سے کائنات پیدا ہوئی، "وقت" کی بھی پیدائش کا ذمّہ دار ہے۔ "وقت" کا تصوّر ام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ منطق کی رو سے اس پر سب سے پہلے آئنسٹائن نے نظر ڈالی۔ اور اسے مشرقین و مغربین ؛ ایک اہم جزو بنا دیا۔ مگر مشہور فلسفی علامہ اقبال جو آئنسٹائن اور برگساں کے ہمعصر تھے کہتے ہیں کہ "وقت" یا مانہ" ایک آزاد تخلیقی حرکت ہے جس کے سامنے کوئی ازل سے معین لائحہ عمل نہیں۔ انسانی نفس کے اندر "وقت" ے اور پہلوؤں کا بھی ادراک ہے جسے آئنسٹائن نے ریاضیات میں محدود ہوکر نظر انداز کر دیا ہے!

اس لیے آپ کا سوال کہ ابتدائی تخلیق میں انسانی ذہن کی سی ارتقائی کیفیت کن کن تخلیقوں میں تھی اُوپر کی تحریر سے واضح ہے۔ اب تک کی تحقیق سے انسان کے علاوہ اور کوئی مخلوق نہیں جو ارتقائی ہو اور جو کچھ بھی اس ے اور خالق کے درمیان حائل ہے اس کے ارتقاء کی تکمیل کے لیے ہے!!

زندہ دلانِ حیدرآباد کی تازہ پیش کش :
ممتاز انشائیہ نگار
ڈاکٹر رشید موسوی
کے بیس دلچسپ مضامین
کا مجموعہ !!

کاغذی ہے پیرہن

خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور
صفحات : (۱۴۰) (ڈیمائی)
قیمت : (۲۰) روپے

شہزاد معصومی

اعزاز اور آگے ملیں گے دمِ حیات*

نکلے نہیں زباں سے سخن کوئی واہیات
طنز و مزاح میں ہے یہ واہی کی خاص بات

غالب ایوارڈ کے لیے تھی مستحق یہ ذات
اعزاز اور آگے ملیں گے دمِ حیات

اکبر کے فنِ "طنز و ظرافت" کا ارتقا
واہی کی شاعری کی نمایاں خصوصیات

واہی کا حق ہے جس نے کہ طنز و مزاح کی
بھر دی ہے تلخیوں میں بھی شیرینیٔ نبات

طرزِ بیاں شگفتہ و شاداب کس قدر
واہی کی رنگا رنگ رہی ہیں نگارشات

آسان کچھ مزاحیہ نظمیں نہیں جناب
بندش نہ چُست ہو تو ہے پھر نظم واہیات

لازم فصاحت اور بلاغت کا علم ہے
پختہ ہوں تجربات تو پختہ مشاہدات

مرغی کا تذکرہ ہو کہ انڈے کی بات ہو
واہی کا ہر کلام ہے آئینۂ حیات

چلتی نہیں ادب کے کسی ڈاکٹر کی بات
واہی کے آگے اُن کی ہے نشتر زنی بھی مات

پھوڑا سماج کا جو کہیں آگیا نظر
بس اک ذرا سا چھیڑ ٹکے کرتے ہیں صاف ہات

ہے اُن کے پاس کس کی نہیں ایکسرے رپورٹ
حضرت کے علم میں نہیں کس کس کی نفسیات

نقّاد ہو کہ کوئی محقق کہ فلسفی
شاعر، ادیب، راہ رَو و رہنما کی ذات

کوئی وزیر ہو کہ دھانک ہو راج کا
نوکِ قلم سے ان کی ملی ہے کسے نجات

جب بھی یہاں مقدمۂ شوہری کھُلا
ہو جاتے ہیں وکیل وہاں بہرِ بیگمات

شوہر جو شکوہ سنج ہوئے آپ بول اُٹھے
ڈرتا ہوں، گھر میں ہو نہ قیامت تمام رات

منصوبہ پنج سالہ کہ نس بندی یوجنا
ملتے نئے نئے ہیں انہیں روز موضوعات

شہزاد حق تو یہ ہے بہرِ نقطۂ نگاہ
واہی کی واہیات میں بھی منفرد ہے ذات

☆

* نامور مزاح نگار رضا نقوی واہی کو غالب ایوارڈ عطا ہونے پر۔

مہندی ٹونکی
(راجستھان)

آؤ بہن لڑیں......؟

جھگڑالو پڑوسی میں وہ رومانیت نہیں ہوتی جو جھگڑالو پڑوسن میں ہوتی ہے۔ جھگڑالو پڑوسی سے زیادہ
جھگڑالو پڑوسنوں میں خوبیاں ہوتی ہیں۔ لوگ جھگڑالو پڑوسی سے خائف نہیں رہتے البتہ جھگڑالو پڑوسن سے
ہوشیار رہتے ہیں۔ کیوں کہ جھگڑالو پڑوسی تو زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور لڑتا بھی مردوں سے
ہے مگر جہاں دو پڑوسنوں میں جھگڑا ہوا پھر دیکھئے وہاں کا نظارہ ــــ یہ پڑوسنیں ایک دوسرے کے گھر کے
حال اور کارروائیوں پہ ایسے ہی نظر رکھتی ہیں جیسے دو دشمن پڑوسی ملک ایک دوسرے کی فوجی نقل و حرکت پہ گہری
نظر رکھتے ہیں۔ ایک گھر میں جہاں غیر معمولی کھٹکا ہوا یا چہل پہل زیادہ ہوئی تو دشمن پڑوسی جھٹ سے جاسوسی شروع
کر دے گا۔ بیچ کی دیوار میں چھید کر کے پڑوسن کے چھپے بھید معلوم کرنے گی یا دیوار پر سے اُچک اُچک کر اندر
کا حال دیکھا کرے گی۔ اپنے بچوں کو جاسوسی کے لیے بھیج دے گی! اس پر بھی اگر کچھ پتہ نہیں چلے گا تو اپنی
دوسری پڑوسن کے پاس کسی کام کے بہانے پہنچ جائے گی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے مقصد پہ آ جائے گی۔ اگر
جھگڑالو پڑوسن کا کچھ نقصان ہو جائے گا تو دوسری پڑوسن کا دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ اپنی ہم خیال پڑوسن سے
کہے گی "دیکھا ـــــ مالک نے کیسا بدلہ لیا۔ کسی کا دل ستانا اچھا نہیں ــ"

جھگڑالو پڑوسی سے یا جھگڑالو پڑوسیوں میں جب لڑائی ہوتی ہے تو وہ انسانیت کا جامہ اُتار کر حیوانیت
کی کھال پہن لیتے ہیں۔ تو تکار سے کے بعد گالیوں کی بوچھار شروع ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اُن کے چہروں پر
غصّہ کا جلال ہوتا ہے اور نہ گالیوں میں رومانیت اسی لیے وہ گالیوں کے بعد جلدی سے مارپیٹ پر اُتر آتے
ہیں جس کا نتیجہ اسپتال، تھانہ اور عدالت میں جا کر ملتا ہے جبکہ جھگڑالو پڑوسنیں کبھی اتنی جنگلی یا خونی نہیں
ہوتیں۔ اُن کی گالیوں سے "وصال یار" کا صحیح تصوّر بنتا ہے۔ اسی لیے تو اُن کی گالیوں سے دل میں گُدگُدی پیدا ہوتی ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ؛ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

دونوں پڑوسنیں چھوٹے ملکوں کی طرح فوجی طاقت میں کمزور ہوں تو دونوں اپنے اپنے گھر والے کے آنگن میں کھڑے
ہو کر تو تکار سے کو، الزامات کو شٹل کاک کی طرح ایک دوسرے پر پھینکیں گی۔ اگر لڑائی میں زیادہ ہی جوش آ گیا تو
بیچ کی دیوار پر سے سر اُونچا کر غصّہ کا دھواں چھوڑیں گی یا بیچ کی دیوار کی کھڑکی اگر ہوئی تو اپنا آدھا جسم نکال کر

بھیانک غصہ کا اظہار کریں گی۔ اگر اُن میں سے کوئی ایک جھگڑالو پڑوسن بولنے میں طاقتور ہے تو وہ مدِمقابل کے آنگن میں پہنچ جائے گی اور ہاتھوں کو نچا نچا کر تیر و تلوار جیسی زبان سے زبان دانی کا مظاہرہ کرے گی اور اگر دونوں ہی برابر کی لڑاکا ہوئیں تو دونوں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر دروازے کے سامنے گلی میں پہنچ جائیں گی دونوں ایک دوسرے کے بھید کو کھولیں گی۔ کردہ ناکردہ کرتوتوں کو بیان کریں گی۔ ایسا بیان کہ تماشہ دیکھنے والوں کو مزا آجائے اور پھر راستہ جام ہو جائے پھر اس کے بعد آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں کھُل جائیں گی۔ عورتیں چھتوں پر آکھڑا ہو جائیں گی۔

لیجیے صاحب! ہو گیا آدھ پون گھنٹے کا مہا بھارت! اس لڑائی کے بعد دو چار دن تک تو سرد جنگ چلتی ہے پھر وہ بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک جھگڑالو پڑوسن سے میری بات چیت ہوئی۔ میں نے پوچھا "اجی خالہ! تم سب محلّہ والوں سے لڑتی بھی ہو پھر میل ملاپ بھی کر لیتی ہو مگر اپنے پڑوس کی جو ماسٹرنی جی ہیں (وکیل صاحب کی بیوی) اُن سے تمہاری بول چال نہیں ہے کیا اُن سے بھی لڑائی ہے؟"

خالہ نے منہ بنا کر کہا "اے ہے ۔۔۔ ان سُوکھوں سے لڑے میری جوتی؟"

میں نے پوچھا "سوکھی؟ ۔۔۔ کیا مطلب ۔۔۔؟"

خالہ نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر کہا "بھیّا ۔۔۔ لڑے اُس سے جس میں کچھ دم خم ہو۔ اِن پڑھی لکھی سوکھیوں کے پاس نہ تو بولنے کو زبان ہے اور نہ دیکھنے کو آنکھوں میں روشنی۔ بولیں گی ایسے جیسے منمنا رہی ہوں۔ ایک تو ویسے ہی مریل پھر اُس پر چلتی اس نزاکت سے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں تیز ہوا میں اپنے دوپٹے یا ساڑھی کا پلّو اُڑنے سے پہلے یہ خود نہ اُڑ جائیں۔ آنکھوں پر ہر وقت دو سو نمبر کا چشمہ چڑھا رہتا ہے ان کمبختوں کے اولاد بھی مریل پیدا ہوتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی آنکھ جھپکانے بھی نہیں پاتے کہ موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھ جاتا ہے۔ ہمیں دیکھو ۔۔۔ پچاس کی پہاڑا بول رہی ہوں لیکن آنکھیں اب بھی اتنی تیز کہ دُور کی اُڑتی چڑیا پہچانتی ہوں۔ ماشاء اللہ آواز ایسی ہے کہ سارے گھر آگے پہنچتی ہے۔ ماشاء اللہ کچے پکے چودہ بچّے ہوئے مگر اب بھی جب نل نہیں آتا ہے تو کنوئیں سے بیس مٹکے کھینچ لیتی ہوں۔ موئی یہ کیا لڑیں گی نگوڑی چھپکلیاں۔ دو بچّوں کے بعد تو یہ لیڈی ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ دیتی ہیں، کرا دو ہمارا آپریشن"۔ میں نے جلدی سے بات بدلی "اجی خالہ۔ یہ تو سوچو ان بیچاریوں کو اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کسی سے بات کریں؟"

خالہ ہاتھ نچا کر بولیں "اے ہے۔ ایسا کونسا کام کرتی ہیں بیچاریاں۔ اُن سے زیادہ تو ہم کام کرتے ہیں۔ صبح کوّے بولنے سے پہلے پانی کی لائن میں کھڑے ہو جاتے ہیں لڑ جھگڑ کر بیس مٹکے پانی کے بھرتے ہیں۔ بچوں کو نہلاتے ہیں۔ شوہر کا کھانا تیار کرتے ہیں۔ گھر کی جھاڑو بہارو نکالتے ہیں۔ کھانا پکاتے ہیں۔ گھر کے لیے راشن سبزی لاتے ہیں۔ دن بھر بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں شام کو پھر سے کھانا پکانا۔ رات کو مرد تھکا ہارا آتا ہے تو اُس کی باتیں بھی سنتے ہیں مار بھی کھاتے ہیں اور اسکے پیر بھی دابتے ہیں۔ ایک یہ ہیں پڑھی لکھی بوائیں۔ بس ایک وقت کا کھانا جیسے تیسے پکائیں گی اور بن ٹھن کر نوکری کیلئے بسوں میں ہو جائینگی فدا جانے یہ نوکری بھی اچھی طرح سے کرتی بھی ہیں یا فرگشتی کرتی ہیں۔ شام کو آئیں گی تو مرجھائی بیل کی طرح پڑ جائیں گی۔ بچوں کو بہلائے گا بھی کھانا بھی پکائیگا۔ کماؤ عورتوں کے سامنے شوہر گردنیں ڈال دیتے ہیں۔" مجھے شرم آگئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کھول رہی ہو۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا ۔!

ڈاکٹر ماہل ناگپوری

چلو ناگپور

لیجیے ـــ سردیاں شروع ہوئیں اور ہمارے شہر میں حرارت دوڑنے لگی. ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اکتوبر سے لیکر جنوری تک شہر واسیوں کا خون بڑا گرم رہتا ہے. خون گرم ہو تو جذبے بھی گرم ہوتے ہیں. جذبے گرم ہوں تو قوتِ عمل و حرکت تیز ہوتی ہے. قوتِ عمل و حرکت تیز ہو تو ہل چل پیدا ہوتی ہے. ہل چل پیدا ہو تو ہنگامے کھڑے ہوتے ہیں اور ہنگامے کھڑے ہوں تو سمجھیے کہ اب رونقِ شہر بھی گویا موقوف ہوئی.

مختلف دیواریں اعلان کرتی ہیں ـــ چلو ناگ پور ـــ مختلف نکڑ جلسوں سے آواز اُٹھتی ہے ـــ چلو ناگ پور ـــ مختلف اخباروں میں اعلان چھپتے ہیں ـــ چلو ناگ پور ـــ مختلف پدیاترائیں چلاتی ہیں چلو ناگ پور ـــ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آتا ہے کہ ہوا اور فضاء میں یہی ایک نعرہ گونجتا ہے ـــ چلو ناگ پور ـــ!

گو ہم بھی فضا اور ہواؤں میں نکلنے سے پرہیز کرتے ہیں کہ مبادا لوبی ہوٹل میں جائیں تو چائے کی پیالی بھی اعلان نہ کر دے کہ ـــ چلو ناگ پور ـــ ہماری ناقص سمجھ میں یہ بات نہیں بیٹھتی کہ ناگپور میں ہوتے ہوئے بھی "چلو ناگپور" کی صدا کیوں اُٹھتی ہے؟ مگر اب ہم ریاستی حکومت کے بے حد ممنون ہیں کہ اس نے پندرہ بیس دنوں کے لیے ہمارے شہر میں ڈیرہ لگایا، ودھان سبھا سجائی اور ودھان منڈل بھرایا، تب کہیں چلو ناگپور کی حقیقت ہم پر منکشف ہوئی.

(یہاں لفظ 'بھرایا' کی وضاحت ضروری ہے. اسے ہرگز مقامی لفظ نہ سمجھا جائے. ورنہ آپ سوچیں گے کیا ودھان منڈل کسی گڈھا یا چوکی نیک ہے جسے وہ کبھی ممبروں اور کبھی پتھروں سے بھرا دیتا ہے ـــ؟ تو اطلاعاً عرض ہے کہ بھرانا بمعنی جمع کرنا، اکٹھا کرنا، سنوارنا، رونق دینا وغیرہ اگر آپ اِتنے معنوں پر اکتفا نہ کرسکیں تو ہم اس لفظ کے اور بھی بہت سے مطلب بتا سکتے ہیں لیکن اب جانے بھی دیجیے.

امسال یوں ہوا کہ نومبر اوائل سے ہی کڑاکے کی سردی پڑنے لگی. اِتنی شدید سردی کہ لو چھوٹ گئی اور سردی کی یہ شدت ہمارے شہر تک ہی محدود نہ تھی، اس نے تو سارے ودربھ کو ٹھٹھرا دیا تھا. لوگ باگ تھر تھر کانپنے اور دانت کٹکٹانے لگے تھے.

اب یہ بات کوئی ڈھکی چھپی تو ہے نہیں، بلکہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہے کہ پوری ریاست میں علاقۂ وِدربھ بطورِ خاص ایک پچھڑا ہوا علاقہ ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ پچھڑے ہوئے علاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے (بلکہ بہت نیچے) رہنے والوں کی تعداد وافر ہوتی ہے چنانچہ ندی نالوں اور کوڑا گھروں میں جھونپڑوں کی قطاریں دور تک دکھائی دیتی ہیں۔ ان جھونپڑوں میں شہر بھر کا کچرا اور گٹر لائنوں کا سارا (سادہ نہیں گندہ) پانی آ آ کر جمع ہوجاتا ہے۔ ان جھونپڑوں میں جو لوگ رہتے ہیں انھیں زمینی مخلوق یا آدم زاد نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ آدمی تو اچھی جگہ رہتا ہے! اچھی غذا کھاتا ہے اور اچھے کپڑے پہنتا ہے اس کے پاس بارش پانی سے، سردیوں میں ٹھنڈ سے اور گرمیوں میں دھوپ سے بچنے کا انتظام رہتا ہے۔ لیکن یہ بے چارے جو آدمی کہلاتے اور جانوروں سی زندگی گزارتے ہیں انھیں کیا کہا جائے جانور کہیں تو چوپالیوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ امسال شروع نومبر سے ہی پورے ودربھ میں کڑاکے کی سردی پڑنے لگی تھی۔ اندیشہ تھا کہ ایک بڑی آبادی ٹھٹھر کر نہ رہ جائے چنانچہ موم بائی نے کرپا درشٹی ڈالی اور ودربھ واسیوں کا سمّان کیا۔ انہیں اپنے لطفِ خاص سے نوازا یعنی کچھ چنے ہوئے مشک راج جو ابھی تک موم بائی کا ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے، انہیں ودربھ کے بعض دیہاتوں میں بھیج دیا۔

ودربھ کے دیہات کپاس کے ذخیرے ہیں یعنی کھیتوں میں اُگتی ہے اور منڈیوں میں چلتی ہے اور جو بچ رہتی ہے وہ ملوں کو چلتا کر دیتی ہے چنانچہ ودربھ کی بہت سی ملیں تالہ بندی سے محفوظ ہوگئی ہیں اور یوں بھی ملک میں "فارن کلاتھ" کے بڑے چرچے ہیں تو پھر فضول کپاس اور فضول ملوں کی ضرورت بھی کیا رہ جاتی ہے ——؟ تو بہرحال موم بائی اینڈ کمپنی کے پارسل کردہ مشک راجوں نے کپاس کی گٹھانوں اور سنتروں کی مچانوں کا مورچہ سنبھال لیا اور ایسی شاندار گھس پیٹھ کی کہ ہر طرف ان کی دوڑ بھاگ سے الاؤ سلگ اُٹھے۔

الاؤ سلگنے لگے تو کیا وردھا، امراوتی، کھام گاؤں، بالاپور اور کیا والنی سبھی مقاموں سے لوگ ہاتھ تاپنے دوڑ پڑے —— سردی نے یوں بھی پریشان کر رکھا تھا۔ بدن میں خون جامد ہو رہا تھا خصوصاً امراوتی والے تو پینتالیس سال کے ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ یہ سنہرا موقع ہاتھ لگا تو امراوتی اور وردھا میں ہاتھ تاپنے کی ہوڑ لگ گئی چنانچہ ضرورت کے مطابق بڑے بڑے الاؤ دہکانے پڑے مگر خدا بھلا کرے ہماری سرکار کا ——! جہاں پبلک نے کسی کارِ خیر کا آغاز کیا کہ یہ اپنا ڈنڈا لے کر مزاحم ہوگئی —— ڈنڈا تو حکومت کا ہوتا ہے لیکن گالیاں پولس سنتی ہے۔ نام سرکار کا اور بدنامی محافظوں کی۔ بھلا کوئی تک ہے ——؟

وہ تو اچھا ہے کہ جنتا کو وردھی پکش کی سہایتا حاصل ہے ورنہ رولنگ پارٹی تو عوام کو برف کا لڈو بنادے امسال بھی سرکار کا یہی ارادہ تھا اور سرکارِ عالی بار بار ایک ہی دھن سنا رہے تھے کہ دیپک راگ سنیں گے اور ادھر تان سین مہاراج نے ساگر کنارے بھری موجوں میں انگارات دیپک راگ سنا کر آگ لگادی تھی۔ سمندر میں آگ لگے تو کنارے نہیں جلیں گے بھلا؟ مگر وہاں تو تھپکیوں سے سارے مسائل حل کرنے کی عادت پڑی ہے۔

سو بے چارا ودربھ ٹھنڈی سانس بھرتا رہا پھر سلگ اٹھا اور پھر بھڑکنے لگا۔ بھڑکنے لگا تو ڈنڈے لہرانے لگے اور ڈنڈے لہرائے تو مشک راج کے ہرکارے چپکے سے کھسک لئے شکر نہیں معلوم تھا کہ سرکارِ عالی دربار لگا رہے ہیں لہٰذا دربار آرائی کی جو تاریخ ٹھہری اسی دن "بند، بند" کا نعرہ بھی لگ گیا یعنی عوامی زبان میں وہی بات ہوئی "تیل نکل گیا"

اس پکار پر پورا ودربھ لبیک کہتا ہے۔ ایک ایک ضلع، ایک ایک شہر اور ایک ایک بلاک سے کتنی ہی جنتا جنار دھن ناگپور آپہنچتی ہے۔ کوئی اس رخ سے کوئی اس رخ سے۔ کوئی اس گوشے سے اور کوئی اس سڑک سے بڑے بڑے جلوسوں اور پیدل مارچ کی شکل میں سول لائن کی طرف چل پڑتے ہیں کیونکہ سردیوں کے پندرہ بیس دنوں میں سارا ناگپور سول لائن میں سمٹ آتا ہے ـــ آخر ودھان سبھا سول لائن میں آباد ہے نا ــــ ؟

آباد تو خیر بہت سے بہت مہینہ بھر رہتی ہے ورنہ باقی گیارہ مہینے اسے کوئی پوچھتا بھی نہیں اور سال کے گیارہ مہینے ودھان سبھا نرسی آ رہتی ہے۔ سونی سونی ـــ اُداس اُداس ـــ اور بے رونق پڑی رہتی ہے اور جیسے ہی سرکار عالی کے ورود اور دربار آرائی کے شغل کا آغاز ہوتا ہے ودھان سبھا کے دن پلٹ جاتے ہیں۔

تو ہم عرض کر رہے تھے کہ ودھان منڈل کے شروع ہوتے ہی سارا ناگپور، بلکہ پورا مہاراشٹر سول لائن میں سمٹ آتا ہے۔ وہ ودھایک جو گھر پر یا شہر میں کبھی نہیں ملتا وہ ودھان سبھا میں مل جاتا ہے۔ وہ منتری جو عوام کیلئے دور کا جلوہ ہوتا ہے ودھان سبھا میں دیدارِ عام بن جاتا ہے۔

ودھایک اور منتری ہی نہیں وارڈ ممبر سے لیکر پریسیڈنٹ آف میونسپل کونسل اور میئر آف کارپوریشن تک ودھان سبھا میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہیں دردوھی پکش کے نیتاؤں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے اور بھانت بھانت کے سیوادلوں، سنگھ منڈلوں، سیناؤں، انجمنوں، اداروں، تنظیموں ملنڈ بھاؤں کے ارباب اقتدار بھی یہیں درشن دیتے ہیں ـــ یعنی کن کن میں بھگوان ہے اور یگ یگ بھگوان کا درشن ہے ـــ اور اس کی لیلا اپرم پار ہے ۔ اس لئے ـــ جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے۔

اگر ابھیلاشی کیول درشک بنا کھڑا رہا تو بھگوان کے درشن تو شاید ہو جائیں مگر بھگوان نہیں ہاتھ لگیں گے بھگوان لوپانے کے لیے ان کے پجاریوں اور پردھتوں کی پرواہ کئے بغیر گھس پڑنا چاہیئے اور بھگوان کے چرن چھو لینے چاہیئے یوں کہ بھگوان چرنداس سے ناراض نہیں ہوتے۔ اسے چرنوں سے اُٹھاتے اور گلے سے لگاتے ہیں یعنی آپ کے ہاتھ یا جیب میں جس قسم کی بھی اپلیکیشن ہے وہ اسے شگھر تا شگھر سویکار کر لیتے ہیں۔ آپ کی عرضی پر اپنے شبھ ہاتھوں سے ہستاکشر کرتے ہیں اور ان کا دوت یعنی سکریٹری اسے بحفاظت فائل میں باندھ لیتا ہے۔

اب آپ بڑی خوشی سے اپنے گھر واپس لوٹ سکتے ہیں کہ آپ کی منوکامنا پوری ہوئی اور آپ کے عزائم کامیاب ہوئے۔ جوابی کاروائی کے لیے آپ آئندہ گیارہ مہینے خوش فیصلے کا جھولا جھولتے رہیئے اور سال آئندہ جب پھر ایسی ہی درشن بیلا سجے تو پھر بھگوان کے دربار میں پرویش کریں۔ پھر چرن داس بن جائیں۔ پھر عرضی پیش کریں۔ آپ کی عرضی ایک بار پھر فائل میں لگ جائے گی۔ اس طرزِ عمل کی خوبی یہ ہے کہ طالب کبھی ناشاد نہیں ہوتا اور کم از کم، مزید گیارہ مہینے نئی خوشی گزار دیتا ہے۔ کہ صراحی آئے گی ـ خم آئے گا ـ پھر جام آئے گا!

آخر بھگوان کی اپنی بھی کچھ سمسیا ہوتی ہے ایک تو بھرا پرا سنسار، اور پھر آتی لمبی چوڑی جنتا جنار دھن۔ اب بھلا بھگوان کس کس کی سنیں اور کس کس کو لابھونت کریں۔ نہیں نہیں۔ آپ ہی کہیئے۔

بہر حال ودھان سبھا میں ودھایکوں اور منتریوں کو سبھی کا دل رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی ہار پہنائے نمسکار کرے۔ تالیاں دینے یا سڑے منتر سے مارے وہ ہر خوشی اور ہر دُکھ کو ہنس ہنس کر سویکار کرتے ہیں۔ اور اسی میں ان کی مہانتا ہے۔ ان کی استھا ہے اور ان کی شکتی ہے۔

صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک ودھان منڈل میں پورے دو درجن کا پرتی ندھی منڈل اپنا ہم نوا منڈلیا کے ساتھ طویل و عریض اور کشادہ لان میں ادھر سے ادھر گھومتا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ ودھان سبھا کا دربار نہیں آستانہ ہے اور یہاں اسمبلی سیشن نہیں سالانہ عرس منایا جا رہا ہے۔ جس طرح عرس کے موقع پر اندرون و بیرون ناگپور سے ایک کے پیچھے ایک صندل مبارک بھیڑ بھاڑ، باجے تاشے ناچ گانے، دھوم دھڑاکے اور شور وغل کے ساتھ آستانۂ عالیہ پر حاضری دیتے اور چادر چڑھاتے ہیں اسی طرح پچاسوں جن منڈلیاں ودھان سبھا میں آ کر اپنے اپنے طریقے اور میمورنڈم چڑھاتی ہیں۔

ان پندرہ بیس دنوں میں ودھان سبھا پچیس پچاس منسٹروں اور سیکڑوں ودھایکوں کا مایدہ بن جاتی ہے۔ ایک طرف جنتا کورد، دوسری طرف سرکاری پانڈو! ہر دکھی سنگھرش کرتا معلوم ہوتا ہے، اور ہر آدمی پہنچے ہوئے اولیائے کرام کا عقیدت مند نظر آتا ہے۔ ہر کسی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ بابا کی نگاہِ خاص اسے جگمگا دے۔ جگمگانے کی آرزو صرف عوام کو نہیں ہوتی۔ ودھایک حضرات بھی اسی حسرت میں مرے پڑتے ہیں، کسی کو کسی اہم بورڈ میں نامزد ہونا ہے۔ کسی کو وزارت کی آرزو ہے اور یہ سب کے سب چیف منسٹر یا ان کے خاص الخاص کے آگے پیچھے ارادت مندوں کی طرح گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔

شام میں ودھان سبھا سماپت ہوتی ہے تو ہر سڑک اور ہر چوراہے پر پولیس مین اور ٹرافک سنتری چاق و چوبند ہو جاتے ہیں۔ ہر چوراہے کے ٹرافک سگنل بھی برابر کام کرنے لگ جاتے ہیں اور ایسے میں چیف منسٹر، منسٹرس اور ڈپٹی منسٹرس کی کاریں اور جیپ گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی روی بھون، رام گری منسٹرز کوارٹرس اور ایم ایل ایز ہوسٹل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ قافلہ ختم ہوتا ہے تو ان کے پیچھے محتاجوں، حاجت مندوں، امیدواروں، ارادت مندوں اور شبھ چنتکوں کی ٹولیاں نکلتی ہیں۔ کوئی جیپ سے، کوئی ٹیکسی سے، کوئی آٹو سے، اور بہت سے سائیکلوں سے بمضبوط ارادوں کے مالک رکشوں اور دو ٹانگوں سے بھی روانہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے "ناگپور" کی طرف اور ہر قدم سے یہی صدا نکلتی ہے چلو ناگپور!

جب ناگپور میں ودھان سبھا بھرتی ہے تو ہر منتری بڑا مہذب، بڑا خوش اخلاق اور زندہ دل ہو جاتا ہے۔ سنتروں کے شہر میں آنے کے بعد بھی اس کی پاترتا ہو اور اس کی زبان رس نہ گھولے تو پھر تف ہے ایسے سنتروں پر! لیکن ہم نے نہیں دیکھا کہ اس موسم میں کسی سنترے نے ترش ذائقہ دیا ہو، ہر پھانک میٹھی اور رس بھری ہی نکلتی ہے چنانچہ منتری مہودے گئی رات تک شردھالو جنتا کے بیچ بیٹھے آرتی اترواتے، پھول چڑھواتے، مدرا انڈھلتے اور پیڑے اڑاتے ہوئے کومل شبدوں سے وارتا لاپ میں مگن رہتے ہیں اور جب بدن میں تھکن جھومنے اور نندیا رانی آنکھوں کے بیڈ روم میں ڈولنے لگتی ہے تو ایک جمائی لیکر جنتا جناردھن سے وداع لیتے ہیں۔

ناگپور آنے والا ہر ودھایک اور ہر منتری ناگپوریوں کے پریم بھاؤ سے بڑا متاثر ہوتا ہے۔ یہاں کی جنتا اپنے نیتاؤں کا بڑا سمان کرتی ہے چنانچہ سول لائن میں دن بھر ودھان سبھا چلتی ہے۔ سرکار اور ورودھی پکش کے سوال جواب ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی خوب شور شرابا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مار پیٹ کی نوبت آ جاتی ہے اکثر اوقات یہ مناظر فلموں کے سین بن جاتے ہیں یعنی کسی طرف سے پیپر ویٹ اچھل کر گرا۔ کہیں سے کسی کرسی نے قلابازی کھائی اور کسی طرف جوتوں چپلوں کی برسات ہو گئی۔ بعض اوقات انڈے، ٹماٹر، پیاز اور آلو تک ودھان سبھا میں پردیش کر جاتے ہیں۔ کبھی شیم شیم کی آوازیں اٹھتی ہیں۔ کبھی مردہ باد اور زندہ باد کی۔ ودھان سبھا کی عجیب ہنگامہ آرائیوں سے تنگ کر ودھایکوں اور منتریوں

کا جھنڈا باہر نکلتا ہے تو اِن کے مداحوں کا ہجوم انہیں گھیر لیتا ہے ہر آدمی کوئی نہ کوئی کاغذ لئے چڑھا آتا ہے جسے وہ ایک گن جمع کرکے منتری جی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور منتری جی دستخط کرکے سکریٹری کو، سکریٹری متعلقہ عملہ کو اور متعلقہ عملہ چوں کہ پردۂ غیب میں رہتا ہے اس لیے پتہ نہیں چلتا کہ وہاں سے کدھر کا سفر شروع ہوتا ہے۔

بہر حال وہ ایک اور منتری مہودے اپنا فرضِ عظیم ادا کرکے اپنے اپنے کامپ کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو وہاں کسی کو توشہ دان، کسی کو سنترملا کا ٹوکرا اور کسی کو مٹھائی کا ڈبّہ لئے حاضر پاتے ہیں۔ بعضے قدرداں پھولوں کے ہار اور گلدستے چمکاتے ہوئے بھی موجود ملتے ہیں۔ کوئی ڈنر کی درخواست کر رہا ہے تو کوئی ٹی پارٹی میں شرکت کا خواہاں یہ سارے قدرداں عموماً کسی علمی و ادبی یا سماجی یا تہذیبی و ثقافتی اداروں کے عہدیداران و اراکین ہوتے ہیں اکثر چھوٹے اخباروں کے مدیرِ اعلیٰ صاحبان بھی اس بھیڑ میں شامل رہتے ہیں کہ شاید منتری مہودے ان کی پکار بھی سن لے ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ؛ اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

غرض وہ ایکوں سے زیادہ منتری مہودے لوک پریہ ہوتے ہیں۔ ان کا ناگرک ستکار ہی نہیں وارڈ وائز اور محلّہ داری ستکار بھی کیا جاتا ہے بطورِ خاص وزیرِ تعلیم کا زبردست استقبال ہوتا ہے وہ اس لیے کہ اہلِ ناگپور تعلیم و تدریس کے بڑے قدرداں ہیں اور تعلیمی فروغ میں ان کی سعیٔ جمیلہ کا بڑا حصّہ ہے چنانچہ ہمارے یہاں متعدد کالج جونیر کالج، ہائی اسکول، ٹیکنیکل اور ووکیشنل تعلیمی ادارے اور دوسرے بے شمار کنڈر گارٹن، ابتدائی و ثانوی تعلیمی ادارے جاری و ساری ہیں۔ پھر بھی ہر سال ڈھیر ساری تعلیمی انجمنیں نئے نئے اسکول قائم کرنے کے لیے دوڑی پڑتی ہیں۔ یعنی اہلِ ناگپور نے گویا طے کر رکھا ہے کہ وہ سبھی کو سبق پڑھائیں گے۔

وزیرِ تعلیم کی قدر و منزلت یوں تو ہر طبقۂ زبان میں ہوتی ہے لیکن اردو والوں کے لیے وہ چندن کا پیڑ ہوتا ہے جس کی ہر شاخ سے لپٹنے کو خادمانِ اردو بے حد کوشاں رہتے ہیں اور جب سے ریاستی اردو اکیڈیمی کا قیام عمل میں آیا ہے تب سے ناگپور میں وزیرِ تعلیم کی حیثیت دو بلکہ سہ چند ہوگئی ہے۔ مہاراشٹرا بھر میں اردو کا جیتا جاگتا علاقہ صرف ناگپور ہے۔ یہاں ایسے قادر الکلام اور مجمع پچھاڑ شعرا موجود ہیں جو کسی بھی مجلس میں گھس کر مائیک تک پہنچنے کا نہ صرف دم خم رکھتے ہیں بلکہ صاحبِ اعزاز کی شان میں طول طویل قصیدہ بھی سنانے اور پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ــــ جو شعراء اسٹیج تک نہیں جا سکتے وہ مقامی اخبارات میں قطعۂ خوش آمدید چھپا کر قناعت کر لیتے ہیں۔

غرض وزیرِ تعلیم کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے کسی مشاعرے کی صدارت فرمائی کہیں مہمانِ خصوصی نے، کہیں تقسیم انعامات کی کسی جلسہ میں ان کی پر تہنیتی نظموں اور سپاس ناموں کی برسات ہے تو کہیں ان کی حیات فکر و فن اور کارناموں پر مقالے پڑھے جا رہے ہیں۔

اطراف و اکناف میں آنی اور ایسی قدر و منزلت دیکھ کر تو باقی وزراء بھی للچاتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی اسی محکمے سے منسلک ہوتے! ہمیں بھی سارا شہر تکتا اور ساری ریاست دیکھتی۔

دیکھئے کہیں آپ یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ وزرائے معظم کی جاہ داری صرف اردو والوں کو ہی آتی ہے۔ جی نہیں جناب اس کارِ خیر میں ہندی، مراٹھی، سندھی، گجراتی اور دیگر زبانیں بھی برابر کی شریک ہیں اس لحاظ سے ناگپور

محمد اسد اللہ (عزیز/ناگپور) (امراوتی)

ٹوپی

ٹوپی کی باضابطہ تعریف کہیں نہیں ملتی جب بھی اس کی تعریف کا مرحلہ آتا ہے ٹوپی تو اپنی جگہ رہ جاتی ہے البتہ ٹوپی پہننے والے کی تعریف آسمان کی بلندیاں ناپنے لگتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹوپی یوٹوپیا UTOPIA کی پیداوار ہے۔ شعراء حضرات عموماً آشفتہ سر آشفتہ مو ہوا کرتے ہیں اور اکثر حکومت بلکہ خود اپنے بھی دائرہ اختیار سے باہر پائے جاتے ہیں اسی لیے افلاطون نے انہیں اپنی یوٹوپیائی ریاست سے نکال باہر کیا تھا۔

ٹوپی پہن کر آدمی خواہ مخواہ شرفاء کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ شرافت کا گھر آدمی نہیں ٹوپی ہے۔ میرا دوست "مسٹر الف" ٹوپی ہی سے شرافت ادھار لے کر شہر بھر میں اینٹھتا پھرتا ہے اسی لیے ٹوپی اس کے سر پر قرضدار کی طرح ہر وقت سوار رہتی ہے۔ جبکہ مسٹر "ب" کے ٹوپی نہ پہننے کی وجہ یہ خدشہ ہے کہ کہیں اس کی ساری شرافت ٹوپی ہی میں منتقل ہو کر نہ رہ جائے۔ ٹوپی پہنے ہوئے آدمی کا اپنے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کا شریف ترین انسان ہے۔ کبھی کبھار وہ اقبال کے اس شعر سے متاثر ہو کر ٹوپی اتار کر رکھ دیتا ہے۔ ؎

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ ٹوپی نے اس کی ساری شرافت چوس لی اور اب وہ دنیا کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ بعض لوگ ٹوپی کو ڈھکن کی طرح استعمال کرتے ہیں کہ وجود کے برتن میں ابھرتی ہوئی شرافت کی بھاپ کھلے سر سے نکل نہ جائے لہٰذا اسے فوراً ٹوپی سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ ٹوپی کے بہت سے فائدے ہیں اس سے آدمی کی کوالٹی معلوم ہو جاتی ہے۔ آدمیوں کی طرح ٹوپیوں کی بھی کئی قسمیں ہیں ٹوپی سے کبوتر بھی برآمد ہوتے ہیں اور سونے کے انڈے بھی۔ کبوتروں سے امن پیدا ہوتا ہے اور سونے کے انڈوں سے چین۔ بعض لوگوں کو بے چینی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ٹوپی کی پہلی منزل آدمی کا سر اور آخری ہینگر (HANGER) ہے۔ باہر سے تھک تھکا کر آنے کے بعد آدمی کی بیرونی شخصیت تھک کر چور ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو گھر میں قدم رکھتے ہی چور چور ہو جاتی ہے گزشتہ زمانے

میں لوگ بجائے ایک سے زائد بیویاں پالتے تھے اب مہنگائی کے زمانے میں غم پالتے ہیں۔ بہرحال جب آدمی باہر سے گھر آتا ہے تو بیرونی شخصیت کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اسے ٹوپی کی صورت اُتار ہینگر پر لٹکا دیتا ہے۔

کیا خوب زمانہ تھا جب ٹوپی، بیوی اور چپل کے بغیر آدمی کی شرافت معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بیوی اور چپل پیروں تلے ہوا کرتی تھی اور ٹوپی سر پر یہ اس وقت کی بات ہے جب آدمی کے سر پر ملک کے چپے چپے سے منتخب ہو کر آئی ہوئی MAJORITY آباد نہیں ہوئی تھی دورِ حاضر میں اس MAJORITY نے اور بیوی نے مل کر آدمی کو وہ ننگی کا ناچ نچایا کہ اس کے سر کے سارے بال "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" کہہ کر رخصت ہو گئے تب آدمی سر پر اُن وطنوں کے بیٹھنے کے لیے کافی جگہ ہو گئی۔ تو آدمی نے اپنی ٹوپی اُتار کر اُن تازہ واردانِ بساطِ سر کو پہنا دی کہ لو یہ رہا تمہارا حصہ۔ اسی لیے آج کل ٹوپیاں نظر نہیں آتیں بلکہ جگہ جگہ چاندنی چوک دکھائی دیتے ہیں۔ اس موقع پر دوُر اندیشی سے کام لے کر سوچا جا سکتا ہے کہ سروں پر ٹوپیاں نہیں تو کیا ہوا ٹوپیوں کا سایہ تو ہے ہم سائے ہی کے لیے تو ٹوپی پہنتے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ سایہ اکثر بھوت پریتوں کا سایہ ثابت ہوتا ہے۔ بھوتوں کے سائے میں سب سے بڑی قیامت یہ ہے کہ اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا صرف برداشت کیا جا سکتا ہے۔ سو وہ بے چارے کر ہی رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک صاحب ہمارے سر سے ٹوپی غائب دیکھ کر اظہارِ افسوس کرنے لگے کہ "لوگوں کے سروں سے ٹوپیاں غائب ہو گئیں، غضب ہو گیا۔ نہ جانے قیامت کب آئے گی؟" ہم نے جواباً کہا ــ "جنابِ عالی! قطعی طور پر تو نہیں معلوم کہ کب قیامت کب آئے گی البتہ جب ہم کالج میں پڑھا کرتے تھے تو روزانہ بلا ناغہ آتی تھی۔" اس پر وہ صاحب قیامت کو اور جلد بلوانے کے لیے دو چار دعائیں بدبدا کر چل دیئے۔

نئے دَور کا آدمی اپنے سروں پر سوار مرئی اور غیر مرئی ٹوپیوں کو اس قدر بھگت رہا ہے کہ اسے ٹوپیوں کے نام ہی سے چڑ ہو گئی۔ کرسیوں اور مسندوں پر سوار ان ٹوپیوں کو اُتار پھینکنے میں وہ ناکام ثابت ہوا تو بے بسی کے عالم میں اپنے سر پر سوار ٹوپی ہی کو نوچ کر پھینک دیا۔ بعض ٹوپیوں نے اپنے کرتوتوں سے آدمی کی بے معنویت میں اضافہ کیا تو وہیں انسان کو اپنے کارناموں سے معنویت کی نت نئی ٹوپیاں بھی پہنائیں۔

آج بھی ٹوپی کو ہمارے سماج میں عزت کا مقام اور بزرگی کا مرتبہ حاصل ہے اسی لیے تو لوگ انھیں اب بھی اپنے سروں پر اُٹھائے پھرتے ہیں تاکہ ٹوپیوں کی موروثی عزت و توقیر کا کچھ حصہ ان کے بھی نام منتقل ہو جائے۔ ہوتا یہ آیا ہے کہ انسانی کارنامے جو پچھلے زمانے میں لوگوں نے انجام دیئے ٹوپیوں کی عزت و توقیر کا باعث ثابت ہوئے اور اب متاخرین ٹوپیوں کے نام لکھے گئے عزت کے وہی چیک BEARER بن کر بھنائے پھر رہے ہیں۔

کبھی ٹوپی سے آدمی کی شناخت ہوتی تو کبھی آدمی سے اس کی ٹوپی پہچانی گئی یعنی کارزارِ زندگی میں آدمی اور اسکی ٹوپی قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے ہیں ایسا بھی ہوا کہ آدمی پیچھے ہی رہ گیا اسکی ٹوپی آگے نکل گئی مگر ٹوپی سر پر سوار تھی لہٰذا اسکی کالی کا پول کھلا۔ عوام الناس نے بھی عبا و قبا میں چھپے آدمی کا جائزہ لینا ضروری نہ سمجھا مگر تاریخ میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ آدمی کی تساہل پسندی اور بدکاری نے وہ گل کھلائے کہ وہ بلا فرمائش عبا و قبا سے برہنہ ہو کر باہر چلا آیا۔ آج کل ٹوپیوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی دراصل عزت دار ٹوپیوں کی بدکاروں کی بستی سے روپوشی کی وجہ سے ہے!

ڈاکٹر سید محمد ظفر امام نظامپوری
(نیویارک*)

رفوگر کی تلاش؟

برسوں کی محنت کے بعد میں نے فنی اور دوسری کئی طرح کی ڈگریاں غیر ممالک سے بھی حاصل کرلیں، مگر ادبی خواہشات اب بھی سر اُٹھاتی ہیں اور ادبی ذوق اب بھی تشنہ ہے۔ میں بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی سیر نہیں ہوتا، اور کبھو کبھی میرے اندر کا ادیب مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کرتا رہتا ہے مگر چند سطروں کے آگے میرے خیالات اور تصورات کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں۔ پھر بھی میں اپنے شوق کو جاری رکھا ہوا ہوں، یہی مشورہ میرے ایک دوست نے اور میرے تجربے نے مجھے دیا ہے۔

ایک بار میں شاعروں کے نرغے میں پھنس گیا، اشعار سُننا، اشعار سمجھنا اور بات ہے۔ شعر کہنا تو میرے بس کی بات نہ تھی، مگر جس شاعر سے بھی ملا، مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان میں سے ہر شاعر کا ایک رفوگر ہے! یہی مشورہ مجھے ایک شاعر نے دیا کہ میں بھی اپنے لیے ایک رفوگر تلاش کرلوں۔

اور آج کل تو عجیب حال ہے، جو لوگ اچھی طرح گفتگو بھی نہیں کرپاتے، وہ ادیب بنے بیٹھے ہیں، ان کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں کتابوں کی رونمائی ہو رہی ہے اور لوگ اب اپنی کتابوں کی رونمائی میں اپنی دلہنوں کی رونمائی سے زیادہ خرچ کررہے ہیں، پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک بار میں ایک نئے انعام یافتہ ادیب کے در پہ حاضر ہوا، چائے کا دَور چلا، اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد بول اٹھے۔ "ادبی سیاست سے تم بالکل ہی ناواقف ہو، اس میں کبھی ایک لیڈر ہوتا ہے، اور ایک لیڈر ہی کی طرح تم سے بہت سے وعدے کرتا ہے کبھی موقع ملتے ہی تمہیں ایک دو قدم آگے بھی بڑھا دیتا ہے۔ اگر تم اس فن کو نہیں سمجھ سکے تو تم ادیب بننا تو دور کی بات ہے ادب سے بھی دُور رہو!"

وہ ادیب بن گئے۔

اور اب ان کی چند کتابوں کی بھی رونمائی ہو چکی ہے، وہ جدید افسانہ نگاروں کے صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں جب میں نے اپنے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے فرمایا "جب آئے ہو تو میرا ایک افسانہ سُنتے جاؤ"۔
اب وہ آئے گا۔ وہ ہلکا آتا ہے۔ ولادت کا فرض انجام دلاکر وہ اسے اس کے بوجھ سے نجات دلائے گا

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔

"افسانہ نگار پر اس کا ماحول کتنا اثر انداز ہوتا ہے، کبھی تم نے غور کیا ہے"

"دیکھو سڑک کے اس پار دیکھو" ——— انھوں نے اشارہ کیا۔

اور سڑک کے اس پار۔ پوسٹ مین لیٹر بکس سے خطوط نکال رہا تھا۔

آہ نیا ادب، تمثیلی ادب!

میں اپنے ذہن کی نارسائی پر شرمندہ تھا کہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھ پایا۔ انھیں ماحول میں کھوتا دیکھ کر میں تیزی سے ادبی رہنما کی تلاش میں نکل پڑا۔

آپ اردو کے ایک ماہنامہ کے اڈیٹر، منیجر، ناشر اور سب کچھ ہیں، ماہنامہ سال میں کم از کم چار یا پانچ بار ضرور شائع ہوتا تھا اس میں ادب سے زیادہ سرکاری اشتہارات ہوتے ہیں۔

انھوں نے میری درد بھری داستان سن کر مجھے اس ادبی ماہنامہ کا لائف ممبر بننے کا مشورہ دیا۔ پرچہ تو خدا کے بھروسہ پر چلتا ہے مگر اردو کے ایسے ماہناموں کو اکثر کسی کی نظر لگ جاتی ہے۔ اس لئے لائف ممبر بننے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میری تشنگی بڑھتی جا رہی تھی، میری جد و جہد جاری تھی اور تلاش بسیار کے بعد میں اردو کے ایک بزرگ افسانہ نگار کے پاس پہونچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد بھی میری صورت انھیں آشنا معلوم نہ ہوئی تو وہ گویا ہوئے۔

"کیا آپ نے کبھی مجھ سے تعلیم حاصل کی ہے؟"

"نہیں"

تو پھر آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے!

میں نے اپنے "زانو کو تہہ" کرتے ہوئے کہا "میں نے آپ کی بہت شہرت سنی ہے اور میری اردو ادب سے دلچسپی آپ کے دولت کدہ تک مجھے لے آئی ہے، اگر آپ فرصت کے کچھ لمحات میرے لیے نکال سکیں تو بڑی عنایت ہوگی۔"

"آپ اس عمر میں اردو پڑھنا چاہتے ہیں"

"نہیں نہیں" میں نے انکساری سے کہا۔ "آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی تحریروں پر اصلاح لینا چاہتا ہوں"

"ہاں ہاں یاد آیا میرے ایک دوست آپ کی اس خواہش کا ذکر کر رہے تھے"

"ایک بات واضح کریں" انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"آپ شاعر تو نہیں"

"نہیں نہیں" میں نے بڑی عجلت سے یہ الفاظ ادا کئے۔

"بسم اللہ تو کل آپ اپنے افسانے لے کر حاضر ہوں"

میں خود کو بہت بڑا افسانہ نگار تصوّر کرتے ہوئے اپنے خیالات میں غلطاں، افسانہ نگاروں کے ہجوم تک جا پہنچا۔ میرے خیالات بہت تیزی سے بدلتے جا رہے تھے، ملک کے تمام رنگین رسالے یکے بعد دیگرے [illegible] گزر رہے تھے، اور اردو ادب کا کوئی بھی رسالہ میرے افسانہ [illegible] کے بغیر نامکمل تھا، [illegible]

اور انھیں خیالوں میں کھویا میں گھر آگیا۔

راتوں رات کئی افسانے تحریر کر ڈالے، کسی کو دوبارہ لکھا، کسی کی نظرِ ثانی کی اور صبح سویرے کاغذات کو سمیٹے منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

اللہ کا شکر تھا وہ گھر پر مل گئے، جاڑوں کی صبح تھی، وہ لیٹے لیٹائے ایک آرام دہ کرسی میں نیم دراز تھے۔ اُن کی مسکراہٹ میرے تصوّر میں شہرت کے دروازے کھول رہی تھی۔ جب تھکن کم ہوئی اور کچھ سکون ملا، تو بہت اَدب سے میں نے اپنا بہترین افسانہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اور نظریں جمائے انہیں دیکھتا رہا وہ بے حد غور سے کاغذات دیکھ رہے تھے، جیسے ایک ایک لفظ پڑھ رہے ہوں، ایک بار بھی ان کے قلم نے جنبش نہیں کی، میں اپنی اَدبی کامیابی سے سرشار ہو رہا تھا وہ دھیرے دھیرے اپنی کرسی سے اُٹھے اور میری تحریر میرے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

"رفوگری کی بات تو اور تھی، میں پیوندکاری سے نابلد ہوں اور خیاطی کبھی میرے آباو اجداد کا پیشہ نہیں رہا"

اور اس کے بعد میں نے افسانہ لکھنے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا ہے، اور اب مزاحیہ ادب کے لیے ایک رفوگر کی تلاش جاری ہے۔ ■□

اقبال

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں ۔۔۔ مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے ۔۔۔ واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

٭

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ۔۔۔ ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر ۔۔۔ وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ ۔۔۔ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

٭

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں ۔۔۔ مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف ۔۔۔ پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

متین قادری (اورنگ آباد)

(خاکہ)

شری سیوک رام

سیوک رام جی دل و جان سے جنتا کی سیوا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اُن کی خدمات سے استفادہ کرنا نہیں چاہتا۔ سیوک رام کا اصلی نام تو کچھ اور ہے لیکن انھوں نے عوامی مقبولیت کے لیے یہ پرکشش نام اپنایا ہے ویسے سیوک رام جی نہایت بھولے بھالے اور سیدھے سادھے انسان ہیں۔ عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ فربہ اندام سہی لیکن وہ دماغ و نظر کے بڑے تیز اور اپنے کام میں نہایت ہی ماہر ہیں۔ مگر موقع نہ ملنے کی وجہ سے اُن کی اہلیت وصلاحیت زنگ آلود ہونے کے قریب ہے۔

سیوک رام جی پوجا پاٹ بھی کرتے ہیں اور دان دھرم میں پیش پیش رہتے ہیں ایک دن سیوک رام جی مندر سے پوجا پاٹ کرکے نکلے ہی تھے کہ انھیں دینو پہلوان نظر آگیا جو دوڑتا ہوا ان ہی کی طرف چلا آرہا تھا قریب آکر وہ اپنی سانس کو درست کرتا ہوا بولا۔

"سیوک رام جی چلیئے . . . جلدی سے چلیئے . . ."

"کہاں ـــــ؟" سیوک رام جی نے اس انداز سے پوچھا جیسے بہت بڑا معرکہ سر کرنے جانا ہو۔ لیکن دینو پہلوان نے نہایت سادگی اور معصومیت سے کہا ـــ "میری بیوی کی پہلی زچگی ہے اور وہ سخت ترین دردِ زہ میں مبتلا ہے"۔

اب بھلا سیوک رام جی کیا کر سکتے تھے۔ پہلے تو کچھ جھجکے، شرمائے۔ وہ دینو پہلوان کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دینا چاہتے تھے کہ اچانک اُن کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یہی تو ایک موقع تھا جنتا کی سیوا کرنے کا۔ چنانچہ انھوں نے دینو پہلوان کو تسلی دی۔

"تم فکر نہ دینو۔ بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم گھر چلو میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں"۔

اور واقعی سیوک رام جی دس منٹ بعد لکشمی دائی کے ہمراہ دینو پہلوان کے گھر پہنچ گئے۔ یہ تھا عوامی خدمت کا جذبہ سیوک رام جی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دینو پہلوان کو دس بیس گالیاں رسید کرکے دھکّے دے کر باہر نکال دیتا۔ لیکن سیوک رام جی نے نہ صرف خندہ پیشانی سے دینو پہلوان کی بات سنی بلکہ لکشمی دائی کے ہمراہ خود بھی بہ نفسِ نفیس حاضر ہوئے۔

یوں تو ہمارے ملک میں مسائل کی کمی نہیں۔ لیکن سیوکوں کی بھی کمی نہیں۔ شہر کی ہر گلی، ہر کوچے میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں وہ ہر منٹ ہر لمحہ تن من دھن سے آپ کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان سیوکوں کی کئی قسمیں ہیں:

چھوٹے سیوک، بڑے سیوک ان سیوکوں میں بھی کچھ سیوک ایسے بھی ہیں جو بیچارے بلا معاوضہ لوگوں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ گو کہ آخر الذکر سیوکوں کی تعداد بہت کم ہے۔ معاوضہ پر کام کرنے والوں کی تعداد البتہ دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی ہے کیوں کہ معاوضہ پر خدمات انجام دینے والے سیوکوں کے کام بہت جلد نپٹا دیئے جاتے ہیں ۔ "کیوں ؟" یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم بھی جانتے ہیں اور آپ بھی یعنی رشوت۔

ہمارے سیوک رام جی بلا معاوضہ بلا تفریق مذہب و ملت عوام کی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اب دینو پہلوان کا ہی مثال لے لیجئے۔ اگر سیوک رام جی چاہتے تو سو، پچاس روپے دینو پہلوان سے اینٹھ سکتے تھے لیکن سیوک رام جی میں عوامی خدمات کا صحیح جذبہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ صرف بخشی دائی کو اپنے ساتھ لائے بلکہ آٹو رکشہ سے آنے جانے کا خرچ اور اس کی فیس بھی اپنی جیب سے ادا کی۔

ان سب باتوں کے باوجود بھائی سیوک رام جی کو کوئی عوامی عہدہ نہ مل سکا۔ ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہونے کی بات دور رہی وہ اپنے محلے کے وارڈ ممبر بھی نہ بن سکے۔ لیکن سیوک رام جی بھی کبھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں۔ سچ بھی یہی ہے وہ لیڈری کیا جو مایوس ہو جائے۔ سچا سیوک تو وہی ہوتا ہے جو آخری سانس تک نا امید نہ ہو۔

سیوک رام جی کی والدہ بھی یہی کہتی ہیں کہ "بیٹا سیوک رام کیئے جا جنتا کی سیوا۔ ایک دن ضرور ملے گا میوہ"۔

4/FORM W (دیکھئے رول ۸)

مقام اشاعت :	حیدرآباد
وقفۂ اشاعت :	ماہنامہ
پرنٹر و پبلشر کا نام :	سید مصطفیٰ کمال
	ہندوستانی، ۱۰۔۶۔۶۸۲ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۳
ایڈیٹر کا نام :	سید مصطفیٰ کمال
	۱۰۔۶۔۶۸۲ دبیرپورہ، حیدرآباد
نام اور پتہ جن کا ایک فی صد سے زائد حصہ ہے	قیصر کمال
	۱۰۔۶۔۶۸۲ دبیرپورہ، حیدرآباد ۲۳

میں ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میری علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۰ء دستخط : سید مصطفیٰ کمال

پانڈو سیر تاج (حیدرآباد)

سلیمان خطیب کا مشن اور ان کی زبان

{ یہ مضمون سلیمان خطیب مرحوم کی یاد میں گلبرگہ میں منعقدہ ایک جلسہ میں پڑھا گیا ——!! }

خطیب مرحوم کی شخصیت اور شاعری، اُن کے کلام کے فکری دھارے اور اُن کے جذباتی رویے فی الحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورے۔ سلیمان خطیب کی سماجی حیثیت اُن کی باخبری، ملی اور معاشرتی مسائل سے آگاہی اور واقفیت۔ اُن کے مزاج اور کلام میں طنز و مزاح کے تیر و نشتر، سوز، دردمندی، گہری سوجھ بوجھ، مقصدیت، معنویت اور جاذبیت پر بہ حیثیتِ مجموعی اور علاحدہ مضامین کی شکل میں، کم از کم دکن میں، بہت کچھ لکھا اور پڑھا گیا۔ میرا اُن کے آموختہ کرانے اور تکرار کا مطلق ارادہ نہیں۔ البتہ ایک بات کا اضافہ کرنا مقصود ہے کہ "وہ آئے، انہوں نے تسخیر کیا اور اپنے رب کی طرف لوٹ گئے"۔ تصرف کے ساتھ یہ مقولہ اُن پر بھی صادق آتا ہے۔

خطیب صاحب کی زندگی خوش درخشید کی ترجمانی کرتی تھی لیکن وہ شعلۂ مستعجل ہرگز نہ تھے۔ لگ بھگ ۶۰ سالہ کامیاب اور بھرپور زندگی وہ جیئے۔ وہ آسمانِ ادب پر اچانک طلوع ہوئے۔ . . اپنی کج کلاہی، غیرت مندی اور خودداری کے باوصف بڑی شان سے زندگی گزاری۔ مشاعروں اور عام جلسوں کے واسطوں سے مطلعِ ادب پر چھائے رہے۔ جہاں، جس طرف، جدھر گئے وہاں عوام اور خواص میں مداحوں کا بڑا حلقہ چھوڑا۔

خطیب مرحوم کی شاعری، فن اور زبان کے لاتعداد پہلو ہیں۔ سردست تین اہم نکات کی طرف توجہ دینا اور معروضات پیش کرنا مقصود ہے۔ اولاً —— سلیمان خطیب کا مشن اور ان کی زبان، جس کو انھوں نے بطور خاص اظہار ذات کا وسیلہ بنایا۔ دوئم —— زبان کی لفظیات، محاورہ۔ فنی ضرورتوں کا خیال، فنی روایات کی پاسداری اور اصول و قواعد کا التزام عروض سے واقفیت، بحروں کا انتخاب، مکمل تشبیہات، مرکب استعاروں کا استعمال، جامع اور بلیغ تراکیب، پیکر تراشی، منظر نگاری، احساسات اور جذبات کی عکاسی، بیک وقت خالص ادبی اور دکنی زبان میں یکساں قدرت اور دسترس۔ اور سوئم۔ کلام خوانی۔ نظم اور اشعار پڑھتے وقت خطیب مرحوم کا انداز وہ منفرد انداز تھا جس کی کامیاب تقلید اور اس نوعیت کے تاثرات کے حصول کا تصور بھی محال ہے۔

کہ گلاو سلیمان خطیب اُن کی باوقار شخصیت، اُن کا اپنا نام نکالے جانے پر ڈاکٹر ... کا انداز ...

سے قبل حاضرین پر نظر ڈالنے کی ادا وہ شانِ بے نیازی جیسے کہہ رہے ہوں۔ ہزار دل کا یہ مجمع، یہ حاضرین میری زبان، میرے کلام کی گرفت میں ہوں گے . . . ایک ذرا مجھے بولنے تو دو۔
اور پھر جب خطیب اپنی آواز، اپنے انداز، اپنے تخاطب سے کبھی فقرے چست کر کے کبھی سامعین میں سے کسی کے فقرے کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر ایسی کیفیت اور ایسا ماحول پیدا کر لیتے کہ تمام حاضرین گوش بر آواز اور ہمہ تن چشم بنے تیار بیٹھ جاتے ۔۔ اس نوعیت کے ماحول کی تشکیل اور تعمیر خطیب کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی اور اس اہتمام میں شاعر خطیب سے زیادہ اداکار خطیب کو دخل ہوتا تھا۔ خطیب اپنے انتہائی ڈرامائی لیکن بے حد فطری انداز میں آگے آگے ہوتے اور مجمع اُن کے ساتھ ۔ اُن کی مرضی کے مطابق، اُن کی پسند سے، اُن کی پسندیدہ سمت اور رفتار سے اُن کے ساتھ ہنسنے کے لیے تیار ہوتا ۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن خطیب کے لیے یہ کھیل تھا۔

خطیب جب پڑھتے تو چہار گوشوں سے اُن کی نظموں کے عنوانات دے کر فرمائشیں ہوتیں۔ مصرعے دہرائے جاتے۔ خطیب جس کا دل چاہتے رکھتے، یا پھر خود اپنی پسند سے کوئی نظم سُناتے۔ لیکن اس صورت میں بھی کہیں ناخوشگواری، بد مزگی اور آزردگی کبھی نہ پائی جاتی۔ خطیب کی نظم خوانی کے دوران سامعین کو قہقہوں سے بے قابو ہوتے دیکھا گیا ہے، درمیان میں سانس روکے، گوش بر آواز پایا گیا ہے تو نقطۂ عروج پر آنکھوں کے کٹوروں سے بھی چھلکتے دیکھے گئے ہیں۔ اس میں عوام اور خواص کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

خالص اُردو، فصاحت اور بلاغت کے درجے کو پہنچی ہوئی اُردو کا استعمال وہ کرتے تھے۔ اَدبی زبان میں اظہار کا موقع ہوگا تو خطیب اپنی بات اس قدرت اور کامل دسترس سے کہیں گے کہ گویا وہ اس زبان اور اس طرزِ اظہار پر استادانہ عبور رکھتے ہوں۔ اپنے ایک پاکستانی دوست کو خط میں مشورہ دیتے ہیں۔

نقادِ بے دماغ کی تحریر دل پذیر
بے معنی شاعری کا بھی اسٹاک کیجیے
بے وزن شعر ہوتے ہیں پڑھتا ہے وزن ڈاک
یہ سوچ کے، سمجھ کے، ذرا ڈاک بھیجیے۔

'عشق کی آگ' نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ خالص اَدبی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔

اس آگ ہی کا پرتو اَسرارِ قلب گوتم ❊ تقدیسِ روحِ عیسیٰ، پاکیزگیٔ مریم
افلاک، عرش و کرسی، ماہ و جلالِ یزداں ❊ آتش بکفِ لالہ، شبنم بچشمِ پُرنم
یہ آگ ہر جگہ ہے، کہیے کہاں نہیں ہے ❊ یہ آگ گر نہیں تو کون و مکاں نہیں ہے

اپنی شہرۂ آفاق نظم "ساس بہو" میں تعلیم یافتہ بہو سنجیدہ اور باوقار لہجے میں ساس سے جو کہتی ہے اُن اشعار کے فکری عنصر اور زبان کی انفرادیت میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟

بات ہیرا ہے بات موتی ہے ❊ بات لاکھوں کی لاج ہوتی ہے
بات کہتے ہیں ربِّ اَرِنی کو ❊ بات اُمّ الکتاب ہوتی ہے
بات سینے کا داغ ہوتی ہے ❊ بات پھولوں کا باغ ہوتی ہے
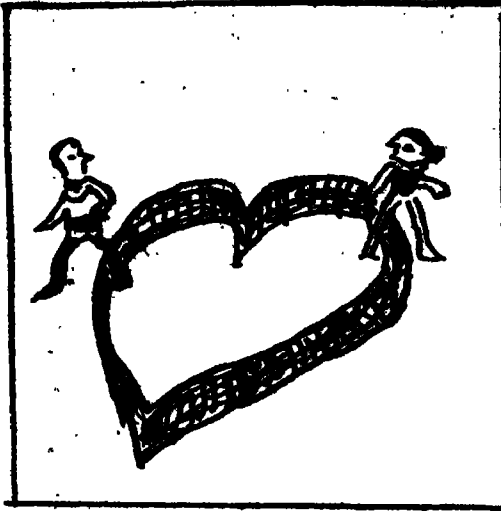
بات نیکی ثواب ہوتی ہے ؛ بات خیرہ عذاب ہوتی ہے
بات برگِ گلاب ہوتی ہے ؛ بات تیغِ حساب ہوتی ہے

بات ہی کے لیے استعاروں کا انتخاب و استعمال لاجواب ہے اور پیکر سہلِ ممتنع میں ملاحظہ ہو۔

بات ہر بات کو نہیں کہتے
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

خطیب کی ایک مشہور نظم رقاصہ میں شہری شاعر رقاصہ کے باؤ بھاؤ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔ یہاں بھی شستہ شائستہ زبان، تشبیہات، ترکیبات اور پھر پیکر تراشی کی مکمل اور موثر مثال دیکھئے۔ کتنا خوبصورت، سجیلا اور مکمل پیکر تراشا ہے خطیب نے۔

سر بزم گرتی ہے بجلی تڑپ کر ؛ تڑپ کر اُٹھی تو اُٹھا شورِ محشر
کہ بہتی ہے سیال چاندی کی چادر ؛ صنوبر جیسے بھرتا ہے دریا کے اندر
کسی کے شبستاں سے اُٹھ کر چلا تھا . . .

اپنی ایک نظم میں حب الوطنی سے سرشار خطیب ان الفاظ میں ملک کی اقبال مندی کے خواہاں ہیں۔ یہ قطعہ خطیب کو بے حد پسند تھا۔

ہمالہ کی چاندی پگھلتی رہے ؛ مرے گھر میں گنگا اُبلتی رہے
یہ گوتم کی گاندھی کی پیاری زمیں ؛ ہمیشہ جواہر اُگلتی رہے

اقبال کی غزل کا شعر ہے

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب ؛ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

اقبال کے اوجِ فکر کا غماز ہے لیکن وہ یہاں خطیب ہیں اور اُن کا مخاطب ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد ہے یعنی خطیب اس کے خطیب بھی ہیں لیکن اس شعر بلکہ دعائیہ میں وہ خطیب نہیں۔ اس شعر میں دعا مانگتے ہیں، خود اپنے بچوں اور اس سماج و ملت کے ہر بچے کے لیے جس کے وہ خود ایک فرد تھے۔

بچوں کو مرے مالک جیسے کا تو ہنر دے ؛ آنکھیں تو دی ہیں تو نے آنکھوں میں کچھ نظر دے

ان کی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

مانا حریفِ کہکشاں اور بھی ہیں تیرے مگر ؛ میری نظر نے چن لیا، اپنی نظر کو کیا کروں

خطیب نے بے حد طباع، خلاق اور منفرد طبیعت پائی تھی۔ پامال راہوں سے گزرنا اور تقلید کا نقش بنانے سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ زبان کے علم، اساتذہ کے ادبی ورثے اور روایات سے استفادہ انھوں نے کیا لیکن بنیادی طور پر وہ اجتہادی ذہن کے مالک تھے۔ اپنی راہ الگ نکالنا جانتے تھے۔ ادبی زبان ہو یا عوامی دکنی ان کے اشعار سے ہمیشہ اظہار اور مہذب و شائستہ لب و لہجے کا اعجاز ہوتے۔

لب و لہجے کی اسی تاثیر، زبان و قوت اظہار کے فنکارانہ اظہار پر ڈاکٹر راہی فدائی نے انہیں بے حد مکمل خراج پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

اک اک شعر ہے اعجاز سلیمان خطیب ؛ کس کو حاصل ہے یہ انداز سلیمان خطیب !
نغرتی دجھی، قلی قطب تھے شیدا جس کے ؛ وہ زباں اب ہے بجا طرز سلیمان خطیب

سلیمان خطیب زبان پر ہی نہیں، اظہار اور بیان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ایسی شستہ، شائستہ ادبی جمال و جلال کی پیکر، نادر تشبیہات، استعاروں، تراکیب سے معمور و مرکب یہ زبان — تراشیدہ مصرعے، رواں اور بولتے اشعار۔ خطیب چاہتے تو اسی میدان میں اسی زبان اور اسی نوع کی نظم نگاری میں جھنڈے گاڑ سکتے تھے۔ بڑے بڑے شاعروں میں اپنا نام گنوا سکتے تھے۔ پھر ایسا فنکار، باکمال اداکار، زبان کا رمز شناس، طباع ذہن اور حساس دل کا مالک سلیمان خطیب خالص ٹکسالی زبان اور ادب کی شاہراہ سے اُتر کر دکنی کی اوبڑ کھابڑ اور ناہموار گلیوں میں کیوں اُترا ؟ یہ ایک توجہ طلب نکتہ ہے۔ خطیب کے ماضی و حال کی زندگی اور اُن کے مزاج و شخصیت پر نظر ڈالنے سے اس نکتے کی وضاحت اور تفہیم ہو جائے گی۔

جو لوگ خطیب مرحوم کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ، اُن کی یتیمی یسیری، غربت اور افلاس، الم ناکیوں اور محرومیوں سے واقف ہیں وہ اس حقیقت سے بھی خوب آگاہ ہوں گے کہ اُس وقت یکسر نامقبول اس خرابے میں خطیب خود نہیں آئے بلکہ اُن کے آس پاس کے کمزور، مجبور، ناانصافی، نابرابری اور ظلم و استبداد کے شکار نچلے طبقے کی بے بسی، محرومیوں، زخمی دلوں کی سسکیاں اور آہیں انہیں اس کوچے میں کھینچ لائیں۔

سلیمان خطیب کے مزاج کی درد مندی نے انہیں کمزوروں اور دہقانوں سے قریب کر دیا۔ وہ خود ایک متوسط طبقے سے متعلق تھے لیکن عملی طور پر نچلے طبقے سے زیادہ مانوس رہے۔ اس طبقے کے افراد کی زبان میں اُن کے دُکھ درد سُننا، دکھ بانٹنا، انہیں دلاسہ دینا، اُن میں مایوسی سے بچنے اور نئی اُمنگوں کے ساتھ جینے کا حوصلہ پیدا کرنا یہ خطیب نے ہمیشہ کیا۔

پھر یہ حساس شاعر جس کی شخصیت اور مزاج کی تشکیل و تعمیر اس طرح کے دُکھوں اور تلخ تجربات کی سان پر گھس کر ہوئی تھی محض اُن کے دُکھوں کا تماشائی کیوں کر رہ سکتا تھا ؟ خطیب کو قدرت نے زبان و اظہار کی قدرت اور توانائیاں ودیعت کی تھیں۔ وہ اس کمزور اور نچلے طبقے کے دُکھ درد اور اُن کے مسائل کو سمجھنے، سمجھانے اور اُن کی نمائندگی کرنے اور اُن کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کرنے کے عزم کو لے کر اس کوچے میں آیا۔ یہی نہیں متوسط طبقے کی بُرائیاں بھی ان کی نظر سے چھپی نہ تھیں۔ یہ طبقہ آپ اپنے تیار کردہ دام میں اسیر تھا۔

خطیب نے نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل کو بڑے ہی معقول انداز میں انہی کی زبان میں پیش کیا۔ اپنی نظر سے اُن بُرائیوں اور لعنتوں کو دیکھا اور اُن کی زبان میں انہیں سمجھایا۔ خطیب کا پیشکش کا انداز کچھ ایسا معقول، منطقی اور نفسیاتی ہوتا تھا کہ متاثرہ طبقے کے لیے اُن کا علاج اور حل دریافت کرنا مشکل کام نہ ہوتا۔ خطیب مسائل کا حل پیش کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اُن کے خفتہ قویٰ کو مہمیز لگانا چاہتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ؎

اک ذرا قوم کو بیدار تو ہو لینے دو

اُن کی بیداری، اُن کی سوجھ بوجھ اُن کے معطل قویٰ کو پوری توانائیوں کے ساتھ روبہ عمل لانے میں معاون ثابت

ہوگا۔ اسی لیے خطیب نے ان کی عام بول چال کی زبان کو اظہار کے لیے اپنایا۔

خطیب کا مشاہدہ بے حد تیز تھا۔ وہ نفسیات کی گتھیوں اور بشری کمزوریوں سے خوب واقف تھے۔ زیرک، دردمند، حساس فنکار سلیمان خطیب کی شاعری کا خمیر انھیں عوامل سے اٹھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی ٹکسالی زبان میں شاعری اوروں کے لیے تسکین روح اور آرام جاں تو بن سکتی ہے۔ اُن پر شہرت کے ڈونگرے برسا سکتی ہے، انھیں اعزاز اور دولت سے سرفراز کرسکتی ہے لیکن اُن بے شمار بے بسوں اور مجبوروں کو تنزلات سے نکال نہیں سکتی — ادب میں مقصدیت کا یہ نہایت لطیف پہلو ہے — اپنی بات کو پیش کرنے اور دلوں میں اتارنے کے لیے پہلے انھیں مخاطب طبقے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنی تھی اس لیے خطیب نے مزاح کو آلۂ کار بنایا۔

انھیں کی زبان میں اور چٹ پٹے الفاظ اور محاوروں میں اُن کو گدگدی کرنا، انھیں ہنسانا، انھیں قہقہے لگانے پر مجبور کرنا خطیب کے لیے لوہا گرم کرنے کے برابر تھا۔ رنج والم کے ماروں، مایوسی اور ناامیدی کے کوچوں کے باسیوں، دکھی محنت کشوں کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے میں بے چین اور ناآسودہ مسکین صورت بنائے ہوئے لوگوں کو ہنسا کر وہ کیوڑے کے بن میں لاتے۔ بن میں آکر وہ خطیب کی گرفت میں آجاتے۔ اب کیوڑے کے کانٹے کی چبھن کا احساس کرنا اُن کے لیے لازمی تھا۔ یہ چبھن، یہ کیوڑے کا کانٹا یعنی اُن کا طنز انھیں خواب غفلت سے بیدار کردیتا تھا۔ یہ چبھن انھیں تصورات کی خوابناک وادیوں سے باہر لے آتی تھی اور یہیں وہ اپنی حالت، زمانہ کی رفتار، سمت اور حالات کے تقاضوں پر غور کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ بیداری کی حالت، تھوڑی سوجھ بوجھ اور غور و فکر اُن کے سامنے راہوں کو روشن کردیتی تھی انھیں حوصلوں اور توانائیوں سے بھر دیتی تھی۔ وہ نئے عزم اور زندگی میں جوش و امنگوں سے سرشار ہو اٹھتے تھے۔

خطیب چاہتے بھی یہی تھے۔ یہ طریقہ اُن کا اپنا تھا۔ یہ راہ انھوں نے اپنے لیے سوچ سمجھ کر منتخب کی تھی۔ انھیں اپنے قوتِ بازو پر مکمل اعتماد تھا۔ تائید ایزدی اور توفیق الٰہی پر اُن کا پورا ایمان تھا انھیں یقین تھا کہ جیسے انھوں نے بحیثیت فرد، سبھی دکھ جھیل کر، تمام مصیبتوں سے تنہا مردانہ وار جنگ لڑی اور اپنے لیے راہ نکالی، کامیاب ہوئے اسی طرح سماج کا ہر فرد اپنی راہ خود بنائے گا — یہ سلیمان خطیب کا مشن تھا۔ یہ مشن انھیں اپنی جان، اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنی زندگی کے لیے یہ نصب العین انھوں نے خود طے کیا تھا۔ اس تحریک، اس اقدام اور اس مشن کی تکمیل کی کوششیں کرنے اور تمام سختیاں جھیلنے کو وہ تیار تھے۔ وہ اس جنگ کے تنہا سپاہی تھے۔

وہ اس طویل، دشوار گزار اور صبر آزما سفر میں تنہا بڑھتے رہے۔ تھکے ضرور مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔ سفر کے دوران، شہرت اور نام و نمود کی ہوس کو انھوں نے منہ نہیں لگایا۔ شہرت خود اُن کے پیچھے رہی . . . دیوانے اور سر پھرے سلیمان خطیب سفر کے شروع میں بھی خالی ہاتھ تھے اور اختتام سفر پر بھی۔ لیکن سفر کے دوران انھوں نے ایک کارواں ترتیب دے لیا تھا۔ انھیں اپنے ساتھیوں، پڑھنے اور سننے والوں کا بے پناہ محبت اور کروڑوں دلوں کا دعائیں ملیں۔ اور وہ اسی دنیا میں کامیاب ہوگئے۔

خطیب کو خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ خطیب کا مشن بھی دراصل اولیاء کرام کے وسیع تر مقاصد اور مشن ہی کا ایک حصہ تھا۔ دکنی تو خواجہ بندہ نوازؒ کی محبوب زبان تھی۔ اسی زبان میں انھوں نے درسِ انسانیت اور معرفت [illegible] اسی زبان کے ذریعے ارض دکن میں بزرگان دین نے

منحرف، بے حس اور خوابِ غفلت میں گرفتار عوام کو بے دار کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے عقیدت مند نے بھی دہی کیا۔ اُسی حکمت سے کام لیا تو بات میں اثر اور کلام میں تاثیر اور زور بڑھنا فطری بات تھی۔ اس تعلقِ خاطر اور وابستگی پر خطیب ہمیشہ نازاں رہے۔ اِن اشعار میں دیکھیے خطیب کس انداز سے اپنی بات کہتے ہیں۔

ہمے بے سہارا ہیں بندہ نواز ؛ غریبوں کا تمنا سہارا کتیں
تُمے کیا سمجھتیں کی معلوم نیئں ؛ ہمارے کو لوگاں تمہارا کتیں

پھر کہتے ہیں۔

اپنے رنگ میں رنگ لے میرے خواجہ ؛ اپنا دوپٹہ تیرے رنگ میں رنگانے آئیوں
چاندی کا پورا گنبد کوئی بنا لے تیرا ؛ میں تو بندوڑی تیری قربان جانے آئیوں

اس اعلیٰ دار نغمے کی تکمیل کے لیے اسے مقبول خاص و عام بنانے کے لیے واسطہ اور ذریعہ بھی اتنا ہی کاٹ دار، تیز، موثر اور تیر بہ ہدف ہونا ناگزیر تھا۔ بول چال کی زبان، مخصوص اور طے شدہ مقاصد کے حصول کے لیے لفظوں کی دولت سے مالا مال ہونا چاہیئے خطیب کی اس ضمن میں کاوشیں واقعی حیرت انگیز اور قابلِ داد تھیں۔ انھوں نے رائج الفاظ اور محاورہ کو چمکا دیا۔ متروکات تک کو جھاڑ پونچھ کر استعمال کیا اور کھرے سکوں کے ہم دوش کر دیا۔ انھوں نے محتاط ہو کر لفظوں کا انتخاب کیا استعارے، تشبیہات اور ترکیبیں تراشے اور پھر اس زبان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ دکنی زبان خطیب کی شاعری میں زندہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ دکنی زبان خطیب کے کلام میں، اُن کی محنت و کاوش سے اپنی نشاۃ الثانیہ سے ہمکنار ہوئی۔

اُن کی نظمیں ندی، میگھ راج، موٹ کا پانی اور پگڈنڈی فطرت کے حُسن کی عکاسی اور منظر نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ موخرالذکر نظم تو خطیب صاحب کی پسندیدہ اور محبوب نظم تھی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ۔

میں کنواری چھوریاں کی ایک لمبی سانس ہوں ؛ دو دلاں میں چبھنے والی ایک بنگی پھانس ہوں

یہاں پگڈنڈی کے لیے کنواری چھوریوں کا لمبی سانس کا استعارہ بے پناہ معنویت رکھتا ہے۔ اسی طرح اُن کی نظم "پہلی تاریخ" میں متوسط طبقے میں جوان اور تیزی سے بڑھتی ہوئی بچیوں کا مسئلہ والدین کی نیندیں کس طرح حرام کر دیتا ہے اِس کا بیان ہوا ہے۔ بیوی کہتی ہے۔۔۔

چھوکری بڑ کو ہرے منڈھے کی اب بیل ہوئی

یہ کہنا خود بتلاتا ہے کہ وہ کیسا عذاب جھیل رہی ہے۔ یہ مصرعہ صرف اشاریہ نہیں معنی و مفہوم کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ بیوی آگے جو کہتی ہے اُس شعر میں بیوی کے لہجے کا درد، اُس کی فکر مندی، میاں کی بے حسی اور بے عملی نمایاں ہو گئی ہیں۔ وہ کہتی ہے۔

بے فکر تان کے چادر تمے سوتے رہتیں ؛ مرے شبنم کے نصیباں ہیں کہ روتے رہتیں

شوہر کا بے حسی میں بے فکری کی چادر تان کر سونا اور شبنم کے نصیباں کا روتے رہنا بجائے خود مکمل استعارے ہیں۔ کمزور نچلے طبقے کے لوگ تمام تر بے بسی اور محرومیوں کے باوجود آرزومند ہے یہی آرزومندی اُسے جینے کا حوصلہ، زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے لیے توانائی دیتی ہے۔

اتّی بس آس پو جیتے ہیں اُجالا ہوگا ؛ سالے راتاں کا کبھی تو منہ کالا ہوگا۔

ایک اور مثال اُن کی نظم "چلے چلو" سے۔

کنکر مٹی ڈھونے والو
میلا کچیلا دھونے والو
دانہ دانہ بونے والو
کل کے راجہ ہونے والو
چلے چلو ہے، چلے چلو

کتنی مثالیں پیش کی جائیں۔ خطیب کا سارا کلام، اُن کا ہر شعر اس نوع کی صناعی اور فنکاری اور اظہار بیان کے خوبصورت پیرایوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ خطیب ہر مرحلے پر اس دقت طلب صبر آزما۔ نازک ولطیف ذمہ داری سے کامیاب گزرے ہیں۔ لیکن سچے شعر کی تخلیق خون کا خراج وصول کرتی ہے۔ اپنے لوگوں، اپنی زمین کے باسیوں کے دُکھ درد، اُن کے جذبات و احساسات اور اُن کے مسائل کی ترجمانی کے لیے اُن کے دلوں کی بات اور دلوں میں اُتارنے کے لیے خطیب نے یہ خون دینا گوارا کیا۔ خون دے کر پروان چڑھایا اس کا انہیں احساس تھا۔ یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ایک حقیقت ہے جو اس شعر کے واسطے سے کہی گئی۔

دم غنیمت ہے میرا دکھن میں
اپنے فن کا اِمام ہوں باشا

□□

شگوفہ پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام
طنز و مزاح پر
انیسہ سلطانہ (ایم فل) کا ایک تحقیقی تنقیدی مقالہ
حیدرآباد
میں
طنز و مزاح کی نشوونما
(شائع ہوچکی ہے)
ضخامت ۲۵۶ ٭ قیمت ۳۰ روپے

طنز و مزاح کے ایوان میں
گونجتی ہوئی آواز!
حلیمہ فردوس
کی پہلی کتاب
مَاشاءاللہ
۱۵ روپے
پبلیشر:-
پیش رفت پبلیشرز، مسلم چوک، گلبرگہ

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

مہرباں ہو کے بلا لو ....

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم شیطان کی طرح مشہور ہیں اور بدبختی ہے کہ دوسروں کی طرح اپنی شہرت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ شہرت سے فائدہ اُٹھانا شائد اس لیے بھی ہمارے بس میں نہیں کہ ہمارے اندر "مکر" کے جراثیم نہیں ورنہ آج ہم، جو "کچھ" ضرور ہیں، کچھ نہ کچھ ضرور ہوتے۔ نا جانے کیوں آج آدمی مشہور ہوتے ہی سیاست میں گھس جاتا ہے، ہم تو اپنے سسرال میں بھی نہیں گھستے تاآنکہ ہمیں ہمارے وقار و موہوم مرتبہ کے لحاظ سے مدعو نہ کیا جائے، اور یوں بھی سسرال کوئی سیاست تو ہے نہیں کہ بِن بلائے گھسا جا سکے۔ لوگوں نے بڑی محبت سے ہمیں یہ مشورہ ضرور دیا تھا کہ "نان میٹرک" لوگ کونسل کے لیے پرچہ نامزدگی داخل کر رہے ہیں آپ تو الحمد للہ ایم اے ہیں، قسمت آزمائیے! ہم تو اپنی قسمت کو کب کے آزما چکے تھے، ہمارے مقدر میں درس و تدریس کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ بھی محض خانگی مدارس میں، اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مدرس قوم کی بھلائی چاہتا ہے، کونسلر بننا نہیں چاہتا تو صاحب ہم اپنی شہرت کا ذکر شریف کر رہے تھے، ہمیں ہماری شہرت سے کوئی اور فائدہ ہوا ہو نہ ہوا دو فائدے ضرور حاصل ہوئے۔ ایک تو لوگ کافی عزت کرتے ہیں اور ہم اس عزت کو تازہ روٹی کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں مبادا باسی ہو جائے۔ دوسرے، دعوتیں دینے میں لوگ گریز نہیں کرتے اگرچہ آخری آخری ہی کیوں نہ ہو۔ اور ہم اس "آخری آخری" کو مشاعرے کی صدارت کی طرح باطل ناخواستہ قبول فرما ہی لیتے ہیں، لیکن زحمت مزید کہ یہ آخری آخری والا معاملہ پیٹ اور پلیٹ تک ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ کیونکہ ہم خطبہ دیتے ہیں دھکے نہیں دے سکتے۔ اور لوگ زورِ شباب کو محض خیمۂ دستر تک رسائی حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ ہم پہلے آپ والے آدمی ہیں، آستین چڑھا کر پلیٹ پا نہیں سکتے خواہ پیٹ میں چوہے بلکہ بلیاں ہی کبڈی نہ دوڑ رہی ہوں۔

پرسوں ہمارے محلے ہی میں ایک شادی ہوئی، شادی تو خیر شادی خانے میں ہوئی، ولیمہ البتہ سڑک پر ہوا دولہے کو لوگ سینے سے لگا رہے تھے اور رکشہ والے سینہ پیٹ رہے تھے، راستہ بند کر دیا گیا تھا اور ولیمہ کے شامیانے میں لوگوں کو ایک طویل سڑک طے کرکے راستہ لینا پڑتا تھا، دولہے کے احباب حسب قاعدہ

چہل گو دیں معروف تھے اور بے چارے رکشہ والے پسینے میں شرابور۔ ہمیں رکشہ والوں سے کافی ہمدردی ہے، اپنے اسنادات کی طرح، گریجویٹ ہونے کے بعد بھی جب بے روزگار رہے تو اس شغل مبروک کو بہ نفس نفیس اختیار کرنے کے متمنی رہے، ہم نے یہاں تک ملاحظہ کیا کہ دو پولیس والے راستہ روکے کھڑے تھے مبادا کوئی غریب "ازتک کش" مارنے کی کوشش نہ کرے۔

شادیاں اکثر جاڑے پر ہوتی ہیں اس لیے ہم شادیوں میں شریک ہونے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ البتہ جاڑے چہلن کی قلمیں اور ولیمہ کی تقاریب ہماری کمزوریاں ہیں کیوں کہ ان میں ہمارے مذاق کی چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ہم یار باش آدمی ہیں۔ دوست احباب ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ میاں پاشو کے ولیمہ میں میر لیاقت علی اور سید الفد علی دونوں ہمارے ساتھ برنگِ وزراء ساتھ تھے۔ رات بھیگنے لگی تو بھوک بام عروج پر پہنچی۔ لیڈیز فرسٹ کے تحت عورتوں کا دستر چلتا رہا۔ دستر ہو کہ دفتر، ہر مقام پر عورتوں کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہم سوچتے ہیں کہ کاش ہم، نیم ضعیف نوجوان کی بجائے کوئی حسین دوشیزہ ہوتے تو ہمیں سرکاری ملازمت تو ضرور مل جاتی اور ہمارے بھی بیوی بچے مزے سے ہندوستان میں زندگی گزارتے۔ جب عورتوں کا دستر اختتام کو پہنچا تو مردوں کو آواز دی گئی۔ آواز کا دیا جانا تھا کہ لوگ مرغیوں کی طرح دوڑنے لگے۔ ہم بھی اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر دوڑنے لگے، مگر "کنفوزی مرغیوں" کا مقابلہ کہاں ممکن تھا۔

ہر محلہ میں ایک نیم پاگل ضرور ہوتا ہے، جسے لوگ "ولی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب ہم اس محلہ میں نئے نئے آئے تھے تو اسی مبارک نام سے ہمیں بھی پکارا جانے لگا تھا۔ ہم اپنی سعادت مندی سے خاموش رہے تو لوگوں کو یقین ہی ہو چلا تھا لیکن جب سے اے۔ کے۔ ایم کالج میں لکچر دینا شروع کیا ہے۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ مگر ہمیں یقین ہو گیا ہے۔ تو خیر محلہ کا ایک نیم پاگل سب کو چھوڑ کر ہمارا ہاتھ تھام لیا۔ نارمل آدمی سے ہاتھ چھڑایا جا سکتا ہے پاگل شخص سے نہیں۔ ہم حیرت زدہ تھے کہ ولیمہ کی تقریب میں پاگلوں کا کیا کام۔ بہرحال وہ ہمارے ساتھ ہو گیا۔ بے چارہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک ٹانگ سے رینگتا تو دوسری سے اچکتا۔ اس کی صحبت نے ہمیں بھی محض رینگنے تک محدود رکھا۔ توجہ دستر کی جانب مرکوز اور بغل میں پاگل موجود۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس بھاگ دوڑ میں کوئی دیکھا نہیں ورنہ ہماری حیثیت عرفی میں مزید شک پیدا ہو جاتا۔ غرض جب ہم گیٹ پر پہنچے تو اندر سے ایک خاص قسم کی ڈانٹ سنائی دی۔ "اک پانچ منٹ تشریف رکھیئے" کمند لب بام ٹوٹ چکی تھی۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس پلٹ آئے۔ دس بج چکے تھے۔ ہم مغرب کی نماز کے بعد جلد ہی کھانے کے عادی ہیں (خواہ جو تے ہی کیوں نہ ہو) یہ تاخیر قرض دوستاں کی طرح بار لگ رہی تھی۔ دوسرے دستر تک محض لطیفے ہوتے رہے تاکہ بھوک اور محرومی کا کم سے کم احساس ہوتا رہے۔ چنانچہ اس نکتہ کو ذہن میں لاتے ہوئے زندگی بھر کے لیے لطیفہ گوئی میں نہیں بلکہ لطیفہ سازی میں مشغول ہونا چاہتے ہیں تاکہ الطاف و عنایات سے محرومی یا وہ دل نہ دکھا سکے۔ دوسری بار کمرہ آمادہ دی گئی۔ آواز دینے کا انداز کچھ اس قدر دلبرانہ تھا کہ معاً جمعرات کی یاد آگئی۔ اب وہ پاگل ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ الفد صاحب اور لیاقت صاحب تھے۔ ایک نہ شد دو شد، ہم تینوں ککڑک مرغیوں کی طرح دوڑے لیکن وائے قسمت کہ باب الداخلہ پر پھر ہاؤس فل کا بورڈ لگا دیا گیا۔ اور ہمیں

رضوان انصاری
سدہولی، ڈسیتاپور(یوپی)

نقابی چہرہ

"چہرہ" لفظ بظاہر جس قدر مختصر سا ہے اسی طرح اپنے اندر بہت جامعیت بھی رکھتا ہے۔ لیوں تو یہ لفظ صرف چ + ہ + ر + ہ سے مل کر بنتا ہے۔ مگر چہرہ ایک عام فہم لفظ ہے۔ نہ تو اس میں کوئی گھماؤ پھراؤ ہے اور نہ ہی کسی الٹ پھیر کا محتاج۔ صاف سادہ سا لفظ ہے۔ جو سُننے وہ سمجھے، جس سے کہیے وہ جانے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ جس، جس انداز سے اظہار کیا جائے گا اسی طرح لوگ معنی و مفہوم سمجھ غور و فکر میں لگ جائیں گے۔ مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ میں نے کہا کہ "چہرہ" تو آپ نے فرمایا کیسا چہرہ؟ کس کا چہرہ؟ چہرہ تو بھائی خوبصورت بھی ہوتا ہے اور بدصورت بھی۔ دل و دماغ میں بجلی سے زیادہ مسرت کی تیز لہر دوڑانے والا بھی ہوتا ہے اور ایسی رفتار سے مکدر و متحزون کن بھی۔ چہرہ گول ہوتا ہے اور لمبا بھی۔ کوئی کالا تو کوئی گورا۔ کوئی دیکھنے میں اچھا لگتا ہے تو کوئی برا بھی۔ کوئی چہرہ ایسا ہوتا ہے کہ میر کا شعر "منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا" کو تازہ کر دیتا ہے تو کوئی سودا کے ہجو والی صورتیں دلوں میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کوئی چہرہ وہ ہے کہ لوگ تعریف میں ہمہ دم رطب اللسان رہ کر بھی نہیں تھکتے اور ان کے لیل و نہار کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ تو کوئی وہ بھی ہے کہ جسے شیخ سعدی کی گلستان سعدی کی حکایت یاد آجاتی ہے اور قطع کلام کا شور برپا ہو جاتا ہے۔ کوئی چہرہ وہ ہوتا ہے کہ اس پر ایک نظر ہی پڑنے سے مرزا شوق کی مثنوی کے ہیرو کی طرح "صبح دم اٹھ کر بام پر جانا" اور "دیکھنا بھالنا چلے آنا" ہی مقصد زندگی بن جاتا ہے۔ اور انکار کی صورت میں "امراؤ جان ادا" کے جاں نثاروں کی خودکشی کی داستان آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ ایک چہرہ وہ تھا کہ جس کا نام شاید رات کی تاریکی سے مستعار لیکر رکھا گیا تھا مگر اس کو دیکھنے والا صحرا نوردی مشغل زندگی قرار دے لیتا ہے اور اسی وقت سے عشق و محبت کی ایک روایت بیان کی جانے لگی۔ اسی چہرہ کی بدولت حیات ابدی حاصل کر کے "مجنوں" کا اسم معروف بھی پالیا۔ یہاں تک کہ آج سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں فلمیں تیار ہو ہو کر ناظرین و سامعین کے دلوں میں عشق و محبت کا بازار گرم کرنے میں نمایاں رول ادا کر رہا ہے۔ ایک چہرہ وہ تھا کہ جس کو دیکھ کر فرہاد نے امر محال کو معمولی کام سمجھ لیا اور عالمگیر شہرت یافتہ اردو کے شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کو "جوئے شیر" لانے کا استعارہ مع التلمیح لفظ دے دیا۔ ایک چہرہ وہ ہے کہ جس کے بارے میں ارسطو نے اپنی خیالی ریاست میں لکھا کہ [illegible]

چاہئے پرخوب صورت مجسمہ بنا کر نصب کر دیا جائے جس کو دیکھ کر لوگ اپنی طبیعت اور دل و دماغ کو خوش کریں۔"
ایک چہرہ وہ تھا کہ جس کو دیکھ کر حضرت زلیخا نے دنیا کے سارے چہروں کو ہیچ سمجھا اور زنانِ مصر کی انگلیاں قلم ہو گئیں اور حسنِ یوسفی کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجوا دیا۔

جنابِ من! اب ارشاد فرمائیے کہ آپ کا ان میں سے کون سا چہرہ ہے بھئی! اب میں آپ کے سامنے لب کشائی کی کیسے جرأت کروں۔ کیوں کہ میرے تو ہوش و حواس ہی یکسر فاختہ کے وزن پر باختہ ہو گئے۔ میں نے تو صرف ایک لفظ چہرہ کہا اور آپ نے اتنے چہرے پیش فرما دیئے کہ میں واحد کو بھول کر جمع کے حصار میں آ گیا۔

اچھا خیر آپ ہمارے اس چہرہ کو دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو پھر تیار ہو جائیے اور ہمارے چہرہ کا چہرہ ملاحظہ فرمائیے مگر ہم آپ سے بہت ادب سے عرض کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت والا آپ نے اپنی علمی قابلیت سے تعارف کرانے کے لئے بہت زیادہ چہرے بیان فرما دیئے کہ جس کو ہمارا سطحی دماغ اپنے پٹارے میں محفوظ رکھنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ خیر الجھاؤ ختم اور مطلب روبرو۔ یہ کہ ہم جس چہرہ کو عنوانِ سخن دے بیٹھے ہیں اس کو آپ نے یا بربنائے مصلحت یا بربنائے انتقام" اظہار نہیں فرمایا۔ یا بازاروں، سڑکوں اور گلیوں گلیوں میں سڑک چھاپ لڑکوں کو گا گا کر لطف اندوز ہونے کے لئے "نقاب" میں رُو پوش فرما دیا ہے۔ ہمارا روئے سخن اُدہ چہرہ ہے کہ جس کو کسی فلمی ہیرو کی محبوبہ نے نقاب کے دبیز پردے میں چھپا لیا تھا اور اس دلدار کے روئے تاباں کو باہر لانے کے لیے خوش الحانی سے نغمہ سرائی کرنی پڑی۔

اچھا جناب! اب ہم سمجھے۔ آپ کا چہرہ اس چہرہ سے رشتۂ ازدواجی کی طرح مربوط اور متعلق ہے جو اپنے اندر ایک تاریخ وابستہ کیے ہوئے ہے۔ شری مان جی! ہم نہ تو کبھی تاریخ کے طالب علم رہے اور نہ ہی اس کے متوالے کہ پرانے مُردے اکھاڑیں اور زندوں کے بجائے مُردوں کے حالات کا جائزہ لے کر پانی پت اور ایران کی یا پھر داستانِ رستم وسہراب سناویں۔ جس سے ہم اور آپ لرزہ براندام ہو کر رات کی نیند حرام کریں۔ یہ کام تو اس دور کے سیاسی اور دینی عالموں کے سر منڈھیے کہ گفتار کے غازی بن کر اور کردار کے میدان سے کوسوں دور رہ کر زندگی گزارنے میں محو ہیں۔ خیر آمدم بر سرِ مطلب۔ وہ "چہرہ" جس کو کسی عصرِ حاضر کے خوش فکر شاعر نے اپنی خداداد صلاحیت پر زور دیا اور اپنے حسنِ بیان کے زور سے نقاب کے اندر چھپا رکھا تھا۔ تو ہاں جب شاعر نے چہرہ کو نقاب میں چھپانے کو کہا تو ہمارے عنوان کو دو باتیں ایک ساتھ مل گئیں۔ آپ کہیں گے کیا؟ ہم عرض کریں گے "چہرہ" اور "نقاب" آپ کہیں گے یا معنی؟ ہم کہیں گے یہ بھی ذرا سنیئے غور سے اور عمل کیجئے دیر سے۔

مکرمی! تو ہم آپ کے متذکرہ بالا چہرہ کو چھوڑ کر پہلے نقاب کو ہی بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔

"نقاب" جس کو آج کے شاعر نے اپنے شعر میں "رخ سے نقاب" کشائی کی بات کی ہے اگر جناب عالی اسی چہرہ کا تقریباً نصف سے آگے پونے ایک صدی پیشتر بات کرتے تو نہ شعر صحیح معنوں میں موضوع ہو پاتا اور نہ ہی لفظ نقاب سے ہمیں روشناس کرا پاتے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ محترم کو شاعری اس دور میں سوجھی جب چودھویں صدی اپنی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ الحاد اور بے دینی کا پورا عروج ہو چکا تھا۔ مصیبت تو اچھا ہوا کہ حضرت اکبر الہ آبادی کی سماعت کہ انھوں نے پردہ پر بہت کچھ کہہ جانے کے باوجود آج کا دور نہیں دیکھا۔ ورنہ شاعری چھوڑ کر کچھ اور ... خیر تو ہم اکبر کا شعر دہرانا چاہتے اور نہ ہی وہ زمانہ۔ ہمیں تو صرف شاعر کی خوش نصیبی پہ رشک در رشک

آتا ہے کہ اُس کو ایسے زمانہ میں جنم لینے کا موقع ملا جب شاعر پیدا کم ہونے لگے تھے اور نیادہ تر لعنت بھیجے جانے لگے تھے۔

آیئے نقاب کا ماضی اُلٹ کر ملاحظہ کریں۔ قدیم زمانے میں نقاب نام کی کوئی اصطلاح یا لفظ اردو زبان و ادب میں مستعمل ہی نہ تھا۔ بلکہ "پردہ" کا ہی لفظ سکۂ رائج الوقت تھا۔ اور یہ پردہ حقیقی معنی میں اپنا کام بھی بحسن و خوبی انجام دیتا تھا۔ ڈھائی گز لمبے اور اس سے کچھ کم چوڑے چکن کے کپڑے کو ہر شریف عورت فخریہ طور پر گھونگھٹ ڈال کر سر سے لیکر پیر تک اوڑھتی تھی۔ یہ پردہ "سر کو چھپانے کے ساتھ ساتھ چہرے کو بھی چھپاتا تھا۔ اب اگر اتنا چہرہ کا متوالا چاروں طرف گردش لگاتا تو اس کا گھومنا، پھرنا بالکل سعیٔ لاحاصل میں شمار ہوتا۔ پھر یہاں پردہ اپنی جگہ برقعہ اور نقاب کو دے کر خود سبکدوش ہو گیا۔

اُردو سبھا کلیان میں

مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام مہیلا منڈل ہال کلیان میں اُردو سبھا کا پروگرام منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں اُردو اور مراٹھی کے طنز و مزاح نگاروں نے شرکت کی پروگرام کی صدارت جناب سیّد نصرت صاحب (پرنسپل باندرہ اردو ہائی اسکول و جونیر کالج باندرہ بمبئی) نے فرمائی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر جی۔ پی۔ ملکرنی (صدر شعبۂ مراٹھی و وائس پرنسپل برلا کالج، کلیان) شریک ہوئے۔

افتتاح میں جی۔ ایم۔ خان صاحب (انڈر سکریٹری اُردو اکادمی) نے پروگرام کے اغراض و مقاصد مختصراً بیان کئے اس کے بعد جناب غلام نبی مومن صاحب نے مہمانوں کا تعارف کروایا پروگرام کا آغاز کلیان کے مشہور مراٹھی مزاح نگار جناب بھالی چندر ایٹرے صاحب کی مزاحیہ کہانی سے ہوا۔ ان کے بعد جناب محمد رفیع انصاری صاحب (اردو لیکچرر رئیس جونیر کالج بھیونڈی) نے اپنے مزاحیہ مضمون "مائیکروفون" سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ بعد ازاں کلیان کے مشہور مراٹھی ادیب جناب جنارد ھن اوک صاحب نے اپنے مزاحیہ ناول کا ایک باب سُنایا آپ کے کئی مزاحیہ ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں۔ اردو کے مشہور مزاح نگار جناب یُوسف ناظم صاحب نے اپنا مزاحیہ مضمون "اشتہاروں کے بیچ میں" سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔

غلام نبی مومن نے مراٹھی زبان میں اپنا مضمون "اُردو نثر میں مزاح نگاری" کے عنوان سے سُنایا۔ ڈاکٹر ملکرنی اپنی تقریر میں اردو اکادمی کے مراٹھی اور اُردو کو قریب لانے کے خیال سے "اُردو سبھا" کی شروعات کو سراہا۔ صدر جلسہ جناب سیّد نصرت صاحب نے اس قسم کے پروگراموں کو ضروری قرار دیا۔ اور اظہارِ تشکر پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل :
طالب خوندمیری

منیجر :
سمیع جلیل

منیجر اعزازی : (بمبئی)
فیاض احمد فیضی

قیمت فی پرچہ : ۴ روپے ۵۰ پیسے
زر سالانہ : پینتالیس روپیہ
(45/- روپے)
غیر ممالک سے : ایک سو پچاس روپے

کتابت : محمود سلیم ۔ محمد عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ : ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون : 557716 مکان : 521064

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-

۱. موہن میکن بریوریز ۲۔ اجنتہ ڈیری آگرہ ۳، انڈین الیسٹ کمپنی لمیٹڈ
۴۔ بارکو بسری نگر ۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. میڈونا کیننگ کمپنی ۷. جیمپئین وہائٹ رولس
۸۔ پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس ۹. ڈرگ بیوٹان فوڈ پراڈکٹس ۱۰. بسل SiL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی وغیرہ)

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان :-

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض، حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

فہرست

چُنندہ آسام و نیلگری کے باغات سے راست منگوائی

چائے

○ اسٹرانگ و خوش ذائقہ۔
○ آپکے ذوق کے عین مطابق۔

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد

یاقوت محل ٹاکیز

یاقوت پورہ حیدرآباد

[illegible]

نیک خواہشات کے ساتھ

ایپکو فیبرکس

دلکش ڈیزائن، رسوم و رواج کے پاسدار نقش و نگار
اور خیال و خواب کی طرح حسین رنگوں میں
پارچہ پر گل بوٹوں کی بُن کاری

آپ کی خدمت میں ایپکو پیش کرتا ہے
پارچہ جات کی تمام قسمیں، ہر موقع اور محل کے لیے
سلک، پولیسٹر، پرنٹیڈ کاٹن، جنتا ساڑی اور دھوتی

تشریف لائیے ـــــ اور ہمارے مختلف النوع کپڑوں سے
انتخاب کیجئے جو آپ کے بجٹ کے عین مطابق ہے

ـــــ ایپکو ملازمین سرکار کو کریڈٹ پر خریدنے کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔

اپنے کپڑوں کی تمام ضروریات کے لیے آندھرا پردیش اور دوسرے صوبوں میں واقع ہمارے ۴۳۱ شورومس
پر تشریف لائیے
ایپکو ـــــ منفرد فیبرکس ـــ جو آپ کو دوسروں سے جدا، سمارٹ، فیشن ایبل اور آرام دہ
ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

دی آندھرا پردیش اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹڈ 3-5-770 ویورس بھون
نارائن گوڑہ - حیدرآباد ـــ 500029

کنھیّا لال کپور — بیاد کنھیّا لال کپور

۱. کچھ یاد نہیں رہتا

۲. ہم اور ہمارے معالج

۳. مسئلہ بیروزگاری کا

[شگوفہ میں ہم نے وقتاً فوقتاً نامور مزاح نگار کنھیّا لال کپور کے بعض ایسے نادر مضامین شائع کئے ہیں، جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں۔ اور کپور صاحب کی زندگی میں روزناموں میں شائع ہوئے تھے۔ اس شمارہ میں بھی ہم ایسے ہی تین مضامین شریک کر رہے ہیں۔ یہ مضامین کبھی ہند سماچار میں شائع ہوئے تھے ——————— مدیر !]

کچھ یاد نہیں رہتا :- ایک شخص اپنے دوست کو بتا رہا تھا۔ مجھے صرف تین چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ لوگوں کے چہرے لوگوں کے نام اور . . . . " اور ؟"

"تیسری چیز کیا ہے وہ میں بھول گیا ہوں۔"

ایک آدمی ایک ڈاکٹر سے مشورہ کرنے گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا "آپ کو کیا شکایت ہے ؟"

وہ بولا۔ "میرا حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ کئی بار مجھے اپنی بیوی سے پوچھنا پڑتا ہے میرا نام کیا ہے ؟"

ڈاکٹر نے نسخہ تجویز کرنے کے بعد اپنی فیس طلب کی۔ وہ آدمی حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

" فیس کس بات کی ؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "مشورہ کرنے کی۔"

" مشورہ !" اس نے چلّا کر کہا "کس کمبخت نے آپ سے مشورہ کیا تھا۔ کم از کم مجھے تو یاد نہیں۔"

ایک اچھا حافظہ نعمت ہے یا مصیبت۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ واقعی نعمت ہوتا تو شاعر کو یہ کہنا نہ پڑتا۔ ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب ✼ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اور نہ ہی سرد آہ بھرنے کے بعد کسی اور شاعر کو یہ شعر موزوں کرنا پڑتا۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اس کے برعکس اگر یہ سراسر مصیبت ہوتا۔ تو شعراکس چیز کی مدد سے اپنے محبوبوں کی یاد تازہ کیا کرتے اور یاد کے موضوع پر کس طرح ایسے بے نظیر شعر کہا کرتے۔ جیسے وَلی دکنی کا یہ شعر۔

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

یا حسرت موہانی کا وہ شعر جس میں انھوں نے اپنے محبوب کو یقین دلایا ہے۔

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے جو تری یاد میں گزر جائے

نفسیات کے ماہر کہتے ہیں، عموماً ہمیں وہ چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ جن سے ہمیں نفرت ہوتی ہے۔ جیسے چھاتا۔ چابیوں کا گچھا۔ چھڑی۔ عینک۔ ٹوپی۔ اور سسرالی رشتے دار۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں اگر بیک وقت ہمارا تعارف دو عورتوں سے کرایا جائے۔ جن میں ایک نہایت خوبصورت اور دوسری نہایت بدصورت ہو، تو ہم کچھ دیر کے بعد بدصورت عورت کا نام بھول جائیں گے۔ ہمارے خیال میں ان کی یہ تھیوری صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ ہم کبھی ایسے اشخاص کو بھی نہیں بھولتے جنھیں ہم ناپسند کرتے ہیں مثلاً اس کابلی پٹھان کو جس کا ہم قرض ادا نہیں کرسکتے تھے۔ اور جس نے مار مار کر ہمیں ادھ موا کر دیا تھا اس رقیب کو جس سے ہم نے عشق بازی میں مات کھائی تھی۔ اپنی ساس کو جو آئے دن ہمیں نصیحت کیا کرتی ہے۔ ایک اچھا شوہر ہمیشہ بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔

نفسیات کے ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی چیز یا شخص کو یاد رکھنے کے لیے اس کا نام کسی ایسی چیز سے منسوب کر دینا چاہیے۔ جسے آپ پہلے جانتے ہیں۔ مثلاً آپ کے دوست کا ٹیلیفون نمبر ۱۲۸۳ ہے اور آپ کی کار کا نمبر ۳۸۲۱ آپ ان دونوں کو منسوب کر دیں۔ کیوں کہ یہ دونوں اعداد ایک دوسرے کے اُلٹ ہیں۔ ٹیلیفون نمبر کے ہندسوں کو اُلٹ دیا جائے۔ تو وہ آپ کی کار کا نمبر ہوگا!

مگر چیزوں کو ایک دوسرے سے منسوب کرنے میں کئی بار گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ایک اجنبی کا (جس کا نام ساون مل تھا۔) ایک شخص سے تعارف کرایا گیا اس نے ساون مل کو برسات کے ساتھ منسوب کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی ملاقات ساون مل سے ہوئی۔ اس نے بڑے جوش کے ساتھ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو! لالہ برساتی مل۔ کیا حال ہے آپ کا؟"

اسی طرح کسی عورت نے اپنی سہیلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "آپ مس وملا ہیں اور شملہ میں رہتی ہیں۔"

جس سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ اس نے سوچا۔ وملا کا قافیہ شملہ سے ملتا ہے۔ اس لیے یہ نام یاد کرنے میں آسانی رہے گی۔ لیکن جب وہ دوبارہ وملا سے ملی۔ اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مس شملہ! آپ وملا سے کب آئیں؟"

فلسفی۔ شاعر اور پروفیسر دوسرے لوگوں کے چہرے نام یا پتے بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ ایک مشہور فلسفی کہیں جا رہا تھا۔ کہ اس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ اس نے اس سے پوچھا۔ "ہیلو مسٹر تمہارے باپ کا کیا حال ہے؟"

ایک پروفیسر لفافے پر ٹکٹ چپکا رہا تھا کہ یکلخت ٹکٹ کہیں غائب ہو گیا۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ مگر بے سود۔ شام کو وہ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے زبان دکھانے کو کہا۔ زبان

دیکھ کر ڈاکٹر بولا "ویسے تو زبان صاف ہے لیکن اس پر ایک ٹکٹ چپکا ہوا ہے"

ایک شاعر کسی ایسے شہر میں مشاعرہ میں شریک ہونے گیا جہاں اس کی سسرال تھی۔ مشاعرہ رات کے ۲ بجے ختم ہوا۔ گھر لوٹتے وقت شاعر اپنے سسر کے مکان کا پتہ بھول گیا۔ اس نے کسی اور مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے مالک مکان نے پوچھا "آپ کون ہیں؟ اور رات کے دو بجے کیا چاہتے ہیں؟"

شاعر نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا "واہ صاحب کیا سوال کئے ہیں آپ نے۔ اجی حضرت! خاکسار آپ کا داماد ہے۔ اور آپ کے ہاں رات گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد شاعر پر کیا گزری ہوگی، اور کس طرح ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے سسرال کی بجائے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا ہوگا۔

دو پروفیسر ایک دوسرے سے پہلی بار ملے۔ ایک نے کہا "ایسا لگتا ہے۔ آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔!"

دوسرا بولا "مجھے بھی ایسا لگتا ہے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے"

"بھلا کہاں دیکھا تھا؟"

"بمبئی میں۔"

لیکن میں بمبئی کبھی نہیں گیا۔

ایک منٹ کے بعد دوسرے پروفیسر نے سر کھجاتے ہوئے کہا "ممکن ہے دو اشخاص جن کی شکل و صورت ہم سے ملتی ہے بمبئی میں ملے ہوں"

اس سے بھی دلچسپ قصہ اس فلسفی کا ہے جس نے کسی شخص سے کہا تھا۔

"میرے خیال میں آپ نندلال کے بھائی ہیں۔"

"بھائی نہیں میں خود نندلال ہوں"

"تبھی آپ کی شکل نندلال سے اس قدر ملتی ہے"

[ہم اور ہمارے معالج]

اس شخص کا حکیموں اور ویدوں و ڈاکٹروں سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ جو نہ صرف پیدائشی بیمار ہوا تھا۔ بلکہ پچھلے چھیاسٹھ سال سے بیمار چلا آتا ہے۔ زندگی میں اکثر ہماری ملاقات بڑے دلچسپ حکیموں کے ساتھ ہوئی۔ حکیم نیاض خاں دہلوی کو ہی لیجئے۔ ہم جب بھی ان سے مشورہ کرنے کے لیے گئے انھوں نے ہماری نبض دیکھنے کے بعد فرمایا۔

"ہماری تشخیص کے مطابق آپ کو کوئی مرض نہیں۔ تاہم دوا دیئے دیتے ہیں۔"

ہم نے عرض کیا "حکیم صاحب! اگر ہم بالکل تندرست ہیں۔ پھر آپ دوا کس لیے دے رہے ہیں؟"

انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"ممکن ہے ہماری تشخیص غلط ہو اور آپ مفت میں مارے جائیں"

ان کی دوا سے ہمیں کبھی فائدہ نہیں ہوا۔ جب ہم نے ان سے شکایت کی "آپ کی سب دوائیں بیکار ہیں۔

انھوں نے کہا "میاں! خدا کا شکر کرو۔ تم بچ گئے۔ ورنہ جس مرض میں تم مبتلا تھے اس سے زندہ بچتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔"

ہم نے انھیں لقمہ دیا۔ "یوں کہئے آپ سے علاج کرانے کے بعد کوئی مریض جانبر نہیں ہوسکا۔"

وہ مسکرا کر بولے۔ "چلئے یونہی سہی۔ ہماری دوا کے باوجود کم از کم ہمارا ایک مریض تو بچ گیا۔"

حکیم اشرف علی لکھنوی جنھیں حکیم کشتہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہر مرض کا علاج کشتوں سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پنسلین بھی دراصل کشتہ ہی ہے۔ گو اتنا زود اثر نہیں۔ جتنا کشتہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کسی نہایت فضول دھات کا کشتہ ہے۔ وہ برسوں ہمارا علاج سونے کے کشتہ سے کرتے رہے۔ جب ہمیں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ فرمانے لگے۔

"آج کل جو سونا ملتا ہے اس میں وہ تاثیر نہیں۔ جو پرانے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ کہیں سے ہمیں ایسا سونا لا دیجئے۔ جو کم از کم پانچ ہزار سال پرانا ہو۔ ہم آپ کو اس کا کشتہ تیار کر کے دیں گے جسے کھا کر آپ از سر نو جوان ہو جائیں گے۔"

وئید گردھاری لال کا شمار ملک کے مشہور وئیدوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں ہر مرض جگر کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے کان میں درد ہوتا ہے۔ آپ اسے بتاتے ہیں تمہارا جگر خراب ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک عورت کو جس کی ریڑھ کی ہڈی میں نقص تھا۔ بتایا کہ اس کا جگر سست ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کی ریڑھ کی ہڈی کمزور ہو گئی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب ان کے پاس ایک ایسے لڑکے کو لایا گیا۔ جسے باؤلے کتے نے کاٹا تھا۔ انھوں نے کہا اگر اس لڑکے کا جگر خراب نہ ہوتا۔ اسے باؤلہ کتا کبھی نہ کاٹتا۔ ہمارا طبی معائنہ کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں مطلع کیا کہ آپ کا جگر اتنا خراب ہو گیا ہے کہ اسے ٹھیک کرنے کے لیے آپ کو کم از کم چالیس سال دوا کھانا پڑے گی۔

حکیموں اور وئیدوں سے مایوس ہو کر ہم نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر بلوستی کی بہت تعریف سنی تھی۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے ایکس رے اور ای سی جی لینے کے علاوہ خون اور پیشاب کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد کہا۔

"آپ کو ہائپو کنڈریا ہو گیا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ ایک قسم کا وہم ہوتا ہے۔ مرض نہیں ہوتا۔"

"اس کا علاج کیا ہے؟"

"کوئی علاج نہیں۔"

"اگر یہ صرف وہم ہے ہمیں نیند کیوں نہیں آتی؟"

"معلوم ہوتا ہے جس پلنگ پر آپ سوتے ہیں اس میں کھٹمل ہیں۔"

"اگر کھٹمل ہوتے وہ ہمیں ضرور کاٹتے۔"

"وہ آپ کو کاٹتے ہیں۔ لیکن آپ کو محسوس نہیں ہوتا۔"

"ہمیں بھوک کیوں نہیں لگتی۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کھانا آپ کی بیوی تیار کرتی ہے وہ نہایت بدمزہ ہوتا ہے۔"
"ہمارے سارے بدن میں درد کیوں ہوتا ہے؟"
"لڑکپن میں کسی اسکول ماسٹر نے آپ کو بُری طرح پیٹا تھا۔ اس کی وجہ سے بدن میں درد ہوتا ہے۔"
"ہم ہر وقت اُداس کیوں رہتے ہیں؟"
"کیوں کہ آپ کو اُداس رہنے میں مزا آتا ہے۔"

ڈاکٹر بوسش کے بعد ہم نے ہومیو پیتھی کے ماہر ڈاکٹر ماعقر سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا۔ اُداسی کا علاج اداسی ہے۔ میں آپ کو ایسی دوا دے رہا ہوں جسے کھا کر آپ بے حد اداس ہو جائیں گے۔ لیکن گھبرایئے گا نہیں۔ ان کی دوا لینے کے بعد ہم پر اداسی کا اتنا زبردست دورہ پڑا کہ ہم دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گھر والوں کے علاوہ ہمسایوں نے بھی یہی سمجھا۔ ہم ہسٹریا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ جب ڈاکٹر ماعقر کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ اس کا مطلب ہے دوا اثر کر رہی ہے اس کے بعد جو دوا انھوں نے دی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ خودکشی کرنے کو جی چاہنے لگا۔ چنانچہ ہم نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ان سے مزید مشورہ نہ کیا جائے۔

کسی نے ہمیں بتایا۔ ڈاکٹر بھاسکر سے ملئے۔ ان کے ہسپتال میں ہر مرض کا قدرتی علاج کیا جاتا ہے کوئی دوا نہیں دی جاتی۔ اور نہ ہی کوئی ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ہم ان کے اسپتال میں پہنچے۔ انھوں نے معقول فیس وصول کرنے کے بعد بتایا۔ ہم پیٹ پر چکنی مٹی کا لیپ کر کے ہر روز تین گھنٹے دھوپ میں لیٹا کریں۔

دو دن لیٹنے کے بعد ہماری یہ حالت ہوگئی جیسے ہم قبر ہی سے نکل کر آئے ہیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کوئی اور طریقہ بتایئے۔ انھوں نے کہا پانچ دن فاقہ کیجئے۔ پانی کے سوا کچھ نہ لیجئے۔ ابھی تین دن ہی فاقہ کیا تھا کہ ہم پر بےہوشی طاری ہوگئی۔ دل ڈوبنے لگا۔ اور نبضیں چھوٹنے لگیں۔ ہمارے گھر والے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لائے۔ وہ کہنے لگے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ علامتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مرض ختم ہو رہا ہے۔"

ہماری بیوی نے غصہ میں آکر کہا۔ "مرض کہاں یہاں تو مریض ہی ختم ہو رہا ہے۔ میں تو انھیں سنگترے کا رس پلانے لگی ہوں، ہم باز آئے آپ کے علاج سے ---!"

ڈاکٹر بھاسکر بولے۔ "خدا کے لئے ایسا مت کیجئے ورنہ فاقے کا سارا فائدہ زائل ہو جائے گا۔"

"یہ اچھا فائدہ ہوا ہے۔" ہماری بیوی نے چمک کر کہا۔ "کہ جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔"

"وہ ہر شخص کو پڑا کرتے ہیں۔ قدرتی علاج میں یہی تو خوبی ہے۔"

"یہ علاج ہے یا خودکشی؟"

ڈاکٹر بھاسکر ناراض ہو کر چلے گئے۔ بیوی نے ہمیں سنگترے کے رس کا گلاس پیش کیا۔ ہماری جان میں جان آئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہم نے تہیہ کیا کہ کسی وید۔ حکیم یا ڈاکٹر کے پاس نہیں جائیں گے۔ اگر مرنا ہی ہے علاج کی بجائے مرض سے مریں گے کیونکہ اس طرح ایک تو ڈاکٹر کا بل چکانا نہیں پڑتا۔ دوسرے تکلیف بھی کم ہوتی ہے۔

(مسئلہ بے روزگاری کا)

وہ چوراہے میں ایک اسٹول پر کھڑا ہو کر اعلان کر رہا تھا۔

"اب ملک میں کوئی شخص بے روزگار نہیں رہے گا۔ وہ مسئلہ جسے بڑے بڑے مدبر حل نہ کر سکے جس کے آگے عظیم سیاستدانوں نے گھٹنے ٹیک دیئے جو ہر ملک کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے وہ ہم نے حل کرلیا ہے اگر بدقسمتی سے آپ بے روزگار ہیں۔ تو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ ہمارا نسخہ آزمایئے۔ ویسے تو صادق مولئے کا نسخہ بھی برا نہیں۔ اس نے اپنی ایک نظم میں اپنے یگ کے بیکاروں کو مشورہ دیا ہے۔ وہ مرگھٹ سے راکھ چرا کر خوبصورت شیشوں میں بھر لیں اور ان کے اوپر لیبل چپکا دیں۔ رانت کا منجن ۔ مگر اس نسخے میں ایک قباحت ہے۔ مرگھٹ سے راکھ چرانا ایک خطرناک فعل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کس وقت لینے کے دینے پڑجائیں۔ ہمارا نسخہ اس لیے بہتر ہے کیوں کہ اس پر عمل کرنا آسان ہے۔ شرط یہ ہے کہ جس لفافے میں یہ بند ہے اسے ایسی جگہ کھولا جائے۔ جہاں آپ کے سوا کوئی نہ ہو۔ ورنہ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ ہم یہ واضح کردیں کہ یہ نسخہ کوئی جادو یا ٹونا نہیں۔ بلکہ دولت کمانے کا ایک کارآمد طریقہ ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ جس شخص کو ضرورت ہو آواز دے کر لے سکتا ہے"

مجمع میں سے کسی نے نسخہ لینے کے لیے آواز نہ دی۔ مجمع باز نے مجمع سے دوبارہ خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! آپ خواہ مخواہ ایک دوسرے سے شرما رہے ہیں۔ ورنہ یہ تو ناممکن ہے آپ اتنے غریب ہوں کہ آپ کے پاس ایک روپیہ بھی نہ ہو۔ ایک روپیہ کی آج کل وقعت ہی کیا ہے۔ معمولی سے معمولی رسالہ خریدیئے یا گھٹیا سے گھٹیا ناشتہ کیجیے۔ ایک روپیہ سے کم خرچ نہیں آئے گا۔ چلیے یوں ہی سمجھ لیجیے آپ رسالہ پڑوسی سے مانگ کر پڑھ لیں گے۔ ناشتہ کسی دوست کے ہاں کرلیں گے۔ اگر ایک روپیہ خرچ کرکے آپ باروزگار بن سکتے ہیں۔ سودا مہنگا نہیں اچھا صاحب! ایک دوسرے کے منہ کی طرف مت دیکھیے۔ جلدی سے آواز دیجیے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

ایک نوجوان نے نسخہ خریدنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مجمع باز نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری جرأت کی داد دیتا ہوں۔ تم نے جھوٹی شرم کو بالائے طاق رکھ کر اپنا مستقبل سنوارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاباش! یہ لو نسخہ اسے وہاں جاکر پڑھنا جہاں تمہارے سوا کوئی نہ ہو"

اس نوجوان کی دیکھا دیکھی کئی اور نوجوانوں نے نسخہ خرید لیا۔

مجمع باز وہاں سے رخصت ہوا۔ اور پہلی بس سے جو اسے مل سکتی تھی۔ کسی دوسرے شہر میں چلا گیا۔

جن نوجوانوں نے نسخہ خریدا تھا۔ انھوں نے جب اسے تنہائی میں پڑھا۔ از حد حیران ہوئے۔ لکھا تھا۔

"آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے ہیں جہاں لوگوں کو بیوقوف بنانا بڑا آسان ہے۔ روزگار حاصل کرنا معمولی بات ہے آپ اگر چاہیں۔ ولی یا پیغمبر بن سکتے ہیں۔ ضرورت صرف لوگوں کو الّو بنانے کی ہے۔ جس طرح میں نے تمہیں الّو بنایا۔ اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے تو سمجھ لیجیے آپ سے بڑا الّو ابھی تک پیدا نہیں ہوا"

بیشتر نوجوانوں نے مجمع باز کو جعل ساز یا دھوکے باز قرار دینے کے بعد نسخے کو پھاڑ دیا۔ مگر ایک باہمت نوجوان نے نسخہ میں دی گئی ہدایت پر عمل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس نے گیروے کپڑے پہن لئے اور اپنا نام رام آنند کی بجائے سوامی دھیر آنند رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے چپے پورے سے مکھشمی کی ایک خوبصورت مورتی خریدی اور ایک قصبہ میں پہنچا۔ جس کا نام "اندھ نگر" تھا۔

اس قصبہ کے نزدیک ایک جنگل میں اس نے اس مورتی کو زمین میں دفن کردیا۔ پھر وہ قصبہ میں ایک پیپل کے نیچے

سمادھی لگا کر بیٹھ گیا اور متواتر چھ گھنٹے بیٹھا رہا۔ اس کے اردگرد ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا۔ قصبہ کے بڑے بوڑھے کہنے لگے۔ کوئی پہنچا ہوا مہاتما ہے۔ جو اتنی لمبی سمادھی لگا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ سب اس افیون کی گولی کا کرشمہ ہے۔ جو سوامی جی نے سمادھی لگانے سے پہلے کھائی تھی شام کے چار بجے اس نے آنکھیں کھولیں دو ایک بار اونچی آواز میں "الکھ نرنجن" کا نعرہ لگایا۔ اس کے بعد لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں لکشمی دیوی کے ساکشات درشن ہوئے ہیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ قصبے کے نزدیک جنگل میں ایک بڑھ کے درخت کے نیچے زمین میں دبی پڑی ہے۔ اور اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب اسے وہاں سے نکال کر اس کی ستھاپنا ایک مندر میں کی جائے گی۔ اور ستھاپنا کی رسم کے ختم ہوتے ہی اس قصبے کے تمام لوگوں کے گھروں میں لکشمی کی لہر بہر ہو جائے گی"

لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

"مہاراج اگر ایسی بات ہے تو ابھی چلئے، ہم دیوی کو برآمد کرکے اس کی ستھاپنا مندر میں کریں گے"

سوامی وچترانند نے لوگوں کی رہنمائی اس بڑھ کے درخت تک کی۔

جب زمین کھود کر دیوی کو برآمد کیا گیا۔ فضا سوامی جی مہاراج کی جے ہو! کے نعروں سے گونج اٹھی۔ دیوی کی مورتی کا جلوس نکالا گیا۔ بعد میں اسے سوامی جی کے حکم کے مطابق ایک پرانی سرائے میں رکھا گیا۔ آس پاس کے قصبوں سے ہزاروں لوگ دیوی کے درشن کرنے کے لیے آئے۔ ہر شخص نے اپنی توفیق کے مطابق مورتی کے آگے چڑھاوا چڑھایا یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ اب سوامی وچترانند نے دیوی کے لیے ایک نیا مندر بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ان کی اپیل پر ہر آدمی نے دل کھول کر دان دیا۔

ایک نہایت عالی شان مندر تعمیر کیا گیا۔ جس میں سوامی جی کے لیے دو ایئر کنڈیشنڈ کمرے بھی بنائے گئے۔ اس مندر میں دیوی کی مستقل طور پر ستھاپنا کی گئی۔ ہزاروں غریب لوگ روزانہ مندر میں آتے اور پرارتھنا کرتے کہ لکشمی کی ان پر نظرِ عنایت ہو جائے۔!

کچھ عرصے کے بعد سوامی جی کے ایک بھگت نے انھیں ایک موٹر کار پیش کی۔ ایک دوسرے بھگت نے "فریج" خرید دیا۔ اب وہ بڑے ٹھاٹ سے رہنے لگے۔ اچھی سے اچھی خوراک کھاتے اور قیمتی سے قیمتی لباس پہنتے۔ سارے علاقے میں انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جانے لگا۔ بڑے بڑے سیٹھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کا آشیرواد حاصل کرنے کے لیے نذرانے پیش کرتے۔ کوئی گڑگڑا کر کہتا۔

"ہمیشہ بیمار رہتا ہوں بہترا علاج معالجہ کیا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ تھک ہار کر آپ کی شرن میں آیا ہوں"

سوامی مشتبہ حاجت مندوں کی دستگیری کرتے اور دل ہی دل میں حیران ہوتے، یہ لوگ کتنے سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد ہیں۔ کبھی کبھی عالمِ تنہائی میں وہ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے۔

"لکشمی دیوی کی کسی اور پر نظرِ عنایت ہوئی ہے یا نہیں۔ ہم پر ضرور ہوئی ہے۔ اور پھر اگر سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے۔ تو ٹیڑھی انگلی کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہر حال جب تک سرکار بیروزگاری کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش نہیں کرتی روزی کمانے کے لیے کوئی نہ کوئی ڈھونگ تو رچانا ہی پڑے گا"

نامور مزاح نگار
یوسف ناظم
کے
مضامین کا دلچسپ
مجموعہ!

البتہ

۱۰ روپے

بتوسط، شگوفہ حاصل کیجئے۔

ٹراویلس کی دنیا میں آج ہر ایک کی زبان پہ
ایک ہی نام

مظہر ٹراویلس

جہاں آپ کے ٹراویلس کے جملہ امور کی تکمیل ذمہ داری سے
کی جاتی ہے۔ یہی اس کی کامیابی اور مقبولیت کا راز ہے۔
ہر ایک کا پسندیدہ ٹراویلس

مظہر ٹراویلس

بہترین کارکردگی، ایمانداری، اور صحیح رہبری ہی ہمارا
نصب العین ہے!

ربط پیدا کیجئے

مظہر منشن 5-6-293/4 حیدرگوڑہ حیدرآباد
فون : 235084

لطیفے

نہلا پہ دہلا:۔ دوستوں کی محفل گرم تھی۔ دفعتاً نریش اپنی کرسی سے اُٹھا اور اپنے احباب پر رعب جھاڑنے کے لیے ٹیلی فون کرنے لگا۔
"ہیلو! ۔۔۔ پی۔ اے۔ ٹو پرائم منسٹر ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ ان سے کہنا میں آج لنچ پر آنے سے مجبور ہوں۔ احباب کے ساتھ مصروف ہوں" اور پھر آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔
حامد بھانپ گیا۔ فوراً اپنی کرسی سے اُٹھا اور ٹیلی فون کرنے لگا اس نے تین نمبر گھمائے۔ سات۔ آٹھ اور چھ ۸۶۷
"ہیلو! کون؟ ۔۔۔ اچھا جبرئیل۔ ذرا "خالق" سے بات کروائیے۔ کیا کہا؟ مصروف ہیں ۔۔۔ میاں اُن سے کہنا کہ آج میں دوستوں کے ساتھ مصروف ہوں۔ لنچ پر نہ آسکوں گا۔"
نریش کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔

مرسلہ

دلیپ بادل (نئی دہلی)

سب کا بھلا: مشہور مزاح نگار مارک ٹوئن نے کہا، میں ایک دفعہ جا رہا تھا کہ میں نے ایک معصوم بچے کو روتے دیکھا۔ میں نے اس کی ماں سے پوچھا کہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟ بچے کی ماں نے افسردگی سے جواب دیا کہ مٹھائی کھانے کی ضد کر رہا ہے اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں!
میں نے فوراً جیب سے دس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور عورت سے کہا۔ "بچے کو مٹھائی دلوا دو اور باقی پیسے مجھے واپس دے دو!"
تھوڑی دیر بعد بچہ اپنی پسندیدہ مٹھائی لیے مسکراتا ہوا آگیا اور اس نے بقیہ نو ڈالر مجھے لوٹا دیئے۔
بچے کی ماں بولی۔ "خدا آپ کا بھلا کرے، اس وقت ہم دونوں کتنے خوش ہیں"۔
"ہم تینوں!" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "بچے کو اس کی پسندیدہ مٹھائی مل گئی۔ بچے کی خوشی کی وجہ سے ماں بھی خوش ہے اور میں بھی خوش ہوں کہ میرا جعلی نوٹ چل گیا"۔

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ "آخر آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ ہمارا منا بڑا ہو کر بہت بڑا سیاست داں بنے گا۔؟"
شوہر بولا۔ "منا ایسی باتیں کرتا ہے جو کانوں کو بھلی لگتی ہیں لیکن غور کریں تو اُن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔"

نیاز سواتی
ایبٹ آباد (پاکستان)
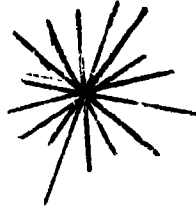
(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

دانش میں افلاطون سے کمتر نہیں ہوں میں
پر گھر میں ایک زیرو برابر نہیں ہوں میں

مہماں جو آئے آخری ہفتے میں جانِ من
کہنا اُسے کہ اِن دنوں گھر پہ نہیں ہوں میں

دولت کی ریل پیل ہے اب گھر میں اس لیے
کسٹم کا اب کلرک ہوں ٹیچر نہیں ہوں میں

ورنہ مجھے بھی جھوٹا سمجھتے تمام لوگ
صد شکر اپنے حلقے کا ممبر نہیں ہوں میں

دیتی ہے حکم کام کا یوں مجھ کو اہلیہ
جیسے کہ اک غلام ہوں شوہر نہیں ہوں میں

رشوت اگر نہ لوں تو مروں بھوک سے نیاز
دفتر میں اک کلرک ہوں افسر نہیں ہوں میں

★

تم غلط سمجھے ہو چپراسی اُسے گھر لے گیا
وہ جو تھا دفتر کا ہیڈ اُس کو افسر لے گیا

جو مسافر آکے ٹھہرا تھا مرے گھر رات کو
صبح دم وہ ساتھ اپنے میرا بستر لے گیا

میرے سینے میں نہ اس کو ڈھونڈ اے اسپیشلسٹ
"دل کہاں ہے پاس میرے دل تو دلبر لے گیا"

تیس پیسوں کی فقط نسوار لانے کے لیے
باس پندرہ میل تک دفتر کی موٹر لے گیا

ڈاکوؤ! کیا ڈھونڈتے ہو میرے گھر کچھ بھی نہیں
گھر میں تھا موجود جو کچھ اس کو نوکر لے گیا

خاک وہ محفوظ ہوگا میرِ لیورپا سے نیاز
ساتھ اپنی اہلیہ کو بھی جو شوہر لے گیا

★

تو مجھے ایسا کوئی کُشتہ کھلا دے سائیں
جو بڑھاپے میں جواں مجھ کو بنا دے سائیں

کار والا اُسے ہفتے میں بنا دے سائیں
نوکری بیٹے کو کسٹم میں دلا دے سائیں

تجھ سے کھانا جو بچے مجھ کو کھلا دے سائیں
اپنے جیسا مجھے مسٹنڈا بنا دے سائیں

والدہ میری بضد ہے کہ کروں میں شادی
مجھ کو شادی کی مصیبت سے چھڑا دے سائیں

اپنے ماتحتوں کی بچنا ہے اگر سازش سے
اپنے ماتحتوں کو آپس میں لڑا دے سائیں

قرض لے کر جو نظر آیا نہیں پھر مجھ کو
مجھ سے بچھڑا ہوا وہ یار ملا دے سائیں

ایسے تعویز کی حاجت ہے مجھے شدت سے
جو مری ساس کو بیگم سے لڑا دے سائیں

★

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

"اُردو شاعری کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔"

اس سیدھے سادھے اور بے ضرر قسم کے جملے نے میرے سیدھے سادے اور بے ضرر قسم کے منہ سے جیسے ہی چھلانگ لگائی میرے ایک جھکّی دوست نے اسے اچک لیا اور بیٹھنے لگے آؤ اس جملے کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔

اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ پوسٹ مارٹم کا رشتہ صرف مُردوں سے ہوتا ہے لیکن اس جیتے جاگتے جملے کے پوسٹ مارٹم کرنے کا عارضہ انھیں کیوں لاحق ہوا۔ یہ تو وہی جانیں یا ان کا جھکّی پن۔

جھکّی پن ایک عارضہ ہے جس کے ڈانڈے دانشوری سے جا ملتے ہیں اور دانشوری بھی بجائے خود ایک عارضہ ہے جس کا شجرہ مختلف واسطوں سے ہوتا ہوا شہرت کی ہوس تک جا پہنچتا ہے۔ جو بے شمار عوارض کی جڑ ہے۔ اس میں آدمی آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ بلکہ اپنے بھاؤ بنائے رکھنے کی فکر میں بڑے چاؤ سے اپنی ذلت بھی برداشت کر لیتا ہے۔ ویسے عورت، دولت اور شہرت کی ہوس کس شریف النفس انسان کو نہیں ہوتی۔ اگر نہیں ہوتی تو انھیں اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اُردو شاعری کے مزاج کی اور درمیان میں ڈھیر سارے جملہ ہائے معترضہ در آئے!

میرے دوست نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"اردو شاعری پر ہی کیا موقوف، مزاج تو ہر زبان کی شاعری کا اپنا اور جداگانہ ہوتا ہے تو تم اُردو ہی کی تخصیص کیوں کرتے ہو؟" تو میں نے بڑا ہی مودبانہ اور فدویانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری کا مزاج تو اپنا ہوتا ہے لیکن اُردو کے شاعر اپنے مزاج کے تنوع (بشمول تلون) سے اردو شاعری کے مزاج کو ٹھکانے سے نہیں رہنے دیتے اسی لیے اُردو شاعری کا مزاج دنیا کی دوسری زبانوں کی شاعری سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہاں ہر شاعر اس گمان میں مبتلا نظر آئے گا کہ اس کے آگے میر و غالب پانی بھرتے ہیں۔ اور میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ میر و غالب بجائے پانی بھرنے کے آہیں بھرتے ہوں گے کہ نسبتاً آسان کام ہے ویسے بھی ہماری اردو شاعری آہوں، جفاؤں، معشوق کے غمزوں، رقیب کی سازشوں، چرخ کی ناسی پٹیوں اور ... کے تازہ پردوں سے اتنی ہی

[illegible]

گستاخی سرزد ہوئی۔ خدا کی پناہ! رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر ہے۔

وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا جس میں ایک بلی چوہے کا پیچھا کرتی ہے اور چوہا بجائے کسی بل میں روپوش ہونے کے شراب سے بھرے پیپے میں پناہ لیتا ہے۔ اور جب نشہ کی حالت میں پلٹتا ہے تو سینہ تان کر پوچھتا ہے "کہاں ہے۔ بلی"؟

اسی طرح جب کوئی بچہ صفت شاعر، مشاعرہ کے شہ نشین سے شراب کی داد پی کر پلٹتا ہے تو پوچھتا ہے "کہاں ہیں میر و غالب؟"

میں نے ایک ہی سانس میں میر و غالب کو کئی بار دہرا دیا۔ آخر یہ بھی تو پتہ چلے کہ یہ بیچارے ہیں کون "آپ جانتے ہیں انھیں؟"

میں نے ان کا تذکرہ سن رکھا ہے۔ یہ غالب صاحب بڑے خاصے کی چیز ہیں۔ سنا ہے شاعری کیا کرتے تھے۔ آم کھاتے اور شراب پی پی کر اپنے افلاس کو کوستے تھے۔ قصیدہ لکھ کر بادشاہ سے تنخواہ بھی پاتے تھے اور ایسا کھاتے پیتے تھے کہ ان کا بچا کھچا آج کے شاعر کو مل جائے تو ملک الشعراء کہلائے۔

خیر یہ غالب صاحب، میر صاحب کے بہت معتقد تھے۔ متقدمین میں اگر کسی کا شمار ہو تو یہ بھی ایک بات ہے۔ اس درجہ غلو کر معتقد بن بیٹھے! کہتا ہے غالب صاحب نے میر صاحب کے ہاتھ پہ بیعت بھی کر رکھی تھی اور یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

سنا ہے کہ غالب صاحب کے ایک رقیب ہوا کرتے تھے۔ ذوق صاحب۔ یہ بھی اچھے خاصے شعر کہہ لیتے تھے لیکن میر صاحب سے خود ٹکر لینے کی بجائے غالب صاحب کو طعنہ دیتے کہ "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب"

ایک ذوق صاحب ہی پہ کیا موقوف آج تو ہر طرف یہی تماشا نظر آتا ہے۔ جو شخص خود کچھ نہیں کر سکتا وہ فنکاروں کو ان کے مقام سے نیچے اتار کر اپنے احساسِ کمتری کو اور بلند کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔

غالب صاحب بڑی تیز آنکھیں رکھتے تھے۔ جو کچھ انھوں نے بیتی ہوئی صدی میں دیکھا آج کا شاعر شاید آنے والی صدی میں بھی نہ دیکھ پائے۔

حضرت موسیٰ کے لیے مشہور ہے کہ ان کی آنکھیں جلوہ طور کی بدولت اتنی تیز ہو گئی تھیں کہ کالی کالی رات میں کالے کالے پہاڑ پر کالی کالی چیونٹی بھی کالے کوسوں رینگتی تو یہ دیکھ لیتے۔ لیکن غالب نے کس طور کا مشاہدہ کیا یہ خدا جانے۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ بدن پہ چیونٹیاں رینگتی ہیں انھیں دیکھنا تو کجا محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ شاید جمود اسی کا نام ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اردو شاعروں کے مزاج کے بارے میں تو عرض کرنا یہ ہے کہ آج کے شاعروں میں سے بعض نے اپنے مزاج کی استطاعت اور توفیق کے مطابق ڈیڑھ اینٹ کی، بعض نے سوا اینٹ کی اور بعض نے بغیر اینٹ ہی کی مسجد تعمیر کروا کے اسے ویران چھوڑ دیا ہے کہ آؤ اس میں اعتکاف کریں اور ثواب شاعروں کی ارواح کو پہنچے۔

اردو شاعری کا مزاج اتنے فنکاروں میں بٹا ہوا ہے جتنے کہ اردو شاعر زندہ ہیں۔ ہر گلی کوچہ شاعروں سے پٹا پڑا ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو میں نے ایسے ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جنھیں شعر کہنا تو کجا شعر سمجھنا بھی نہیں آتا

آتا لیکن میرے جھکی دوست نے اس کی یہ تاویل پیش کی کہ شعر کہنا الگ فن ہے اور شعر فہمی دوسرا ڈپارٹمنٹ ہے۔ شعر کہنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ شعر سمجھ بھی جائیں۔ یہ کام تو قاری یا سامع بحسن و خوبی انجام دے لیتا ہے اور بعض اوقات شاعر کی خوش نصیبی سے اسے اچھا قاری یا سامع مل گیا تو سمجھئے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مطلب و معانی کے سمندر کے سمندر ابل پڑیں گے حالانکہ چشموں سے بھی کام چل سکتا تھا۔

یکایک انھوں نے سوال جڑدیا۔ "مخدوم کا نام سنا ہے؟" اس بے تکے سوال پر پہلے تو میں حیران ہوا پھر اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے الٹا سوال کر دیا۔ "کون مخدوم؟" حیرانی سے کہا۔ "مخدوم کو نہیں جانتے؟ ارے بھئی مخدوم محی الدین!" میں نے کہا وہی کامریڈ مخدوم تو نہیں جو اُن جھنڈے کے منڈوے تلے عشق کی آگ میں جل گئے تھے۔ بگڑ کر بولے "لفظ کامریڈ پر زور کیوں دے رہے ہو؟ کیا مخدوم شاعر نہیں تھا۔؟" میں نے کہا شاعر کو کامریڈ کہنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ بولے "پڑ سکتا ہے۔ تم جیسے کچے ذہن اسے صرف سیاسی خانے میں فٹ کر کے بھول جائیں گے کہ مخدوم شاعر بھی تھا۔"

میں نے گفتگو کو دوسرا رخ دینے کے لیے کہا "اُردو شاعری سے آسان کوئی چیز نہیں۔" جھکی دوست نے فوراً میرا جملہ اپنی مٹھی میں کھینچ کر پوچھا۔ "شاعری بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟" معافی مانگتے بنی کہ بھائی شاعری چیز نہیں ہوتی۔ دوسرا سوال ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ "تو پھر کیا ہوتی ہے؟" میں نے ٹالنے کے لیے کہا کچھ بھی ہوتی ہوگی لیکن بخدا چیز تو نہیں ہوتی۔"

ہنس پڑے اور بولے "بڑی آسانی سے ہار مان لیتے ہو۔" میں جواباً مسکرا کر رہ گیا کہ جھکیوں سے نہ الجھنے میں ہی عافیت ہے۔ پوچھا۔ بڑا شاعر کون ہوتا ہے۔ میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ جس شاعر کے پیچھے کوئی گاڈ فادر ہو وہی بڑا شاعر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے یہی میں نے دہرا دیا۔ یہ گاڈ فادر کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا جنھوں نے ماریو پوزو کا ناول "گاڈ فادر" یا اسی نام کی انگریزی فلم دیکھی ہو وہ اس اصطلاح سے بخوبی واقف ہیں اگر وہ کسی وجہ سے اس سعادت سے محروم رہ گئے ہوں تو فیروز خاں کی فلم "دھرماتما" سے اس کا کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔ کہنے لگے اس کا اردو ترجمہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے ترجمہ کیا "خدائی باپ"

انھوں نے دریافت کیا "خدائی فوجدار کی طرح؟" میں نے حامی بھر لی۔

کہنے لگے "یہ تو بڑی مذہبی بات ہوئی۔ چلو اس میں خدا کا تصوّر تو آیا جب کہ ہمارے کئی شعراء حضرات وجود خداوندی سے متفق نظر نہیں آتے۔" پھر اس کے بعد کہا۔ "ہاں بتاؤ اگر یہ خدائی باپ میسّر نہ آئے تو؟" میں نے کہا چھٹی ہو گئی اس شاعر کی۔" بولے "اگر شاعر کے فن میں دم ہو تو؟" میں نے کہا "خدائی باپ وہ خود پیدا کر لے گا۔" ہنس کر کہنے لگے "لڑکا اپنا باپ پیدا کرے گا۔" میں نے کہا کیا آپ نے یہ نہیں سنا کہ زمانۂ آخر میں ماں اپنا بیٹا نہیں آقا جنے گی۔ کہنے لگے کہ یہ خالص اسلامی نظریہ ہے۔ میں نے کہا تو پھر عیسائی نقطۂ نظر سے بات کرنا چاہیئے اور سنیئے عیسائی مدارس میں پڑھنے والے طلباء اپنے والد بزرگوار کو ڈیڈ کہتے ہیں اور پادریوں کو فادر" منہ بنا کر بولے "یہ تو بڑی بُری بات ہوئی۔ اپنے آپ کو کسی دوسرے باپ سے منسوب کرتے ہوئے انھیں شرم نہیں آتی؟" میں نے کہا اگر اردو شاعری بھی انھیں ساتھ ہی ساتھ پچھوائی جائے تو سلسلہ یہیں ختم ہو سکتا ہے ... ... پہلی بار وہ میری بات سے متفق ہو گئے اور مجھے اردو شاعری کا ... ... بہت خوشی ہوئی کہ رہا رنگ بھی پکڑ سکتا ہے!! ▽

مجیب الرحمٰن بزمی
(ڈورنڈا۔ رانچی)

ہیں ملک کے معمار جواب آپ ہی دیں گے
ہر دن کے فسادوں کا حساب آپ ہی دیں گے

کتنوں کا ہوا قتل، جلے کتنے مکانات
آئندہ الکشن میں جواب آپ ہی دیں گے

دلکش تھا مرا شہر بنا آج ہے مرگھٹ
حالات دگرگوں کا جواب آپ ہی دیں گے

تاریخ جو ہو مسخ نصابوں میں لکھیں گے
نفرت بڑھے جس سے وہ کتاب آپ ہی دیں گے

مظلوم کی فریاد پہ ٹپکائیں گے آنسو
ظالم کے بھی چہرے پہ نقاب آپ ہی دیں گے

فاقہ ہے کہیں لوٹ ہے رشوت ہے کہیں قتل
ان سارے حوادث کا جواب آپ ہی دیں گے

قاتل کو سزاؤں کے عوض حضرتِ بزمی
معصوم ہیں، ان کو یہ خطاب آپ ہی دیں گے

قطعات

حکومت کی ستم رانی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
اِدھر رشوت اُدھر رشوت جدھر جاؤ نظر رشوت
وہی محنت کی ارزانی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
سیاست کی وہ من مانی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

شعلۂ بغض و عداوت کو ہوا دو لوگو!
دورِ حاضر کے جو نیتا ہیں یہی کہتے ہیں
آگ نفرت کی ہر اک دل میں لگا دو لوگو
پیار و اخلاق کی توقیر گھٹا دو لوگو

وڑا پاؤ

رفیق عثمانی
(بھیونڈی)

مہمان آئے آج کریں بھی تو کیا کریں
گھر میں نہیں اناج کریں بھی تو کیا کریں

اک صرف یہ ہے گھر ہی نہیں سارے دیش میں
ہے مفلسی کا راج کریں بھی تو کیا کریں

ہاتھوں میں لے کے دوستو! جھاڑو ہے آج کل
بیوی کے سر پہ تاج کریں بھی تو کیا کریں

پیتا ہے مجھ سے قطرہ ہر اک شام اُن کا باپ
رشوت کا ہے رواج کریں بھی تو کیا کریں

دینے لگے ہیں دال وہ وڑا پاؤ میں رفیق
یوں کھو رہے ہیں لاج کریں بھی تو کیا کریں

صغیر احمد سحر سندیلوی

غیر حاضر دماغ پروفیسر

"اس وقت ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں شخصی نظام حکومت قائم ہے"۔ علم سیاسیات کے ایک غیر حاضر دماغ پروفیسر نے کلاس میں لکچر دیتے ہوئے فرمایا "پروفیسر صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چند ملکوں کو چھوڑ کر ساری دنیا میں جمہوریت کا نفاذ ہے" طلباء نے بیک آواز ہو کر جمہوری انداز میں احتجاج کرتے ہوئے کہا: "ابھی تم لوگوں نے اتنی سیاست پڑھی بھی نہیں ہے جتنی میں پڑھ کر بھول چکا ہوں۔ یہ بھی ایک سیاست ہے جسے تم لوگ جمہوریت سمجھتے ہو وہ دراصل شخصی حکومت ہے تم اس راز کے سمجھنے سے قاصر ہو یہ سیاست دانوں کی شعبدہ بازی ہے کہ تم ایسا سمجھنے پر مجبور ہو ان سیاست دانوں نے تمہاری عقل بندی کر دی ہے جس طرح بازیگر تماشا دکھاتے وقت ناظرین کی نظر بندی کر دیتے ہیں ان لوگوں نے تمہاری آنکھوں پہ جمہوریت کا باریک ریشمی پردا ڈال رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی سامراجیت تم سب لوگوں کو جمہوریت دکھائی دیتی ہے۔ انھیں جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" پروفیسر صاحب نے اپنی سیاست دانی کے زعم میں میز پر زور کا مکّا مارتے ہوئے کہا:

"لیکن حیرت ہے پروفیسر صاحب! کہ ساری دنیا کے عوام بیوقوف ہیں اور یہ آخر اتنے بڑے مغالطے میں کیوں پڑے ہوئے ہیں شاید یہ دنیا کا سب سے بڑا فریب ہے" ایک ذہین طالب علم نے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔

"مغالطہ میں ڈالنا ہی تو شعبدہ بازی ہے اسی کا دوسرا نام سیاست ہے تم لوگوں کو اگر سیاست کا درس لینا ہے تو اس اہم راز کو سب سے پہلے سمجھنا ہوگا"۔ پروفیسر نے ناک پر رکھا ہوا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"سر! جمہوریت اور سامراجیت میں کیا فرق ہے" ایک بدھو طالب علم نے دوسرا سوال چھیڑ دیا "جو فرق انسان کے لباس اور اس کے جسم میں ہوتا ہے۔ انسان اگر لباس سے مبرا ہو جائے تو سامراجیت ہے اور اگر اپنے برہنہ جسم کو خوبصورت کپڑوں میں چھپائے تو یہ جمہوریت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت کچھوے کا ہڈی نما اس خول کو کہتے ہیں جس میں سامراجیت پناہ لیتی ہے۔ اور حالات سازگار دیکھ کر اس خول سے باہر نکل کر اپنا مقصد پورا کرتی ہے اور خطرہ محسوس کرتے ہی پھر اسی خول میں سکڑ جاتی ہے۔ گویا کچھوے کی یہ ہڈی نما جمہوریت کی پناہ گاہ ہوتی ہے اگر سیاست کی تعلیم حاصل کرنا ہے تو سب سے پہلے ہر طالب علم کو اپنے اپنے گھروں میں

پالنا چاہیئے کچھوے اور سیاست کا بہت گہرا تعلق ہے کچھوے کے حرکات و سکنات میں ایک اچھے ماہر جمہوری سیاست داں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں کچھوے اور خرگوش کا قصہ تم لوگوں نے اسکول میں ضرور پڑھا ہوگا کچھوے اور خرگوش کا دوڑ میں کیا مقابلہ ہو سکتا ہے یہ کچھوے کی سیاسی چالاکی اور شعبدہ بازی ہی تھی جس نے خرگوش کو گہری نیند سونے پہ مجبور کر دیا آج کل بھی کچھ سیاسی کچھوے بہت سے خرگوشوں کو خواب آور گولیاں کھلا کر اطمینان کی نیند سُلا دیا کرتے ہیں علامہ اقبال مرحوم نے کچھوے کی اس سیاسی فنکارانہ مہارت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ؎

خواب سے بیدار جب خرگوش ہوتا ہے کبھی ؛ پھر سلا دیتی ہے کچھوے کی اسے جادوگری

"سر! جمہوریت کی خصوصیت اور سامراجیت کے نقائص پر کچھ روشنی ڈالئے ایک دوسرے طالب علم نے پوچھا۔ علامہ اقبال جمہوریت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں ؛ خرگوش گِنے جاتے ہیں تولے نہیں جاتے

شخصی حکومت میں عیب نہ ہے نہ جمہوری میں فرق صرف حکمراں کی نیتوں میں ہوتا ہے۔ اگر نیک نیتی کے ساتھ رعایا کی فلاح و بہبودی کا خیال رکھا جائے تو دونوں صورتیں ایک ہی جیسی ہیں حکمرانوں کو خواہ ظلِ الٰہی شہنشاہ، راجہ مہاراجہ تعلقدار اور زمیندار کہا جائے یا ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ پی۔ وزیر اعظم وزیر اعلیٰ گورنر اور راشٹرپتی کہا جائے بات ایک ہی ہوئی نام بدلنے سے شخصیت اور ذہنیت نہیں بدل جاتی ارباب اقتدار تو وہی ہیں جو کل تھے رعایا جیسی کل شخصی حکومت میں غریب تھی آج کے جمہوری دور میں بھی غریب ہے۔ پھر شخصی اور جمہوری نظام حکومت کی اصطلاحیں وضع کرنے سے کیا فرق پڑا۔ غریب دولت مندوں کے سامنے کل بھی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے بادشاہوں اور امراء کے حاشیہ بردار کل بھی تھے عوامی نمائندوں کے ناز بردار آج بھی ہیں پہلے ان کے آگے ڈالیاں لگائی تھیں نذرانے گزارے جاتے تھے رشوتوں کے انبار آج بھی ان کے سامنے لگائے جاتے ہیں" پروفیسر سانس لینے کے لیے رُکے۔

"لیکن پروفیسر صاحب! کل شخصی دور میں ہماری کوئی آواز نہ تھی آج ہم چاہیں تو وزیر اعظم کو بھی کرسی سے اُتار سکتے ہیں شخصی دور میں عوام کی حیثیت نہ تھی جمہوری دور میں عوام کی قیمت ہے حق رائے دہندگی کی طاقت ہے"۔ ایک طالب علم نے ان کے نظریئے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

تم جھوٹے ہو تمہارا نظریہ باطل ہے تمہاری کوئی آواز نہیں تمہارے ووٹوں کی کوئی قیمت نہیں تم کل شخصی حکومت میں بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے ہو اور آج بھی تم یہی کھوکھلے نعرے لگا رہے ہو تم عقل سے نہیں جذبات سے زیادہ کھیلتے ہو ذرا سچ سچ بتاؤ حقیقت پسندی سے ٹھنڈے دل سے کہو کیا تم پارلیمنٹ میں ایسے ہی منتخب نمائندے بھیجنا چاہتے تھے جو تمہاری جان و مال کی حفاظت نہ کرسکیں اور اپنے لیے حفاظتی دستے مقرر کریں جو تمہارے لیے دو وقت کی سوکھی روٹی کا بھی انتظام نہ کرسکیں اور خود مرغن غذاؤں سے شکم پری کریں۔ تم کو صاف پانی کے لیے ترسائیں اور وہ فریزر کا ٹھنڈا پانی نوش جان کریں تم کو سڑکوں پہ جوتیاں رگڑ رگڑ کے مار ڈالیں اور خود ہوائی جہازوں ہیلی کاپٹروں سے اور غیر ملکی کاروں سے سفر کریں۔ تم تین تین دن تک بجلی کی روشنی کے لیے تڑپتے رہو اور وہ بجلی کے قمقموں میں دادِ عیش دیا تھا ... لیے گرمیوں میں ٹھنڈی کا انتظام نہ کرسکیں اور وہ کولر اور خس کی ٹٹیوں کی خوشبو دار ٹھنڈی ہوا ... کم مزے لوٹیں تم کو رہنے سکنے کے لیے جھونپڑے نہ بھی میسر نہ ہوں اور ان کے محل عالیشان زینت و زیبائش اور آرائشی سامانوں سے

ریزہ بنگلے ہوں۔ اگر تم بیمار پڑ جاؤ تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ آئے اگر انھیں چھینک آجائے تو غیر ملکوں میں ان کا علاج ہو۔ بولو جواب دو یہ کیسی تمہاری آواز ہے یہ کیسی تمہارے ووٹوں کی قیمت ہے یہ کیسی تمہاری جمہوریت ہے جس کی شان میں تم قصیدے پڑھتے ہو کیا یہی وہ جمہوریت ہے۔ اگر تمہارے ووٹوں کی کچھ بھی قیمت ہے تو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور کیوں ہے جہلا کو تو جانے دو تم تو تعلیم یافتہ ہو تم ایک فیصد بھی اپنے پسند کے نمائندے پارلیمنٹ میں نہیں بھیج سکتے چالیس سال کا جمہوری نظام حکومت تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے آج تک کوئی نیک لیکن غریب صاف باطن شخص پارلیمنٹ میں کیوں نہیں پہنچا اس کے پاس زر ضمانت ہی داخل کرنے کے لیے روپیہ نہیں وہ الکشن کیا لڑے گا لیکن تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ آخر اس کے کیا اسباب ہیں الکشن لڑنا انھیں لوگوں پیتوں کا کھیل ہے انھیں امراء و روساء کی تفریحات ہیں پارلیمنٹ ان کے لیے قمار خانہ ہے ایک تجارتی منڈی ہے۔ یہ وہی امراء زمیندار ہی تو ہیں جو کل تک غریب کاشتکاروں کا خون چوستے رہے ہیں وہی ظالم جفا پیشہ ہی تو ہیں جو غریبوں سے بیگار لیتے تھے پھر انھیں آج غریبوں سے کیسی ہمدردی پیدا ہو گئی یہی وجہ ہے کہ میں جمہوریت اور سامراجیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی فرق ہے تو مجھے بتاؤ دلائل سے ثابت کرو؟" پروفیسر نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سر کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور ہے" ایک طالب علم نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں فرق صرف اس قدر ہے کہ شخصی حکومت کے بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا تھا اور جمہوری دور کے بادشاہ بغیر تاج کا ہوتا ہے جس کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی ہوتا ہے۔ یہ بغیر تاج کے بادشاہ عوام زاد ہوتے ہیں جبکہ تاج والے بادشاہ در زاد ہوتے تھے اور ماں کے شکم ہی سے بادشاہت ساتھ لے کر پیدا ہوتے تھے لیکن عوام زاد بادشاہ جب تک عوام انھیں بادشاہ نہیں بنا لیتے وہ عوام کے ہاتھ جوڑ جوڑ کر بادشاہ بنانے کی ان سے برابر تقاضا کرتے رہتے پھر جب وہ بادشاہ بنا دیئے جاتے تو پورے پانچ سال تک اور کبھی کبھی ساری عمر تک عوام سے اپنے ہاتھ پیروں کی مالش کراتے رہتے ہیں علامہ اقبالؔ جن کا شمار علم السیاسیات کے ماہرین میں ہوتا ہے وہ اس حقیقت سے پردا اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

حقیقت ایک ہے جمہوری و شخصی حکومت کی ؛ لہو تربوز کا نکلے جو خربوزے کا دل چیریں

دراصل اس جمہوری دور میں خربوزہ اور خرگوش دونوں کی مٹی خراب ہے خربوزہ اور خرگوش میں جو لفظ مشترک ہے وہ ہے "خر" جو بیوقوفی کی کھلی ہوئی علامت ہے عوام بھی اسی خصوصیت سے متصف ہوتے ہیں اس لیے انھیں بھی اسی زمرے میں شمار کرنا چاہیئے مجھے اس موقع پر ایک بار پھر علامہ اقبالؔ کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا بھیڑی فرزش ؛ انتہائے سادگی میں کھا گیا خربوزہ مات

"لیکن پروفیسر صاحب! آپ نے جو اپنے لکچر میں علامہ اقبالؔ کے اشعار پیش کئے وہ ان کے نہیں بلکہ کسی مزاح نگار نے ان میں تصرف کیا ہوگا" ایک طالب علم نے جو سیاست کے ساتھ شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا مسکراتے ہوئے کہا

"نہیں بات دراصل یہ ہے کہ میں نے یہ اشعار ڈاکٹر صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے دیکھے ہیں جب کچھوے اور خرگوش ان ترقی پسند علمی اصطلاحیں شائقین علم و ادب کی سمجھ میں نہ آئیں تو انھوں نے اردو میں رائج بعض دوسری متبادل اصطلاحوں سے بدل دیں وہ اکثر اس طرح کی اپنے کلام پر خود اصلاح کیا کرتے تھے۔

"سر! کیا علامہ اقبالؔ شاعر کے علاوہ سیاستداں بھی تھے جو سیاست سے متعلق اتنے اہم نکات اپنی شاعری

بیان کر گئے ، ایک طالب علم نے پھر سوال کر دیا۔

" ہر سیاست داں شاعر ہوتا ہے۔ پروفیسر مارگل نے اپنی کتاب " عجائبات سیاست " میں ایک جگہ لکھا ہے کہ سیاست داں اگر سیاست داں نہ ہوتے تو وہ بہترین جدید ترقی پسند شاعر ہوتے " اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح جدید ترقی پسند شاعری کے معنی و مطالب سمجھنے کے لیے سامع کو دماغ سوزی اور شاعر کو بلند پروازی کی ضرورت ہوتی ہے ایک عام آدمی کے لیے اس بلندی تک پہنچنا بہت مشکل ہے حالانکہ شعر عوام کے لیے کہے جاتے ہیں جب عوام ہی انھیں نہ سمجھ پائیں تو پھر ایسی شاعری سے کیا فائدہ اسی طرح سیاست داں کے بیانات بھی عوام تو کیا خواص تک نہیں سمجھ پاتے وہ ان کی باتوں کا کچھ کا کچھ مطلب نکالتے ہیں۔ سیاست داں اپنی تقریر میں صنعت د کا استعمال بہت کرتے ہیں صنعت ایہام کلام میں ایسے جملوں کے استعمال کو کہتے ہیں جن کے دو مفہوم ہوں ایک قریب الفہم دوسرے بعید الفہم لیکن اس میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ عوام کا ذہن، قریب المفہوم تک ہی پہنچ پاتا ہے اور بعید المفہوم صرف سیاستداں کے دماغ ہی میں محفوظ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست داں ہمیشہ مبہم بات کرنے کا عادی ہوتا ہے تاکہ حسب ضرورت وہ اپنی بات کی تردید یا تائید کر سکے دراصل سیاست داں کی تقریر کا ہر جملہ جدید ترقی پسند شعر ہوتا ہے۔" انھوں نے آنکھوں سے چشمہ اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا

" سر !" ایک طالب علم نے کچھ پوچھنا چاہا۔

" اب کل تم لوگ پروفیسر مارگل کی کتاب " عجائبات سیاست " کا مطالعہ کر کے آنا مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا۔

" سر ! وہ کیا ؟ سب طلباء ایک زبان ہو کر بولے۔

میں کل شام کو اپنی کار عجائب گھر میں بھول آیا تھا آج صبح اسی ارادے سے نکلا تھا مگر یونیورسٹی کی طرف آگیا۔ وہ کار کی چابیاں طلباء سے لیتے ہوئے کلاس روم سے نکل گئے۔

□ □

نامور مزاح نگار
نریندر لوتھر
کے انشائیوں کا تازہ مجموعہ !

الف تماشا

صفحات : ۱۷۴ ——— قیمت : ۱۶ روپے

مطبوعہ : زندہ دلانِ حیدرآباد

رؤف خوشتر (بیدر)

........اور گماں اپنا

ایک زمانہ تھا کہ لوگ واضح افکار اور صالح اولاد کی وجہ سے دنیا میں مشہور و مقبول ہوتے تھے۔ آپ ان دونوں نعمتوں سے اکثر محروم نظر آتے ہیں اور اب لوگ دنیا میں جانے پہچانے جانے کے لیے سوانح حیات قلمبند کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ یہی ایک شہرت کو دوام بخشنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ سوانح حیات کے صاحب کتاب کے لیے غیر معمولی فرد ہونا ضروری ہے۔ معمولی اور عام آدمی جس کی خشک اور سپاٹ زندگی کسی طرح کے اسکینڈل کمیشن خرد برد، رشوت، غبن معاشقے، شادیوں اور دیگر اتار چڑھاؤ اور سنگین واقعات سے یکسر خالی ہو تو بھلا وہ خود نوشتہ داستان کو رنگین کیسے بنا سکتا ہے۔

سماجی، سیاسی، ثقافتی، تعلیمی، مذہبی، سائنسی اور دیگر شعبۂ حیات کے چھوٹے موٹے ماہر جیسے ہی اپنی آپ بیتی قلم بند کرنے کا اعلان کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ بہتی ہوئی گنگا میں خوب ڈبکیاں لگا کر اب ستانے کے لیے شہرت کا ساحل ڈھونڈ رہے ہیں۔

اس سہانے سوانحی اعلان کے ساتھ ہی اُن کے حریف اب حلیف بن جاتے ہیں۔ تاکہ اس متوقع کتاب زیست میں ان کا ذکرِ خیر ہو۔ وہ ایک عدد ہار ایک فوٹو گرافر اور اخبار کے ایک نمائندے کو لے کر اُن کے یہاں پہنچتے ہیں۔ ہار پہنا کر ساتھ ہی فوٹو کھنچوا کر اس اکلوتے صحافی سے ان کا پہلا اور غالباً آخری انٹرویو دلاتے ہیں جس میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ اس سوانحی کتاب سے کس طرح آنے والی نسلیں متاثر ہوں گی اور وہ شاندار ماضی کی جھلکیاں اس کے اوراق میں دیکھ سکیں گی۔ اور یہ محض ایک داستانِ فرد نہیں بلکہ حکایتِ عصر ہے۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد حلیف نما حریف پیشگی مبارکباد پیش کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ یوں تو آپ کی ساری زندگی ہمارے لیے کھلی کتاب کی سی ہے لیکن اس کاغذی پیرہن سے ہم آپ کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف گوشوں سے واقف ہو جائیں گے۔

ہم ایک ایسے شناسا کے پاس پہنچے جو اپنی داستانِ حیات قلم بند کر رہے تھے ہم نے دستک دی تو کچھ دیر بعد دروازہ کھولا اندر بلایا میز کے نیچے سے پردہ سے چند کتابیں جھلک رہی تھیں۔ غور سے دیکھا

تو وہ مشاہیر عالم کی خود نوشتہ کتابیں تھیں۔ ہم نے سوچا کہ ان کی داستانِ حیات میں چند پردہ نشین خواتین کا ذکر آئے نہ آئے لیکن پردہ نشین کتابوں کا اثر ضرور ہوگا۔ ہم نے اُن کی کتاب کی پیش رفت کے متعلق دریافت کیا کہنے لگے "اب تم سے کیا چھپاؤں اپنی داستانِ حیات کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہوں۔ جیسے بچپن، تعلیم، کھیل کود، جوانی، ادبی و سیاسی سرگرمیاں اور ہنگامے، جلوس، دوست احباب، شادیاں، خطوط، تقاریر، نوٹ وغیرہ ان ابواب سے متعلق بھرپور معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک سوال نامہ دوست احباب رشتہ داروں میں تقسیم کیا ہوں اس توقع کے ساتھ کہ وہ میری اس کتاب میں جو صدی کی عظیم الشان تاریخی دستاویز ہوگی اپنا ذکر چاہتے ہیں تو سوال نامہ پُر کرکے ایک تازہ فوٹو اور سَو روپیہ کا پوسٹل آڈر چیک روانہ کریں۔ ماشاء اللہ خوب تعاون مل رہا ہے۔ اس کتاب کو شایانِ شان بنانے کے لیے ہر ایک دامے، درمے اور سخنے تعاون کر رہا ہے۔

پھر پیار سے اپنے سر کے گھنے بالوں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم تو جانتے ہو میں بال بال مقروض تھا۔ اب سارے قرض ادا ہو گئے ہیں"۔

اچھا ذرا آپ کے سوالات تو دیکھیں؟ ہم نے مجسم سوال ہو کر پوچھا۔ جواب ملا "میں نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے صرف چند سوالوں پر قناعت کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

۱۔ میں آپ سے پہلے کہاں ملا تھا؟ اس پہلی یادگار ملاقات کو کم سے کم پچیس سطروں میں لکھیے۔
۲۔ آپ مجھ سے کیوں متاثر ہیں؟ جواب واضح اور مفصل ہو تاکہ دوسرے بھی متاثر ہو سکیں۔
۳۔ میری کون سی ادا آپ کو پسند ہے؟ شرمانے سے کام نہیں چلتا۔
۴۔ آپ کس حد تک میرے احسان مند اور مرہونِ منت ہیں؟ دو چار مثالوں سے سمجھائیے۔
۵۔ آپ ہر کام مجھ سے کیوں لینا چاہتے ہیں؟ جب کہ کئی وزیر اور بااثر لوگ موجود ہیں۔
۶۔ مجھے قائد بنانے میں آپ کو کیوں خوشی ہوتی ہے؟ جب کہ قائد ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔
۷۔ آپ کے نزدیک میرا سب سے اچھا کارنامہ کون سا ہے
۸۔ آئندہ انتخاب اور اردو اکیڈیمی کی صدارت کے لیے ہر ایک میرا ہی نام کیوں لے رہا ہے۔
۹۔ میرے مرنے کے بعد جو خلاء پیدا ہوگا اسے آپ کیسے پُر سکیں گے؟ متوقع خراجِ عقیدت منظوم و نثر میں لکھیں تاکہ ان کو پڑھ کر میں بے موت مر جاؤں (صرف محاورہ ہے میں) ان سوال ناموں کے لیے الگ اور غیر جانبدارانہ جوابات کی روشنی میں میں اپنے آپ کو تلاش کروں گا ترتیب کے ساتھ آپ بیتی لکھوں گا جو جگ بیتی بھی ہوگی۔ تو صاحبو یوں سوال ناموں، چٹکلوں، ڈراموں، عظیم انسانوں کی سوانح حیات سے بھرپور استفادہ حاصل کرتے ہوئے کچھ اپنی زندگی کے سنسنی خیز واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کو اب آپ بیتی سمجھا جا رہا ہے۔ اور یہ آپ بیتیاں خوب مقبول بھی ہو رہی ہیں۔

حالانکہ یہ ساری معلومات اور کارنامے دوسری شخصیتوں کے ہیں لیکن ان پر گماں اپنا ہوتا ہے۔

جاوید لطیف (حیدرآباد)

کُتّا بھی ساتھی بھی

کُرۂ ارض پر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو جانوروں کو بھی ساتھی بنائے رکھتی ہے، انسان
...ے سے لیکر ہاتھی تک سب کو پالتا ہے مگر ان سب جانوروں میں کُتّا ہی ایک ایسا جانور ہے جو قریبا
ساتھی کے درجے تک جا پہنچا ہے وہ انسان کے ہمراہ سڑکوں پارکوں اور مکانوں میں ساتھ رہنے
بسنے کے علاوہ موٹر نشینی بھی کرتا ہے، گودوں میں بھی بیٹھتا ہے اور بستروں میں بھی سوتا ہے۔ کُتّے کی
دو ہی قسمیں مسلّم ہیں، ایک تو وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کُتّا ہی رہتا ہے اور دوسری حیثیت میں وہ محبت
...لا وفادار ساتھی بن جاتا ہے۔

عام انسانوں سے لیکر بزرگوں، فقیروں، اصحابِ کہف اور یہاں تک کہ بھگوان دتاتریہ نے بھی کُتّے کو
...نا رفیق بنایا ہے۔ آج کی دنیا میں جب کہ فیشن عام ہوتا جارہا ہے مغربی تہذیب نے کُتّے کو بطور فیشن اور
شرق نے کچھ تو بطور تقدس اور کچھ بطور فیشن اپنا ساتھی بنا لیا ہے۔

انسان میں بہت کچھ کمالات ہیں تاہم کمی یہ ہے کہ وہ کُتّے کی نفسیات تو جانتا ہے مگر اس کی بولی
...ہیں سمجھتا۔ اگر سمجھتا ہوتا تو کُتّے کے اس قدر قریب آجاتا کہ شاید کُتّے کی دوسری قسم ہی بن جاتا۔ ویسے
...بات اور ہے کہ بعض انسان کُتّے سے بھی زیادہ زور سے بھونکتے ہیں اور دیر تک بھونکتے ہی رہتے ہیں
...ن کا مطلب جن پر وہ بھونکتے ہیں وہ تو کچھ سمجھتے ہی ہوں گے مگر کُتّے شاید ہی سمجھ پاتے ہوں۔ ایک بیوی
...رف ایک شوہر کی شریکِ حیات بن سکتی ہے مگر ایک کُتّے میں یہ وصف ہے کہ وہ شریکِ خاندان بن جاتا ہے۔

کُتّا اور وفاداری دو لازم و ملزوم الفاظ بن گئے ہیں انسانوں پر طنز کرنے کے لیے کُتّے کی وفاداری یاد
لائی جاتی ہے کبھی زمانے میں کسی مجنوں نے اپنی لیلیٰ کے کُتّے سے ضرور پیار کیا ہوگا مگر اس ماڈرن ایج میں اونچے
...ر مغربی تہذیب کے دلدادہ گھرانوں میں کچھ کُتّے حسبِ عمل درآمدِ قدیم آج بھی سگِ لیلیٰ کا پارٹ ادا کرتے ہیں
...ر دورِ حاضر کے کچھ مجنوں اپنی لیلاؤں کے کُتّوں سے آج بھی محبت کرتے ہیں۔

مغربی ممالک اور امریکہ میں تو کُتّوں کی وفاداری کا صلہ دینے کے لیے بعض صاحبِ ثروت خواتین و حضرا...
...ن کے نام بڑی بڑی جائیدادیں وقف کر جاتے ہیں کُتّوں کو عیش و آرام پہنچاتے اور چاہنے کے سلسلے میں تو

خواتین عموماً پیش پیش نظر آتی ہیں، ان سارے حالات کے پیشِ نظر کبھی کبھی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ آدمی کو ہمیشہ آدمی ہی بنے رہنے میں کچھ فائدہ نہیں۔

کتا انسان کے ساتھ رہے تو کبھی کبھی ایک انسان دوسرے انسان پر لطیف طنز بھی کر سکتا ہے۔ دو پڑوسی آپس میں ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے تھے ایک دن صبح کی سیر کے وقت دونوں کا کسی جگہ آمنا سامنا ہو گیا ایک پڑوسی کے ساتھ ایک اونچا پورا کتا تھا دوسرے پڑوسی نے طنزاً پوچھا۔

"بھائی کس گدھے کو ساتھ لئے پھر رہے ہو؟"

اس پر کتے والے پڑوسی نے فوراً کہا۔

"اندھے ہو گیا۔ دیکھتے نہیں یہ گدھا نہیں کتا ہے کتا۔"

یہ سن کر دوسرے پڑوسی نے کہا۔

"معاف کیجئے میں آپ سے مخاطب نہیں ہوں تو کتے سے پوچھ رہا ہوں۔"

کتے کے ساتھ سے کئی جائز و ناجائز فائدے بھی حاصل ہوتے رہتے ہیں مثلاً سدھایا ہوا کتا گلے کے چوڑے پٹوں میں خفیہ طور پر لگائے ہوئے ٹیپ ریکارڈ لیے دشمنوں کے جنگی مورچوں میں گشت لگا سکتا ہے۔ منشیات اور ہیرے جواہرات کی اسمگلنگ اور پیام رسانی کے کام بھی انجام دے سکتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کے گلوں کی حفاظت چوکیداری اور ان پر قابو رکھنے کا کام کر سکتا ہے، برفانی علاقوں کے تندرست و توانا کتے پچاسوں کی تعداد میں، اسکیمو قبیلوں کی برف گاڑیاں کھینچ کر انسانوں اور مال و اسباب کی باربرداری کر سکتے ہیں۔ وقت پڑنے پر کتا اپنے ساتھی انسان کی جان بچانے کا کام چوروں اور قاتلوں کی تلاش اور چوکیداری کے فرائض بھی انجام دے سکتا ہے اور تو اور تربیت یافتہ کتے اندھے انسانوں کی آنکھوں کا نور بھی بن سکتے ہیں۔

کتے کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی گلی میں صرف کتا بنا رہتا ہے اور اپنی دُم اپنی ٹانگوں کے اندر ہی رکھتا ہے مگر اپنی گلی میں شیر بن جاتا ہے۔ ایک دوست جب اپنے دوست کے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوا تو ایک خوفناک کتا بھونکتا ہوا اس کی طرف لپکا، دوست نے گھبرا کر بنگلے والے دوست سے چیخ کر پوچھا جو سامنے ہی بنگلے کے ورانڈے میں اطمینان سے کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"بھئی یہ کاٹتا تو نہیں ۔۔۔؟"

بنگلے والے دوست نے بھی چیخ کر کہا۔

"میں نے یہ کتا نیا نیا خریدا ہے بے تکلف چلے آؤ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کاٹتا ہے یا نہیں۔"

تفریح کے میدان میں بھی کتا انسان کا بہترین ساتھی بنا رہتا ہے شکاری کتے اپنے مالک کے ساتھ شکار میں بہت مدد دیتے ہیں۔ سرکس میں سدھائے ہوئے کتے عجیب و غریب کمالات و کرتب کر کے دکھاتے ہیں آج کا انسان صرف گھوڑوں کی ہی ریس میں اپنی تفریح اور منفعت تلاش نہیں کرتا بلکہ کتوں کی ریس سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور فی زمانہ غیر ممالک میں کتوں کی ریس گھوڑ دوڑ سے بھی زیادہ مقبول دلچسپ اور نفع بخش بنتی جا رہی ہے۔

مختلف کتے اپنی اقسام اور اپنے اجسام کی وجہ سے مختلف قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ایک صاحب نے کتے فروخت کرنے والی ایک دکان میں پہنچ کر ایک کتے کی قیمت پوچھی تو جواب ملا "دو سو روپے" انھوں نے سمجھا کہ

کتّا قد و قامت میں بڑا ہے اس لیے یہ قیمت ہوگی انھوں نے ایک اور چھوٹے کتّے کی قیمت پوچھی تو جواب ملا ــــ "تین سو روپے ــــ" پھر انھوں نے ایک اور اس سے چھوٹے کتّے کی قیمت پوچھی تو جواب ملا "چار سو روپے" اس پر انھوں نے ایک بالکل ننھے پلّے کی قیمت دریافت کی تو کہا گیا ــــ "پانچسو روپے ــــ" اب تو وہ بہت سٹپٹائے اور دکاندار سے ہاتھ جوڑ کر اور گڑگڑا کر پوچھا ــــ

بھائی صاحب اگر میں کوئی کتّا نہ خریدوں تو مجھے کیا دینا پڑے گا؟"

"سُنتے ہیں لوگ عموماً پوسٹ مین پولیس والے اور فقیروں پر بے تحاشا بھونکتے ہیں مگر دھوبی اور حجام پر نہیں اس کی وجہ ان کی نقل کا کتّا پن ہو سکتا ہے یعنی پوسٹ مین پولیس والے اور فقیر تو غیر کتّے ہوں گے اور دھوبی اور حجام "گھریلو" محسوس ہوتے ہوں گے۔

یقیناً بعض انسانوں کی طرح کتّے بھی جاہل اور بے پڑھے لکھے ہوتے ہیں جبھی تو ہمارے ایک دوست پر وقت بے وقت بھونکتے ہی رہتے ہیں باوجود یہ کہ ان کے گلے میں "دافع کتا" کا تحریری عمل بالکل اسی طرح پڑا رہتا ہے جس طرح کہ پالتو کتوں کے گلے میں پٹہ پڑا رہتا ہے تاہم ابھی یہ امر تحقیق طلب ہے کہ کیا سب ہی کتّے جاہل اور اَن پڑھ ہوتے ہیں جب ہمارے دوست نے عامل صاحب سے تعویذ کے بے اثر ہونے کی شکایت کی تو عامل صاحب نے فرمایا ــــ "ہم نے جو تعویذ دیا ہے وہ عربی میں ہے آج کل کے کتّے انگریزی داں معلوم ہوتے ہیں اب انگلش میں لکھ کر دوں گا انشاء اللہ مجرب ثابت ہوگا ــــ"

بعض کتّے لالچی اور چھچھورے بھی ہوتے ہیں ــــ ایک عمر رسیدہ حجام کی دکان میں ایک کتّا حجامت بنوانے والے ہر گاہک کے منہ کو تکتا ہی رہتا تھا ایک گاہک کے اس کی وجہ پوچھنے پر معمر حجام صاحب نے نہایت لاپرواہی سے فرمایا:ــ

"ــــ اب کیا بتاؤں صاحب یہ کمینہ کتّا بہت ہی چھچھورا بن گیا ہے غفلت سے اگر میری قینچی سے گاہک کے ناک کان کٹ کے نیچے گر جاتے ہیں تو یہ لپک کر کھا جاتا ہے میں تو تنگ آگیا ہوں ــــ"

یقیناً کتّا انسان کا ایک وفادار ساتھی ہے جبھی تو اسے ہم بچپن سے گراموفون ریکارڈوں پر اپنے مالک کی آواز بغور سُنتا دیکھتے چلے آئے ہیں اور کتّے نے بھی ریکارڈ پر جم کے بیٹھے رہنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا ہے کیا مجال جو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ریکارڈ پر سے اُٹھ کے کہیں گیا ہو' ایک دن ہم سے اپنے ایک انسان ساتھی نے ریکارڈ پر بیٹھے ہوئے کتّے کی جنس پوچھی کہ وہ نر ہے یا مادہ؟ تو ہم پریشان ہوگئے اور یہ کہہ کر معذرت کرلی۔ "معاف کرنا بھائی بڑا سخت سوال ہے نہ ہم کتّے سے یہ بات پوچھ کر اس کی خطرناک محویت میں رخنہ اندازی کرسکتے ہیں نہ اسے پتھر مار کے اور بھگا کے اس کی جنس بوجھ سکتے ہیں؟"

یہ جواب سُن کر ہمارا ساتھی انسان ہماری سادہ لوحی پر ہنسنے کے انداز میں بھونک پڑا اس نے کہا۔

"لو آج ہم سے جان لو اور سُن لو کہ ریکارڈ پر بیٹھا ہوا کتّا نر ہے اسی لیے ریکارڈ پر لکھا ہے "ہز ماسٹرس وائس" ورنہ لکھا ہوتا "ہر ماسٹرس وائس ــــ"

انسانی سائنس اور ٹکنالوجی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ وہ چاند پر بھی پہنچ گیا ہے انسان کا قریبی ساتھی ہونے کے ناطے چاند پر کتّا بھی بھیجا گیا تھا۔ مگر کتّوں کی سائنس بھی بعض باتوں میں انسان کے لیے چیلنج کا درجہ

رکھتا ہے انسان نے ہر بات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے بیشتر مواقع پر وہ کامیاب بھی رہا ہے مگر اب بھی جہاں چند باتوں پر اُسے قابو پانا ہے اُن میں سے ایک کُتّے کی دُم کو سیدھا کرنے کا مسئلہ بھی ہے یہ کمبخت کتا قوم نہ جانے لمبی دُم بنانے میں کونسے کیمیکلس استعمال کرتی ہے کہ اگر سو برس بھی اس کی دُم کو دبائے رکھا جائے تو وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے انسان کتے کی دُم سیدھا کرنے میں آج تک ناکام ہے اور زبان کو اِس سلسلے میں ایک محاورہ بھی حاصل ہوگیا ہے کہ "کتے کی دُم ٹیڑھی کی ٹیڑھی"؟

نامور مزاح نگار
پرویز یداللہ مہدی
کے
مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
ٹائیں ٹائیں فش
قیمت: ۱۵ روپے

دُلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کیلئے من پسند دوپٹہ!
دُلہن سب سے زیادہ جس کپڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کپڑا دوپٹہ صرف اور صرف
اے۔ ایچ۔ زری والا
کا ہوگا۔
اس کے علاوہ
ہمارے شوروم کا کپڑا اسٹاک ○ بنارسی سلک ساڑیاں ○ تنچوی ○ ساٹن ○ جارجٹ ○ آرگنزا ○ ٹشو ○ شفان ○ پٹولہ ○ بروکیڈ ○ دھرماورم ○ کانجی ورم ○ پوچم پلی ○ نارائن پیٹ ○ میسور کریپ
ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل۔
خصوصی کا دنٹر میاچنگ کے لیے بلوز، دوپٹہ، کرتے اور فالس۔
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔
اے۔ ایچ۔ زری والا
لاڈ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
کیبل "زری والا"
فون: 525232

ایم یوسف انصاری (مالیگاؤں)

کھٹمل نامہ

"کھٹمل جو مر گیا ہے تو کمبل اُداس ہے"

چارپائی پر کھولتے پانی کی یلغار کے بعد ہماری عقلِ ناقص نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہم نے کھٹملوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ اور عارضی طور سے ہی ہم نے اس نامعقول مخلوق سے چھٹکارا پا لیا ہے۔ مگر سردی ذرا کڑاکے کی پڑنے لگی تو ہم نے بوریا بستر گول کیا اور کمرے میں دراز ہوئے تو عقدہ کھُلا کہ سوئے مقتل ہم چلے ہیں۔ کمرے میں تو پوری کی پوری بٹالین چھپی تھی۔ اور یہ کہ چارپائی کے کھٹمل ایک بٹالین کے عشرِ عشیر بھی نہ تھے۔ گنتی کے چند کھٹملوں کو مار کر ہم بڑے تیس مار خاں نہیں بلکہ تیس دو نے ساٹھ مار خاں بنے پھرتے تھے۔ اب ہمیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا کھٹملوں نے ہر چہار طرف سے ہمارے بستر کو ہدف بنایا۔ حتیٰ کہ چھاتہ بردار فوج کی طرح چھتوں سے بھی حملہ کیا تو ہم پریشان ہو گئے اور ہمیں گوشۂ عافیت تک نہ ملا۔ کمبختوں نے اپنے مقتول بھائیوں کا بدلہ کچھ اس طرح سے لیا کہ ہم بھول گئے کہ

خواب خرگوش کس کو کہتے ہیں ؎ نیند کیا؟ نیند کا مزہ کیا ہے؟

ہمارا جسم ان کی نشتر زنی سے اس قدر تار تار ہو چکا ہے کہ ٹانکے لگانا بھی ممکن نہیں۔ خوابِ راحت ایک خواب سا لگتا ہے۔ بقول اکبرؔ ؎

خوابِ راحت ہے کہاں نیند بھی آتی نہیں اب ؎ بس اچٹ جانے کو آتی جو کبھی آتی بھی

اختر شماری کا تذکرہ ہم اکثر سنا کرتے تھے، کبھی اتفاق تو نہیں ہوا۔ ہاں فلموں میں ضرور دیکھا ہے۔ ایک ہیرو نے تو اختر شماری کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ رات بھر شمار کرتے رہے یہاں تک کہ ستارے اپنی روشنی لٹا لٹا کر سو گئے۔ اچھے ہیرو مجبور ہو گئے۔ مگر پھر بھی معشوق کو آنا تھا نہ آیا۔ ہیرو کو گانا گا کر صبر کرنا پڑا۔ محبوب کی جدائی یا بے وفائی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے فلم دیکھ کر ہمیں احساس ہوا تھا اور ہم نے دل ہی دل میں یہ دعا مانگ لی تھی کہ اے خدا ہمیں نہ صرف ایسی بلکہ ہر قسم کی اختر شماری سے باز رکھنا۔ دعا تو قبول ہوئی مگر ہم، بچہ شماری، مردم شماری، ووٹ شماری اور خانہ شماری میں دھر لئے گئے کہ ہم ٹھہرے ماسٹر۔ مگر یہاں معاملہ اختر شماری کا نہ تھا بلکہ کھٹمل شماری کا تھا۔ آہ! کس قدر اذیت ناک تھا یہ فعل کہ قلم اظہار کرنے

سے قاصر ہے ۔ جبکہ ہماری اہلیہ بھی اس کھٹمل شماری میں شریک تھیں ۔ کہاں دیکھا وتنہا اختر شماری اور کہاں میاں بیوی کی مشترکہ کھٹمل شماری ۔ مگر پلڑا اسی نامعقول مخلوق کی طرف جھکتا تھا ۔ گندے خون کی اس بیر بہوٹی کو پکڑ کر ایڑی سے رگڑتے رگڑتے ہم عاجز آ گئے تھے ۔ بڑی کراہیت محسوس ہوتی تھی ۔

ایک دن اہلیہ نے فرمایا "کھٹملوں کو مارنا نہیں چاہیئے "

"لیکن وہ تو بیحد شریر ہیں ۔ مارنا نہیں تو کیا پالنا چاہیئے ؟"

فرمانے لگیں " فرش اور دیواریں گندی ہوتی ہیں ۔ تو ہمیں بار بار چونا پھیرنا پڑتا ہے " ہم نے اس معقول وجہ کو تسلیم کر لیا ۔ واقعی یہ حقیقت تھی کہ دیواروں پر جابجا کھٹملوں کو مارنے سے ہلکے گہرے سرخ رنگوں کی آڑی ترچھی لکیریں بن گئی تھیں اور کچھ دن بعد دیوار کے نقش و نگار ایسا آرٹ پیش کرتے تھے جو کسی ترکیب و تناسب سے بے نیاز تھا ۔ ایسے ہی تجریدی آرٹ کا نمونہ ایک دوست کے گھر ہم دیکھ چکے تھے ۔ مگر وہ آرٹ کسی کہنہ مشق آرٹسٹ کا نمونہ تھا ۔ از راہِ مذاق ہم نے پوچھ لیا کہ دیوار کا اوریجنل رنگ کیسا تھا ؟ ہنس کر کہنے لگے کہ ۔ ع

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

کھٹملوں کی اتنی پیداوار ہے (صد حیف ! گورنمنٹ ان کے تدارک کے لیے کوئی پلاننگ نہیں کرتی) کہ دیوار سے چن کر فرش پر مارنے کی مہلت تک نہیں ملتی ۔ اس لیے جہاں ملیں (on the spot) وہیں رگڑ دیا کے اصول پر عمل کرنے سے تجریدی آرٹ کا عمل تخلیق ہوا ۔ بیوی کے ٹوکنے پر ہم نے طے کر لیا کہ اپنے شبستان کو اس قسم کے عمل سے آرٹ گیلری بنانا نہیں چاہیئے ۔ اب ہم کھٹمل پکڑ تو لیتے ہیں مگر مارتے نہیں اور یوں چھوڑ دیتے ہیں جیسے سکندر نے پورس آزاد کر دیا تھا ۔ ایک دو ہوں تو کمبختوں کو مارا جائے ۔ مگر ایک ایک کو چن کر قتل کرنا ہمیں تو اختر شماری سے بھی اذیت ناک عمل معلوم ہوتا ہے ۔

پھر ہماری اہلیہ نے ایک نیا انکشاف فرمایا ۔

"کھٹملوں کو مارنا نہیں چاہیئے کیونکہ گندے خون کی بو سے انڈے بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں ۔ جہاں ایک پیدا ہونا چاہیئے آج ہی اپنے خول سے اُبل پڑتے ہیں اور ہم پر پل پڑتے ہیں "

اس منطق پر ہم نے زبردست احتجاج کیا ۔ ہم اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے اور پھر ہم گریجویٹ ایک تجربہ کار مدرس ، جہاں دیدہ و گرگ باراں دیدہ ، طوفاں دیدہ اور ہماری اہلیہ مڈل پاس ۔ ان کے پاس ہونے میں بھی ہمیں شبہ ہے ۔ کوئی سند ہوتی تو بوقتِ ضرورت کام آتی ۔ ہم نے آج تک یہ منطق کہیں پڑھی نہ سنی ، ہم کو کتاب سے کیڑے ہماری معلومات کو وہ چیلنج کر رہی تھیں ، بھلا کس طرح ہم اپنی ہار تسلیم کر لیتے ، ویسے ہر معاملے میں سرِ تسلیم خم تو کرنا ہی پڑتا ہے ۔ مگر ایسی بے سروپا بات پر اپنے ڈگری یافتہ سر کو جھکانا نہ صرف ہماری بلکہ ہر گریجویٹ کی توہین تھی ۔

فرمانے لگیں (بہر ضرورت کا فرمانا بلکہ بار بار فرمانا پیدائشی حق ہے جو مرتے دم تک برقرار رہتا ہے) ہاتھ سے مارنا نہیں چاہیئے بلکہ مٹی کے تیل میں ڈال دینا چاہیئے اور اگر مٹی کا تیل کمیاب ہو تو پانی میں ڈبو دینا چاہیئے ۔

مٹی کے تیل کا تذکرہ چھڑ گیا تو برسبیلِ تذکرہ چند جملے لکھتے چلیں کہ فی زمانہ مٹی کا تیل حاصل کرنا

جوئے شیر لانے سے بھی مشکل امر ہے۔ جوئے شیر نکالنے کا عمل صادق تھا اور نتیجہ یقینی مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نظر آتا ہے۔ گھنٹوں لائن میں کھڑے رہنے کے بعد بھی تیل ملنا غیر یقینی ہے بلکہ ہمارا تیل نکل جاتا ہے۔ اس کی دستیابی کے لیے کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اس کا بیان قدرے مفصل ہے بخوف طوالت ہم اس تذکرے کو یہیں پر قطع کرکے پانی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ کھٹملوں کو پانی میں ڈبو دینے کے حق میں ہم نے اپنا قیمتی ووٹ صرف اس لیے ڈلوا دیا کہ مارنے اور رگڑنے سے بہتر عمل ڈبو دینا تھا۔ مگر اس میں بھی ایک دشواری تھی۔ اس نامعقول مخلوق کی اتنی اقسام ہیں کہ گنانی مشکل۔ تاہم چند ایک کا شمار کرتے چلیں کہ ہمارا مضمون نویسی کا سلسلہ بھی چلتا رہے۔

ایک تو وہ جس کی مثال کسی فاقہ مست فقیر سے دی جا سکتی ہے۔ اسی قسم کے خشک اور باریک کھٹملوں کو اول تو گرفت میں لینا مشکل، دیگر یہ کہ گرفت میں آنے کے باوجود پانی میں ڈالنا دشوار۔ چٹکی میں پکڑ کر پانی میں ڈال دیا اور خوش ہو گئے کہ کم بخت کو دریا برد کر دیا مگر ہائے افسوس! ایسے خشک کھٹمل اتنی آسانی سے دریا برد نہیں ہوتے۔ بلکہ انگلی سے اس طرح چپک جاتے ہیں جیسے مقناطیس سے ذرات۔ ہم ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے ہیں اور وہ بدخو کاواک کر پنج شاخے کے کسی گوشے میں اس طرح پناہ لیتے ہیں جیسے گوریلا جنگ کا سپاہی کوہ سلاسل میں۔ اب دوسرا مرحلہ یہ کہ گمشدہ کھٹمل کو ناخن کے چھجوں اور انگلیوں کی وادیوں میں تلاش کر کے دوبارہ دریا برد کیا جائے۔ اس طرح ایک ایک کھٹمل کو کیفر دار کو پہنچانے تک تو کئی کھٹمل راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا ایک نے ہم سے آنکھ مچولی کھیل کر اپنے بھائیوں کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ اسے کہتے ہیں قومی یک جہتی — خود تو ڈوبے مگر دوسرے افراد کو بچا لیا۔ ایسا ہم ہیں، خیر جانے دیجئے . . . مگر ہم بھی اس خشک ذات کھٹمل سے اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔

دوسری قسم اس گندم نما کھٹمل کی ہے جو اتنا خون چوس لیتا ہے کہ چلنا دشوار۔ اس قبیل کا کھٹمل آسانی سے گرفت میں آ جاتا ہے اور دریا برد کرنے سے پیشتر ہی چٹکی کے دباؤ سے راہی ملک عدم ہو جاتا ہے کہ ہم نے کسی گندم نما کھٹمل کا خون کر دیا۔ ہر چند کہ ہماری انگلیاں لہولہان ہوئیں، لیکن اس حکایت خوں چکاں کو لکھنے سے ہم باز نہ رہے۔ وائے افسوس!! کہ جس کراہیت سے ہم بچنا چاہتے تھے، جسے ہم پیروں سے مسلنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، ہماری انگلیوں میں دم توڑ کر پھر مات دے دی۔ ایسی حالت میں ہمارے غصے کا پارہ یک لخت چڑھ جاتا ہے اور اس دیوانگی میں گریباں کے پرزے اڑانا فقط باقی رہ جاتا ہے۔

تیسری قسم جوں نما کھٹملوں کی ہے۔ مگر ہم ان کو قطعی بھاؤ نہیں دیتے۔ مگر کھٹمل کا بچہ آخر کھٹمل ہوتا ہے۔ انسانوں کا خون چوسنا تو اس کا پیدائشی حق ہے۔ وہ اپنے حق سے محروم کیوں رہے؟ جبکہ اس کا رزق بھی اسی عمل سے وابستہ ہے۔ خون نہ چوسے تو کیا بھوکا رہے؟ ایسے باریک کھٹملوں کو (بشرطیکہ ننگی آنکھ سے نظر آئیں) تو بستر پہ ہی رگڑ دینا ہمیں گوارا کیونکہ یہ اتنے مہین ہوتے ہیں کہ ان کے جسم میں خون کی رمق بھی نہیں ہوتی۔ کراہیت کی اصل وجہ تو وہی گندہ خون ہے جو پیٹ پھٹنے کے بعد بعض اوقات فوارے کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

آپ ہمیں کنجوسی کا طعنہ ہرگز نہ دیں۔ ہم نے ہر قسم کی دوا استعمال کرنے کے بعد ہی یہ بال دھوپ میں سفید کیا تھا۔ وہ تمام دوائیں ادھ سے کند ثابت ہوئے جو ہم نے یکے بعد دیگرے آزمائے تھے۔

کھیتوں میں چھڑکنے والے جراثیم کش دوا کا چھڑکاؤ کیا۔ مگر یہ بدذات اس طرح ہضم کر گئے گویا اس میں 1121 FCPS ملا ہوا تھا۔ آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اتنی زہریلی دوا کارگر کیوں نہیں ہوئی؟ آیا کھٹمل زہر پروف تھے یا دوا میں ملاوٹ تھی؟

مشہورِ عالم دوا بگ مار کا بڑا چرچا تھا۔ سب سے پہلے اسی کو آزمایا۔ اخباروں میں پڑھا تھا، بار بار پڑھنے میں آتا تھا کہ فلاں ابن فلاں نے بگ مار پی کر خودکشی کر لی۔ بڑی زہریلی دوا ہوتی ہے کہ انسان کسی اور زہر پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اسی کو ترجیح دیتا ہے۔ دکاندار بھی اس دوا کی سفارش یوں کرتا ہے کہ صاحب! خودکشی کرنا ہو تو بگ مار پیجیئے۔ زندگی سے بیزار ہوں یا روزی روزگار سے بیکار۔ فریب خوردہ ہوں، احباب گزیدہ کہ زن گزیدہ سب یہی دوا استعمال کرتے ہیں، کارگر نہ ہو تو دام واپس۔ جب اتنی گیارنٹی دکاندار دیتا ہے تو کون احمق ہے جو دوسری دوا خرید کر ناکامی کا منہ دیکھے اور شرمسار بھی ہو۔ اسی طرح حضرتِ انسان نے کسی اور کے متاع پر اپنا حق جتایا، جیسا کہ اس کی فطرت ہے۔ دوا تو تھی ایک کم تر مخلوق کے لیے لیکن ہم اشرف ذات نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔

ہاں تو جب دوا فروش کی زبانی اس کی تعریف سُنی تو پھولے نہیں سمائے۔ کہ یہ فتنہ خو مخلوق اب بچ کر کہاں جائے گی؟ دوا فروش یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم خودکشی کے لیے دوا خرید رہے ہیں مگر ہم نے اسے دھوکے ہی میں رکھا، مبادا وہ کھٹمل مار دوا دے دے۔ ہم تو اس انسان کش دوا سے اس فتنہ خو کھٹمل کو مارنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسا ہی غصہ ہم پر سوار تھا۔ در و دیوار پر دوا کا SPRAY کر دیا حتیٰ کہ ایک انچ جگہ تک باقی نہ رہی۔ بازو شل ہو گئے۔ مگر پرواہ تک نہ کی کہ پُرسکون نیند کے لیے انسان کو کیا کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ مگر نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات۔ یعنی ہم اپنی شکست کا تماشہ دیکھتے رہے۔

ہم مایوس ہو چکے تھے کہ گھور اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی وہ اس طرح کہ مہنگائی کے سبب ہر چیز کے دام بڑھنے لگے تو جن سیوا کھٹمل مار پاؤڈر کے موجد ہمارے بھائی صاحب کے پاس آئے کیوں کہ وہ آرٹسٹ ہیں۔ وہ اپنی دوا کا نیا اشتہار نیا ڈزائن بنوانا چاہتے تھے مگر اصل مقصد تو قیمت بڑھانا تھا۔ شراب تو پُرانی تھی، نئی بوتل نیا لیبل درکار تھا۔ اشتہار کچھ اس قسم کا تھا۔ "یہ سفوف کھٹملوں کا جانی دشمن ہے۔ نیز ۱۵ فٹ اونچائی کے کھٹمل اسے سونگھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور یہ بے ہوشی ان کی موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ ایک پُڑیا کافی ہے"۔ اس سفوف کی ایک پُڑیا ہم نے فوراً خرید لی۔ مگر ریزگاری کی قلت کے سبب دکاندار نے تین پُڑیاں تھما دیں۔ اور ہم نے بھی بخوشی قبول کر لیں۔ ہدایت کے مطابق بستر کے اطراف اپنا دام بچھا دیا۔ احتیاطاً ہم نے دو تین تہیں جما دیں کہ ہمارے پاس زائد پُڑیاں تھیں۔ بلکہ حفظِ ما تقدم دیواروں اور چھت پر بھی سفوف کی پچکاری مار دی جبکہ اشتہار میں صاف درج تھا کہ ۱۵ فٹ اُونچائی کے کھٹمل خود بخود مر جاتے ہیں۔ اِسے کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج، ایک تیر سے دو شکار، کھٹمل بھی مرے خون بھی نہ بہے۔ اس پاؤڈر کی یہی ایک صفت ہمیں پسند آئی تھی جس کی وجہ سے ہم ایک مکروہ عمل سے بچ جاتے۔ بقیہ کام ہماری بیگم کر لیتیں، یعنی صبح اُٹھ کر مُردہ کھٹملوں سمیت پاؤڈر پر جھاڑو پھیر دیتیں۔ مگر ہیہات! ہماری امیدوں پر جھاڑو پھر گئی جب ہم نے دیکھا کہ اتنی سخت حد بندی کے باوجود ہم پر یلغار ہوئی تو اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔ رات بھر کھٹمل شماری اور پکڑ دھکڑ میں گزری۔ انھیں کی محفل سجی

اگرچہ کہ چراغ ہمارے تھے، مگر رات ان کی تھی۔ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے اشتہار کے اس ٹکڑے کو تلاش کیا جسے ردّی سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ دوبارہ پڑھا، مبادا استعمال میں کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو۔ ایک گوشے میں درج تھا "نقلی مال سے ہوشیار" ہم نے دوبارہ اپنا سر پیٹ لیا۔ (وقت تنگ تھا ورنہ ہم چچا غالب کے نوحہ گر کی طرح سر پیٹنے والے کو ساتھ رکھ لیتے۔) دوا نقلی ہوسکتی ہے مگر موجد تو نقلی نہیں ہوسکتا تھا جس کے ہاتھوں ہم نے پڑیاں خریدی تھیں۔ مگر واہ ری قسمت! ہائے رے ناکامی!!

چند دنوں بعد ایک نیا اشتہار دیکھا "ماسٹر کھٹمل مار پاؤڈر" مگر ہم نے کان پکڑ لیے کہ اب ہرگز دھوکا نہ کھائیں گے۔ ماسٹر کھٹمل مار پاؤڈر ہو خواہ ہیڈ ماسٹر کھٹمل مار پاؤڈر، اب ہمارا ایمان ہر قسم کی دوا سے اُٹھ گیا ہے۔ اور یہ کہ ہم اشرف المخلوق جن کے قدم کو چاند اور مریخ کی زمینیں بوسہ دیتی ہیں، اس جنس بے مول کو فنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اس رقیبِ سرخ رو و فتنہ خو نے ہم پر وہ وہ ستم ڈھائے کہ بیان سے باہر۔ ہمارا جسم سنگ و خشت تو ہے نہیں کہ وہ ستائے جائیں اور ہم اف تک نہ کریں۔ حادثاتِ زمانہ سے اک تو یونہی ہمارا دل فگار ہے۔ جب ہم نے محسوس کیا کہ یہ بدخو ہماری خانہ ویرانی پر تلے ہیں تو ہم نے بیگم سے کہا کہ آؤ ہم ان سے سمجھوتہ کرلیں۔ یہ ہر گھر کے ازلی افراد ہیں انھیں اپنا ہی سمجھئے۔ ظاہر ہے کہ گھر کی رونق گھر میں رہنے والے افراد سے ہوتی ہے،

"ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد"
کھٹمل جو مر گیا ہے تو کمبل اداس ہے

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف اور ہزاروں کی دل پسند چائے
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب!!

Nilgiri's
LASA
SUPER BLEND
TEA

لاسا اسپیشل چائے!
لسا اسپیشل چاکلیٹ چائے
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس:
نیلگری ٹی امپوریم معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد (اے پی) انڈیا

روحِ غالب سے ○ معذرت کے ساتھ

اپنی غزل کی آپ کتابت کرے کوئی
ایسا ہے اپنی آپ حجامت کرے کوئی

دنیا سے بھاگنے کی ضرورت جو پیش آئے
گانجہ، چرس افیم کی عادت کرے کوئی

خشکی پہ پھیر پھاڑ مگر سے تو ٹھیک ہے
پانی میں رہ کے اُس سے عداوت کرے کوئی

باہر نہیں ہیں بیویوں کی دسترس سے شوہر
غاں چوں کرے کہ لاکھ بغاوت کرے کوئی

مُنہ میں دیئے لگام وہ رکھتی ہیں رات دن
دیتیں ہیں دال دلیہ دلالت کرے کوئی

جھُوٹے رسول مر چکے سب ہاتھ روم میں
ختمِ رُسلؐ کے بعد رسالت کرے کوئی!

تحلیل چربی ہوگئی اب بال و کھال کی
شادی کی ایک بار حماقت کرے کوئی

مدہوش ہیں وہ خوشبوئے دامانِ یار میں
ایسے میں چرمِ خام دباغت کرے کوئی

ہے ننگِ فن و ننگِ قلم، ننگِ دستانی
سیکھے بغیر جو بھی کتابت کرے کوئی

غالب جسے بھی شام و سحر اس جہان سے
منظور ہو فرار کتابت کرے کوئی

غزلیں

غالب حیدرآبادی

○

دو وقت کا ہے خرچ یہ دُنیا مرے آگے
دَم بھر میں پر نچے ہوا مُرغا مرے آگے

ہے فاتحہ نانا کی مٹھائی کی دُکاں پر
کس بات کا اس مد میں ہے صرفہ مرے آگے

اب اپنے پتا کے ہی پکڑ لیتا ہے وہ کان
دانا ہے بہت آج کا بچّا مرے آگے

برقع میں جو شے تھی ہوئی خود آپ سے باہر
اب جزوِ نمائش ہوا برقع مرے آگے

بنکوں میں ڈکیتی کا ہنر روز ہے افزوں
دن دھاڑے بھی ہو جاتا ہے سرقہ مرے آگے

گھیرے ہوئے اطراف تھے منہ چاٹنے والے
ہر گام پہ چمچوں کا تھا نرغا مرے آگے

بریانی کی ہے بھوک مجھے اور یہ دنیا
لا، لا کے رکھے جاتی ہے دوشا مرے آگے

مظہر الزماں خان (حیدرآباد)

"دیباچے / غلط دبوچے"

"چمن در چمن ویرانی" یہ باغ گورکھ پوری کا شعری مجموعہ ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحات (شاید اس سے بھی زیادہ صفحات پر مشتمل ہوگا) اس مجموعہ میں ۸۰ پر آدھی یعنی ساڑھے اسی نظمیں اور باقی غزلیں شامل ہیں۔ باغ کی شاعری اندر سے نکل کر باہر آتی ہے اور باہر آکر تمام کمروں، دالانوں، باورچی خانوں و غسل خانوں کا سفر کرتی ہوئی بیڈ روم میں پہنچ کر اپنے تنقید نگار کے پہلو میں سو جاتی ہے اور پھر صبح اُٹھ کر سفر کرنے لگتی ہے۔ ان کی شاعری میں سورج کی ڈکاریں، چاند کی چھیڑ چھاڑ اور ستاروں کی مدہوشی طاری ہے۔ باغ گورکھ پوری نے اپنے اس مجموعۂ کلام "چمن در چمن ویرانی" میں پھولوں کی خوشامد اور پتوں کی بے وفائی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چمن کے اندر گل اور بلبل دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں جس طرح سیاستداں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ اس سے ہٹ کر باغ گورکھ پوری نے درد کے کھلنے اور بند ہوتے ہوئے اظہار کو اپنی پوری قوت سے پیش کیا ہے اور غیر عورتوں کے لباس (اپنے گھر کے لباس کو چھوڑ کر) کو دھو دھو کر ہینگر پر لگا کر دھوپ میں رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور پھر خارجی راز کے پردے کو چاک چاک کر کے مسکرانے کی ناکام اور کامیاب کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک ناقابلِ یقین حد تک ناپسند کیا جائے گا ــــ پروفیسر سی۔ آر۔ نگری۔

ــــ رضوی اُن نقادوں میں سے ایک ہیں جن کی تنقید کے شفاف پردے میں کہیں کوئی روزن نظر نہیں آتا البتہ اُن کے قلم سے روشنائی بکھرتی رہتی ہے جسے وہ اپنے دامن میں جذب کر لیتے ہیں (ہر سمجھدار نقاد ایسا ہی کرتا ہے) رضوی نے اپنے مقالہ میں بعض مقامات پر طنز کے بڑے گہرے داغ ڈالے ہیں مگر ان کے طنزیہ داغوں پر بہت کم لوگوں کی نظر پہنچ سکتی ہے کیونکہ وہ اس قدر چالاکی سے داغ لگاتے ہیں کہ وہ لباس پر ایک پھول کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ رضوی کی تنقید بے شمار لبوں اور زبانوں کا ایک جاگتا ہوا سفر ہے ایک ایسا سفر جس میں کوئی راستہ نہیں ہے صرف پاؤں ہی پاؤں ہیں اور وہ پاؤں چلے ہوئے راستوں کے عادی نہیں ہیں اس لیے انھوں نے اپنی تنقید میں راستے نہیں رکھے بس پاؤں پہ پاؤں رکھے ہیں بہرحال رضوی کی یہ کتاب تنقیدی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

ایک ایسا اضافہ جس کے بعد اضافے کی مزید کوئی اُمید باقی نہیں رہتی ۔ ڈاکٹر پروفیسر ۔ ط ۔ ظ ۔

—— "مسکراہٹ کا غم" یہ دور حاضر میں شبنم بیگم کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے ۔ اس سے پہلے اُن کی تین کتابیں نکل چکی ہیں ۔ پہلی تخلیق اُن کی شادی کے ٹھیک ڈیڑھ سال بعد عالم وجود میں آئی ۔ جس کا نام انھوں نے "ماہ رُخ" رکھا اور اب وہ کتاب ۱۴ سال پُرانی ہونے کے باوجود نئی اور تروتازہ ہے دوسری کتاب پہلی کتاب کے ٹھیک پانچ سال بعد وجود میں آئی اس کا نام یا عنوان انھوں نے "روشن آراء" رکھا یعنی یہ کتاب پہلی تخلیق سے پورے پانچ سال چھوٹی ہے ۔ تیسری کتاب سات سال کے بعد ریلیز ہوئی ۔ اس کا نام "ماہ جبین" ہے ۔ یہ ایک مکمل ناول ہے اور اب جو تازہ کتاب کچھ دن پہلے وجود میں آئی ہے اس کا نام انھوں نے "اظہار" رکھا ہے یعنی تین کتابیں مونث اور ایک مذکر ہے کیونکہ بقول اُن کے اُنہوں نے اپنوں کا یہی سلسلہ ہے کہ اُن کے خاندان میں جتنے ادیب گزرے ہیں اُن کی یہی ترتیب ہے بہرحال "مسکراہٹ کا غم" شبنم بیگم کی رومانی پسند طبیعت کا چوتھا زندہ ثبوت ہے ۔ اُن کے کلام میں پیٹ پر گھومتی ہوئی اُنگلیوں کی گُدگُداہٹ اور چہرے پر پھیلی ہوئی معنی خیز مسکراہٹ شامل ہے چار کتابوں کی اشاعت کے باوجود اُن کے تخلیقی سوتے اب بھی خشک نہیں ہوئے ۔ اور اُن میں تخلیقی صلاحیت اُسی طرح موجود ہے جو پہلی کتاب کے وقت موجود تھی ۔ اور یہی اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے بہرحال اُن کی یہ چوتھی کتاب ہر طرح کے قاری پڑھ سکتے ہیں ۔ —— پروفیسر آئی ۔ این ۔ فرید ۔

(نوٹ) میری کتاب پر آپ کی رائے حقیقت پر مبنی ہے اور اس کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں ۔ تاہم آپ نے میری چار کتابوں کا حوالہ دیا ہے جبکہ یہ میری آٹھویں کتاب ہے آئندہ دیباچے میں اس کا ذکر ضرور کیجیے گا ممنون رہوں گی —— فقط شبنم بیگم ۔

—— مکرم تسلیم ! میرا افسانوی مجموعہ ہے لیکن آپ نے شعری مجموعہ سمجھ کر رائے لکھ دی ہے ۔ اور پھر میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ دیباچہ لکھیں لیکن آپ نے رائے لکھ دی ۔ شاید مصروفیت کی وجہ سے بہرحال میں آپ کی بیش قیمت رائے کتاب میں شامل کر رہا ہوں ۔ فقط ۔ باغ گورکھپوری ۔

—— مائی ڈیر ۔ ط

بھائی میں نقاد کب سے ہوگیا ۔ میں تو ایک مزاح نگار ہوں اور میں نے اپنے مزاحیہ مضامین کے لیے آپ سے دیباچہ لکھنے کی گزارش کی تھی لیکن آپ نے رائے دی اور وہ بھی تنقیدی مضامین پر خیر یہ رائے بھی چل سکتی ہے کہ میرے مضامین میں تنقید زیادہ مزاح کم ہے ۔ آپ کی دور اندیش نگاہ نے پہچان لیا ورنہ مزاحیہ ادب میں کافی شہرت رکھتا ہوں ، اور اب آپ کی بیش قیمت رائے ملنے پر بحیثیت نقاد بھی کافی شہرت حاصل کرلوں گا بلکہ لُوٹ لوں گا کہ میں صابن کے جھاگ میں زندگی کے خوابوں کو ایک ماہر سیاست دان کی طرح تلاش کرتا ہوں ۔ فقط ۔ بیضوی ۔ ▭▭

شگوفہ کا منفرد ڈرامہ نمبر

قیمت : تیس روپے ۳۰

محمد رفیع الدین انصاری
(بھیونڈی)

محمد علی جوہر —— ایک طالبِ علم کی نظر میں ؟؟

مندرجہ ذیل سوالوں کی مدد سے محمد علی جوہر پر مضمون لکھیئے:

سَوالات: ۱۔ محمد علی جوہر کون تھے؟ ۲۔ اُن کے برادرِ بزرگ کا کیا نام تھا؟ ۳۔ تحریکِ خلافت کیا تھی؟
۴۔ 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟

الجواب: **مُحمّد علی جَوھر**

ہماری دُنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے۔ اُن بڑے لوگوں کے کام بھی بہت بڑے بڑے تھے۔ یہاں جتنے بھی بڑے بڑے کام ہوئے وہ سب بڑے لوگوں نے کیئے۔ چھوٹے لوگوں کو کبھی بڑے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آج بھی بڑے لوگوں کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے۔ اَب تو ہر دوسرے تیسرے گھر بڑا آدمی پیدا ہوتا ہے۔ بعض بہت کم عمری میں ہی بڑے ہو جاتے ہیں اور اچھے اچھے اُن کے سامنے بونے دکھائی دیتے ہیں۔

انھیں بڑے لوگوں میں محمد علی بھی ہیں۔ خدا کا یہ لاکھ احسان ہے کہ وہ ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ کئی بار اُن پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ متعدد بار وہ حادثات کا شکار ہوئے۔ مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

یوں تو یہ کرۂ ارض ہی اُن کا وطن ہے۔ مگر وہ خاص امریکہ کے رہنے والے ہیں۔ امریکہ کے بارے میں میں اِس چھوٹے سے مضمون میں کچھ نہیں بتا سکتا ورنہ اس ملک کے بارے میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ المختصر اسی جادوئی ملک کے طلسماتی انسان محمد علی ہیں۔ وہ بہت بڑے اور مشہور باکسر ہیں۔

دنیا کے سامنے انھوں نے کئی بار اپنی باکسنگ کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسی لیے اُن کو محمد علی جوہر کہتے ہیں۔ محمد علی کے والدین ابھی زندہ ہیں۔ بہت سے رشتہ دار بھی ہیں اور کئی بھائی بھی۔ یہ سب اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اُن کا نام یاد رکھنا ممکن نہیں۔ ہم بچوں کو بہت کچھ یاد رکھنا پڑتا ہے۔ محمد علی کا نام یاد ہے یہی بہت ہے۔ باقی لوگوں سے ہمیں کیا لینا دینا۔ ویسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے برادرِ بزرگ کا نام جوزف، مائیکل یا رچرڈ سے ملتا جلتا ہوگا۔

آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے۔ جس قدر مقبول ہوتا ہے۔ اتنے ہی اس کے حاسد بھی ہوتے ہیں۔ محمد علی کی شہرت کی طرح

اُن کے حاسد بھی دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی جگہ ایسا نہیں جہاں اس غیر معمولی اور نابغۂ روزگار کے دشمن نہ ہوں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کے لیے ایک تحریک کی بنیاد ڈالی ہے۔ جسے تحریکِ خلافت کہتے ہیں۔ (دشمنوں کی مخالفت میں جو تحریک چلائی جاتی ہے وہ خلافت تحریک کہلاتی ہے)

محمد علی کے بہت سے ساتھی اور شیدائی اس تحریک میں اُن کے ساتھ ہیں۔ اور اُن کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دشمنوں اور حاسدوں کے خلاف اس طرح کی تحریک ضروری ہے۔ تاکہ سچے کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا ہوتا رہے۔

آخر میں مجھے اُن کے ہمدرد اور کامریڈ ہونے پر اظہارِ رائے کرنا ہے۔ اس بے مروّت دنیا میں محمد علی جیسا ہمدرد آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ ایک دو کا کیا ذکر اُن کی ہمدردی کے بے شمار واقعات ہیں۔

وہ جب بھی کسی کو خط لکھتے ہیں اُسے کامریڈ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ وہ سب کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کی بہت بڑی خوبی ہے۔ بھلا جس شخص میں اِتنی ساری اچھائیاں ہوں، اس کے دشمن اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آخر میں ایک شعر پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں ؎

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

□ □

شگوفہ کا بے مثال

ہندوستانی مزاح نمبر

مہمان مدیر ——— یوسف ناظم

ہندوستان کی تمام مسلّمہ زبانوں کے مزاح کا جائزہ

نمونوں (تراجم) کے ساتھ

قیمت: ۵۰ روپے

جہانگیر انس [سیوان]

ایک انٹرویو

اَدبی دنیا میں علامہ خر بھارتی کی ڈسکو رفتار بڑھتی ہوئی شہرت و مقبولیت سے متاثر ہو کر میری خواہش ہوئی کہ ان کا انٹرویو حاصل کروں تاکہ اَدب میں نام اور مقام حاصل کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکے۔ اپنی اس خواہش کے تحت میں ان کے خرخانہ الموسوم "خرلاس" پر حاضر ہوا اور ان کے چپراسی کم اسٹینو بھونپو ہندی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ بھونپو ہندی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ جس کی دیواروں پر چھوٹے مجھلے اور بڑے غرضیکہ بھانت بھانت کے گدھوں کی تصویریں دیکھ کر میری عقل کے بنہ کا فیوز اُڑتے اُڑتے بچا۔ کھڑکیوں اور دروازے کے پردے پر بھی گدھے خرمستیاں کر رہے تھے یہاں تک کہ علامہ کی مخصوص نشست بھی خرنما ہے جس کے سامنے ٹیبل پر سنگ مرمر کا ایک گدھا آویزاں ہے۔

علامہ تشریف لائے تو پہلے بھونپو ہندی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا پھر براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق ایک مشہور رسالہ سے ہے اور میں اُن کا انٹرویو لینے حاضر ہوا ہوں تو اپنے تمام کاموں کو پس پشت ڈال کر سراپا انٹرویو بن کر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انٹرویو شروع کر دیا۔

میں:۔ سب سے پہلے آپ اپنے نام کے متعلق تفصیل سے بتائیے؟

علامہ:۔ (تبسم کی نمائش کرتے ہوئے) میرا پہلا اَدبی نام نابالغ ہے۔ ابتداء میں میں نے اسی نام سے لکھنا شروع کیا لیکن میری تخلیق کو کسی نے منہ نہیں لگایا نتیجتاً میں نے ادب سے رشتہ توڑ کر کوئلہ کی دلالی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں اپنے فیصلہ پر عمل کرنے جا ہی رہا تھا کہ اچانک حوصلہ کی چڑیا نے کان میں کہا "تمہاری ناکامیابی کا سبب تمہارا نام ہے۔ نابالغ کے نام سے جب تک لکھو گے کوئی تمہیں منہ نہیں لگائے گا۔ تمہاری بیش بہا تخلیقات کو لوگ نابالغ سمجھ کر نظر انداز کرتے رہیں گے۔ کوئی انوکھا اور پرکشش نام اختیار کرو کہ لوگ سنتے ہی متوجہ ہو جائیں۔ اپنی ایک لابی تیار کرو۔ لکھنے سے زیادہ ہنگامہ برپا کرو، دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہو جاؤ گے، تمہارے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔"

حوصلہ کی چڑیا کے مشورہ پر میں نے عمل کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نابالغ کی حد تک میں کوڑی کا تین تھا لیکن علامہ خر بھارتی بنتے ہی ادبی دنیا کی ناک کا بال بن گیا۔"

ھمیں :۔ آپ بے دال کا بودم بھی بن سکتے تھے پھر خر بھارتی بنا ہی کیوں پسند کیا۔

علامہ :۔ دوسروں کو بیوقوف بنانے کا سب سے آسان نسخہ یہی ہے کہ آدمی خود بیوقوف بن جائے اور لفظ خر بیوقوفی کے ٹکسال کا سکہ رائج الوقت ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے خر کو بے دال کا بودم سے بہتر سمجھا۔

ھمیں :۔ حوصلہ کی چڑیا نے انوکھا اور پرکشش نام اختیار کرنے کے علاوہ اپنی ایک لابی تیار کرنے اور لکھنے سے زیادہ ہنگامہ برپا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مشورہ پر آپ نے عمل کیا یا نہیں ؟

علامہ :۔ (مسکراتے انداز میں) ہر شخص اپنی تعریف کا بھوکا ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی بہ نسبت خاص لوگوں میں خصوصاً شعراء و ادباء میں شہرت کی بھوک کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس کمزوری کا خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اردو کے شعراء اور ادباء ہی اُردو کے قاری بھی ہیں اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنا سفر شروع کیا۔ رفتہ رفتہ لوگ میری طرف متوجہ ہوتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میں میر کارواں بن گیا۔

ھمیں :۔ اُردو کے موجودہ رسم الخط کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

علامہ :۔ یہ سوال اگر کسی مجلس سے پوچھا جاتا تو میں پہلے شرکائے مجلس کے جذبات و خیالات کا جائزہ لیتا اگر شرکاء اُردو مخالف ہوتے تو میرا جواب ہوتا کہ اردو کا موجودہ رسم خط غیر سائنٹفک اور ناقص ہے اس لیے اس کا بدلنا ضروری ہے اور اگر شرکاء اردو کے بہی خواہ ہوتے تو میرا جواب اس کے برعکس ہوتا۔ فی الحال میرا جواب یہ ہے کہ اس کو بدلنا بھی چاہیئے اور برقرار بھی رکھنا چاہیئے۔

ھمیں :۔ ادب میں آپ کا کوئی خاص نظریہ تو ہوگا ؟

علامہ :۔ (ہنستے ہوئے) نظریہ وظریہ کیا ہوتا ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ ؂

چلو اُدھر ہی کو جدھر کی ہوا ہو

ھمیں :۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کن کن ادیبوں سے متاثر ہیں۔

علامہ :۔ میری مشغولیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ مجھے کسی بھی ادیب کی تخلیق پڑھنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ سچ یہ ہے کہ میں دوسروں کی تخلیق تو کجا اپنی تخلیق ہی نہیں پڑھ پاتا اس لیے کسی سے متاثر ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ھمیں :۔ موجودہ دور میں آپ اُردو کا عظیم ادیب کسے سمجھتے ہیں ؟

علامہ :۔ (برجستہ) خود کو، آپ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھ جیسا عظیم ادیب اُردو ادب میں آج تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ اُردو ادب کا میں وہ دیدہ ور ادیب ہوں جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ھمیں :۔ جدیدیت کیا ہے ؟۔ ایک ذہنی فینٹاسی یا اور کچھ ؟ بقول غالب ؂

علامہ :۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ بھی جدید نہیں۔ ہر لقمہ چبایا ہوا ہے۔ تاریخ کی طرح ادب بھی خود کو وقت کے ساتھ دہراتا ہے۔ ماضی کی روایات و حکایات کو نئے الفاظ میں بیان کرکے جدیدیت کا ڈھنڈورہ پیٹنا ایک فیشن بن گیا ہے۔

میں :- ترقی پسند ادب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ :- گدھے کی طرح ادب کا مقصد بھی انسانیت کی خدمت یا بقول شخصے تنقید حیات ہے گدھے کو اطلس اور کمخواب کی پوشاک پہنا دینے سے وہ گھوڑا نہیں بن جائے گا گدھا ہی رہے گا ادب پر جو بھی لیبل چسپاں کر دیجئے وہ ادب ہی رہے گا اس لیے ترقی پسند ادب غیر ترقی پسند ادب یا اس قسم کی جتنی بھی اصطلاحیں ادب کے ساتھ رائج ہیں ان کا مقصد قاری کو بیوقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کرنا ہے۔

میں :- جدت، تجربہ اور ابہام کے نام پر لکھیں موسیٰ پڑھیں عیسیٰ جیسی تخلیقات . . .

علامہ :- (قطع کلام کرتے ہوئے) آپ کا خیال غلط ہے لکھیں موسیٰ پڑھیں عیسیٰ جیسی تخلیقات کے بجائے لکھیں موسیٰ، پڑھیں موسیٰ، اور سمجھیں کوئی نہیں جیسی تخلیقات کا رواج آج عام ہے۔

میں :- آپ کی تخلیقات بھی تو اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

علامہ :- (لاجواب ہوتے ہوئے) جیسا دیس ویسا بھیس۔

میں :- آپ اب تک کتنی کتابیں لکھ چکے ہیں اور کس کس موضوع پر؟

علامہ :- اپنی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد مجھے بھی یاد نہیں ویسے میری ایک مشہور کتاب ہے "گڑبڑ گھوٹالا" اس میں میں نے اکثر بڑے ادیبوں کی تخلیقات کا گڑبڑ گھوٹالا کیا ہے۔ ایک اور کتاب ہے ادب اور املی۔ ایک کتاب کا عنوان ہے چوں چوں کا مربہ ـــ ہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میری اکثر بلکہ بیشتر کتابیں اردو اکاڈمی اور دیگر ادبی اداروں کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہیں۔

میں :- آپ کا میں نے کافی قیمتی وقت ضائع کیا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، اچھا اب اجازت دیجئے۔

علامہ :- ارے بھائی آپ نے میرا وقت کہاں ضائع کیا انٹرویو سے بڑھ کر اور کیا کام ہو سکتا ہے۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

زندہ دلان حیدرآباد کی تازہ پیش کش
ممتاز انشائیہ نگار
ڈاکٹر رشید موسوی
کے
بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ
کاغذی ہے پیرہن
قیمت: ۲۰ بیس روپے
خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور
صفحات: ۱۴۰ (ڈیمائی)

سرپٹ حیدرآبادی

وفا میں عاشقوں کی پختگی ہے جفا، جو حُسن کی ہے پھُس پھُسی ہے
غمِ فرقت میں پیہم، جانکنی ہے ہر عاشق، ہستیِ خودکشی ہے
وہ خود آئے ہیں، اپنا تھام کر دل یہ میرے دل کی، سب کاریگری ہے
یہ دل میں کس کے آنے کی ہے آہٹ یہ اُجڑی بستی، شاید پھر بسی ہے
لڑکپن میں چپیت کھائی تھی سرپٹ
ابھی تک، کھوپڑی تو پلپلی ہے

اِس کے سوا پسند نہیں کوئی کھیل اُنھیں وہ کھیلتے ہیں، اب میرے جذبات ہی کے ساتھ
ملتے ہیں بے نقاب حسین ہر مقام پہ ہے ساز بازِ حُسن کا، بے پردگی کے ساتھ
منظر یہ میکدے کا خصوصی تھا دیدنی رِندوں کی ہاتھا پائی ہوئی شیخ جی کے ساتھ
مشہور چاند سلطانہ کی ہے وہ شخصیت جس کا زنانہ پن رہا مردانگی کے ساتھ
اب جو رفیقِ زیست ہے، یہ تو قدیم ہے
دل چاہتا ہے آگے بسر ہو نئی کے ساتھ

★

ڈاکٹر یوسف گوہر شاہجہاں پور

مہنگائی

مہنگائی کا یہ دَور، یہ ہر چیز کی کمی
یہ زندگی خدا کی قسم زندگی نہیں
پتنی کا یہ چیخ چیخ کے کہنا وہ بار بار
آٹا نہیں ہے دال نہیں تیل بھی نہیں

کو ایجوکیشن

ایک اسٹوڈنٹ بی اے کی یہ بولی باپ سے
آپ کے سب تجربے ناکام یکسر ہو گئے
کون کہتا کو ایجوکیشن سے کچھ حاصل نہیں
کل جو تھے ٹیچر مرے وہ آج شوہر ہو گئے

اقبال بلگرامی (اورنگ آباد)

"میں ذرا جلدی میں ہوں!"

جی ہاں! آپ جب بھی ان صاحب سے بات کریں گے، وہ کہیں گے "میں ذرا جلدی میں ہوں!" آپ کسی وقت کسی موسم یا کسی مہینے میں ملیئے آپ کو یہی جملہ سننے کو ملے گا۔ آپ اخلاقاً کہیں گے "کوئی بات نہیں! ہم آپ سے بعد میں مل لیں گے۔" لیکن کسی بھی بازار میں دفتر میں گھر پر آپ انھیں یہی جملہ دہراتے ہوئے پائیں گے۔ "کہ میں جلدی میں ہوں!" آپ سوچیں گے کہ آخر یہ شخص دنیا کے کون سے ایسے کاموں میں مصروف ہے کہ اس کو کسی سے ملنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔

ہم نے سمجھا شاید یہ بات ہمارے ساتھ ہی ہوئی ہے اس لیے ہم نے اُن کے قریبی دوستوں سے پوچھا تو وہ بھی کہنے لگے کہ بھائی ہم لوگ بھی اسی جملے کے گزیدہ ہیں۔ ہمیں جستجو ہوئی کہ وہ کسی سے تو اطمینان سے بات کرتے ہوں گے۔ لیکن بسیار تلاش و جستجو کے بعد بھی ہمیں ایسا کوئی خوش نصیب نظر نہیں آیا جس سے اُنھوں نے دو گھڑی اطمینان سے بات کی ہو۔

ہماری ملاقات اُن سے ایک بہت بڑے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ کوئی دو سال ہوئے اس آفس میں بحیثیت ٹائپسٹ داخل ہوئے تھے۔ خوش گفتار و خوش پوشاک تو وہ تھے ہی نیز کسی بھی بات کو بڑھا چڑھا کر بتانا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ پتہ نہیں ان ہی باتوں کے پیش نظر اُن کی بیوی اُنھیں یکہ و تنہا چھوڑ کر میکے چلی گئی تھی۔ اسی ضمن میں موصوف عدالت کے بھی کئی چکر کاٹ چکے تھے۔ ذمہ داری کچھ نہ تھی۔ اس لیے دوستوں کے حساب پر دل کھول کر خرچ کرتے اور دوسرے لوگوں کے سامنے اُس سے چار گنا خرچ بتاتے اور داد وصول کرتے۔

آخر وہ کب تک اکیلے رہتے۔ ایک غریب بیوہ کی بچی اُن کو پسند آ گئی۔ اُنھوں نے فوراً اُس سے عقد کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر بچوں کے لیے پانی پت کا میدان بن گیا۔

اُن کو ہم نے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا ایک بار وہ شہر کی عیدگاہ میں نظر آئے ہم ابھی پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب ادھر کدھر ــــــ وہ فوراً گویا ہوئے "میں ذرا جلدی میں ہوں۔" آپ سے ابھی ملتا ہوں۔ اور وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔

ایک دفعہ کسی نے اُن سے پوچھ لیا کہ صاحب آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ کہنے لگے میں ہندوستان

کے بہت بڑے شہر کا رہنے والا ہوں۔ لیکن بعد میں اُن کے قریبی دوست سے پتہ چلا کہ بے چارے پچھم مہاراشٹرا کے ایک چھوٹے سے دیہات کے ہیں۔

بیوی سے اُن کی کم ہی بنتی تھی۔ اِس لیے وہ ہمیشہ گھر سے باہر ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ گھر جب آتے تب تک سب لوگ سو چکے ہوتے۔

وہ جب بھی نکلتے بہت بن ٹھن کر نکلتے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو بننے سنورنے میں ضرور صرف کرتے۔ اِتنی دیر تو شاید لڑکی کے سولہ سنگار میں بھی نہ لگتی۔

جب کوئی ... اہل معاملہ اُن سے دفتر میں ملتا وہ کہتے۔ ہاں یہ کام ــــ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ کا یہ کام میں چٹکی بجاتے کر دیتا ہوں۔ فکر مت کرو۔ اور پھر دوبارہ جب اہلِ معاملہ سے ملاقات ہوتی وہ فوراً کہتے ارے بھئی آپ کا کام ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں آپ کو لیٹر کے ذریعے معلوم ہوگیا ہوگا۔ وہ غریب منہ لٹکائے کہتا: نہیں بھئی ابھی تک تو کوئی خبر نہیں۔ پتہ نہیں وہ لیٹر سپرد ڈاک ہوا یا سپردِ خاک ہوا" کوئی بات نہیں۔ میں ابھی دیکھتا ہوں"۔ اور پھر وہ اُسے اپنے ٹیبل کے سامنے بٹھا کر اُس غریب کے دو تین گھنٹے آسانی سے ضائع کر دیتے۔ اِس دوران وہ اطراف کے اہلکاروں کو فاتحانہ انداز سے دیکھتے کہ دیکھو میرے پاس کیسے کیسے لوگ آتے ہیں۔ اور میں کس کس کا کام منٹوں میں چٹکی بجاتے کر دیتا ہوں۔ لیکن بُرا ہو اُس دفترِ شاہی کا کہ اُن کی بات جہاں کی وہاں ہی رہتی اور اُس کارروائی پر ایک لفظ بھی نہ لکھا جاتا۔ اہل معاملہ منہ لٹکائے چلا جاتا۔

"آپ چلیئے۔ میں ذرا جلدی میں ہوں ـــ پھر بھی میں آپ کے لیے اُس سیکشن میں دو بار گیا۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔ مطمئن رہیئے۔ آپ بے فکر جائیے مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں اب سب دیکھ لوں گا۔" پھر وہ دوسری پارٹی کو اٹینڈ کرنے لگتے۔ وہ کہتے۔ آہ آ ـــ یاد آیا آپ کا وہ کام میں نے کر دیا۔ پارٹی کا لیڈر کہتا کیا۔؟ ہم تو آپ سے پہلے کبھی نہیں ملے وہ خجل ہوتے ہوئے کہتے معاف کرنا۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ کہیئے آپ کا کیا کام ہے ... فارم چاہیئے۔ وہ تکمیل کر کے دینا ہے۔ سرکاری چھپے ہوئے فارم جو فری آف کاسٹ ملتے وہ اپنے میز کے خانے سے نکالتے اور ... انداز ... سے اہلِ غرض کو دیتے جیسے یہ فارم سرکار کی طرف سے نہیں بلکہ اُن کی طرف سے عطاء کیئے جا رہے ہیں۔ اور ... نہ ہوتے تو اہلِ غرض کو وہ فارم زندگی بھر نہ ملتے۔

اگر وہ دیکھتے کہ اہلِ معاملہ سفید پوش اور ذی حیثیت ہے تو اُس کے لیے وہ بچھ بچھ جاتے۔ اور اُس سے دس بار پوچھ کر ایک بار ضرور چائے منگاتے۔

وہ چائے کبھی اکیلے نہیں پیتے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ چائے پلاتے فل کپ نہ سہی ہاف کپ ہی پلاتے ـــــ مگر پلاتے ضرور۔ چائے پلانے کے بعد وہ ہر ایک کلرک سے پوچھتے کیوں بھئی آپ نے چائے پی، آپ نے چائے پی۔ اور ہر بار ساتھی کلرک یہی کہتا۔ ہاں بھئی شکریہ۔ تو وہ سامنے بیٹھے ہوئے مہمان یا اہلِ معاملہ شخص کو فاتحانہ انداز میں دیکھتے اور یہ بتانے کی کوشش کرتے کہ دیکھو میں اپنے دفتر میں کتنا ذی اثر ہوں۔ اور لوگ میرا کتنا احترام کرتے ہیں۔

اتفاق سے اُنہیں ایک دفعہ ہلکا سا بلڈ پریشر ہوا۔ وہ سمجھے کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ فوراً میڈیکل کالج کے بڑے ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ آپ کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا ہے، صرف بلڈ پریشر

کا ہلکا سا عارضہ ہے۔ جو اب نارمل ہے۔ لیکن یہ صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ دوست احباب کا حلقہ وسیع تو تھا ہی، تین چار ڈاکٹروں سے مزید معائنہ کروایا۔ نتیجہ وہی رہا۔ لیکن انھوں نے ایک لمبی چھٹی لے لی جب بھی بستر سے اُٹھتے دل تھامے اُٹھتے جیسے وہ کہیں بھاگ جا رہا ہو۔ چونکہ وہ بلا وجہ شہر میں مشہور تھے کچھ لوگ ازراہِ ہمدردی مزاج پُرسی کرنے گھر چلے آتے۔ تب یہ صاحب اندر سے کہلا بھیجتے کہ ذرا ٹھہریئے۔ پھر میز وغیرہ کو جھٹک کر صاف کر دیتے اور اُس پر کچھ پُرانے رسالے جو انگریزی کے ہوتے جما دیتے۔ ساتھ ہی سنڈے ایڈیشن جو تقریباً مہینہ بھر پہلے کا ہوتا جھاڑ پونچھ کر میز پر سجا دیتے کہ آنے والا تیمار دار یہ سمجھے کہ کیا غضب کا مطالعہ ہے بیمار کا۔

ایک دفعہ وہ میرے دوست کے ساتھ جو اُن کے دفتر کے ساتھی بھی ہیں، بمبئی سے اورنگ آباد آ رہے تھے۔ میرے دوست کے پاس ریزرویشن تھا وہ بڑے مزے سے مطالعہ کرتے ہوئے سفر کا مزہ لے رہے تھے۔ اُن صاحب کو کہیں جگہ نہ ملی تو ریلوے حکام کی بد انتظامی کو کوسنے لگے۔ اس طرح رات انہوں نے کھڑے کھڑے گزار دی۔ دوسرے دن جب یہ دفتر پہنچے تو ڈینگ ہانکتے ہوئے کہنے لگے رات جب مَیں نظام آباد سے چلا تو میرے پاس پہلے ہی سے ریزرویشن تھا سفر بڑا آرام سے گزرا۔ میرے دوست دم بخود اُنہیں دیکھتے رہ گئے کہ یہ شخص رات میں بمبئی سے میرے ساتھ تھا۔ یعنی مغرب سے مشرق کی طرف اور اب جو یہ سمت بتا رہا ہے وہ مشرق سے مغرب کی ہے۔

شگوفہ :۔ ایک سفری سیلزمین جب دورے سے واپس آیا تو اُس نے اخراجات کا بل کمپنی کے ڈائرکٹر کو پیش کیا۔ ایک مد کو گھورتے ہوئے ڈائرکٹر نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" سیلزمین نے جواب دیا۔ "ہوٹل کی رقم" ڈائرکٹر بُرا منہ بنا کر بولا۔ "ٹھیک ہے مگر اب آئندہ کوئی ہوٹل ہرگز نہ خریدنا۔"

پبلسٹی :۔ ایک بیوٹی کلینک کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر مندرجہ ذیل تحریر لکھی ہوئی تھی "بیوٹی کلینک سے باہر نکلتی ہوئی کسی بھی حسین و جمیل خاتون سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں ممکن ہے وہ آپ کی ساس ہو۔"!

وہ اپنے سوپیریر (SUPERIOR) کا بہت احترام کرتے ہیں چاہے وہ کتنی جلدی میں کیوں نہ ہو اپنے عہدہ دار کو سلام کیئے بغیر کبھی آگے نہیں بڑھتے چاہے ان کا سلام ان سوپیریر تک پہنچے یا نہ پہنچے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی

اکثر بیچارے نوّے فیصد سلام ضائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سلام کرنے سے باز نہیں آتے۔ بلکہ باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اُن کی کتنے بڑے بڑے آفیسروں سے صاحب سلامت ہے۔ ایک دفعہ ان کے قریب بیٹھے ہوئے کلرک نے اُن کے ایک سوپیریر کی آواز کی نقل کی یہ صاحب فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پینٹ اُوپر کھینچنے لگے (یہ ان کی عادت تھی) اور کہنے لگے لیس میڈم ابھی حاضر ہوا تو میڈم جو سپرنٹنڈنٹ تھیں اپنے موٹے چشمے میں سے اپنی غبار آلود آنکھوں سے (جو کسی زمانے میں تھیں اور اب تو صرف اُن کے کھنڈرات ہی باقی تھے) کہا کہ مَیں نے تو آپ کو نہیں پکارا۔ کیا آپ کے کان ہوا میں بجنے لگتے ہیں تو وہ بہت جھجکی ہوئے۔ اور بعد میں انھیں

جب یہ معلوم ہوا کہ یہ اُن کے پاس ہی بیٹھے ہوئے کلرک کی حرکت تھی تو وہ اور بھی تڑپ کر اندر ہی اندر سوختہ کباب کی مانند بھننے لگے۔ لیکن بیچارے کرتے کیا۔

یوں تو کئی قسم کے باز اس دنیائے فانی میں موجود ہیں مثلاً کبوتر باز، بٹیر باز، مرغ باز، پتنگ باز، لیکن یہ صاحب "قلم باز" ہیں۔ کئی کلرس کے قلم ان کی جیب میں آپ کو نظر آئیں گے۔ پن اور بال پن ان کی جیب میں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ جیب نہ ہوئی پن اور بال پینوں کی چلتی پھرتی دکان ہے۔ ان قلموں سے لکھتے کم اور شو زیادہ کرتے جب لکھنے پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کیڑے مکوڑے کی دوڑ ہو رہی ہے لیکن ذرا ٹھہریئے اُنھوں نے پھر کسی سے کہا "میں ذرا جلدی میں ہوں" میں ہمہ تن گوش ہی نہیں چشم براہ بھی ہوں پتہ نہیں اب کی بار وہ کیا گل کھلاتے ہیں۔

ادارۂ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجا سکتی ہیں!

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
الف تماشا	نریندر لوتھر	مضامین	۱۶	روپے
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۱۲	"
جاپان چلو	"	سفرنامہ	۱۴	"
بالآخر	"	مضامین	۱۴	"
تکلف برطرف	"	"	۱۴	"
قطع کلام	"	"	۱۲	"
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
سُنی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰	"
مزاح لطیف	رشید قریشی	"	۲۰	"
غبار خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵	"
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲	"
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعۂ کلام	۱۲	"
ماشاء اللہ	حلیمہ فردوس	مضامین	۱۵	"
کاغذی ہے پیرہن	رشید موسوی	"	۲۰	"

دُعا سن لے

اختر سعیدی
رانچی (بہار)

اس کنوارے کی دُعا سُن لے خُدا
اک عدد بیوی مجھے بھی ہو عطا

چُٹکلے چٹکی سے مجھے چُھٹّی جو دے — سینک کر ہر دن مجھے بٹّی جو دے
ختم ہو جائے اگر چاول کبھی — مانگ کر بازو سے پھر روٹی جو دے

مفلسی میں جو نہ چھوڑے گھر میرا
اس کنوارے کی دُعا سن لے خدا

ہونٹ اس کے ہوں رسیلے اور بس — چاند سا چہرہ ہو دلکش دلنشیں
اس کی زُلفوں پہ گھٹا کا ہو گماں — ہو سہی قد اور سراپا نازنیں

الغرض ہو خوب سے بھی وہ سِوا
اس کنوارے کی دُعا سن لے خدا

لڑکی والے دیں بلیٹ اور دس ہزار — اور دیں ٹی وی بھی اک رنگین کلر
اک فریج بھی ہے ضروری ساتھ ہی — جس میں رکھوں ٹھنڈی کر نے میں بیر

گھر بھی بنوا دیں مجھے اک خوشنما
اس کنوارے کی دُعا سُن لے خدا

نوکری آفس میں وہ کرتی بھی ہو — اچھا ہے تنخواہ گھر لاتی بھی ہو
بعد آفس سیدھی آئے گھر کو جو — آ کے کپڑے گھر میں پھر سیتی بھی ہو

جیب کے خرچے کو دے نقدی سدا
اس کنوارے کی دُعا سن لے خدا

میں سناؤں غزلیں وہ سنتی رہے — ہر غزل پر داد بھی دیتی رہے
میرے شاعر دوستوں کے واسطے — چائے لے کر شام سے بیٹھی رہے

شعری محفل کو نہ سمجھے وہ بُرا
اس کنوارے کی دُعا سن لے خدا

ایسی مل جائے اگر بیوی مجھے — میں بٹھائے رکھوں گا سر پہ اُسے
ایسی خوابوں جیسی بیگم ہو کہ بس — دیکھتا رہ جائے سارا گھر اُسے

اس کی ہر خواہش کروں پوری سدا
اس کنوارے کی دُعا سن لے خدا

کریک بتیاوی

اسمبلی کا ہے نقشہ یا کوئی بازار ٹیبل پہ — وطن کے ٹھیکیداروں کا ہے بیڑا پار ٹیبل پہ
نہیں کرتی ہے ٹائپسٹ گرل آنکھیں چار ٹیبل پہ — جھکائے رکھتی ہے گردن ہمیشہ یار ٹیبل پہ
نہ آیا ڈاکٹر افسوس آیا بھی تو کب آیا! — اکڑ کر رہ گئے جب حضرتِ بیمار ٹیبل پہ
غریبی اور بے کاری مٹانے کے لیے اکثر — پلاننگ خوب کرتی ہے مری سرکار ٹیبل پہ
نہ جب تک مال بدولت نوٹ بائیں نوٹ کیا لکھیں — ہے پینڈنگ فائیلوں کی دیکھئے بھرمار ٹیبل پہ
یہ جوتا فیکٹری ہے یا کسی لیڈر کا چیمبر ہے — لگی ہے سیمپلوں کی دیکھئے انبار ٹیبل پہ

چھڑا کر میرا ٹیبل کلارک چپراسی ہوا چمپت
پچھاڑ کر رکھ گیا مجھ کو وہ ناہنجار ٹیبل پہ

سراج نرملی

نو دو گیارہ ہوئی جمپت ہوئی غربت میری — لاٹری نکلی ہوئی دور نحوست میری
کل تلک قابلِ نفرت تھی یہ صورت میری — آج دولت کی بدولت بڑھی عزت میری
تو نے دیکھی ہے ابھی تک تو شرافت میری — چاہتا ہے تو دکھا دوں گا جہالت میری
بس سلامت رہے کرسیٔ وزارت میری — بھاڑ میں جائے رعایا و ریاست میری
ساٹھ کے سن میں فقط بیس کی دلہن ہے ملی — رنگ لائے گی کسی دن یہ حماقت میری
نوکری اس کو ملی جس نے سفارش لائی — کام آئی نہ ذہانت و لیاقت میری

حسنِ ظن آپ کا اور ذرہ نوازی ہے سراج
ورنہ میں کیا ہوں؟ بھلا کیا ہے حقیقت میری

رقیب بن کے تو دل کو مرے مسلتا ہے — خدا ہی جانے ترا مردہ کب نکلتا ہے
خدا قسم مرے سینے پہ مونگ دلتا ہے — "یہ کون ہے جو ترے ساتھ ساتھ چلتا ہے"
یہ مرشدی تو بہت راس آگئی مجھ کو — کہ بس اسی پہ مرا خاندان پلتا ہے
یہ نیتا لوگ تو اولاد ہوں گے گرگٹ کی — کہ رنگ نت نئے گرگٹ ہی تو بدلتا ہے
چنے کی دال پہ جو کر چکا ہے پی۔ ایچ ڈی — ڈھکیل بنڈی میں اب مرچیاں وہ تلتا ہے
سراج! کام نہ آئے گی کچھ بھی آنسٹی — جو خود بخود کرے بھولتا

HONESTY

ایس۔ ایم۔ آرزو (کلکتہ)

ظلم کرنے کے چند طریقے

ظلم کی تشکیل کچھ عجیب و غریب انداز سے ہوئی ہے۔ شاید اسی لیے جو شخص بھی اس لفظ کو سنتا ہے اس کے دل میں یہ خیال اُمڈتا ہے کہ ظالم کو ختم کردے اور مظلوم سے ہمدردی کرے لیکن یہ خیال اس طرح اس کے دل میں آتا ہے جس طرح سوڈا واٹر میں گیس۔

ظلم کی سحرکاری سے ہم اس وقت واقف ہوتے ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والا ظلم کرکے جاچکا ہوتا ہے۔ تب یہ بات ہم لوگوں کے سمجھ میں آتی ہے کہ کسی نے ظلم کیا، نیز اس ظلم کی کیا سزا ہونی چاہیئے۔

چھری، کٹاری، لاٹھی، ڈنڈا، پستول اور رائفل سے ظلم پہلے زمانے میں کیا جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پچھڑے ہوئے علاقوں میں اس کا رواج اب بھی برقرار ہے۔ مگر آج کل یار لوگوں نے ظلم کرنے کا نیا طریقہ نکالا ہے۔

اب آپ اس واقعہ کو پڑھیئے اور ہمیں بتلائیے کہ آخر یہ ظلم کی کونسی شکل ہے؟ میں جن کی علاقائی گوئیے سے متاثر تھا، ایک دن اُن سے ملاقات شہر کے چوراہے میں ہوگئی تو گلوکار صاحب نے نہ صرف خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا بلکہ میری خاطر تواضع کے لیے مجھے ایک مشہور ہوٹل میں بھی لے گئے، ہوٹل میں پہنچ کر انھوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا نوش فرمائیں گے، میں نے کہا "جو آپ کی مرضی" پھر انھوں نے کہا کہ یہاں کا چکن بریانی بہت فیمس FAMOUS ہے۔ خیر صاحب دو پلیٹ چکن بریانی کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا، کہ گلوکار صاحب نے کہا "آرزو صاحب میں آپ کا بے حد ممنون اور مشکور ہوں کہ آپ نے نہ صرف بریانی کھلائی بلکہ چائے بھی پلائی۔ لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ٹیکسی کا کرایہ بھی عنایت کریں کیوں کہ آپ نے اتنا زیادہ کھلایا پلایا ہے کہ اب ٹیکسی کے بغیر گھر پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" صاحبان ہمیں اُمید ہے کہ ظلم کے اس طرح بدلتے ہوئے رجحانات کا شکار آپ بھی ہوئے ہوں گے۔

وحشت اور زمانے کے ساتھ ساتھ ظلم بھی اپنا چولا بدلتا ہے۔ ظلم کرنے کا لیٹسٹ (latest) طریقہ جس کا شکار آج کا ہر مہذب شوہر بنا ہوا ہے۔ ایک بیوی یہ دُعا مانگ رہی تھی "اے ایشور تو خالق کائنات ہے، تو ان داتا ہے، تیرے اختیار میں ہے جو چاہے دے، جسے چاہے دے لیکن میری یہ بنتی ہے، یہ پرارتھنا ہے کہ تو جو کچھ بھی چاہے مجھے دے لیکن بیٹا نہ دے اور اگر بیٹا دے تو بہو نہ دے۔"

بات ایک شاعر کی

شریک ہوا۔ لوگوں کو علم ہوا کہ مشاعرے میں زندہ طلسمات بھی ہے تو بہت سارے مریض وہاں چلے آئے۔ مشاعرہ اور شاعر دونوں کامیاب ہو گئے۔ دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اپنے تخلص دل بڑھانے اور امرت انجن، عرقِ پودینہ، گم پلاس وغیرہ اختیار کئے۔ بعد میں دواؤں کے نام پر شاعروں میں جھگڑے ہونے لگے یہ لوگ کسی مشاعرہ میں ایک جگہ جمع ہوتے تو ایسا لگتا شاعروں کا جمگھٹ نہیں کوئی میڈیکل اسٹور ہے پھر جب شاعروں کے اصلی نام لوگوں کے ذہنوں سے مٹنے لگے تو اس طرح کی باتیں بھی سننے کو ملیں ۔۔۔

یار۔ آج امرت انجن نظر نہیں آتا؟

بیٹھا ہوگا کسی کے پاس۔ اُس کے سر میں درد کرتے ہوئے۔

کل گم پلاس بھی مولانا سے ایسا چپکا کہ عصر بھی غائب مغرب بھی۔ آخر عشاء کے وقت چھٹکارا ملا تب مولانا توبہ توبہ کرتے ہوئے سیدھے میڈیکل اسٹور میں گھس گئے۔

والد کا اصرار تھا کہ لڑکا کچھ دھندا بزنس کرے لیکن وہ زیادہ تر پڑھائی میں لگا رہا۔ گاؤں میں نئی نئی بجلی آئی تو ایک معاملہ میں تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ یہ اکیلا ایک طرف۔ سارا گھر دوسری طرف۔ معاملہ تھا۔ بیت الخلاء میں بلب لگانے کا۔ ایک دن یہ چپکے سے بلب لے آیا اور بیت الخلاء جانے لگا۔ والد صاحب نے دیکھ لیا۔ کہا خبردار وہاں بلب لگا تو۔ لڑکے نے پوچھا آخر کیوں؟ جواب ملا کیوں کے بچے۔ تم ویسا بھی وہاں دن میں گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھے رہتے ہو۔ اب بلب لگاؤ گے تو رات میں بھی وہاں شاعری کی کتابیں پڑھنے بیٹھو گے اور ادھر سارا گھر کیا کرے گا؟ آخر بڑا ہو کر یہ لڑکا ایک اسکول میں ٹیچر ہوا اور خوب شاعری کرنے لگا۔ ٹیچر شپ میں اُسے اتنا وقت ملا کہ یہ پورے ملک میں محبوب راہی کے نام سے مشہور ہوا۔ مشہور ہے کہ ملک کا کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا اخبار یا رسالہ ایسا نہیں سمجھا جاتا جس میں ان کی تخلیقات نہ چھپتی ہوں۔ اس کے باوجود ان میں وہی سادگی اور انکساری ہے جو ایک عام آدمی میں ہو سکتی ہے۔ شرافت، اخلاق، دوست داری اور مہمان نوازی کا ایک نام محبوب راہی بھی ہے۔

لوگ شاعری کے لیے سکون کی تلاش میں رہتے ہیں۔ راہی صاحب گھر کے ہنگاموں اور بیوی بچوں کی آوازوں کے بغیر شاعری نہیں کر سکتے۔ ریسرچ کے دوران ان کے لیے علیحدہ کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا لیکن وہاں چھ صفحے بھی نہ لکھ سکے۔ واپس سب کے درمیان آ گئے یہیں انھوں نے چھ سو صفحات کا مقالہ لکھا۔ گھر سے باہر راہی صاحب ایک ٹھنڈے مزاج کے آدمی مشہور ہیں لیکن گھر میں یہ عالم ہے کہ یہ خود تو درکنار ان کے لکھے ہوئے کاغذ کے پرزوں سے بھی لوگ ڈرتے اور ایسے دُور بھاگتے ہیں جیسے کاغذ نہیں، ایٹم بم رکھا ہے۔ کوئی کاغذ اِدھر اُدھر پڑا ہوا دکھائی دے تو احتیاط سے اُٹھا کر ٹیبل پر لگا دیتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ انھوں نے ٹیبل صاف کر کے ردّی کاغذات نکالے اور چولہے کے پاس رکھ دیئے۔ کسی نے دیکھا۔ گھبرایا اور دوبارہ ٹیبل پر لگا دیا۔ انھوں نے پھر چولہے کے پاس رکھا۔ وہ پھر ٹیبل پر آ گئے۔ جھنجھلا کر انھوں نے سارے کاغذات اپنے ہاتھ سے جلا دیئے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ غزلوں کے تین کاغذات غائب ہیں۔ ایک چھوٹی ڈائری لاپتہ ہے اور عورتوں کے موضوعات پر لکھا گیا پورا مسودہ، آدھا جل کر چولہے کے باہر پڑا ہے جو مفلس فاروقی کی حیثیت سے انھوں نے لکھا تھا۔

ان کی اکلوتی لڑکی ناظمہ نسرین کی شادی سے قبل کا واقعہ ہے۔ دو کتابیں چھپ چکی تھیں یعنی گھر کافی

خسارہ میں چل رہا ہے۔ گھر سے بار بار آوازیں اٹھتیں کہ ایک لڑکی کے بھروسہ کب تک بیٹھے رہیں گے۔ تھوڑا بہت پیسہ بچا بھی ہے تو کتابیں چھپوانے میں برباد ہو جاتا ہے۔ اور چھپنے کے بعد پیسے ملنا تو درکنار اُلٹا پوسٹ کرنے میں سیکڑوں روپے اُٹھ جاتے ہیں۔ میں تو اپنی بچی کی شادی کے وقت سب سے پہلے یہ دیکھوں گی کہ لڑکے کو کتابیں چھپوانے کا شوق تو نہیں؟ شاعر ہونا بُرا نہیں۔ بلکہ اچھا ہے۔ گھر میں لڑائی جھگڑے کے لیے وقت نہیں ملتا آدمی دوسرے شاعروں، رسالے اور مشاعرے والوں سے لڑ کر جی ہلکا کرلیتا ہے۔ لیکن کتابیں چھپوانے والا شوہر تو خدا کسی بچی کو نہ دے۔ اب بچی کی شادی سامنے ہے۔ کچھ اور بھی کرو۔ تنگ آکر راہی صاحب نے طے کیا کہ دکانداری کریں گے۔ ان کی ایک خالی دکان دس برس سے سڑک کے کنارے بے کار پڑی تھی۔ اسے جھاڑ جھنکا کر صاف کیا۔ پھر کچھ سوچ کر یہ بورڈ آویزاں کردیا کہ "یہ دکان ہے"۔ لوگ جھانک جھانک کر جانے لگے کہ آخر کا ہے کی دکان ہے۔ تنگ آکر کتابوں کی دکان لگالی شروع میں صبح سات بجے سے رات نو بجے تک بیٹھتے۔ لیکن تشبیہوں اور استعاروں کے درمیان جینے والا شاعر دکان داری کی حقیقتوں میں کیوں کر جی لگا سکتا تھا؟ کسی نہ کسی بہانے اوقات میں کمی شروع کردی۔ دس بجے کھولتے۔ پانچ بجے بند کردیتے پھر دوپہر میں ایک سے چار تک لنچ ٹائیم کی سہولت نکالی۔ بعد میں یہ نوبت بھی آئی کہ چار بجے کھولتے اور پانچ بجے بند کردیتے۔ پھر سننے میں آیا کہ گاہکوں کے خوف سے صرف پانچ منٹ کے لیے دکان کھولتے ہیں۔ اس دوران بھی کوئی گاہک چلا آئے تو اُسے صلواتیں سناتے ہیں کہ شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ دیکھتے نہیں میں دکان بند کررہا ہوں۔ اور دیکھتے دیکھتے دکان بند کرکے بیڑی کا دھواں گاہک کے منہ پر چھوڑ کر نکل جاتے ہیں۔ بیڑی کے علاوہ یہ خاص موقعوں پر سگریٹ بھی پیتے ہیں۔ اظہر حسین منظر سے ملنا ہو تو منہ میں سگریٹ وہاں سے نکل کر بٹلاری گلی میں آئے اور کسی شاعر سے ملاقات ہو گئی تو منہ میں بیڑی۔ ہم تو اپنی اوقات کا اندازہ ان کے منہ میں بیڑی یا سگریٹ دیکھ کر لگاتے ہیں۔ ایک دن انھیں غزل کی اشاعت پر مبارکباد دی اور دو تین اشعار زبانی سنادیئے۔ انھوں نے سگریٹ پینی شروع کردی۔ ہم سمجھ گئے آج خوش ہیں۔ اور شام کو اگر ہم کہیں کہ آج کے اخبار میں آپ کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس کا تیسرا شعر وزن اور سمجھ سے باہر ہے تو فوراً بیڑی پر اُتر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ بہت جاگا کرتے تھے۔ اس سے طبیعت خراب رہنے لگی۔ پھر لوپا ایک برس ایسا گزرا کہ ایک سطر، ایک مصرعہ، نہ لکھا نہ پڑھا۔ خوب سوئے۔ اب تو ما شاء اللہ ایسی حالت نہیں ہے لیکن اب بھی جاگنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہم نے پوچھا آپ عام طور پر صبح کتنے بجے اُٹھتے ہیں۔ بولے عام طور پر تو چھ بجے اُٹھ جاتا ہوں لیکن خاص طور پر اُٹھنا ہو تو آٹھ بھی بج جاتے ہیں۔

جن دنوں ان پر شاعری کا موڈ سوار رہتا ہے یہ غائب دماغ رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ابلیس اور بلقیس میں گڑ بڑ گڑ بڑ کردی۔ گھر میں غزل سوچتے بیٹھے تھے کسی نے بچے کی شکایت کردی کہ اس کو سمجھاؤ۔ بولے میں ایسے بلقیسوں سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ اس گھر میں سارے بلقیس کی اولاد جمع ہو گئے ہیں۔ ان کی پھوپی زاد بہن جن کا نام بلقیس ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آئیں تو ایک بچے کو دیکھ کر بولے :

ارے یہ ابلیس کا بچہ اتنا بڑا ہو گیا؟

بچے کے والد ششدر منہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

کچھ شعراء گھریلو جھگڑوں سے تنگ آکر فساد پر ایک آدھ نظم لکھ لیتے ہیں تو فرقہ وارانہ فساد ہونے کے

کردلتا ہے۔ اور بڑی تلاش کے بعد بچھڑے ہوئے سندر کو اس کی بیٹی اور بیوی سے ملانے کے بعد وینکٹ راؤ ایک خط کے ذریعہ اپنی چوری کا اعتراف کرتا ہے اور اس بار سب کا دل چرا کے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

چند سال قبل اترپردیش اردو اکیڈیمی نے علیم مسرور کی ایک ناول "بہت دیر کردی" شائع کی تھی جس کے مناظر پردۂ فلم کی کہانی کی طرح بدلتے ہیں۔ متعدد فلم سازوں نے اس کے کاپی رائٹ حاصل کرنے کی کوشش کی اور آخر کار بی آر چوپڑہ اسے فلمانے میں کامیاب ہوئے۔ "روشن سائے" کی کہانی بھی اسی طرح کی خوبیوں سے متصف ہے۔ چنانچہ اس کہانی کی بنیاد پر تلگو اور ہندی میں فلمیں بنائی جا چکی ہیں غریب کی مجبوریاں، سماج کی بوالعجبیاں، بیٹی کے بہتر مستقبل کی آس، ضمیر کی آواز، گناہ اور کفارہ، جواں جسموں کی کشش، رومان پرور فضائیں، گیت و رقص کے مناظر، کشمکش اور پھر خیر کی جیت ــــ لیکن خیر کی یہ جیت شر کے مقابل نہیں بلکہ مجبوریوں کے اندھیرے میں جلائی گئی شمع کی طرح ہے۔ جس کی روشنی میں ہر انسان اپنا دل ٹٹولتا ہے۔

روایتی ناول کے تمام لوازمات سے مزین اس ناول کو اکرام جاوید کے منجھے ہوئے قلم نے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ تلگو حسن کو اردو کا لبادہ اڑھا کر انھوں نے ایک حسین امتزاج کا روپ دیا ہے جس کے لیے اکرام جاوید اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی، مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ناول کو ثقیل ادبی کتابوں کی طرح الماریوں میں مقید رکھنے کی بجائے کمرشیل پیمانے پر پھیلایا جائے۔ اس کے لیے یہ کتاب "پیپر بیک" پر چھپتی تو زیادہ بہتر ہوتا ــــ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت بھی نہایت واجبی ــــ (مدیر)

ہم نے شہر میں معیاری اور خوبصورت ہوٹلوں کی ایک تاریخ بنائی ہے۔

کیفے گرو ٹو
ڈی یم آر ایل چوراہا سنتوش نگر حیدرآباد

کیفے گرینو
بنجارہ ہلز روڈ نمبر ۱ حیدرآباد

مرزا برادرس کی نگرانی میں ــ نفیس ماحول ★ مودب سروسینگ
★ واجبی قیمتیں
★ ہر دم تازہ اشیاء خورد و نوش
★ صفائی کا خاص اہتمام۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۰
شمارہ ۵
مئی ۱۹۸۷ء

Zakir Husain Library
Jamia Nagar
New Delhi

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

ٹائیٹل: طالب خوندمیری

مینیجر:
سمیع جلیل

مینجر اعزازی بمبئی:
فیاض احمد فیضی

قیمت فی پرچہ: ۴ روپئے ۵۰ روپے
زرِ سالانہ: پینتالیس روپے (Rs45/-)
عرب ممالک سے: ایک سو پچاس روپے
(Rs.150/-)

کتابت: محمود سلیم۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فاین پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔۲

خط وکتابت کا پتہ: ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 557716 فون رہائش: 521064

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک
کے اسپیشلسٹ :-

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد!

ڈسٹری بیوٹرس برائے :-
۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ
۴. ہارکوسری نگر ۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. میڈونا کیننگ کمپنی.
۷. جیمینی وہائٹ رولٹس ۸. پیری سوئیٹس اینڈ ٹافیس ۹. ڈرگ مجوٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سیل [جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی] وغیرہ!

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان :-

پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض. حیدرآباد!

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چُنندہ آسام
و نیلگری کے باغات سے
راست منگوائی چائے!
اسٹرانگ و خوش ذائقہ!!
آپ کے ذوق کے عین مطابق!!!

آسام
ٹی
ٹریڈرس

نزد:
یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ، حیدرآباد

Ph: 525444

پانی، پانی، پانی!

آج ہمارے شہر میں پانی کی یہ حالت ہے کہ

صرف دو بوند پڑوسی سے جو مانگا پانی
اُس کی آنکھوں میں اچانک اُمڈ آیا پانی
(طالب خوندمیری)

لیکن آپ پڑوسی سے پانی مانگ کر اُسے اور اپنے آپ کو کیوں شرمندہ کریں؟
قدرت نے زمین میں بھی آپ کے لیے وافر مقدار میں پانی چھپا رکھا ہے۔
جسے باہر نکالنے اور آپ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہم آپ کو
آپ ہی کے صحن سے پانی بہم پہنچا سکتے ہیں۔

ہماری فنی اور ماہرانہ خدمات سے استفادہ کے لیے ربط پیدا کیجیے:

موبائل ڈرلنگ کمپنی

MOBILE DRILLING COMPANY

حسینی علم، موسیٰ باؤلی

نزد جلویر سوپ فیکٹری مکان نمبر 20-3-637/5

پروپرائٹر: محمد عباس — ایگزیکیٹیو: سید عبدالعلی

Ph. 521317

محمد برہان حسین
حیدرآباد

ذکر ایک الکشن کا

ـــــ اور پھر پیارے اپنا

رحمو بھائی نے پہلے مرزا کے دروازے کی گھنٹی کا بٹن دبایا پھر اسمبلی کے لئے علاقہ کے امیدوار چندہ صاحب سے کہا یہ پورا علاقہ میرا ہے صاحب، میں جس کی طرف اشارہ کروں گا سارا محلہ ووٹ دے گا۔ بس آپ ذرا میرے خلاف ڈپارٹمنٹل ڈائری رکوا دیجئے۔" پھر رحمو بھائی نے دروازہ کی طرف دیکھا "ارے جنبش مکن۔ اتنی دیر" انہوں نے گھنٹی کا بٹن بارہ دباتے ہوئے بجلی والوں کو گالی دی اور دروازہ پیٹا۔ مرزا نکلے۔ رحمو بھائی ان سے ہاتھ ملانے جھپٹے لیکن مرزا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا "ابھی ہاتھ دھونا باقی ہے۔"

رحمو بھائی نے کہا "کوئی بات نہیں ۔۔۔ آپ سے ملئے آپ چندہ صاحب چنڈال ہیں۔ اس علاقہ کے بلی کے لئے امیدوار ۔۔۔۔ مرزا صاحب! آپ کو یاد ہوگا وٹھل بھائی کا لڑکا بمبئی سے ایک لڑکی اڑا لایا تھا۔۔۔ ہ صاحب نے ہی اس کو اپنے گھر میں پولیس سے چھپایا تھا اور وہ ۔۔۔۔ جو لڈو پہلوان طوائف کے قتل کے سلسلہ پھنس گئے تھے۔ آپ نے ہی پہلوان کو مسکہ میں سے بال کی طرح نکال لیا تھا اور کریم بھائی جو ہاؤزنگ بورڈ کی زمین یا کر پھنس گئے تھے وہ کیس آپ ہی نے دبا دیا تھا۔ (پھر چندہ صاحب سے) چندا بھائی! ہمارے مرزا صاحب کو ٹ پا تھ کا کونا دلا دو ان کا دیوان خانہ بن جائے گا۔ بلدیہ کی زمین ہے۔"

چندا صاحب نے مرزا سے صرف یہ کہا۔ "میں خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ ذرا میرا خیال رکھئے" اور ہاتھ جوڑ کر ت ہوئے۔ آگے بڑھ کر رحمو بھائی سے کہا "ارے رحمو بھائی میرے کچھ اچھے کاموں کا ذکر تو کرو آپ تو بس میرے م کا ریکارڈ پیش کر رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے کون شریف آدمی ووٹ دے گا۔"

رحمو بھائی بولے آپ کی اچھی باتیں بھی بیان کروں گا ۔۔۔۔ مگر اچھے لوگوں سے ۔۔۔۔۔ اپنا مرزا تو سیلز ٹیکس ہے۔ کیا کام ہے یوم یہ شمارہ بہت کرتا ہے اور اسی میں ایک دن پکڑا جائے گا پھر آپ جیسا شخص ہی اس کو بچائے گا تے اس کو بتا دینا ضروری تھا کہ آپ سنگین سے سنگین مجرم کو بھی بچا لیتے ہیں۔"

اتوار کی صبح مرزا کسی سیٹھ کے گھر گئے تھے کہ کانگریسی امیدوار نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیگم نے اوٹ سے پوچھا

"کون ہیں صاحب"
امیدوار کے چمچے نے کہا " اس علاقہ کے کانگریسی امیدوار روی کمار اس علاقہ کا دورہ کر رہے ہیں، مرزا صاحب سے ملنا چاہتے تھے"۔
بیگم نے کہا " اُن سے فرمائیے کہ ہم لوگ کانگریس ہی کو ووٹ دیں گے "
مرزا آئے تو بیگم نے اپنی گفتگو کا خلاصہ اصل سے زیادہ تفصیل سے سنایا۔
مرزا نے کہا۔ " واہ ۔ میں کانگریس کو ووٹ کیوں دوں ؟"
بیگم نے کہا " تم پر کانگریس کے بڑے احسانات ہیں "
مرزا ۔ " مثلاً "
بیگم ۔ " مثلاً یہ کہ اس کی حکومت نے مہنگائی بھتہ بڑھا بڑھا کر تمہاری تنخواہ اتنی کر دی کہ تم اب اپنی تنخواہ چار لوگوں کے آگے بیان کرتے ہو ورنہ یاد ہے اسم نویسی میں تم کو تنخواہ کے ساتھ اوپری آمدنی کا ذکر بھی کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی احسان ہیں، اب جانے دیجئے ۔"
مرزا ۔" واہ ۔ جب ذکر شروع کیا ہے تو اور بتاؤ ۔"
بیگم " اور یہ کہ اوپری آمدنی والے ان کی حکومت میں ہی محفوظ ہیں ورنہ "
مرزا بیگم پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ پھر کھٹکا ہوا۔ مرزا باہر نکلے تو دیکھا لمبا چوڑا ساحلی آندھرا کا کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ تلگودیشم امیدوار ہے ۔
مرزا نے کہا۔" اے بھائی تمہاری پارٹی کی حکومت نے تو مقدمے ہارنے کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے NTR کا ذکر گنیز بک میں ضرور آئے گا !
امیدوار نے کہا " نہیں صاحب ! ایک ہلمٹ کا مقدمہ غلطی سے جیت گئے نا ۔ مگر پھر بھی NTR شملہ باندھنے والا ایک ہی چیف منسٹر کہہ کر گنیز بک میں آسکتا ہے ۔"
مرزا بھی گریٹ آدمی تھے ، دوستوں کا خیال تھا کہ جس مٹی سے مرزا بنے تھے اگر اس سے مرزا کو نہ بنایا جاتا تو اور کچھ نہ بن سکتا تھا ۔ وہ اتنے شدید دیش بھگت تھے لوگ انھیں CIA کا آدمی سمجھتے تھے ۔ مرزا کا مزاج شروع سے سیاسی رہا تھا۔ جب وہ اکیس سال کے ہوئے تھے تو والد بزرگوار سے سوال کیا تھا " ابا جی ۔ سیاست کسے کہتے ہیں اس کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں . . . . اگر ہو سکے تو مثالوں اور تصویروں سے سمجھائیے "
اُن کے والد نے کہا تھا " بیٹے ! سیاست ایک بے رنگ ، بے بو اور بے مزہ چیز ہے جو ہوا سے ہلکی ہوتی ہے ۔ لیکن جب کسی جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی میں رنگ ، خوشبو اور مزہ ہی مزہ بھر دیتی ہے اور آدمی کو وزنی بھی کر دیتی ہے " چالیس سال کی عمر کو پہونچتے پہونچتے مرزا کا سیاسی دماغ پک کر تیار ہو گیا اور الیکشن کا اثر اُن پر ایسا ہوتا کہ حالت دگرگوں ہو جاتی ۔ وہ گھنٹوں مختلف پارٹی کے امیدواروں کے بارے میں سوچتے رہتے ۔ بعض وقت کوئی آزاد امیدوار ٹی وی کے اشتہار کی طرح اُن کی سوچ کو توڑ دیتا ۔
مرزا کی ذہنی الجھنوں کا اثر اُن کے دفتری کام پر بھی پڑتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے کششی یار لوگوں سے

رشوت لے لی تھی لیکن اُن کا کام نہیں کیا تھا خیر یہ تو اتنا "سیریس" (Serious) معاملہ نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے غضب یہ کر دیا کہ کئی لوگوں سے رشوت لے لی لیکن کام کرنا بھول گئے جس سے دفتر کے لوگ بدگمان ہو گئے تھے سمجھے کہ مرزا سب کا حصہ دبا گئے۔

اتوار کو الکشن تھا مرزا نے جمعہ کی شام سگریٹیں پھونک پھونک کر الجھن میں گزاری۔ ہر پارٹی کو تولتے جاتے لیکن جب بھی کسی نتیجہ پر پہنچتے ایک آزاد امیدوار ایک اوتار کی طرح ذہن میں کود پڑتا جس نے مرزا سے صرف اتنا کہا تھا۔ "مرزا صاحب اگر میں منتخب ہو گیا تو آپ کے گھر کے سامنے ہیلوجن لائٹ لگوادوں گا جس کا منہ آپ اپنے صحن کی طرف بھی موڑ سکیں گے۔ مرزا کا خیال تھا کہ یہ آفر irresistable تھا۔

ہفتہ کی شام مرزا نے الماری سے وہ شاندار شیروانی اور اونچی ٹوپی نکالی جو انہوں نے فلم مغل اعظم کی ریلیز پر پہنی تھی۔ یہ دیکھ کر بیگم نے پوچھا "یہ کیوں؟ .... کیا محبت اور خدا ریلیز ہو رہی ہے؟"

مرزا نے بیگم کو گھور کر دیکھا اور کہا "کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اس قدر شان سے ووٹ دینے جاؤں کہ جاہل لوگ بھی ووٹ کی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔"

اتوار کی صبح مرزا جیسے ہی رکشہ سے اُترے، اُن کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور ٹوپی دیکھ کر ایک مسلم پارٹی کے ایجنٹ لپکے۔

"آپ تو خیر اپنی پارٹی ہی کو ووٹ دیں گے۔"

مرزا نے ڈانٹا۔ "مسٹر! یہاں کینوسنگ جرم ہے۔"

ایک نوجوان نے پوچھا "چچا۔ شیروانی کے اندر کرتہ ہے؟"

مرزا نے صرف گھور کر دیکھا لیکن اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "چچا! میرا مطلب ہے۔ آپ شیروانی اتار کر بھی ایک ووٹ ڈال سکتے ہیں۔ اگر اندر کرتا ہو تو۔"

مرزا اس جملے کی وجہ سے جمہوریت سے مایوس ہونے لگے تھے کہ ایک مسٹنڈے نے ایک طرف پان تھوک کر کہا "ووٹ ڈالنے کے بعد، ہماری پارٹی کی کار آپ کو گھر پہنچا دے گی۔"

مرزا غرائے۔ "وہ کیوں؟"

وہ آنکھ مار کر بولا "آپ گھر پہنچ کر شیروانی بھجوا دیجئے، تھوڑے ووٹ ڈلوانے ہیں، تو لڑکوں سے۔"

مرزا چیخے "آپ بوگس ووٹ ڈالیں گے؟"

ایک ہندو لڑکے نے دوسرے سے کہا "یار! اس کو دونوں طرف سے پہنتے شاید"

اس نے کہا "نہیں۔ لیکن اس کو کم عمر لڑکوں کو پہنا کر لیڈیز کے ووٹ ڈلوا سکتے ہیں۔"

مرزا ان حالات سے گذر کر جوں توں پولنگ بوتھ کے اندر تک پہنچے۔ اُن کی وضع قطع دیکھ کر پولنگ اسسٹنٹ سمجھا کوئی مغلوں کا آثار آ گیا ہے۔ جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔

مرزا نے کہا۔ "میں ووٹ دینا چاہتا ہوں۔"

اسسٹنٹ نے نام، پتہ اور عمر پوچھی اور رجسٹر میں تلاش کرنے لگا، پھر ڈرتے ڈرتے کہا "سر! آپ کا

ووٹ تو پڑ چکا ہے۔"

مرزا چلائے "کیا کہا، پڑ گیا، کس نے ڈالا۔ آپ کیا کر رہے تھے۔ آپ کے آفیسر کو بلاؤ۔"

شور سن کر پولیس اور پولنگ آفیسر آ پہنچے۔ مرزا نے اُن کو حالات سے آگاہ کیا اور دھمکی دی۔ پولنگ آفیسر نے کہا: کوئی بات نہیں صاحب۔ آپ جتنے چاہے ووٹ ڈال لیجئے۔ بہت ووٹ ہیں ہمارے پاس (پھر اسسٹنٹ سے کہا) - ارے بزرگ آدمی ہیں ووٹ ڈال لینے دے بھائی۔"

کسی نے پھبتی کسی "شاید ان کا آخری ہو یہ سسٹم۔"

مگر مرزا نے ووٹ ڈالنے سے انکار کیا اور پولنگ بوتھ سے باہر نکل آئے۔

گھر پہنچے تو بیوی کسی پارٹی کے رکشہ سے اتر رہی تھی اور خوشی سے پھولی نہ سمائی ہوئی بولی "آپ ووٹ ڈال آئے۔ میں نے تو تین ووٹ ڈالے"

مرزا کچھ نہ بولے شیروانی اتاری تھی کہ کھٹکا ہوا۔ "صاحب! ریڈی صاحب شیروانی منگوا رہے ہیں۔"

بیوی نے معنی خیز انداز میں شوہر سے سوال کیا۔ "کیا ہوا۔ اور شیروانی کا کیا قصہ ہے۔"

"یہ تمہاری نہیں ہے۔"

U.A.E (متحدہ عرب امارات) کا ویزا

خوشخبری

اُن مسافروں کے لئے جو نہ صرف اپنے دوست احباب، رشتہ داروں سے ملنے کیلئے جو U.A.E میں مقیم ہیں بلکہ اُن سیاحوں کیلئے بھی جو متحدہ عرب امارات کے سات خلیجی ریاستوں (دوبئی، ابوظہبی شارجہ، اجمان، فوجیرہ، راس الخیمہ، ام القوین) کی سیر و تفریح کے علاوہ سامان کی خرید و فروخت کیلئے جانا چاہتے ہوں اُن کے لئے 7 تا 15 دن کے ویزوں کا بندوبست معہ قیام و طعام نہایت ذمہ داری سے کیا گیا ہے۔ جو حضرات U.A.E. میں اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کے ہاں بھی رہنا چاہیں تو بخوشی رہ سکتے ہیں۔ مزید تفصیلات کیلئے حسب ذیل پتہ پر ربط پیدا کریں۔

بہترین سروس مکمل آرام:

مظہر ٹراویلس

مظہر منشن۔ 3-6-293/4

حیدرگوڑہ۔ حیدرآباد۔ فون۔ 235084

(وزارت امور خارجہ حکومت ہند کا مسلمہ ٹراویل ایجنٹ)

حکیم لقمان کی نصیحت

(اپنے شاعر فرزند کے نام)

ملے تجھے نہ ملے سر، کُلاہ پیدا کر　　　کتاب "بعد میں لکھ" پہلے رسمِ اجرا کر
غزل کہے گا بھلا کیسے قافیے کے بغیر　　　لغت سے ڈھونڈ کے کچھ قافیے اکٹھا کر
پری کو شعر کی پھر قافیے کے شیشے میں　　　اُتار اور ردیفوں کو چھوڑ چمکا کر
بنا صنائع بدائع کا اک طلسم کدہ　　　کہیں سے ڈھونڈ کے تشبیہیں نت مہیّا کر
بڑا سہارا ہے تیرا ضلع جگت بیٹا　　　اسی سے شعر کے جن کو جکڑ کے رکھا کر
پکڑ کے لفظوں کو کٹھ پتلیوں کا ناچ دکھا　　　سخن کی ڈور پہ نٹ کا کوئی تماشا کر
پھر اس کے بعد ترنّم کے زور پر چھا جا　　　ہلا کے رکھ دے زمیں آسماں کو چلّا کر
ہے بننا کچھ تو چڑھی مار بن تخیّل کا　　　ستارے توڑ کے لا آسمان پر جا کر
زمیں پہ گھاس ہے، کیڑے ہیں سانپ بچھو ہیں　　　زمیں پہ چلنے سے پرہیز سخت بیٹا کر
اگرچہ بحر میں تو شعر پڑھ نہیں سکتا　　　مگر رسالوں میں شعر اپنے چھوڑ چھپوا کر
ہر ایک شعر میں بھر ریت دھوپ سایہ سراب　　　یہ شاعری کے لوازم ہیں، ان کو پورا کر
سفر سرابوں کا تیرے لیے ضروری ہے　　　ملے نہ ریت تو پھر تُو جیے گا کیا کھا کر
پھر اس کے بعد مدیروں کی جوتیاں بھی اٹھا　　　اور اپنے پیٹ کو بھر اُن سے گالیاں کھا کر

تب اپنے وقت کا ٹھہرے گا میرؔ و غالبؔ تو
فراقؔ و فیضؔ تو، اور افتخار جالبؔ تو!

ستّر ہزار کا

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

نسخہ ہے آزمودہ یہ جاڑا بخار کا
بیمار کو پلائیے شربت انار کا

بھائی کو دعوتوں کا بہت شوق ہے جناب
چرچا ہے رشتہ داروں میں اِن کی ڈکار کا

قابو میں باپ کے نہیں اولاد آج کل
شاید نتیجہ ہوگا یہ اماں کے پیار کا

صاحب کو چھوٹی مچھلیاں بے حد پسند ہیں
ہے شوق نوجوانی سے ان کو شکار کا

میک اپ کا ہے رواج حسینوں میں آجکل
اب دَور ختم ہوچکا سولہ سنگھار کا

ویسے چمک رہا ہے کلر دُور سے مگر
ماڈل پُرانا ہوچکا صاحب کی کار کا

سچ بات بے خودی میں وہ کہتا ہے دوستو
اب اعتبار کیجئے بس بادہ خوار کا

اب شہری لوگ دوسرے درجے پہ آگئے
ہر بات میں لحاظ ہے پہلے گنوار کا

یہ جو خزاں کے بعد خزاں ہی کا دَور ہے
کیا انتقال ہوچکا فصلِ بہار کا

خود مجھ کو اعتماد نہیں اپنے آپ پر
کیا اعتبار بھائی کے قول و قرار کا

میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں مجھے خود نہیں پتہ
شاعر بنا ہوا ہوں فقط اشتہار کا

شاعر کا گرم چائے سے جی مت جلائیے
گر ملے اب پلائیے شربت انار کا

ہم نے بھی لاٹری کا لیا تھا ٹکٹ ظریفؔ
انعام پایا خواب میں ستّر ہزار کا

غزل

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

شیخ جی لوگوں سے چھُپ کر روزہ بہلانے گئے
لوگ سمجھے وہ نہانے کو غسل خانے گئے

یوں ہمارے سر کے اُوپر سینگ تو ہرگز نہیں
کس طرح لوگوں نے جانا، کیسے پہچانے گئے؟

چونکہ ہم کو اپنے گھر کا راستہ ملتا نہیں
اِس لئے ہم گمرہوں کے رہنما مانے گئے

قوم کے پیسے سے جب کوٹھی بنالی پانچویں
تب کہیں وہ قوم کے سردار گردانے گئے

میرے بستر میں جو بیگم ڈھونڈنے جھمکا گئیں
میں نے جو پیسے چھپا رکھے تھے سرہانے گئے

ہم گئے تھے تاکہ اُن کی پھول سی باتیں سُنیں
وہ مگر سمجھے ہم اُن کی گالیاں کھانے گئے

"اسلام علیکم!"

"خیریت!"

یہ سلامتی اور خیریت کے کلمات میرے نہیں، افسانہ نگار عاتق شاہ صاحب کے ہیں. دوست احباب کسی ہوٹل کے قریب یا کسی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے ہوئے بات چیت میں مصروف ہوں، اور ایسے میں عاتق شاہ گھومتے گھامتے کہیں سے آدھمکیں تو اُن کے منہ سے پہلے پہل یہی کلمات نکلتے ہیں. ایسے موقع پر اگر کوئی قسمت کا مارا بننا شروع کر دے یا ڈینگیں مارنے لگے تو پھر عاتق شاہ سے چپ نہیں رہا جاتا. ان کی خود ساختہ فوجی رگ بے ساختہ پھڑک اُٹھتی ہے. اُس وقت اُس شخص کی خیریت اِسی میں رہتی ہے کہ وہ "ذہنی نامہ" لکھ دے. یا پھر خندہ پیشانی سے اپنی پسپائی کو تسلیم کرلے. ایسے پوزیشن پر میں نے بعض خود ساختہ دانشوروں کو "ضرورت" کا بہانہ بنا کر موقع واردات سے کھسکتے دیکھا ہے. اس کے برعکس اگر موقع واردات پر موجود سبھی لوگ نارمل قسم کے انسان ہوں تو پھر عاتق شاہ بقول اُنھیں کے "حریر و پرنیاں" بن جاتے ہیں. "حریر و پرنیاں" والی اصطلاح عاتق شاہ نے گڑھی ہے یا کہیں سے لی ہے یہ مجھے نہیں معلوم. میں نے یہ محاورہ سوائے عاتق شاہ کے کسی اور کے منہ سے نہیں سُنا. اور جب بھی سُنا، خوب لطف اندوز ہوا. مگر عاتق شاہ سے اُس کے معنی پوچھنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی. ہر بار یہی

مسیح انجم (ٹماکہ)

فیلڈ مارشل عاتق شاہ

سوچ کر خاموش رہا کہ "حریر و پرنیاں" کے معنی پوچھ کر "حریرہ" کیوں بنوں؟

اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ وہ مبارک دن اور نیک ساعت کونسی تھی جب عاتق شاہ سے میری ملاقات ہوئی تھی. البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ان سے دوستی کے بعد دوست احباب میری خیر خیریت بہت زیادہ ہی دریافت کرنے لگے تھے. اُس وقت مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں عاتق شاہ سے قریب نہیں ہو رہا ہوں بلکہ ایک قدیم اور پُراسرار عمارت میں داخل ہونے کی حماقت کر رہا ہوں. ایک دوست کو تو اس حد تک تشویش لاحق ہوگئی تھی کہ ایک روز سڑک پر اس نے مجھے پکڑ ہی لیا:

"کہو کیا حال ہے؟ عاتق شاہ سے کیسی نبھ رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا "سب ٹھیک ٹھاک ہے! ابھی ابھی عاتق شاہ صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر لوٹ رہا ہوں!"

اُس نے اچنبھے کا اظہار کیا "حیرت ہے، ویلن نے کھانا کھلایا ہے! میں تو "ڈشم، ڈشم" کی توقع کر رہا تھا!"

ہاں تو میں عاتق شاہ سے اپنی ابتدائی ملاقاتوں کا ذکر کر رہا تھا. جوں جوں عاتق شاہ سے دوستی بڑھتی گئی، ویسے ویسے مجھ پر یہ راز کھلتا گیا کہ ایوزیشن والوں نے شاہ صاحب کے بارے میں جو افواہیں پھیلا رکھی ہیں، وہ ساری کی ساری غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں. ویسے اس میں تھوڑا سا قصور عاتق شاہ کے کھرے مزاج اور کھردرے لہجے کا

بھی ہے۔ ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار ؛ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں

عاتق شاہ سے میری دوستی کوئی دس سال پرانی ہوگی۔ دس سال پہلے اُن کی عمر جہاں ٹھہری ہوئی تھی آج بھی وہیں ٹھہری ہوئی ہے۔ اُن کی عمر ایک معمّہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

حال حال تک عاتق شاہ کلین شیور رہنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ لیکن اب انھوں نے موچھوں کو پنپنے کا موقع عطا کیا ہے۔ اور موچھیں بھی کیسی ؟ ۔ لمبی اور گھنی! جب عاتق شاہ چائے پیتے ہیں تو ان کی موچھیں بھی چائے نوشی میں شریک ہو جاتی ہیں۔ (کبھی کبھار شریکِ طعام بھی ہو جاتی ہوں گی۔) دراصل یہ اُن کی "موچھ نوازی" نہیں "ذرہ نوازی" ہے۔ اگر داڑھی کو پنپنے کا موقع عطا کرتے تو یقیناً مولانا عاتق شاہ کہلاتے۔ (یہ موقع ابھی ہاتھ سے نہیں گیا) اس حقیر و فقیر نے اس جانب عاتق شاہ کو توجہ بھی دلائی۔ اور سند کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حالی کا حوالہ بھی دیا۔ سن کر آگ بگولہ ہو گئے۔ اس بندۂ پُر تقصیر نے فوراً معذرت چاہی۔ اور عرض کیا۔

ع خطا وار ہوں میں، جزا چاہتا ہوں

مصرعہ سُن کر فوراً ہوٹل لے گئے۔ چائے پلائی۔ اور سزا تجویز کی کہ "بل" میں ادا کروں۔ تب فرمایا :

"آج کل داڑھی والے بدنام ہیں۔ میں یہ بدنامی مول لینا نہیں چاہتا" یہ سن کر بے اختیار میرا ہاتھ اپنی داڑھی کی طرف چلا گیا۔ لیکن اس حرکت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

ان دنوں عاتق شاہ موچھوں کی وجہ سے "فیلڈ مارشل" قسم کی ڈراؤنی مخلوق نظر آنے لگے ہیں۔ انھوں نے جس دن سے اپنی موچھیں بڑھائی ہیں، شہر میں اُن کی موچھیں موضوعِ سخن بنی ہوئی ہیں۔ چونکہ میں عاتق شاہ کا قریبی دوست ہوں اس لئے اُن کے بہت سے ساتھی مجھے پکڑ پکڑ کر اُن کی موچھوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ جیسے وہ موچھ نہ ہوں، عاتق شاہ کے بال بچے ہوں۔ خیریت تو بیوی اور بال بچوں کی پوچھی جاتی ہے۔ موچھوں کی نہیں۔ معقول لوگوں کی ایسی ہی نامعقول باتوں پر عاتق شاہ بھڑک اُٹھتے ہیں۔

کسی زمانے میں عاتق شاہ صرف ایک عینک لگاتے تھے۔ اب وہ اپنے ساتھ دو عینکیں رکھنے لگے ہیں ایک گھر سے نکلتے وقت لگانے کے لئے۔ اور دوسری لکھنے پڑھنے کے لیے۔ خدا وہ دن نہ لائے جب دو عینکوں کو ڈھونڈھنے کے لئے عاتق شاہ کو تیسری عینک کی ضرورت پڑے۔

عاتق شاہ کے داڑھی نہ رکھنے کے عمل سے آپ اس غلط فہمی میں مُبتلا نہ ہوں کہ عاتق شاہ صرف اعداد و شماری کے مسلمان ہیں۔ بھلے ہی وہ نماز نہ پڑھیں لیکن عقیدے کے وہ بڑے پکے ہیں۔ کوئی اُلجھن آپڑے تو یہی کہیں گے کہ اللہ بہت بڑا ہے۔ کوئی بگڑا کام بن جائے تو کہیں گے کہ کملی والے کا صدقہ ہے۔ اس سے آگے اُن سے یہ مت پوچھئے کہ دُعائے قنوت کب پڑھی جاتی ہے ؟ اور سجدہ سہو کب لازم ہوتا ہے ؟

سُنا ہے کہ عاتق شاہ کسی زمانے میں کثرت سے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن ہارٹ اٹیک کے بعد ڈاکٹروں نے ان کی سگریٹ نوشی پر پابندی لگا دی ہے۔ چنانچہ عاتق شاہ نے منہ میں زردے کا پان کھانا شروع کیا ہے۔ اور زردہ بھی کونسا ؟ ۔ راج رتن چھینٹا! میں نے پان کی گنتی تو نہیں کی ہے۔ البتہ میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک کام چور نوکر دن بھر میں اپنے مالک کی جتنی گالیاں کھاتا ہے، عاتق شاہ دن بھر میں اُتنے ہی

پان کھاتے ہیں۔

پیسوں کے معاملے میں عاتق شاہ بڑے محتاط رویّے کے حامل ہیں۔ فضول خرچی کے وہ قائل نہیں اور نہ وہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔ "عاتق شاہی اسکیم" کے تحت اپنی کتاب کی اڈوانس بکنگ کروائی ہوئی رقم کو وہ ایک ایسے "چور جیب" میں رکھتے ہیں جس کا تصوّر اگر پاکٹ ملیر کریں تو اُن کے تصوّر کے پَر جل جائیں۔ میں یہاں ریزگاری کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری مراد نوٹوں سے ہے۔ نوٹوں کو نکالنے کے لئے وہ سب سے پہلے اپنے پینٹ کا بلٹ کھولیں گے۔ پھر پتلون کو ذرا ڈھیلا کریں گے۔ اس کے بعد بنیان کے نچلے حصّے کو اُوپر کھینچیں گے۔ تب آپ کو بنیان کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا "چور جیب" سیا ہوا نظر آئے گا۔ اُس کے اندر سے ایک پلاسٹک کور برآمد کریں گے۔ اس کور کے اندر کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پرس ہوگا۔ اس پرس کے اندر مزید کچھ کاغذات ہوں گے۔ اور اُن کاغذات کے اندر بڑے سلیقے سے تہہ کئے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ یہ ہے عاتق شاہ کا "لاکر" (LOCKER) ہے کوئی بینک جو اس قسم کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا لاکر (LOCKER) مہیا کرے!

عاتق شاہ کی ذات سے کسی انڈسٹری کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ ہو، مگر فلم انڈسٹری کو زبردست فائدہ پہنچا ہے۔ وہ فلموں کے بڑے دلدادہ ہیں۔ شاید ہی کوئی فلم ان سے چھوٹتی ہو۔ میں اگر ساتھ رہوں تو عاتق شاہ جنتا کلاس کو عزت بخشتے ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ساتھ ہوں تو رائل کلاس منتخب کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ ایک سرکش اور کنگ سائز افسانہ نگار، ایک میڈیم سائز ڈاکٹر کے قابو میں کیوں اور کس طرح آ گیا؟ شاید کمال صاحب نے عاتق شاہ کو کچھ گھوٹ کر پلایا ہو۔

جب فلموں کی بات چل نکلی ہے تو میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ عاتق شاہ اُس ٹاکیز میں جانا پسند کریں گے جو اُن کی ناک کی سیدھ میں واقع ہو۔ اگر ٹاکیز سڑک کے دوسرے کنارے ہو اور عاتق شاہ کو سڑک پار کرنی پڑے تو اُن کے سڑک پار کرنے کرنے تک شو (SHOW) بدل جاتا ہے۔ اور اگر سکنڈ شو ہو تو تاریخ بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ عرض کرنا یہ ہے کہ سڑک پار کرنا، عاتق شاہ کے بس کی بات نہیں۔ اُس وقت عاتق شاہ کی ساری "فیلڈ مارشلی" دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اور وہ بالکل ایک برخوردار اور اطاعت گزار قسم کی مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں۔

تھیٹر میں داخل ہونے کے بعد وہ پھر سے فیلڈ مارشل بن جاتے ہیں۔ اور پھر مونگ پھلی کھاتے ہوئے مختلف ریمارکس پاس کرنے لگتے ہیں۔ فلم اگر جاندار ہو تو ہر اچھے سین کے ساتھ ساتھ ٹکٹ کے پیسوں کی فرضی واپسی کا اعلان شروع کر دیتے ہیں۔ اُس اعلان پر ہراج خانے کی بولی کا گمان ہوتا ہے:

"واہ! چار آنے واپس کیا!"
"اب تو آٹھ آنے واپس ہوسے؟"
"ڈیڑھ روپیہ واپس کیا، ابھی ڈیڑھ روپیہ باقی ہے!"
"تین روپے واپس ہو گئے!"
"ٹکٹ کے پورے پیسے واپس ہو گئے!"

ایک بار میرے بازو بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے:

"بھائی صاحب! وہ کون ہے جو اُن کے پیسے واپس کئے جا رہا ہے؟ مگر ہمارے پیسے واپس نہیں کرتا!"
تو یہ ہیں عاتق شاہ کے فلم دیکھنے کے انداز۔ اور یہی ان کی واحد تفریح ہے جہاں وہ کچھ دیر کے لیے فلمی نقاد بن جاتے ہیں۔ فلم سنسر بورڈ کی رکنیت کے لئے عاتق شاہ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔
لکھتے وقت ہر ادیب کی نشست و برخواست کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ انگریزی کے ایک ادیب کے بارے میں میں نے پڑھا ہے کہ وہ لکھتے وقت سڑے ہوئے سیب سونگھا کرتا تھا۔ اُسے سڑے ہوئے سیب کی بو بڑی مرغوب تھی۔ لیکن جب عاتق شاہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اگربتی جلا کر اطراف کی فضا کو معطر کر دیتے ہیں۔ پہلی بار جب میں نے اُنھیں اگربتی کو جلاتے اور فضا کو معطر کرتے دیکھا تو یہ سمجھا کہ وہ فاتحہ پڑھنے والے ہیں اور فاتحہ ختم کرتے ہی تبرک پیش کریں گے۔ یہ میری خوش فہمی تھی۔ عاتق شاہ تخلیقی عمل کو ایک نیک اور خوشگوار فریضہ کے طور پر انجام دیتے ہیں۔

عاتق شاہ کوئی چالیس برس سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اُن کے ساتھ جو ترقی پسند شاعر اور ادیب اُبھرے تھے ان میں سے چند تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور چند ابھی ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ اور چند راہِ راست پر آ کر اللہ اللہ کر رہے ہیں لیکن عاتق شاہ ہیں کہ چھیل چھبیلے بنے ہوئے شہر میں گھوم رہے ہیں۔ سڑکوں پر پھر رہے ہیں۔ لڑائیاں لڑ رہے ہیں۔ فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ عاتق شاہ نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ غفلت سے پڑ جانے والی پہلی نظر جائز ہوتے کے باوجود عورتوں کو گھورنے کا جواز نہیں پیدا کیا۔ لوگ حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیسا ترقی پسند افسانہ نگار ہے؟ میرا خیال ہے کہ اگر ترقی پسند سارے کے سارے عاتق شاہ قسم کے ہوتے تو ترقی پسند تحریک کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا۔

بعض اوقات عاتق شاہ کے پُرانے ترقی پسند ساتھی، جن کے پاس حاضری دے دے کر عاتق شاہ نے اُن کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں مجھ سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ بھئی آجکل عاتق شاہ کیوں نہیں آ رہا ہے؟ میں تو کچھ جواب نہیں دے پاتا۔ البتہ یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر کب تک آتا رہے گا عاتق شاہ؟۔ چالیس سال سے تو وہ مسلسل آ رہا ہے۔ مزاج پُرسی کر رہا ہے۔ عیادت کر رہا ہے تسلی دے رہا ہے۔ دل بڑھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کسی شاعر یا ادیب کی موت پر جب اُس کے دوست احباب جنازے میں شرکت کو فرضِ کفایہ جان کر انجان بن جاتے ہیں، وہ فرضِ عین جان کر شرکت کر رہا ہے۔ قبر پر پھول چڑھا رہا ہے۔ پسماندگان کو پُرسہ دے رہا ہے۔ آخر وہ کب تک یکطرفہ دوستی کا ثبوت دیتا رہے گا۔ دوستی اور محبت کا شعلہ تو دونوں طرف بھڑکنا چاہیئے۔ شعلہ نہ سہی، ڈھونگ ہی سہی، ڈرامہ ہی سہی!

یوں تو عاتق شاہ اردو کے لیکچرر ہیں لیکن اُن کی ذات میں ایک فوجی چھپا بیٹھا ہے۔ اور یہ فوجی کب سے چھپا بیٹھا ہے اور کیوں چھپا بیٹھا ہے اور اس کی ٹریننگ اور تربیت پر عاتق شاہ نے کتنی رقم خرچ کی ہے؟۔ یہ ساری تفصیلات یقیناً عاتق شاہ کے (Confidential Record) کنفیڈینشل ریکارڈ میں محفوظ ہوں گی۔ جبھی تو عاتق شاہ نے اُس فوجی کو پروموشن دے کر "فیلڈ مارشل" کے عہدے سے نوازا ہے۔ یہ اُن کی خود شناسی نہیں، جوہر شناسی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ پہلی ملاقات میں عاتق شاہ کسی پہلو سے بھی افسانہ نگار دکھائی نہیں دیتے۔ البتہ فیلڈ مارشل قسم کی مخلوق ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا اصرار بھی یہ

ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھی انھیں "فیلڈ مارشل" کے نام سے مخاطب کریں۔ میں نے آج تک عاتق شاہ کو فیلڈ مارشل کے نام سے کبھی مخاطب نہیں کیا۔ لیکن آج، اس بھری پُری محفل کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے حضار محفل کے روبرو عاتق شاہ کو "فیلڈ مارشل" کہنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور اُن کی اَدبی کاوشوں اور کامرانیوں کو سیلوٹ کرتا ہوں کیوں کہ یہی "فیلڈ مارشل" عاتق شاہ کی تصانیف اور افسانوں میں مجھے رواں دواں نظر آتا ہے۔

●●

یہ خاکہ ممتاز افسانہ نگار عاتق شاہ کی گیارہویں تصنیف "دومنٹ کی خاموشی" کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا۔

دُلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے ٹن ٹینڈ دوپٹہ!
دلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے۔ایچ۔زری والا
کا ہوگا

اس کے علاوہ
ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک:۔ بنارسی سلک ساڑیاں ● تنچوی ● ساٹن ● جارجٹ ● آرگنزا ● ٹشو ● شفان ● پٹولہ ● بروکیڈ ● دھرماورم ● کانجی ورم ● پوچم پلی ● نارائن پیٹ ● میسور کریپ ● ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل۔
خصوصی کاؤنٹر میاچنگ کے لیے بلوز، دوپٹہ، کرتے اور فالس۔
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا!

اے۔ایچ۔زری والا

لاڈ بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
کیبل "زری والا"

فون:
525232

میر حسین علی امام
حیدرآباد (سندھ، پاکستان)

ب سے بیوی

ب سے بیوی اور ب سے بچے الف کے بعد ب سے بہت کچھ ہے اور ب کے بعد بھی بہت کچھ! لیکن جس کے پاس بیوی ہے اس کے پاس کچھ بھی نہیں اور اگر کچھ ہوگا بھی تو وہ یقیناً بچے ہوں گے اور بیوی بچے سب موجود ہوں تو وہ خود نہیں بچے گا۔

کہتے ہیں کہ ب سے بیوی کہنا لکھنا پڑھنا آسان ہے لیکن بیوی لانا مشکل بلکہ نہایت مشکل ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے شہروں میں بچے پندرہ سولہ سال کی عمر میں سن بلوغ کو پہنچتے ہیں اور ۲۵ تا ۳۰ سال کی عمر میں شادی کرتے ہیں یعنی دس تا پندرہ سال بیوی کے لئے انتظار اور کوشش کرتے ہیں تب بیوی لے آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بیوی کا نہیں لانا افسوس کا باعث اور بیوی کا لانا پچھتانا ہے جس شخص کی بیوی نہیں ہوتی ہے دوست احباب اُسے تنگ کرتے ہیں اور شادی کرنے پر اور بیگم والے صاحب پر اکساتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں جس نے شادی کی وہ بھی پچھتایا اور جس نے نہیں کی وہ بھی پچھتایا۔ پس پچھتانا مردوں کی زندگی ٹھہرا، کئی دو دو شادیاں کرکے پچھتاتے ہیں اور اکثر ان سے سبق سیکھ کر پچھتانے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے شادیاں کرتے ہیں اور بیویاں لاتے ہیں۔

ایک صاحب ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ شادیاں کروں گا تو چار یکے بعد دیگرے کروں گا ہم دوست احباب انھیں مشورے دیتے کہ پہلی شادی تو کرو بعد میں چار کرنا! سنا ہے کہ ان صاحب نے ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق شادی کرلی اور بیوی والے ہوگئے۔ جب دوست احباب ان سے دریافت کرتے کہ بقیہ تین کا پروگرام کتنے پنج سالہ منصوبوں میں پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو وہ فرمانے لگے ایک شادی اور ایک بیوی زندگی بھر کے لئے کافی ہے بلکہ آدم و حوا کی ایک شادی ہی کائنات کے لیے کافی تھی اب ہم انھیں کہتے ہیں کہ ایک بیوی پر کیا قناعت شریعت میں چار کی گنجائش ہے۔ ایک صاحب خواجہ حسن نظامی کے پاس پہنچے اور دوسری شادی کی اجازت مانگی آپ نے فرمایا دوسرا امکان نہ ہو۔ وہ صاحب گئے اور ایک سال بعد آئے اور کہنے لگے خواجہ صاحب دوسرا مکان بن گیا۔ نے تعبیر کر ڈالی [illegible] دوسری شادی کی اجازت دیں۔ خواجہ صاحب نے دوسری شادی کا لفظ سن کر

کہا تیسرا مکان بنا اس پر وہ شخص چونک سا گیا اور عرض کی کہ دو بیویوں کے لیے دو مکان والی بات تو سمجھ میں آتی ہے یہ تیسرا مکان کیوں؟ تو خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر دونوں بیویوں نے تجھے اپنے اپنے مکانوں سے بھگا دیا تو کیا ہوگا؟ تیرے لیے بھی تو مکان چاہیئے! تیرا مکان تعمیر ہوا یا نہیں، اس شخص نے دوسری شادی کی یا نہیں ہمیں نہیں معلوم، ہمیں یہ معلوم ہے کہ ایک اچھی سلیقہ شعار، غم گسار بیوی ہمیشہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔

ہر شخص حسب توفیق اور حسب استطاعت بیویاں رکھتا ہے۔ زیادہ تر لوگ ایک ہی بیوی پر قناعت و توکل کرتے ہیں اور بعض کے لیے ایک بیوی بھی بہت ہوتی ہے پہلے زمانے میں بیویاں رکھنے کا رواج کچھ زیادہ ہی چلا تھا۔ غالباً اُس وقت کی فیشن پرستی میں داخل تھا۔ محل، و حرم بنائے جاتے تھے۔ مختلف ممالک کی خواتین سے شادیاں کرکے حرم میں داخل کیا جاتا تھا۔ آج بھی عرب ممالک میں یہ ہوتا ہے۔ ادب میں بھی بیوی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے عظیم بیگ چغتائی کی شریر بیوی تو نہایت مشہور ہے سگھڑ، سلیقہ شعار، صفائی پسند بیوی میاں کا دل موہ لیتی ہے جبکہ پھوہڑ، بدسلیقہ، بدمزاج بیوی گھر میں خرابی کا باعث بنتی ہے اور نذیر احمد کی جنوبی اور سوکن کا راز ایسی کہانیوں کا باعث!

ادب میں یا کسی ٹی۔ وی ڈرامہ میں کسی ایک فیصد شوہر کو بیوی سے ڈرتا دکھایا جاتا ہو تو لوگ خوب ہنستے ہیں اور جب ننانوے فیصد بیویوں کو شوہروں کے ہاتھ پٹتے، مار کھاتے، سختیاں جھیلتے دکھایا یا پیش کیا جاتا ہے تو چپ رہتے ہیں! بیوی سے ڈرنے والا شوہر ہنسی کا باعث، شوہر کے ہاتھوں چکی پسنے والی عورت مظلوم، بیوی کا شوہر ہنسی خوشی زندگی گزاریں اور مل جل کر کام کریں تو وہ ناپسندیدگی اور حسد کا موجب اور کبھی کبھار تباہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی — یہ معاشرتی المیہ ہے۔

مشہور انگریز شاعر ولیم شیکسپیئر کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ شادی کی رات بیوی کی صورت دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔ ہمیں حیرت یہ ہوتی ہے کہ تاریخ میں ان کروڑوں جیالوں کا نام نہیں آتا ہے جو شادی کی رات بیوی کی صورت دیکھ کر نہیں بھاگتے ہیں بلکہ عمر بھر محاذ پر قائم رہتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں پاک و ہند تعلقات بہتر ہوئے اور دونوں ممالک کے درمیان راستے کھل گئے۔ جب بھی کوئی شخص عزیزوں سے ملنے بھارت جاتا ہے، دوست احباب اس سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا شادی کا ارادہ ہے؟ کیا بیوی لانے کا پروگرام ہے؟ گویا بھارت نہ ہوا، بیویوں کی بارہ مارکیٹ ہوئی یا شادیوں کا FREE PORT سیانے لوگوں کا کہنا ہے کہ مہینے کے ہر ہفتہ پر بیوی کا موسم و مزاج بدلتا رہتا ہے مہینہ کی ابتداء یا تنخواہ کی آمد پر میاں کی آؤ بھگت و سواگت بانہوں کے ساتھ دوسرے ہفتہ میں یا کہیں کم اور صرف سلام کرکے استقبال کیا جاتا ہے تیسرے ہفتہ میں بچے کے ذریعے چائے بھیجی جاتی ہے چوتھے ہفتہ میں روکھا پھیکا ناشتہ لنچ غائب اور دیر سے آنے پر سخت سست کہنا اور دال کا پیش کرنا۔ جغرافیائی زبان میں پہلا ہفتہ فرحت بخش، دوسرا معتدل، تیسرا گرم، چوتھا ہفتہ خشک اور گرم گویا کہ قیامت کا ہفتہ — ایسے لوگ جن کے پاس سال کے باون ہفتے ھذا من فضل ربی رہتی ہے یا محنت کا پسینہ رہتا ہے، وہاں پر ایک ماہر موسمیات کے مطابق گھریلو موسم فرحت بخش ہی رہتا ہے۔

ہمارے ایک دوست امام صاحب کا کہنا ہے کہ بیویوں کی تین اقسام ہوتی ہیں ایک وہ جو دن بھر کی محلہ کی خواتین اور بچوں کی رپورٹیں جمع کرکے اور مصالحہ لگا کر اپنے میاں کو شام میں سناتی ہیں دوسری وہ جو میاں کو

جی بھر کی!) دوسری وہ قسم جو میاں کے دفتر کی دن بھر کی رپورٹیں سنتی ہیں (اور اپنی پڑوسنوں کو بعد میں سناتی ہیں) تیسری وہ قسم جو نہ رپورٹیں سنتی ہیں اور نہ رپورٹیں سناتی ہیں اور صرف اپنے کام کاج اور گھر گرہستی میں رہتی ہیں!

ادب میں بیوی کی دیور و نندوں سے کبھی بھی بنتے نہیں دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ ہم ایسی کئی خواتین کو جانتے ہیں جو اچھی بیویوں کے فرائض انجام دینے کے ساتھ دیور، نندوں کے ساتھ بھائی بہن کا تعلق رکھتی ہیں اور ساس کو اپنی ماں کا درجہ دیتی ہیں۔ بہر کیف اچھی بیوی کہلانا ہر معاشرے میں عورت کے لیے باعث فخر ہوتا ہے۔ عورت کی زندگی بیوی کے روپ میں آکر ایک غم گسار، رفیق و ساتھی کی ہو جاتی ہے وہ گھر کی وزیر اعظم ہوتی ہے اور وجودِ زن سے ہے رونقِ کائنات کی تفسیر۔

طاہر مسعود (پاکستان)

طاہر مسعود پاکستان کے ممتاز صحافی اور کالم نگار ہیں۔ روزنامہ جسارت میں "دامِ خیال" کے عنوان سے اور روزنامہ جنگ میں "برگردن راوی" کے مستقل عنوان کے تحت ان کے کالم چھپ چکے ہیں۔ ان کے کالموں کا انتخاب "برگردن راوی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ جس سے دو مضامین قارئین شگوفہ کے لئے منتخب کر کے زیرِ نظر شمارہ میں شریک کئے جا رہے ہیں — (مدیر)

کسی ڈائری★ کے چند اوراق

پچھلے ہفتے ایک ردّی فروش سے ہم نے چند پرانی کتابیں سستے داموں خریدیں اسی ڈھیر میں ہمیں ایک نادر ڈائری بھی ملی، جس پر ڈائری نویس کا نام اور پتہ درج نہ تھا۔ اس کے مطالعے سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ کسی کالعدم سیاستداں کی ڈائری ہوگی۔ ذیل میں ہم اس ڈائری کے چند اوراق بطور نمونے کے درج کر رہے ہیں تاکہ جن صاحب کی بھی ڈائری ہو وہ اسے پہچان لیں اور ہم سے وصول کر لیں تاہم اس کے لئے ڈائری کے غیر مطبوعہ حصّوں کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔

"یکم جنوری ۱۹۸۲ء:

آج سال کا پہلا دن ہے۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہوئے پانچ سال ہوگئے۔ ہر نئے سال کی ابتداء پر میں سوچتا ہوں کہ مجھے مارشل لا کے خاتمے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے پھر سوچتا ہوں "کیا کرنا چاہیئے؟" تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں لیکن میں کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ سیاستداں ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی لاعلمی یا غلطی کا اعتراف زیب نہیں دیتا۔ اسی لئے میں احتیاطاً اپنے بیانات میں صرف حکومت سے مطالبہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ کام ذرا سہل بھی ہے اور محفوظ بھی لیکن اب تو میں مطالبے کر کر کے تھک گیا ہوں۔ خدا کی پناہ! میں گزشتہ دس برس سے صرف مطالبے ہی تو کر رہا ہوں بعض ساتھی کہتے ہیں کہ میرے مطالبات اور بیانات میں طنز و مزاح کی چاشنی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، میں تو بہر حال سنجیدگی سے بیان دیتا ہوں۔ نئے سال کے لیے میرے ذہن میں کئی پروگرام ہیں۔ ان کی ترجیحات حسبِ ذیل ہوں گی۔

★ نوٹ: یہ کالم اس لئے اہم ہے کہ اس کی اشاعت پر مولانا شاہ احمد نورانی نے کالم نگار اور "جنگ" اخبار کے خلاف ایک پریس کانفرنس میں شدید احتجاج کیا جس کے بعد اس اخبار سے کالم نگار کی علیحدگی عمل میں آئی۔ ایک ماہ بعد مولانا نے حکومت کو سخت لعن طعن کیا کہ اس نے اخبارات کی آزادی کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔

۱. اس برس بھی پچھلے برسوں کی طرح بلاناغہ روزانہ اخباری بیان جاری کروں گا۔
۲. تیتر اور بٹیر کے ساتھ مرغابیوں اور جنگلی بطخوں کا بھی شکار کروں گا۔
۳. حکومت مذاکرات کے لیے بلائے گی تو چلا جاؤں گا، نہیں بلائے گی تو بھی چلا جاؤں گا۔
۴. سیاستدانوں میں معاصرانہ چشمک کو ہوا دوں گا، اس سے شخصیت اور پارٹی میں سیاسی جاذبیت بڑھتی ہے۔
۵. اس سال مطالعے پر خصوصی توجہ دوں گا، خصوصاً اخبارات میں شائع شدہ اپنے بیانات کے مطالعے پر۔

۸ر فروری :

صبح سویرے ایک رپورٹر آدھمکا۔ وہ مجھ سے انٹرویو کرنے کا خواہاں تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں دس پندرہ روز تک بے پناہ مصروف ہوں حالانکہ میں قطعی مصروف نہیں تھا۔ سیاست پر پابندی کے زمانے میں ایک سیاستداں کی بھلا کیا مصروفیت ہوسکتی ہے۔ رپورٹر گھاگ نہیں تھا، اُس نے میری بات پر یقین کرلیا۔ اس نے جب بہت اصرار کیا (جیسا کہ میں چاہتا تھا) تو میں نے ردّوکد کے بعد اُسے منگل کی شام کا وقت دے دیا۔ وہ ممنون ہوا حالانکہ سچی بات یہ تھی کہ اس کے انٹرویو لینے کی درخواست پر دل ہی دل میں جتنا میں اس کا ممنون ہوا تھا، وہ خود تو کیا ہوا ہوگا، منگل کو پانچ دن رہتے ہیں، یہ دن کیسے کٹیں گے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اتنا لمبا وقت دے کر میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔

۹ر فروری :

انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو، انٹرویو کل سے یہی ایک لفظ ذہن میں، دل و دماغ میں گردش کر رہا ہے۔ اس لفظ پر مجھے کتنا پیار آرہا ہے، بتا نہیں سکتا۔ چلتے چلتے ایک بار پھر کہہ کر دیکھتا ہوں کہ کیسا لگتا ہے انٹرویو۔ واقعی کیوٹ لفظ ہے۔

۱۳ر فروری :

بالآخر منگل آہی گیا۔ رپورٹر نے ڈھائی گھنٹے کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا تھا۔ میں تو خیر تیار بیٹھا تھا لیکن اُسے دیکھتے ہی میں ایسا ظاہر کرنے لگا جیسے مجھے کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ اس نے پوچھا: "تو پھر گفتگو شروع کروں؟"

میں جواباً سوال کیا: "کیا یہ انٹرویو ملتوی نہیں ہو سکتا؟" (یہ کہتے ہوئے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، اگر وہ انٹرویو کے التوا پر آمادہ ہوگیا تو پھر کیا ہوگا)

"لیکن جناب انٹرویو کے لئے وقت تو پہلے سے طے ہے۔" رپورٹر نے کہا۔

"جی ہاں! وہ تو ٹھیک ہے" میں نے فرمایا۔ "دراصل مجھے پارٹی کی مجلسِ عاملہ کے ایک ہنگامی اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔" رپورٹر سخت بدمزہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں کھیل بگڑ نہ جائے خود ہی فرمایا۔ "اچھا چلئے! میں آپ کی خاطر اجلاس منسوخ کردیتا ہوں۔ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے، میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہے۔" میں نے انٹرکوم پر سیکریٹری کو ہدایت کی کہ وہ مجلسِ عاملہ کے ہنگامی اجلاس کی کل تک کے لیے ملتوی ہونے کی اطلاع اراکین تک پہنچا دیجیے۔ سیکریٹری حیران ہوا، پوچھنے لگا: "کون سی

مجلسِ عاملہ؟ کیسا اجلاس؟" لیکن جب میں نے اُسے ڈپٹ کر کہا کہ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی تعمیل کرے" تو وہ سمجھ گیا۔ آدمی ذہین ہے۔ رپورٹر نے انٹرویو کے دوران ایک نہایت بیوقوفانہ سوال کیا کہ آپ سیاست میں کیوں آئے؟ لگتا ہے ملک میں صحافت کا معیار بھی تیزی سے گر رہا ہے۔ خیر میں اس سوال کے جواب میں بیس منٹ تک بولتا رہا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ساری زندگی بولتا رہوں لیکن رپورٹر کی صحت اچھی نہیں تھی۔ پھر میرے سامنے وہ پہلے ہی سر درد کی دو گولیاں نگل چکا تھا۔ میں نے کہا کہ میں قوم کی خدمت کرنے ایک آسودہ حال معاشرے کی تعمیر کرنے اور یہ کرنے اور وہ کرنے سیاست میں آیا ہوں۔ رپورٹر کے جانے کے بعد سے میں سوچ رہا ہوں کہ واقعی میں سیاست میں کیوں آیا؟ اگر مجھے بمبئی ٹاکیز میں چانس مل جاتا تو میں سیاست میں آتا ہی کیوں؟!

(نوٹ: میں نے اس صفحے پہ جابجا "میں نے کہا" کے بجائے "میں نے فرمایا" لکھا ہے اس لئے کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ جو آدمی اپنی عزت خود نہیں کرتا، اس کی دوسرے بھی عزت نہیں کرتے۔)

۶ر مارچ:

گزشتہ چند روز کے اندر اندر میری کئی ہمعصر سیاستدانوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اُن میں شیر باز مزاری، مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر غفور احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نا معلوم کیوں دوسرے سیاستدان مجھ سے مل کر فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ میں بھی انہی جیسا ایک سیاستداں ہوں۔ شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر میں نے کالعدم جماعتِ اسلامی کی خوب غیبت کی، وہ بیحد خوش ہوئے اور گرمجوشی سے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ وہاں سے پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے مزاری صاحب موجود تھے۔ میں نے پروفیسر صاحب کے سامنے شاہ صاحب کے بارے میں چند فقرے اُچھالے۔ مزاری صاحب کا چہرہ خواہ مخواہ سرخ ہوگیا۔ بولے "آپ جانتے ہیں کہ کوّا کوّے کا گوشت نہیں کھاتا۔ آپ کیسے سیاستداں ہیں کہ اپنے سیاستداں بھائی کی غیبت کر رہے ہیں؟" میں نے بھی ناراض ہو کے فرمایا "آپ نے سیاستدانوں کو کوّے سے تشبیہ دے کے ہماری توہین کی ہے۔" مزاری صاحب نے کہا "میں نے تشبیہ نہیں دی بلکہ موقع محل کی مناسبت سے ایک محاورہ استعمال کیا ہے اور ویسے بھی اردو میری مادری زبان نہیں ہے۔" معاملہ آگے بڑھ جاتا مگر خدا بھلا کرے پروفیسر صاحب کا انھوں نے بیچ میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا۔ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے اُٹھ کے سیدھا غلام احمد بلور اور عابد زبیری کے پاس جاؤں گا اور انہیں مزاری صاحب کے خلاف بھڑکاؤں گا۔ میں طبعاً مسلم لیگی ہوں۔

۱۰ر مارچ:

آج میں بے حد اُداس رہا۔ کسی اخبار میں بھی نہ میری کوئی خبر شائع ہوئی نہ ہی تصویر۔ پارٹی کے سیکریٹری نشر و اشاعت بتا رہے تھے کہ آج بازار میں اخبارات برائے نام فروخت ہوئے۔ باقاعدہ خریداروں کے ہاں بھی مطالعۂ اخبار کا تناسب بیحد محدود رہا، خود میرا اپنا جی بھی اخبار پڑھنے کو نہ چاہا۔

۳ر اپریل:

کل شب عجیب خواب دیکھا۔ سارا دن طبیعت پہ اُس کا اثر باقی رہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نکھو کھا عوام

میری تصویریں اُٹھائے، میرے نام کے نعرے لگاتے ہوئے، سڑکیں، بازار، گلیاں گھروں کی چھتیں درخت، کھمبے، ہر طرف انسانی سر ہی سر نظر آرہے ہیں۔ عجیب جوش و خروش کا عالم ہے۔ نعرے لگاتا ہوا ہجوم ایک سرکاری عمارت کے سامنے جاکے رُکتا ہے۔ بالکنی سے میں مُسکراتا ہوا نمودار ہوتا ہوں، وکٹری کا نشان دکھاتا ہوں، عوام زور دار طریقے سے تالیاں اور سیٹیاں بجا رہے ہیں پھر میں اپنا ایک ہاتھ بلند کرکے خطاب کرتا ہوں۔ "میرے جیالے بھائیو! . . . " مجھے کوئی زور سے جھنجھوڑتا ہے۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ بیگم کہہ رہی تھیں۔ آخر آپ کی نیند میں تقریریں کرنے کی عادت کب جائے گی ؟!

آزادی کا چہرہ

لیکن اگر ان آٹھ کروڑ باشندوں سے کبھی پوچھا جائے۔ "آزادی کیا ہے؟" تو کوئی ہپی چرس بھری سگریٹ کا کش لے کر کہے گا :

"آزادی اس سگریٹ کے دھوئیں کا نام ہے"۔ کوئی قانون شکن اپنی موٹر سائیکل اِسٹارٹ کرکے چیخے گا۔ "میں ابھی آزادی کی تعریف بیان کرتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر وہ سگنل توڑتا ہوا، ٹریفک کانسٹیبل کی چیختی سیٹی سے بے پرواہ فرّاٹے بھرتا نکل جائے گا۔ اپنی نشست پر بیٹھکر اونگھتا ہوا کلرک بیزاری سے کہے گا : "براہِ کرم میری آزادی میں مداخلت نہ کریں، رات بھر کا جاگا ہوا ہوں"۔ یہی سوال کرنے کسی افسر کے پاس جائیں تو وہ فائلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے اپنا سر اُٹھاکر رعونت سے فرمائیں گے۔ "پہلے یہ بتائیں کہ آپ کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت کس نے دی ؟" مسجد کے منبر پر تشریف فرما مولوی صاحب نفیس اور شُستہ آواز میں کہیں گے۔ "جن حضرات کو ہمارے مسلک سے اختلاف ہو، وہ کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاسکتے ہیں"۔ پولیس افسر اپنا پیر پٹخ کر حکم دے گا۔ "اوئے اینہوں تھانے وچ بند کردیو، ایہہ آزادی دی گل کردا اے"۔ سیاست دان عیاری سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہے گا۔ "آزادی کی تعریف یہ ہے کہ سیاستدانوں کے بیانات اخبارات کی زینت بنتے رہیں"۔ غریب اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرے گا کہ اس جہنم کو بھرنے کی راہ میں کسی رکاوٹ کا نہ ہونا ہی آزادی ہے۔ اور رنگین مزاج وی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے، عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے، ریس کورس میں جیکی کے دوڑنے ہی کو آزادی کہیں گے۔ آزادی کی ان گنت تعریفیں ابھی باقی ہیں۔

۱۲/ اگست ۱۹۸۱ء طاہر مسعود

طاہر مسعود (پاکستان)

یہ اتوار کی رات کا ذکر ہے۔

میں نے اپنے ایک دوست کو سوسائٹی میں اس کے گھر پہ ڈراپ کیا چونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس لئے میں نے دوست کے اصرار کے باوجود چائے کی پُرکشش آفر پہ معذرت کرلی۔ طارق روڈ کے چوک پہ خاکی اوورکوٹ پہنے ہوئے دو سپاہیوں نے رُکنے کا اشارہ کیا، چوک پر منظر بے حد دلچسپ تھا۔ نیلے رنگ کی ویسپا پر ایک صحت مند پولیس انسپکٹر آرام سے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے سیاہ چمکدار جیکٹ والے کئی لڑکے بے بسی سے کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کی موٹر سائیکلیں قریب ہی لگی تھیں۔ چوک پر تین چار ٹیکسی ڈرائیور اکڑوں بیٹھے تھے۔ اُن میں ایک ڈرائیور گنجا تھا اور اس کا گنج چاند کی روشنی میں اور کچھ چمک اٹھا تھا۔

"اوئے تم بھی لائن میں لگ جاؤ"۔ انسپکٹر نے مجھے حکم دیا۔

"لیکن میں۔۔۔"

"اوئے چپ کرکے لگ جاؤ لائن میں"۔ اس نے میری مزاحمت کو سختی سے جھٹک دیا۔

"ہاں تو آپ کیا کرتے ہو، بابوجی؟" انسپکٹر نے سب سے آگے کھڑے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

"پڑھتا ہوں"

"اچھا تو اسٹوڈنٹ ہو؟"

"جی ہاں"

"لائسنس ہے؟"

"اصل میں سر میں کچھ جلدی میں گھر سے نکلا تھا۔۔۔" لڑکا کچھ گڑبڑا گیا۔

"ہاہاہا" انسپکٹر نے قہقہہ لگایا۔ "بہت دنوں بعد پھنسے ہو"

"جی کیا مطلب!"

"ابھی مطلب سمجھ آجائے گی، گھبراؤ نہیں۔ اوئے گل محمد!"

"یس سر!" گل محمد نے ایڑیوں پہ گھوم کر سیلوٹ مارا۔

"گل محمد، یہ اسٹوڈنٹ ہم لوگوں کو کیا کہہ کر بلاتے ہیں"؟
"سر! یہ ہم کو ٹلّے ٹلّے کہتے ہیں"
"اچھا تو تم ہمارے گل محمد کو ٹلّے بولتے ہو، ایں؟"
"سر! میں نے کبھی نہیں کہا" لڑکے نے نہایت لجاجت سے تردید کی۔
"تم نے نہیں کہا تو پھر کس نے کہا؟"
"مجھے نہیں پتہ سر"
"اوئے تم بکواس کرتے ہو۔ بتاؤ تم ہمیں ٹلّا کیوں کہتے ہو" انسپکٹر کڑکا۔
"سر یقین مانیں، میں نے کبھی نہیں کہا"
"اچھا تو تم ہمیں کیا کہتے ہو؟"
"سر میں، میں تو کچھ بھی نہیں کہتا"
"تم کچھ بھی نہیں کہتے۔ اوئے تم جھوٹ بولتے ہو، ہم کو چکر دیتے ہو"
"سر قسم لے لیجئے"
"قسم، ہا ہا ہا۔ قسم کیا تم اپنے باپ کی کھاؤ گے!"
"سر باپ کو بیچ میں مت لائیے"
"اگر میں لے آیا تو کیا کرو گے؟" انسپکٹر غرّایا۔
"سر جب میں ٹلّا کہا نہیں تو پھر مجھ پر الزام کیوں رکھ رہے ہیں"
"اچھا تمہارے پاس لائسنس ہے"
"جی نہیں"
"کیوں نہیں ہے؟"
"سر میں نے بتایا نا کہ جلدی میں نکلا تھا، اس لئے لائسنس رکھنا بھول گیا"
"یہ موٹر سائیکل تمہاری ہے!"
"یس سر"
"جب تمہارے پاس لائسنس نہیں ہے تو میں کیسے مان لوں کہ تمہاری ہے؟"
"سر! میرے پاس گاڑی کے کاغذات ہیں"
"کاغذات نہیں چاہئیں، مجھے لائسنس دکھاؤ"
"لائسنس تو گھر پہ ہے سر"
"پھر ضرور تم نے یہ موٹر سائیکل کہیں سے چرائی ہے۔ تم جیسے لونڈے بہت ۔۔۔" انسپکٹر نے موٹی سی گالی دی۔

"صاحب جی ہم کب تک بیٹھے رہیں گے؟" گنجے نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بور ہو کر مداخلت کی۔
"یہ گنجا بہت بکواس کر رہا ہے، گل محمد اس کو ایک ہنٹر لگاؤ" انسپکٹر نے بگڑ کر حکم دیا لیکن گل محمد اپنی

جگہ پر خاموشی سے کھڑا رہا۔
"صاحب جی میں تو بولا ہی ایک گھنٹے کے بعد ہوں"۔
"تم اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟"
"اچھا جی نہیں بولتا" گنجا سہم کر چپ ہوگیا۔
"ہاں تو پھر تم نے یہ گاڑی کدھر سے چرائی؟" انسپکٹر لڑکے سے مخاطب ہوا۔
"سر! یہ میری اپنی ہے"۔
"اوئے تم کو میں اُلّو کا پٹھا نظر آتا ہوں"۔
"نہیں سر!"
"اچھا تو تم اُلّو کے پٹھے ہو؟"
"نہیں سر!"
"کیا کہا؟ تم نہیں ہو؟" اس نے مضحکہ خیز حیرت سے پوچھا۔
"نہیں سر"؟
"گل محمد! یہ کیا ہے"؟
"سر! یہ اُلّو کا پٹھا ہے!" گل محمد نے سعادت مندی سے کہا۔
"ہاں بیٹے تم کیا ہو؟"
"سر! میں اُلّو کا پٹھا ہوں"۔
"شاباش! ایک بار پھر کہو"۔
"سر میں . . . اُلّو کا . . . پٹھا . . . ہوں" لڑکے نے رُک رُک کر صاف لہجے میں اعتراف کیا۔
"اچھا بیٹے! تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں۔؟"
"بیس روپے"!
"صرف بیس روپے؟ اوئے تم دیکھنے میں تو کروڑ پتی باپ کے بیٹے لگتے ہو"۔
لڑکا کچھ نہیں بولا؛ البتہ اس کا ساتھی پہلو بدلنے لگا۔
"اچھا، اب جلدی سے بیس روپے نکال دو"۔
لڑکا جس کی حالت اِن مکالموں کے سبب غیر ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے جیب سے پرس نکال کر بیس روپے انسپکٹر کی طرف بڑھا دیئے جسے انسپکٹر نے بے نیازی سے پتلون کی جیب میں ٹھونس لئے۔
"اچھا! اب تم جا سکتے ہو"؟
"تھینک یو سر!"
"اوئے ٹھہرو!"
"جی؟" وہ ٹھٹھک گیا۔
"اب تم گل محمد کو ٹلّے تو نہیں بولو گے؟"

"کبھی نہیں سر۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم جلدی سے بھاگ جاؤ۔" لڑکا موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے جناب"؟ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"آپ کیا کرتے ہیں جناب؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

اس کے اس سوال کے جواب میں، میں نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھمادیا۔ کارڈ لے کر اس نے پہلے الٹا پلٹا، پھر غور سے پڑھنے لگا۔

"اچھا تو پریس مین ہیں؟"

"جی ہاں! اتفاق سے۔؟"

"تو پھر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

"تو پھر کہاں کھڑا رہوں"؟

"آپ گھر جائیے جناب۔ اتنی دیر میں آپ لوگ گھر جاتے ہیں، اللہ اللہ، آپ لوگوں کی صحت خراب نہیں ہوتی۔ آپ فوراً جائیے جناب"!

انسپکٹر ہمدردی اور محبت کے مارے رنجیدہ ہوگیا۔

"ٹلے، ٹلے"! دور سے آواز آئی۔ انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"اوئے تیری۔۔۔" غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"ٹلے ٹلے" بیس روپے ادا کرکے تیز رفتاری سے موٹر سائیکل پر جاتا ہوا لڑکا چیخ رہا تھا، "ٹلے ٹلے"

اور انسپکٹر اور گل محمد غصے میں پاگل ہوکر مغلظات بک رہے تھے۔

نامور مزاح نگار

نریندر لوتھر

کے

انشائیوں کا تازہ مجموعہ!

الف تحاشا

○ صفحات: ۱۷۴ ○ قیمت: ۱۶ روپے

○ مطبوعہ: زندہ دلانِ حیدرآباد!

اندرجیت لال
(نئی دہلی)

واہ رے گدھے

بے ہنگم لمبے لمبے کان، بڑی بڑی آنکھیں، لمبوترہ چہرہ، گردن پر بال، چھوٹی سی دُم۔ جو شاید اپنی نہ ہو کہیں سے مُستعار لی ہوئی ہو۔ جی ہاں یہ تصویر گدھے کی ہے۔ جسے آپ اپنے ماحول یا روزانہ زندگی میں عام طور پر دیکھتے ہیں۔ اور ہمارے لئے کوئی انجانا کردار نہیں ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا پُرانے زمانے ہی سے گدھے کو احمق کہتی چلی آئی ہے احمق کے علاوہ اسے اور طرح سے بھی یاد کرتے ہیں۔ بدھو، پاجی، خبیث اور پتہ نہیں کیا کیا کہا جاتا ہے۔ اُردو، فارسی، پنجابی بلکہ دُنیا کی ہر زبان میں اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ فارسی والوں نے تو گدھے کے لیے خرمست، خردماغ، خرنما مشخص جیسی ترکیبیں وضع کر ڈالیں۔ اور یہی حال ہمارے ہاں دوسری زبانوں کا بھی ہے۔

اچھے بھلے آدمی کو گدھا چند، گدھا رام، گدھا سنگھ حتیٰ کہ گدھا صاحب بھی کہہ لیجئے موصوف آپ کا طنز سمجھ لیں گے کہ آپ اُن کی بے وقوفی یا نا اہلی کا ماتم اکس طرح کی ترکیب سے کر رہے ہیں، گدھے کے نام کو خواہ کسی طرح سے ترتیب دیں جیسے گدھے کو باپ بنانا یا گدھے پر کتابیں لادنا یا گدھے کو حلوہ کھِلا کر لاتیں لگانا یا گدھے کے ہل چلوانا۔ ایک مُرقع جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یقیناً مضحکہ خیز اور کچھ تضحیک آمیز ہوتا ہے، ذرا سوچئے تو بڑا عجیب لگتا ہے کہ انسان کی وضع کی ہوئی ترکیبیں کس قدر نا منصفانہ ہیں۔ گویا صابر، جفاکش، شریف اور محنتی احمق کے نام سے پُکارا جائے اور دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اُڑانے والا دانا اور مدبّر۔

گدھے سے کئی قصّے کہانیاں منسُوب کی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں ایک بادشاہ سیر و شکار کے لیے نِکلا۔ اس کا شہزادہ اور نوکر بھی ساتھ تھے۔ دیکھتے دیکھتے دوپہر کا وقت آن پہنچا۔ بڑی گرمی ہونے لگی بادشاہ اور شہزادہ نے گرمی کی شدت کی وجہ سے اپنے لبادے اُتار کر نوکر کے کندھے پر لاد دیئے۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے نوکر سے کہا۔

"اِن دو لبادوں کا بوجھ تجھ پر ایک گدھے کے برابر ہو گیا ہے"۔

نوکر تھا مسخرہ۔ جھٹ بول اٹھا "قُربان جاؤں حضور! ایک گدھے کا بوجھ حضور یہ تو دو گدھوں کا بوجھ ہے"۔
اس بے ساختہ جواب سے بادشاہ بہت نادم ہوا۔

ایسے سینکڑوں قصوں اور تمثیلوں سے ہندوستانی ادب بھرا پڑا ہے۔ خصوصاً طنز کی صورت میں گدھے کے نام پر کیا کیا لطیفے رائج ہوئے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں ایک دیہاتی گدھے پر اناج لاد کر شہر کی طرف جارہا تھا۔ شہر کے پاس پہنچ کر ایک مقام پر گدھا اڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ نہ تو آگے بڑھتا تھا اور نہ پیچھے پلٹتا تھا۔ دیہاتی پہلے تو اُسے کھینچتا رہا۔ پھر دھکے دیئے۔ مگر گدھا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس پر دیہاتی گدھے پر بے تحاشہ ڈنڈے برسانے لگا۔ اتنے میں چاروں طرف سے لوگ جمع ہوگئے اور اُسے یہ کہتے ہوئے گدھے کو مارنے سے منع کرنے لگے۔ "کتنے بے رحم انسان ہو۔ کس بے دردی سے اس بے چارے کو مار رہے ہو۔"

دیہاتی پہلے تو سنتا رہا۔ پھر ڈنڈا ایک طرف پھینک کر گدھے کے سامنے آیا۔ چار مرتبہ اُسے جھک کر سلام کیا۔ اور بولا "حضور مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں آپ کے اتنے ہمدرد اور قریبی رشتہ دار رہتے ہیں۔"

ایک لطیفہ جو اکبر بادشاہ اور ان کے نورتن بیربل سے منسوب کیا جاتا ہے کہ اس کو ایک شاعر نے عوامی سطح پر یوں قطعہ بند کردیا ہے۔

مسخروں نے گھیر لیا مجھ کو ایک دن ۔۔ شاید انہیں گمان تھا میں بے زبان ہوں
ہنس کر انھوں نے پوچھا کہ احمق ہو یا گدھے ۔۔ میں نے کہا کہ "دونوں کے اب درمیاں ہوں"

گدھا بالعموم مسکین اور سیدھا ہوتا ہے اور دوسرے جانوروں کے مقابلے میں فرماں بردار بھی اِسی لئے انسان اور خصوصاً کمہار یا دھوبی گدھے کے سیدھے پن کا خوب فائدہ اُٹھاتا ہے گاؤں گاؤں کے دیہاتوں میں ایک روایت ہے کہ رات کو کمہار، گدھوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے اُن کے ٹخنے رسیوں سے جکڑ دیتے ہیں تاکہ وہ کسی لمحہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ گدھے زیادہ ہوتے ہیں اور رسیاں کم۔ اس صورت میں جن گدھوں کے ٹخنے رسیوں سے نہ جکڑے جاسکیں۔ اُن کے ٹخنے کمہار اپنی انگلیوں سے دبا دیتے ہیں۔ اس طرح دبانے سے گدھے سمجھتے ہیں کہ ہمیں رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہے، اس وجہ سے وہ ساری رات اپنے تھان پر بغیر ہلے جُلے کھڑے رہتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر مالک جب اُن کے ٹخنوں کو چھوتا ہے تو گدھے سمجھتے ہیں کہ ہم آزاد ہوگئے ہیں۔

شاعروں، ادیبوں، اور مزاح نگاروں نے گدھے کے موضوع پر بڑی خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ بڑا سیدھا سا موضوع ہے۔ کچھ بھی کہہ ڈالیئے۔ گدھا اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے رہا۔

گدھے کا سلسلۂ نسب ایلیا سینیا کے جنگلی گدھے سے ملتا ہے۔ گدھا دھول اور مٹی کو پسند کرتا ہے۔ پانی اور کیچڑ سے ممکن حد تک بچنے کی کوشش کرتا ہے بارش سے ڈرتا ہے، وہ معمولی خوراک کھاکر بھی ایک لمبے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے اور محنت کرسکتا ہے۔ یہ اُس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتا جب تک کہ کام کرکے تھک کر چور نہ ہوجائے، ایک مزے دار بات یہ ہے کہ گدھا کھڑے کھڑے نیند لے لیتا ہے۔ ہاں اِس کا اڑیل پن بہت مشہور ہے۔ جب اَڑ جاتا ہے تو لاکھ مارنے پیٹنے پر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

گدھے کی ادب میں بھی اہمیت ہے، اہلِ زبان نے اسے محاوروں اور ضرب المثلوں میں ایک حسین دُولھا بناکے رکھ دیا ہے۔ چند محاورے حاضر ہیں۔

کہاوت "گدھا دھونے سے بچھڑا نہیں ہوجاتا" اُن حضرات کے لیے وجود میں آئی جو ظاہری ٹیپ ٹاپ یا

نمائش و آرائش سے اپنی نااہلی یا بیوقوفی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گدھا کتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے اس کے لیے محاورہ ہے "گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ"۔ مثل "گدھا گیا دُم کی تلاش میں کٹا آیا کان" اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی بے سمجھ اپنے نقصان کی تلافی کی کوشش میں اور زیادہ نقصان کر بیٹھے گویا نقصان تو فقط گدھا ہی کرتا ہے۔ تاریخ و ادب میں گدھے کا تذکرہ کئی جگہ ملتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب فاتح بادشاہ کسی شہر کو مسمار کرنا چاہتے تھے، تو اس کی عمارتیں گرا کر وہاں گدھے کا ہل چلوا دیتے تھے باغیوں کو گدھے کی کھال میں سی کر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ جہانگیر کے لڑکے خسرو نے باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا، لیکن شکست کھائی۔ چنانچہ جہانگیر نے اس کے سرکردہ ہمنوا عبدالعزیز خاں کو گدھے کی کھال میں سلوا دیا۔ جس سے وہ کئی روز تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ ایک سزا تو آج بھی گاؤں میں سرپنچ کے حکم سے دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بدکار کا منہ کالا کرکے اُسے گدھے کی پیٹھ پر دُم کی طرف بٹھاتے ہیں، اور اُسے گاؤں بھر میں پھرا کر اس کی تشہیر کرتے ہیں کبھی کبھی ملزم کے سر کے بال بھی نکال دیئے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے پیچھے عوام کا ہجوم تالیاں پیٹتا ہے ڈھول بجاتا ہے۔

شیخ سعدی کی کتاب "گلستان" کے مقابلے میں مولانا مجید الدین نے "خارستان" لکھی۔ اس کتاب میں ایک جگہ گدھے کا ذکر یوں ملتا ہے، کہ قربِ قیامت کی یہ نشانی ہے کہ دجال گدھے پر سوار ہو کر آئے گا۔ اس پس منظر میں لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا "دجال کب پیدا ہوگا"؟ جواب ملا۔ "وہ تو عرصے سے پیدا ہو چکا ہے لیکن گاؤں کے نمبردار کے ڈر سے چھپا بیٹھا ہے کہ اس کا گدھا بے کار میں نہ پکڑ لے"۔

ترکی، شام اور ایران کے گدھے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں، کیا حیرت کی بات ہے کہ امریکہ کی ری پبلیکن پارٹی کا نشان گدھا ہے مغربی جرمنی کے ایک کارخانے میں حال ہی میں ایک ہیوی ٹرک تیار کیا گیا ہے جس کا نام گدھا ہے۔ خدا معلوم کسی تاجر نے گدھے کی تصویر سے کوئی ٹریڈ مارک پیٹنٹ کروا رکھا ہو،

گدھے کی آواز بڑی کرخت اور بے ڈھب ہوتی ہے لیکن ایک ماہر موسیقی کے فرمان کے مطابق گدھے کی آواز میں سنگیت کے بے راگ ہیں۔ میرے ناچیز خیال میں گدھے کا کوئی راگ نہیں، یہ کوئی مالکونس۔ بھیرویں، آسا۔ آساوری نہیں۔ یہ تو فقط کھٹے راگ ہے اس کا سارا راگ بے آہنگ ہے۔ اس کا کوئی سُرتال نہیں گدھے کی آواز "ڈھینچوں ڈھینچوں" کو سرگم کی گرفت میں ملایا ہی نہیں جا سکتا۔ راگ ہو تو اُسے سُرتال میں لایا جا سکے اور جب نہ کچھ ہو تو دھوکہ کھائیں کیا۔

یہودیوں کی کتاب مقدس توریت میں گدھے کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ مصر کے لوگ گدھے کو ایک برگزیدہ اور پاک مخلوق تصور کرتے ہیں۔ روم کی شہزادی ملکۂ یوپیا اپنے حسن و جمال کو قائم رکھنے کے لیے تیرہ روز گدھوں کے دودھ میں نہایا کرتی تھی اور جب کبھی ملکہ محل سے دور یا سفر پر جاتیں تو اس کی گدھیاں بھی ساتھ ہی جاتیں۔ تاکہ شہزادی کو غسل میں گدھوں کے دودھ کے بغیر دشواری نہ ہو روایت ہے کہ اُجین کے راجہ گندھرپ سین پر کسی نے جادو ڈال دیا۔ راجہ دن کو گدھا بن جاتا اور رات کو پھر اپنے اصلی روپ میں آ جاتا۔ ان حالات میں اس کی شادی ایک راج کماری سے کر دی گئی۔ جس کے بطن سے راجہ بکرماجیت پیدا ہوا۔ اور اسی کے نام پر بکرمی سمت (بمعنی سن) کا اجراء ہوا۔ آج کل ہندو تہواروں میں اس سمت کو خاطر میں رکھا جاتا ہے۔

مشہور دانشور چانکیہ کا فرمان ہے کہ انسان میں گدھے کے گن ہونے چاہئیں!

□□

صابر بہاری، رانچی

اُجالے میں!

یہ بات ہے رشوت کی دن رات اُجالے میں
اک ہاتھ اندھیرے میں اک ہاتھ اُجالے میں

شب زادوں کی محفل میں سورج کی ہو کیا پوجا
کٹتی ہے جہاں ہر دم ہر رات اُجالے میں

بات اہلِ سیاست کی کیا خاک کوئی سمجھے!
اک بات اندھیرے میں اک بات اُجالے میں

مولانا طلاق کا ہے عقدِ چہارم آج!
نکلی ہے جو مسجد سے بارات اُجالے میں

تھے امن کے رکھوالے بندوق بہ کف ہر سو
لُٹتا ہی رہا لیکن گجرات اُجالے میں

صابر یہ گھڑی آئی ظلمت کی گھٹا چھائی
بے بات کی ہوتی ہے ہر بات اُجالے میں

o

سلامت اختر
(بمبئی)

"مگر"

گھومتے گھڑیال ہیں ہر سو مگر
کس قدر ویران ہے یہ ٹالو مگر

ایک مچھر بھی نہ مارے مر سکا
گھومتا ہوں کھول کر چاقو مگر

کرکری ہونا تھی محفل میں ہوئی
خیر سے گھر آ گئے بدھو مگر

آپ سے میں راز اپنا کہہ تو دوں
آپ کو ہو جائے گا اچھو مگر

جن کو گلدستے دیئے جاتے تھے کل
اب ہے اُن کے ہاتھ میں جھاڑو مگر

ہر مٹانے والا خود ہٹ جائے گا
مٹ نہیں سکتی کبھی اردو مگر

ہو گئی جنتا پریشاں ٹیکس سے
آپ سُلجھا یا کئے گیسو مگر

بلبلیں کچھ پھنس گئیں کچھ اُڑ گئیں
باغ میں آزاد ہیں اُلّو مگر

شام ہی سے موم بتی بجھ گئی
صبح تک چمکا کئے جگنو مگر

سوچتا ہوں دے دوں بیگم کو طلاق
بیچ میں آ جاتے ہیں ساڑو مگر

جام توڑا ساقیٔ کم ظرف نے
ہے سلامت رند کا چُلّو مگر

o

انیس سلطانہ (بھوپال)

★

کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

لکھیں عیسیٰ اور پڑھیں موسیٰ، کہاوت تو سب نے سُنی ہوگی، کبھی اس کا استعمال بھی کیا ہوگا، لیکن اس کی ایمائیت سے شاید لطف نہ لیا ہوگا۔ اور اگر آپ بخوبی واقف ہیں تو خدا را ناراض نہ ہو جائیے گا۔

ہوا یوں کہ انجمن آرا کا اچانک بیٹھے بیٹھے جی جو گھبرایا تو کسی نے ان کے کان میں پھونک دیا کہ آج تو قلم اٹھالے "بس جناب خیال کا آنا تھا کہ گھر میں بھونچال آگیا۔ (اصلاح پسند طبیعتیں یہاں زلزلہ ہرگز نہ پڑھیں کیونکہ بھونچال کی صوتیت ہی اس مفہوم کو واضح کرتی ہے)۔

میز جو کبھی پڑھنے، لکھنے کے کام آتی تھی، ٹی، وی اور ریڈیو کے قبضہ میں تھی، محراب دار طاقچیں جو گاہے ماہے کتابوں سے بھری رہتی تھیں، گڑیوں سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ اکلوتی الماری جسے اپنی خوش ذوقی کے طور پر مہیا کیا تھا، اندر ہی اندر سُلگتی رہتی، کہ تالا اور تو کہیں نہ تھا، سوائے اس غریب کے دروازہ کے۔ کتابیں نکالی نہیں ـــ کہ ایک آدھ اپنے تن بدن کی سدھ بدھ کھو دیتی۔ اسی ڈر سے الماری کا تالا بند رکھتیں۔ مگر آج تو ذہن کے دریچے کھل گئے تھے ... شاید . . . الماری کا تالا کیوں نہ کھلتا . . .؟؟

گرد و غبار سے مزین کتابیں، اس مشتِ غبار کی زیادتی تھیں۔ کہاں کا لکھنا، کہاں کا پڑھنا، وہ تو ہو چکی تھیں نذر باورچی خانہ۔

"میاں" تو خیر سے نہایت خوش تھے۔ روز نت نئی فرمائشیں کرتے، جو نہایت خلوص سے پوری ہوتیں۔ "شاہی دسترخوان" اور "نعمت خانہ" "فلاں دفلاں بیگم" مطالعہ میں رہتا۔ دہی بڑے، کباب اور بریانی کا تو ذکر ہی کیا، مرغ و ماہی پُر لذّت دیر پیالہ تھے۔

اِدھر پاندان والی ادا کیا مرصع گلکاریاں فرمائی جاتیں کہ طرازِ دامن بھی در ناب کو ترستا تھا۔ ادھر منہ کا پان ختم اور گلوری تیار (ہر چند کہ اس کی تیاری میں کسی اور کے ید بیضا کے رنگین ہونے کا خدشہ نہ تھا) پان خور، اگر زردہ نہ کھائیں تو بدعتی کہلائیں۔ کیوں کہ پان کی شریعت میں زردہ کو جو اولیت حاصل ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ یہ الگ بات کہ زردہ لکھنوی ہے، کہ قوام والا، خوشبو والا . . . اور پتہ نہیں کیا کیا والا۔ تو میٹھا پیپ والا زردے۔ کے اِتنے تو پھنکے لگاتے اور اسی قدر میٹھی چیزوں کے شوقین کہ مخصوص قسم کی عورتوں

کو بھی نہ ہوگا۔

اہلِ ہنر کو اگر کوئی سبزی، ترکاری یا سالن نہ ملے تو زندہ باد اچار چٹنی — آم کا اچار تو خیر شاہ پسند اچار ہے (یہ نہ پوچھئے کہ کون سے شاہ کو پسند تھا — ؟) لیموں، گاجر، مولی، گوبی، شلجم، ... غرض کہ آپ تمام ترکاریوں کا اچار بنا لیجئے۔ پتہ نہیں تازہ ترکاری پکانے کی ضرورت کیوں تھی!

لیکن چٹنی ۔۔ کہ اس کی اقسام تو بے شمار ہیں۔ کھٹی چٹنی، میٹھی چٹنی۔ لونِ تن چٹنی، کیری کی چٹنی (موسم گرما کی شرط) املی کی چٹنی کے لئے موسم کی کوئی قید نہیں۔ امچور تو نہایت کفایتی چیز ہے، جب چاہے آزما لیجئے۔ اور تو اور ہری مرچ، ناریل، ہرا دھنیا بھی اسی کوشش میں مصروف نظر آئے۔ چاہے ان کی چٹنی ہی کیوں نہ بنا جائے۔

لیکن تابکئے۔ ۔ ۔ صبرِ ایوب تو ان کے پاس کہاں تھا۔ البتہ ایوب میاں جب نہایت نرمی سے کوئی فرمائش کرتے تو وہ پگھل ہی تو جاتیں۔

صاحب یہ تو نہیں ہو سکتا تا کہ اچھا خاصہ دوپہر کا کھانا تیار کر لیا، قیمہ، کوفتے اور ٹماٹر، خاگینہ وغیرہ وغیرہ.. کہ اچانک موصوف کو چٹنی کی یاد آ گئی۔ ۔ ۔ اچار ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ ریڈی میڈ چیز ہے۔ ۔ ۔ لیکن چٹنی اور وہ بھی کبیٹ کی۔ ۔ ۔!

چٹنی نگوڑی کی بساط ہی کیا۔ ۔ ۔ لیکن کڑکتی سردی اور یہ چٹنی کبیٹ کی۔ ۔ ۔ اِدھر خود نزلہ کی تحریک۔ "آنکھ ناک ایک ہوا جا رہا ہے" انھیں اپنے چوچلے سوجھ رہے ہیں" اور ایوب میاں نے نہایت برجستگی سے غالب کے شعر پہ تصرف کیا۔ ؎

نکلتے خلد سے ہرگز نہ حضرت آدم ÷ جو کھاتے حضرت آدم کبیٹ کی چٹنی

فساد کی جڑ تھی یہ چٹنی، جس نے آج دو دلوں میں کھٹ پٹ کرا دی۔ "قہرِ درویش برجانِ درویش ۔ ۔ ۔"

فرمائش تو پوری کرنا ہی پڑی۔

انھوں نے سوچا، آج پھر "قلم گردی" کا سہارا لیں۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ شادی سے پہلے۔ ۔ ۔ ہائے کیا دن تھے وہ بھی ۔ ۔ ۔ اچھا بھلا کبھی کبھار لکھ لیا کرتی تھیں۔ اور اب تو خط لکھنا بھی جان پہ آتا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو دو چار افسانے بھی تخلیق کر چکی تھیں اور اکثر بوجھل تنقیدی مضامین کالج میگزین اور مقامی اخباروں میں شائع بھی ہو چکے تھے، سہیلیاں تو خاصی مرعوب ہوا کرتیں۔ انھیں پورا یقین تھا، ان کے بھاری بھرکم مضامین آج تک کسی سہیلی نے نہ پڑھے ہوں گے۔ یا تو وہ خود پڑھتی تھیں اور یا کاتب غریب کہ اس کی روزی روٹی کا معاملہ تھا۔

لیکن آج رہ رہ کر دل کروٹیں لے رہا تھا، بلکہ پہلو میں مچل رہا تھا کہ "تم بازنی" چنانچہ انھیں مجاہد کی شان سے ۔ ۔ ۔ قلم سنبھالا۔ ۔ ۔ "کیا لکھوں۔ ۔ ۔ تنقیدی مضامین۔ ۔ ۔ مگر کیا۔ ۔ ۔ ؟؟ کلامِ غالب میں فلسفہ ۔ ۔ ۔ ؟؟ دماغ پکارا۔ ۔ ۔ "ہاں ہاں سنبھل کر کہیں اس کوچہ میں منہ کے بل نہ آ رہنا"۔ ۔ ۔ "غالب کی ظرافت؟ بس بس" اس نے صاد کر دیا۔ "بالکل ٹھیک — ہلکا پھلکا مضمون ہے۔ ۔ ۔ اور۔ ۔ ۔

پھر تو موصوفہ نے کلامِ غالب۔ ۔ (کبھی کبھار نسخۂ حمیدیہ بھی ان کی نظر سے گزرا تھا) پر خاصہ دلچسپ مضمون لکھ لیا۔ زمانۂ طالب علمی کی ایک ایک بات نظروں میں گھومنے لگی۔ کیسی بے فکری، خوش باشی۔

مضمون نویسی کے مقابلہ میں اسے پہلا انعام ملا ہے۔ "دیوانِ غالب" جس پر مس فرزانہ خانم نے بخطِ غبار لکھا تھا۔ ع "جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے"
اور اسے کبھی رونا نہ آیا۔ رونے کی افادیت ہی سمجھ میں نہ آسکی۔ اچھی بھلی آنکھوں کو کیوں بھگوئیں . . . رونا تو اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا ہے۔
اور کر یہاں تو بات تھی غالب کی ظرافت کی۔ حالی کا وہ "حیوانِ ظریف" جس کے حرف حرف میں جہاں ظرافت کروٹیں لے رہا ہے۔
لکھتے لکھتے شاید ساری رات بیت گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی . . . "ہیں ابھی گیارہ ہی بجے ہیں۔ سردیوں کی راتیں بھی بڑی طویل ہوتی ہیں۔ ایوب میاں، بجلی بند کرنے کی منتیں کر رہے تھے۔ مگر آج تو بیگم کو ایک ہی دھن سوار تھی۔ "مضمون مکمل کرنا ہے"۔ . . . آخر خطوطِ غالب میں جو شوخی اور بذلہ سنجی ہے وہ کیوں نہ بیان کی گرفت میں لائی جائے۔"
اور پھر مضمون آگے بڑھتا رہا۔ قلم دوڑتا رہا اور جب شوخیٔ گفتار میں اس خط کے حوالہ تک پہنچیں۔

"رجب ۱۲۲۶ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا . . . اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا . . .
. . . جب یہ دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں"

تو ایوب میاں سوتے سوتے چونک اٹھے۔ بیگم سسکیوں، ہچکیوں سے رو رہی تھیں اور وہ بیچارے حیران تھے کہ ؎ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف اور ہزاروں کی دلپسند چائے!
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب!!

لاسا اسپیشل چائے
لسا اسپیشل چاکلیٹ چائے
لاسا سوپر بلنڈ ٹی
ھیڈ آفس:
نیلگری ٹی امپوریم معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد اے پی، انڈیا

غالب حیدرآبادی — غزلیں

سخت قلّت جو ہے یہ پانی کی
ہے یہ پھٹکار مستان جانی کی
فکر جتنی ہے سب کو پانی کی
اتنی قطعاً نہیں جوانی کی
جب سے آئے ہیں سائیں بابا یہاں
ایک برسی نہ بوند پانی کی
غنڈے بورنگ پہ بور کرتے ہیں
باج لینے لگا ہے پانی کی
بات میں اک نکل گئے جیسے
اور صورت ہے خونا خانی کی
بور کرنے کو بور سمجھے ہیں
پھیلے شش سمت راجد ھانی کی
فکر خوباں کی گم ہے پانی میں
سُدھ نہیں ان کو سُرمہ دانی کی
سارے صیاد مرغ چھوڑ چکے
پانی جب تک تھا عمر غسانی کی
اپنے محبوب کی قسم یارب
اب نہ کرنا کمی تو پانی کی
مجھ کو وہ ڈنک اچھل کے مار گیا
میں نے جس سے بھی مہربانی کی
بیاہ رہتے تھے مومنوں کے نکاح
اب نہیں صورت عقد ثانی کی
نام غالب ترا لکھے کیوں کر
سیاہی میں کمی ہے پانی کی

ڈورِ غالب سے معذرت کے ساتھ

کسی کے نکلے صدقی صدکسی کے بیش و کم نکلے
نکلتے میرے ارماں کیا مرے تو صرف غم نکلے
بھلے ڈاکو تھے وہ اگلے دنوں کے ڈال کر ڈاکہ
زر اس کو بانٹ دیتے تھے جو بے دام و درم نکلے
بنام خوش نویسی کام لیجے بد نویسوں سے
کہ ایسے خوش نویس اب کان پہ رکھ کر قلم نکلے
ادارے خوشخطی کے ہیں تو ماہر بدنویسی کے
تو پھر شاگرد کیسے خوش نویس و خوش قلم نکلے؟
بپا ہوتا ہے اردو کا جو شہرہ وقفہ وقفہ سے
مچا کر دھوم اردو کی یہ کچھ اہلِ دھرم نکلے
اُچک کر یہ اُچکّے گئے میدانِ اردو میں
بھڑک کر جس طرح جنگل سے وحشی بے رحم نکلے
ہزاروں جو ہے کھا کر بلّیاں نکلی ہیں یوں اکثر
کہ ہندو ہو گئے یہ و مومناں سمجھے حرم نکلے
چھوٹی شاہ کے گھر جشنِ میلاد النبی میں جب
بہت سے دیگ بریانی کے جس دم دمبدم نکلے
تو پہنچی لُٹ گئے بریاں اہلِ پولس کی بھی ناکوں میں
سو نکلے چند اک استاد تا کہ دل سے غم نکلے
پلاؤں لے کے دھاوا کر دیا درویش کے گھر پہ
کہ نکلے کالا دھن شاید وہاں یا پھر رقم نکلے
نہ آیا ہاتھ جب کچھ بھی تو بولے چھوٹی شاہ سے
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
جو ہوتی بات دشمن سے تو پھر بھی بات تھی لیکن
یہاں یہ حال ہے آپس میں ہی تیغِ دو دم نکلے
ہماری زندگی میں پیچ و خم کی حد نہیں کوئی
جو کھولا ایک پیچ و خم تو لاکھوں پیچ و خم نکلے
کھڑی ہیں اب تو پولس و الیاں ہر سمت سے گھر پہ
سر کٹ چھاپ اپنے فرہاد وں کا تا کہ اُن پہ دم نکلے
گدھے سب کر رہے تھے جشن کھا کر گلگلے غالب
جو نکلے ہیں جنازوں میں تو ہم اہلِ قلم نکلے

مختار یونس
(مالیگاؤں)

کرکٹ آپریشن

کمیونسٹ ممالک کا نظریہ ہے کہ کرکٹ ایک بورژوا گیم ہے جس میں "مظلوم" گیند کا بیدردی سے استحصال کیا جاتا ہے۔ بلّہ گیند پر اسی طرح ظلم ڈھاتا ہے جس طرح سرمایہ دار مزدور پر۔ مزدور کی تقدیر کا ستارہ گردش میں رہتا ہے تو گیند اپنی قسمت کا خود سیارہ ہے جو ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ مزدور محنت کرتا ہے تو پیداوار سے گودام بھر جاتے ہیں مگر گیند دوڑ بھاگ کرتے کرتے ریٹائر ہو جاتی ہے۔ مگر پیداوار ٹھوس شکل میں حاصل نہیں ہوتی۔ رنز کے اسکور بورڈ پر ظاہر ہوتی ہے جس سے ملک و قوم کا پیٹ تو نہیں بھرتا مگر کچھ لوگوں کو لمحہ بھر کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اسی لئے اس گیم سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو قوم اس کھیل کی رکھیل ہو جاتی ہے وہ دکان، مکان کا کام چھوڑ کر کارخانے و دواخانے سے بے نیاز ہو کر، علم و فن سے کنارہ کش ہو کر بحرِ کرکٹ میں ڈوب جاتی ہے۔ ترقی کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔

ماضی میں لکھنؤ کے لوگ بٹیر بازی، پتنگ بازی، شطرنج بازی اور مرغ بازی کیلئے بدنام تھے مگر آج زمانہ کرکٹ کھیلنے، دیکھنے اور سننے میں سرگرم ہے مگر اسے کوئی برا نہیں سمجھتا۔ لوگ مہنگائی کا رونا روتے ہیں مگر اس مہنگے گیم کے لئے روپیہ اور وقت خرچ کرتے ہیں انہیں مہنگائی کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ اب تو عربوں کو بھی شارجہ ٹورنمنٹ کا روگ لگ گیا ہے، شاید وہ چاہتے ہیں کہ کوئی بلے باز گیند بم سے ایسا چھکا مارے جو اسرائیل کی اسٹمپ اڑا دے۔ عربوں کا اربوں روپیہ ضائع ہو رہا ہے بلکہ مائع ہو رہا ہے اور بہتے بہتے خلیج کرکٹ میں گر رہا ہے۔ کرکٹ کے شیدائی جو کرکٹ کا عالمی ریکارڈ بٹورتے، سمیٹتے اور جمع کرتے رہتے ہیں، وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ اس مضمون نگار کو کلین بولڈ کرنے والے کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

بہرکیف ہمارا قلم کرکٹ کا پوسٹ مارٹم الفاظ کے نشتر سے کرنے کے لئے حرکت میں آگیا ہے ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

رَن :- جب بلے باز تلملا کر، دانت کچکچا کر گیند پر "ضربِ عظیم" لگاتا ہے اور گیند مخالف ٹیم کے ہر کھلاڑی سے دامن بچا کر بھاگتی ہے تو بلے باز اپنے بلے سمیت، سامنے والے اسٹمپ کی طرف بھاگتے ہیں۔ اگر وہ صحیح سلامت اپنی منزل "اسٹمپ" پر پہنچ گئے تو ایک رن بنتا ہے۔ جب ستم زدہ گیند میدانِ کرکٹ کی سرحد سے باتیں کرنے لگے تو چوکا حاصل ہوتا ہے اور اس طرح بلے باز کے کھاتے میں چار رن جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر بلّہ زدہ گیند دہشت کے مارے سرحدِ کرکٹ کو پھلانگ جائے

اور کسی تماشائی کے کاندھے پر رکھی ہوئی گیند کو ہٹ کرے یا نہ کرے تو سکسر بنتا ہے یہ وہ مفت کے چھ رن ہیں جو بلے باز بغیر دوڑ بھاگ کے حاصل ہو جاتے ہیں۔ بلے باز پیڈ میں پھولا نہیں سماتا اور تماشائی اپنی نشست پر اسپرنگ کی طرح اچھل اچھل پڑتے ہیں۔ بلے باز کی رنوں کے ساتھ تماشائیوں کی رگوں میں خون بڑھتا ہے۔ دوڑ بھاگ کا حاصل یعنی رنز جمع کرنے کے لئے ایک تختۂ کرکٹ ہوتا ہے جسے انگریزی میں اسکور بورڈ کہتے ہیں جسے اکثر شعرا " گردش افلاک " سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔ رن کو بھاگم بھاگ، تگ ودو، دوڑ دھوپ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً فلاں کرکٹر نے پچاس بھاگم بھاگ بنائے یا فلاں باؤلر نے ۵ دوڑ دھوپ دے کر ۶ کھلاڑیوں کو " خارج میدانِ کرکٹ " کر دیا۔ کرکٹ میں بہت سی رنز NO BALL کا نتیجہ ہوتی ہیں یہ منافع کی رنیں کہلاتی ہیں۔ گویا ٹیم کو " صدقہ و خیرات " ملا ہو۔ ہندی والے اسے " خیراتی دوڑیں " کہہ سکتے ہیں۔ سو رنز حاصل کرنے پر سنچری بنتی ہے۔ جو ریکارڈ بک میں نمایاں مقام پاتی ہے جو بلے باز سختی سے اور شگفتگی سے بھکتی کے ساتھ کریز پر جم جاتے ہیں وہ سو رنز بنا کر ٹیم پر احسان کرتے ہیں۔

بلے باز :- رنوں کی تخلیق کرنے والے خالقوں کو بلے باز کہا جاتا ہے۔ کھیل شروع ہوتے ہی دو بلے باز اس طرح اسٹمپ کے پاس آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے آئینے کے سامنے عکس اور شخص۔ ان کے ہاتھ میں بلا دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بجرنگ بلی ہنومان ہاتھ میں " گرز " لئے آ رہے ہوں۔ جب ایک بلے باز ریٹائر ہوتا ہے تو اس کے بعد یکے بعد دیگرے نو اوتار میدانِ کرکٹ میں نازل ہوتے ہیں۔ اور اپنا اپنا چمتکار دکھا کر پویلین کے " برلوک " میں سدھار جاتے ہیں۔ یہ اسٹمپ کے باڈی گارڈز ہوتے ہیں۔ جب کوئی راکشش نما بولر " گیندبم " سے اسٹمپ کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے تو یہ اپنے گرز سے ان بموں کو ایک نیا رخ نیا موڑ دیتے ہیں۔ گیند کو بھاگتے دیکھ کر عکس اور شخص کھلاڑی ایک دوسرے کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان کی دوڑ بھاگ قابلِ دید اور قابلِ داد ہوتی ہے۔ یہ اتنی تیز بھاگتے ہیں جتنا فساد کے دوران پبلک۔ پبلک سڑکوں اور گلیوں میں بھاگتی ہے اور یہ پچ پر ہی دورہ کرتے رہتے ہیں۔ سورما بلے باز گیند کو جس سمت ہانکتے ہیں مخالف ٹیم کے سارے کھلاڑی اسی طرف بھاگتے ہیں۔ " چور چور پکڑو پکڑو " کی صدائیں اُن کے من میں گونجتی رہتی ہیں جو بلے باز تگ ودو اور دوڑ دھوپ سے تنگ آ جاتے ہیں تو اُن پر آؤٹ ہونے کا موڈ طاری ہو جاتا ہے۔ پویلین انہیں آواز دینے لگتا ہے اور یہ کبھی رن آؤٹ ہو جاتے ہیں کبھی کلین بولڈ اور بعض اوقات کیچ آؤٹ یا ایل بی ڈبلیو کی مہربانی سے انہیں آرام کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ بلے بازی میں سورما ہوتے ہیں وہ خود کم دوڑتے ہیں اور مخالفین کو دوڑا دوڑا کر سُرمہ بنا ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نصیب میں سینکڑے، چھکے، چوکے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کی بھگدڑ دیکھ کر کچھ حاسد اور کینہ پرور لوگ انھیں ہندی میں " بھگوڑا " کہتے ہیں۔

بولر :- بلے باز کی سمت گیند پھینکنے والے حضرات بولر کہلاتے ہیں۔ انہیں " پھینکوا " بھی کہا جاتا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اسٹمپ کے دشمن ہیں بعض کا خیال ہے یہ بلے باز کو زخمی کرنے کے لئے انتقاماً گیند برساتے ہیں۔ جس طرح امریکہ نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر بم برسا کر جاپان کو ہٹلر نوازی کا مزہ چکھایا تھا۔ جس طرح روس نے افغانستانی پچ پر کیمیائی بم بالنگ کر کے مجاہدین کو کلین بولڈ کرنا چاہا تھا۔ یا جس طرح اسرائیل لبنان کی فلسطینی اسٹمپ پر بمپر بالنگ کرتا ہے۔ غرض دنیا کا ہر طاقت ور فرد کمزور پہ بالنگ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اور مخالفین کو کلین بولڈ کرنا اپنا فرض گردانتا ہے کرکٹ کا بولر ایسے ہی چنگیز خان و ہلاکو کا جانشین ہوتا ہے۔ اگر گیند باز کے ہاتھوں میں توانائی ہو، بدن میں پھرتی ہو، جسم

بن طاقت ہو اور مزاج میں گرمی ہو تو وہ فاسٹ بولر بن جاتا ہے۔ وہ امپائر کی انگلی پر ناچتا ہے۔ پیچھے دوڑتا ہے آگے بھاگتا ہے اور گیند میں تمام قوت انڈیل دیتا ہے۔ گیند توپ کے گولے کی طرح اسٹمپ کی فصیل مسمار کرنے کیلئے روانہ ہوتی ہے یا اسٹمپ تینوں شانے ہو جائے گی یا بلے باز کے بدن کی وکٹیں اڑ جائیں گی اور وہ پویلین ہاسپٹل میں شریک ہو جائے گا۔ دراصل بولر چاہتا ہے کہ بلے باز کرکٹ سے توبہ کرلے کیونکہ ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

بولر کی دوسری ذات اسپنر ہے۔ اِسپن بولر گیند کو ایسی چابی بھر کر پھینکتا ہے کہ وہ بلے باز تک پہنچتے پہنچتے اپنی رفتار کی ادا بار بار بھول جاتی ہے۔ رفتار میں تیزی اور شدت کم ہوتی ہے مگر اس میں ایسا "لہراؤ" ہوتا ہے کہ اس کی گرفتاری پر بلے باز دھوکہ کھا جاتا ہے اور اپنی وکٹ بولر کے حوالے کر دیتا ہے۔ تاکہ مخالف ٹیم کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کہتے ہیں جس طرح بگڑا ہوا گویا قوال بن جاتا ہے اسی طرح بگڑا اور بکھرا بولر فاسٹ بولر سے اسپن بولر بن جاتا ہے۔ اسپن بولنگ کیلئے بولر کو دوڑنا بھاگنا نہیں پڑتا۔ کوئی بولر گیند لڑھکا کر بالنگ نہیں کر سکتا۔ نہ ہی آنکھ کی سیدھ میں اسٹمپ کا نشانہ لگا کر گیند پھینکتا ہے۔ بلکہ وہ دستِ بازو کے پرکار سے کاندھے کے مرکز سے دائرہ بناتا ہے اور پھر گیند کو بلے باز کی طرف داغ دیتا ہے۔

<u>فیلڈر:-</u> کرکٹ کی دو ٹیمیں مقابلے میں آتی ہیں۔ ایک ٹیم کا کپتان پویلین میں بیٹھا بلے باز سپلائی کرتا ہے اور دوسری ٹیم کا شیرازہ میدانِ کرکٹ میں بکھر جاتا ہے۔ ٹیم کے بیش قیمت ہیرے موتی اور کنکر میدان میں دور دور پڑے ہوتے ہیں۔ یہ فیلڈرس نہیں سپاہی و حولدار ہیں جو گیند کو بھاگنے کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں (نوٹ مدعوئے کرکٹ میں در بدر پھرنے والے کھلاڑیوں کو فیلڈرس کہا جاتا ہے۔) یہ اپنے کپتان کی ہدایت پر اپنا جغرافیہ بدلتے رہتے ہیں ابھی "کوہِ اسٹمپ" کے دامن میں کھڑے ہیں اور اوور بدلتے ہی وہ کبھی سرحدی جوان بن جاتے ہیں یا سطحِ مرتفع میٹ کے آس پاس قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔ بعض فیلڈرس گیند کے پیچھے یوں بھاگتے ہیں گویا وہ مرغی پکڑ رہے ہیں۔ گیند کے تعاقب میں عمر گذرتی ہے جس وقت بلہ زدہ گیند فضا میں اچھلتی ہے تو فیلڈرس اسے ہاتھوں ہاتھ لینے کیلئے دوڑ پڑتے ہیں۔ اُچکے، اُچک لیتے ہیں "کیچو رے" اُسے کیچ کر لیتے ہیں۔ ہر فیلڈر بلے باز کی "غیر فطری موت" پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ کیچ کرنے والے کو فیلڈرس گود لے لیتے ہیں۔ اگر کیچ بہت مشکل ہو اور فیلڈر نے ہاتھ پیر تڑا کر کیچ لے لیا تو کپتان اسے کاندھے پر بٹھا لیتا ہے اور رپورٹر اخبار میں اس کا فوٹو چھپوا دیتا ہے۔

<u>وکٹ کیپر:-</u> اسٹمپ کے پیٹھ پیچھے جو شخص تقریباً رکوع کی حالت میں کھڑا ہے اور دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے وکٹ کیپر کہلاتا ہے۔ وہ گیند پروف لباس و دستانے و پیڈ سے مسلح ہے۔ وہ اسٹمپ کے اس پار سے دیکھ لیتا ہے کہ بولر کی قاتلانہ ادائیں کیا رنگ لانے والی ہیں۔ وہ اسٹمپ پر تخریبی کارروائی کرنے کے لئے تاک میں رہتا ہے۔ گیند بازی کے دوران اس کے دستِ دعا اُٹھ جاتے ہیں۔ "اے گیندِ متحرک! مجھے سنہری موقع عطا کر کہ تیرے طفیل اور ٹیم کے صدقے اس کم بخت بلے باز کو اسٹمپ آؤٹ کر دوں۔ آ بھی جا کہ میری ہتھیلی کے دستانے تجھے بلاتے ہیں۔

وکٹ کیپر بہت ہمت والا، بہادر اور پھرتیلا ہوتا ہے۔ کمزور اور بزدل حضرات وکٹ کیپر بن نہیں سکتے۔ کیونکہ طوفانی گیند جو بلے باز سے ٹکرا کر آتی ہے عموماً وکٹ کیپر کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتی ہے اور وکٹ کیپر اپنے ساتھیوں کی معرفت اسے بولر تک پہنچا دیتا ہے۔ بولر اور وکٹ کیپر کا موازنہ حسبِ ذیل کالم سے کیا جا سکتا ہے۔

وکٹ کیپر	بولر
(۱) یہ اسٹمپ کے اِس پار واقع ہے۔	(۱) یہ سامنے والی اسٹمپ کے اُس پار واقع ہے۔
(۲) یہ ساکن ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سکونِ قلب سے وکٹ سنبھالتا ہے۔	(۲) یہ متحرک ہوتا ہے۔ یہ بڑی بے چینی سے وکٹ کے تنکے اُڑانے کے لئے سرگرم عمل ہوتا ہے۔
(۳) یہ گیند اپنے ہاتھوں میں درآمد کرتا ہے۔	(۳) یہ گیند اپنے ہاتھ سے برآمد کرتا ہے۔
(۴) یہ بلے باز کا قریبی دشمن ہے جو اسٹمپ کے پیچھے پیچھے رہ کر وار کرتا ہے۔	(۴) یہ بلے باز کا دشمن بعید ہے جس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اُسے آوٹ کردے

اسٹمپ :- بلے بازوں کی سنگ و دو اور چہل قدمی کے لئے میدان میں جو قالین بچھا ہوتا ہے اُسے "پیاٹ" کہتے ہیں جو ٹھیٹھ اسٹمپ کے قدموں پر سجدہ ریز ہوتی ہے۔ اسٹمپ کی تین ڈنڈیاں آمنے سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ دُور سے (III) تھرڈ کلاس نظر آتی ہے۔ کرکٹ کے حاسدین کی نظر میں یہ تین ڈنڈیاں ثابت کرتی ہیں کہ یہ کرکٹ گیم III کلاس گیم ہے جسے III کلاس لوگ کھیلتے ہیں دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ مگر کرکٹ کے وکیل صفائی کا کہنا ہے کہ یہ تین اسٹمپ تاش کے تین یکّے کا درجہ رکھتے ہیں اور تاش کے کھیل میں جس کے پاس تین یکّے ہوں وہ خوش نصیب اور کامیاب ہوتا ہے۔

ان تین ڈنڈیوں کے درمیان بلے باز تیز رفتاری سے مارچ کرتے ہیں۔ اس طرح رن سازی کو سوپر فاسٹ ڈانڈی مارچ کہہ سکتے ہیں، آندھی طوفان کی طرح پدیا ترا کرنے والے بلے باز کو مہاتما آندھی کہا جاسکتا ہے اور رن آوٹ ہونے والے شہید کو مہاتما (انانا نانانا) کی پدوی دی جاسکتی ہے۔ اگر اسٹمپ کی حفاظت کے لئے بلے باز کا جسم بیچ میں آجائے تو گیند انہیں ایل بی ڈبلیو قرار دیتی ہے۔ بلے باز کو آوٹ کرنے کا سب سے آسان اور سستا نسخہ یہی ہے جو امپائر کے دست مبارک سے کبھی بھی جاری کیا جاسکتا ہے۔ ایل بی ڈبلیو قرار دیا جانے والا کھلاڑی منہ بسور کر پویلین میں یوں روانہ ہوتا ہے جیسے کوئی روٹھی ہوئی بیوی میکے سدھارتی ہے۔

امپائر :- کرکٹ کی دنیا کا بدنام بادشاہ امپائر ہے۔ اسکی محفل میں سارے کھلاڑی با ادب کھڑے ہونے پر مجبور ہیں۔ کسی کھلاڑی کی کیا مجال جو اس کے سامنے پالتھی مار کے تھکان اتارلے۔ اس کے اشارے پر بولر کے ہاتھ سے گیند طلوع ہوتی ہے اسی کے اشارے پر بلے باز پویلین میں غروب ہوتا ہے۔ اس کے دربار میں ہر کھلاڑی اپیل کرسکتا ہے مگر اس کے فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ میں کوئی اپیل نہیں کرسکتا۔

امپائر قوم نے دنیا کے عظیم بلے بازوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ اس پر جانبداری برتنے کا الزام ہر کرکٹ میچ اور سیریز میں لگایا گیا ہے۔ مگر الزام دینے والے نوٹ کرلیں کہ امپائر بھی انسان ہے اس کی پسلیوں کے اسٹمپ کے پیچھے دل کا وکٹ کیپر دھڑکتا رہتا ہے اور دل کی پیچ میں جذبات کی بالنگ، بیاٹنگ اور فیلڈنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے اور جذبات کا تقاضہ ہے کہ جن سے لگاؤ ہو اسی طرف دل کا جھکاؤ ہو۔ ویسا ہی فیصلہ اور سجاؤ ہو، چاہے سامنے والے کے دل میں اس داؤ سے گھاؤ ہو۔ اسطرح جانبداری برت کر امپائر انسانی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ جب جانبداری کھلاڑیوں کے انتخاب میں ہوتی ہے تو امپائر کی جانبداری پر اتنا واویلا کیوں ؟

[یادِ رفتگاں]

سعادت حسن منٹو

چچا سام کے نام

منٹو کا ایک خط

۳۱. لکشمی مینشنز ہال روڈ
لاہور. مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۱ء

چچا جان. السلام علیکم

یہ خط آپ کے پاکستانی بھتیجے کی طرف سے ہے، جسے آپ نہیں جانتے. جسے آپ کی سات آزادیوں کی مملکت میں شاید کوئی بھی نہیں جانتا.

میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں کر بنا، کیسے آزاد ہوا، یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے یہی وجہ ہے کہ میں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں. کیوں کہ جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا، اسی طرح میں کٹ کر آزاد ہوا ہوں. اور چچا جان یہ بات تو آپ جیسے ہمہ دانِ عالم سے چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیئے کہ جس پرندے کو پَر کاٹ کے آزاد کیا جائے گا، اس کی آزادی کیسی ہوگی ــــ خیر اس قصے کو چھوڑیئے.

میرا نام سعادت حسن منٹو ہے. میں ایک ایسی جگہ پیدا ہوا تھا جو اب ہندوستان میں ہے. میری ماں وہاں دفن ہے، میرا باپ وہاں دفن ہے. میرا پہلا بچہ بھی اسی زمین میں سو رہا ہے، لیکن اب وہ میرا وطن نہیں. میرا وطن اب پاکستان ہے جو میں نے انگریزوں کے غلام ہونے کی حیثیت میں پانچ چھ مرتبہ دیکھا تھا.

میں پہلے سارے ہندوستان کا ایک بڑا افسانہ نگار تھا. اب پاکستان کا ایک بڑا افسانہ نگار ہوں میرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں. لوگ مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ــــ سالم ہندوستان میں مجھ پر تین مقدمے چلے تھے. یہاں پاکستان میں ایک. لیکن اسے ابھی بنے بھی کے برس ہوتے ہیں.

انگریزوں کی حکومت بھی مجھے فحش نگار سمجھتی تھی. میری اپنی حکومت کا بھی میرے متعلق یہی خیال ہے. انگریزوں کی حکومت نے مجھے چھوڑ دیا تھا، لیکن میری اپنی حکومت مجھے چھوڑتی نظر نہیں آتی. عدالتِ ماتحت نے مجھے تین ماہ قیدِ با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی تھی. سیشن میں اپیل کرنے پر میں بری ہو گیا. مگر میری حکومت سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے. چنانچہ اب اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی ہے کہ سیشن کے فیصلے پر نظرثانی کرے اور مجھے قرار واقعی سزا دے . . . . دیکھئے عدالتِ عالیہ کیا فیصلہ دیتی ہے.

میرا ملک آپ کا ملک نہیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر عدالتِ عالیہ مجھے سزا دے دے تو میرے ملک میں ایسا کوئی پرچہ نہیں جو میری تصویر چھاپ سکے۔ میرے خاندان کی تصویریں چھاپ سکے میرے تمام مقدموں کی روداد کی تفصیل چھاپ سکے۔

میرا ملک بہت غریب ہے اس کے پاس آرٹ پیپر نہیں ہے۔ اس کے پاس اچھے چھاپے خانے نہیں ہیں اس کی غربت کا سب سے بڑا ثبوت میں ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا چچا جان بیس بائیس کتابوں کا مصنف ہونے کے بعد بھی میرے پاس رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں۔ اور یہ سن کر تو آپ حیرت میں غرق ہو جائیں گے کہ میرے پاس سواری کے لیے کوئی پیکارڈ ہے نہ ڈوج۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر کار بھی نہیں۔

مجھے کہیں جانا ہو تو سائیکل کرائے پر لیتا ہوں۔ اخبار میں اگر میرا کوئی مضمون چھپ جائے اور سات روپے فی کالم کے حساب سے مجھے بیس پچیس روپے مل جائیں تو میں تانگے پر بیٹھتا ہوں اور اپنے یہاں کی کشید کردہ شراب بھی پیتا ہوں۔ یہ ایسی شراب ہے کہ اگر آپ کے ملک میں کشید کی جائے تو آپ اس ڈسٹلری کو ایٹم بم سے اُڑا دیں۔ کیونکہ ایک برس کے اندر اندر ہی یہ خانہ خراب انسان کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

میں کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ اصل میں مجھے بھائی جان ارسکائن کولڈول کو آپ کے ذریعے سے سلام بھیجنا تھا۔ ان کو تو خیر آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ان کے ایک ناول "گوڈز لٹل ایکڑ" پر آپ مقدمہ چلا چکے ہیں۔ جرم وہی تھا جو اکثر یہاں میرا ہوتا ہے۔ یعنی فحاشی۔

یقین مانئے چچا جان مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی جب میں نے سنا تھا کہ ان کے ناول پر سات آزادیوں کے ملک میں فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا ہے۔ آپ کے یہاں تو ہر چیز ننگی ہے۔ آپ تو ہر چیز کا چھلکا اُتار کر الماریوں میں سجا کے رکھتے ہیں۔ وہ پھل ہو یا عورت، مشین ہو یا جانور، کتاب ہو یا کیلنڈر۔ آپ تو ننگ کے بادشاہ ہیں۔ میرا خیال تھا آپ کی مملکت میں طہارت کا نام فحاشی ہوگا مگر چچا جان آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ بھائی جان اسکائن کولڈول پر مقدمہ چلا دیا؟

میں اس صدمے سے متاثر ہو کر اپنے ملک کی کشید کردہ شراب زیادہ مقدار میں پی کر یقیناً مر گیا ہوتا اگر میں نے فوراً ہی اس مقدمہ کا فیصلہ نہ پڑھ لیا ہوتا۔ یہ میرے ملک کی بدقسمتی تو ہوتی کہ ایک انسان خس کم جہاں پاک ہونے سے رہ گیا۔ لیکن پھر میں آپ کو یہ خط کیسے لکھتا۔ ویسے میں بڑا سعادت مند ہوں۔ مجھے اپنے ملک سے پیار ہے۔ میں انشاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں مر جاؤں گا۔ اگر خود نہیں مروں گا تو خود بخود مر جاؤں گا، کیونکہ جہاں آٹا روپے کا پونے تین سیر ملتا ہو وہاں بڑا ہی بے غیرت انسان ہوگا جو زندگی کے روایتی چار دن گزار سکے۔

ہاں تو میں نے مقدمے کا فیصلہ پڑھا اور میں نے خانہ ساز شراب زیادہ مقدار میں پی کر خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ بھئی چچا جان کچھ بھی ہو، آپ کے ہاں ہر چیز ملمع چڑھی ہے، لیکن وہ جج جس نے بھائی جان ارسکائن کو فحاشی کے جرم سے بری کیا، اس کے دماغ پر یقیناً ملمع کا جھول نہیں تھا۔ اگر یہ جج افسوس ہے کہ میں ان کا نام نہیں جانتا، زندہ ہیں تو ان کو میرا عقیدت مندانہ سلام ضرور پہنچا دیجئے۔

ان کے فیصلے کی یہ آخری سطور ان کے دماغ کی وسعت کا پتا دیتی ہیں۔

"میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو سختی سے دبا دینے پر پڑھنے والوں میں خواہ مخواہ تجسس اور استعجاب پیدا ہوتا ہے جو انہیں شہوت پسندی کی ٹوہ لگانے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ حالاں کہ اصل کتاب کا یہ منشاء نہیں ہوتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے صرف وہی چیز منتخب کی ہے جسے وہ امریکی زندگی کے کسی مخصوص طبقے کے متعلق سچا خیال کرتا ہے۔ میری رائے میں سچائی کو ادب کے لیے ہمیشہ جائز قرار دینا چاہیئے!"

میں نے عدالتِ ماتحت سے یہی کہا تھا، لیکن اس نے مجھے تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے کی سزا دے دی ــــ اس کی رائے یہ تھی کہ سچائی کو ادب سے ہمیشہ دور رکھنا چاہیئے ــــ اپنی اپنی رائے ہے۔

میں تین ماہ قید بامشقت کاٹنے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ تین سو روپے کا جرمانہ مجھ سے ادا نہیں ہوگا۔ چچا جان آپ نہیں جانتے میں بہت غریب ہوں ــــ مشقّت کا تو میں عادی ہوں لیکن روپوں کا عادی نہیں۔ میری عمر اتنالیس برس کے قریب ہے اور یہ سارا زمانہ مشقّت ہی میں گزرا ہے ــــ آپ ذرا غور تو فرمائیے کہ اتنا بڑا مصنف ہونے پر بھی میرے پاس کوئی پیکارڈ نہیں ــــ

میں غریب ہوں، اس لیے کہ میرا ملک غریب ہے۔ مجھے تو خیر دو وقت کی روٹی کسی نہ کسی حیلے مل جاتی ہے۔ مگر میرے بھائی کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں یہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔

میرا ملک غریب ہے ــــ جاہل ہے۔ کیوں؟ ــــ یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے چچا جان۔ یہ آپ کے اور آپ کے بھائی جان بل کے مشترکہ ساز کا ایسا تار ہے جسے میں چھیڑنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ آپ کی سماعت پر گراں گزرے گا۔ میں یہ خط ایک برخوردار کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں، اس لیے مجھے اوّل تا آخر برخوردار ہی رہنا چاہیئے۔

آپ ضرور پوچھیں گے اور بڑی حیرت سے پوچھیں گے کہ تمہارا ملک غریب کیوں کر ہے جب کہ میرے ملک سے اتنی پیکارڈیں، اتنی بیوکیں ــــ میکس فیکٹر کا اتنا سامان جاتا ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے چچا مگر میں آپ کے اس سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ اس لیے آپ اس کا جواب اپنے دل سے پوچھ سکتے ہیں (اگر آپ نے اپنے قابل سرجنوں سے کہہ کر اسے اپنے پہلو سے نکلوا نہ ڈالا ہو)

میرے ملک کی وہ آبادی جو پیکارڈوں اور بیوکوں پر سوار ہوتی ہے، میرا ملک نہیں ــــ میرا ملک وہ ہے جس میں مجھ ایسے اور مجھ سے بدتر مفلس بستے ہیں۔

یہ بڑی تلخ باتیں ہیں۔ ہمارے یہاں شکر کم ہے، ورنہ میں ان پر چڑھا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ اس کو بھی چھوڑیئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے حال ہی میں آپ کے ملک کے ایک ادیب EVELYN WAUGH کی تصنیف THE LOVED ONES پڑھی تھی۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔

یوں تو آپ کے ملک کی انفرادیت کا میں پہلے بھی معترف تھا مگر یہ کتاب پڑھ کر تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا ــــ

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب ہے ؎ واہ وا، واہ وا، واہ وا،

چچا جان! واللہ مزا آگیا۔ کیسے زندہ دل لوگ آپ کے ملک میں بستے ہیں۔

ایوی لِن وا ہمیں بتاتا ہے کہ آپ کے کیلی فورنیا میں مُردوں یعنی بچھڑے ہوئے عزیزوں پر بھی ملمع کاری کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے بڑے بڑے ادارے موجود ہیں۔ مرنے والے عزیز کی شکل مکروہ ہو تو ان میں سے کسی میں بھیج دیجئے۔ فارم موجود ہے، اس میں اپنی خواہشات درج کر دیجئے۔ کام حسب منشا ہوگا۔ یعنی مردے کو آپ جتنا خوبصورت بنوانا چاہیں، دام دے کر بنوا سکتے ہیں۔ اچھے سے اچھا ماہر موجود ہے، جو مردے کے جبڑے کا آپریشن کر کے اس پر میٹھی سے میٹھی مسکراہٹ ثبت کرسکتا ہے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ماتھے پر حسب ضرورت نور پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ سب کام ایسی چابکدستی سے ہوتا ہے کہ قبر میں منکر نکیر بھی دھوکہ کھا جائیں۔

بھئی خدا قسم چچا جان، آپ کے ملک کا کوئی جواب پیدا نہیں کرسکتا۔

زندوں پر آپریشن سنا تھا، پلاسٹک سرجری سے زندہ آدمیوں کی شکل سنواری جاسکتی ہے اس کے متعلق بھی یہاں کچھ چرچے ہوئے تھے، مگر یہ نہیں سنا تھا کہ آپ مُردوں تک کی شکل سنوار دیتے ہیں۔

یہاں آپ کے ملک کا ایک سیاح آیا تھا۔ چند احباب نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا۔ اس وقت میں بھائی ایوی لِن وا کی کتاب پڑھ چکا تھا۔ میں نے ان سے ان کے ملک کی تعریف کی اور یہ شعر پڑھا ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ؎ ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

سیاح صاحب میرا مطلب نہ سمجھے مگر حقیقت یہ ہے چچا جان کہ ہم نے اپنی صورت کو بگاڑ رکھا ہے۔ اتنا مسخ کر رکھا ہے کہ اب وہ پہچانی بھی نہیں جاتی۔ اپنے آپ سے بھی نہیں ــــ اور ایک آپ ہیں کہ اپنے مکروہ صورت مُردوں تک کی شکل سنوار دیتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس دنیا کے تختے پر ایک صرف آپ کی قوم ہی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ بخدا باقی سب جھک مار رہے ہیں۔

ہماری زبان اردو کا ایک شاعر غالب ہوا ہے۔ اس نے آج سے قریب قریب ایک صدی پہلے کہا تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ؎ نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

غریب کو زندگی میں اپنی رسوائی کا ڈر نہیں تھا، کیونکہ وہ اوّل تا آخر رسوائے زمانہ رہا۔ اس کو خوف اس بات کا تھا کہ بعد از مرگ رسوائی ہوگی۔ آدمی دوراندیش تھا۔ خوف نہیں بلکہ یقین تھا، اسی لئے اس نے غرقِ دریا ہونے کی خواہش کی۔ کہ جنازہ اُٹھے نہ مزار بنے۔

کاش وہ آپ کے ملک میں پیدا ہوا ہوتا۔ آپ اس کا بڑی شان وشوکت سے جنازہ اُٹھاتے اور اس کا مزار سکائی سکریپر کی صورت میں بناتے ــــ اور اگر اسی کی خواہش پر عمل کرتے تو شیشے کا ایک حوض تیار کرتے جس میں اس کی لاش رہتی دنیا تک غرق رہتی اور چڑیا گھر میں لوگ اسے جا جا کر دیکھتے۔

بھائی ایوی لِن وا بتاتا ہے کہ وہاں مُردہ انسانوں ہی کے لئے نہیں مُردہ حیوانوں کی نوک پلک درست کرنے والے ادارے بھی موجود ہیں۔ حادثے میں اگر کسی کتے کی دُم کٹ جاتی ہے تو دوسری لگا دی جاتی ہے مرحوم کی شکل وصورت میں اس کی زندگی میں جتنے عیب تھے، اس کی موت کے بعد چابک دست ہاتھ درست

کر دیتے ہیں۔ اسے شان وشوکت کے ساتھ کفنا دفنا دیا جاتا ہے۔ اس کی تربت پر پھول چڑھانے کا انتظام بھی کر دیا جاتا ہے اور ہر سال جس روز کسی کا پالتو مرا ہو اس ادارے کی طرف سے ایک کارڈ بھیج دیا جاتا ہے۔ جس پر کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی ہے۔

"جنت میں آپ کا ٹمی یا جمی آپ کی یاد میں اپنی دُم یا کان ہلا رہا ہے؟"

ہم سے تو آپ کے ملک کے کتے ہی اچھے۔ یہاں آج مرے کل دوسرا دن۔ کسی کا کوئی عزیز مرتا ہے تو اس غریب پر ایک آفت ٹوٹ پڑتی ہے اور وہ دل ہی دل میں چلاتا ہے "کم بخت یہ کیوں مرا۔ مجھے ہی موت آگئی ہوتی"۔ سچ تو یہ ہے چچا جان ہمیں مرنے کا سلیقہ آتا ہے نہ جینے کا۔

آپ کے ملک میں ایک صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ ان کی موت کے بعد ان کا جنازہ سلیقے اور قرینے سے اُٹھے گا چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے کفن دفن کی بہار دیکھ لی ــــ یہ ان کا حق تھا۔ وہ بڑی شائستگی، نفاست اور امارت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر چیز اُن کے منشاء کے مطابق ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے موت کے بعد ان کا جنازہ اُٹھانے میں کسی سے کوئی کوتاہی ہو جاتی۔ بہت اچھا کیا جو انہوں نے زندگی ہی میں اپنی موت کی آرائش و زیبائش دیکھ لی۔ مرنے کے بعد ہوتا ہے جو ہوتا ہے۔

تازہ "لائف" (مورخہ ۵ نومبر ۱۹۵۱ء انٹرنیشنل ایڈیشن) دیکھا۔ واللہ آپ لوگوں کی زندگی کا ایک اور زندگی آموز پہلو آنکھوں کے سامنے روشن ہوا۔ دو پورے صفحوں پر تصویروں کے ساتھ آپ کے ملک کے مشہور و معروف "گینگسٹر" کے جنازے کی پوری روداد مرقوم تھی۔ دلی موریٹی (خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کی شبیہہ دیکھی۔ اس کا وہ عالی شان گھر دیکھا جو اس نے حال ہی میں پچپن ہزار ڈالر میں فروخت کیا تھا۔ اور اس کی وہ پانچ ایکڑ کی اسٹیٹ بھی دیکھی جہاں وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر آرام اور چین کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اور مرحوم کا وہ فوٹو بھی دیکھا جس میں وہ بستر پر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کیے لیٹا ہے۔ اور اس کا پانچ ہزار ڈالر کا تابوت اور اس کے جنازے کا جلوس جو پھولوں سے لدی پھندی گیارہ بڑی بڑی لموزینوں اور پچھتر کاروں پر مشتمل ہے ــــ اللہ اعلیٰ ماشاء اللہ ــــ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خاکم بدہن، اگر آپ انتقال فرما جائیں تو خدا آپ کو دلی موریٹی سے زیادہ عزت اور شان عنایت فرمائے۔

یہ پاکستان کے ایک غریب مصنف کی دلی دعا ہے جس کے پاس سواری کے لیے ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل بھی نہیں۔ وہ آپ سے ایک ایسی استدعا بھی کرتا ہے کہ کیوں نہ آپ اپنے ملک کے دور اندیش آدمی کی طرح اپنی زندگی ہی میں اپنا جنازہ اٹھتا دیکھ لیں۔ بندہ بشر ہے، ہو سکتا ہے کسی سے بھول چوک ہو جائے۔ ہو سکتا ہے آپ کے چہرے کا کوئی خط سنورنے سے رہ جائے اور آپ کی روح کو تکلیف پہنچے ــــ مگر بہت ممکن ہے آپ یہ خط پہنچنے سے پہلے ہی اپنا جنازہ اپنی حسبِ منشاء عظیم الشان دھوم دھام سے اٹھوا کے دیکھ چکے ہوں۔ اس لئے کہ آپ مجھ سے کہیں زیادہ صاحبِ فہم و ادراک ہیں اور میرے چچا ہیں۔

بھائی جان ارسکائن کو لڈویل کو سلام اور اس جج کو بھی جھولوں نے ان کو فحاشی کے جرم سے بری کیا تھا۔

کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف فرمائیں۔ زیادہ حدِ ادب ــــ آپ کا مفلس بھتیجا

سعادت حسن منٹو سکنہ پاکستان

[یہ خط پوسٹیج اسٹامپ خریدنہ سکنے کے باعث پوسٹ نہ ہو سکا]

منظور وقار (گلبرگہ شریف)

افسانہ نگار کا خط ایڈیٹر کے نام

جناب شمشیر احمد شرارتی،
ایڈیٹر ماہنامہ "دھماکہ" ـــــ آداب!

میں آپ کا ماہنامہ "دھماکہ" (جو چار چھ ماہ بعد مشکل سے منظر عام پر آتا ہے) کے بیے کئی (شاید دس یا پندرہ) مختصر افسانے (ہر افسانہ دس پندرہ صفحات سے زیادہ نہیں ہے) مناسب ڈاک ٹکٹ لگے لفافے میں روانہ کر چکا ہوں افسانوں کو ارسال کئے ہوئے کوئی پانچ برس بیت گئے ابھی تک میرے کسی بھی افسانے کو دھماکہ میں جگہ نہیں مل سکی حالانکہ اس دوران کئی اَن پڑھ لیڈروں کو اسمبلی اور پارلیمنٹ میں ایک ایک عدد کرسی مل گئی۔ شاید میرے افسانے دھماکہ کے دھماکہ خیز معیار پر اُترنے میں یا چڑھنے میں ناکام ہوگئے ہیں! لیکن انہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ ہمارے اَدبی دوست جناب پاگل پا کھنڈی (جو تنقید نگاری میں پاگل پن کی حد تک مشہور ہیں) ہمارے غریب خانے پر امیرانہ ٹھاٹ سے کھانا کھانے کے بعد میرے افسانوں پر کچھ اس طرح تبصرہ کر چکے ہیں "میاں مفلس تمہارے افسانے معیار کے اعتبار سے اس قدر بلند ہیں کہ افسانوی بلندی کی آخری چوٹی پر اَدبی جھنڈا گاڑ کر ہی دَم لیں گے" ـــــ مگر افسوس! آپ کو میرے افسانوں کے اندر پوشیدہ خوبیوں کی خبر ہی نہیں ورنہ آپ میرے افسانوں کو ماہنامہ "دھماکہ" میں فوراً اس طرح جگہ دے دیتے جس طرح حکومت ہر کم افراد کو سرکاری دفتروں میں کھٹا کھٹ ملازمت فراہم کر دیتی ہے۔ یوں بھی تمہارے رسالے کا ادبی معیار خواتین کی شرم وحیا کی طرح دن بدن گھٹتا ہی جارہا ہے شاید ادبی رسالہ ترتیب دینے کی ترکیب سے تم پوری طرح واقف نہیں ورنہ تم میری ادبی کاوشوں (افسانوں) کو اپنے گھٹیا رسالے میں کوئی اچھا مقام دے کر خود اپنے گرے ہوئے مدیرانہ مقام کو اونچا اُٹھا سکتے تھے۔ بہیشہ در فنکاروں کے فن پاروں کو فنکارانہ اسٹائل سے شائع کرکے خود کو اُونچے آدمیوں میں شمار کرلینے کے گُن سے تمہیں واقفیت نہیں (کاش کبھی میں تمہارے رسالے کا مُدیر ہوتا)

مکرمی! ابھی تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ میں کتنا بلند پایہ افسانہ نگار ہوں ہمالیہ پہاڑ کی بلندی پر پہنچنا تو آج کل بچوں اور عورتوں کا کھیل بن چکا ہے مگر میری طرح افسانوی بلندی کی آخری چوٹی کو چھونے والا مرد تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا ارے جب مرزا غالب کی فنی بلندی کو کوئی نہیں چھو سکا تو میری فنکارانہ بلندی

تک پہنچنے کی جرأت بھلا کون کرے گا . . . ؟ میری مقبولیت اور شہرت کے ڈنکے کرکٹ کے کھلاڑیوں
کی طرح نجی محفلوں سے لے کر باورچی خانوں تک گونجا کرتے ہیں شک ہے میری شہرت کے ڈنکے کی آواز
فلمستان تک نہیں پہنچی۔ ورنہ کوئی شرمیلا ٹیگور یا رینا رائے جیسی جذباتی ہیروئن میرے گلے پڑ جاتی۔ جب ادبی
محفلوں میں میرے افسانوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو بڑے بڑے نقاد اچانک خاموش ہو جاتے ہیں میرے
افسانوں کا تذکرہ چھڑتے ہی سٹپٹا کر لوگ کھسک جاتے ہیں۔ ریڈیو پر جب میرے افسانے نشر ہوتے ہیں تو
باورچی خانوں میں کام کرتی ہوئی خواتین کے ہاتھوں سے ہانڈی چھوٹ جاتی ہے تو ڈرائنگ روم میں پڑھنے
والی لڑکیوں کے ہاتھوں سے ناولیں پھسل پڑتی ہیں۔ میرے افسانے سننے کے بعد نوجوان لڑکیاں اس قدر
جذباتی ہو جاتی ہیں کہ وہ راتوں رات اپنے بے روزگار دوست کے ساتھ ہندی فلم کے مالدار باپ کی اکلوتی
بیٹی کی طرح بھاگ جاتی ہیں۔ کیوں کہ میرے عشقیہ افسانے عشق کرنے والے عقلمند نوجوانوں کو اپنے والدین
سماج اور سوسائٹی کو ٹھوکر مار کر اپنا پریم نگر الگ بنانے کا بھرپور درس دیتے ہیں مگر حیرت ہے تمہاری
اندھی عقل پر کہ مجھ جیسے اہم افسانہ نگار کو جوابی خطوط میں یوں لکھتے ہو کہ مجھے زبان و بیان پر قدرت حاصل
نہیں میرے افسانوں کا موضوع اور مرکزی خیال بڑا بے جان ہے ایڈیٹر صاحب اس طرح کا چکر کسی اور کو
دیجئے گا مبتدی حضرات کو ڈرانے کے لیے زبان و بیان، موضوع، مرکزی خیال اور گرفت کی گولیاں بڑی
کارآمد ہوتی ہیں تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں مبتدی نہیں معتبر افسانہ نگار ہوں تمہیں میرے معتبر افسانہ نگار ہونے
پر شک ہے تو چند ماہ انتظار کر کے دیکھو میں جلد ہی روس، امریکہ اور جاپان کا زبردست دورہ کرنے والا ہوں
جب میرا غیر ممالک کا دورہ مکمل ہو جائے گا تب تم تو کیا تمہارا باپ بھی مجھے معتبر افسانہ نگار تسلیم کر لے گا۔
غیر ممالک کی سیر کرنے والے قلمکاروں سے جب نامور نقاد تک مرعوب ہو جاتے ہیں تو تم اور تمہارا رسالہ کس
گنتی میں۔ جبکہ تم تو ادبی کھیت کی ایک معمولی سی مولی ہو۔ اگر تمہیں میرے افسانوں کے اندر پوشیدہ پیغام نظر
نہیں آتا تو تمہیں ایڈیٹری کو طلاق دے کر دیسی دارو کی دکان چلانا چاہیئے تھا تاکہ مجھ جیسے دیسی شراب کا
نشہ کر کے بدیسی کہانیاں چرانے والے افسانہ نگاروں کو چلو بھر شراب میں ڈوب مرنے کا موقع فراہم کر سکتے
لعنت ہے تمہارے دفتر میں رکھی ردی کی ٹوکری کی بھوک پر جو میرے بہترین افسانوں کو سرکاری مال سمجھ کر سرعت
سے ہضم کر کے ڈکار تک نہیں لیتی۔ ارے اندھی عقل کے ناخلق ناخن (معاف کرنا غصہ کی حالت میں قلم سے
یہ کا لفظ نکل گیا اور منٹو مرحوم کی طرح میرے قلم سے جو نکل گیا سو نکل گیا تصحیح کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا)
جیسے خالص ادب کا دم بھرنے اور نامور ادیبوں کے آگے دم ہلانے والے مدیروں کی تعداد تو ہمارے ملک
کے بے ایمان منسٹروں کی تعداد سے بھی کم ہے۔ جناب اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ تم کہو گے کہ میں چھوٹا منہ
بڑی بات کر رہا ہوں یہی بات اگر بڑے ادیب کہتے تو بڑے غور سے تم اس پر غور کرتے چاہے بڑی بڑی
...لی کرنے والے بڑے بڑے ادیبوں کے منہ کتنے ہی چھوٹے ہوں۔ خیر اب بھی وقت ہے اپنی نادانی کی نیند
سے جاگ اٹھو اور فوراً میرے افسانوں کو اپنے رسالے کے خاص خاص نمبروں میں جگہ دے دو اگر میں اپنے
افسانے کسی نیم ادبی و نیم فلمی رسالے میں بغرض اشاعت روانہ کر دوں تو نہ صرف میرے افسانے فوٹو آفسٹ
چھپیں گے بلکہ میری تصویر بھی جتیندر کی تصویر کی طرح سری دیوی اور جیہ پردا کے ساتھ چھپے گی میری

قسمت کا قیمتی ستارہ فلمی ستاروں میں چمکنے لگے گا تو تمہاری تقدیر کا دیا دلوالہ مار مدیروں بے روزگار قلمکاروں اور سدابہار بیمار قارئین کے درمیان ٹمٹماکر ایک دن شادی شدہ مرد کی آواز کی طرح خاموش ہو جائے گا۔ ایسا ہوگیا تو تمہارا مستقبل بڑا تاریک ہوگا لوگ ادبی رسالہ جاری کرنے کی تیاری کرنے والے نوجوانوں کو تمہاری عبرت ناک کہانی سُناکر اُن نوجوانوں کو ہولناک حالات میں مبتلا کردیں گے نتیجتاً پھر کوئی ادبی رسالہ جاری کرنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا اور پھر تمہاری داستان تو ہوگی مگر عبرت ناک داستانوں میں۔ مجھے یقین ہے میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد تمہاری سوئی ہوئی ادبی حس جدید شعراء کی تجریدی حس کی طرح جاگ اُٹھے گی اور تم اپنے دفتر کے کونے میں رکھی ہوئی ردّی کی ٹوکری سے میرے افسانے دریافت کرکے اُن افسانوں کی کتابت (کاتب تو تم خود ہی ہو) اور طباعت (اپنے زنگ آلود پریس کے گھسے ہوئے پتھر پر) شروع کردوگے اور طباعت کے بعد اپنے اکلوتے رسالے کو شہر کے اکلوتے بک اسٹال پر (جس کے مالک بھی تم خود ہو) لانے کی کوشش کروگے اگر دھماکہ کی اشاعت میں مزید دو چار برس کی تاخیر ہے تو میرے افسانوں کو کتابی شکل میں شائع کردو میں اس کتاب نما کتابچہ کو انعام کے لئے اردو اکیڈیمی روانہ کردوں گا۔ انعامی رقم میں تمہیں دیدوں گا کیونکہ مجھے انعام کی نہیں نام کی ضرورت ہے۔ تمہیں تو دولت کی ہوس ہے مجھے چیز کی ہوس ہے اس کے لیے میری ایک عدد کتاب کا چھپنا بے حد ضروری ہے اور ہاں کتاب کے سرورق پر کسی تجریدی آرٹ کے بجائے میری تصویر کا نیگیٹو کافی ہے جسے دیکھنے کے بعد لوگوں کو تجریدی آرٹ کا ہی گمان ہوگا اور اس طرح کا دھوکہ دینے کا نام ہی آرٹ ہے چاہے وہ تجریدی آرٹ ہو یا کلاسکی آرٹ۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ میری تصویر لوکل اخبارات کی کتابت اور طباعت کی طرح بدنما نہیں بلکہ بلوفلم کے بے باک اشتہاروں کی طرح صاف صاف چھپنی ضروری ہے اگر ایسا نہیں ہوا تو میرے افسانوں کی عاشق لڑکیوں کا دل بڑی طاقتوں کے ہتھیار نابنانے کے معاہدوں کی طرح ٹوٹ جائے گا لڑکیوں کا دل توڑنا دہشت پسندوں کے ہاتھوں مرکزی حکومت کی کرتوڑنے کے برابر ہے اگر لڑکیوں کو غصہ آ گیا تو تمہارا دفتر اُن لڑکیوں کے عاشقوں کے ہاتھوں جلا دیا جائے گا اور تم انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے چکر میں دفتر کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کو بھی آگ میں جھونک دوگے۔

اس خط کے بعد بھی اگر میرے افسانے تمہارے رسالے کے کسی خاص نمبر میں شائع نہیں ہوئے یا میرے افسانوں کا مجموعہ منظرِ عام پر نا آیا تو قسم ہے میری پسندیدہ افسانہ نگار واجدہ تبسم کی (جن کے افسانے پڑھنے کے بعد میرے جسم کا سویا ہوا ایک ایک عضو جاگ اُٹھتا ہے) میں شہر کے اکلوتے بک اسٹال سے دھماکہ کی تمام کاپیاں ردّی کے بھاؤ خرید کر آگ لگا تا رہوں گا اور اس آگ سے صبح نہاری تو دوپہر بریانی پکایا کروں گا کیونکہ گیاس کا آج کل بڑے شہروں میں پینے کے پانی کی طرح کال پڑا ہوا ہے۔

وقت کی کمی اور اختصار پسندی کی عادت کی وجہ سے مختصر الفاظ میں اپنی بات پوری کر رہا ہوں مجھے اُمید ہے میرے اس مختصر خط پر آپ طویل عرصہ تک غور کرتے رہیں گے۔۔۔!!

فقط

مجبور احمد مفلس

محمد قاسم [پربھنی]
لکچرر ذاکر حسین جونیئر کالج

مشاعرے اور کنوینر

چاؤش کے بھٹیار خانہ میں چائے پیتے ہوئے خان صاحب نے فرمایا "مشاعرے ہماری تہذیبی ترقی کا نتیجہ ہیں"۔

میر صاحب نے لقمہ دیا "مشاعروں سے اردو ادب کی ناقابل تصوّر ترقی ہوتی ہے"۔

اور سید صاحب یوں گویا ہوئے "مشاعروں سے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے" اس قدر تعریف سن کر ہمارے دل میں بھی مشاعرہ گاہ چلنے کی خواہش اسی طرح انگڑائی لے کر اٹھی جس طرح لنگور کے دل میں حور کو بانہوں میں لینے کی خواہش۔ صاحب! صاف گوئی کا تقاضہ یہی ہے کہ وضاحت کر ہی دی جائے۔ ہم ٹھہرے بی ایس سی سائنس والوں کو ادب سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے جتنی کرگس کو بچی ہوئی ہڈیوں سے۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سائیکل نکالی اور مشاعرہ گاہ جا پہنچے۔ ہمارے دوستوں نے ہمیں دیکھ کر کہا "صبح کا بھولا شام کو لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ ایک دن ضرور آئے گا جب تم نہ صرف مشاعروں کی افادیت کا اعتراف کروگے بلکہ کنوینر بننے کے لیے ہاتھ پیر بھی مارو گے"۔ ہم کیا جواب دیتے۔ کسی سیاسی سیاستداں کی طرح صرف مسکرا کر رہ گئے اور ہمارے دوست بھی کچھ نہ سمجھ کر کسی مدبّر کی طرح خوش ہوگئے کہ ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ نو بجے شروع ہونے والا مشاعرہ گیارہ بجے رات شروع ہوا۔ بالغوں کے پروگرام یقیناً رات دیر گئے شروع ہونے چاہئیں۔ خدا خدا کرکے ڈائس پر شاعروں اور شاعرات کی آمد شروع ہوئی چار خوبصورت شاعرات کو سامنے بٹھایا گیا۔ ان کے پیچھے شاعروں کو مسندیں دی گئیں۔ ہمیں ان باذوق حضرات کے ذوق پر ترس آیا جو مشاعرہ گاہ میں نہ آکر صرف کیسیٹ سنتے ہیں اور باذوق ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ مشاعرہ نہ صرف سننے بلکہ دیکھنے کی بھی چیز ہوتا ہے۔ شاعرات کا میک اپ، ہیر اسٹائیل۔ بے وجہ آنچل ڈھلکانے، اسے بار بار سنبھالنے کی ناکام کوشش کا انداز، روٹھ جانے اور پھر مشتعل ہونے کا انداز۔ واقعی بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔

قومی یک جہتی کی علامت کے طور پر ایک آدھ غیر مسلم شاعرہ کو مدعو کر کے کنوینر اپنے سیکولر ہونے کا عملی ثبوت دیتا ہے۔ کنوینر کے مصاحب اور حواری کچھ کم ڈپلومیٹ نہیں ہوتے۔ وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ وہ اپنے مرد رشتہ داروں اور دوست شاعرات کو مدعو کر کے اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مہمان بھی اپنے بے لوث خلوص کا دل کھول کر مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنا تن من دھن میزبانوں پر نچھاور کرتے ہیں، اسی لیے کنوینر چاہے بدل جائیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے شہر میں سابق کنوینر، موجودہ کنوینر اپنے تمام اختلافات فراموش کر کے اردو ادب و شاعری کی ترقی کے لیے مل جل کر کام کرتے ہیں۔

جبکہ دوسرے شہروں میں سابق کنوینر، موجودہ کنوینر کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے نت نئی سازشیں کرتا ہے تاکہ اس کا ریکارڈ بریک نہ ہو۔ اب کوئی اُسے کیسے بتائے کہ مشاعرے کے دوران کیا کیا بریک ہوتا ہے۔ ہمارے شہر میں کنوینر خون پسینہ اور نہ جانے کیا کیا ایک کر کے مشاعرے کو کامیاب بناتا ہے۔ ہم نے ایسے کنوینروں کے بارے میں سنا ہے جو مشاعرے کے ۸ دن پہلے اور ۸ دن بعد تک اپنے گھر اور بیویوں کا منہ نہیں دیکھتے۔ اور جب گھر لوٹتے ہیں تو ان کی جیبیں گرم رہتی ہیں اور یہی گرمی ان کی گرم مزاج بیویوں کو ٹھنڈا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

مہمان شاعر جہاں قیام کرتے ہیں وہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ کچھ رشتہ دار شاعروں سے ملنے کچھ انٹرویو اور آٹوگراف لینے۔ اور کچھ لوگ یونہی آجاتے ہیں یہ جتلانے کہ وہ کتنے باذوق ہیں۔
ہم نے مشاعرہ میں ایسے افراد کو بے تحاشا داد دیتے اور جھومتے دیکھا ہے جو میٹرک میں محض اس لیے فیل ہو گئے کہ انھیں اردو میں ، نشانات سے زیادہ نہیں ملے تھے۔ ڈائس پر ایسے کتنے شاعر تھے ہمیں معلوم نہیں۔
اس عدم واقفیت کے لیے آپ سوائے معاف کرنے کے اور کیا کر سکتے ہیں؟ تاہم یہ سچ ہے کہ مقامی استاد شاعروں کے مقابلے میں خوبصورت شاعرات اور گلوکار شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔
مقامی شعراء کا صرف اتنا قصور ہوتا ہے کہ وہ کنوینر کی جی حضوری نہیں کرتے۔ گاگا کر سامعین کی دلبستگی کے سامان مہیا نہیں کرتے آج کے مشاعروں کے سامع اور کنوینر کے مزاج میں بھی بڑی یگانگت پائی جاتی ہے اور اچھے شاعر اس مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ نتیجتاً وہ اپنی خودداری کی کٹیا میں محصور رہ جاتے ہیں

زندہ دلان حیدرآباد کی تازہ پیش کش

کاغذی ہے پیرہن

ممتاز انشائیہ نگار
ڈاکٹر رشید موسوی کے بیس دلچسپ مضامین
کا مجموعہ

صفحات : ۱۴۰ ڈیمائی
قیمت : ۲۰ روپے
خوبصورت دورنگی ڈسٹ کور

محمد خورشید احمد۔ کراچی

مزاحیہ اور انشائیہ

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُردو رسائل میں اِنشائیہ کے عنوان کے تحت جو مضامین شائع ہو رہے ہیں ان میں سے بیشتر اِنشائیہ نہیں بلکہ مزاحیہ کے ذیل میں آتے ہیں کیونکہ وہ ان خصوصیات کے حامل نہیں جو اِنشائیہ کے لیے لازمی تصوّر کی جاتی ہیں۔ ذیل میں مزاحیہ اور اِنشائیہ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے اور ہر دو اصناف کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے کی سعی کی گئی ہے، تاکہ دونوں اصناف کی خصوصیات نمایاں طور پر اُجاگر ہوسکیں اور ان کے باہمی فرق کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکے۔

مزاحیہ میں ابتداء تا انتہا افکار و خیالات اور واقعات میں ربط و تسلسل قائم رہتا ہے، مزاح نگار اپنے موضوع سے گریز نہیں کرتا اور اسی کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے۔ مزاحیہ ہر لحاظ سے ایک مکمل مضمون ہوتا ہے اور اس میں تشنگی اور عدم تکمیل کا احساس نہیں ہوتا۔

اِنشائیہ میں خیالات و افکار غیر منظم اور منتشر ہوتے ہیں واقعات اور تاثرات بھی مربوط و مسلسل نہیں ہوتے۔ ان میں بظاہر نظم و ضبط کا فقدان ہوتا ہے، اِنشائیہ نگار اپنے موضوع سے گریزاں ہوتا ہے اور بے ربط اور غیر متعلق باتیں بھی بیان کرتا جاتا ہے۔

انشائیہ میں تکمیل اور سالمیت نہیں ہوتی اور یہی اس کا امتیازی وصف ہے۔

مزاحیہ کا دائرہ نسبتاً محدود ہوتا ہے۔ مزاح نگار غیر ضروری، لایعنی اور غیر متعلق باتوں سے قصداً اجتناب کرتا ہے اور اس کی ساری توجہ موضوع اور اس کے متعلقات پر مرکوز ہوتی ہے، بالفاظ دیگر مزاحیہ حشو و زوائد سے مبرا ہوتا ہے۔

انشائیہ کی حدود متعین نہیں ہیں، اس کا کوئی دائرہ یا حصار نہیں، اس کا کینوس لامحدود ہے، انشائیہ نگار آزادی سے جس طرف چاہے توسنِ فکر کو موڑ کر جولانیٔ طبع دکھا سکتا ہے۔ انشائیہ میں پراگندہ خیالی اور فکری بے ربطی کا احساس ہوتا ہے، مگر یہ کیفیت مستقل نہیں ہوتی۔ انشائیہ نگار تھوڑی دیر تک آوارہ گردی کرنے

کے بعد اپنے منتقر پر لوٹ آتا ہے اور موضوع سے رجوع ہوتا ہے۔

○ مزاحیہ میں قدرے تکلف ہوتا ہے، برجستگی اور بے ساختگی نسبتاً کم ہوتی ہے کیوں کہ مزاحیہ کو دلچسپ اور پرلطف بنانے کے لئے مزاح نگار کو ذہنی کاوش کرنی پڑتی ہے' بسا اوقات غیر فطری باتیں بھی ضمناً رقم ہو جاتی ہیں۔

انشائیہ میں بے تکلفی اور بے ساختگی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ تحریر رواں اور سلیس ہوتی ہے، الفاظ فصیح اور سریع الفہم ہوتے ہیں۔ اندازِ بیان لطیف اور شگفتہ ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہے' اس لئے اس کی تحریر میں روانی، بے ساختگی اور برجستگی خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ ان خصوصیات کے لیے اُسے ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی تحریر کو سنوارنے اور سحر طراز بنانے کی شعوری طور پر کوشش نہیں کرتا۔

○ مزاحیہ مضامین میں قاری کو آورد کا احساس ضرور ہوتا ہے اور یہ امر فطری ہے کیوں کہ مزاح نگار قصداً یا شعوری طور پر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' اسے دمِ تحریر حذف و اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے، کوئی پُرلطف جملہ ذہن میں آجائے تو اسے چسپاں کرنے کے لیے خواہ مخواہ گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔ کسی دلچسپ ٹکڑے کے اضافہ کے لیے پس منظر بیان کرنا پڑتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ ٹکڑے کے اضافہ کے لیے مضمون کو طول دیا گیا ہے۔ اس لئے مزاحیہ میں آورد اور تصنع کا راہ پانا یقینی ہے۔

انشائیہ میں صرف آمد ہوتی ہے۔ آورد کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ انشائیہ نگار کو فکری کاوش اور عرق فشانی کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ قلم برداشتہ لکھتا ہے، اسے بار بار حذف و اضافہ اور قطع و برید کی حاجت نہیں ہوتی لفظی و معنوی خوبیاں از خود پیدا ہوتی ہیں جو دراصل وسیع مطالعہ لکھنے کا طویل عملی تجربہ ذہنی پختگی اور فکری بلوغت کا نتیجہ ہے، اس لئے مزاحیہ کے مقابلہ میں انشائیہ زیادہ حقیقی اور فطری محسوس ہوتا ہے۔

○ مزاحیہ ایک اوسط درجہ کا تعلیم یافتہ شخص بھی فطری مناسبت اور مشق و مطالعہ کے باعث لکھ سکتا ہے' اور دوسروں کے لکھے ہوئے مزاحیہ مضامین سے حسبِ استعداد لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک عام تعلیم یافتہ قاری جو اس موضوع سے خصوصی شغف رکھتا ہے مزاحیہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

انشائیہ نگاری ہر تعلیم یافتہ شخص کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لئے کثرتِ مطالعہ، عملی تجربہ، زبان و بیان پر حاکمانہ قدرت اور ایک خاص اُسلوب کا حامل ہونا ضروری ہے۔ مزید برآں انشائیہ نگاری کے تقاضوں اور اس کے مسلمہ اصولوں سے پوری واقفیت بھی لازمی ہے۔

انشائیہ کے مطالعہ سے ہر تعلیم یافتہ شخص لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس کے لئے اعلیٰ ذوق، علمی و ادبی مذاق اور لطیف جمالیاتی حس ضروری ہے۔ ساتھ ہی صنفِ انشائیہ کی مسلمہ خصوصیات سے واقفیت بھی لازمی ہے کیونکہ انشائیہ میں ظاہری ترتیب، ربط اور صراحت نہیں ہوتی، عدم سالمیت اور رمز و کنایہ ہوتا ہے' اور اندازِ بیان اشارتی ہوتا ہے' انشائیہ نگار کسی طرف ہلکا سا اشارہ کر کے دفعتہً دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ قاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس اشارہ کے پس منظر سے بخوبی واقف ہو۔

مزاح نگاری میں مزاح مقصود بالذات ہوتا ہے اور مزاح نگار شعوری طور پر مزاح پیدا کرنے کی

کوشش کرتا ہے۔

صنفِ انشائیہ، مزاح نگاری سے علیحدہ ایک مستقل صنف ہے اور اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہے اس میں مزاح مقصود بالذات نہیں ہوتا، محض ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاح کی آمیزش سے انشائیہ کی بے لطفی خشکی اور ثقاہت کو کم کرکے اسے پُر لطف اور خوشگوار بنایا جاتا ہے، لیکن مزاحیہ اور انشائیہ لازم و ملزوم نہیں، یعنی مزاح انشائیہ کا جزو لاینفک نہیں ہے۔ مزاح کی آمیزش کے بغیر بھی کامیاب انشائیہ لکھا جاسکتا ہے۔ انشائیہ نگار انشائیہ میں مزاح کا عنصر جبراً داخل نہیں کرتا لیکن دورانِ تحریر کوئی پُر لطف جملہ ذہن میں آجائے تو اسے رقم کرنے میں تامل و احتراز بھی نہیں کرتا، مگر انشائیہ نگار بطور خاص مزاحیہ فقرے تراشنے کی سعی نہیں کرتا۔

○ مزاح نگاری میں شروع سے آخر تک مزاحیہ طرزِ تحریر برقرار رہتا ہے، مزاح کی فضاء قائم رہتی ہے اور بقول شخصے پورے مضمون میں مزاح برقی رو کی طرح دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مزاح نگار نہ خود سنجیدہ ہوتا ہے اور نہ قاری کو سنجیدہ ہونے کا موقع دیتا ہے۔

انشائیہ میں مزاح کا عنصر بہت کم ہوتا ہے، کہیں کہیں حسبِ ضرورت مزاح کی آمیزش کی جاتی ہے تاکہ قاری کی دلچسپی برقرار رہے اور اسے اکتاہٹ محسوس نہ ہو، اس لئے پورے انشائیہ میں مزاحیہ انداز نہیں ہوتا۔ مزاح کی فضا تادیر قائم نہیں رہتی۔ بعض حضرات انشائیہ کو مزاح سے آلودہ کرنے کے قائل نہیں، وہ محض شگفتہ بیانی سے اس کمی کو پورا کرنے کی سفارش کرتے ہیں، غالباً اس خدشہ کے پیشِ نظر کہ انشائیہ کی لطافت متاثر نہ ہو، انشائیہ کا اپنا وجود برقرار رہے اور صنفِ انشائیہ مزاح نگاری میں مدغم نہ ہوجائے۔ یہ رجحان قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ مزاحیہ طرزِ تحریر اور شگفتہ بیانی میں نمایاں فرق ہے، شگفتگی مزاح سے زیادہ لطیف اور پُر تاثیر ہوتی ہے۔

○ مزاحیہ خالص مزاحیہ بھی ہوسکتا ہے یعنی اس میں طنز کی آمیزش نہ بھی کی جائے تو کامیاب خالص مزاحیہ لکھا جاسکتا ہے لیکن خالص مزاحیہ مضامین کو لوگ ہنس کر ٹال دیتے ہیں یا قہقہوں میں اڑا دیتے ہیں۔ اس لیے اگر مزاحیہ میں طنز کی آمیزش کردی جائے تو، وہ مؤثر اور بامقصد بن جاتا ہے اور لطف و انبساط کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ اس سے ذہنی اصلاح بھی ہوسکتی ہے۔ اسی لیے مزاحیہ میں طنز کی آمیزش ضرور پائی جاتی ہے۔

خالص مزاحیہ کی طرح خالص انشائیہ بھی لکھا جاسکتا ہے کیوں کہ انشائیہ مزاح کا محتاج یا مرہونِ منت نہیں۔ انشائیہ بذاتِ خود ایک مستقل صنف ہے۔ لیکن اس میں مزاح کا عنصر شامل کردیا جائے تو اس کی خشکی اور بے لطفی رفع ہوجاتی ہے اور وہ زیادہ پُر لطف بن جاتا ہے لیکن انشائیہ میں طنز کا عنصر نہیں ہوتا انشائیہ کا لطیف اور نازک مزاج طنز کی تیزی اور تلخی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول شخصے انشائیہ میں نمک کا اضافہ تو ہوسکتا ہے مگر مرچ کا نہیں۔

خلاصہ یہ کہ مزاح میں طنز شامل ہوتا ہے اور انشائیہ میں مزاح لطیف۔

○ مزاحیہ بالعموم شگفتہ بیانی سے شروع ہوتا ہے پھر اس میں بتدریج مزاح، ظرافت اور طنز کو شامل کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مزاحیہ مضامین کا مطالعہ کرتے وقت پہلے تبسم پھر مسکراہٹ، اس کے بعد

قہقہہ نمودار ہوتا ہے اور آخر میں طنز کے باعث قاری کو غور و فکر پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اگر مزاحیہ طویل ہو تو یہی کیفیت بار بار پائی جاتی ہے۔

انشائیہ میں اس طرح کا التزام نہیں کیا جاتا۔ اس میں اس نوع کا فکری زیر و بم اور جذباتی مد و جزر نہیں ہوتا۔ پورے انشائیہ میں طرب و انبساط کی یکساں فضا قائم رہتی ہے۔ مزاحِ لطیف کے باعث کہیں کہیں تبسم کی لہریں ضرور اٹھتی ہیں مگر یہ تبسم بھی تبسم زیر لب سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ قہقہہ بردوش ظرافت اور روح فرسا طنز انشائیہ کے مزاج کے منافی ہیں۔ اگر انشائیہ میں ظرافت اور طنز کا عنصر جزو غالب ہو تو، وہ انشائیہ کے دائرہ سے خارج متصور ہوگا۔

○ مزاحیہ میں حقیقی و اقعات بھی مزاحیہ انداز میں بیان کئے جا سکتے ہیں اور فرضی واقعات بھی زورِ تخیل سے مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مزاحیہ میں حقائق کم ہوتے ہیں اور تخیل کی کارفرمائی اور مبالغہ آرائی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔

انشائیہ حقیقی واقعات پر مشتمل ہوتا ہے اور انشائیہ نگار اپنے گرد کے ماحول اور معاشرہ کے عینی مشاہدات بیان کرتا ہے۔ انشائیہ میں غیر شخصی مشاہدات، تصورات اور تجربات غیر معتبر تصور کئے جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار صرف ان حقائق کو بیان کرتا ہے جو اس کے چشم دید ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں فرضی یا غیر فطری واقعات کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

○ مزاحیہ تمثیلی انداز میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں غیر انسانی کردار بھی انسانوں کی طرح ادبی زبان میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

انشائیہ میں تمثیلی انداز نہیں ہوتا۔ اس میں غیر انسانی کردار نہیں ہوتے۔ انشائیہ فردِ واحد کے ذاتی قلبی تاثرات کا مجموعہ اور اس کے افکار و رجحانات کا افشردہ ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے کرداروں کی مداخلت اور اُن کے مکالمات نہیں ہوتے۔

○ مزاحیہ میں مزاح نگار اپنے ذاتی خیالات کے علاوہ دوسروں کے نظریات بھی بیان کرسکتا ہے۔ دوسروں کی زبانی سُنے ہوئے واقعات کو اپنے الفاظ میں رقم کرسکتا ہے۔ دوسرے افراد سے انٹرویو لے سکتا ہے اور اُن کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف بھی کرسکتا ہے۔

انشائیہ میں عموماً غیر شخصی افکار و نظریات بیان نہیں کئے جاتے۔ انشائیہ نگار اپنے گرد و پیش کے واقعات، حادثات اور کوائف کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے اسے دوسروں کے نظریات و رجحانات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، البتہ انشائیہ نگار دوسروں کے خیالات کا ماحصل اپنے الفاظ میں بیان کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ ناگزیر ہوں اور موضوع اس کا متقاضی ہو مگر محض او مختصراً۔ اس صورت میں انشائیہ نگار کا ذاتی تبصرہ ضروری ہے لیکن انشائیہ میں مدلل اور عالمانہ بحث کی گنجائش نہیں۔

○ مزاحیہ میں صنعتِ تحریف (PARODY) سے بھی کام لیا جا سکتا ہے مشہور اور زبان زد خاص و عام اشعار و اقوال میں تحریف و تصرف کر کے مزاح پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مزاحیہ میں تحریف شعوری طور کی جاتی

انشائیہ میں صنعتِ تحریف کی گنجائش نہیں اور شعوری طور پر اس طرح کی کاوش کی جاتی ہے۔
انشائیہ وارداتِ قلبی کے اظہار کا وسیلہ ہے، جسے لطیف اور خوشگوار انداز میں سپردِ قلم کیا جاتا ہے۔
انشائیہ لفظوں سے کھیلنے یا زباں دانی کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ تحریفِ لفظی اگر تحریر کی روانی میں سرزد ہو اور برمحل و موزوں ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں، مگر بے ساختہ ہو التزاماً نہ ہو اور بار بار اس کا اعادہ نہ ہو تو بہتر ہے۔

٥ مزاحیہ میں لطائف وظرائف بیان کئے جا سکتے ہیں۔ وہ لطائف بھی جو مشہور ہیں اور دوسروں کے تصنیف کردہ ہیں، اور وہ لطائف بھی جو مزاح نگار خود اپنی جودتِ طبع سے اختراع کرے۔ ایک مزاحیہ مضمون میں کئی لطائف بیان کئے جا سکتے ہیں، حتیٰ کہ پورا مزاحیہ بھی لطائف سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔
انشائیہ میں لطائف وظرائف نہیں ہوتے، صرف شگفتہ بیانی اور سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے۔ اگر لطیفہ، ظریفانہ اشعار و اقوال کا بیان ناگزیر بھی ہو تو انھیں مکمل طور سے بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اشارۃً ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن سے پورا لطیفہ، شعر یا قول ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ مزاحیہ میں وضاحت و صراحت ہوتی ہے اور انشائیہ میں ایجاز و بلاغت۔ (باقی آئندہ)

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مجموعے!

بہر حال ۱۰ روپے آدمی نامہ ۹ روپے بالآخر ۱۴ روپے

تکلف برطرف ۱۴ روپے قطع کلام ۱۲ روپے

جاپان چلو (سفرنامہ) ۱۴ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے

بال کی کھال (تبصرہ)

از ڈاکٹر لئیق صلاح

حلیمہ فردوس

ماشاء اللہ

حلیمہ فردوس ایک علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بھائی (خالد سعید) شوہر (ملنار اطہر احمد) اور خسر نما چچا (حمید الماس) الحمد اللہ سب صاحب کتاب ہیں ایسے ماحول میں آنکھیں کھولنے کے بعد قلم کاغذ سے واسطہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی مجبوری مصنفہ کی رہی ہوگی۔ ورنہ اچھی خاصی گرہستی میں عورتیں اس قسم کی دخل اندازی کو قطعاً گوارا نہیں کرتیں۔

آج سے کئی سال پیشتر ایک نامور مزاح نگار نے "انشاء اللہ" کو ناول کے روپ میں پیش کیا تھا تو حلیمہ فردوس نے "ماشاء اللہ" کو مزاحیہ مضامین سے سنوارا ہے۔ اس مجموعے میں کل سولہ مضامین ہیں۔ مختلف عنوانات کے تحت، زندگی کے نت نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول یوسف ناظم حلیمہ فردوس نے ایک خاتون قلم کار کی حیثیت سے اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی زندگی کی نقاب کشائی کی ہے۔ اُن موضوعات پر مردوں نے بھی قلم اُٹھایا ہے۔ مگر جو گہرائی اور گیرائی ان کے یہاں موجود ہے وہ مردوں کے یہاں یقیناً مفقود ہے کیونکہ صیغۂ راز کی باتیں، ایک راز داں ہی افشاء کر سکتا ہے اس فرضِ منصبی کو مصنفہ نے بڑی خوبی سے نبایا ہے۔ بطور شہادت چند اقتباسات ملاحظہ کے لئے درج ہیں۔

" لیکن ہماری ایک ساتھی نے یہ بھی بتایا تھا کہ سیل میں کوئی چیز خریدنا ضروری نہیں۔ وہاں آنکھوں کی زکوٰۃ بھی دی جاتی ہے۔"

"پڑھی لکھی عورتیں تو پہلے ہی بیوی کے فرائض انجام دینے میں عار محسوس کرتی تھیں لیکن اب ٹی۔ وی دیکھ کر ان پڑھ بیویوں کے دماغ کی چولیں ڈھیلی پڑنے لگی ہیں۔" "چند ایسی معصوم بیویاں ہیں جو تنگ دستی کا خیال کرتے ہوئے اپنے شوہروں سے فرمائشیں کرتی ہیں کہ گھر پر ٹی وی نہ سہی چھت پر اینٹینا تو لگا دیں رکھئیے تاکہ محلے والوں کو معلوم رہے کہ ہم بھی اس کی دوڑ میں پیچھے نہیں۔"

"لیکن ان کی خاموشی دیکھ کر ہمیں ان کے بیوی پن پر گمان ہونے لگا۔"

[ٹی۔ وی اور بیوی ص: ۶۷، ۶۸، ۷۱]

"کتاب کے اجزائے ترکیبی" میں کتاب کی تعریف میں اس قدر تفصیلات منظرِ عام پر آئی ہیں کہ کوئی پہلو چھوٹا نہیں۔

مثلاً

" الماری کے خانوں میں جو سلیقے سے جمائی جاتی ہے وہ بھی کتاب ہے۔ کباڑی کی دکان میں ردّی کے طور پر جو فروخت کی جاتی ہے وہ بھی کتاب ہے۔ اور مصنفوں کے خوابوں کی تعبیر، دل کی ازلی خواہش، جو گھر کے ڈبوں میں بند دیمک کی غذا بنتی ہے وہ بھی کتاب ہے۔" [کتاب کے اجزائے ترکیبی، ص: ۱۸]

کتابوں کی یہ مختلف اقسام بلاشبہ نظیر اکبرآبادی کے "آدمی نامہ" کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

ذائقہ کے معاملہ میں عموماً ہم اس اصول کے پابند ہوتے ہیں کہ میٹھے کے ساتھ کچھ ترشی بھی ہو۔ بس یہی حال طنز و مزاح کا ہے طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی اور مزاح کے ساتھ طنز کی تلخی کا ہونا ضروری ہے حلیمہ فردوس نے ناصحانہ یا مشفقانہ انداز میں تلخ حقائق کو طشت از بام نہیں کیا بلکہ ایک کامیاب مزاح نگار کے انداز میں ہنستے ہنستے، زندگی کے سنگین حقائق، اور کمزور پہلوؤں پر اُچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے، دوسروں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

" اور جب وہ محبوبہ سے بیوی بن جاتی ہے تو اس کے چہرے کی سُرخی چولہے کے آگے خود بخود دب جاتی ہے۔"
[رنگوں کے انتخاب نے . . . . ص: ۲۹]

" پیشہ میں کوئی ماہر ہو یا نہ ہو۔ اگر دکان میں کوتی کا انتظام کیا جائے تو پیشہ خود بخود چل نکلے گا۔"
[پیشے ہی پیشے، ص: ۳۰]

"کیوں کر شادی کے دن ہی اُن کے والدین نے منہ مانگی قیمت حاصل کر کے انھیں "سیل" کر دیا تھا۔ اس کے بعد اُن کے لب ایسے SEAL ہوئے کہ وہ کبھی کھل نہ سکے۔" [سیل نے ہم کو نکما کر دیا۔ ص: ۴۲]

اُنھوں نے سال بھر کیا پڑھا اس کا اندازہ تو آپ نہیں لگا سکتے۔ البتہ پندرہ منٹ پہلے اُنھوں نے جو مطالعہ کیا اس کی شہادت ان کی ہتھیلیاں اور امتحان ہال کی چند کرسیاں ضرور دیتی ہیں۔"

" دراصل یہ ہمارے ہال ٹکٹوں کا البم ہے کیونکہ ہماری تعلیم بڑے پختہ طریقے سے ہوئی ہے ایک امتحان کامیاب کرنے کے لئے ہمیں بسا اوقات دو یا چار بار بھی سعی کرنی پڑتی ہے۔ اس یادِ ماضی کے ریکارڈ کو ہم نے سعیٔ پیہم کا نام دیا ہے۔" [امتحان ہال میں تین گھنٹے۔ ص: ۵۱، ۵۳]

" اِن سارے دھبوں کو دور کرنے والی لانڈری صرف بیوی ہے۔ آپ اس آڑ میں جیسے جی چاہے گُل کھلا سکتے ہیں۔ . . اور جب دل اوب جائے تو نقلی سے اصلی بیوی کے پاس آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
[بیوی اور ٹی وی، ص: ۶۶]

مختصراً عرض کرنا یہ ہے کہ حلیمہ فردوس کی یہ پہلی تخلیق (ادبی) واقعی طنز و مزاح کے ایوان میں ایک گونجتی آواز ہے۔ اس مجموعے کے اکثر مضامین مطبوعہ ہیں اور موقر رسالہ "شگوفہ" کی زینت بن چکے ہیں۔ اُن میں بعض موضوعات پر نامور مزاح نگاروں نے قلم فرسائی کی ہے۔ محترمہ کا انداز دلکش اور شگفتہ ہے۔ مزاح نگار کے یہاں تخیل و تفکر کے ساتھ الفاظ کے انتخاب کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ موصوفہ نے متناسب الفاظ کی سحر کاری سے قاری یا سامع کو مسحور کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کبھی جاگ تیرا انتظار کب سے ہے" میں شاعرانہ نثر کی تمام خوبیاں سمودی گئی ہیں۔

"دانا و دیوانہ" "تنہائی لعنت بھی اور نعمت بھی" "چچی جان اور پاندان" اور "تعارف جہت دیگر است" اچھے انشائیے ہیں۔ موخرالذکر میں ایک اہم تعارف بھول چوک کا نشانہ بن گیا۔ وہ ہے ایک شاعرہ یا افسانہ نگار کے شوہر کا تعارف جن کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو بیوی کے توسط سے اپنے تعارف پر خوش ہوتا ہے اور دوسرا اسے اپنی توہین سمجھتا ہے کر دیا، قطرہ میں گم ہو جائے گا۔

حلیمہ فردوس نے تنقید اور عملی تنقید کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے نہ تو آخری صفحہ پر اپنی تصویر شائع کی ہے اور نہ کسی مشہور نقاد کی رائے سے اسے مزین کیا ہے۔ (مقصد اشاعتِ تصویر کا ص ۱۰۶)

کتابت، طباعت اور سرورق ہر لحاظ سے "ماشاء اللہ" اسم بامسمیٰ ہے۔ "ماشاء اللہ" کی پذیرائی انشاء اللہ ادبی حلقوں میں خوب ہوگی۔

یہ مجموعہ، کرناٹک اردو اکاڈمی بنگلور کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے صرف پندرہ روپے سکۂ رائج الوقت کے صلہ میں مصنفہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ممتاز مزاحیہ شاعر صابر بہاری کے مجموعۂ کلام "بال کی کھال" کی اشاعت پر نامور شاعر علقمہ شبلی کا منظوم تاثر

"بال کی کھال" مل گئی صاحب
کیا کہوں کیا ہوئی خوشی صاحب

خوب ہے یہ کتاب شعروں کی
ذہن کو تازگی ملی صاحب

طنز کے تیر بھی ہیں کچھ اس میں
کچھ ہے رنگِ مزاح بھی صاحب

بس متانت ہی زندگی تو نہیں
بات ہو کچھ ہنسی کی بھی صاحب

خود پہ ہنسنا کہ غیر پہ ہنسنا
بات یہ بھی ہے ظرف کی صاحب

کارِ آساں نہیں ظرافت بھی
چاہیئے خوش سلیقگی صاحب

شکریہ آپ نے بھرم رکھا
کارِ مرداں تو ہے یہی صاحب

آپ یوں ہی کھلائیں لالۂ دل
ہے دعا بس یہی مری صاحب

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۲۰

شمارہ : ۶

جون ۱۹۸۷ء
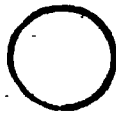
ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

ٹائٹل:
طالب خوندمیری

منیجر:
سمیع جلیل

مجلس مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

منیجر اعزازی : فیاض احمد فیضی (بمبئی)

کتابت :
محمد عبدالرؤف

قیمت فی پرچہ : ۴ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ : پینتالیس روپے (Rs 45)

عرب ممالک سے : ایک سو پچاس روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ :
۳۱ - بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس : 557716 فون رہائش : 521064

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ!

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد!

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹیڈ
۴. ہارکو سری نگر ۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. ہیڈونا کیننگ کمپنی
۷. چمپین وہائٹ روٹس ۸. پیری سوئٹس اینڈ ٹانیس ۹. ڈرگ بھوٹان نوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سِل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی)

وغیرہ

اس ہتھیلی کے چھٹے بٹے

فہرست

(انشائیے)

چوَرن (منظومات)

چُنندہ آسام و
نیلگری کے باغات سے راست
منگوائی چائے!

اسٹوانگ خوش ذائقہ
آپ کے ذوق کے عین مطابق۔

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد
یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ، حیدرآباد
PH 625444

یوسف ناظم
(بمبئی)

اکبر کا سوال؟ بیربل کا جواب؟

مہابلی اکبرِ اعظم اور راجہ بیربل کے بارے میں ہم نے جو کچھ پڑھا ہے (پڑھنے سے زیادہ سُنا ہے)
ـے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اتنے خوشگوار اور بے تکلفی کے تعلقات تاریخ کے کسی بھی (دائیں یا بائیں)
پر) دُنیا کے کسی بھی علاقے میں ایک حکمراں اور ایک مصاحب کے درمیان شاید ہی رہے ہوں (ہو بھی
ـہیں سکتے تھے)۔ اکبر کے مقربینِ خاص میں (جو تعداد میں ۸ تھے اور بشمول اکبرِ اعظم نورتن کہلاتے تھے)
ـہ بیربل کا نام شامل نہیں تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے وہ ان مقربینِ خاص کے مقابلے میں مہابلی سے
ـت زیادہ قریب تھے بلکہ قریب اور دُور کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا جب ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ
ـسے کم ایک خطِ فاصل ہوتا (جیسا کہ دو جملوں کے درمیان ہوا کرتا ہے)۔ یہ دونوں تو ایسے الفاظ تھے جو
ـر لکھے جائیں تو معنے دیتے تھے ورنہ نہیں۔ مثال کے طور پر لگ بھگ۔ انجر پنجر وغیرہ۔ (یہ دو مثالیں تو ہم نے
ـہ اشتمال اور لکھ دیں ویسے زیرِ اشتمال امر کے معنے ہمیں معلوم نہیں ہیں لیکن ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ اس
ـکے الفاظ استعمال کرنے سے معمولی سی معمولی تحریر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے)۔

تاریخ میں اکبر اور بیربل کے ناموں کے علاوہ اور بھی کچھ دو نام ایک ساتھ آتے ہیں جیسے محمود و ایاز لیکن
ـیں وہ کیفیت نہیں ہے جو اکبر اور بیربل کے ناموں میں ہے۔ ایاز یوں بھی ایک خاموش اور سنجیدہ شخص تھا۔ بجھا بجھا
ـرہنے والا انسان۔ خلعت وغیرہ بھی نہیں پہنتا تھا۔ اس کی حیثیت تھی بھی ایک گن مین کی یا نجی خدمت گار کی جسے
ـہ شاید ویلیٹ VELET کہتے ہیں۔ دربار تو الگ رہا کسی محفل یا دعوت میں بھی اُسے کرسی نہیں دی جاتی تھی۔ (اس
ـن کے ثبوت میں وہ دو ٹکے کا مصرع یاد کیجیے جس میں کہا گیا ہے ایاز قدرِ خود بشناس) ہاں اُسے تخلیئے میں یقیناً ہم نشینی
ـاجازت تھی۔ ایاز کی ذہانت وغیرہ کے بارے میں بھی مورخین نے جنھیں عام طور پر بات کا علم ہوا کرتا ہے، کہیں
ـلکھا نہیں ہے، دو حرف بھی نہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا شاید غلط نہ ہو کہ ایاز میں ذہانت معدوم تھی اور اگر کسی جیسے،

تھی بھی تو اِتنی مقدار میں نہیں تھی کہ مورخین کی توجہ اُس طرف مبذول ہو سکتی ۔۔۔ شہرت کی بات الگ تھی مشہور ہونے کی تو بیسیوں وجہیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی شاعر، مشاعرے کے اناؤنسر کے ساتھ یا کوئی ادیب، کسی تنقید نگار کے ساتھ منسلک ہو کر بھی مشہور ہو سکتا ہے اور یہ ایاز تو محمود جیسے شخص کے ساتھ منسلک تھا۔ اُسے مشہور و معروف ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ ذہین نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایمان داری اور وفاداری کی البتہ اُس کی تعریف کی گئی ہے لیکن یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ اُس زمانے میں تعلیم اتنی عام نہیں تھی اِس لیے بھی لوگ وفادار، ایمان دار اور دیانت دار ہوا کرتے تھے اور ایاز جیسا کہ ہم نے عرض کیا کوئی ذہین آدمی بھی نہیں تھا۔ اُس زمانے میں ہمارا خیال ہے ایمان داری اور وفاداری کو کوئی وصف نہیں سمجھا جاتا تھا یہ لوگوں کی صفت نہیں، عادت (بلکہ خصلت) تھی۔ اوصاف وغیرہ کی تشکیل و ترتیب تو بہت بعد میں عمل میں آئی ۔۔۔ زمانے میں قدریں اسی طرح بدلتی ہیں اور آدمی اپنی نا قدروی کے کیسے ہی کام کیوں نہ انجام دے نام انھیں اقدار ہی کا دیا جائے گا۔ اقدار کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے جیسے چند مخصوص اور ممتاز شخصیتوں کے مرتبے کا یا اُن عہدوں کا جو عرفِ عام میں جلیلہ عہدے کہلاتے ہیں اور مساعی جمیلہ سے حاصل ہوتے ہیں) جیسے کہ گو بادشاہوں اور ملکاؤں کا دور یوں تو گزر چکا ہے لیکن دیگر اقسام کے بادشاہ اور ملکائیں اب بھی رواج میں ہیں۔ کسی نہ کسی کنگ یا کسی نہ کسی کوئن کا ہمارے درمیان رہنا ضروری ہے۔ ہر شہر میں ایک بیوٹی کوئین اور دو اسسٹنٹ کوئنس ہوتی ہیں جن کی مدت کارگزاری کم سے کم ایک سال ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر شہر میں اور شہر کے ہر محلے میں ایک مٹکا کنگ یا سٹہ کنگ کا ہونا لازمی ہے۔ یہ لوگ نہ ہوں تو شہر خالی خالی نظر آتا ہے۔

اکبر اور بیربل کی یاد ہمیں اصل میں اس لیے آئی کہ آج پانچ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ان دونوں کے تعلق سے جتنا بھی لٹریچر فروخت ہوتا ہے وہ اُردو اور ہندی زبان ہی میں ہوتا ہے (ویسے یہ لوگ اہلِ گجرات میں بھی بہت مقبول ہیں) لیکن پریشانی یہ ہے کہ آج تک ان لطائف و ظرائف کے مترجم کا نام ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ شہنشاہِ اکبر زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اس لیے ان سے یہ بات منسوب کرنا کہ وہ کئی زبانیں جانتے تھے انھیں خواہ مخواہ تکلیف پہنچانا ہوگا (مبالغے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے)۔ وہ صرف فارسی زبان سے واقف تھے۔ یہ بات بھی ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اکبر مثنوی مولانا روم آسانی سے پڑھ لیا کرتے تھے۔ رہا بیربل کا معاملہ تو چونکہ وہ بے حد ذہین تھے اور عوام میں اُن کا اُٹھنا بیٹھنا بھی تھا اس لیے وہ یقیناً کئی زبانیں جانتے ہوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں اہلِ ظرافت کے مابین 'اکبر کا سوال اور بیربل کا جواب' بہ زبانِ فارسی ہی عمل آتا ہوگا۔ اُردو لشکر و بازار سے ابھی دربار تک پہنچی نہیں تھی۔ بھوج پوری اور برج بھاشا سرکاری درباری زبانیں تھیں۔ علاقائی زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں ہوں گی اس لیے اکبر اور بیربل اپنے خیالات کا اظہار فارسی زبان ہی میں کرتے ہوں گے تاکہ دربار کے حاضرین اور دیگر مصاحبین بھی ان لطیفوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور زیر لب مسکرائیں۔ ان سب لطیفوں اور داستانوں کو بادشاہِ وقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اِن لطیفوں کا بھی اِتنا ہی احترام کیا جاتا تھا جتنا کہ فرمانِ خسروی کا کیا جاتا تھا۔

اگر یہ دعویٰ کیا جائے (بیرونِ عدالت) کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا رواج سولھویں صدی عیسوی سے چلا آ رہا ہے تو یہ تاریخ اور ادبی اعتبار سے غلط نہ ہوگا (ویسے ادب میں تو ہزاروں مغالطے زیرِ پرورش ہیں)۔

صرف ۴۹ سال حکومت کرنے کی مہلت ملی ورنہ لطائف و ظرائف کی ایک کُل ہند تنظیم اُسی زمانے میں
اتی (ویسے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں مزاحیہ چیزیں کافی تعداد میں موجود ہیں) اکبر اگر
رتے تو ملک کے دوسرے علاقوں میں نہ سہی کم سے کم دلی یا مہرولی میں ایک بیربل ہال ضرور تعمیر کر دیا
ہ سلیم نے بھی جس نے اکبر کی وفات کے بعد تخت و تاج سنبھالا بیربل کی کوئی یادگار قائم نہیں کی اور اس
ید یہ ہوگی کہ انارکلی کے واقعے کے بعد اکبر اور شہزادہ سلیم کے تعلقات میں گرہ پڑ گئی تھی (حوالے کے لیے
انارکلی مصنفہ امتیاز علی تاج)۔ واقعہ بھی تو ایسا ہی تھا کہ گرہ پڑنا ضروری تھا۔ یوں بھی شہزادہ سلیم
انہ، وہ سطروں میں شہنشاہ جہانگیر کہنا پسند کریں گے) ظرافت وغیرہ جیسے اہم امور سے کوئی خاص دلچسپی
شاہتیں تو موروثی ہوا کرتی ہیں لیکن پسندیں موروثی نہیں ہوا کرتیں۔ (دُنیا میں موروثی بادشاہوں کا
کہیں اب بھی باقی ہے عنوان البتہ بدل گیا ہے)

ر اور بیربل کے معاملات پر ہم جتنا غور کرتے ہیں ہماری آنکھیں اُتنی ہی کھلتی جاتی ہیں (معلوم نہیں یہ سلسلہ
قرار رہے گا) شہنشاہ اکبر میں تو اور بھی خوبیاں ہوں گی لیکن اُن کا حسِ مزاح ہی انھیں اعظم بنانے کے
(بیسوی صدی میں انگلستان کے وزیر اعظم چرچل اس کی مثال تھے)۔ اس حسِ مزاح کی بنا پر وہ بادشاہ
وجود اپنے ایک مصاحب کی ذہانت کے قائل ہوئے (لوگ تو اپنے برابر کے بلکہ اپنے سے زیادہ ذی فہم
قائل نہیں ہوتے)۔ اتنا اقتدار اور یہ انکسار۔ اُس زمانے میں مُلّا دو پیازہ بھی موجود تھے اور آٹھ
سے ایک رتن تھے۔ وہ بھی ذہین تھے (جبھی تو رتن کہلائے) لیکن بیربل کی بات ہی اور تھی۔ بیربل کبھی خفیف
۔ وہ ظریف ہی کیا جو خفیف ہو جائے۔ اس کے برخلاف مُلّا دو پیازہ کے خفیف ہونے کے کئی قصے
۔ مُلّا دو پیازہ کا نام آج بھی ادب سے لیا جاتا ہے لیکن اکبر اور بیربل سے متعلق لکھا ہوا اور ترجمہ کیا ہوا
مقبول ہے اُس کا عشر عشیر بھی مُلّا دو پیازہ کے حصے میں نہیں آیا۔ مُلّا دو پیازہ کے ذمے دوسرے کام بھی
ے تھے جب کہ بیربل صرف ذہانت کے کام پر مامور تھے اور واقعہ یہ ہے بیربل نے اپنے مفوضہ فرائض نہایت
لوبی سے انجام دیتے اور ہماری عزت رکھ لی ورنہ لطائف و ظرائف کا عالمی کپ ملّا نصیرالدین کے قبضے میں
دہی اس میدان کے ورلڈ چیمپئن کہلاتے۔ (کتنا بُرا ہوتا)

صویروں کے لحاظ سے بھی اکبر کے عہد کے صرف دو ہی اشخاص ایسے ہیں جن کی تصویریں آج بھی جگہ جگہ
بیربل اور تان سین۔ باقی کے مقربین کی تصویریں بنائی تو ضرور گئی تھیں لیکن اب ان کی نوعیت مخطوطات
ئی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اُس زمانے کا پورا مزاحیہ لٹریچر محفوظ بھی نہیں رکھا گیا۔ اُس زمانے میں ایسا کوئی ادارہ یا اکادمی
کوئی شخص اِن لطیفوں پر کوئی باضابطہ کام کرتا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ لطائف کو مختلف ابواب میں اُن
ان کے لحاظ سے درج کیا جاتا ہے۔ کتنے ہی شاعروں اور ادیبوں کے لطیفے اخبار و رسائل میں نمایاں
ہیں جن کے مرتب کا نام جلی حروف میں شائع ہوتا ہے (یہ اچھا طریقہ ہے) ہماری آئندہ نسلیں اپنے
کسی بھی لطیفے سے محروم نہیں رہیں گی۔ (ورثے میں انھیں کچھ تو ملنا چاہیے)۔

جہاں تک تواتر اور سرقے کی وارداتوں کا تعلق ہے یہ وارداتیں لطیفوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ

ہوگئی ہیں۔ (اشعار وغیرہ کے سرقے اعداد و شمار کے اعتبار سے کوئی حقیقت نہیں رکھتے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لطیفے بالحاظ ملک و زبان اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئے ہیں۔ جو لطیفہ ہندوستان کے خانخاناں سے سرزد ہوا تھا وہی لطیفہ برنارڈ شا سے بھی منسوب ہے ہمارا اشارہ اس شہرۂ آفاق لطیفے کی طرف ہے جس میں ایک خوبصورت خاتون اپنے ممدوح سے (یہ ممدوح خان خاناں تھے) اپنی اس خواہش کا اظہار کرتی ہیں کہ یہ ناچیز آپ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منتقل ہونا چاہتی ہے اور موصوفہ نے اس تجویز کا جواز یہ بتایا تھا کہ مجوزہ عقد کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہوگی (اگر ایسا ہوا تو) وہ ذہین بھی ہوگی اور خوبصورت بھی ہوگی۔ اس فرمائش کا جو جواب اُنھیں ممدوح کی طرف سے ملا اس کی بناء پر یہ تجویز واپس لے گئیں (جس خطرے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ بڑا خطرہ تھا)۔ اب یہی لطیفہ (یا واقعہ) برنارڈ شا سے بھی منسوب ہے لیکن ہم اپنے (وسیع) مطالعے اور (بے پناہ) معلومات کی بُنیاد پر نہایت اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خاص ہندوستانی واقعہ ہے۔ اس سوال جواب میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو ہے۔ یہ خاص مشرقی ذہانت بھی اور عہد اکبری میں تو اس قسم کے واقعات اور مکالمات روز کے معمولات میں داخل تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ برنارڈ شا کی ذہانت دوسری وضع کی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا واقع میں شادی کا پیغام راست نہیں بھیجا گیا تھا جب کہ برنارڈ شا کے وطن میں شادی بیاہ کی گفتگو میں سوائے فریقین کے اور کوئی حصّہ لیتا نہیں ہے ــــ گفتگو بھی علی الاعلان ہوتی ہے۔ خفیہ کاروبار الگ ہوتے ہیں۔

ایک اور بیربل سے متعلق کچھ لٹریچر ہم تک بھی پہنچا ہے بلکہ یہ کہنا دُرست ہوگا کہ ہم خود اپنے ذرائع اور کوششوں سے اس لٹریچر تک پہنچے ہیں جو ابھی تک خام حالت میں ہے۔ مطلب یہ کہ اِسے ابھی ترجمے کی بھٹّی میں ڈالا نہیں گیا ہے۔ چوں کہ یہ لٹریچر ماڈرن فارسی میں نہیں ہے اس لیے ہمارے احباب میں سے کوئی شخص معنی پر جڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے (حالانکہ ترجمے کا صحیح ہونا ضروری کب ہے)۔ ہم جہاں تک ان لطیفوں کو سمجھے ہیں ان میں کم سے کم دو لطیفے ضرور ایسے ہیں جن میں مہابلی اکبر اعظم راجہ بیربل سے زیادہ ذہین نظر آتے ہیں مثلاً ایک کہانی ہمارے پاس کے مخطوطے میں یہ درج ہے۔

ایک دن جب اکبر اپنے محل کے باغ میں گلگشت کر رہے تھے (یہی لفظ اصل مسودے میں استعمال ہوا ہے)۔ اور بیربل تقریباً ہم قدم تھے تو اکبر نے اچانک ان سے پوچھا (اکبر ہمیشہ اچانک ہی کچھ پوچھا کرتے تھے)۔

بیربل تمہارا وزن کتنا ہے؟

بیربل نے کہا "حضور! میں زمین پر ہی ٹھیک ہوں؟"

اکبر نے کہا: "اچھا پر تم بوجھ ہو۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ کتنا بوجھ ہو؟"

بیربل اپنی گلگشت بھول گئے۔

دوسرا قصّہ بھی کچھ اِسی قسم کا ہے۔

اکبر نے ایک دن کہا۔ بیربل تم تو اللہ والے آدمی ہو۔ کیا کسی کے مُرید بھی ہو۔

بیربل نے جواب دیا: مہابلی۔ خادم آپ ہی کی طرح زن مُرید ہے۔

اکبر نے کہا۔ تمہاری بیوی آپنی پیر ہیں ــــ تم کو کم عمر دکھائی دیتے ہو۔

ایک لطیفہ جو اس نایاب ذخیرے میں شامل ہے ہمیں بہت پسند آیا۔ بیربل نے اِس میں ثابت کر دیا کہ وہ کتنے ذہین ہیں۔

ایک دن مہابلی کسی الجھن میں گرفتار تھے۔ کبھی اِدھر دیکھتے کبھی اُدھر دیکھتے۔

بیربل نے پوچھا! حضور آپ کو کچھ چاہیئے۔

اکبر نے کہا۔ ہاں تمہارا سر چاہیئے۔

بیربل نے عرض کیا: حضور میں نے تو پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ صرف اپنے سر کے بھروسے اِتنے سارے کام نہیں کر سکتے۔

اکبر تو ہنس پڑے (حالانکہ بیربل نے بات بڑی سنجیدگی سے کہی تھی)!

□ □

U.A.E (متحدہ عرب امارات) کا ویزا۔

خوشخبری

اُن مسافروں کے لیے جو نہ صرف اپنے دوست احباب، رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جو U.A.E میں مقیم ہیں بلکہ اُن سیاحوں کے لیے بھی جو متحدہ عرب امارات کے سات خلیجی ریاستوں (دوبئی، ابوظہبی، شارجہ، اجمان، فوجیرہ، راس الخیمہ، ام القوین) کی سیر و تفریح کے علاوہ سامان کی خرید و فروخت کے لیے جانا چاہتے ہوں ان کے لیے 7 تا 15 دن کے ویزوں کا مع قیام و طعام نہایت ذمہ داری سے کیا گیا ہے۔ جو حضرات U.A.E میں اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کے ہاں بھی رہنا چاہیں تو بخوشی رہ سکتے ہیں۔

□ مزید تفصیلات کے لیے حسب ذیل پتہ پر ربط پیدا کریں۔

بہترین سروس مکمل آرام

مظہر ٹراویلس

مظہر منشن 3-6-293/4
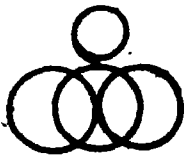
حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد۔ فون: 235084

(وزارت امور خارجہ حکومت ہند کا مسلمہ ٹراویل ایجنٹ)

نیاز سواتی (پاکستان)

مزاحیہ کلام

تو مجھے ایسا کوئی کشتہ کھلادے سائیں!
جو بڑھاپے میں جواں مجھ کو بنادے سائیں!

کار والا اسے ہفتے میں بنادے سائیں!
نوکری بیٹے کو کسٹم میں دلادے سائیں!

قرضِ حسنہ کے اسے ڈال دے اب کھاتے میں
جو مجھے قرض دیا تھا وہ بھلادے سائیں!

والدہ میری بضد ہے کہ کروں میں شادی
مجھ کو شادی کی مصیبت سے چھڑادے سائیں!

باپ کہتے ہوئے بچے بھی ترے شرمائیں
اپنے حلیے کو نہ ایسا بھی بنادے سائیں!

اپنے ماتحتوں کی بچنا ہے اگر سازش سے
اپنے ماتحتوں کو آپس میں لڑادے سائیں!

قرض لے کر جو نظر آیا نہیں پھر مجھ کو
مجھ سے بچھڑا ہوا وہ یار ملادے سائیں!

پھر کہے گی نہ تری اہلیہ "بیمار ہوں میں"
وجہِ بیماری اگر عمر بتادے سائیں!

دُور کرتا ہے اگر بیٹے کو خود سے تو لے
اس کو شادی کے شکنجے میں پھنسادے سائیں!

کالا بکرا میں تری نذر کروں گا لاکر
مجھ کو ڈسکو کی وبا سے جو چھڑادے سائیں!

(۲)

کہا کشتی چلائیں ہم؟ کہا کشتی چلاؤ تم
کہا طوفان کا ڈر ہے، کہا طوفان تو ہوگا

کہا، کیا ہم کریں توبہ؟ کہا ہاں تم کرو توبہ
کہا شیطان کا ڈر ہے، کہا شیطان تو ہوگا

کہا مستعفی ہو جاؤں؟ کہا مستعفی ہو جاؤ
کہا نقصان کا ڈر ہے، کہا نقصان تو ہوگا

کہا بیگم سے جھگڑیں ہم؟ کہا بیگم سے جھگڑو تم
کہا بحران کا ڈر ہے، کہا بحران تو ہوگا

کہا جو چاہیں ہم کھیلیں؟ کہا جو چاہو تم کھیلو
کہا کپتان کا ڈر ہے، کہا کپتان تو ہوگا

کہا ہم نقل کرسکتے ہیں؟ کہا جی شوق سے کیجے
کہا نگران کا ڈر ہے، کہا نگران تو ہوگا

کہا کیا کشتہ کھائیں ہم؟ کہا ہاں کشتہ کھاؤ تم
کہا یرقان کا ڈر ہے، کہا یرقان تو ہوگا

کہا، کیا پھول پھینکیں ہم؟ کہا ہاں پھول پھینکو تم
کہا گلدان کا ڈر ہے، کہا گلدان تو ہوگا

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار
گوجرانوالہ، پاکستان

اسٹوڈنٹ لیڈر

(تمام غیر جسٹرڈ اور رجسٹرڈ و لقہ قسم کے لیڈروں سے معذرت کیساتھ)

کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ آپ کو بھی کالج کا پہلا دن اچھی طرح "وہ بھی کچھ نہ کچھ" تو یاد ہو گا ہم چشم تصور سے دیکھ رہے ہیں کہ آپ ڈرتے ڈرتے اور کچھ شرماتے کچھ لجاتے کالج کا مین گیٹ کراس کر چکے ہیں آگے سڑک کی نکڑ پر چند خوش پوش نوجوان پتلی کمریا والے کھڑے ہیں ایک کنگھی کر رہا ہے دوسرا ایک ایسا پوز بنائے کھڑا ہے کہ اس کی ٹانگیں قینچی کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ تیسرا کوئی پمفلٹ ہاتھ میں پکڑے بے نیازی سے اکا دکا لفظ پڑھ رہا ہے لیجئے آپ ان کے قریب پہنچنے والے ہیں وہ لوگ بھی متوجہ ہو چکے ہیں اور اب انہوں نے بڑھ کر آپ کا تقریباً فقید المثال استقبال بھی کیا ہے وہ کالج آفس یا لیکچر تھیٹر تک زبردستی رہنمائی کے درپے ہیں۔ انھوں نے تھوڑا سا اپنی سیاسی جماعت کا تعارف بھی کرایا ہے۔ جس طلبہ تنظیم کا وہ نام لے رہے ہیں وہ کسی نہ کسی ملکی یا پردیسی جماعت کی بغل بچہ تنظیم ہے ان تین چار نوجوانوں کے چہرے اور مہرے ابھی ذہن نشین کر لیں کہ یہ اسٹوڈنٹ لیڈر ہیں اور اگر نہیں ہیں تو اسٹوڈنٹ لیڈروں کی پنیری تو ضرور ہیں۔

اسٹوڈنٹ لیڈر صنعتی پیمانے پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سڑکوں اور راہداریوں میں ہونے والے سیاسی عمل میں کسری کشید کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔ ٹمپریچر زیادہ ہو جائے یا قومی مسائل کا غم زیادہ ہو جائے تو عمل تبخیر شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے اسٹوڈنٹ لیڈر تبخیر معدہ کا شکار ہو جاتا ہے اس دوران اگر عوام کی زبوں حالی پر زیادہ سوچے تو درد دل بھی شروع ہو جاتا ہے رات کو دیر سے جب گھر یا ہاسٹل کا رُخ کرتا ہے تو سوچتا ہے اس درد کی دوا لیتا چلوں۔ لیکن ہر کلینک کے شٹر اس پر بند ہو چکے ہوتے ہیں یعنی ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل ؛ وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ہر اسٹوڈنٹ لیڈر دو تین سال فقط ایک ہی کلاس میں توقف کرتا ہے شاید کہیں سے پڑھ لیتا ہے کہ تیز رفتاری موت انجام! پھر ذرا سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ پڑھائی کا شارٹ لوں اور اگلی کلاس تک رسائی حاصل کروں یا رہنے دوں؟ سیاست اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے شاخ گل میں باد سحر گاہی کا نم قوم کے غم میں سوکھ سوکھ کر اتنا صحت مند ہو جاتا ہے کہ اسے دیکھ کر عام آدمی خیال کرتا ہے دوسرا جھارا اب عدم سے معرض وجود میں آگیا ہے ہر اسٹوڈنٹ لیڈر جلد باز ہوتا ہے ذرا سی بات پہ پریشان ہو جاتا ہے مثلاً روسی فوج سرحدوں

پر دستک دے رہی ہے اب اچھا کرے تو جواب دے کہ "بھائی گھر کوئی نہیں"! اور حقیقت بھی شاید یہی ہے کہ گھر میں کوئی نہیں امریکی قوم کو دیکھیں اس کے برعکس ہر وقت خوش باش رہتی ہے جیسے نیویارک میں ایک آدمی پچاس منزلہ عمارت سے نیچے گر پڑا دسویں منزل کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا پریشانی کی کوئی بات نہیں اب تک تو بالکل خیریت ہے یہی بات ہم کہہ رہے تھے کہ دس سر پہ آگیا ہے تو کیا ہوا کون سا اس نے ہماری سنگھی میں لون دے دیا ہے اب تک تو بالکل خیریت ہے۔

ہر اچھے اور کامیاب اسٹوڈنٹ لیڈر میں چند ایک خصوصیات کا بدرجہ اتم موجود ہونا لازمی ہے (اختیاری نہیں) مثلاً

۱۔ اسے بہت سے چٹ پٹے شعر یاد ہوں۔

۲۔ چرب زبانی کو استعمال کرتے ہوئے چھوٹی سی بات کا بڑا سا پچاس من وزنی بتنگڑ بنا سکے۔

۳۔ مخالفین کی ذات و صفات کی دھجیاں اُڑانے اور بعد ازاں فضا میں بکھیرنے پر ید طولیٰ رکھتا ہو۔

۴۔ ہر وقت ہر کسی سے ملتے ہوئے خالص الیکشنی مسکراہٹ چہرے پر سجانے کا ماہر ہو۔

۵۔ روزانہ کم از کم تیس ہٹے کٹے بے فکرے طالب علم دوستوں کو ناشتہ، بیس دوستوں کو پیپسی اور دس دوستوں کو فلم دکھلانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۶۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے اور پینترا بدلنے میں نیولے کی طرح ایکسپرٹ ہو۔

۷۔ جذباتی تقریر کر کے حاضرین کے دلوں کو بلاسٹ فرنس بنانے کا ماہر ہو۔

۸۔ مضبوط سر کا مالک ہو جو ایک تقریر کے دوران بہت سے گندے انڈوں پر مشتمل باؤلنسر اور سوئنگ ہو کر آتی ہوئی سبزیوں کو اپنی جبینِ نیاز پر سہہ سکے۔

ہم نشتر میڈیکل کالج میں پڑھتے رہے وہاں اسٹوڈنٹ لیڈروں کی بڑی عمدہ ورائٹی پائی جاتی تھی کیمپس کے آگے سڑکوں پر بنے ہوئے کھوکھوں پر یہ لوگ بالافراط پائے جاتے تھے بےتیو بڑھی ہوئی بال بکھرے ہوئے۔ آدھی شرٹ پتلون کے اندر اور آدھی باہر۔ عمر رسیدہ قسم کے انڈے اور سلائس کھا رہے ہیں۔ انڈے کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا گیا۔ اس سلسلے میں "وجہ تسمیہ" تو کوئی خاص نہیں ایک سُنا سنایا واقعہ البتہ پیش کیا جا سکتا ہے ایک کنوارہ نوجوان اسی قسم کے کسی کھوکھے پر ناشتہ کرنے میں مبتلا تھا کہ یکایک اس کی نظر سامنے پڑے اُبلے انڈے پر پڑی وہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ کہ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا غور سے پڑھنے لگا۔ اس تحریر پر کسی ایسے آسودہ حال کنوارے نوجوان کی نظر پڑے جو ایک زمین دار کی خوبصورت ۱۸ سالہ بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہو۔ تو اس پتے پر خط لکھے۔ نوجوان نے اسی دن خط لکھ دیا تیسرے دن جواب آیا کہ آپ نے خط ذرا دیر سے لکھا۔ میری تو شادی ہو چکی ہے بلکہ اب دو بچوں کی والدہ ماجدہ بھی ہوں۔

الیکشن کی بادِ بہاری ہر سال آتی تھی۔ اور سہانی یادیں چھوڑ جاتی الیکشن میں حصہ لینے والے لیڈرانِ عظام ان دنوں سے پیشتر کبھی ملتے تو واجبی سی سلام دُعا ہو جاتی لیکن الیکشن قریب آتے تو اچانک چھوٹے موٹے قائدین کا ظہور ہونا شروع ہو جاتا۔ انہی نو دریافت شدہ قائدین پر اچانک انکشاف ہوتا کہ ہم تو ان کے نہایت ہی قریبی عزیزوں میں وہ پہلے ہیں جان پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں بناتے بڑی گرمجوشی سے ملتے اس طرح۔ بغلگیر ہوتے کہ ہڈیاں انھیں صلواتیں سنانا شروع کر دیتیں اور چند دن کے لیے متاثرہ حصوں پر آئیوڈیکس کا آزادانہ استعمال کرنا پڑتا۔

نے والے اُمیدواران چائے اور مشروبات کی (ظاہری طور پر) غیر مشروط پیش کش کرتے حالانکہ دل میں
ووٹ مل گیا تو خرچ شدہ رقم بار آور ثابت ہوگی۔ ورنہ بے فائدہ۔ الیکشن کے بعد نظریں اجنبی بن جاتیں۔
ی نے چائے کی آفر کی نہ مزیدا پیش کی نہ مسکرا کے دیکھا نہ بغلگیر ہوا ایسے ہی ایک صاحب کہ الیکشن میں چاروں
ت گرے تھے۔ ہوسکتا ہے کوئی ہڈی پسلی بھی تڑوا بیٹھے ہوں۔ ان سے پوچھا کہ اب آپ میں وفا کا عنصر کچھ کم
ے فوراً فرمایا ؎

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں ؛ ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

کالج کے در و دیوار پر اُن دنوں جگہ جگہ پوسٹر چپکے ہوتے تھے جن میں کچھ جوشیلے اور کچھ عقیدت و محبت
دں میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے محسوس ہوتے بعض پوسٹر بڑی رقت آمیز تحریروں سے اٹے پڑے ہوتے
ہ کے قیمتی ووٹ کے جائز حق دار اور قانونی وارث بندہ ناچیز ظلم کے آگے ہمیز مسٹر چوہدری علم دین فا
ب رول نمبر ۲۴ تھرڈ ائیر" خدارا اپنا ووٹ عطا کر کے حق کی پشت پناہی کریں"
کچھ پوسٹروں پر جذبات کو بھڑکانے والے اشعار لکھے ہوتے جن میں سے اکثر اوزان کی حدود و قیود سے
ردیف قافیہ کی پابندی سے ماوراء ہوتے جیسے ؎

غم کیوں کرتے ہو کہ ضرورت پڑی تو ڈالوں گا ؛ لہو کا تیل چراغوں میں جلانے کے لیے
تندیٔ باد مخالف سے کیوں گھبراتا ہے عقاب ؛ یہ تو چلتی ہے تجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے

روزانہ جلسہ و جلوس، شور و غوغا اور ہنگامہ برپا رہتا ہمارے ایک دوست کہ جن کا تعلق پنجاب کے ایک
و نیم دریا فتہ شدہ گاؤں سے تھا۔ الیکشن میں حصہ لینے کی سوجھی دوستوں نے ووٹ دینے کی ساتھ مرنے
جینے کی قسمیں کھائیں۔ کاغذات نامزدگی پامردی سے داخل کرائے گئے۔ دوسرے دن سے تقریروں کا سیزن
ا۔ وہ بیچارے سیدھی سادی حلوہ کی پلیٹ کے عادی تھے اور واسطہ پڑ گیا ٹیڑھی کھیر کے "دابڑے" سے
دار تقریر لکھ کر دی گئی دوستوں کو دوسرے دن کے لیے ان کا مقام اور کام سمجھایا گیا ہماری ڈیوٹی یہ تھی
جلوس میں کھڑے ہوں اور جب یہ دیکھیں کہ مقرر پٹڑی سے اُتر رہا ہے تو کوئی ہلکا پھلکا نعرہ داغ دیں۔ اگلے
ن ہوا۔ تالیوں کی گونج اور ٹہنیوں کی چھاؤں تلے ایک اونچی سی دیوار پر انہیں ایستادہ کیا (ویسے ان کی حالت
ہو رہی تھی کہ جیسے دیوار میں چنے جا رہے ہوں) سامعین کچھ پکڑ کر لائے گئے کچھ خود بخود کچے دھاگے کی
ے بغیر کھنچے چلے آئے۔ تقریر شروع ہوئی،

انداز زیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ؛ شاید کہ پڑ جائے تیرے سر پہ میرا ہاتھ

ت تیرے کی ہم نے نعرہ داغ دیا اور یوں ان کا آؤٹ آف آرڈر شعر ان آرڈر محسوس ہوا۔ ملنبد و بانگ دعوے
ے۔ وقفے وقفے سے مقرر شدہ دوستوں کی تالیوں کا شور اور ہم بھی اپنے فرائض غیر منصبی مستعدی سے سرانجام
تھے۔ جہاں کہیں مقرر کی زبان ٹھیک رفتار کا گیر پھنسا ہوا محسوس کیا۔ فوراً ایک لحیم و شحیم نعرہ داغ دیا انہیں
سوچنے کو مل جاتا اور یوں تقریر میں پیوند کاری اور رفو گری کا کام حاضرین کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر
مت دیکھئے کہ کچھ دیر بعد ہم اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو کر کسی اور طرف دیکھنے لگے اور اسی اثناء میں
ن لڑکھڑا گئی۔ اب مزہ تو جب تھا کہ گرتوں کو ساقی صاحب تھام لیتے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ لیڈر صاحب

نے ہمیں متوجہ کرنے کے لیے مائیک کے بالکل سامنے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ "یار نعرہ لگانا" لیکن سب نے سن لیا اور یوں ہوا ہے کہ عین بیچ بھانڈا پھوٹ گیا وہ کہہ رہے تھے "دوستو میرے ایسے لوگ مشکل سے ملیں گے کہ صلاحیتیں جن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؛ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

محسوس ہوا کہ شعر میں کہیں نہ کہیں گھپلا ہو گیا ہے سامعین پر حقیقت آشکار ہو گئی ایک جوان ہمت طالب علم نے افتتاح کیا اور سب سے پہلے ایک بزرگ سا ٹماٹر اور عاجز سا پچکا ہوا انڈا ہمارے اسٹوڈنٹ لیڈر کی جانب پھینکا۔ ہم سر جھکائے بچتے بچاتے اس ہجوم بے بصر میں سے نکل آئے اور ؎

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

بعد ازاں بہت سے اسٹوڈنٹ لیڈروں سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور اس مخلوق کی عادات اور اطوار کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اکثر اسٹوڈنٹ لیڈروں کی صبح گیارہ بجے ہوتی ہے اور ہر کلاس میں چار پانچ سال براجمان رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض جب کالج میں سال آخر کے طالب علم ہوتے ہیں تو ان کا خلف الرشید اسی کالج میں سال اول کے نوخیز طالب علم کی حیثیت سے وارد ہو چکا ہوتا ہے۔ ہر کام ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے (کیونکہ دائیں ہاتھ میں سگریٹ ہوتا ہے") کبھی کبھار طبیعت میں چہل آئے تو کوئی کتاب بغل میں دبائے منہ میں رام رام کہتے کلاس میں چلے جاتے ہیں۔

مخلوط قسم کی تعلیم مہیا کرتے والے اداروں میں اگر کوئی خاتون اسٹوڈنٹ لیڈر کے عہدے پر خود بخود فائز ہو جائیں اور تقریر بھی شروع کر دیں تو حاضرین میں سامعین کم اور ناظرین زیادہ ہوتے ہیں۔

ہم آج کل کبھی عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں (بے شک کوئی غزل نہ بھی چھیڑے) تو اپنا زمانہ طالب علمی یاد آتا ہے الیکشن کے دنوں میں جب گھسی پٹی تقریریں سن کر دونوں کان اچھی طرح پک جاتے تو ہمارے ایک مرنجان مرنج صورت شطرنج۔ دوست گیٹو گرے اسٹیج پر چڑھ جاتے اور کہتے ذرا ورائٹی ہو جائے۔ ؎

گئے نگاہ دے نیر کلیجہ چیر عیراں دیگر رنگا نصیر تیری تصویر میری تقدیر
میری جاگیر ہے

ہے تو صاحب کمال میں خستہ حال بے حال نڈھال تو جام وصال پیال
مینوں اکسیر ہے،

یہ مختصر شعر سنانے کے بعد اس قسم کی گفتگو کرتے "لوبھئی سجنو میں ووٹ لینے نہیں آپ کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے آیا ہوں۔ میرے ابا عاشق علی ولد معشوق علی سرمہ شربت دیدار بناتے تھے جس میں دھوپ چھاؤں کی جڑیں چڑیا کے دودھ کی لسی اور روغن کدو بھی ملایا کرتے تھے سرمہ کی ترکیب استعمال یہ ہے کہ سرمچو سے لگا دائیں آنکھ میں ڈالیں تو فوراً بائیں آنکھ کا "ڈیلا" باہر ہوگا۔

اسٹوڈنٹ لیڈر جب کئی کئی سال ایک ہی کلاس میں مقیم رہتا ہے تو اس کا بھی دل بھر آتا ہوگا اور دل ہی دل میں کہتا رہتا ہوگا۔

سیاست میں گو لاکھ صدمے ہوں دل پہ ؛ ظفر کچھ نہ نکلے خبر دار منہ سے

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لیڈری انہیں کیا P A Y کرتی ہے تعلیمی سال ضائع۔ پیسا ضائع۔ اگر مخالف پارٹی سے لڑائی ہو جائے تو کوئی "لت یا بانہہ" بھی ضائع اور گلا گیا۔ یہ سوال کئی دنوں سے مجھے ستا رہا تھا۔ لیکن کل مطالعہ کے دوران نظیر کی ایک نظم نے اس سوال کا مجھے منہ توڑ جواب دیا۔ آپ بھی اپنا منہ بچاتے ہوئے سنیں ۔

بل اور زمیں الاٹ کراتی ہے لیڈری
اور کوٹھیوں پہ قبضہ دلاتی ہے لیڈری
لنچ اور ڈنر مزے سے اڑاتی ہے لیڈری
غم ساتھ ساتھ قوم کا کھاتی ہے لیڈری
فرصت ملے تو ٹور پر جاتی ہے لیڈری

■ ■

دلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند دوپٹہ
دلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے ایچ زری والا
کا ہوگا

اس کے علاوہ
ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک :۔
بنارسی سلک ساڑیاں　تنچوی　ساٹن　جارجٹ　آرگنزا　ٹیشو　شفان　پٹولہ
بروکیڈ　دھرمادرم　کانچی ورم　پوچم پلی　نارائن پیٹ　میسور کریپ
ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل۔
خصوصی کاؤنٹر : میاچنگ کے بلوز، دوپٹہ، کرتے اور فالس۔
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا!

PHONE: 525232

اے ایچ زری والا
لاڈ بازار، حیدرآباد ۲۔　کیبل "زری والا"

رشید عبدالسمیع جلیلؔ

آئی رے.....!

ہے وہی کھڑکی وہی زلفوں کا سایہ آئی رے
رات دن جس نے فقط کچرا گرایا آئی رے

پیاز کے چھلکوں کو پھینکا دفعتاً یوں آپ نے
ہم نے یہ سمجھا کہ آنچل سرسرایا آئی رے

ایک آہٹ سی ہوئی دل نے کہا وہ آ گئے
مڑ کے دیکھا تو گدھے نے سر ہلایا آئی رے

یوں ہوا اکثر کسی سے آنکھ جب بھی لڑ گئی
سانس پھولی، دم گھٹا، دل پھڑپھڑایا آئی رے

رات کے پچھلے پہر کروٹ بدل کر سو گئے
ایک مچھر کان میں کیا بھنبھنایا آئی رے

مانگ تھی کانجی ورم کی ہم نے لائی ہینڈ لوم
دیکھ کر بیگم نے اپنا منہ پھلایا آئی رے

پیچھے پیچھے لڑکیوں کے بن ٹکٹ جب ہو لئے
گیٹ پر دربان نے ڈنڈا گھمایا آئی رے

اک ذرا سی مسکراہٹ ایک ہلکی سی ادا
بارہا جس نے ہمیں الو بنایا آئی رے

راج کرسی پیش کرنے جا رہا ہے راج ظلم
ہل رہا ہے اک طرف شوٹنگ سے پایہ آئی رے

محفلِ شعر و سخن بھی مقصد کی محفل ہوئی
سب نے مصری کی طرح مصرعہ اٹھایا آئی رے

اک قدم فٹ بورڈ پر تھا اک قدم فٹ پاتھ پر
بس ایسے میں چلتی بس نے اڑایا آئی رے

رؤف رحیم

غزل

چاند سے چہروں کو تکنے کی تھی عادت میری
اس لئے پڑ گئی کمزور بصارت میری

میں ہی مون کو کشمیر گیا تھا تنہا
ساری دنیا میں ہے مشہور خجالت میری

اپنا معمار ہوں میں دیش کا معمار نہیں
جھوٹی بنیاد پہ ٹھہری ہے عمارت میری

محفلِ شعر کا سب خرچ اٹھاؤں گا مگر
شرط یہ ہے کہ رکھی جائے صدارت میری

چار مینار، قلعہ ہو کہ ہو پھر تاج محل
جس پہ قابض نہیں کوئی وہ عمارت میری

امن ہوگا تو نہ چل پائے گی روٹی روزی
ہے فسادات پہ موقوف سیاست میری

دست و پا ٹوٹ گئے عشقِ بتاں میں اکثر
ان کی گلیوں میں ہوئی روز مرمت میری

واہ رے شعر سے قدر مری واہ رے میں
واہ واہ کر کے چکا دی گئی قیمت میری

اس لئے مجھ پہ عنایت کی نظر ہے شاید
گھر کے کاموں کے لئے ہوگی ضرورت میری

اک غزل میں نے سنائی تھی جو محفل میں رحیمؔ
مفت میں ہوگئی اس روز حجامت میری

میر حسین علی امام
حیدرآباد سندھ (پاکستان)

ج سے جوتے

جُوتا، جوتے اور جوتیاں ہر انسان کی ضرورت ہیں کالج و یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر نکلنے والے نوجوان جوتیاں چٹخاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ امیر شاہی طبقہ جوتیاں مارتا ہے اور غریب کھاتا ہے۔ بعض جگہوں پر جوتے کے لیے سینڈل کا خوبصورت لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب یہ سینڈل خوبصورت پیروں کے بجائے خوبصورت ہاتھوں میں ہو تو بعض کے لیے نہایت پسندیدہ ڈِش بن جاتی ہے۔ جوتے جب کو الیفائیڈ یا پڑھے لکھے شہری مزاج کے لوگ پہنتے ہیں تو بوٹ کہلاتے ہیں جبکہ غریب ہوائی چپل پہنتے ہیں اور ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں۔

جوتے اور مقبول شخصیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دامن پاکستان میں کچھ زیادہ ہی وسیع ہے بلکہ کہنا یہ چاہیئے کہ پاکستانی بڑے خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اور ہر بین الاقوامی شخصیت کے نام پر جوتے، سینڈل کے نام رکھ چھوڑے ہیں۔ لالوکھیت کے بازار میں یا طارق روڈ کے شاپنگ سنٹر پر قذافی شو، لیڈی ڈائنا شو وغیرہ کے بورڈز یقیناً آپ کو مل جائیں گے جو دراصل لیبیا و برطانیہ سے ہماری محبت کا اظہار ہیں۔

جوتے چُرانا، بعض کا مشغلہ ہوتا ہے اور کچھ کی مجبوری! مجبوری میں انسان کچھ بھی چُرا لے جائے (بسا اوقات کوئی دل چُرا لے جاتا ہے) ہائے رے مجبوری! لیکن جوتیاں چُرانے کو مشغلہ بنانا یا بطور مشغلہ کے چُرانا، قطعًا جائز نہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد دیر سے آتے تھے اور سب سے پہلے مسجد سے باہر چلے جاتے تھے۔ اُن سے کسی نے دریافت کیا "بھائی، ایسا کیوں کرتے ہو؟" تو فرمانے لگے کہ جوتی چوروں کے ڈر سے! اکثر مساجد میں سجدے کے آگے یا دیواروں کے ساتھ جوتیوں کے اسٹینڈ رکھے جانے لگے ہیں موجودہ تہذیب کا یہ ایک نیا تحفہ ہے جو کہ ہمیں جوتی چوروں کی طرف سے ملا ہے۔ ایک زمانے میں گجرات کے باشندوں کو باہر جوتی چور سمجھا جاتا تھا اور ٹرین جب اسٹیشن پر پہنچتی تھی تو ڈبے میں آواز گونجا کرتی تھی کہ جوتی سنبھال کر رکھنا کہ گجرات آگیا۔ لیکن اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر مسجد میں جوتے سنبھال کر رکھنے پڑتے ہیں کیونکہ نمازی مسجد میں گیا اور جوتے غائب۔ گویا مسجد نہ ہوئی کوئی جوتوں کی مفت تقسیم کا ادارہ ہے کہ اپنی پسند کی جوتی پہنی اور گھر چلے گئے۔

جوتے چونکہ پہنے جاتے ہیں، اس لیے بنائے بھی جاتے ہیں۔ جوتے بنانے والے 'چمار' کہلاتے ہیں اور ... انسان۔ انسان اور چمار میں کیا فرق ہے! یہ ... بہتر جانتے ہوں گے۔ لیکن ہم یہ جانتے ...

اب ایک صنعت ہوگئی ہے اور کروڑہا معزز افراد اس صنعت سے وابستہ ہیں۔

جوتا، شاعروں اور لیڈروں کا سیاست کے میدان میں ہمیشہ سے روایتی حریف رہا ہے۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے ہمیں آج تک ایسے تاریخی مشاعرے کا قطعاً کوئی علم نہیں جس میں جوتے برسائے گئے ہوں یا پھینکے گئے ہوں یا صدر مشاعرہ یا کسی عظیم شاعر کو جوتوں کے ہار پہنائے گئے ہوں۔ لیکن ممتاز سیاستدان ہوں یا بلدیاتی کونسلر کے لیے اٹھنے والا عام امیدوار، سب کی سواگت، آؤ بھگت اور تواضع جوتوں کے ذریعہ کرنا، ہماری قوم بہتر جانتی ہے جب بھی کسی تنظیم کی سیاسی مہم کا آغاز ہوتا ہے قریبی دکان سے جوتوں کی گرانڈ رعایتی سیل شروع ہو جاتی ہے تاکہ تمام تماش بینوں کو سہولت رہے اور کوئی بھی اس سیاسی نیکی یا سیاسی ادبی دشیطان کو ری کرنا اور سیاستدان کو جوتے مارنا، غالباً ایک ہی مقدس فریضہ کے دو نام ہیں ۔۔۔ عوام کے نزدیک) سے محروم نہ رہے۔

بہرکیف جوتا ایک اہم ضرورت اختیار کر گیا ہے۔ معاشی، اقتصادی، سیاسی، سبھی لحاظ سے اس کی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔ اگر کسی طالب علم کے جوتے ایسے نہ ہوں یا اُن پر پالش نہ ہو تو وہ ڈسپلن کے لحاظ سے ایک اچھا طالب علم نہیں سمجھا جاتا ہے۔ (چاہے، اُن کے پاس نئے جوتے خریدنے کی استطاعت ہی نہ ہو) اسی طرح کسی محفل میں آپ اچھے جوتے پہن کر نہ جائیں تو آپ آدابِ محفل سے واقف نہیں ہیں یا آپ کی شخصیت میں جھول رہے۔ جوتے پہن کر اکڑ کر چلنا، ایڑی کی آواز پیدا کرنا، اپنی طرف مصنوعی توجہ پیدا کرانا، خواتین کا شیوہ اور افسری کی شان سمجھی جاتی ہے۔ خواتین کے سینڈل کی ٹھک ٹھک جہاں دلوں کو گرماتی ہے وہاں افسروں کے جوتوں کی دھمک ذہنوں کو سہماتی ہے۔

ایک زمانے میں کسی نقاب پوش حسینہ کی جوتی دیکھ کر کوئی عاشق بیمار ہو جاتا تھا اور صدائیں لگایا کرتا تھا کہ جس ظالم کی جوتی اتنی خوبصورت ہے وہ خود کتنی خوبصورت ہوگی؟ دیکھا آپ نے، پرانے وقتوں کے عاشق کا حال، لیکن دورِ حاضر کا عاشق محبوبہ کی جوتی نہیں دیکھتا ہے بلکہ عید کے موقع پر جوتوں کی دکان پر سیلزمین بن جاتا ہے اور ہر گاہک لڑکی کو سینڈلز کچھ اس طرح سے پیش کرتا ہے گویا نذرانۂ دل پیش کر رہا ہو۔ اور کالج کی یہ چنچل دوشیزائیں ادائے دلبری سے کچھ اور ڈیزائن دکھائیے کہتے ہوئے جوتوں کے سو ڈیزائن کے ساتھ عاشق کے سو روپ دیکھتی ہیں اور جوتوں کے ساتھ دل کا سودا بھی جز وقتی کر جاتی ہیں۔ چاہے یہ جھوٹا دار عید بازار جنھوں نے جوتوں کی دکانوں کو دل کی اوپن مارکٹ بنا دیا!

آج کل پبلسٹی کے کئی طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ جن میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی مشہور شخصیت کے دستخط کی کاپی اُس شئے پر پرنٹ کی جاتی ہے اور اُس شخصیت کے پرستار اُس شئے کو خرید لیتے ہیں۔ اس طریقۂ کار سے جوتے بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ اور مختلف کرکٹروں کے دستخط شدہ جوتے مارکٹ میں آ گئے، گویا کوئی تو بہانہ چاہیے جوتوں کی فروخت کے لیئے۔

بعض علاقوں میں شادی کی رسموں میں "جوتی کی رسم" بھی ہوتی ہے۔ جس میں دلہن کے بھائی، دولہا کی جوتیاں چھپاتے ہیں اور "نیگ" کا اصرار کرتے ہیں۔ اور دولہا تہذیب شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سو روپے کے جوتے کے کئی سو روپے ادا کرتا ہے تب اُسے اپنے جوتے واپس ملتے ہیں۔

جوتے چرانے، پالش کرنے، ڈیزائننگ کے [illegible] جاتے ہیں۔ ہر رنگ کے [illegible] جوتے

خصوصاً سینڈلز میچنگ کلر کی دستیاب ہونے لگی ہیں۔

بعض لوگ جوتے بغل میں رکھ کر بھاگتے ہیں لیکن اُس وقت جب کوئی پاگل کتّا یا پولیس کا سپاہی اُن کے پیچھے لگ گیا ہو اور سب جانتے ہیں کہ پاگل کتّا اور پولیس کا سپاہی عادات میں ایک جیسے ہوتے ہیں اور کسی بھی وقت آپ کے پیچھے لگ سکتے ہیں۔

ہمیں ڈر ہے کہ یہ مضمون پڑھ کر کوئی جوتی چور، کوئی سیلز مین، یا جوتوں کے دکاندار حضرات ہتک عزت کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ مضمون نہ جوتے کھانے کے لیے لکھا گیا ہے اور نہ جوتے کھا کر! نہ کسی حسینہ کی جوتی سے متاثر ہو کر اور نہ کسی حسینہ کو بطور سیلز مین جوتی پیش کر کے! بلکہ کچھ تو تفریح طبع کے لیے چاہیے کے مصداق لکھا گیا ہے اور تفریح طبع کے لیے ہم نے جوتے تک کا موضوع نہ چھوڑا۔!

نامور مزاح نگار یوسف ناظم
کے مضامین کا مجموعہ!

البتہ

۴ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجیے

نامور مزاح نگار
نریندر لوتھر کے انشائیوں کا تازہ مجموعہ!

الف تحاشا

صفحات: ۱۷۴ ★ قیمت: ۱۶ روپے

مطبوعہ: زندہ دلانِ حیدرآباد

غزلیں

پاگل عادل آبادی

ہستیوں کی عظمت کو ہم گھٹا نہیں سکتے
سر کٹا تو سکتے ہیں سر منڈا نہیں سکتے

وہ حرام خوری میں ٹاپ جا نہیں سکتے
مال جو کہ مُردوں کا ڈٹ کے کھا نہیں سکتے

پیار میں حسینوں کے جیل جا نہیں سکتے
ہم گدھے سہی لیکن گھانس کھا نہیں سکتے

اور بھی ہے اک سسرال جس کی یہ ہے کنڈیشن
آپ جا تو سکتے ہیں جا کے آ نہیں سکتے

روگ لگ گیا جب سے ہائے اُن کو شوگر کا
سامنے ہیں رس گلے پھر بھی کھا نہیں سکتے

کیا وہ تیر ماریں گے تیس مار خاں بن کر
بکریاں بھی ماموں کی جو چرا نہیں سکتے

جب تلک سلامت ہے بوڑھے باپ کا سایہ
یہ جوان بیٹے تو کچھ کما نہیں سکتے

جو چبایا کرتے تھے لوہے کے چنے کل تک
آج گلگلے تک بھی وہ چبا نہیں سکتے

شیر خاں لقب ہے نام ان کا موچھ بھی ہے شیروں کی
پھر بھی ایک چوہے کو وہ ڈرا نہیں سکتے

ایسے کھوٹے سکّے کو بھی وہ دیتے کرائے پر
آپ کیا جہاں کوّے سر چھپا نہیں سکتے

آسمان سے تارے کیا وہ توڑ لائیں گے
ایک نوٹ کا چلّر جو کہ لا نہیں سکتے

آج کل کے گھوڑوں کو کیا ہوا خدا جانے
اب تو یہ سلیقے سے ہنہنا نہیں سکتے

وہ بھی ٹاپ کے شاعر آج بن گئے دیکھو
اپنے نام کے ہجّے جو بتا نہیں سکتے

سُر میں شعر کہتے ہیں دھن میں شعر پڑھتے ہیں
فاعلن فعولن میں سر کھپا نہیں سکتے

جوتے گالیاں ہوٹنگ سب قبول ہیں پاگلؔ
مختصر غزل لیکن ہم سُنا نہیں سکتے

○

سلیم شیخ محبوب نگری

چپکے چپکے رات دن چسکلے لگانا یاد ہے
اُن کے ساتھ اپنی تباہی کا زمانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو ترا وہ مسکرانا یاد ہے
اور پھندے میں سلیقے سے پھنسانا یاد ہے

جھوٹے وعدوں سے مجھے جھانسے میں لانا یاد ہے
گھر بُلا کر بھائی سے جوتے کھلانا یاد ہے

ہائے غصّہ میں ترا وہ بڑبڑانا یاد ہے
چھوٹی چھوٹی بات پر مُرغا بنانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں مچھلی پکڑنے کے لئے
وہ ترا تالاب میں چھڑیاں ہلانا یاد ہے

پیار میں دیوانہ ہو کر اُن کی چھت پر میں چڑھا
ڈنڈا لے کر اُن کے ابا کا بھگانا یاد ہے

باس کے اجلاس کا نقشہ ہی اُلٹا ہے سلیمؔ
خود تو کچھ کرتے نہیں ہم کو دبانا یاد ہے

سید عباس متقی (حیدرآباد)

خدا بچائے سڑکوں سے

ہم اس بات کو سمجھنے سے آج تک قاصر ہیں کہ گاڑیوں سے سڑکیں خراب ہوتی ہیں یا سڑکوں سے گاڑیاں۔ ہم اپنی گاڑی کے متعلق یقیناً سچ ہی کہیں گے خواہ جھوٹ بولنا ہماری عادت ہی کیوں نہ ہو کہ ہماری گاڑی محض سڑکوں کی خرابی سے خراب ہوتی رہی ہے اور خراب ہوتی رہے گی، خراب ہوتی رہے گی پر آپ نہ چونکئے گا کیونکہ ہمیں اس بات کی گویا اطلاع ہے کہ جس سڑک سے گزرتے ہوئے ہم کالج اور گھر کے درمیان چکر لگاتے ہیں اس کے مقدر میں بننا نہیں ہے البتہ تسلسل کے ساتھ بگڑتے رہنا ہے۔ جب بھی کوئی کونسلری کے لیے کھڑے ہونے کی کوشش کرتا تو ہم اس سے ایک ہی معاہدہ کرتے ہیں کہ آپ صرف اس دقیانوسی سڑک کو بنانے کا وعدہ کیجئے ہم آپ کو کامیاب بنائیں گے اور ہر کونسلر بڑے اطمینان سے وعدہ کرلیتا ہے جیسے اُسے نیا بنانا ہی نہ ہو اور ہم ووٹ دے کر ہمیشہ کی طرح ایک مدت کے لیے پھر مشغول ماتم ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی سڑک وہی گڑھے ہیں وہی گندگی ہے وہی تنگی ہے۔

سڑک اگر کشادہ، صاف ستھری اور ہموار ہو تو واقعی سڑک کہلانے کی مستحق بھی ہے۔ ایسی سڑکوں پر گاڑی چلانے اور بھگانے میں مزہ بھی آتا ہے بلکہ ٹھہرانے میں بھی کیوں کہ کشادہ سڑکوں پر گاڑی لب سڑک ٹھہرائی جائے تو پیچھے سے میوزیکل پروگرام شروع نہیں ہوتا۔ ہم اکثر اسی عمدہ ترین سڑکوں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں یہ ہماری پرانی عادت ہے اور رات دیر گئے ایک محض سڑک پیمائی کی تمنا پوری کرتے ہیں مگر اس کے لیے ہمیں خاص خاص لوگوں کی خاص خاص خوابگاہوں کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاش ہمارے محلہ میں بھی کوئی خاص آدمی آئے، کہ ہمارے محلہ کی سڑکیں بھی کشادہ ہوجائیں۔ گو ہماری سڑکوں پر تیز روشنیاں لگادی گئی ہیں، ان روشنیوں سے کوئی فائدہ ہوا نہ ہو یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ گڑھے صاف نظر آجاتے ہیں۔

ہمارے محلہ میں بڑا بازار ایک مشہور مقام ہے۔ یہیں جلسے ہوتے ہیں اور یہیں سے جلوس نکالے جاتے ہیں اور مقررین، صفائی ستھرائی، خدمت خلق جیسے عنوانات پر رات کے بھیگنے تک الفاظ خرافی کرتے ہیں لیکن وہاں سے جو سڑک ہمیں ہمارے گھر لے جاتی ہے بالکل ہماری شخصیت کی طرح مجروح، ہماری تمناؤں کی طرح ویران اور ہمارے خیالات کی طرح مجہول واقع ہوئی ہے۔ ہم اکثر راستہ اتر کر طے کرتے ہیں اور یہاں اس بات کو فی الحال مخفی ہی رکھا جاتا ہے کہ گاڑی ہمیں اتار دیتی ہے یا ہم خود گاڑی سے اتر جاتے ہیں، بارش کے دنوں میں تو دریا بہتا ہے۔ ورد ولفنٹ کے گمبیر

گڑھے ہیں جن سے تیز آزمائی جاری رہتی ہے۔ ہم رکشے والوں کی طرح ان گڑھوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، ہماری موپیڈ انہی گڑھوں کے طفیل پیرس کی سیکل ہو گئی ہے، کوئی پرزہ اپنے مقام پر نہیں ہے، ہر پک لگتا ہے نہ ہارن بجتا ہے اب سواری اور سڑک میں چنداں کوئی فرق نہیں رہا۔

ہم ہمیشہ سڑکوں پر یکسوئی سے چلنے کے متمنی رہے لیکن ذہن اور آنکھیں دونوں ہی بدام منتشر رہیں ذہن سواریوں کے شور سے اور آنکھیں نیم برہنہ مناظر سے، کیا کریں کان اور عقل دونوں کے مالک ہیں محسوسات اور تعیشات دونوں سے گریز ممکن نہیں۔ بعض وقت تو نظریں کچھ ایسے مقامات پر الجھ جاتی ہیں کہ آنے والے گڑھے کی جو عین وسط میں ہوتا ہے خبر نہیں رہتی۔ ایک دفعہ ہم کسی پوسٹر میں اُلجھے ہوئے تھے کہ سائیکل گڑھے سے دوچار ہوئی، ہم ایک دھچکے کے ساتھ اچھل کر سیٹ سے ہینڈل پر آگئے اور پاؤں پیڈل سے بد کا ڈپہ ہم لیڈر تو ہیں نہیں کہ ہر حال میں توازن برقرار رکھ سکیں، فوراً ہم سے سڑک بوسی کی سعادت نصیب ہوئی، چند لمحات تو سمجھ ہی نہ سکے کہ کیا ہوا ایسا لگ رہا تھا کہیں کی سیٹ ہل گئی ہے، یہ وقت تمام زچہ کی طرح اُٹھے اور نوزائیدہ کی طرح آنکھیں کھولیں، پتہ چلا کہ ہم معہ سیکل کے درست ہیں البتہ تو شہ اچھل کر نکل گیا ہے، پر مد چونکہ استفادہ کر رہے ہیں ہم نے خود کو ٹٹولا کچھ جھاڑا کچھ پھونکا تھا ایک مصرع ذہن میں کوند گیا۔

دانہ دانہ پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام

سڑکوں کی خرابی اور موریوں کی لاپرواہی دونوں ہی حادثات کا موجب ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی سڑکوں پر حادثے کم جھگڑے زیادہ ہوتے ہیں ہر شخص دوسرے کا تعارف کرواتا ہے اور وہ بھی نادر مالوجود گالیوں میں، ہم عقد ثانی کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے سڑکوں پر جھگڑتے نہیں اور یوں بھی احمقوں سے کون جھگڑے، ہماری بولی سمجھتے ہیں نہ گالی، ایک صاحب جو مختصر سی سڑک پر بڑی سی کار بڑی تیزی سے چلا رہے تھے جیسا کٹ مار کر ہمارے پہلو سے گزرنے لگے تو ہم سے پہلوتہی نہ ہو سکی، بڑی لجاجت سے کہا جناب کیا یہ کھلی شاہراہ ہے؟ نہ جانے انھوں نے ہمارے جملے کا مطلب کیا سمجھا جھٹ سے ایک ناشائستہ گالی جڑ دی، ہم حیران رہ گئے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کچھ مزید کہا اور ایکسی لیٹر دے دیا ورنہ مرزا غالب کے مصرع کو یوں پڑھنا پڑھتا۔

جن کو ہو اپنا سر عزیز اُن سے منہ لگائے کیوں

نہیں معلوم یہ اک رخی راستے ہمیں کہاں لے جائیں گے، ہم جانا کہیں چاہتے ہیں اور پہنچ کہیں جاتے ہیں جگہ کام کے ساتھ ساتھ راستوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے، راستے آج دو رخی ہوتے ہیں تو کل یک رخی۔ ایک دن ہم نے حسب معمول ایک جانب گاڑی موڑ دی، پولیس والے نے ڈنڈا دکھایا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے پہلے یہ راستہ اک رخی ہو گیا ہے۔ ہم نے راہ عدم کو یک رخی راستہ سمجھا تھا جہاں صرف جاتے ہیں، جہاں سے آتے نہیں لیکن اب گلی کوچوں کو بھی راہ عدم کہنا پڑ رہا ہے اور یوں بھی ایسی سڑکیں اسم بامسمٰی کہلائی جا سکتی ہیں۔ ایک مرتبہ چوری چوری ہم کسی تھیٹر میں پکچر دیکھنے جا رہے تھے ارادہ فرسٹ شو کا تھا لیکن بُرا ہو یہ اک رخی راستوں کا، سیدھی جانب تھیٹر تھی اور ہمیں بائیں جانب موڑ دیا گیا پھرتے پھراتے جب ہم تھیٹر پہنچے تو سکنڈ شو شروع ہو چکا تھا۔

ایک صاحب نے ہم سے اپنے موٹاپے کی شکایت کی اور کہا کہ کوئی نسخہ بتائیے۔ ہم نے مشورہ دیا کہ آپ ہو سکے ایسے میں سیکل چلائیں انھوں نے کہا سیکلنگ کو آزما چکا ہوں ہم نے جواب دیا کہ آپ سیکل چلانے کو آزماتے

ہی سیکل اُچھالنے کو نہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے گاڑی سنبھالی اور ہماری روڈ پر اچھل کود میں مصروف ہوگئے۔ ہفتہ عشرہ ہی میں اتر گئے اور شاید کچھ اور مشق جاری رکھتے تو زمین میں اتر گئے ہوتے نہ دُبلے ہوگئے تو کئی مولوں کو سیکل پر چڑھا دیا۔ ہمارے ایریئے میں نہ فیملی پلاننگ کی ضرورت ہے نہ بدہضمی کے علاج کی یہ سب اپنے آپ ہوتے ہیں۔

سڑکوں پر جو چیز اکثر ہمیں پریشان کرتی ہے وہ جانوروں کی بہتات ہے، بھینسوں کی بے ہنگم قطاریں گدھوں کا ہجوم، بیلوں کی ہٹ دھرمیاں، کتوں کی دادا گری، آپ خود سوچئے آدمی گاڑی چلائے گا یا خود چل جائیگا۔ ہارن بجائیے یا سر پیٹئے کوئی راستہ نہیں، گدھے راستہ کیوں دینے لگیں، بارہا ہم تھک ہار کر بدھو کی طرح گھر لوٹ آئے ہیں اور بیگم کی مخصوص صلواتوں سے مستفید ہوئے۔

فی زمانہ روڈ کراس کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ہم نے اس کاوشِ مسعود میں اپنی جوانی کا قیمتی حصہ گزارا ہے، کیا مجال جو روڈ کراس کر سکیں اکیلے روڈ کراس کرنا تو جیون کی سیما پار کرنا ہے اس شغل کو با جماعت انجام دینا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے مضمحل قویٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے تن تنہا روڈ کراس کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا لیکن بقول غالب

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

والی بات پیدا ہوگئی۔ جماعت کا انتظار کیا، لیکن کوئی روڈ کراس کرنے راضی نہیں شاید سب ہی کراس ہو چکے تھے مدت دراز بعد ایک فیشن ایبل عورت کا بغل میں آ کھڑا ہوا ہم نے شکرِ حق بجا لایا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے نصف روڈ پار کر لی۔ اب جو ہم نے موصوف کا جغرافیہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ موصوف کوئی موصوفہ ہیں۔ انہوں نے ان کی جنسِ حقیقی پر غور کرنے کی مہلت نہ دی تھی۔ اندیشہ ہائے دور دراز سے گزرنے لگے، ہم کانپ کانپ گئے۔ کبھی انجانے خوف سے ٹانگیں لرزنے لگیں ایک جھٹکے سے دور ہٹ گئے گویا بجلی کا شاک لگا ہو، ہم شریف آدمی ہیں سڑک پر تو منکوحہ کے بھی اتنے قریب نہیں ہوتے اور جو سڑک چھاپ فرہادوں کی پٹائی کا حال اخبار میں پڑھا تھا اس کی سُرخی نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں گھوم رہی تھی، ہم گدھوں کی دولتی کھانا تو پسند کرتے ہیں لیکن پولیس والوں کی مار کے تصور ہی سے ہمیں رقیق اجابتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، ہمیں ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو پولیس والوں کی مار کھا کر بھی زندگی کی تمنا رکھتے ہیں۔ اللہ بچائے پولیس والوں سے، تو خیر باقی آدھا راستہ ہم نے ٹھوکریں اور گالیاں دونوں کھاتے ہوئے طے کرلیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ موصوف کہ موصوفہ کیا مال تھے۔

مصیبت اس وقت کھڑی ہوتی ہے جب علم و اطلاع کے بغیر راستہ روک کر سڑک بنائی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سڑک بنائی جاتی ہے یا لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔ ایسے میں ٹریفک جام نہ ہو، ممکن نہیں، ہر شخص نکل جانے میں آگے رہتا ہے اور ہم سب سے آگے نتیجہ یہ کہ جلوس کی شکل میں کھسکتے اور سسکتے رہتے، عقل کا استعمال مفقود بلکہ عقل ہی۔ مشقت کی گرمی کی بہتات، ہجوم اور ہجوم کے ساتھ گوناگوں آوازوں کی دھوم اب ایسے میں

پار کرنا راہ کا لانا ہے جوئے شیر کا

والی بات پیدا ہوگئی ہو۔ پاؤں پھنسے ہوئے، ہاتھ اٹکے ہوئے، پیڈل ادھر ہینڈل اُدھر، آدمی گھر پہنچنے کی بجائے شفاخانہ پہنچ گئے۔

ہم مڈل کلاس آدمی ہیں، مڈل کلاس ہی کی طرح رہتے ہیں تاہم کبھی کبھی بننے سنورنے کی رگ پھڑک ہی جاتی ہے اور وہ اکلوتی شیروانی نکال ہی لیتے ہیں جسے شادی میں بنوائی تھی اور شادیوں ہی میں پہنتے ہیں، یہ ہماری بدبختی ہے یا ماحول کی بدنصیبی کہ ایسے خوش پوش موقعہ پر اگر گاڑی خراب ہو جائے جس کی بدولت کوئی احمق موٹر سوار ہماری بارعب شخصیت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہم پر کیچڑ اچھالتا ہوا گزر جائے گا، چلئے چھٹی ہوئی۔ تمنائے خوش پوشی سرکاری ملازمت کی طرح محض خواب ہو کر رہ گئی۔ سنوار تو دکھانے کے لائق ہی نہ تھے اب تو شیروانی بھی دکھانے کے لائق نہیں رہی۔ بڑبڑاتے، کوستے کاٹتے گھر کی راہ لیتے ہیں، ہمارے بڑبڑانے کی کسے پرواہ فقیر کا غصہ فقیر کی جھولی میں کے مصداق ہماری بڑبڑاہٹ محض ہمارے کانوں سے ٹکرا کر فضاؤں میں بکھر جاتی ہے۔ اسی بڑبڑاہٹ کے طفیل لوگوں نے ہمیں مجذوب تک سمجھا ہے بعض وقت تو خود ہمیں بھی شک گزرنے لگتا ہے۔

فی زمانہ سڑکیں پارٹی کی طرح بنائی جا رہی ہیں ورنہ کسی دور میں بعث کی طرح سینکی جاتی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بناؤ کل خراب، بلکہ دن میں بناؤ رات میں شکل تبدیل۔ سڑکوں کی حالت کے ساتھ ساتھ بنانے والوں کی حالت کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ یہ معاش کا فلسفہ ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض وقت تو سڑک بنیاد ڈال کر چھوڑ دیا جاتا ہے جیسے حجام کسی کی آدھی مونچھ مونڈھ کر کنوئیں میں بٹھا دے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ الٰہی سڑکوں کو پار کرنا پل صراط سے گزرنے سے کم نہیں۔ سوار مع سواری کے ڈسکو کرنے لگتا ہے۔ گویا آج سڑکوں کو مرض ڈسکو لاحق ہو گیا۔ آج بھی وہ سڑکیں رشک قدم ہیں جنھیں دورِ کہنہ کی یادگار کہا جاتا ہے۔ ریلوے انجن گزر جائے یا ریلیے رولڈ دبنے کا سوال ہی نہیں۔ آج یہ عالم ہے کہ موسم گرما میں سڑک پر قدم رکھا تو جا سکتا ہے لیکن اٹھایا نہیں جا سکتا۔ جوتے بچتے قدموں کے دھنس جاتے ہیں۔ ایک دوپہر ہمارے پاؤں روڈ پر دھنس گئے تھے لوگوں نے بہت جد و جہد کے بعد ہمیں تارکول کے دلدل سے آزاد کروایا مگر اس کوشش میں خود ان کے پاؤں دھنس گئے تھے بشکر ہے پاؤں تو ہاتھ آ گئے تھے لیکن جوتوں کو چھوڑنا پڑا تھا۔ کاش "اولڈ از گولڈ" کے تحت سڑکیں بھی سمنٹ سے تیار کی جائیں یہ کالی کالی سڑکیں ارباب بلدیہ کے کالے کرتوت کی طرح ہیں۔

ہم اکثر شامیں ان سڑکوں پر گزارتے ہیں جو ہر گزرنے والے کے گزرے نہیں ہوتے اور وہ سڑکیں مشہور شاہراہوں سے متصل ہوتی ہیں۔ کھنکتے قہقہے اور گداز خوشبو کی لپٹیں ہمیں انہی سڑکوں پر گھومنے مجبور کرتی ہیں۔ سجی ہوئی تیلیاں اور سنبھلتی ہوئی گڑیائیں ہماری توجہ کا مرکز رہتی ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ آخر ہمارا بچپن کب رخصت ہوگا خوب رو گرڈیلا سے دلچسپی کب ختم ہوگی۔ خوب صورت کاروں کا لامتناہی سلسلہ بھی ہمیں خواب دیکھنے پر مجبور کرتا ہے جی چاہتا ہے کہ انہی سڑکوں سے ٹیک لگائے عمر گزار دیں۔ ہر ان سڑکوں کے حسن اور ان سڑکوں پر چلنے والوں کی چہل پہل دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں۔ راستہ کو منزل تصور کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑا رک بھی جاتے ہیں کہ آنکھیں مکرر فیض یاب ہوں دل صحیح معنوں میں دھڑکنا سیکھ لے ــــ لیکن چند ہی لمحوں میں یاد آتا ہے کہ یہ جواں راہ اپنے گھر اپنے محلہ اور اپنے ایریے کی طرف گامزن ہے۔ آگے چل کر یہ بوڑھی ہو جائے گی اور اس کے بڑھاپے کی تصویر ہماری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ دل مغموم ہو جاتا ہے ـــ کاش سڑکیں بھی جمہوریت کی علمبردار ہوتیں۔ وہی کشادہ راستہ وہی تا حد نظر سڑک وہی گڑھے، وہی کچرے کے انبار اور بدبو کی لپٹیں اور پھر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایریل کی سڑکوں اور غریبوں کی سڑکوں میں کچھ فرق ضرور ہے۔ اگر ہم اپنا انشائیہ جسے دکھڑا بھی کہا جا سکتا ہے نظم کرتے تو یقیناً اقبال کے اس مصرع پر ہماری نظم ختم ہوتی۔

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے

مفلس تابدنی (اکولہ)

نام کمانے کے چند مجرّب نسخے

الٹے سیدھے مصرعے گھڑ لو، شعر بناؤ، نام کماؤ
بھاشن دو، لوگوں کو آپس میں لڑواؤ، نام کماؤ
جھوٹوں کی آواز دلوں میں آواز ملاؤ، نام کماؤ
ریل گراؤ، پل توڑو، گھر بار جلاؤ، نام کماؤ
گلیوں گلیوں التالوئیاں کا خون بہاؤ، نام کماؤ
اخباروں میں جوڑے کے فوٹو چھپواؤ، نام کماؤ
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھو گے تو تم کو پوچھے گا کون
سیدھی سچی باتوں پر کوئی بھی دھیان نہیں دے گا
دولت آئے گی تو عزت بھی آئے گی شہرت بھی
کوئی نئی سی بات، اچھوتا کام، انوکھی سوچ کوئی
جب جب بھی اپنا حق کوئی مانگنے آئے تو اس کو
ڈاکہ، دہشت گردی، اسمگلنگ اگر بس میں نہ ہو
صوبہ، مذہب اور زباں کا پل پل واویلا کر کے
یہ دھرتی اُپجاؤ بہت ہے یہ دھرتی زرخیز بہت ہے
چھوٹے گھر میں رہنے والا خود بھی چھوٹا کہلاتا ہے
چکنے چپڑے خط لکھ کر اخبارات اور رسائل کو
ورنہ جہاں ہو آج وہیں پر پڑے پڑے سڑ جاؤ گے

لہک لہک کر غزلیں اور کویتائیں گاؤ، نام کماؤ
بھولی بھالی جنتا کے نیتا بن جاؤ، نام کماؤ
سچوں کی ہر سچائی کی ہنسی اڑاؤ، نام کماؤ
رستے روکو، ہڑتالیں گھیراؤ کراؤ، نام کماؤ
سڑکوں سڑکوں لاشوں کے انبار لگاؤ، نام کماؤ
ستر سال میں سترہ سال کی دلہن لاؤ، نام کماؤ
سڑکوں پر ناچو، کودو، چیخو چلاؤ، نام کماؤ
بات بات پر جھوٹی سچی قسمیں کھاؤ، نام کماؤ
اپنی دھرتی چھوڑ کے کچھ دن باہر جاؤ، نام کماؤ
انہونی کو تم بھی ہونی کر دکھلاؤ، نام کماؤ
وعدوں کے رنگین کھلونوں سے بہلاؤ، نام کماؤ
کالا بازاری سے ہر سو لوٹ مچاؤ، نام کماؤ
بستی بستی اک نفرت کی آگ لگاؤ، نام کماؤ
اس دھرتی پہ ظلم و ستم کی فصل اگاؤ، نام کماؤ
رشوت لے کر اچھی اچھی بلڈنگ بناؤ، نام کماؤ
غزلیں نظمیں چھپواؤ، شاعر کہلاؤ، نام کماؤ
رشوت دو اور جو بھی عہدہ چاہو پاؤ، نام کماؤ

فانی عالمی آگ حسد کی بھڑکانے سے کیا حاصل ہے
تم بھی مفلس جیسا کچھ کر کے دکھلاؤ، نام کماؤ

ضیاء الحق قاسمی (پاکستان)

جگایا رات بھر اک چھپکلی نے

ڈرایا آخرت سے اِک ولی نے
تسلی دی مجھے پھر فلسفی نے

ابھی تو خلد سے نکلا ہے آدم
ابھی دیکھا ہی کیا ہے آدمی نے

وہ کافر ہے نہیں دیتا جو چندہ
دیا فتوے بڑے اِک مولوی نے

پسینے چھٹ گئے میرے وہیں پر
جو مانگے دس روپے مجھ سے قلی نے

میری آنکھیں تو چھت پر ہی لگی تھیں
جگایا رات بھر اک چھپکلی نے

تقاضا عمر کا یہ تو نہیں تھا
پٹایا ہے مجھے اس چلبلی نے

میں ہوتا کاش کس علم میں لازم
دئے فاقے مجھے اس شاعری نے

عجب ہے حیا اور یہ جمیل اپنا
کیا برباد جلسہ کھلبلی نے

سمندر سے نکلتا بھی تو کیونکر
مجھے پکڑے رکھا اس جل پری نے

یہ چلتے چلتے اکدم رک گئی تھی
بڑا دھوکا دیا میری گھڑی نے

محمد ظہیر الدین ساحر (مرزا)

غزل

○

سبق شادی کا جس کو یاد ہوگا
وہی سسرال میں برباد ہوگا

چھپا لو وگ سے اپنے عیب کو تم
کہ گنجہ سر حسین آباد ہوگا

بہت محفوظ ہوں گے تھانے میں ہم
کہ پہرہ پر کھڑا جلاد ہوگا

سنا ہے لیڈری اب کرنے والا
ہر اک قانون سے آزاد ہوگا

ہے ساحر شاعری میں آج کچا
کل استادوں کا وہ استاد ہوگا

○

قطعات

جی۔ ایم۔ لطیفی
(بھوپال)

میں بھی آ جاؤں وزارت میں اگر
کون سی اِس میں بڑائی ہوگی
کوٹہ فارین کا ہوگا ہر سال
لڑکیوں کی بھی سگائی ہوگی

○

اردو کا رقیق چہرہ بہت تاریک ہے
چھوکرے سے کہہ رہی تھی چھوکری
اس زبان کے پڑھنے میں کیا ہی رکھے
پڑھ کے بھی عزت ملے نہ نوکری

شاہنواز اختر (دہلی)

مسٹر تندوری

تندوری صاحب ہمارے اُن چند گنے چنے دوستوں میں سے ہیں جنھیں ہم بڑے مرغوب ہیں۔ پتہ نہیں کیا ملتا کہاں کھویا تھا جنھوں نے یہ بلا ہمارے سر منڈھ دی۔ ہم دانت کے درد کے دائمی مریض ہیں ورنہ اُس مردود کو ڈھونڈ کر اُسے بتیسی سے بے نیاز کر دیتے خواہ پولیس کیس ہو جاتا۔

شروع شروع کی دو چار ملاقاتوں میں یہ موصوف ہمارے گرویدہ ہو گئے۔ بوجہ اخلاق و مروت ہم نے اُن کی پُر تکلف ضیافتیں کیں تھیں۔ مطلب یہ کہ تندوری صاحب نے کوئی تکلف نہ کیا تھا۔ اُن ضیافتوں سے خوش ہو کر وہ ہمیں مجرا سنانے لے گئے۔ طوائف کے ہر شعر پہ 'تان' ہر ہر ادا پر اُنھوں نے نوٹوں کی بارش کر دی نتیجتاً ہم صرف طوائف کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

ایک روز یوں ہوا کہ شامتِ اعمال ہمیں کھینچ کر نہاری ڈیری فارم لے گئی جہاں تندوری صاحب ایک میز پر بیٹھے دکھائی دیئے۔ ہم نے چھپنے کی کوشش ضرور کی مگر انھوں نے ہمیں تاڑ لیا۔ بہ زورِ بازو بیٹھنے پر مجبور کیا۔ حال احوال کو نظر انداز کیا اور پھر کہنے لگے کہ لسّی پیئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ چار و ناچار ہم نے دو گلاس لسّی کا آرڈر دیا اور کھنچائی کرنے کی نیت سے پوچھا۔

"یہ بتایئے آپ تندوری کیوں کہلاتے ہیں؟"

"چھوڑو بھی وہ جو تیلیے صاحب نے کہا ہے نا۔ سچ ہی کہا ہے" بے زاری سے بولے "کیا کہا ہے؟" ہم نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا "یاد نہیں آ رہا ہے" بیچارگی کے انداز میں بولے۔

"تو یاد کیجئے کیا کہا تھا تیلیے صاحب نے۔ اور یہ حضرت ہیں کون؟" ہم نے سوال کیا۔

"کمال ہے تیلیے صاحب کو نہیں جانتے جبکہ ہر بڑے چھوٹے ان کے بارے میں جانتا ہے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ صبح کے اخبار کی شامت پڑھنی۔" انھوں نے آنا ہمیں کھا سو قرار دیا "ٹھیک ہے پہلے فرض کر لیا آپ جاہل بھی عالم ہیں فاضل ہیں دانش ور ہیں ہم نے بد قسمتی سے یہ نام پہلی مرتبہ سُنا ہے اگر آپ ان کے متعلق کچھ بتائیں تو قسم پاک پروردگار کی میری آئندہ نسلیں آپ کے مزار پر مجاوری کریں گی۔"

"تو سنو غور سے" وہ اپنی گردن اکڑا کر کہنے لگے "تیلیے صاحب ایک انگریز تھے اور انھوں نے انسان کے

اور اس کے۔۔۔ متعلق بہت کچھ کہا ہے"
"کس کے متعلق؟"
"اوہ! کیا کہتے ہیں اُسے" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے "جو آج تک ہمارے پلّے نہ پڑسکی"
اُسی وقت لسّی آگئی ایک سانس میں ڈکار گئے" سانس درست کی اور یوں گویا ہوئے۔ "تلیلے صاحب نے انسان کے متعلق بہت کچھ کہا ہے" نفس تو ولیوں کا فیورٹ سبجیکٹ (SUBJECT) تھا مغرب میں کب چلا گیا اور پھر یہ تلیلے صاحب کچھ عجیب سا نام ہے انگریزوں میں ایسے نام تو نہیں رکھے جاتے" ہم نے کہا۔
"تم سے خدا بچائے" چڑ کر بولے "میں نے یہ کب کہا کہ تلیلے صاحب اُن کا اصلی نام ہے"
"تو کیا تخلّص ہے؟"
"نہیں" انھوں نے نفی میں گردن ہلائی۔
"فرضی نام ہے یا کوئی خطاب؟ ہم نے پھر سوال کیا۔
"اِن میں سے کچھ بھی نہیں"
"پھر"؟ ہم نے حیرت سے پوچھا۔
"ترجمہ ہے" وہ شانِ بے نیازی سے بولے۔
"ترجمہ"
"جی ہاں ترجمہ ہے اُردو میں"
"تو پھر اصلی نام کیا ہے؟"
"تم بھی وہی کرو جو ہم نے کیا ہے" اُنھوں نے مشورہ دیا۔
"یعنی" ہم تھوک نگلتے ہوئے بولے کیوں کہ اُنھوں نے چار شادیاں کی تھیں اور ڈیڑھ درجن بچے پیدا کیے تھے۔
"عجیب بے وقوف ہو" جھلّا کر بولے "میرا مطلب ہے ترجمہ کرو"
"ترجمہ مگر کس کا"؟
"تلیلے صاحب کا اور کس کا" اُنھوں نے آنکھیں نکالیں۔
"آپ خود کیوں نہیں کرتے"؟
"میرا ذریعہ تعلیم اردو رہا ہے۔ اس لیے اردو میں ترجمہ کر دیا اب انگریزی میں سمجھانا، تمہاری ذمّے داری ہے کالونیٹ زادے!"
"آخر آپ کا مطلب کیا ہے" ہم نے جھلّا کر پوچھا۔
"مطلب یہ کہ ترجمہ کرو۔ یہ لو قلم اب اس اخبار پر لکھو صاحب کو کیا کہتے ہیں انگریزی میں؟"
"مسٹر یا سر" ہم لکھ کر بڑبڑائے۔
"ٹھیک ہے اب تلیلے کو کیا لکھو گے یعنی تلے ہوئے انڈوں کو؟"
"فرائڈ ایگز (FRIED EGGS)" ہم پھر لکھ کر بڑبڑائے۔
ٹھیک ہے اب انڈے ہمارے حوالے کرو۔ باقی کیا بچا؟"

"فرائڈ" ہم نے کہا۔

"بس یہی نام ہے حضرت کا" اُنھوں نے ہماری ڈبیہ سے سگریٹ اُچکتے ہوئے کہا۔ ہم بھونچکے رہ گئے اُنھوں نے سگریٹ سُلگائی کش اول کھینچا دھوئیں سے فضا کو زہر آلود کیا اور بولے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کس بے دردی سے آپ نے ایک عظیم دانشور کی مٹی پلید کی ہے"

"اُنھوں نے کیا کہا تھا ہمارے ساتھ معلوم ہے نہیں" وہ کش مکرر کھینچ کر بولے۔

"کس نے فرائڈ صاحب نے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں انگریزوں نے" وہ بولے (واضح ہو کہ تمام یو پی باشندوں کو وہ انگریز ہی کہتے ہیں)

"انھوں نے بس کچھ صدیوں تک حکومت کی ہے۔ کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں مگر یہ تو ہر فاتح قوم کرتی ہے"

"صرف حکومت ہی نہیں کی ہمارے علمی سرمائے کو بھی نیشنلائز ڈ کیا ہے"

"مثلاً" ہم پھر سراپا اشتیاق بن گئے۔

"ہمارے عالم و فاضل اشخاص کو بھی تو ہیا لیا تھا"

"کیسے"

"تھے ایک حضرت۔ اسم گرامی تھا ان کا دلی میاں شیخ پیر۔ انگریزوں نے اُنھیں تہذیبی دورے کے بہانے مدعو کیا۔ لندن پہنچ کر ابھی اُنھوں نے اپنی سانسیں بھی درست نہ کی تھیں کہ قید کر لیے گئے اور اُن کا نیا نام رکھا گیا ولیم شیکسپیئر سمجھے"

"سمجھ گیا" ہم نے گردن ہلا کر کہا اور تندوری صاحب مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

"اچھا وہ بتا دیجئے جو آپ فرما رہے تھے کہ فرائڈ صاحب نے کہا تھا"

"میاں اُس لسی سے جو انرجی حاصل ہوئی تھی وہ سود کیساتھ تمھیں لوٹا چکا ہوں اب مزید سیکھنا چاہتے ہو تو میری فیس حسب دستور وہی ہوگی۔"

"یعنی" ہم نے دھڑکتے دل اور لرزتی زبان سے پوچھا۔

"یعنی فی مسئلہ فی گلاس لسی اور اگر مسئلہ ٹیڑھا ہوا جیسا کہ تمہارا ہے تو لسی وہ ہونی چاہیئے جس میں بادام پستہ ڈالا گیا ہو" وہ اپنے داؤں آزمانے لگے۔

ہم نے خاموشی سے ویٹر کو بلا کر مزید دو گلاس لسی کا آرڈر دیا پھر پوچھا۔

"اچھا اب تو بتا دیجئے کیا کہا تھا اُنھوں نے ؟"

"ٹھیک ہے بشگوفہ عزل سے۔ تیلئے صاحب نے کہا تھا نام ہی کیا رکھا ہے؟"

"سب کچھ نام میں ہی تو رکھا ہے" ہم نے جل کر کہا۔

اسی وقت لسی آگئی وہ جواب دینے کے بجائے اپنے حلق میں لسی اُنڈیلنے لگے۔

ہم نے بھی اپنا گلاس اُٹھالیا۔ لسی ختم کرنے کے بعد اُنھوں نے ہم سے پوچھا:

"تمہاری نظر میں ہمارے تندوری کہلانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے" ؟

"آپ کی بسیار خوری" ہم نے چوٹ کی۔

"بالکل غلط" وہ سر کو نفی میں ہلا کر کہنے لگے "یہ نام اس لیے پڑا کر . . . . خیر تم یہ بتاؤ کہ تندرستی کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"یہی کہ درست ہو تن یعنی جسم سالم اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔"

"بالکل اسی طرح روزِ پیدائش سے لے کر گیارہ سال کی عمر تک ہم دھان پان سے تھے۔ بدن پر سوائے سوکھی ہڈیوں اور ان پر منڈھی کھال کے اور کچھ نہ تھا۔ لہٰذا تن دوری کے نام سے مشہور ہوئے اور یہ جو فربہ جسم، پُرشکوہ توند اور فیل بدن تم دیکھ رہے ہو دوستوں کی دعا سے یہ ہمارے اپنے زورِ بازو کا کمال ہے بچے!

"یعنی کہ بڑے بڑے لڑاکے آپ مدمقابل کو موقع دیئے بغیر پچھاڑتے رہے۔" ہم نے اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر کہہ ہی دیا اور تیزی سے پلّو چھڑا کر باہر نکل آئے ــــ ! □□

اِدارہ شگوفہ کے توسط سے

حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں :-

الف تماشا	نریندر لوتھر	مضامین	۱۶	روپے
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵	"
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۱۲	"
جاپان چلو	"	سفرنامہ	۱۴	"
بالآخر	"	مضامین	۱۴	"
تکلف برطرف	"	"	۱۴	"
قطع کلام	"	"	۱۲	"
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰	"
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸	"
سُنی سنائی	لیئق صلاح	"	۱۰	"
مزاح لطیف	رشید قریشی	"	۲۰	"
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲	"
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵	"
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲	"
مطلع عرض ہے	دلاور فگار	مجموعہ کلام	۱۲	"
ماشاء اللہ	حلیمہ فردوس	مضامین	۱۵	"
کاغذی ہے پیرہن	رشید موسوی	"	۲۰	"

محمد بدیع الزماں (پٹنہ)

مولانا محمد علیؒ کے چبھتے نشتر

مولانا محمد علی المتخلص بہ جوہر ایک عظیم سیاسی رہنما و مفکر، بلندپایہ اخبار نویس، شعلہ مقال خطیب، انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر قادرالکلام بہترین انشاپرداز اور ایک صاحبِ طرز شاعر تھے۔ اُن کی ذات جامع صفات تھی۔ ان سب فضائل کے ساتھ خوش طبعی، بذلہ سنجی، برجستگی، حاضر جوابی اور شوخی اُن کے مزاج اور اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کی چٹکیاں اور گدگدیاں اپنے وقت کے سیاسی رہنماؤں، ادیبوں، دوستوں اور دشمنوں میں موضوعِ گفتگو رہا کرتی تھیں۔ اُن کی بے ریا ظرافت "ظریف" اور "مظروف" دونوں کو یکساں طور پر مسرور کرتی تھی اور دونوں کے کیف و انبساط اور برکت و سعادت کا باعث بنتی تھی۔

ذیل میں مولانا کے ترکش سے نکلے طنز کے چند تیر اور اُن کے نشتروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے نشانوں اور گھاؤ سے نہ مولانا کا کوئی حریف و حلیف بچ سکا اور نہ مخالف و مداح۔

• مولانا محمد علی ایک بار خالص عربی لباس (عبا اور عقال کے ساتھ) مرکزی اسمبلی میں بحیثیت صحافی تشریف لے گئے۔ اتفاقاً پنڈت مدن موہن مالویہ سے ملاقات ہوگئی تو انھوں نے دیکھتے ہی کہا: "اخاہ! آپ ہیں! میں تو سمجھا بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لا رہی ہیں"۔ مولانا نے فوراً جواب دیا: "بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیر دل خاتون ہیں کہ اس زنانی مجلس (مرکزی اسمبلی) میں آنا پسند نہیں کرتیں!"

مولانا کچھ آگے بڑھے تو مرکزی اسمبلی کے اسپیکر مسٹر وٹھل بھائی پٹیل سے ملاقات ہوگئی۔ اُنھوں نے مولانا کو اپنے کمرے میں لے جا کر ایک انگریز سے تعارف کرایا۔ مولانا کے اس وضع قطع پر وہ بھی کچھ متعجب ہوا اور بولا: "مولانا، آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں!" مولانا کی بذلہ سنجی بھلا چُپ کب بیٹھ سکتی تھی۔ فوراً جواب دیا: "اس حُسنِ ظن کا شکریہ، لیکن جب بارہ برس تک میں بالکل انگریزی لباس استعمال کرتا رہا تو آپ میں سے کسی نے نہیں کہا: "تم تو پورے انگریز معلوم ہوتے ہو" بلکہ "کالا آدمی" ہی آپ کی زبان پر رہا"۔

بے چارہ انگریز اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۸ء) کے خاتمہ پر "جمعیت اقوام" (لیگ آف نیشنز) کا قیام عمل میں آیا جس کی جانشینی دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵ء) کے بعد "اقوامِ متحدہ" (یونائیٹڈ نیشنز) کو دی گئی ہے۔ جمعیت اقوام

مغربی سامراجیوں کے ہاتھ کا ہتھکنڈا تھی جسے اقبال نے "داشتۂ پیرکِ افرنگ" کا لقب دے رکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے یورپی سامراجیوں نے مشرقِ وسطیٰ، ایشیا اور آفریقہ کے ملکوں کو، جنگ ختم ہونے پر آپس میں تقسیم کر لینے کا خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا۔ اس لئے جب "جمعیتِ اقوام" کا قیام میں آیا تو ان سامراجیوں نے اس تقسیم کی توثیق اس ادارہ سے کرانی شروع کی۔ مولانا کی حریت پسندی بھلا اس شب خون کی کیوں کر متحمل ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اپنے اخبار "ہمدرد" کے ۱۹؍اکتوبر ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں ایک مضمون میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"موجودہ نام نہاد "لیگ آف نیشنز" کو میں "THIEVES' SUPPER" یا "چوروں کی دعوت" بھی کہتا ہوں، جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ چوروں میں سر پھٹول ہوئے بغیر مالِ مسروقہ تقسیم ہوجائے۔"

مولانا علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور اس سے ان کو انتہائی شیفتگی اور عقیدت مندی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا علی گڑھ میں ایک دوست کے یہاں مقیم تھے۔ مولانا جہاں بھی ہوتے اُن کے سیاسی حریفوں اور حلیفوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ مولانا کو شریفوں سے بہت شغف تھا۔ صاحبِ خانہ نے مولانا کو شریفے پیش کئے تو مولانا اُن کو کھاتے جاتے تھے اور اُن کی بیج زمین پر پھینکتے جاتے تھے۔ مخالف پارٹی کے ایک صاحب نے اُن کے اس فعل پر اُنھیں مطعون کیا تو مولانا نے فرمایا:

"اس لیے پھینک رہا ہوں کہ شاید اُگ آئیں۔ علی گڑھ میں شریفوں کی بہت کمی ہے۔"

مولانا ایک بار مصر سے گزرے تو قاہرہ میں کچھ دیر شہر کی سیر کی۔ اُنھوں نے عورتوں کا پردہ کس طرح کا رائج دیکھا اُن سے سُنئے اور ان کی شگفتہ مزاجی اور تیکھے طنز کی داد دیجیے:

"جو عورتیں اب تک برقع پوش ہیں، اُن کی نقاب بھی اتنی باریک ہے کہ سارا چہرہ نظر آتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حُسن کو دوبالا کر دیتا ہے، جالی کے پھندے، عشاق کو گرفتار کرنے میں اچھی طرح کام دے سکتے ہیں۔"

("ہمدرد" ۲۹؍جنوری ۱۹۲۸ء)۔

مولانا کی چلبلی اور شوخ طبیعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مذاق میں الفاظ و اسماء کے ناموں کو بدل کر لطف پیدا کر دیتے تھے۔ چنانچہ اُن کے رکھے ہوئے چند ناموں کا لطف لیجئے:

بمبئی کا چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن	:	بابِ کلیسا
میرین لائن	:	صفوفِ بحریہ
گرانٹ روڈ	:	شارعِ عطیہ
جیکب سرکل	:	دائرۂ یعقوبی
سرکاری محکمۂ معلوماتِ عامہ	:	محکمۂ مجہولاتِ عامہ
مرکزی اسمبلی (موجودہ پارلیمنٹ ہاؤس) کی عمارت کا ایوانِ مدوّر	:	دائرۃ الشّوم
ایک دوست چندو لال ہنس	:	مبسط (چندو: مہ، ہنس: بط)

ایک بار مولانا لندن میں تھے کہ جسٹس سرسید امیر علی کا وہیں انتقال ہوگیا۔ مولانا اُن کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ قبرستان میں اُنھوں نے مسلمانوں کے قبروں کے کتبے بھی پڑھے۔ ایک قبر سرآغا خاں کے بھائی کی بھی دیکھی جس کے کتبے پر مولانا کا تبصرہ سُنئے:-

"ایک قبر آغا خاں کے چچا زاد بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے۔ اس پر آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے :

"برادرم عزیز

زرفتن تو از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم"

"آغا خاں کو کون "غریب" کہے گا؟ لیکن اُن کی "غریب الوطنی" اب ایک ضرب المثل ہے!

نغمہ و موسیقی سے مولانا محمد علی کو بہت شوق تھا لیکن قوم کی نوحہ خوانی نے انھیں اس سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہندوستانی گانا سُننے کو اب دل تڑپتا ہے۔ گوہر جان کی طرف سے شوکت صاحب دعوت لائے تھے، کبھی تو کچھ سُن لیا کیجئے، میں قسم کھاتی ہوں، سوائے اقبال کے اشعار اور حسرت کی غزلوں کے کچھ نہ سُناؤں گی"۔

"میں نے کہلا بھیجا، اب معذور ہوں، البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں، تو پیارے صاحب (پیارو قوال) کا گانا ضرور سُن لیتا ہوں۔ (اس طرح) "جنتِ نگاہ" نہ سہی، "فردوسِ گوش" ضرور حاصل ہو جایا کرتی ہے"۔

آخری جملے کی تراکیب غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہیں ؎

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ : یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

ایک بار مولانا اپنے اخبار "ہمدرد" کے رپورٹر کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی کی پریس گیلری میں بیٹھے تھے۔ نیچے سے پنڈت موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی کے ایک رُکن نے جو مولانا کے دوستوں میں تھے اُن سے کہا :

"جب یہاں تک چلے آئے ہو تو دو قدم اور سہی، آؤ، ہماری جماعت میں باقاعدہ شریک ہو جاؤ"۔

مولانا محمد علی نے، جو مہاتما گاندھی کے ترکِ موالات کی پالیسی کے حامی تھے، برجستہ جواب دیا :

"میں آپ کی جماعت میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں۔ میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں"۔

مولانا کے نزدیک مذہب ہر فکر پر مقدم تھا۔ ایک بار دورانِ قیامِ لندن اُن کی ملاقات کرنل ویج وُوڈ (جو بعد میں برطانوی کابینہ میں وزیر ہندبھی رہے) سے ہوئی۔ دورانِ گفتگو کرنل ویج وُوڈ نے فرمایا : "بھائی تمہارا جو جی چاہے کرو، مگر اپنے مذہب کو ہماری پارلیامنٹ میں نہ لاؤ"۔ مولانا نے جواب دیا :

"میرا مذہب پارلیامنٹ تو پارلیامنٹ آپ کے چکلوں اور شراب خانوں تک میں جائے گا اور وہاں کی گندگی کو دُور کرے گا"۔ ("ہمدرد" ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

چند کتابیں لکھ کر یا مطالعہ کر کے بہت سے یورپین "مستشرقین" کہلانے لگتے ہیں حالانکہ اُن کا مطالعہ بہت محدود اور سطحی ہوتا ہے۔ "مستشرقین" پر مولانا نے "مستغربین" کی ایک نئی اصطلاح نکالی اور "ہمدرد" کے ۹ر فروری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں دو لائن مضمون فرمایا :

"اگر کوئی یورپین کسی مشرقی ملک میں ایک دو سال رہ کر اُس کے چند مصنفین کی تصنیفات کا مطالعہ کر کے "مستشرق" کہلا سکتا ہے، تو یقیناً میں "مستغرب" کہلانے کا مستحق ہوں کیونکہ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مشہور انگریزی ناول نگاروں کی بہت [illegible] پڑھی تھیں"۔

آزادی سے قبل دہلی اور پنجاب سے شائع ہونے والے زیادہ تر رسالوں اور اخباروں میں جنسی اور خفیہ امراض کی دواؤں کے گندے اشتہارات عام طور سے اس سُرخی کے ساتھ شائع ہوتے تھے: "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا،" مولانا نے اس غیر ذمہ دارانہ صحافت پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا: ـ

"لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں، جن کا اصول صحافت یہ ہے کہ "ایک پیسہ لوں گا، ایک گالی دوں گا"۔ یا جن کی آمدنی کا ذریعہ اُن کے گندے اشتہارات ہیں، جن کے پڑھنے ہی سے نہیں، بلکہ چھاپنے سے بھی بہتوں کا بھلا ہوتا رہتا ہے"۔

۱۹۲۶ء میں پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک نئی "انجمن نیشنل یونین" قائم کی تھی جس کی رکنیت کی شرط یہ تھی کہ وہ کسی فرقہ وارانہ جماعت کا ممبر نہ ہو۔ اس شرط میں اشارہ ہندو مہا سبھا اور خلافت کمیٹی کی طرف تھا۔ مولانا تو خلافت کمیٹی کے سربراہ اور وہ رہنما ہی تھے وہ اتنی بڑی مداہنت پر آمادہ کیسے ہو جاتے۔ چنانچہ "ہمدرد" میں ایک مضمون ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں شائع کیا جس میں دورانِ تحریر فرمایا: ـ

"اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے، اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازہ پر کندہ ہے:

"جو شخص اس میں داخل ہو، اُمید کو باہر چھوڑ آئے"۔

"پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی، جس کے دروازہ پر کندہ ہو کہ: "جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت اور مذہب کو باہر چھوڑ آئے"۔

جنوبی آفریقہ میں سفید اور سیاہ فام لوگوں کے نسلی امتیاز کو قائم رکھنے کے لیے جب وہاں کی حکومت نے "ایشیاٹک بل" کا نفاذ کیا تو اس پر دہلی میں احتجاج کے طور پر ایک جلسہ عام ہوا جس میں سوامی شردھانند آنجہانی کے صاحبزادہ پروفیسر اندر نے دورانِ تقریر انسانیت کے نام پر انگریزوں سے اپیل کی کہ جنوبی آفریقہ میں ہندوستانیوں سے خلافِ انسانیت سلوک نہ رکھا جائے۔ جب اس کے بعد مولانا محمد علی کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا:

"لیکن صاحبو! وہ (انگریز) کب کہتے ہیں کہ ہم میں انسانیت ہے؟ بہت زور دیا تو یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم اولادِ آدم ہی نہیں، ہم تو بقول ڈارون بندر کی اولاد ہیں، اُس وقت میرے بھائی اندر صاحب کیا اُن کی "بوزینت" سے اپیل کریں گے"۔ ("ہمدرد" ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

مولانا نے اپنی جامع شخصیت کا لوہا اپنے حریفوں سے بھی منوایا۔ اُن کے انتقال پر ایچ۔ جی۔ ویلز نے کہا:

"محمد علی کا دل نیپولین کا دل تھا، اُس کی زبان برک کی زبان تھی اور اُس کا قلم میکالے کا قلم تھا"۔

مولانا کا انتقال ۱۹۳۱ء میں لندن میں ہوا جہاں وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ مولانا کی زندگی جتنی طرحدار تھی اُتنی ہی اُن کی موت شاندار تھی۔ اُن کی نعش لندن سے بیت المقدس لائی گئی جہاں انھیں دفن کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاکھوں کا مجمع سمندر کی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسی سعادت کتنوں کو نصیب ہوتی ہے!!

غزلیں

نسیم سحر

اپنے قدموں کی اُسے دھول بنائے رکھا
مرد نے زن کو بہت فُول بنائے رکھا

کتنے انگریز بنے پھرتے تھے ہم بھی لیکن
عشق نے عاشقِ مجہول بنائے رکھا

ہم گرامر کے قوانین سے واقف ہی نہ تھے
ہم نے فاعل کو بھی مفعول بنائے رکھا

اپنا حُلیہ تو المناک ہی رہتا لیکن
لنڈے کے سوٹ نے معقول بنائے رکھا

یوں تو بدنام بہت شہر میں تھے ہم لیکن
چند غزلوں نے ہمیں مقبول بنائے رکھا

○

ظہیرالدین ظہیر (نیم گانوی)

لگی تو چوٹ ہمارے ہوئے ہیں ہم گھائل
تمہارے چہرے کا کیوں رنگ ہوگیا زائل

میں حادثہ کی کراؤں کسی سے کیا تادیل
لڑی تو آنکھ مگر ہوگیا ہے دل گھائل

تمہارا نیچرؔ اسپیڈ جب سے دیکھ لیا
قسم خُدا کی قیامت کا ہوگیا قائل

اسی میں اِنٹریؔ ہوگا ہمارا بھی فیچرؔ
تم اپنے چاہنے والوں کی دیکھ لو فائل

نگاہ و عارض و لب ہوگئے ہیں زنگ آلود
بدل دو چہرے کی اپنے گھڑی کا اب ڈائل

دیالِ عشق کی گٹھری اسی کو دے دینا
تمہارے در سے اگر کوئی آ کے سائل

عجب نہیں کہ دلِ اوکلڈ ینگ شؔ ہوجائے
لگا کے دیکھیں گے ہم بھی تمہارا ہیئر آئل

کسی نے گھاس نہ ڈالی ظہیرؔ کو اب تک
خُدا کا شکر اگر ہوگئے ہو تم مائل

○

شاہد عدیلی (حیدرآباد)

روز کھانے میں دال ہے باشاہ
شاعری کا کمال ہے باشاہ

پاس جس کے بھی مال ہے باشاہ
وہ پریشان حال ہے باشاہ

شہر میں آدمی بھی ارزاں ہے
صرف پانی کا کال ہے باشاہ

گھوڑے جوڑے کی اہمیت تو نہیں
ہاں مگر اِک سوال ہے باشاہ

کیا طمانچہ تھا اُن کے والد کا
گال اب تک بھی لال ہے باشاہ

مجھ سے وہ مِل رہے ہیں ہنس ہنس کر
کچھ تو "کالے" میں "دال" ہے باشاہ

دل میں کچھ ہے زبان پہ کچھ ہے
یہ سیاست کی چال ہے باشاہ

چوتھی بیگم کے ناز نخرے دل سے
اب تو جینا محال ہے باشاہ

کوئی اچھا بُرا نہیں شاہد
اپنا اپنا خیال ہے باشاہ

NATURE کے SPEED کنٹری کے FEATURE کے [illegible] YOUNG کے HAIR OIL

مرزا کھونچ بیتیاوی

سہرا مبارک

میاں نوشہ تجھے سہرا مبارک — نئی اتی نئے ابا مبارک
یہ ٹی. وی، ریفریجیٹر، نقد پیسہ — کہوں میں کیا تجھے کیا کیا مبارک
میاں تم ہو انگوٹھا چھاپ لیکن — ہے بی. اے پاس منکوحہ مبارک
یقیناً وہ کھلائے گی کما کر — تجھے بس بیٹھ کر کھانا مبارک
الگ ماں باپ سے گر ہو گیا تو — نئی ہانڈی نیا چولہا مبارک
عزیز و اقربا کو کھونچ صاحب — ہو گھی میں تر بہ تر لقمہ مبارک

مرزا کھونچ بیتیاوی

غزل

سراسر لن ترانی کون لکھے — ہے بیگم پہ جوانی کون لکھے
لکھو بس ملک میں امن داماں ہے — فسادات و گرانی کون لکھے
غزل منگوا رہا ہوں پارسل سے — ہے کس کی مہربانی کون لکھے
بھری محفل میں شاگردوں سے پٹ کر — ہوا وہ پانی پانی کون لکھے
کبھی میں بھی جواں تھا کھونچ صاحب — گئی گزری کہانی کون لکھے

محمد فخرالدین فخر کوڑلوی

تین شعر

جوں ہی نظر میں آؤں تو دیتی ہے گالیاں
پھر کیوں نہ بھاگ جاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

ہاتھی دکھانے نکلا تھا بچوں کو لے کے ساتھ
اب کیا انھیں دکھاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

بنتا ہے فخر مجھ سے تیرے تیس مار خاں
سانپوں کے ہاتھ پاؤں تجھے دیکھنے کے بعد

مقبول احمد مقبول

چپل

(چٹکوبہ)

کس نے دعوت میں ہماری ہی چرائی چپل
قیمتی تو نہ تھی، اپنی تھی، ہوائی چپل

یوں بھی اکثر ہوا ہے راستہ چلتے چلتے
لڑکی اور لوٹ کے جی بھر کے ستائی چپل

بات بچپن کی ہے اک بار پڑی تھی سر پر
نئی لینے کی غرض سے جو گنوائی چپل

معز ہاشمی (اورنگ آباد)

عارضۂ ادب

اور پھر ہمارے شہر کی فضاء اچانک ہی ادبی وباء کا شکار ہوگئی۔ انتظامیہ اپنی ہی سعی کر کے رہ گیا۔ اس وباء نے بستی کے گلی کوچوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سڑکیں ویران ہوگئیں چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہر گھر میں ایک نہ ایک ادبی مریض پایا جانے لگا۔ طرح طرح کی تشویشناک افواہوں سے لوگوں کے دلوں پر دہشت طاری ہوگئی۔ انتظامیہ نے یہ اعلان کر دا دیا کہ "یہ وبائی مرض اس بستی کے لئے نیا نہیں ہے بلکہ سینکڑوں برس قبل بھی اس مرض نے اسی بستی پر حملہ کیا تھا اس لئے عوام سے پُر زور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مرض کے تعلق سے تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ انتظامیہ بہت جلد اس کا ٹیکہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اُمید ہے آپ ہم سے پورا پورا تعاون کریں گے اور افواہیں پھیلانے والوں کی نشاندھی کر کے ایک اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیں گے"۔

اس اعلان پر ہم نے چین کی سانس لی۔ لیکن مرض کی دہشت اور مریضوں کی وحشت ہمارے دل میں بھی تھی چنانچہ ہم سوچنے لگے کہ آخر یہ مرض ہے کیا اور کس طرح ایک انسان کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ سب جاننے کے لیے ہم نے بستی کے نامور حاذق، حکیم و عامل سے رجوع کیا جو امراضِ پیچیدہ پر اچھا خاصہ عبور رکھتے تھے۔ اُن کا مطب کیا تھا؟ ایک اچھا خاصہ پوسٹ مارٹم روم دکھائی دیتا تھا! چاروں طرف عملِ جراحی کے زنگ آلود اوزار بکھرے پڑے تھے۔ بوسیدہ کتابوں کے ڈھیر تلے دبے ہوئے نامور حاذق و عامل نے ہمیں دور ہی سے پہچان لیا، بعجلت تمام وہ ڈھیر سے برآمد ہوئے۔ ہم نے کہا "محترمی! اطمینان سے تشریف لائیے۔ ہم کوئی مریض نہیں ہیں"۔ بڑی تگ و دو کے بعد حکیم صاحب نے گرد سے اٹے کپڑوں کو جھاڑا۔ اپنی منحنی کمر کو بمشکل تمام خطِ مستقیم کی شکل دی۔ ایک دائرہ ہمارے اطراف کھینچ کر وہ ایک بوسیدہ کرسی پر براجمان ہوگئے۔ آثارِ قدیمہ کے نوادر سے۔ لیے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔

"مطلب بیان کرو برخوردار!"

"آنجناب کے علم میں تو یہ بات آئی ہوگی کہ اس وقت بستی ایک خطرناک وباء کا شکار ہے"!

"کیوں نہیں۔ حکیموں، عاملوں سے یہ کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے"!

"تب اس کے معالجے کی آپ نے کوشش نہیں کی"؟

کر تو رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مرض کی تاریخ جاننا بہت ضروری ہے۔"
ہم نے حیرت سے کہا۔ "جناب والا یہ مرض کوئی ڈھائی تین سو سال پرانا ہے۔"
حکیم صاحب نے کہا "کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں؟"
"جی ہاں اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔"
"جس وقت یہ مرض عالم وجود میں آیا تھا اس وقت ستارے کون سی چال چل رہے تھے؟"
"پتہ نہیں۔"
"یہی جاننے کے لیے ہم زائچہ تیار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی ستاروں کی چال معلوم ہو جائے گی ہم مرض کا علاج دریافت کرلیں گے۔"
"دافع مرض کے لیے زائچہ۔؟"
"ہم ہر مرض کی تشخیص اور علاج بذریعۂ زائچہ ہی کرتے ہیں تاکہ اس کی بیخ کنی کرنے میں آسانی ہو۔"
"حکیم صاحب مرض کیسے لاحق ہوتا ہے اس بارے میں آپ کچھ بتائیں گے۔؟"
آج تک جتنی بھی تحقیقات ہوئی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی موروثی مرض نہیں ہے۔ بلکہ یہ ادبی وائرس (VIRUS) ہے جو کسی ادیب یا شاعر کی صحبت میں رہنے سے ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے۔ بچوں میں یہ مرض بالکل نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف عقل و فہم سے آراستہ بالغوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔"
"اس کی علامتیں کیا ہوتی ہیں؟ اور کس طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مریض عارضۂ ادب میں مبتلا ہو گیا ہے؟"
"اہم علامتیں یہ ہیں: مریض تبخیر معدہ کا شکار ہوتا ہے۔ خوابیدگی کے عالم میں خواہ مخواہ خواہشوں کے سپنے دیکھتا ہے۔ خویش و اقارب سے بلا وجہ دوری اختیار کرلیتا ہے۔ ہر ایک کو تکتا ہے۔ امور خانہ داری سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ درون خانہ اس کی حالت بھیگی بلی سی ہوتی ہے۔ بیرون خانہ اپنے ہم جنسوں سے چڑنے لگتا ہے اختلاجِ ادب کا مریض ہمیشہ اپنی تعریف سننا چاہتا ہے۔ دائمی ادبی مریضوں کے تذکرہ پر بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ادب کا عالم پناہ تصور کرتا ہے۔"
"اس کا مداوا کیسے ہو؟ آپ نے اس بارے میں کچھ سوچا ہے۔"
"دیکھئے عنقریب عالموں، حکیموں کی تین روزہ کانفرنس "عارضۂ ادب کی افادیت اور علاج" کے عنوان سے منعقد ہونے جارہی ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔"
"فی الحال ایسے مریضوں کو کس دوا سے افاقہ ہوگا؟"
"عارضی افاقہ کی حد تک آپ ایسا کر سکتے ہیں ایسے مریضوں کو ادبی جلسوں، رسالوں اور اخباروں میں اچھا مقام دیں تاکہ انھیں کچھ تسکین ہو۔"
حکیم صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "عارضۂ ادب میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بے ادبی سے اگر مریض کو وہ مقام نہ مل سکا تو اس کی حرکتِ ادب بند ہو سکتی ہے۔"
ہم نے اضطراب سے کہا "آپ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیے۔"
"دیکھو میاں"۔ حکیم صاحب نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا۔ اگر تمہارے گھر میں اس وباء کا کوئی شکار ہے

تو میں آزمائش کے لیے چند تعویذ اور گنڈے دیتا ہوں تاکہ مرض میں کچھ افاقہ ہو۔ لیکن اعتقاد بہت ضروری ہے۔ پرہیز وغیرہ کی کوئی شرط اس آزمائشی علاج میں نہیں ہے۔ صرف تعویذ کھول کر اُسے دُور ہی سے دکھا دینا۔ اور گنڈہ کو میڈل کے طور پر اس کے گلے میں ڈال دینا۔ ساتھ ہی صبح و شام "لغاتِ کشوری" اور "دیوانِ غالب" کا پانی دَم کر کے پلاتے رہنا تاکہ وہ مرض کی تکلیف میں الفاظ کا مبہم استعمال ترک کر دے" ہم نے حکیم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مطب سے باہر آکر حکیم صاحب کے دیئے ہوئے تعویذ کو کھول کر دیکھا تو اس میں شاعری کی گردان فاعلاتن فاعلاتن، فاعلن کی تحریر درج تھی۔ اور گنڈے پر "ادب برائے عمل" لکھا ہوا تھا۔

ہم اس تعویذ کو لیئے ایک دوست کے گھر پہنچ گئے جو ایک عرصہ سے "عارضۂ ادب" میں مُبتلا تھا۔ دروازہ پر دستک دی تو، اندر سے سسکیاں سنائی دیں دروازہ کھلتے ہی ہم پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہمارے یارِ غمگسار کا کیس پیچیدہ نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ ابھی ہم اس کی کیفیت پوچھ بھی نہ پائے تھے کہ دوست کی والدۂ محترمہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا:

"دیکھو بیٹا کیا حال ہو گیا ہے تمہارے دوست کا۔"

ہم نے کہا۔ خاطر جمع رکھیئے خالہ جان۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی یہ پہلے اسٹیج میں ہی ہے۔ میں اسے آج ہی کسی اسٹیج پر چڑھا دیتا ہوں۔ انشاء اللہ دو ایک روز میں یہ نارمل ہو جائے گا" تب ہم نے اپنے دوست پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ اسٹیج کے نام پر اس کے یرقان زدہ چہرے پر سُرخی دوڑ گئی تھی۔ ہم نے کہا "میرے دوست چل آج شام "شبِ افسانہ" منعقد ہو رہی ہے حتی الامکان کوشش کر کے تجھے وہاں پڑھنے کا موقع دلادونگا" دوسرے ہی لمحہ میں وہ ایک لمبی جست لگا کر ہمارے قریب پہنچ گیا۔

اس کی اس حرکت پر سارے گھر نے اطمینان کی سانس لی۔ پتہ چلا کہ وہ تین دن سے ایک جگہ دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ نہ کھا رہا تھا نہ پی رہا تھا۔ صرف خلاؤں میں آنکھیں پھاڑتا رہتا تھا۔ ■□■

قومی، ادبی، تہذیبی روابط کو سخن کا خراج

وقار خلیل کی نظموں اور غزلوں کا

دوسرا مجموعہ!

"ورثہ"

پیش لفظ —— علی جواد زیدی

صفحات: (۱۲۸) کارڈ بورڈ دورنگی سرورق قیمت: صرف ۱۲/۵۰

وقار خلیل۔ ایوانِ اُردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

مُلّا نصیرالدین کے لطیفے

① مُلّا نصیرالدین سے لوگوں نے پوچھا کہ "تمہاری عمر کیا ہے؟"

جواب دیا "چالیس سال" دس برس کے بعد پھر پوچھا گیا تو مُلّا نے وہی جواب دیا "چالیس سال" لوگوں نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ دس سال قبل بھی جب پوچھا گیا تو آپ نے یہی جواب دیا تھا۔

مُلّا نے فوراً جواب دیا "میں اپنے قول کا پابند ہوں اور اپنے قول سے انحراف کرنے کا میں قائل نہیں"۔

② مُلّا سے چند عیسائی راہبوں نے دریافت کیا کہ بتاؤ دنیا کا مرکز کہاں ہے؟

مُلّا نے جہاں کھڑے تھے وہیں جگہ دکھا کر کہا کہ یہ دُنیا کا مرکز ہے۔

پادریوں نے کہا "کیسے معلوم" جواب دیا کہ تم ناپ کر دیکھو۔ اگر فرق نکلے تو مجھے آکر بتا دینا۔

③ لوگوں نے مُلّا سے دریافت کیا کہ وضو کرتے وقت کس طرف رُخ کرنا چاہیئے۔

مُلّا نے فوراً جواب دیا "جس طرف تمہارے کپڑے رکھے ہوئے ہیں"۔

④ ایک روز لوگوں نے مُلّا سے دریافت کیا کہ "جنازے کے جلوس میں شرکت کے وقت سب سے مناسب جگہ کونسی ہے۔ تابوت کے سامنے، پیچھے، داہنی یا بائیں؟"

مُلّا نے فوراً کہا کہ تابوت کے اندر مت رہو۔ بقیہ جہاں بھی رہو کوئی حرج نہیں۔

⑤ مُلّا نے ایک دفعہ اپنا گدھا ایک دلال کے حوالے کیا کہ اس کو فروخت کروا دے۔ ایک خریدار نے گدھے کے دانت دیکھنے چاہے تو اس نے کاٹ لیا۔ وہ چلا گیا۔ ایک اور خریدار آیا تو گدھے نے اس کو دولتی ماردی۔ دلال نے تنگ آکر گدھا مُلّا کے حوالے کیا اور کہا کہ یہ جانور کوئی بھی نہیں لے گا۔ مُلّا نے فوراً کہا کہ میں بھی فروخت تھوڑے ہی کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ دیکھیں اور جان لیں کہ میں اس بدعت کے ہاتھوں کیا کیا دکھ اُٹھا چکا ہوں۔

⑥ ایک دن مُلّا اپنے گھر میں بہت ہی اداس بیٹھے تھے۔ پیسے بالکل نہیں تھے اور کوئی ترکیب بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اتنے میں ان کا ایک پڑوسی آیا۔ اور نصیحت کی کہ "ایسے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔ کوئی کام کرو۔ حرکت میں برکت ہے"۔ مُلّا نے تنگ آکر پوچھا کہ "کیا کام کروں؟" اس نے کہا کہ کچھ بھی کام کرو مثلاً باغ میں کھدائی کرو تاکہ بارش کے بعد بیج بو سکو۔

مُلّا نے جھنجھلا کر ایک کدالی اُٹھائی اور باغ کے کونے میں کھودنے لگے۔ اچانک زمین کے اندر سے ایک دفینہ برآمد ہوا۔ مُلّا نے ہاتھ اُٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا پھر یہ بھی کہا تیری حکمت میں کوئی دخل نہیں مگر تو نے خزانہ یہاں چھپا کر پڑوسی کو کیوں اطلاع کردی تھی۔

⑦ ایک دن مُلّا کسی دوسرے شہر گئے تھے دیکھا کہ لوگ رمضان کے نئے چاند کو دیکھنے کیلئے جمع ہو رہے ہیں اور ایک ہنگامہ برپا ہے۔ مُلّا نے ایک آدمی کو روک کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے دیکھا کہ اجنبی آدمی ہے بتایا نیا چاند دیکھنے سب لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اور آسمان کی طرف اشارہ کیا وہاں آسمان پر باریک سا ہلال افق میں نظر آرہا تھا۔ مُلّا سے رہا نہ گیا۔ فوراً کہا کہ تمہارا شہر بھی عجیب ہے ہمارے پاس چودھویں کے اتنے بڑے اور خوبصورت چاند کو کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا اور تم لوگ ابھی چلے [illegible]

محمد خورشید نادر ہاشمی

دوسری قسط

مزاحیہ اور انشائیہ

مزاحیہ مضامین میں کرداروں کی تشکیل ممکن ہے۔ یہ کردار اگرچہ فرضی ہوتے ہیں مگر ایک مشاق اور باکمال مزاح نگار اپنی جادو بیانی سے انھیں اس طرح پیش کرسکتا ہے کہ وہ زندہ اور مستقل کردار معلوم ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں اس طرح کے کئی مزاحیہ کردار ہیں جو اگرچہ فرضی ہیں مگر ایک مخصوص اور مستقل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ایک مزاحیہ مضمون میں کئی فرضی کرداروں کی تشکیل بھی ممکن ہے جو آپس میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

انشائیہ محض ایک ذہنی ترنگ ہے، جس میں نہ ربط و تسلسل ہوتا ہے، نہ باقاعدگی اور نہ تکمیل و جامعیت۔ ایسی سیماب صفت صنف میں کسی مستقل کردار کی تشکیل و تعمیر امر محال ہے۔

مزید برآں انشائیہ میں فرضی کرداروں اور ان کے مفروضات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ انشائیہ نگار معاشرہ کے زندہ موجود کرداروں کی حرکات و سکنات اور ان کے اعمال و اشغال پر نظر رکھتا ہے اور معاشرہ میں واقع ہونے والے معاشی و تہذیبی تغیرات اور ذہنی و فکری انقلابات کا بچشم غائر مطالعہ کرتا ہے اور ان ناہموار اور مضحکہ خیز حقائق کو اُجاگر کرتا ہے جنھیں آج کا مصروف انسان عموماً نظر انداز کر دیتا ہے۔

انشائیہ نگار کردار سازی کی کوشش نہیں کرتا اور نہ کسی مخصوص اور انفرادی کردار کی طرف ملتفت ہوتا ہے۔ وہ معاشرہ کا طائرانہ جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنی جولانیِ طبع کے لیے کوئی گوشہ منتخب کرلیتا ہے۔

مزاحیہ میں خاکہ نگاری بھی ممکن ہے۔ یہ خاکے فرضی افراد کے بھی ہو سکتے ہیں اور حقیقی افراد کے بھی، جنھیں مزاح نگار اس طرح پیش کرتا ہے کہ خاکہ نگاری کے پردہ میں ان کا خاکہ اُڑایا جا سکے، اور ان کی شخصیت کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُجاگر کرکے انھیں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جا سکے۔

انشائیہ میں کسی خاص فرد کی، خواہ وہ فرضی ہو یا حقیقی، بالتفصیل خاکہ نگاری نہیں ہوتی اور نہ خاکہ نگاری کے مسلمہ اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے انشائیہ نگار ذاتی تاثرات سے سروکار رکھتا ہے، غیر شخصی تاثرات کی ترجمانی اس کا منصب نہیں۔

انشائیہ نگار عموماً کسی مخصوص شخصیت کے گرد طواف نہیں کرتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فرد کی اہمیت

کو نظرانداز کرتا ہے۔ اگر کسی خاص فرد کے کردار میں کوئی ایسی خوبی یا خامی ہو جو پورے معاشرے کو متاثر کرسکتی ہے اور اس کے دوررس اثرات مرتب ہوسکتے ہیں تو وہ ان کی نشاندہی کرکے ہماری خصوصی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے۔ مگر شخصی کردار کا یہ جائزہ خاکہ نگاری کے مروجہ ضوابط کے تحت نہیں ہوتا کیوں کہ وہ کسی شخصیت کا ہر پہلو اور ہر زاویہ سے مطالعہ نہیں کرتا، وہ کسی خاص خوبی یا خامی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسے اُبھارتا اور اُجاگر کرتا ہے مگر نتائج کا باقاعدہ استخراج اس کی ذمہ داری نہیں وہ صرف قاری کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے اور بقیہ معاملات اس کی صوابدید پر چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔

مزاحیہ میں عموماً رعایتِ لفظی، ذومعنی الفاظ کا استعمال، لفظوں کی اُلٹ پھیر اور دیگر لفظی شعبدہ بازیوں سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ ان صنعتوں کا استعمال شعوری طور پر کیا جاتا ہے اور اس کے لیے تامل اور غور وفکر لازمی ہے۔

انشائیہ میں اس طرح کا التزام مستحسن نہیں۔ انشائیہ صنعتِ رعایتِ لفظی و تجنیس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن غور وفکر کے بغیر غیر شعوری طور پر کوئی صنعت استعمال ہوجائے تو مضائقہ بھی نہیں۔

انشائیہ میں مرصّع نثر، تکلف اور عبارت آرائی کی قطعاً گنجائش نہیں، مگر ادبیت بہرحال لازمی ہے۔ نثر میں انشائیہ کا وہی مرتبہ ہے جو نظم میں سہل ممتنع کا بظاہر آساں مگر عملاً دشوار۔ انشائیہ نگاری میں زبان سادہ مگر پُرکار ہوتی ہے، الفاظ عام فہم ہوتے ہیں لیکن ان میں گہری معنویت ہوتی ہے۔

مزاحیہ ڈرامائی انداز میں بھی لکھا جاسکتا ہے۔ بعض مزاحیہ مضامین کا اختتام اتنا ڈرامائی اور غیر متوقع ہوتا ہے کہ قاری کو ذہنی جھٹکا لگتا ہے۔ اس کی توقعات مجروح اور تصورات زیر و زبر ہوجاتے ہیں۔

انشائیہ میں عموماً ڈرامائیت نہیں ہوتی۔ اس میں اول تا آخر ایک ہمواری اور روانی ہوتی ہے، جیسے کوئی جوئے آب نرم خرامی سے رواں دواں ہو۔ راستہ کے نشیب و فراز اور پیچ وخم کے باعث اس میں تموّج اور ارتعاش تو ہوتا ہے مگر نہ طغیانی ہوتی ہے اور نہ طوفانی کیفیت بلکہ ایک طرح کی موسیقیت اور نغمگی ہوتی ہے جو شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

انشائیہ میں بات سے بات پیدا کی جاتی ہے اور موضوع سے گریز بھی کیا جاتا ہے مگر بڑے پُرلطف انداز میں، ڈرامائی طور سے نہیں۔ انشائیہ میں قاری ایک سحرزدہ معمول کی طرح انشائیہ نگار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور آخر تک اس کے سحر سے آزاد نہیں ہوتا۔ اگر انشائیہ نگار اسے کسی موڑ پر چھوڑ کر علیحدہ بھی ہوجائے تو، قاری کے ذہن کے پردوں پر ایک سرور انگیز ارتعاشی کیفیت تادیر قائم رہتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو نہ مبہوت کرتا ہے نہ مرعوب بلکہ اسے جہانِ نو کی سیر کراتا ہے، اس کے ذہنی اُفق کو وسیع کرتا ہے، اور نئی لذت سے آشنا کرتا ہے۔

مزاحیہ میں مکالماتی انداز بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مزاح نگار کے علاوہ دوسرے کردار بھی مکالمے ادا کرسکتے ہیں، حتیٰ کہ غیر انسانی کردار بھی ظریفانہ انداز میں انسانوں سے ہم کلام ہوسکتے ہیں۔

انشائیہ نگاری میں عموماً مکالمات سے گریز کیا جاتا ہے کیونکہ انشائیہ صرف انشائیہ نگار کے ذاتی محسوسات پر مشتمل ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار اثنائے بیان دوسرے کے خیالات ضمناً پیش کرسکتا ہے مگر ان کی زبانی نہیں بلکہ اپنے الفاظ میں۔

دراصل مکالمات انشائیہ کی روانی اور ہمواری میں حارج ہوتے ہیں اس لیے ان سے گریز و اجتناب ہی بہتر ہے۔ صرف مکالمات ہی نہیں بلکہ واوین اور قوسین کی کثرت بھی گراں گزرتی ہے۔ یہ تمام چیزیں انشائیہ کی روانی میں SPEED-BREAKER کا کام کرتی ہیں اور انشائیہ کے مزاج کے منافی ہیں۔

انشائیہ میں غیر شخص کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس میں تخاطب بھی روا نہیں، صرف انشائیہ نگار خود کلامی کے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

انشائیہ میں نہ غیر انسانی کردار ہوتے ہیں اور نہ ان کے مکالمے۔

مزاحیہ میں خارجیت کا عنصر غالب ہوتا ہے، داخلیت یا تو مفقود ہوتی ہے یا تناسب کے اعتبار سے بہت کم۔

مزاحیہ کے برعکس، انشائیہ میں داخلیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ خارجیت نسبتاً کم ہوتی ہے مگر یکسر مفقود نہیں ہوتی کیونکہ خارجیت کے بغیر داخلیت ممکن ہی نہیں۔ حقائق خارجیت سے تعلق رکھتے ہیں اور تاثرات داخلیت سے۔ انشائیہ نگار حقائق اپنے گرد و پیش سے لیتا ہے اور ایسے نقطہ پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتا ہے جسے لوگ عموماً نظرانداز کر دیتے ہیں اور پھر اپنے ذوق و رجحان کے مطابق ذاتی تاثرات تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اس لیے انشائیہ میں خارجیت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔

مزاحیہ میں عموماً ماضی اور حال کے واقعات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور زورِ تخیل سے مستقبل میں رُونما ہونے والے ممکنہ تغیرات، واقعات اور ان کے اثرات بھی بیان کئے جا سکتے ہیں، بالفاظِ دیگر مزاحیہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو محیط ہوتا ہے۔

انشائیہ نگار حال سے سروکار رکھتا ہے۔ وہ پیش آمدہ حالات و واقعات پر نظر رکھتا ہے اور جو اثرات اس کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوئے ہیں انھیں ایک خاص انداز سے صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیتا ہے۔ ایسا ذکرِ ماضی جس میں یاس و حرماں اور حزن و قنوطیت کا غلبہ ہو، انشائیہ کے لیے موزوں نہیں۔ اگر ماضی اور مستقبل کا ذکر ناگزیر بھی ہو تو اس کی حیثیت محض ضمنی ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنی بیشتر توجہ حال کی طرف مبذول کرتا ہے، اور تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو کی جستجو میں رہتا ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی ندرت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور تازہ موضوعات زمانۂ حال ہی میں مل سکتے ہیں۔

مزاحیہ میں حقیقی واقعات کو مسخ کر کے بیان کرنے کا رُجحان عام ہے زورِ بیان کے لیے غلو اور مبالغہ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ ترتیبِ داستان کے لیے امرِ واقعہ میں حذف و اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مزاحیہ زائیدہ تخیل ہوتا ہے اور اس میں حقیقی واقعات اور کردار کم ہی ہوتے ہیں۔

انشائیہ میں حقیقی واقعات کو مسخ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ تصرف اور کذب بیانی انشائیہ نگاری کے مسلمہ اصولوں کے منافی ہے، تاہم انشائیہ نگار کسی واقعہ سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات بیان کر سکتا ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکتا ہے مگر کسی حقیقی واقعہ میں تحریف و تصرف کا اسے اختیار نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ حقائق کو من و عن بیان کر لے اور پھر اپنا ردِ عمل ظاہر کرے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی۔

مزاحیہ میں مقصدیت کار فرما ہوتی ہے۔ مزاح کی غایت ادبی و ذہنی تربیت اور اصلاح ہے۔ طنز کا عنصر

شامل ہونے سے مزاحیہ اور موثر ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات مزاحیہ میں مقصدیت کے قائل نہیں اور اسے محض ذہنی تفریح فراہم کرنے کا ایک وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے اور فی الوقت خارج مبحث۔

انشائیہ میں مقصدیت نہیں ہوتی۔ نہ اس میں پروپیگنڈہ اور نظریات کی تبلیغ کی گنجائش ہے۔ انشائیہ نگار اخلاقی مبلغ کے فرائض انجام نہیں دیتا۔ انشائیہ نوعیت کے اعتبار سے ایک فرحت بخش اور روح افزا صنف ہے، ذہنی خستگی اور اعصابی انتشار کو دور کر کے تفریح و تسکین فراہم کرتا ہے، وہ محض لطف و سرور اور نشاط و انبساط کا منبع ہے۔ اس میں افادیت کا عنصر یا تو مفقود ہوتا ہے یا برائے نام۔ تاہم انشائیہ میں اخلاقی و روحانی اقدار شجر ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کا انحصار انشائیہ نگار کی افتاد طبع پر ہے۔ وہ اگر چاہے تو اخلاقیات کا عنصر داخل کر سکتا ہے لیکن اس کا براہ راست اظہار یقیناً ناپسندیدہ ہے۔ برہنہ گفتن انشائیہ میں مستحسن نہیں۔ انشائیہ نگار کا مافی الضمیر بین السطور میں مستور ہونا چاہیئے۔

مزاحیہ میں مزاح نگار کی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ مزاح نگار پس منظر میں ہوتا ہے اور حالات و واقعات غالب ہوتے ہیں۔ مزاحیہ مضامین کے مطالعہ سے خود مزاح نگار کی شخصیت، رجحانات اور اس کے نظریۂ حیات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مزاحیہ بہرحال شخصیت کا آئینہ دار نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں ذاتی تاثرات نسبتاً کم ہوتے ہیں اور تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔

انشائیہ اظہار شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں انشائیہ نگار بے نقاب ہو جاتا ہے۔ چوں کہ وہ نجی قلبی کیفیات بیان کرتا ہے، اس لیے کذب بیانی اور حاشیہ آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انشائیہ کے مطالعہ سے انشائیہ نگار کے ذاتی جذبات و افکار، ذوق و ظرف اور اس کے تصور حیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اظہار ذات اور انفرادی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے انشائیہ سے بہتر و موزوں اور کوئی صنف نہیں۔

مزاحیہ اپنے عہد اور ماحول کا صحیح عکاس نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں بیشتر واقعات و کردار فرضی ہوتے ہیں۔ حقائق، خوف فساد خلق یا مصلحت اندیشی کے باعث مسخ شدہ یا ان میں حذف و اضافہ ہوتا ہے۔ مزاحیہ چوں کہ زائیدہ تخیل ہوتا ہے اس لیے اس میں حقیقت نگاری کم اور طبع زاد باتیں زیادہ ہوتی ہیں، مبالغہ آرائی اس پر مستزاد۔ اس لیے مزاحیہ میں ماحول اور معاشرہ کی حقیقی عکاسی نہیں ہوتی۔

انشائیہ اپنے عہد اور ماحول کا صحیح عکاس ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری انشائیہ کا اصول اساسی ہے اس لیے اس میں حقائق و شواہد کی ترجمانی موجود ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار حقائق کو مسخ کرنے کا مجاز نہیں خواہ وہ پسندیدہ ہوں یا ناپسندیدہ۔ وہ اپنے تاثرات کے ساتھ انہیں بجنسہٖ پیش کر دیتا ہے اس لیے انشائیہ میں عہد، ماحول اور معاشرہ کا صحیح عکس نظر آتا ہے۔

مزاحیہ میں منظر کشی نہیں ہوتی۔

انشائیہ میں منظر نگاری اور انشاء پردازی ایک اضافی خصوصیت ہے۔ انشاء پردازی سے یہاں مراد مقفیٰ و مسجع عبارت نہیں بلکہ الفاظ مترنم ہوں، انداز بیان شگفتہ ہو اور زبان سیال اور بے کیف نہ ہو۔

مزاحیہ کی مثال ایک تیز سینٹ (SCENT) کی سی ہے جو اکثریت کو مرغوب ہوتی ہے اور جس کا

اثر تیز اور فوری ہوتا ہے، مگر تا دیر قائم نہیں رہتا۔

مزاحیہ کے مقابلہ میں انشائیہ کی مثال ایک لطیف عطر کی سی ہے جس کی خوشبو بھینی بھینی، لطیف اور مسحور کن ہوتی ہے، مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے اور اس کی خوشبو بھی تا دیر قائم رہتی ہے مگر اس کی لطافت سے ہر شخص لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ مزاحیہ اور انشائیہ دو مختلف اصنافِ نثر ہیں، ان میں ظاہری مماثلت ضرور ہے مگر فی الاصل دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں، اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہیں اور ان کی اپنی خصوصیات ہیں ۔۔۔ !! ∞

نامور مزاح نگار مسیح انجم کے مضامین کا تیسرا مجموعہ!

چنانچہ

۱۲ روپے

ناشر
زندہ دلانِ حیدرآباد

نامور افسانہ نگار عاتق شاہ
کی گیارھویں تصنیف

"دو منٹ کی خاموشی"

چودہ کہانیوں کا مجموعہ

خوبصورت، عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔
صفحات: ۱۲۸ ــــــ قیمت: ۱۵ روپے

ہم سے طلب فرمائیے:

شگوفہ پبلیکیشنز ۔ ۳۱ بیچلرز کوارٹرس
حیدرآباد

عابدہ محبوب

دھجیاں

"راہِ نجات"

ایک خاتون اپنے شرابی اور جواری شوہر سے عاجز آچکی تھیں۔ ایک دن اپنی عزیز سہیلی کو اپنی داستانِ غم سنا کر رونے لگیں: "اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا! برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ موت دوسروں کو آرہی ہے۔ مگر خدا تو مجھے ہی بھول گیا ہے۔ میں خدا سے دن رات دعا کر رہی ہوں کہ وہ مجھے جلد سے جلد . . ." سہیلی نے فوراً ٹوک دیا۔

"فضول باتیں نہ کیا کرو۔ بھلا اس طرح کوئی ہمت ہار دیتا ہے!" خاتون نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سچ! خدا کو نہ جانے کب مجھ پر رحم آئے۔ اسی لیے تو میں دن رات دُعا کر رہی ہوں کہ وہ مجھے جلد سے جلد . . . ."

سہیلی نے پھر ٹوک دیا۔

"پھر وہی فضول بات کی تم نے۔ خُدا پر بھروسہ رکھو۔ اچھے دن ضرور آئیں گے!"

خاتون نے چڑ کر کہا "مگر کب؟ اسی لیے تو میں خُدا سے دن رات دُعا کر رہی ہوں وہ مجھے جلد از جلد بیوہ بنا دے!"

"تصحیح"

ایک بار میں بمبئی جا رہا تھا۔ ہمارے کمپارٹمنٹ میں چھ آدمی تھے۔ ایک دُبلے پتلے آرٹسٹ، دوسرے ضرورت سے زیادہ تندرست سیٹھ صاحب۔ میاں بیوی اور ان کی چار سالہ لڑکی ہُما۔ ہُما کی باتیں سُن کر مجھے ٹیگور کی کہانی "کابلی والا" کی مینی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

رات زیادہ ہونے لگی تو سب اپنے اپنے برتھ پر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ سب سے اوپری برتھ پر سیٹھ صاحب اور آرٹسٹ، درمیانی برتھ پر ہما کے ڈیڈی اور میں اور سب سے نچلی برتھ پر ہما اور ہما کی ممی۔ مگر ہما مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی اور سوالات پر سوالات کر رہی تھی — آخر ہما کی ممی نے ڈانٹ کر کہا۔

"اب سو جاؤ ہما۔ ورنہ اوپر چھپا بیٹھا ہے۔ اگر کاٹ کھائیگا سمجھیں؟"

ہما نے اپنا سر نکال کر اوپری برتھ پر دیکھا اس کو سیٹھ صاحب نظر آئے۔ جھٹ سے بولی۔

"ممی۔ ممی۔ اوپر چوہا نہیں ہے۔ ہاتھی بیٹھا ہے ہاتھی!"

"پُرانی کتاب"

ایک خاتون نے حج کو جانے کا قصد کیا۔ ان کی عزیز سہیلی کو علم ہوا تو وہ اپنے ساتھ حج کے تعلق سے چند کتابیں لے آئیں اور خاتون کو دیتے ہوئے کہا۔

"جب میں حج پر گئی تھی نا۔ پندرہ سال پہلے۔ تب بمبئی حج کمیٹی نے یہ کتابیں دی تھیں۔ تم فی الحال اس میں سے دُعائیں وغیرہ یاد کرتی رہو اس طرح جانے تک . . ."

خاتون نے اپنی سہیلی کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"مگر پندرہ سال پُرانی کتابیں لیکر میں کیا کروں گی؟ اب تک ان میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہو چکی ہوں گی!"

"سلامتی"

سو سالہ قدیم دارالعلوم ہائی اسکول فار گرلز انشا بعابدہ قاضی

رکھتا ہے۔ انقلاب زمانہ نے اس کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ ایسے ہی زوال پذیر دور میں ایک خاتون ٹیچر کا نیا نیا تقرر اسکول پر ہوا۔ خاتون ٹیچر نے اپنی جماعت کے مانیٹر کو کیل ٹھونک کر ٹائم ٹیبل لٹکانے کی ہدایت کی۔ جب مانیٹر کیل ٹھونک رہا تھا تو پاس والی کلاس سے اسکول کے ایک بہت ہی سینیئر استاد آئے اور پریشانی سے بولے۔

"ارے۔ ارے یہ کیا غضب کر رہی ہیں آپ؟ دار العلوم کی دیواریں تو سلامت رہنے دیجیئے!"

خاتون ٹیچر نے برجستہ جواب دیا۔

"قبلہ! آپ دیواروں کی فکر کر رہے ہیں۔۔؟ یہاں کی تو بنیادیں ہل چکی ہیں!"

"آئیڈیل"

ایک خاتون اپنی خوب صورت لڑکی کے لیے خوب سے خوب تر لڑکے کی تلاش میں تھیں۔ خاتون کی قریبی سہیلی نے ان سے پوچھا "آخر تمہیں کیسا لڑکا چاہیئے؟"

خاتون بولیں "مجھے ایسا لڑکا چاہیئے جو اسمارٹ ہو، رنگ گورا ہو، قد اونچا ہو، خاندانی ہو، خوش اخلاق ہو، تعلیم یافتہ ہو، ملازم سرکار ہو، دولت مند ہو، بہترین کھلاڑی ہو، خوش لباس ہو اور ایسا ہنس مکھ ہو کہ لوگ . . . . . ."

سہیلی نے بات کاٹ دی "بس، بس میں سمجھ گئی تمہیں کیسا لڑکا چاہیئے! مگر ایسا لڑکا تو بس ایک ہی جگہ مل سکتا ہے!"

خاتون نے بے چینی سے پوچھا کہاں . . . کہاں مل سکتا ہے ایسا لڑکا؟"

سہیلی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"شفیق الرحمن کے افسانوں میں!"

"نئی ٹکنیک"

ایک صاحب اپنے جگری دوست کو ایک پانچسالہ خوب صورت لڑکی کی تصویر بتاتے ہوئے بولے۔

"یہ میری منگیتر کی بچپن کی تصویر ہے! پندرہ سال پرانی!"

پندرہ سال پرانی!"؟ دوست نے حیران ہوکر کہا۔ اس کی حالیہ تصویر کہاں ہے"؟

"یہی تو مشکل ہے یار" وہ صاحب اداسی سے بولے اس کے والد بڑے قدیم خیالات کے ہیں۔ میں نے اور والدہ نے اس کی حالیہ تصویر کے لیے کئی بار انھیں لکھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے! ادھر میرا دل اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ اب بڑی ہوکر نہ جانے کیسی لگتی ہوگی!"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر . . ." یکایک دوست کسی بات کے تصور سے اچھل پڑا "تم اس کو بڑی دیکھنا چاہتے ہونا۔ بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہو!

"مگر کہاں۔ کیسے؟" صاحب نے بے چین ہوکر پوچھا۔ دوست نے کہا "تمہارے پاس جو تصویر ہے نا تم اس کو ENLARGE کروالو!"

پرویز یداللہ مہدی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ!

ٹائیں ٹائیں فش

قیمت : ۲۰ روپے

ماجد شمیم (بیدر)

تکیہ کلام نے ڈھائے ستم کیسے کیسے...!

تکیہ کلام کی افادیت سے مجھے انکار نہیں اس لیے کہ اس کا عادی اس کے بغیر کلام کرہی نہیں سکتا مگر اسی تکیہ کلام نے ہمیں ڈبویا ہے۔ اگر ہم اپنے تکیہ کلام کی وجہ سے ڈوبتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن احباب کے تکیہ کلام نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ اس لیے بعض دفعہ میں نعرہ لگاتا ہوں کہ "مجھے میرے دوستوں کے" تکیہ کلام "سے بچاؤ"۔ اگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو شاید یہی نعرہ بلند کرتے۔ بعض دفعہ تکیہ کلام ہمیں نازک موقف" میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ایک ہمارے دوست ہیں دوست کیا عزیز کہیے۔ ان کا تکیہ کلام ہے" آپ بولے جیسا" جب ان کے بچوں نے میٹرک کامیاب کرلیا تو انھیں پی۔ یو۔ سی میں داخلہ دلوایا اور ایک ملاقات میں مجھ سے یوں گویا ہوئے:" آپ بولے جیسا" میں نے بچوں کو پی۔ یو۔ سی میں داخلہ دلوایا ہے بچوں کا ارادہ ہے کہ وہ اس کے بعد انجینیرنگ یا ڈاکٹری میں داخلہ لیں اس لیئے" آپ بولے جیسا" میں نے ان کو گلبرگہ کالج میں داخلہ دلوایا ہے . . . " اور ہم حیران و پریشان تھے کہ ہم نے اتنے اچھے مشورے انھیں کب دیئے تھے بعد کی ملاقاتوں میں معلوم ہوا کہ یہ ان کا تکیہ کلام ہے اور ہماری وہ خوش فہمی دور ہوئی کہ ہم بھی کسی کو اچھے مشورے دے سکتے ہیں۔ چندماہ بعد یہی عزیز ہمارے گھر آئے۔ اس وقت میں اپنے ایک مخلص دوست کے ساتھ ان کے ایک نجی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا۔ سلام اور دعا کے بعد انھوں نے حسب عادت یوں کلام فرمایا۔ کہ" آپ بولے جیسا" میں نے دفتر تحصیل میں عذرداری پیش کردی ہے۔ اور آپ بولے جیسا ان صاحب کی درخواست منتقلی جائداد تعطل میں پڑ گئی ہے"۔ ابھی میں کوئی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ میرے مخلص دوست نے مجھے گھور کر دیکھا اور کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد کی گفتگو سے پتہ چلا کہ میرے اس مخلص دوست نے ایک پلاٹ ان کی زمین کے قریب خریدا ہے اور ہمارے عزیز نے ان کے خلاف دفتر تحصیل میں عذرداری پیش فرمادی ہے اور اب ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وہ اچانک اُٹھ کر کیوں چلے گئے . . . اس کے بعد کئی دفعہ ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اس عذرداری سے ہمارا کوئی تعلق نہیں سارا فساد ان کے تکیہ کلام کا ہے۔ مگر ہمارے دوست کا دل و دماغ اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن وہ ہم سے روٹھے ہوئے ہیں اور ہم ان کی دوستی اور اخلاص سے محروم ہیں۔

ایک اور ہمارے ہم پیشہ دوست ہیں جن کا تکیہ کلام آپ کو سن کر تعجب ہوگا " ہے۔ یہ ایسی کوئی بات نہیں فرماتے

جسے سُن کر ہم تعجب کریں۔ لیکن ایک نیا ملنے والا آپ کے اس تکیہ کلام پر ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ اور آپ کی ساری گفتگو بڑے انہاک سے سُنتا ہے اور جب گفتگو ختم ہوتی ہے تو اسے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کے سُننے سے تعجب ہو۔ ان کے اس اندازِ کلام پر ملاقاتی کو واقعی تعجب ہوتا ہے اور دو ایک ملاقاتوں میں وہ جان جاتا ہے کہ اس جملے کے بغیر ان کی بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک دفعہ بار اسوسی ایشن کی میٹنگ میں ایک اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی جس میں ہائی کورٹ کے بھی کچھ نمائندے شریک تھے۔ ہمارے یہی دوست اظہارِ خیال فرما رہے تھے۔ گفتگو ایک نازک موڑ پر آ گئی تھی اور سامعین پر یہ تاثر قائم ہو چکا تھا کہ آپ ایک جملہ میں گفتگو کا ماحاصل پیش کر دیں گے۔ . . اسی لمحہ آپ نے تکیہ کلام کا سہارا لیا اور فرمایا کہ "آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ شمیم صاحب . . . . ابھی آپ نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ آپ کی سول جج کورٹ سے کال ہوئی۔ اور آپ ابھی آیا . . . ! کہہ کر بار روم سے چلے گئے۔ . . ادھر ہم سارے لوگوں کی نظروں کے تیروں کا شکار ہو گئے۔ ہم نے صاف پڑھ لیا کہ وہ ناچیز ہی کو اس سارے فساد کی جڑ تصور کر رہے ہیں آخر چند منٹ بعد ہمارے دوست تشریف لائے اور اپنا جملہ یوں پورا کیا۔ . . شمیم صاحب نے بھی اس سلسلے میں انھیں کافی سمجھایا مگر وہ ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ہی ہم ان نظروں کے تیروں سے آزاد ہو پائے . . .

ایک اور دوست ہیں جو ہم پیشہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہم مذہب بھی ہیں جن کا تکیہ کلام ہے "میری اپنی ذاتی رائے میں"۔ مذہبی محفل ہو کہ سیاسی میٹنگ آپ کی گفتگو ہمیشہ "میری اپنی ذاتی رائے" سے شروع ہوتی ہے۔ اور درمیان میں بار بار اس کی تکرار کرتے ہوئے مشہور فلاسفر "ریفارمر" اور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے اقوال بیان کرتے ہیں۔ یہ ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقوالِ زرین دوسروں کے ہیں۔ ابتداً ہم بھی اوروں کی طرح ان اقوال کو آپ ہی سے منسوب کرتے رہے اور جب ایک جلسۂ عام میں ہم نے موصوف کے حوالے سے کہا کہ "اسلام ایک بہترین مذہب ہے، مگر مسلمان ایک بدترین قوم"، تو سامعین نے ہمیں حیرت سے تاکا اور پھر جب ہم نے انہی کے حوالے سے کہا کہ ؎

"مدلیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس"

تو سامعین میں سے کسی نے جھنجھلا کر کہا۔ . "بس بس کیجیے۔ یہ برنارڈ شاہ ثانی اور علامہ اقبال ثانی کب پیدا ہوئے؟" ہم سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور بغلیں جھانکتے رہ گئے۔

کہتے ہیں سیاست میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے ایک سیاسی دوست ہیں جن کا تکیہ کلام ہے "خدا جھوٹ نہ بلوائے"۔ اور وہ بے چارے بے تحاشا جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کی گفتگو کی ابتداء ہمیشہ "خدا جھوٹ نہ بلوائے" سے ہوتی ہے۔ آپ جب بھی بنگلور کا دورہ کرتے ہیں۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے"۔ ایک ایم۔ ایل۔ اے سے لے کر چیف منسٹر تک سب سے مل آتے ہیں۔ اور اپنی محفلوں میں ملاقاتوں کا تذکرہ کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں کرتے اور یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ بیدر کے مسائل "خدا جھوٹ نہ بلوائے" ان کی نمائندگی کے بغیر حل ہی نہیں ہو سکتے۔ اور نتیجتاً "اہلِ غرض" ہمیشہ آپ کو گھیرے رہتے ہیں۔ قسمت کے مارے ایک دفعہ ہم بھی اہلِ غرض کی [illegible] ہو گئے۔ اور ان کے ہمراہ بنگلور متعلقہ منسٹر صاحب [illegible] کمرہ پر پہنچے اوقاف کے مسائل [illegible]

منسٹر صاحب ہمارے ساتھی کی طرف متوجہ ہوکر یوں گویا ہوئے۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے" گو کہ وہ سیاسی نقطۂ نظر میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے اوقافی کاموں میں ایک مقام پیدا کیا ہے۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے" لوگ محض غرض میں خواہ مخواہ مخالفت پر اُتر آئے ہیں۔" منسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "اوقافی مسائل میں سیاست کو دخل نہیں ہونا چاہیئے۔" تو ہمارے دوست نے فوری ٹکڑا لگایا۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے" میں بھی یہی کہتا ہوں۔ منسٹر صاحب مسکرائے اور کہا آپ جھوٹ بولنے کی کوشش ہی کیوں فرماتے ہیں۔ جو ہمیشہ خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔

ایک اور کرم فرما کے تکیہ کلام کی کرم فرمائی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی بات ختم کروں گا آپ کا تکیہ کلام ہے۔ "آپ یقین کیجیے۔" غالباً وہ کسی دوست کی شادی کی تقریب تھی جہاں پر پہلی ملاقات اِن ... صاحب سے ہوئی۔ تعارف کے بعد صاحبِ موصوف نے کہا "آپ یقین کیجیے" کی اضافت سے وہ وہ موشگافیاں فرمائیں کہ صاحب خانہ کے لیے میرے دل میں نفرت نے گھر کر لیا اور میں نے تقریب سے رخصت ہوتے وقت ساری بات اُن کے گوش گزار کردی آپ یقین نہیں کریں گے صاحب خانہ دنگ ہوکر صرف مجھے گھورتے رہ گئے اور ان صاحب نے درمیان میں بات کاٹ کر کہا آپ یقین کیجیے۔" میں نے وہ ساری باتیں ازراہِ مذاق کہی تھیں۔ جن کا تعلق حقیقت سے کچھ نہیں یہ سُن کر ہماری حالت ایسی ہوگئی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں!

اِن تلخ تجربات کے بعد ہم نے احباب کی گفتگو سُننے میں یہ احتیاط کی کہ آیا ان کے کلام میں کوئی "تکیہ کلام" تو نہیں ہے۔ اور "آپ بولے جیسا" آپ کو سن کر تعجب ہوگا" میری اِس ذاتی رائے کے بعد" "خدا جھوٹ نہ بلوائے" ان ساری پریشانیوں سے محفوظ ہوگیا ہوں ۔ ۔ ۔ غالباً آپ نے یقین کرلیا ہوگا۔

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف
اور ہزاروں کی دل پسند چائے!
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب!

لاسا اسپیشل چائے
لمسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی
لاسا سُوپر بلنڈ ٹی

Nilgiri's
LASA
SUPER BLEND
FINEST QUALITY LASA
TEA

ہیڈ آفس:
نیلگری ٹی ایمپوریم، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد، اے پی، انڈیا۔

محمد مظہر حیات (ناگپور)

بس کا سفر

بس میں سفر کرنے والوں کی بھی ایک الگ دُنیا ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہر طرح کے لوگوں کا ایسا عجیب مکسچر ان بسوں میں ملتا ہے اور نت نئے تجربوں کا مزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

ویسے تو ہم بس میں سفر ہی نہیں کرتے کیونکہ ہم ایک عدد اسکوٹر کے مالک ہیں روزانہ اسی سے دفتر آیا جایا کرتے ہیں۔ لیکن ہماری بھی کیا شامت آئی کہ اسکوٹر دیکھی تو پنکچر۔ لامحالہ بس کی یاد آئی۔ چنانچہ ہم بس کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ بس اسٹینڈ پر ٹھیک وقت پر پہنچ گئے لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میلہ لگا ہوا ہے۔ رکشہ والے، آٹو والے، پانی والے اپنی اپنی دکان سجائے کھڑے ہیں ۔۔۔ کیو نام کی تو چیز ہی نہیں ہے ناگپور شہر میں! ایسی حالت میں عورتوں اور مردوں کی ریل پیل آپ نے دیکھی ہی ہوگی ۔۔۔ نہ جانے کیسے کیسے دھکم دھکوں کو سہنا پڑتا ہے۔

ہمارے سامنے سے بسیں بھری بھری گزر گئیں اور ہم کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھے جا رہے تھے۔ اور بسیں ہمیں منہ چڑاتی جا رہی تھیں۔ گھڑی دیکھی ۱۰ بج رہے تھے آفس کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اب رکشہ کر لیا جائے تاکہ وقت مقررہ پر آفس پہنچ جائیں۔ لیکن صاحب! ہم جیسے ہی رکشہ والے کے قریب گئے ہمیں دُور سے بس آتی دکھائی دی۔ ہم نے رکشہ والے سے کہا۔ دیکھو ہماری بس آ گئی ۔۔۔ بس کیا آئی۔ آفت آئی۔ ہماری شامت آئی۔ ایک پر ایک گرے جا رہے ہیں۔ ہم شرافت کی لائن میں کھڑے انتظار ہی کر رہے ہیں کہ سب کے چڑھنے کے بعد ہم چڑھ جائیں گے لیکن صاحب! کنڈکٹر نے ٹن ٹن بجادی اور ہم اپنا سا منہ لٹکائے رہ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد دوسری بس آئی۔ ہم اس بار کسی طرح خدا خدا کر کے بس میں سوار ہو گئے۔ بس تھوڑی ہی دُور چلی ہوگی کہ پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ چور چور۔ ہائے میں لٹ گیا ۔۔۔ پاکٹ مار دیا۔ ۔ کنڈکٹر نے ایمرجنسی گھنٹی بجائی۔ بس رُکے بغیر سیدھا پولیس تھانہ پہنچ گئی ۔۔۔ وہاں باری باری سب کی چیکنگ ہوئی۔ چور تو پہلے ہی بھاگ گیا لیکن تلاشی ایسی ہو رہی تھی بالکل چور ہم ہی ہیں۔

خیر صاحب! پولیس کی کاروائی کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد بس پھر اپنی منزلِ مقصود کی طرف دوڑنے لگی۔ میرے پیچھے ایک کالج کی طالبہ تھی۔ اس کے پیچھے اس کے چاہنے والے طالب علم کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد ندور دار قہقہوں

کی آوازیں آنے لگیں اور لڑکی پر طنز یہ فقرے کسے جانے لگے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک صاحب لڑکی کے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "خوب" فاؤنٹین پن لٹکانے کا یہ نیا ڈھنگ ہے"! اب مزے کی بات یہ کہ بے چاری لڑکی چاروں طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے کہ قلم کس کا ہے؟ ایک صاحب سمجھے قلم لڑکی کے ہاتھ سے لیا۔ اسے کھولا تو اس کا دماغ ہی نہیں میرا مطلب نب اور ہلڈر کی سے ہے۔ یہ شرارت نہیں تو کیا۔

بس جھٹکے سے رکی ہم نے جھک کر دیکھا۔ یہ تو ہمارا ہی اسٹاپ ہے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے ہم اترنے لگے۔ کنڈکٹر نے ٹکٹ مانگا۔ ہم نے ۵۰ پیسے دیئے اس نے ۳۵ پیسے کی ٹکٹ ہمیں دی اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ صاحب ۱۵ پیسے چلر نہیں ہیں۔ اور ٹن ٹن بجادی۔ گھڑی دیکھی تو پونے بارہ بج گئے تھے یعنی ہم پورے ۱/۲ ۱ گھنٹہ لیٹ ہو گئے تھے۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے واگ مارے صاحب کا بے چارے کچھ بولے تو نہیں صرف ریڈ مارک لگا دیا۔

آفس چھوٹنے کے بعد پھر ہم بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بس آئی جس میں پہلے سے ہی اتنے مسافر تھے کہ اس میں 'اور' کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لیکن بھلا ہو اس کنڈکٹر کا بھیڑ بکریوں جیسا بھرے جارہا تھا۔ "آگے بڑھو، آگے بڑھو" کے نعرے لگا رہا تھا۔ ہم نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً چڑھ گئے اسی بس میں ـــ ہم ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک صحت مند دھکا لگا۔ ہم اسی دھکے سے کچھ اور کھسک گئے۔ اب کی بار ایک بھاری بھرکم بوٹ ہمارے نئے جوتے پر (جو ہمارے بھیّا نے سعودی عرب سے بھیجا تھا) جم گیا۔ انگلیوں کا کچومر نکلتا تو شاید ہم آسانی سے سہہ لیتے لیکن فارن کے جوتے کی ستیاناسی اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھتے۔ ہم نے ذرا بگڑ کر ان صاحب سے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس پر وہ صاحب بغیر معافی مانگے الٹا ہمیں پر بگڑ پڑے کہنے لگے "اگر دھکا برداشت نہیں ہے تو ہوائی جہاز میں سفر کیا کرو"۔ یہ بھی خوب رہی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ خیر صاحب! ہم نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

بس ایک اسٹاپ پر رکی بہت سے مسافریاں اتر گئے۔ اب تھوڑی بہت کھلی ہوا ملی ہم نے بھی فوراً ایک خالی سیٹ پر قبضہ کرلیا۔ بس آگے بڑھی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت غیر ملکی لباس میں (تھی تو اسی ملک کی لیکن لباس غیر ملکی تھا) کافی سے زیادہ بنی سنوری بڑی سیٹ کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ باقی سیٹ خالی تھی۔ سامنے کی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ اور یونیورسٹی کا ایک طالب علم۔ اگلے اسٹاپ پر کچھ مسافر اور چڑھے جن میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص چکن کا کرتا۔ دھوتی۔ منہ میں پان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بس میں داخل ہوا۔ اور عورت کے قریب بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے فوراً بعد ہی انھوں نے گھوم کر بڑے چاؤ سے اس عورت کی طرف دیکھا اور اسی لمحہ عورت نے بھی گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ کچھ لمحہ چار ہی رہیں۔ اور پھر عورت تنک کر دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی ـــ طالب علم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔ ہمارے پیٹ میں بڑے زور کی گدگدی ہوئی لیکن ہنس نہ سکنے کی وجہ سے دردبن کر رہ گئی۔

کنڈکٹروں کی تو آج کل چاندی ہے تنخواہ سے زیادہ ان کی بالائی آمدنی ہے۔ اب آپ ہی دیکھئے نا! کسی سے پورے پیسے لیتا ہے اور ٹکٹ ہی نہیں دیتا ٹکٹ کے ۵۰ پیسے ہوتے ہیں تو منزل تک پہنچ کر ۲۵ پیسے دے دو اور بغیر ٹکٹ لیے نیچے اتر جاؤ ـــ یہ بات الگ ہے کہ ہم نے بھی ایسا ہی کیا اور نیچے اتر گئے لیکن یہ کیا یہاں تو چلتی پھرتی عدالت بغیر اطلاع دیئے کھڑی ہے اور ہر اترنے والے سے ٹکٹ مانگ رہی ہے۔ اب تو ہم بُری طرح پھنس گئے کنڈکٹر تو بس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ پکڑے گئے ہم۔ ۲۵ پیسے بچانے کی کوشش میں پورے ۵ روپے جرمانہ لگ گیا۔ اس لیے۔ صاحب۔ ۔ ۔ ۔

□□

تبصرہ از : ڈاکٹر محبوب راہی   بال کی کھال (تبصرہ)

نئی روشنی (شعری مجموعہ)

شاعرہ : نور جہاں نور
صفحات : ۱۱۲ قیمت : ۲۰ روپے
رابطہ : ۶/۱ آکاش اپارٹمنٹ، آگری پاڑہ، بمبئی ۴۰۰۰۱۱

عورت ذات ہر دور میں زمانے بھر کی زیادتیوں اور نا انصافیوں کا شکار رہی ہے۔ قسم ہا قسم کے مظالم اس مخلوق پر روا رکھے گئے۔ مختلف رشتوں کی آڑ میں اس کا مسلسل استحصال کیا گیا اور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مختلف عنوانوں سے کیا جا رہا ہے (دلائل و شواہد پیش کرنا ضروری نہیں سمجھی جانتے ہیں)

شاعر طبعاً حساس ہوتا ہے اس نے عورت کے درد کو پہچانا، محسوس کیا اور وقتاً فوقتاً اس کے مختلف مسائل پر دردمندی اور دلسوزی کا اظہار کرتا رہا۔ لیکن وہ جو کہا ہے ؎

گھایل کی گت گھایل جانے اور نہ جانے کوئی

عورت کا دکھ عورت ہی ٹھیک طور پر سمجھ سکتی ہے محسوس کر سکتی ہے کہ ان تجربات کے شعلہ زاروں سے کبھی کبھار وہ بھی گزر چکی ہوتی ہے۔ نور جہاں نور جو عورت بھی ہیں اور نور" علیٰ نور ایک سلجھی ہوئی شاعرہ بھی۔ حوا کی بیٹیوں کو درپیش مختلف روزمرہ، تلخ ترش اور شیریں مسائل و موضوعات پر پچھلے کئی برسوں سے مسلسل نظمیں لکھتی رہی ہیں جو وقتاً فوقتاً خواتین کے شائع شدہ رسائل اور اخبارات میں شائع بھی ہوتی رہی ہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ ادبی حلقوں بالخصوص طبقۂ نسواں کے لیے مخصوص اہمیت و افادیت کی حامل ان کی نظموں کا خوبصورت انتخاب کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے جس کا عنوان اسم بامسمیٰ "نئی روشنی" ہے۔

سفید چکنے کاغذ پر دیدہ زیب کتابت اور طباعت کی خوبیوں سے آراستہ نور جہاں نور کی اکتیس فکر انگیز اور سبق آموز نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ جن میں ہمارے معاشرے میں عورت کو قدم قدم پر درپیش نت نئی آزمائشوں، مثلاً محبت کے جھوٹے وعدوں کی فریب کاری، لمحاتی عشق، مطالباتی جہیز، خوب سیرتی کی بجائے خوبصورتی کو معیارِ انتخاب قرار دینا، زن و شوہر کا انا کی صلیبوں پر مصلوب رہنا، مرد کی غرض پرستی کے جواب میں عورت کا ایثار اور بے لوثی، ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کا المیہ، بیوی بچوں کے لیے راحت کی فراہمی

کے لیے مرد کی غریب الوطنی، سگھڑ بیوی کی قناعت پسندی، مثالی ساس بہو کا کردار، جنگ و فساد کا شکار ایک گھرانے کی دوشیزہ کا کوٹھے کی زینت بن جانا، مال و متاع کی ہوس میں جوان لڑکیوں کو ہوس کار مالدار بوڑھوں کی زوجیت میں دے دینا، عورت کا جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوکر مجنون بن جانا۔ قبل از پیدائش بیٹی کا وجود ختم کر دینا (اسقاطِ حمل کرانا) اسبابِ تعیش کے لیے پاکیزہ جذبوں کی قربانی وغیرہ کی ترجمانی نہایت موثر انداز میں کی گئی ہے۔ اور بیشتر مسائل کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔

درس و تدریس، حصولِ علم، اور گرہستی کے جھمیلوں سے نبرد آزما رہتے ہوئے نور جہاں نور نے جو نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں جا بجا ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات جھلکتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ڈاکٹر ظ۔ انصاری پروفیسر نور العین علی، اور علامہ قمر سرسوی کی تحریروں میں بھی کچھ اس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں۔

"ایک گرہست کی شاعری، گرہست کی زبانی اور گرہستی کی ترجمانی، جتنے نشیب و فراز اس زندگی میں عموماً ہوا کرتے ہیں اتنے ہی اس کلام میں ہیں۔

نئی روشنی میں شامل ۱۳ نظموں میں مجھے بطورِ خاص جو نظمیں پسند آئیں وہ ہیں "شرط"، "میرا فیصلہ" "نئی روشنی" "شاہکار"، "مثالی ساس بہو" "یقین" "خوابوں کا شہزادہ نہ تھا۔" "دولہا بدل گیا" "دوسری شادی" "بیٹی کی فریاد" "نیا روپ"۔ یہ مجموعہ جتنا ماؤں اور بہنوں کے لیے مفید ہے اتنا ہی ساسوں اور بہوؤں کے لیے بھی ہے۔ مردوں کو اس میں جا بجا دعوتِ فکر دی گئی ہے۔ لہٰذا بلا تخصیص اس کو خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مجموعے!

بہر حال ۱۰ روپے
آدمی نامہ ۹ روپے
بالآخر ۱۴ روپے
تکلف برطرف ۱۴ روپے
قطع کلام ۱۲ روپے
جاپان چلو (سفرنامہ) ۱۴ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے!

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

۱۹۸۷ء میں ادارۂ زندہ دلانِ حیدرآباد اپنی عمر کے ۲۵ سال مکمل کر رہا ہے۔ ربع صدی میں یہ پودا ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی تشکیل کے وقت کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ ادارہ ایک دن ملک میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلے گا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۵ء میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے انعقاد کے بعد اس تحریک کا دوسری زبانوں پر بھی خاطر خواہ اثر پڑا۔ ملک اور بیرونِ ملک کی ۱۹ زبانوں کے نمائندے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ادارہ نے جو وقار، شہرت اور کامیابیاں حاصل کی ہیں، اس کا سلسلہ قائم رہے۔ طنز و مزاح کے فروغ کے لیے اب تک جو کام ہوئے ہیں اُن کا جائزہ لیا جائے اور خاص طور سے نوجوانوں کو اس تحریک میں شریک کیا جائے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب نومبر ۸۷ء کے پہلے ہفتہ میں شاندار پیمانہ پر منعقد کی جارہی ہیں۔ اس موقع پر شگوفہ کے سووینر کے علاوہ ادارہ کے پہلے معتمد اور نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی اور ضخیم "مجتبیٰ حسین نمبر" شائع کیا جائے گا — مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فکر و فن پر ملک و بیرونِ ملک کی اہم شخصیتوں اور نقادوں کے مضامین حاصل کئے جارہے ہیں۔ قبل ازیں بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، کنھیا لال کپور، سلیمان خطیب، خواجہ عبدالغفور اور تخلص بھوپالی پر شگوفہ کے خصوصی نمبر شائع ہوچکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نمبر کے تعلق سے تفصیلات کا متعاقب اعلان کیا جائے گا۔ سلور جوبلی تقاریب کے سلسلہ میں قارئین شگوفہ سے التماس ہے کہ وہ اپنے زریں مشوروں سے نوازیں اور اپنے تعاون کے ذریعہ ان تقاریب کو یادگار اور کامیاب بنائیں۔

پچھلے ماہ جناب ولی شاہجہانپوری کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم ماہنامہ "کتاب نما" کے ایڈیٹر ہونے کے علاوہ اُردو کے ممتاز اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ جناب ولی شاہجہانپوری کے انتقال سے مکتبہ جامعہ کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور جناب شاہد علی خاں مینجنگ ایڈیٹر اپنے دیرینہ رفیق اور دوست راست سے محروم ہوگئے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین!

چولہے کا چولہا۔۔۔ ٹی وی کا ٹی وی

بالکل اناڑی ہے۔ اسے تو بجانا ہی نہیں آتا۔
اس سے اچھی موسیقی تو ریڈیو سیلون سے سن سکتے ہیں۔

Zakir Husain Library, Jamia Nagar, J.M.I. New Delhi
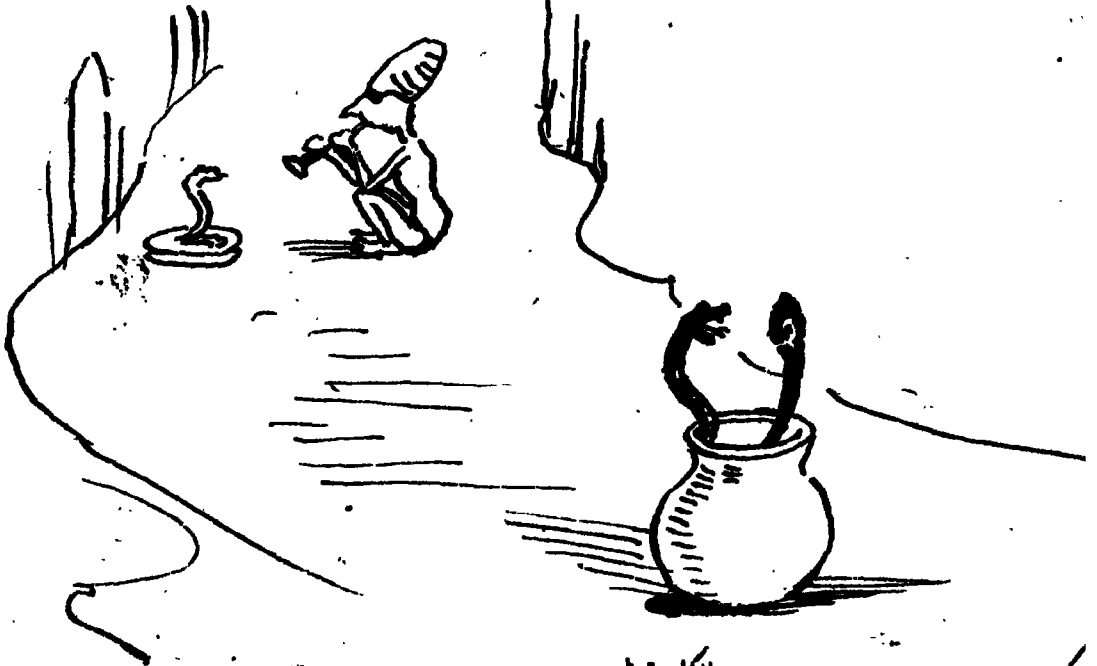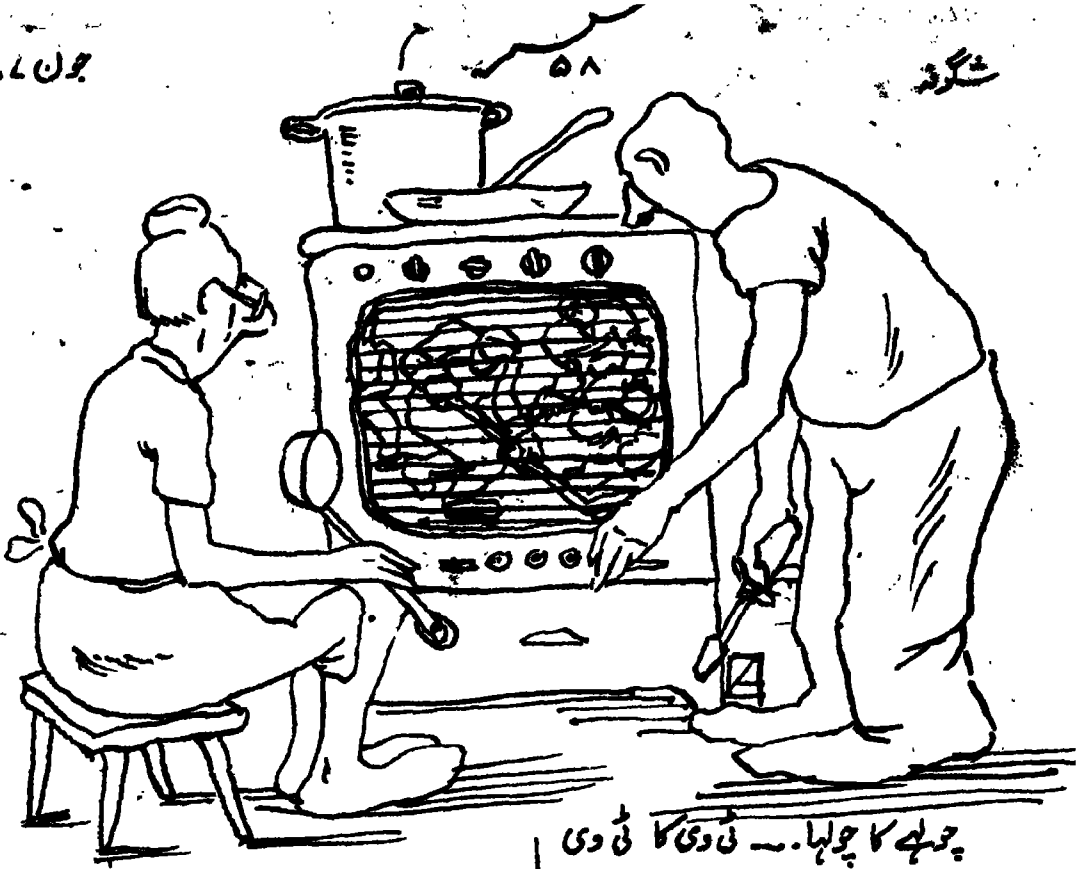
ایڈیٹر:
ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال

جلد [۲۰] شمارہ [۷] جولائی ۱۹۸۷ء

مجلسِ ادارت

حمایت اللہ ؛ محمد منظور احمد ؛ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

بھارت چند کھنّہ ؛ نریندر لوتھر

یوسف ناظم ؛ مجتبیٰ حسین

فی پرچہ ۴ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: پینتالیس روپے (۴۵)

غیر ممالک سے ایک سو پچاس روپے

سرِورق: طالب خوندمیری

مینجر:

سمیع جلیل

مینجر اعزازی: (بمبئی)

فیاض احمد فیضی

کتابت: محمد عبدالرؤف ؛ مسعود الانور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۲۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس: 557716

فون مکان: 521064

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:-

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ ۳. ہارکو سری نگر
۴. انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ ۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹرنکور ۶. میڈونا کینگ کمپنی
۷. پیرس سوئٹس اینڈ ٹافیس ۸. ڈرگ بھوٹان فوڈ پراڈکٹس ۹. چمپین وہائٹ روٹس
۱۰. ایس SIL (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس
اینڈ سنس
گلزار حوض۔ حیدرآباد

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

چُننده آسام و
نیلگری کے باغات سے
راست منگوائی ہوئی چائے

اسٹرانگ و
خوش ذائقہ! آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام
ٹی
ٹریڈرس

نزد
یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ، حیدرآباد

PHONE
525444

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی

تقاریب

۱۲ تا ۱۴ نومبر ۱۹۸۷ء

ہند و پاک کے نمائندہ مزاح نگاروں کا اہم اجتماع

تیاریاں زور و شور کے ساتھ جاری ہیں ـــ!

مجتبیٰ حسین

اختر بھائی٭

پچھلے ہفتہ حیدرآباد میں قدیر زماں سے ملاقات ہوئی تو مجھے ایک گوشہ میں لے گئے اور نہایت رازدارانہ انداز میں میرے کان میں کہا "آپ کو پتہ ہے اختر حسن صاحب پچھتر برس کے ہوگئے۔"

میں نے حیرت سے کہا "یہ واقعہ کب ہوا کیسے ہوا! مجھے تو یقین نہیں آیا۔ کیا سچ مچ اختر صاحب پچھتر برس کے ہوگئے یا آپ اپنی خوردی کو مزید پکا کرنے کے لیے ان کی عمر میں اضافہ کر رہے ہیں!"

اپنی موٹر کی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے بولے۔ "اب ہم اختر حسن صاحب کے پاس تو جا ہی رہے ہیں آپ خود پوچھ لیجئے۔"

میں نے کہا بھلا اختر بھائی سے ان کی عمر پوچھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے کیوں کہ میں خود انھیں لگ بھگ تین دہوں سے دیکھ رہا ہوں اور ان دہوں سے پہلے کے دو دہوں میں ان کے بارے میں سنتا رہا ہوں۔ خود میری عمر کے پچاس برس ان کی دید اور شنید میں گزر گئے لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا کہ اختر بھائی پچھتر برس کے ہوگئے۔"

میں اور قدیر زماں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو میں نے اس خیال سے کہ اختر بھائی پچھتر برس کے ہوگئے ہیں نہایت مودبانہ انداز میں ان سے مصافحہ کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے نہایت گرمجوشانہ انداز میں مجھ سے معانقہ کرکے میری عمر کے پچاس برسوں کو اپنے پچھتر برسوں سے پچھاڑ دیا۔ اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی میں ایک جگہ ٹھیرے ہوئے پانی کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اختر بھائی پیچھے سے آئے اور اپنے پچھتر برس سمیت اس پانی کو پھلانگ گئے اور دوسری طرف پہنچ کر اپنے پچھتر برس کا سہارا میری عمر کے پچاس برسوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے "پھلانگنے میں دشواری ہو رہی ہو تو میرا ہاتھ تھام لینا"۔ میں شرمندہ سا ہوگیا اور اپنے پچاس برسوں کے بل بوتے پر پانی کو پھلانگنے کی کوشش تو ضرور کی لیکن اس کوشش میں پانی کے تھوڑے سے چھینٹے اختر بھائی کے کپڑوں پر آگئے۔ نئی نسل، پرانی نسل کے دامن کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔

میں نے بھی بہت سی سدا بہار شخصیتیں دیکھی ہیں لیکن اختر بھائی کی بات ہی الگ ہے بعض شخصیتیں جسمانی طور پر ضرور سدا بہار دکھائی دیتی ہیں لیکن ذہنی طور پر یا تو خزاں رسیدہ ہوتی ہیں یا پیدا ہی نہیں ہونے پاتیں۔ دل

٭ ممتاز ترقی پسند ادیب جناب اختر حسن۔

دماغ اور جسم کی سدا بہاری کا امتزاج مجھے اختر بھائی کی ذات میں ہی دکھائی دیا۔ میں ۱۹۵۵ء کے اواخر میں اختر بھائی سے پہلی بار پرانے ایم ایل اے کوارٹرز میں ملا تھا اور ان سے ملنے کی حاجت اس لیے پیش آگئی تھی کہ آرٹس کالج کی بزم اردو نے ایک ادبی محفل کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا اور بزم اُردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ میں اختر حسن صاحب کو اس جلسہ کی صدارت کے لیے مدعو کروں۔ ان دنوں وہ لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے اور ایم ایل اے کوارٹرز میں رہتے تھے میں ان کے گھر پہنچا تو اختر بھائی گھر پر موجود نہیں تھے۔ ریاست بھابی (مسز اختر حسن) گھر پر موجود تھیں اور انھوں نے ہی گھر کا دروازہ کھولا تھا۔ ریاست بھابی کو پہلے پہل یہیں دیکھا اور انھیں جو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے یہ یاد ہی نہ رہا کہ میں کس کام سے اختر بھائی کے گھر آیا ہوں۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں دیکھنے کے بعد آدمی کے پانچوں حواس خمسہ میں سے باقی چار حواس... اچانک کام کرنا بند کر دیتے ہیں یہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ ریاست بھابی نے جب میرے آنے کی غرض و غایت پوچھی تو مجھے نہ تو بزم اُردو کی یاد آئی اور نہ ہی اردو ادب کا خیال آیا۔ میں نے گھبراہٹ میں کہا "بہت پیاس لگی ہے۔ پہلے تھوڑا سا پانی پینا چاہتا ہوں بعد میں آنے کی غرض و غایت بیان کروں گا۔" پانی کے آنے اور اسے پینے تک مجھے اپنے حواس کو یکجا کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے آنے کی غرض و غایت بتائی تو ریاست بھابی نے بتایا کہ اختر بھائی گھر پر نہیں ہیں اور یہ کہ میں دوسرے دن صبح میں ان سے ملنے کے لیے آؤں۔ دوسرے دن میں خوشی خوشی اختر بھائی کے گھر گیا تو بدقسمتی سے اختر بھائی نہ صرف موجود تھے بلکہ گھر کے باہر نکل ہی رہے تھے میں نے اپنا مدعا بیان کیا مگر جس تاریخ کو ہم کالج میں جلسہ رکھنا چاہتے تھے اس دن وہ کسی سیاسی مصروفیت کے سلسلے میں حیدرآباد سے باہر جانے والے تھے گھر کے باہر کھڑے کھڑے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں جناب محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کا چھوٹا بھائی ہوں تو اور بھی خوش ہوئے بلکہ اتنے خوش ہوئے کہ ان کا بس چلتا تو پانی بھی پلا دیتے لیکن اس وقت وہ جلدی میں تھے اور کسی ضروری کام سے دو چار لوگوں کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے۔

اختر بھائی اور ریاست بھابی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اس ملاقات کو بتیس برس بیت گئے لیکن یہ ذہن میں اب بھی تازہ ہے ان دنوں باجی جمال النساء اور اختر بھائی کے گھر۔ بائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے ادبی محفلیں ہوتی تھیں سیاسی مشورے ہوتے تھے ادیبوں، اور دانشوروں کی بیٹھکیں جمتی تھیں۔ روزنامہ "پیام" کے ایڈیٹر اور سیاسی قائد کی حیثیت سے اختر بھائی کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس یونین کے فرنٹ پر کام کرتا تھا۔ مخدوم۔ راج بہادر گوڑ۔ کامریڈ مہندرا اور اختر بھائی کا طوطی جگہ جگہ بولتا تھا۔ اگر نہیں بھی بولتا تھا تو ہم اس کی جگہ بولنے لگ جاتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ طوطی بھی خاموش ہو گیا اور ہم بھی خاموش ہو گئے (بعض خاموشیوں کی یاد اب بھی کانوں کے پردے پھاڑ دیتی ہے) سماجی اور سیاسی سطح پر اس کا نقصان تو بہت ہوا لیکن ہمارا شخصی فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مخدوم، راج بہادر گوڑ اور اختر بھائی جو اپنی بے پناہ سیاسی اور سماجی مصروفیات کے باعث ہم جلیسوں کے لیے نہ صرف کمیاب بلکہ نایاب بھی تھے اب رفتہ رفتہ دستیاب بھی ہوتے گئے۔ اورینٹ ہوٹل میں محفلیں جمنے لگیں ابتدائی دعا سلام سے ہمکلام ہونے تک نوبت پہنچی۔ اس زمانے کے حیدرآباد کے معاشرے میں چھوٹوں کا اس منزل تک پہنچنا بھی کچھ کم اعزاز کی بات نہیں تھی اگرچہ اختر بھائی کی بہت سی تحریریں پڑھی تھیں ان کی

تقریبوں میں بھی سنی تھیں لیکن ان سے باضابطہ ملاقاتیں ۱۹۶۲ء کے بعد سے ہونے لگیں جب میں حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے اردو شعبہ سے وابستہ ہوا۔ ریاست بھابی پہلے سے یہاں کام کرتی تھیں۔ یہیں مجھے ریاست بھابی کو تفصیل سے دیکھنے سمجھنے اور ان کے حوالے سے خود اختر بھائی کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ریاست بھابی جیسی خوددار، خوداعتماد اور باوقار خواتین میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ زندگی کے ہر موضوع پر ان سے مردانہ وار بات کی جاسکتی ہے۔ اختر بھائی اکثر محکمہ اطلاعات میں چلے آتے تھے یا پھر میں ریاست بھابی سے ملنے ان کے گھر چلا جاتا۔ دونوں کی شفقتوں کا انداز نرالا تھا۔ اختر بھائی کی شفقت بڑی خاموش شفقت تھی جبکہ ریاست بھابی کی شفقت نہ صرف بولتی تھی، بلکہ ضرورت پڑنے پر ڈانٹتی بھی تھی۔ ۱۹۶۲ء کے اواخر میں جب میں نے مزاح نگاری شروع کی تو میں فطری طور پر مصر تھا کہ اختر بھائی میری مزاح نگاری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ وہ رائے دینے کے بارے میں فطری طور پر بہت محتاط ہیں پہلے تو وہ رائے نہیں دیتے اور جب رائے دیتے ہیں تو اس میں سے اصل رائے کو تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے برخلاف اس کے ریاست بھابی رائے دینے کے معاملہ میں اتنی ہی غیر محتاط ہیں ان کا رائے دینے اور گالی دینے کا انداز تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ میں ایک عرصہ تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ ریاست بھابی میری مزاح نگاری کے بارے میں جو رائے دیتی ہیں وہ اصل میں اختر بھائی کی رائے ہے اور میں نتیجہ میں اختر بھائی سے کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ اختر بھائی اور ریاست بھابی اپنی اپنی آراء کے معاملہ میں نہ صرف خودمکتفی ہیں بلکہ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ میری ایک کتاب پر اختر بھائی نے تبصرہ بھی لکھا تھا جس میں "لیکنوں" اور "اگروں" کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ پتہ نہیں آج ان "لیکنوں" اور "اگروں" میں سے میں نے کتنوں کا لحاظ رکھا ہے۔ اختر بھائی کے بارے میں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ روزگار کے معاملہ میں وہ "خانہ بدوشوں" کا سا رویہ رکھتے ہیں جب بھی انھیں پتہ چلتا ہے کہ موجودہ روزگار سے انھیں فائدہ ہونے والا ہے تو فوراً اس سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں میں نے انھیں روزنامہ "پیام" کے ایڈیٹر، لیجسلیٹو کونسل کے رکن، سالار جنگ میوزیم کے ریسرچ اسکالر، لکچرار، ہفتہ وار اردو بلٹز کے ایڈیٹر، محکمہ اطلاعات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور اردو اکیڈیمی کے اسسٹنٹ سکریٹری کے روپ میں دیکھا ہے ان کے علاوہ اگر ان کے اور بھی کچھ پیشے رہے ہوں تو میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ انھیں جب بھی دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں بے روزگاری کا جو رونا رویا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے ایک ہی شخص کو جب اتنی ساری ملازمتیں مل سکتی ہیں تو کیسی یہ روزگاری اور کہاں کی یہ بے روزگاری۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس ملک میں پہلے تو ملازمت کا ملنا دشوار ہے اور اگر وہ ایک بار مل بھی جائے تو پھر اس ملازمت کو چھوڑنا تو اس کو حاصل کرنے سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں اختر بھائی نے کس طرح اتنی ساری ملازمتیں حاصل کیں اور پھر انھیں چھوڑا کیسے؟ یہ گر وہ کسی کو نہیں بتاتے۔ اصل میں اختر بھائی تن آسانی کے قائل نہیں ہیں جب زندگی میں سکون اور خوش حالی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو وہ فوراً ایک عدد ملازمت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی شخصی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں وہ اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی دلچسپی وہ اپنے لیے مسائل کو پیدا کرنے میں لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اختر بھائی آج بھی بڑی بھرپور زندگی گذار رہے ہیں۔ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مسائل سے لڑتے ہوئے اور نت نئی آزمائشوں سے گذرتے ہوئے۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے اختر بھائی کے ماتحت کام کرنے کا موقع بھی نصیب ہو چکا ہے۔ روزگار کی تلاش میں ایک بار وہ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے

اسسٹنٹ ڈائرکٹر بن گئے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر بن جانے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کے دو اہم ماتحتین تھے ان میں سے ایک تو ریاست بھائی تھیں اور دوسرا … میں تھا۔ ان کے تحت الشعور میں بھی یہ بات نہ رہی ہوگی کہ کبھی ایسے فرمانبردار ماتحتین انھیں نصیب ہوں گے ریاست بھائی کی ماتحتی کے بارے میں میں کیا عرض کر سکتا ہوں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے اختر بھائی کو ڈسپلن کے معاملہ میں نہایت سخت گیر پایا۔ چنانچہ میں گھنٹوں دفتر سے غائب رہتا تھا کبھی میں ان کے ہاتھ آ جاتا تو دفتر سے غائب رہنے کی وجہ پوچھتے۔ جب میں کہتا کہ میں نے ریاست بھائی سے باہر جانے کی اجازت لے لی تھی۔ تو فوراً خاموش ہو جاتے تھے حالانکہ مجھے باہر جانے کے لیے ریاست بھائی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی مگر مجھے تو ایک "سلیدا جازت" درکار تھی جو مجھے مل گئی تھی۔ ڈسپلن کی پاسداری کا انھیں اتنا احساس ہوتا تھا کہ ریاست بھائی سے کبھی نہیں پوچھا کہ آیا انھوں نے مجھے باہر جانے کی اجازت دی بھی ہے یا نہیں انھیں ڈر تھا کہ اگر وہ اس کی توثیق چاہیں گے تو اس سے ان کے گھر کا ڈسپلن بگڑ جائے گا ڈسپلن کا اتنا خیال رکھنے والے افسر تو میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ نتیجہ میں دفتر کا سارا کام اکیلے اختر بھائی خود کرتے تھے سچ تو یہ کہ ایسی ٹھاٹ کی ملازمت میں نے کبھی نہیں کی یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ جن دنوں میں اختر بھائی کی ماتحتی کر رہا تھا تو انھیں دنوں دہلی سے میرے پاس ایک ملازمت کی پیش کش آئی۔ اختر بھائی بہت خوش ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً اس نئی ملازمت کو قبول کر کے دہلی چلا جاؤں۔ انھوں نے ہی مجھے دہلی جانے پر اکسایا تھا اور خوشی خوشی جانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ چنانچہ آج تک اپنے وطن سے دور دہلی کی خاک چھاننے کے علاوہ ملکوں ملکوں کی خاک چھان رہا ہوں پتہ نہیں اختر بھائی یہ میرے بھلے کے لیے کئے تھے یا اپنے بھلے کے لیے؟!

خواتین میں "پتی ورتا" تو ہمارے سماج میں عام سی بات ہے لیکن مردوں میں "پتنی ورتا" کی جھلک میں نے اختر بھائی میں ہی دیکھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اختر بھائی کی طرح سگھڑ اور سلیقہ مند شوہر میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ اسے ریاست بھائی کی خوش نصیبی نہ کہوں تو اور کیا کہوں کہ جہاں دفتر میں انھیں ایک وفا شعار افسر ملا تھا وہیں گھر میں ایک سلیقہ مند شوہر کی خدمات بھی انھیں میسر تھیں گھر کے سارے سلیقہ سے اختر بھائی ٹپکے پڑتے تھے لذیذ کھانوں کے ذائقہ میں اختر بھائی کا ہاتھ دکھائی دیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ اختر بھائی پکوان کے نہ صرف شوقین بلکہ ماہر بھی ہیں۔ دوپہر کے کھانے میں میں تو پہلا نوالہ ہی منہ میں رکھ کر بتا دیتا تھا کہ کون سا سالن اختر بھائی نے بنایا ہے اور کونسا ریاست بھائی نے۔

پرانی باتیں یاد کرنے لگوں تو شاید دفتر کے دفتر سیاہ کرتا چلوں دو ایک باتیں کہہ کر اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا اختر بھائی جہاں بلند پایہ صحافی ہیں وہیں ایک معتبر نقاد اور شاعر بھی ہیں کلاسیکی ادب کا جتنا مطالعہ ان کا ہے شاید ہی کسی کا ہو۔ فارسی شاعروں کے شعر سنانے پر اتر آتے ہیں تو سناتے ہی چلے جاتے ہیں چاہے سننے والے کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اختر بھائی کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے کو میں ایک سعادت اور نعمت سمجھتا ہوں۔ نوجوانوں کی ہمت افزائی میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں بلکہ بعض نوجوان ادیبوں میں اتنی "ہمت" نہیں ہوتی جتنی کہ وہ اس کی "افزائی" کرتے ہیں۔ میں جب بھی حیدرآباد جاتا ہوں تو اختر بھائی سے ضرور ملتا ہوں یوں بھی وہ حیدرآباد جسے ہم نے تیس پینتیس برس پہلے دیکھا تھا اب دھواں دھواں سا ہوتا جا رہا ہے دھندلکے بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ شخصیتیں جن سے حیدرآباد "حیدرآباد" کہلاتا تھا اب عنقا ہوتی جا رہی ہیں اختر بھائی سے ملکر اس حیدرآباد کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس کا خمیر … سے اٹھا تھا ہمارے درمیان اختر بھائی جیسی محترم اور باکمال شخصیت کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں

انوار انصاری
(رانچی، بہار)

قرض کا مرض

مرض چاہے قرض کا ہو یا دل کا دونوں ہی انسان کے لیے مہلک ہے اگر انسان قرض کے مرض میں مبتلا ہوگیا تو سمجھئے اس کی زندگی دوبھر ہوگئی اور جینا محال ہوگیا۔ یہی حال دل کے مریض کا ہے دل کا مریض جس طرح گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی گذارتا ہے اور صرف زندہ رہنے کی حسرت میں بہت ساری تکلیفیں جھیلتا ہے اسی طرح قرض کا مریض بھی اپنی زندگی میں طرح طرح کی رسوائیاں اٹھاتا ہے، در در کی بھیک مانگتا ہے اور ذلت و خواری کا تاج پہن کر بھی اس کو قرض سے نجات نہیں ملتی۔

آج کل انسان مختلف امراض میں مبتلا ہے۔ کوئی دل کا مریض ہے تو کوئی دماغ کا۔ کوئی جسم کا مریض ہے تو کوئی روحانیت کا شکار ہے۔ کوئی کج روی میں مبتلا ہے تو کوئی شوخیٔ گفتار کا شکار ہے۔ کوئی کردار کا مریض ہے تو کوئی کریکٹر کا۔ غرض کہ سائنس کی نت نئی ایجادوں اور ترقی کے باوجود مختلف قسم کی بیماریاں سر اٹھا رہی ہیں اور انسان اس سے پریشان ہے۔ حال ہی میں ایڈس کی بیماری نے ساری دنیا کو چونکا دیا ہے۔ کینسر سے ابھی نجات ملی نہیں کہ ایڈس نے ساری انسانیت کے لیے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ مرض سے انسان کو چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے یعنی "مرض بڑھتا گیا جیوں جیوں دوا کی" یہی حال قرض کا ہے۔ یعنی اگر انسان اس مرض میں مبتلا ہوگیا تو اس مرض سے نجات ممکن نہیں۔ ایک قرض کی ادائیگی پوری نہیں ہوتی کہ دوسرے قرض کے لیے انسان ہاتھ پسارے کھڑا رہتا ہے۔ یعنی "قرض بڑھتا گیا جیوں جیوں ادا کی"۔

قرض کا مرض خاصا پرانا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر غالب ہمیشہ قرض کی پیتے رہے۔ مشہور شاعر بیارتینو و برش جند بھی اپنی زندگی میں ہمیشہ مقروض رہے اور مقروض ہی مرے۔ سداما جی جب کرشن سے ملنے کے لیے جانے لگے تو سوغات کے لیے بیچارے کے پاس کچھ نہ تھا۔ آخر کار اپنے ایک پڑوسی سے تھوڑا سا چاول ہی قرض لے کر ساتھ لے گئے۔ ایک مشہور مریض فلسفی کا قول ہے "کھاؤ پیو موج کرو۔ پاس اگر کچھ نہ ہو تو قرض لے کر دل کی مراد پوری کرو"۔ آج کل اس قول پر عمل تیزی سے جاری ہے جس طرح ملک میں بیماری تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پڑھے نکوکر بے کار رہیئے اور قرض لے کر کاروبار دنیا چلاتے!!

قرض کا مرض اب بین الاقوامی سطح کا ہوتا جارہا ہے۔ ہماشما لوگوں کو جانے دیجیے اب بڑی بڑی حکومتیں

قرض کے لیے تگ و دو کرتی ہیں۔ خیر سگالی کے دورے پر وزیروں کو بھیجتی ہیں اور قرض مانگنے کی نئی نئی ترکیبیں بتاتی ہیں۔ نئی اسکیموں کی آڑ میں قرض کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ قرض کا مرض اب اتنا شدید ہوگیا ہے کہ آج کی بہت سی حکومتوں کا دار و مدار قرض ہی پر منحصر ہے۔ اگر قرض نہ ملے تو حکومتیں ختم ہوجائیں بکھر جائیں، ٹوٹ جائیں، قومیں تباہ ہوجائیں اور کچھ پرانی تہذیبوں کا خاتمہ ہوجائے۔ قرض اب عزت کی نشانی ہے۔ جدیدیت کی پہچان ہے۔ یوں سمجھئے ملک کی تعمیر و ترقی کا انحصار بھی قرض ہی پر منحصر ہے۔ موجودہ دور میں اب قرض کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر آپ قرض لینے سے اپنا دامن بچاتے رہیں گے تو یقیناً ایک نہ ایک دن آپ کی رسوائی سر بازار ہوجائے گی

میرے پڑوس میں ایک حضرت کلّو صاحب ہیں۔ وہ قرض لینے میں اتنے ماہر ہیں کہ قرض دینے والا بھیگی بلی بن کر ان کو قرض سے نوازتا ہے۔ کلّو صاحب باتوں کے شہنشاہ ہیں۔ وہ بر رائی کا پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاست دانوں، شاعروں، سماجی کارکنوں کا تذکرہ اور ان کی دکھتی رگیں ان کے دماغ میں یوں محفوظ ہیں جیسے کسی تھانے میں بدمعاشوں کی ہسٹری شیٹ محفوظ ہو۔ وہ اپنی گفتگو کا آغاز حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ فرماکر شروع کرتے ہیں اور اختتام قرض پر ہوتا ہے۔ ایک دن صبح ہی صبح غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کلّو صاحب کا آنا مصلحت سے خالی نہیں۔ میں نے بچّے کو آواز دے کر ان کے لیے چائے منگوائی اور ان کی گفتگو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا۔ کلّو صاحب نے اپنی پانچویں پوتی کی منگنی پختہ ہوجانے کی خبر سنائی۔ کہنے لگے کہ آپ تو جانتے ہیں کہ مہنگائی کے زمانے میں سامان مہیا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اگر آج کل منگنی کی رسم معمولی طریقے سے انجام دی جائے گی تو بڑی رسوائی کا سامنا کرنا ہوگا۔ بابو۔ لڑکی کا معاملہ ہے کوئی کھیل نہیں ہے۔ لڑکے والوں کو تو ہر حال میں خوش رکھنا ہے۔ اگر آپ کے پاس ڈھائی سو روپے ہوں تو عنایت کریں۔ میں نے اب تک قرض ہی کے سہارے دو ہزار روپیوں کا انتظام کرلیا۔ میں کلّو صاحب کو گزشتہ قرض کی یاد دلانا ہی چاہتا تھا اور یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ پہلے اگلے قرض کی ادائیگی کریں پھر نئے قرض کے بارے میں غور کروں گا۔ مگر حضرتِ کلّو نے اس کی ذرا بھی مہلت نہ دی اور خوشامدانہ انداز میں یوں گویا ہوئے۔ انوار بھائی آپ جیسے شریف لوگوں سے تو محلّے کا وقار قائم ہے۔ اس وقت آپ مدد نہ کریں گے تو دوسرا کون ہے جو اس نیک کام میں بڑھ کر حصّہ لے چنانچہ کلّو صاحب اس وقت تک دھرنا دیئے بیٹھے رہے جب تک مطلوبہ رقم ان کو مل نہیں گئی حالانکہ میں نے بھی یہ رقم کسی دوسرے سے قرض لے کر ہی ادا کی تھی۔

قرض کا مرض اب عوامی بن چکا ہے۔ اس لیے خاکسار کا مشورہ ہے کہ اپنی جھوٹی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے دل کھول کر قرض لیجئے۔ مکان تعمیر کرنے کے لیے قرض لیجئے زمین قرض لے کر خرید یئے T.V ٹی وی، فریج، اسکوٹر خریدنے کے لیے قرض کا سہارا لیجئے۔ شادی بیاہ رچانے کے لیے قرض کا دامن تھامئے۔ غرض کہ ہر چھوٹا بڑا کام انجام دینے کے لیے قرض لیجئے۔ اس سے بیگم بھی خوش رہیں گی اور پڑوسی بھی آپ کو داد طلب نگاہوں سے دیکھیں گے قرض لے کر رشتہ داروں کی بھرپور خاطر مدارت بھی کیجیے تاکہ انہیں بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔ دوست احباب کا حلقہ وسیع کیجئے اور قرض لے کر ان کی خاطر خواہ پذیرائی کیجئے۔ ہر جگہ لوگ آپ ہی کے گُن گائیں گے۔

جس طرح معالج مریض کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی بیماری کا انکشاف کرتا ہے اور نجومی ہاتھ کی لکریں دیکھ کر بھولے بھالے انسانوں کی قسمت کا حال سناتا ہے اسی طرح قرض کا مریض سوچ سمجھ کر ایسے دروازے پر جاتا ہے جہاں اسے ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ وہ گڑگڑا کر اپنی روداد اس طرح [illegible]

اپنی خیریت سمجھتا ہے۔ قرض کا مریض بار بار قرض لے کر اس فن میں ماہر ہو جاتا ہے اور قرض لے کر ہی آپ کے دوست ملتا ہے۔ قرض لینا بھی اب ایک مشکل آرٹ ہو گیا ہے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے خاصی مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی قرض کے مریض کی گفتار دلبرانہ ہونی چاہیئے اور کردار عاشقانہ۔ یعنی جب خواہش ہو قرض ادا کیا اور جب موڈ نہ ہو تو قرض دینے والے کو ٹرخا دیا۔

قرض کے مریضوں میں عورتیں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ مرد تو خیر موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں مگر عورتیں تو چھوٹا موٹا قرض کا کاروبار آئے دن کرتی رہتی ہیں۔ کوئی گھر اس سے مبرا نہیں۔ دال، چاول، ہلدی، لہسن، پیاز، ٹماٹر، دھنیا کی پتی، مرچ، مصالحہ سے لے کر ساڑی کا فال، بلاؤز کے کپڑے، ساریاں، بچوں کے فراک وغیرہ تک قرض کے ذریعہ ہی حاصل کرتی ہیں اور شان بے نیازی سے اس کا تذکرہ اپنے پڑوسیوں یا دیگر رشتہ داروں سے کرتی ہیں۔ ہمارے محلے میں خالہ نصیبن پکی ہوئی ترکاری بھی قرض مانگ لیتی ہیں۔

بزرگوں کا مقولہ ہے "قرض محبت کی قینچی ہے"۔ "قرض دوزخ کا دروازہ ہے"۔ "قرض ذلت اور رسوائی کی مال ہے"۔ مگر اب یہ سب مقولے بے جان سے لگتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات کے تحت اب تو قرض ذریعہ محبت ہے یعنی جب قرض کا لین دین ہوگا تو آپس میں ملنے کے راستے بھی بڑھیں گے "قرض جنت کا دروازہ ہے"۔ "قرض عزت و ستائش کا ایک اہم ستون ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ہر آدمی شوق سے قرض لے اور اپنی تمام دبی ہوئی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کرے۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے اپنی ناکام حسرتوں کا گلا نہ گھونٹئے بلکہ قرض لے کر ڈنکے کی چوٹ پر کام لوپا کیجئے۔ قرض وہ جادو ہے جس میں سر چڑھ کر بولنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

قرض "دینے" اور "لینے" دونوں میں بڑی خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ قرض دے کر آپ کسی نامعقول شخص کی رفاقت سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں اگر آپ کسی مطلب پرست دوست، یا رشتہ دار سے پیچھا چھڑانے کے خواہش مند ہیں تو اس شخص کو آپ قرض سے نوازیئے اور پھر قرض وصول ہونے والی بات فراموش کر جائیے۔ آپ کا پیچھا خود بخود اس سے چھوٹ جائے گا۔ یہ میرا آزمودہ نسخہ ہے آپ بھی آزما کر دیکھئے۔ کسی سے "قرض مانگ" کر بھی آپ قرض دینے سے بچ سکتے ہیں۔ میں نے قرض مانگنے والا نسخہ بارہا آزمایا ہے۔ دفتر کے لوگ میرے بارے میں اب یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت کیا خاک قرض دیں گے۔ یہ تو خود ہی قرض لینے کے مہلک مرض میں گرفتار ہیں۔ میرے محلے کے ایک علامہ "ابن الوقت" میرا وقت بہت برباد کیا کرتے تھے۔ میں ان کی اوٹ پٹانگ باتوں سے عاجز آ گیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ میرے گھر پر تشریف نہ لایا کریں۔ لہٰذا ایک دن موقع دیکھ کر میں نے اپنی بچی ضرورت کا بہانہ بنا کر علامہ ابن الوقت سے کچھ روپیوں کا مطالبہ کیا اور انھیں یقین دلایا کہ لڑکی کی شادی طے ہو چکی ہے اور جلد ہی انجام پانے والی ہے۔ جہیز کے لیے رقم اکٹھا کرنا بھی ضروری ہے۔ میرا مطالبہ سن کر علامہ ابن الوقت بہانہ تراشنے لگے پھر بغلیں جھانکنے لگے اور موقع ملتے ہی میرے گھر سے وہ اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ !! ▲

نامور مزاح نگار
پرویز یداللہ مہدی
کے
مضامین
ٹائیں ٹائیں فش
۲۰ روپے

اعجاز وارثی سنبھلی

قطعات

تبدیلی

خود نمائی میں رہا کرتے تھے مرزا پیش پیش — لیکن اُن کا عقد جب اک شاعرہ سے کر دیا
اس قدر بدلے کہ ہر موقع پہ، ہر تقریب میں — آپ پیچھے رہ گئے، بیوی کو آگے کر دیا

ابن الوقت

ملاحظہ ہو یہ قولِ جناب ابن الوقت — گدھے کو باپ بنا لینا اک ضرورت ہے
مزہ تو جب ہے کہ حضرت سے پوچھ لے کوئی — گدھا بنانے میں والد کو کیا قباحت ہے

مکڑیاں اور جالے

رشتۂ استاد و شاگرد اور دنیائے سخن — مکڑیاں گنتی کی ہوتی ہیں، مگر جالے بہت
شعر کہتا ہے کوئی، محفل میں پڑھتا ہے کوئی — ایک کنجی سے کئی کھلتے ہیں یہاں تالے بہت

وائے نصیب

آج بھی دیش کے ہزاروں سپوت — بھوکے مر مر کے ایم۔اے کرتے ہیں
لیکن اُن کے نصیب، وائے نصیب — ایم۔اے کر کے بھی بھوکے مرتے ہیں

حمّام

رشتۂ حمام و عریانی کبھی مشہور تھا — آج یہ ضرب المثل لیکن برائے نام ہے
حسن کا ذوقِ نمائش، الاماں والحفیظ — آنکھیں کہتی ہیں کہ یہ دنیا نہیں، حمام ہے

عرضِ ہنر

کہنے لگے وہ تحت میں سُن کر مری غزل — عرضِ ہنر سے فائدہ، جب تک گلا نہ ہو
کچھ ایسا ہے جناب کا ذوقِ سخنوری — کھانے میں جیسے مرغ ہو لیکن گلا نہ ہو

رزلٹ

مشتہر ہوتے ہی دسویں کا رزلٹ — آرزوؤں پہ جوانی آ گئی
خوش ہیں مرزا اور اہلِ خاندان — لاڈلے کی سپلیمنٹری آ گئی

ڈاکٹر وشیع رحمٰن اکولوی

ٹوپی

ٹوپی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کے اقتدار کی تاریخ۔ ٹوپی کے لیے انسانی گروہوں میں ازل سے تصادم ہوتا آیا ہے۔ اس کے لیے جنگیں ہوئیں، سلطنتیں اجڑیں، قومیں مٹیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے پہلے یہ تاج کی صورت میں شاہوں کے سر پر سوار تھی اب مختلف سیاسی قیادتوں کی علامت کے روپ میں اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ جیسے کانگریسی ٹوپی، جن سنگھی ٹوپی، ریپبلکن ٹوپی وغیرہ وغیرہ۔ شاہی تاج ٹوپی کے عروج کی انتہا تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ تاج کے بغیر کبھی کسی شخص کو باقاعدہ راجا تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کا تخت پر بیٹھ جانا کافی نہیں ہوتا تھا۔ آج وہ تاج ہیں نہ تاجدار مگر ٹوپی کی حکمرانی جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ نومولود بچے کے کان میں اذان دینا ہو۔ بسم اللہ کی تقریب ہو، محفلِ نکاح ہو۔ عبادت گاہ ہو۔ مکتب ہو۔ مذہبی اجتماع ہو۔ پولس یا فوج پریڈ ہو۔ جنازہ ہو یا قبرستان ٹوپی مع اپنی بزرگی و تقدس کے، ہمارے سر پر جلوہ افروز ہے۔

ٹوپی کے عالم وجود میں آنے کے بارے میں سوچتے سوچتے ہم اس نتیجے پر پہنچے یا نتیجے پر پہنچتے پہنچتے ہم نے سوچا کہ ٹوپی کی موجد کوئی خاتون رہی ہوگی۔ زمانۂ ماضی سے خواتین بڑوں کے احترام میں سر پر آنچل یا ساڑی کا پلو ڈالتی آئی ہیں۔ مردوں کے ہاں اس سلسلے میں کوئی اہتمام نہیں پایا جاتا تھا۔ یہی بات کسی خاتون کو اکھری ہوگی جو آگے چل کر ٹوپی کی ایجاد کا سبب بنی۔ ٹوپی کا مونث ہونا بھی ایک ثبوت ہے کہ یہ زنانی ایجاد ہے!

انسان کی تنوع پسند طبیعت اور زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر ٹوپی نے کئی چولے بدلے۔ نزاکت اور نفاست پیدا کرنے کے خیال سے اسے دھاگوں سے بھی بنا گیا۔ اس کا یہ روپ نوجوانوں کو بھا گیا۔ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ ہوا کا گذر ہونے سے گرمی کی پریشانی کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسرے اسے پہننے کے بعد بھی بال اپنی جگہ جمے رہے، بالوں کا اسٹائل اندر سے بھی جھانکتا رہا۔ ٹوپی پہننا ہو گیا اور بال بھی بے ترتیب نہ ہوئے، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

ٹوپی کا ارتقائی سفر درختوں کے پتوں، پرندوں کے پروں سے شروع ہو کر کپڑے سے ہوتا ہوا آہنی خود تک طے ہوا ہے۔ پہلے راجا مہاراجا جنگوں میں اپنے سروں کی حفاظت کی خاطر آہنی خود پہنتے تھے لیکن آج پولس کا ایک عام سپاہی بھی آہنی ٹوپی رکھتا ہے۔ یہ جلسوں اور جلوسوں کے موقعوں پر پولس والوں کو دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے سروں

کی حفاظت سے بے فکر ہو کر لوگوں کے سروں پر ڈنڈے برسائیں۔ ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں لوگ ہی ٹھنڈے ہو جائیں تب بھی مضائقہ نہیں ۔طویل کرفیو کے زمانے میں یہ خود بطور کشکول بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

ہلمٹ بھی ایک آہنی ٹوپی ہے۔ پہلے موٹر سائیکل چلانے والے کے لیے اسے پہننا لازم تھا۔ لیکن بعد میں موٹر سائیکل پر سوار بھی افراد کے لیے اسے لازمی قرار دے دیا گیا۔ کیوں کہ دیکھنے میں آیا تھا کہ حادثات میں ہلمٹ کی وجہ سے چلانے والے کا سر تو محفوظ رہا گر پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی کا سر ہلمٹ کی زد میں آ گیا۔ ہلمٹ پہننے کے یہ فائدے بھی ہیں۔ ــــ سر درد کو بریک لگائے رکھتا ہے۔ اس کی شدت کو کم کرتا ہے۔ گنجا پن چھپاتا ہے۔ اس کی موجودگی میں سر کے بالوں کو خضاب لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح پیسے اور وقت کی بچت ہوتی ہے۔

آدمی کا سوشل اسٹیٹس (SOCIAL STATUS) بڑھتا ہے۔ اس کی بدولت 'موٹر سائیکل اونر' ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ موٹر سائیکل خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ٹوپیوں کی دنیا میں کچھ ٹوپیوں نے اتنا نام پیدا کیا کہ اپنے ملک کی پہچان بن گئیں۔ اس ضمن میں ترکی۔ نیپالی۔ روسی افغانی۔ رومی۔ ہندستانی (گاندھی) اور پاکستانی (جناح) ٹوپی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ گاندھی اور جناح ٹوپیاں جن افراد سے منسوب ہیں وہ ان کے مزاجوں کی غمازی کرتی ہیں۔ گاندھی ٹوپی نرم کپڑے کی ہوتی ہے۔ جناح کیپ کی دیواروں میں سختی لانے کے لیے دفتی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جناح سخت مزاج کے آدمی تھے جبکہ گاندھی جی کا مزاج لچکیلا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ رومی ٹوپی کو وضعدار شرفاء سر چڑھائے رکھتے ۔ اس ٹوپی کی بڑی دھاک تھی۔ اگر کوئی نتھو خیرا یا مراثی یا گالداتی بھی اسے پہن لیتا تو لوگ مرعوب ہو جاتے اسے خاندانی سمجھنے لگتے۔ جب کوئی شخص اس ٹوپی کو پہن کر چلتا تو اس کا پھندنا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر اس طرح حرکت کرتا ۔ جیسے صاحب ٹوپی کی بلائیں لے رہا ہے۔ اس پھندنے کا فائدہ یہ تھا کہ اس کی اچھل کود کو بنیاد بنا کر ٹوپی بردار اپنی چال کی سستی یا تیزی کا اندازہ کر لیتا اور دوسروں کو بھی اس کا اندازہ ہو جاتا۔ اردو شعراء میں غالب کی ٹوپی اپنی نوعیت کی ایک ہی تھی۔ اتنی اونچی ٹوپی کسی اور شاعر کی ہم نے نہیں دیکھی۔ کوئی ہم سے اردو شاعری میں غالب کا مقام پوچھے تو ہم کہیں گے کہ غالب اور دوسرے شعراء کی ٹوپیوں کی اونچائی ناپ لیجیے، اونچائی کا جو فرق نکلے گا اس سے غالب کا مقام واضح ہو جائے گا۔

راجاؤں اور نوابوں میں سکندر اعظم، ٹیپو سلطان، واجد علی شاہ، پیشوا جی وغیرہ کی ٹوپیاں، ٹوپیوں کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہیں۔ بعض پستہ قد حکمراں تو قد کی پستی چھپانے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سرکس کے جوکر کے طرز کی ٹوپی پہنتے تھے۔ جس طرح آج کل اونچی ایڑی کی چپلوں اور جوتوں کا استعمال ہو رہا ہے۔

ٹوپی ہر دور میں عزت و شرافت کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے کسی معاملے میں خاندان کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے تو آدمی اپنی ٹوپی فریق کے قدموں میں رکھ کر اسے اپنی عزت کا واسطہ دیتا ہے۔ یہ آدمی کی بےبسی کی انتہا ہوتی ہے۔ اس پر بھی فریق کا دل نہ پسیجے تو یہ انتہا درجہ کی بداخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ پولس ڈپارٹمنٹ میں کسی سپاہی کو ترقی دی جاتی ہے تو اس کی ٹوپی پر ایک عدد پٹی کا اضافہ ہوتا ہے۔ قدیم معماروں نے تو عمارتوں تک کو ٹوپیاں پہنائی ہیں۔ تاج محل اور دیگر تاریخی عمارات کے گنبد دیکھئے مندر اور مسجد کے میناروں کی بناوٹ کا بغور جائزہ لیجیے آپ

اری بات کے قائل ہو جائیں گے۔ ان عمارتوں کے محرابوں اور دروازوں کے ڈیزائن بھی ٹوپیوں کی یاد دلاتے
ہ۔ مزاروں کے تعویذ کیا ہیں؟ ٹوپیاں ہی تو ہیں! آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ خدا نے بزرگ و برتر نے ٹوپی کو کس قدر
ند مرتبہ عطا کیا ہے؟ یہ سر سے گرتی ہے تو قطب مینار کی بلندی کی تصدیق کرتی ہے۔ سبحان اللہ، اس کی پستی بھی
ندی کا پتہ دیتی ہے۔ برطانیہ کے شہزادے (شاید ایڈورڈ ہشتم) نے ایک عام لڑکی کو ٹوپی پر ترجیح دی تو وہ خود
ب عام آدمی ہو کر رہ گیا۔

بزرگوں کے سامنے ننگے سر آنا بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے۔ اسے بزرگوں کی بے ادبی پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن
بعض حالتوں میں عزت دینے کے لیے ٹوپی اتارنی پڑتی ہے مثلاً پولیس یا فوج کے کسی افسر کی موت پر دوسرے افسران
پنی ٹوپیاں اتار کر مرنے والے کی تعظیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں تو چور ڈاکوؤں کی موت پر پولیس افسران
تعظیماً ٹوپی اتارتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

ٹوپی نے معتوب اردو کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھا اور اسے یہ محاورے عطا کئے ٹوپی اچھالنا یا ٹوپی اتارنا
یعنی ذلیل کرنا یا الفاظِ دیگر اپنی ٹوپی خطرے میں ڈالنا) ٹوپی بدلنا = بھائی چارہ قائم کرنا۔ منہ بولا بھائی بنانا (ننگے بھائیوں
سے دشمنی مول لینا) ٹوپی جس طرح ٹوپی بردار سے متعلق عوام کی رائے کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اچھا
خاصا شریف آدمی ٹوپی ذرا ترچھی پہن لے تو لوگ اس کے کردار کے بارے میں مشکوک ہو جائیں گے۔ ٹوپی مختلف اوقات
میں آدمی کے موڈ کو ظاہر کرتی ہے۔ جب وہ ٹوپی سر سے اتار کر بازو رکھ دے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ کسی کام کی انجام دہی
کے بعد RELAX ہو رہا ہے۔ ٹوپی الٹی پہنی ہو تو اسے عجلت یا بوکھلاہٹ پر محمول کیا جائے۔ بار بار ٹوپی اتارنا کھلانا اس
سے ہوا کرتا جائے تو یہ ذہنی الجھن کی علامت ہوگی۔

ایک ٹوپی خاص نوعیت کی ہے۔ ہر ایک کو اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ آدمی اسے پہننا پسند نہیں کرتا۔ لوگ زبردستی
پہنا دیتے ہیں۔ اسے پہنانا بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ماہر فن آدمی چاہیئے۔ اسے پہننے کے بعد آدمی کو اپنی
حماقت کا احساس ہوتا ہے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ کوئی اسے الو بنا کر اپنا الو سیدھا کر چکا ہوتا ہے۔
اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری مراد بول چال کی اصطلاح "ٹوپی پہنانا" والی ٹوپی سے ہے تو آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔

ٹوپی مونث ہے تو ٹوپ (HAT) مذکر۔ جو سروں کو یورپ کی دین ہے۔ ہندوستان میں اس ٹوپ کا جادو گر
سر چڑھ کر بولا تو انگریزوں نے اسے ہر سرکاری افسر کے لیے لازم کر دیا۔ یہ ٹوپ خاکی کپڑے سے بنا ہوتا تھا۔ اس
کے اندر کی گولائی میں دو لیٹر پانی بآسانی سمویا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک بیلٹ بھی ہوتا تھا جو کنپٹیوں سے ہوتا ہوا
گالوں کو چھوتا ٹھوڑی تک پہنچتا تھا اور ٹوپ کو گرنے سے بچاتا تھا۔ جو لوگ سرکاری افسر نہیں تھے وہ ان ٹوپوں کو
سجا کر خود ساختہ نیم افسر بن جاتے۔ کیونکہ ٹوپ پہننے کے بعد ایک عدد ڈنڈے کی کسر رہ جاتی تھی جو انگریز افسروں
کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ بھیڑ بکریوں کی طرح ہندوستانیوں کو ہانکنے کے لیے بھی ڈنڈا ضروری سمجھتے تھے۔ جس طرح عربی سکھانے
کے لیے بید کی مار ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس ٹوپ کے ذکر پہ شاید آپ کو تاتیا ٹوپے یاد آگئے ہوں۔ اس ٹوپ سے تاتیا
ٹوپے کا اتنا ہی تعلق ہے کہ ان کی حکومت کے خاتمہ کا سہرا انہی ٹوپوں یعنی انگریزوں کے سر بندھا تھا۔

ماضی قریب میں بڑے بوڑھے سروں کو پوری طرح ڈھانپنے کے لیے ٹوپی کو ناکافی سمجھتے تھے اس لیے پگڑی
باندھتے تھے۔ ایک عام آدمی بھی دو عدد پگڑیاں رکھتا تھا۔ ایک ململ کی روزانہ استعمال کے لیے دوسری کوسے کی جسے

شادی بیاہ، تہواروں اور خاص خاص موقعوں پر پہنا جاتا۔ آج کل بھی آثارِ قدیمہ کے زمرے میں آنے والے بزرگ پگڑی باندھ کر وضعداری نبھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں آج بھی کسی شخص کو "پگڑی اوندھا" کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کرتی ہیں۔ پگڑی کے مندرجہ ذیل مصارف ہوسکتے ہیں۔

اسے سرہانے رکھ کر تکیہ بنا سکتے ہیں۔
دعوت میں بطور دسترخوان استعمال کرسکتے ہیں۔
اس میں ہفتہ وار بازار سے ہفتے بھر کا سامان لاسکتے ہیں۔
اس سے جانور کی رسّی کا کام لیا جاسکتا ہے۔
ناٹ چلی جانے پر اسے کمر کے گرد باندھ سکتے ہیں۔
اس کی سیڑھی بنا کر اوپری منزل والی محبوبہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔
زندگی سے جی اُچاٹ ہوجائے تو اسی کا پھندا بنا کر خودکشی بھی کی جاسکتی ہے۔

مالک مکان کرایہ دار سے جو ضمانتی رقم ایڈوانس لیتا ہے۔ پگڑی کہلاتی ہے۔ مکان چھوڑنے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس مل جاتی ہے۔ لیکن اچھے مکانات کی قلت کی وجہ سے یہ موقع بہت کم آتا ہے اور اگر آجائے تو مکان مالک نئے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم لے کر پہلے کرایہ دار کو دے دیتا ہے۔ ایک کی پگڑی دوسرے کے سر چلی جاتی ہے، معاملہ رفع دفع ہوجاتا ہے۔

کچھ ٹوپیاں جن کا ذکر، جن کی مسلّمہ اہمیت و افادیت ہے، یہاں نہ ہوسکا۔ انھیں انسانی زندگی سے خارج کردیں تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ ہوائی جہازوں کا رابطہ کنٹرول روم سے ختم ہوجائے گا۔ کئی امراض کی تشخیص نہ ہوسکے گی پاگلوں کو شاک نہیں دیئے جاسکیں گے۔ گیتوں کی ریکارڈنگ نہ ہوسکے گی۔ وائرلیس سسٹم ٹھپ ہوجائے گا۔ مرہم ٹوتھ پیسٹ اور دوسری دوائیں اپنی ٹیوبوں سے نکل کر بہہ نکلیں گی۔ گپتیاں، خنجر، تلواریں بے نیام ہوجائیں گی۔ قلم کی نب غیر محفوظ ہوجائے گی۔ زمین کے سر سے آسمان کا سایہ اُٹھ جائے گا۔ غرض کہ بڑی افراتفری ہوجائے گی۔ اور ہاں یہ بات بھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ ہماری یہ تحریر بھی تو اسی ٹوپی کی رہینِ منت ہے ——!

■□

نامور مزاح نگار
نریندر لوتھر
کے
انشائیوں کا تازہ مجموعہ!

الف تحاشا

صفحات : ۱۷۴
قیمت : ۱۶ روپے

مطبوعہ: زندہ دلانِ حیدرآباد

شفیقہ فرحت (بھوپال)

چلتے چلاتے

[نامور طنز و مزاح نگار شفیقہ فرحت نے دو تین سال قبل وعدہ کیا تھا کہ وہ شگوفہ
میں کسی مستقل عنوان کے تحت لکھا کریں گی۔ وعدہ وفا کرتے ہوئے اب اُنھوں نے
یہ مضمون عنایت کیا ہے۔ اس ترمیم کے ساتھ کہ وہ مُستقلاً لکھیں گی لیکن ہر مہینہ نہیں۔!
بہرحال ہم سپاس گزار ہیں۔! مدیر]

ان دنوں قسط وار عرف دھارا واہک کا بول بالا ہے۔ اچھی بھلی چیز کو توڑتے ہیں۔ پھر جوڑتے ہیں۔
کہ جوڑ توڑ ہی سب سے مشکل اور عالی فن ہے۔!
لہٰذا ہم نے بھی سوچا کہ کچھ جوڑ توڑ کر ہی لیں۔ اب نہ کی گئی تو کیا اگلے کسی جنم کی آس ہے۔ چلتے بھی ہم مسلسل
رہے ہیں۔ اور اوروں کو چلاتے بھی رہتے ہیں۔
تو "چلتے چلاتے" کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ جب لکھنے کو کچھ نہیں ہوگا دماغ خالی۔ ذہن کند۔ زبان
اور قلم کی سیاہی خشک تو کہہ دیں کہ ہوائی جہاز کسی ہونے ان ہونے حادثے کی افواہ کی وجہ سے رک
گیا۔ گاڑی لیٹ ہے۔ یا ناٹ ہالٹ۔ ابھی حفت۔ ہزار بہانے ہزار باتیں۔
یا یہ کہ چلتے چلتے جوتے پھٹ گئے۔ ذرا کسی اچھے اور خاص قسم کے موچی کا انتظار ہے۔ کہ ان دنوں جوتوں
کا استعمال زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اور زاویے بدل بدل کر۔
اور پھر آگے چل پڑیں گے دم لے کر۔
تو پھر آئیے ہمارے ساتھ۔ دنیا دیکھئے۔ کچھ اِدھر کی کچھ اُدھر کی۔ یعنی تیل دیکھئے تیل کی دھار دیکھئے۔
اپنے گھر تیل نہ ہو (جس کے امکانات زیادہ ہیں) تو تیلی کے گھانے پر جائیے۔ مگر وہاں تیل اور اس کی دھار سے
پہلے آپ کو کولہو کا بیل دکھائی دے گا۔
ٹی وی تصویر اور تقدیر دیکھ کر تو نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ ہے۔! خیر تیلی کا تیل نہ دیکھئے فلاں [illegible]
[illegible] ناٹیری دیکھئے۔ حضرت شیخ کے لاکھوں گیلن کے آئیل ٹینکر دیکھئے۔ مگر اس [illegible]

تو پھر کچھ نہ دیکھئے۔ بس چلئے۔ بغیر دیکھے۔ بغیر سُنے۔ بغیر سمجھے کی جاتی ہے بسم اللہ اس عنوان کی ۔۔!
اس عنوان کے دو مطلب ہیں۔ ویسے بھی آج کل دنیا مطلب کی ہے۔ یعنی ہر کام میں مطلب کے عناصر بڑھا دیئے گئے ہیں۔ الفاظ کم ہوتے جا رہے ہیں اور مفہوم مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسی لیے ایک ایک لفظ کو کئی کئی مطلبوں کی سرپرستی سونپ دی گئی ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک وزیر کے حوالے کئی شعبے کر دیئے جاتے ہیں۔ (یا وزیر شعبوں کے حوالے!) یا ایک ایک امیر۔ ایک ایک کبیر۔ خیر چھوڑیئے۔

تو آیئے مطلب کی طرف۔ گویا مطلبوں کے دوراہے پہ۔ ایک مطلب تو اس عنوان کا یہ ہے کہ چلتے پھرتے بے مقصد۔ بے وجہ۔ یونہی کوئی بات بغیر کوشش۔ بغیر کسی سورس۔ بغیر سفارش۔ یعنی بغیر کسی فارن ہینڈ کے آپ کے کان میں پڑ گئی۔ لو اسے آپ نے "ہستہ شلپ کلا" مندر سے اونچے داموں خریدی (پھیکے پکوان کا کوئی ذکر نہیں) مٹی کی اوبڑ کھابڑ بدرنگ بدوضع رکابی میں سجا۔ تر و تازہ خوش رنگ میٹھے تیکھے الفاظ کی سلاد سے حاشیہ بندی کر کے۔ اوپر سے نمک مرچ چھڑک لیموں نچوڑ آپ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

لیجئے صاحب۔ گناہ ثواب (ص والا صواب بھی چلے گا) سب آپ کی جھولی میں۔ اور گردنِ راوی فروغ دروغ سب سے آزاد ۔۔۔!!

واہ راوی صاحب نہ ہوئے صدرِ مملکت ہو گئے۔ کوئی ہاتھ کو پھندا اس گردنِ بے داغ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔
اور دوسرا مطلب ۔۔۔؟

وہی مقطع اور سخن گسترانہ بات کی رسہ کشی۔ مقطع کا دائرہ آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جائے اور بات سخن گستر سے سخن گستاخ بنتی جائے کہ لکھنے والا بس قلم گھسیٹ دے۔ نہ سوچ نہ بچار۔ نہ فکر نہ فہم نہ قطع نہ برید۔ نہ نوک نہ پلک۔ نہ املا نہ انشا۔ کہ چلتے چلاتے تو بس یہی بے ساختگی ہوگی۔ یعنی RAW CRUDE ART۔ کر سکتے اسی کا چل رہا ہے۔
تو حضرت چلتے چلاتے میں تو پانچوں کیا دسوں انگلیاں گھی میں (بس گھی کا وجود شرط ہے۔!) اور سر۔۔۔
تو اس کی فکر کسے۔ ویسے بھی اب سر ہے بھی کس کا ندھے پر۔

مگر عنوان پر تو کچھ کہا ہی نہیں اور رہگذر تمام ہوئی جاتی ہے (سفر نہیں۔) کہ چلتے چلتے تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ آپ برسوں چلتے۔ چلتے رہتے۔ ایک عمر۔ ایک زمانہ۔ سارا وجود گردِ راہ سے اٹا۔ پاؤں کانٹوں سے لہولہان۔ مگر آپ وہ منزل پہ نہ موڑ پہ ۔۔۔
ویسے چلنے اور چلتے رہنے کا یہی آرٹ اور انداز ہے۔
رہا عنوان۔ تو پھر کبھی سہی۔

ایک بھاری بھرکم شخصیت (دینی دنیاوی ہر اعتبار سے) کو ان سے بھی زیادہ بھاری تقریب میں مدعو کرتے ہوئے منتظمین نے پوچھا۔
"آپ اس عنوان پر کتنی دیر بول سکتے ہیں؟"
کم از کم ایک گھنٹہ۔

اور واقعی وہ گھنٹہ بھر تک عنوان کے ہجّے معنی مفہوم دائرے شوشے نکتے مرکز وغیرہ پر بھر پور روشنی ڈالتے رہے۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ اور روشنی یہاں تک بجا کہ جب وہ پیچھے ہٹے تو خالی ہال کے آخری سرے سے مائیک والا مائیک اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔

سننے والے کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ رہے منتظمین۔ سو ان کی عافیت اور عاقبت خطرے میں پڑ چکی تھی۔ انھوں نے تو سامعین سے پہلے ہی راہِ فرار اختیار کر لی۔

تو چلتے چلاتے ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ کہ آج کی ملاقات بس آئی۔

ملک کے سب سے بڑے صوبے کی راجدھانی کے سب سے قدیم کہ جو کبھی عظیم بھی تھا کالج کا اسپورٹس ڈے منائے جانے کا ناٹک کیا جا رہا تھا وہ اسپورٹس ڈے کہ جو دراصل تھا "آل بھوپال" مگر منتظمین کی ہزار کوششوں کے باوجود آل محلے کے درجے تک بھی نہ پہنچ پا رہا تھا کھیلنے والوں کی بے حسی اور کھانے والوں کی بے کسی کو لاؤڈ اسپیکر کے دَم خم سے چھپانے کے جتن کئے جا رہے تھے۔

"آپ کا کیا ہوگا جنابِ عالی . . . ؟" کے پھر زور پرشور سوالنامے کے ساتھ اناؤنسر کی کمزور سی آواز آئی۔

'CALL FOR 400 MT. RACE'

مگر کون سُنتا۔ اور سُننے کے لیے میدان میں تھا بھی کون۔

پھر نیم مردہ نعرہ لگا 'CALL FOR 400 MT RACE'

دو ایک پیشہ ور نظارہ بازوں نے تعزیتی نظر ڈالی اور عادتاً نظر یں کسی بہتر نظارے کی جانب پھیر لیں۔

مگر یہی اسپورٹس آفیسر کے لبوں پہ مکرّر یہ صدا

'LAST CALL FOR 400 MT RACE'

پھر وہی سناٹا۔ اور بے رُخی۔

ہم نے ان کی چشم نیم بینا میں سُرمۂ حقیقت افزا کی دو ایک سلائی پھیرنے کی کوشش کی۔

"حضور نیا موسم ہے۔ نئی فضائیں۔ نئی ہوائیں۔ لوگ بھوپال سے دلی یعنی پورے سات سو ایک کلومیٹر کی دوڑ لگا رہے ہیں۔ وہ بھی اتنے نیچے اور بے سُرے سُروں میں"

"مگر پروگرام تو اسپورٹس کا ہے ؟"

ہمیں کب انکار ہے جناب۔ پروگرام اسپورٹس کا ہے۔ موسم دوڑ کا ہے۔ سب دوڑ رہے ہیں۔ یہاں وہاں۔ اِدھر اُدھر۔ بلکہ اُدھر ہی اُدھر۔ چھوٹے پیر کے پاس۔ بڑے پیر کے پاس۔ صاحب تدبیر کے پاس۔ مالکِ تقدیر کے پاس۔ اور دلی جو ایک شہر تھا کبھی عالم میں انتخاب۔ وہاں روز ایک دوڑ ہوتی ہے مارتھن ریس۔ آج اس کے ہاتھ مضبوط کرنے ہیں۔ کل اس کے قدم جماتے ہیں پرسوں کسی اور کا سر بچانا ہے۔ تو ان رنگا رنگ کی دوڑوں میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر حصّہ لینے والوں کی بھیڑ بھاڑ کا یہ عالم ہے کہ اب دلی میں دلّی والے نظر نہیں آتے بلکہ سنا ہے وہ دلی سے اپنے مالکانہ اور مالشانہ حقوق سے دستبردار ہو کر دلی ملا آوروں کے حوالے کر کے خودکشی اور سمت ہجرت کر رہے ہیں۔ تو جن جاتی اس 400 MT RACE پیگر ائونڈ ملک بسوں اور ریلوں میں لدلد کے بھاگی دوڑی جا رہی ہے آپکے اس پلے گراؤنڈ پر کون آئے گا۔ وہ بھی کے لیے! چلتے چلتے نظر میں اور بھی بہت کچھ پڑ چکا ہے۔ وہ پھر کبھی ۔۔!!

اسرار جامعی (پٹنہ)

جدید تحقیق

ان دنوں زندہ اشخاص پر تحقیق کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے
مگر اصل موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری باتیں تحقیق کا "میٹر" ہوتی ہیں

سب سے بڑے محقق کرتے تھے یہ تماشا
قبروں سے کھینچتے تھے اردو ادب کا لاشا
سودا کا ہو وہ "غنچہ" اکبر کا یا ہو "جمن"
دگی ہو یا کہ "تگی" تولہ ہو یا کہ ماشا
گہرائی کی نظر سے ہر اک کو دیکھتے تھے
اپنے قلم سے ان کو ہوتی نہ تھی تراشا
ساری پرانی خبریں جب کھود لیں بڑوں نے
زندوں پہ ہو رہی ہے اب مشق بے تحاشا
ان کا بھی "پوسٹ مارٹم" کرنے لگے "رسرچر"
تحقیق کی ہیں زد میں "احمد جمال پاشا"
تحقیق کا ہے "میٹر" دولہا بنے تھے جب وہ
شہنائی بھی بجی تھی یا صرف ڈھول تاشا
سگریٹ کے علاوہ پیتے ہیں اور کیا کیا
کھاتے ہیں "چاکلیٹ" یا مرغوب ہے بتاشا
اخبار خود ہیں پڑھتے پڑھوا کے یا ہیں سنتے
رکھتے ہیں کس رسالے کا آج کل تراشا
"سیوان" میں سکونت جب سے ہوئی ہے ان کی
اردو ہی بولتے ہیں یا بھوجپوری سجاشا
شاعر کمار "پاشی" ہیں مرد یا کہ عورت
"پاشی" تو ہے مؤنث، تذکیر جس کی پاشا
تحقیق کی گاڑی یوں ہی رواں دواں ہے
ہر جامعہ میں ہوتا ہے اب یہی تماشا
حق بات کھل کے کہہ دی اسرار جامعی نے
روئے سخن کسی کی جانب نہیں ہے حاشا

○

پاک فساد

اسرار! ارض پاک میں جب ہو گیا فساد
فریاد سن کے حاکم اعلیٰ نے یہ کہا
حضرات! جن کو مرنا تھا وہ لوگ ہی مرے
یہ "خون کا فساد" ہے میں کیا کروں بھلا

○

ناموزوں

ایک شاعر گا رہے تھے اس سے جو واقف نہ تھے
شعر کا بے وزن ہونا کس قدر معیوب ہے
سن کے یہ اسرار بولے آفریں صد آفریں
"بحر ناموزوں" میں شاعر کی غزل کیا خوب ہے

○

علی عباس اُمید (بھوپال)

قصہ تیسرے درویش کا

تیسرے درویش نے کان سے بیڑی کا ٹکڑا نکالا اور ماچس کے لیے پہلے درویش کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ قریب تھا کہ پہلا درویش آپے سے باہر ہو جاتا لیکن چوتھے نے آگے کھسک کر اپنے لائٹر سے بیڑی سلگا دی۔ تیسرے درویش نے جلدی جلدی دو چار کش لگائے پھر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور بڑی پُرسوز آواز میں یہ اشعار پڑھنے لگا:

بن کے لیڈر اور منسٹر کچھ نمایاں ہو گئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　　پیٹ کے آگے مگر سب طاقِ نسیاں ہو گئیں

اشعار سنتے ہی دوسرے درویش نے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کی داڑھی چوم لی اور گلوگیر آواز میں بولا:

اسی چکر نے مجھ کو بھی کیا ہے در بہ در بھائی　　　وگرنہ تھی چچا غالب سے اپنی بھی شناسائی
کبیر و میر اور ٹیگور تو اپنے ہی گھر کے ہیں　　　رہا ہوں مدتوں بی۔ بی۔ سی۔ شیلے تک کا تماشائی

چوتھے درویش نے سگریٹ کا طویل کش لے کر بھیانک قہقہہ لگایا اور پھر پہلے کو گھور کر کہانی شروع کرنے کی فرمائش کی۔
تیسرے درویش نے بیڑی ایک طرف پھینکی، منہ میں تمباکو کی چٹکی دبائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد کہنا شروع کیا:

میرے لوزائیدہ ساتھیو! اس ذرۂ ناچیز کی داستانِ حسرت بیان کہاں سے شروع ہوتی ہے اسے یہ کمترین خود بھی نہیں جانتا۔ پھر بھی موٹی موٹی باتوں اور بڑے بڑے واقعات و تجربات کو جوڑ کر اس عہد کی کہانی جیسی کوئی چیز بن گئی ہے جسے آپ حضرات کو سنانے جا رہا ہے۔

آج سے صرف پونے چار سال پہلے میں ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ کلرکی سے آپ سب بخوبی واقف ہیں اس لیے تشریح کی چنداں ضرورت نہیں۔ بہرحال خاکسار کی پھٹے حال بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن دفتر کے بڑے بابو نے بلایا، بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور بڑے صاحب کے جعلی دستخط کرنے کا گُر بتایا۔ جب میں اُلٹے سیدھے دستخط کھینچنے لگا تو ایک کاغذ مع نوٹوں کی ایک سبک گڈی کے میری طرف بڑھایا اور دستخط کرنے کا اشارہ کیا۔ ہرچند کہ نوٹ دیکھ کر میرے منہ میں سیلاب آ گیا لیکن شرافت اور ایمان کی ایک نامعقول چنگاری اس وقت تک باقی تھی، اس نے سارا پانی جذب کر لیا نتیجہ میں میرے لیے انکار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ بڑا بابو بہت بگڑا، نیلی پیلی آنکھیں دکھائیں، دھمکیاں دیں لیکن میں اس کے روبرو دو گھڑا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس واقعہ کے ٹھیک ہفتہ بھر بعد دفتر کے بڑے صاحب کی طرف سے مجھے نالائق

کا پروانہ مل گیا۔ میں نے لاکھ گریہ وزاری کی، حلوے مانڈے کا واسطہ دیا لیکن وہ مردِ ناہنجار، بدخوار و بداطوار ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجبوراً میں نے وہ کاغذ ہاتھ میں تھام دوسرے دفتروں کے چکر لگانے شروع کئے۔ لیکن بے فائدہ، جہاں جاتا چپراسیوں کی جھڑکیاں کھاتا اور دور سے ہی "نو ویکنسی" کی دیرینہ تختی دکھا کر واپس کیا جاتا۔ ایک دفتر میں اپنے ایک کلرک دوست کی سفارش لے کر گیا۔ وہاں نوکری کے تذکرے سے پہلے ہی لوگوں نے میری جیب پر ہاتھ ڈالا۔ چونکہ بندے کی اکلوتی قمیض پہلے ہی داغِ مفارقت دے چکی تھی اس لیے انھوں نے بڑے خلوص سے چپراسی کو آواز دی اور مجھے دھکے دے کر باہر نکالنے کا حکم صادر فرمایا اور اپنے کام میں محو ہوگئے۔

چند ہی دنوں میں ہر طرف سے مایوس ہوکر اور حضرتِ شکم کی درندگی سے عاجز آکر میں نے اسٹیشن کا رُخ کیا تاکہ قلیوں میں شامل ہونے کی ٹھانی۔ گاڑی آئی اور سارے قلی اس "لڑکی" پر جھپٹ پڑے۔ میں نے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا رُخ کیا اور جیسے ہی سامان اٹھانے کے لیے جھکا سامان والے کی کڑک دار آواز سنائی دی "ٹھہرو! پہلے یہ بتاؤ تم کیا لوگے؟"

میں بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا، عاجزی سے بولا "جو بھی آپ دے دیں گے لے لوں گا"

ابھی وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ایک دوسرا قلی وہاں آکر کھڑا ہوگیا اور مسافر سے کہنے لگا "صاحب! ایم اے پاس ہوں، ایک سال ریسرچ کر چکا ہوں۔ صرف پچہتر پیسے لوں گا۔ اُٹھاؤں؟"

اتنا سنتے ہی باوجود نقاہت کے میں بی اے پاس تصور میں دُم دبائے باہر بھاگا، مگر گیٹ پر تعینات ٹکٹ چیکر نے پکڑ لیا اور میری خستہ حالی پر رحم کھا کر ایک ماہ کی جیل کرا دی۔ میری اصل داستان جیل سے ہی شروع ہوتی ہے۔ وہاں مجھے بڑے بڑے "فنکاروں" کا ساتھ ملا اور بہت بڑے بڑے گُر سیکھنے کا موقع ملا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں جیل ہی کی بدولت ہوں۔ میں جیل کے اپنے ساتھیوں میں استاد ٹنکو کو کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ ان کی قابلیت اور واقفیت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اتنا مکمل فنکار آج تک مجھے نہیں ملا۔ اس نے معمولی جیب تراشی سے لے کر کوکین فروشی تک کے تمام طریقے مجھے ازبر کرا دیئے۔

خیر تو صاحبو! جیل سے چھوٹ کر میں انتہائی بے فکری کی زندگی گزارنے لگا، بغیر ہلدی پھٹکری کے زیادہ سے زیادہ کمانے اور اچھے سے اچھا کھانے لگا۔ ایک شام ایک بے ڈول کھدر پوش کا پیچھا کرتے کرتے ٹاؤن ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں بہت بڑی بھیڑ اکٹھی تھی اور ایک شخص نشے میں دُھت نشہ بندی کے حق میں تقریر کر رہا تھا۔ اس کی تقریر میں خاص بات یہ تھی کہ ہر جملہ الگ الگ ہوتا تھا، پچھلے کا اگلے سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں اس کے پاس پہنچا اور کان میں جھک کر بولا "حضرتِ مقرر! ایسا بھاشن دینے سے منہ میں چیونگم ڈال کر بیٹھے رہنا زیادہ بہتر ہے۔ ابھی ابھی جو جملہ آپ نے بولا ہے اُس میں عارضی اور مستقل کا استعمال غلط کیا ہے اور اس کے علاوہ آپ خود نشے میں ہیں"

اس پر وہ بغیر مائک پر ہاتھ رکھے بولا "شاید تم گریجویٹ ہو، میں سمجھ گیا۔ میں نشے میں ہوں یہ ایک عارضی بات ہے اور تم جیسے سب بے وقوف ہیں یہ مستقل ہے"

اتنا سنتے ہی چاروں طرف سے لوگ تالیاں بجانے لگے اور میں اپنا سا منہ لے کر جلسہ گاہ سے باہر نکل آیا اور ایک ڈبل بس میں بیٹھ گیا۔

وہ بس کچھ عجیب طرح سے لہراتی ہوئی چل رہی تھی، سارے کے سارے مسافر منہ کھولے ہوئے تھے۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک نیم مرد نے اس سے کہا "سچ سچ آپ بہت ہوشیار معلوم ہوتے ہیں بھی اتنی لاپرواہی

سے بس چلانے کے بعد بھی ہنس رہے ہیں"
یہ سُن کر ڈرائیور نے ڈھائی تین ہارس پاور کا قہقہہ لگایا اور پھر اطمینان سے بولا "تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔
میں اس طرح بس چلانے پر نہیں ہنس رہا ہوں بلکہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میرے اس طرح چلے آنے پر پاگل خانہ
کے نگراں کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے؟" اس کے آگے کچھ سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے چھلانگ لگادی۔
صبح سے کوئی آسامی ہاتھ نہیں آئی تھی اس لیے یونہی بوکھلایا سا گھوم رہا تھا۔ بھوک مٹانے کا تو کوئی انتظام
ہوا نہیں تھا اس لیے میں نے پیاس ہی کو نیست و نابود کرنے کی ٹھانی اور ایک سرکاری نل کھول کر چلو بڑھانا ہی چاہتا
تھا کہ اس میں سے پانی کے بجائے ایک تنومند سیاہ سانپ دست بوسی کو بڑھا۔ میرے دماغ کی ساتوں کھڑکی کے دونوں
پٹ ٹوٹ کر نیچے آرہے اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ چوں کہ پیاس کی شدت تھی اس لیے جمنا کی طرف بڑھا۔
ابھی میں کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ ایک عورت نظر آئی۔ وہ کنارے پر کھڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "بھگوان کے لیے
کوئی دوڑو! میرا شوہر ڈوبا جا رہا ہے۔"
اس کے پاس ہی بندوق کے غلاف میں لپٹے جو صاحب کھڑے تھے وہ بڑی بے لبی سے ہاتھ مل مل کر کہہ رہے
تھے "ونڈرفل، بالکل اوریجنل، بہت ہی اچھا سین ہے لیکن کیا کروں بدقسمتی سے میرے کیمرے میں فلم ہی نہیں ہے۔"
جب تک میں مدد کو پہنچا ڈوبنے والا لہروں میں گم ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان صاحب نے نفرت سے ہونٹ
سکوڑے اور کاندھے اچکا کر حقارت سے بولے "نان سینس، اب بھی تیرھویں صدی میں رہتا ہے، کیسے جائے گا اکیسویں
صدی میں!"
ابھی میں بیسویں صدی میں کھڑا تیرھویں اور اکیسویں صدی کے فرق کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک گیدڑ شہر
کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگا اور چند ہی منٹوں میں اسے جا لیا۔ پاس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔
"نامعقول، کیوں اپنی جان کا دشمن ہوا ہے۔ جانتا نہیں کہ گیدڑ شہر کی طرف کب بھاگتا ہے!"
"وہ ہنسا اور بجائے جواب دینے کے اُلٹا مجھ سے سوال کیا "اگر شہر میں اپنی ہی برادری بسی ہو تو؟"
میں لاجواب ہو کر اسے دو چار ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ بولا "جھگڑنے کی ضرورت نہیں، میرے
ساتھ چلو، خود بھی دیکھ لو گے۔"
اس کی تجویز بُری نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر چلتے ہوئے دو نوجوانوں
میں سے ایک نے کہا "میں تو آئی۔ سی۔ ایس۔ ہوں۔"
دوسرے نے ایک قدم آگے بڑھ کر چھاتی پھلائی "میں نے تو اپنے مزاج کو دیکھتے ہوئے پی۔ سی۔ ایس کی لائن چُنی۔"
میں دیدے پھاڑے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس تو کجا وہ آفس کے
باوردی چپراسیوں سے بھی کئی گنا بدتر دکھائی دے رہے تھے۔ میری کھلی آنکھیں دیکھ کر گیدڑ طنزیہ انداز میں مسکرایا
اور بولا "تم اس بستی کے رہنے والے ہو پھر بھی نہیں سمجھے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
اُس نے کہا "دونوں ہی سچ بول رہے ہیں۔ ایک آئس کریم سیلر ہے اور دوسرا فوٹو چاپ سیلر۔ چوں کہ یہ ذہنی
طور پر سہارے بھائی ہیں، اس لیے صاف کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"
ندامت رفع کرنے کے خیال سے میں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لنگڑے بھ[illegible]ن کو مخاطب کرلیا۔ "بھائی لنگڑ!

ہوتا بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اندھے نہیں ہو، وہ اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔"

لنگڑے بھکاری نے مسکرا کر کہا "شریمان جی! آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ جب میں اندھا تھا تو لوگ مجھے کھوٹے پیسے دے جایا کرتے تھے۔"

گیدڑ نے تمسخر سے میری طرف دیکھا اور میں نے قدم کچھ تیز کر دیئے۔

کچھ دور چلنے پر ایک جگہ بڑی بھیڑ نظر آئی۔ گیدڑ کے مشورے پر اس کا سبب دریافت کرنے کے لیے مجمع میں گھسا، قریب پہنچنے پر دیکھا کہ ایک جانور نما آدمی نے ایک مچھلے مانس کا، جس کے سر سے گاڑھا گاڑھا پانی بہہ رہا تھا، گریبان پکڑ رکھا تھا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ "انصاف کرو۔ اس کمینے نے میری لاٹھی توڑ دی۔ حق بولو، مجھے بدلہ دلواؤ۔"

اس عجیب ترین بات پر مجھے کچھ ایسی حیرت ہوئی کہ بغیر گیدڑ کا خیال کئے میں نے آگے بڑھ کر اس جانور نما شخص سے پوچھا "کیوں جناب! انھوں نے آپ کی لاٹھی کیسے توڑ دی؟"

اس نے پہلے تو پیر سے سر تک مجھے گھور کر دیکھا پھر چنگھاڑا "تم کو اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ اتنی معمولی سی بات سمجھ سکو۔ اِسے اس مردود نے اپنا پہاڑ جیسا سر میری لاٹھی پر دے مارا اور وہ شہید ہو گئی۔"

میں بھاگنے ہی والا تھا کہ گیدڑ نے میرا پچھلا دامن پکڑ لیا اور بولا "شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے اپنوں سے نہیں، بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ کافی چل چکے ہو، اب تھک گئے ہوں گے۔ میں بھی تکان محسوس کر رہا ہوں، بھوک بھی چمک چکی ہے۔ چلو کسی اچھے ہوٹل میں تھوڑی دیر بیٹھیں گے اور کھانا کھائیں گے۔" بھوک اور کھانے کا ذکر سن کر مجھے یاد آیا کہ میری آنتیں پی۔ ایل ۴۸۰ کی گردان کرتے کرتے نیم مردہ ہو چکی ہیں۔

گیدڑ مجھے لیکر ایک آراستہ پیراستہ ریستوران میں داخل ہوا۔ دربان سے لے کر مینیجر تک نے مسکرا کر استقبال کیا۔ گیدڑ نے بے شمار چیزوں کا آرڈر دیا۔ چار بیرے سامان لانے لگے اور ہم دونوں نے کھانا شروع کیا۔ اقسام اور مقدار دونوں ہی لحاظ سے وہ میری زندگی کا "ہٹ" کھانا تھا۔ گیدڑ نے 'بنت عنب' سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ اس وقت تک میں اشرف المخلوقات تھا لہٰذا خاموش بیٹھا اس کو تکتا رہا۔ کوئی دو گھنٹے بعد جب ہم چلنے لگے تو ویٹر نے بڑے ادب سے بل پیش کیا۔ بل دیکھتے ہی گیدڑ آپے سے باہر ہو گیا۔ شور سن کر مینیجر بھاگا بھاگا آیا اور ہنگامے کا سبب دریافت کیا۔ گیدڑ اور بھی زور سے چیخا "میں تم سب کا چالان کرادوں گا، تمہارے یہاں گھی سے لیکر مسالہ اور اناج تک ہر شئے نقلی اور ملاوٹی استعمال کی جاتی ہے۔" ۔ ۔ ۔ ! اس کے کچھ اور بولنے سے پہلے مینیجر نے پاس کھڑے بیرے کی ٹرے سے دو کوفتے نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیئے اور ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے بولا "ہماری عزت آپ کے پیروں میں ہے۔ بزنس کا واسطہ خاموش ہو جایئے۔ اگر اس گھڑی آپ نے ہماری لاج رکھ لی تو ہم آپ کو دو اصیل مرغ سپید نذر کریں گے۔"

وہ گردن اکڑا اکڑا کر بولا "نہیں، میں رشوت نہیں لیتا لیکن ان نامعقول بیروں کو کم از کم اتنا تو سمجھا دو کہ شخصیت دیکھ کر بات کیا کریں۔ یہ سب کے ساتھ آدمیوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

میں بھی اس کی تقلید کرنا ہی چاہتا تھا کہ مینیجر نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور کہنے لگا "تم کہاں جاتے ہو؟ یہ تو نہ تمہارے دادا کے والد محترم کا گھر ہے نہ خیرات خانہ۔ آہستہ سے بل کی رقم نکالو۔"

جب میں نے اپنی بغیر جیب کی قمیض اسے دکھائی تو وہ اپنا 'والیوم' کم کر کے بولا "اچھا تو میں تمہارا نام لکھ لیتا ہوں،

جلد ہی دے جانا۔"
اچانک تبدیلی پر میں متحیر تھا۔ وہ مجھے کاؤنٹر پر لے گیا اور نام دریافت کر کے رجسٹر کے بجائے دیوار پر لکھنے لگا۔
میں اور بھی متعجب ہوا۔ بہر حال شکریہ ادا کر کے چلنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کہا "اپنی قمیص اتار کے اس پر ٹانگ دو، ورنہ دیوار پر نام دیکھ کر لوگ تمہاری عافیت تنگ کر دیں گے۔"
میں نے قمیص اتار نے ہی میں عافیت کی وسعت دیکھی۔ جب صرف پینٹ میں باہر نکلا تو گیدڑ کو اپنا منتظر پایا۔ مجھے خود پر جہالت اور اس پر شہری غصہ آ رہا تھا، اس نے ہر جگہ مجھے شکست دی تھی لہذا اسے مارنے کے لیے بے تحاشہ دوڑا۔ لیکن وہ 'خوش بخت' ایک ہی جست میں سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا اور میں 'بدبخت' اس تک پہنچنے کی کوشش ناکام میں ایک برق رفتار ٹیکسی کی زد میں آ گیا۔
جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، درد کی 'ڈکٹیٹرشپ' قائم ہو چکی تھی۔ میری بغل والے مریض کے پاس کئی آدمی کھڑے تھے، دو ڈاکٹر اس کے جسم کے مختلف حصوں کو بڑی بے چینی سے ٹٹول رہے تھے۔ آخر ایک نے آہستہ سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ یہ اب اس فانی دنیا میں نہیں رہے۔"
یہ سن کر اس کی بیوی زور زور سے چیخنے اور 'لٹ گئی' 'بٹ گئی' 'والا قدیم بین کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نحیف الجثہ مردے نے کروٹ لی اور مری ہوئی آواز میں بولا "منے کی ماں! تمہیں اس طرح اپنا دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے ابھی تو میں زندہ ہوں۔"
وہ عورت چونک پڑی پھر بگڑ کر دہاڑی "ہمیشہ بے تکی بات کرتے ہو، بھلا اتنے بڑے ڈاکٹر جھوٹ کہیں گے؟"
تھوڑی دیر بعد مجھے اسٹریچر پر ڈریسنگ روم لے جایا گیا۔ وہاں کمپونڈر سگریٹ پھونک کر نرس کی عدم موجودگی کے غم کو غلط کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا "چپ چاپ پڑے رہو، جب تک 'ہنی' نہیں آئے گی کوئی کام نہیں ہوگا۔"
کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد نرس صاحبہ خراماں خراماں تشریف لائیں۔ کمپونڈر نے آگے بڑھ کر دُم ہلاتے ہوئے دیر میں آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے لاپرواہی سے اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے جواب دیا "کیا بتاؤں، آج جو ڈاکٹر میرا پیچھا کر رہا تھا اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ یہ وقت ہو گیا۔"
دو ہفتہ بعد جب اسپتال سے نکلا تو بنیان بھی میرے جسم سے غائب ہو چکی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ روزی روٹی کا چکر ہمیشہ آگے رہتا ہے اس لیے تلاش میں چل پڑا۔ کچھ دُور جانے پر ایک بہت بڑے میدان میں ایک عالیشان پنڈال رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجا ہوا نظر آیا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بہت بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ میں نے 'یک کرشمہ دو کاج' پر عمل کرنے کے لیے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بھانت بھانت کے شاعروں کی فوج ڈائس پر آ کر بیٹھ گئی۔ صدر صاحب نے اپنی ساڑھے تین منٹ کی تقریر میں الگ الگ کر بتایا کہ 'پرانی شاعری بالکل اوندھی تھی۔ اگر شاعری کا صحیح لطف لینا اور زندگی کو واقعی سمجھنا ہو تو آدمی کو علاقی شاعری پڑھنی اور سننی چاہیے۔ چنانچہ آج کے مشاعرہ میں سب ترقی پسند شاعر اکٹھا ہیں اور وہ عوام کو اس بہتر صنف سے روشناس کرائیں گے۔ یہ شاعری روح کے علاوہ شاعر اور سامع کے لیے جسمانی طور پر بھی مفید ہے۔"
میں نے بی۔ اے تک اردو ادب پڑھا تھا اور میر، غالب و اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے بالکل ہی ناواقف تھا اس لیے دھڑے کو کچھ دیر ملتوی کر کے شاعری کی طرف توجہ دی تھی۔

کیا عرض کروں — ایک سے ایک رنگروٹ اپنی بے نسل لٹیں سنوارتا ہوا مائک پر آتا اور مجذوب کی بڑ کی طرح نہ جانے کیا کچھ اناپ شناپ بک کر چلا جاتا۔ ایک خاص بات جو میں نے اس مشاعرہ میں دیکھی وہ یہ کہ ہر شاعر کے کچھ مخصوص لوگ تھے جو اس کے ایک ایک لفظ پر با جماعت رونا شروع کر دیتے تھے۔ عوامی داد کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ شعر سن کر لوگ وجد میں آجاتے اور امداد باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کا سر پیٹنے لگتے تھے۔

میری سمجھ میں اور تو کچھ آیا نہیں۔ ایک لہولہان شاعر خنجر زخمی نے "جدید آگہی بہ نام نیا آدمی" کے عنوان سے جو نظم سنائی تھی وہ بطور نمونہ آپ بھائیوں کے گوش گذار ہے۔

بس کے اڈّے پر لگا تھا ناریل کا اک درخت
تھی بہت زنجیر سخت
آگیا واں ایک بلّا
بدنظر، موذی، نکھٹّو
— سخت تھا جوتے کا تلا
دُم دبا کر بھاگ نکلا
میں نے پکڑا بس کا کنڈا اور لٹکتا ہی رہا
ناریل کے پیڑ نے دیکھا مجھے
ہنسنے لگا —
ہنستے ہنستے تین اُنگلی میری جانب کر کے بولا۔
" آئیے ناں آئیے"!
گھنٹیاں بجنے لگیں اور بدلیاں ٹلنے لگیں
رقص میں کھمبے جو آئے بجلیاں چلنے لگیں
میں بڑھا ابھی کی طرف لیکن تبھی
اٹھی اک چیخ
کانوں سے لڑی
آسماں کانپا، زمیں رونے لگی
اور خرد کے خون کی گھنٹی بجی
جاگ کہنہ خواب سے اور کر ترقی کو پسند
گُل کی، بلبل کی، چمن کی، آشیاں کی ٹانگ توڑ
منتظر ہیں، بم، مزائل، زخم و خون
رو ماں چھوڑ
میں نے پوچھا ناریل کا پیڑ بم ہے یا مزائل زخم ہے یا
سرخ خون

ذہن بولا بے ثباتی ہے ثبات
فکر بوگس، عقل سرکش، ہوش ہے لمبی سی رات
شرٹ کو پتلون سمجھو، ہاتھ کو گدھے کی لات
جنگ ہو یا امن دونوں واہیات
زندگی لعنت ہے بولو فا علاتن فاعلات۔

میرے رجعت پرست درویشو! اس نظم کو سُن کر میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں لیکن اسی اثنا میں آنتوں نے نثری باکسنگ شروع کردی اور مجھے دھندے کا خیال آیا۔ میں نے سوچا بھوک اک عذاب ہے۔ ہر چند کہ محفل خراب ہے لیکن موقع ہر اعتبار سے لا جواب ہے۔ بغل میں بیٹھے ہوئے ایک سوٹ بوٹ والے جنٹلمین کا بٹوہ کمال صفائی سے نکال کر چلتا بنا۔ پنڈال سے نکل کر کچھ ہی دُور گیا تھا کہ کسی نے میرے ننگے شانہ پر لوہے کا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی شخص تھا جس کا پرس میری جیب میں تھا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکلنے ہی کو تھی کہ وہ بولا "گھبراؤ نہیں۔ تم میرے دوست ہو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہے چلو پہلے کھانا کھالو۔ لیکن نہیں پہلے کپڑے پہننے ہوں گے ورنہ ہوٹل والے اندر نہیں جانے دیں گے۔"

ایک ریڈی میڈ دکان سے اس نے مجھے انگریزی سوٹ دلایا اور پھر ایک ریستوران میں داخل ہوا۔ مینجر نے کھڑے ہو کر بے حد خاکساری سے اسے سلام کیا جس سے پتہ چلا کہ وہ کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ عمدہ قسم کا کھانا کھانے کے بعد بغیر بل ادا کئے ہوئے ہم باہر نکل آئے۔ باہر پہنچتے ہی اس نے کہا "اب بزنس"۔ میں کچھ بھی نہ سمجھا۔ اس نے پھر پوچھا "بولو، تیار ہو؟" میں نے یہ سوچ کر کہ وہ کوئی بہت بڑا بزنس مین ہے اقرار میں گردن ہلائی اور بولا "جی ہاں! میں گریجویٹ ہوں، پانچ سال تک سرکاری کلرک رہ چکا ہوں"۔ یہ سن کر وہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا "نہیں پیارے نالائق باتیں نہیں۔ میں تو تمہارے ہی بزنس کی بات کر رہا ہوں، وہی جو تم نے کچھ دیر پہلے میرے ساتھ کیا تھا"۔ اس کے بھیانک جبڑے اور خوفناک آنکھوں کی تاب نہ لاکر میں نے اقرار میں گردن ہلادی۔ اس نے کہا "چلو، پہلے تم کو استاد پیر لَلّو شاہ سے ملنا ہوگا"۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم شہر کے باہر قبرستان میں پہنچے۔ وہاں ایک بوسیدہ لیکن کشادہ مکان کے صحن میں ایک بڑے تخت پر مسند کے سہارے عقیدت مندوں کے ہجوم میں ایک ادھیڑ عمر مجذوب فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی وہ گالی بکنے لگتا، کبھی کوئی چیز اُٹھا کر لوگوں پر پھینک دیتا اور مجمع ہو حق کے نعرے لگانے لگتا۔ میرے ساتھی نے اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے کچھ کہا۔ اس نے بے تحاشہ گالیاں بکنی شروع کردیں اور اپنا ڈنڈا اٹھا لیا۔ مجمع آہستہ آہستہ اُلٹے پیروں پیچھے کھسکنے لگا۔ جب سب چلے گئے تو اس نے کھا جانے والی نظروں سے میرا مُنہ لیا پھر بولا "تم پر اعتماد کرلوں"۔ میں نے منہ کے بجائے گردن سے اثباتی جواب دیا۔ پہلے آدمی نے کہا "استاد میں نے اس کا ہاتھ دیکھ لیا ہے، بہت ہی منجا ہوا ہے۔ دوسرے کاموں سے چند ہی دنوں میں اسے واقف کرا دیا جائے گا۔"

للّو شاہ نے مجھ سے کہا "یہ ایمان لوگوں کیلئے اس قبرستان میں بہت جگہ ہے"۔ اور میں نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اس کی تائید کردی۔

پہلا آدمی مجھے لے کر مکان کے دوسرے حصہ میں لے گیا اور صبح تک شراب پی پی کر کام کی تفصیل سے مجھ کو باخبر کرتا رہا۔ صبح ہونے کے بعد اس نے کہا "اب سونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "جب دنیا جاگ چکی تو ہم سوئیں گے"۔
اس نے ہنس کر جواب دیا "جب دنیا سوئے گی تو ہم جاگیں گے"۔
چوں کہ میں کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ چکا تھا اس لیے خوب سویا۔ صبح جب توشاہ کی ٹھوکر نے مجھے بیدار کیا۔
سوٹ والا مجھ کو ساتھ لے کر بازار کی طرف چل پڑا۔ اس نے سارے اڈے اور ان سب کے کرتا دھرتاؤں سے مجھے روشناس کرایا۔ میرے سامنے بہت ہی شاندار مستقبل رقص کر رہا تھا۔ واپسی میں فرطِ عقیدت سے میں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ اس نے کہا "دھیرج دھیرج۔ چومنے کی چیز ڈیرے پر ملے گی" اور واقعی قبرستان والے ڈیرے پر پہنچ کر تو مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پریوں کا محلہ ہتھکا کر لایا ہو۔ ہر طرف شراب و شباب کا سیلاب چڑھا ہوا تھا ــــ میں زرق تا بہ قدم اس سیلاب میں غرق ہو گیا۔

اے میرے بے غرض ساتھیو! تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ مختصراً عرض کیے دیتا ہوں کہ چھ ماہ کے قلیل عرصے میں نہ تو دنیا کا کوئی عیش باقی رہا جو مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو، شاہوں سے بڑھ کر بسر ہو رہی تھی کہ نہ جانے کس عمل خیر کی سزا ملی جو آج تمہارے ساتھ اس تکیہ کو آباد کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ پیر توشاہ سے ایک شخص نے 'بزنس' میں دھوکہ کیا۔ توشاہ اصولوں کا بیحد سخت انسان ہے، منت سماجت کرنے پر بھی وہ پورے طور پر اس کو معاف نہ کر سکا اور سزا کے طور پر اس شخص کا ایک کان کاٹ کر نکال باہر کیا۔ اس کمبخت نے بدلہ لینے کی ٹھانی اور خفیہ پولیس کو چپکے چپکے سارے راز ہائے سربستہ سے بھر دیا۔

ایک رات پیر توشاہ اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا تھا کہ حکومت کا گھیرا تنگ ہوا، باوردی جوانوں نے دھاوا بول دیا۔ توشاہ بڑے جوٹ کا آدمی ہے، ذرا بھی ہراساں نہ ہوا۔ ایک پولیس افسر نے گرفت میں لینا چاہا لیکن اس نے اس انداز میں گفتگو کی کہ وہ بھی ہاتھ جوڑ کر عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔
کہتے ہیں کہ آئی کبھی نہیں ٹلتی۔ اسے بدقسمتی ہی کہیئے کہ توشاہ نے اپنی قابلیت، علمیت اور درویشیت کا سکہ جمایا۔ پولیس افسر یہ نہ برداشت کر سکا اور ساری عقیدتوں اور روحانی خوف کے باوجود اُبل پڑا۔ گرفتاریوں کے بعد تلاشی میں اغوا شدہ لڑکیوں سے لیکر 'اسمیک' اور 'ہیروئن' تک برآمد کی گئی۔ گروہ کے کچھ لوگ گرفتار ہوئے کچھ بھاگ گئے۔ میں بھی گزشتہ تین دنوں سے داڑھی بڑھائے 'وگ' لگائے گھوم رہا ہوں جب تک توشاہ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا چھپ چھپا کر اسی تکیہ میں تم لوگوں کے ساتھ لو لگاؤں گا۔"

داستان ختم کر کے جب اس نے غور سے دیکھا تو تینوں درویش عرقِ پیاز کی مدد سے آنسو بہا رہے تھے۔ وہ ان کی ہمدردی سے بے انتہا متاثر ہوا اور عش عش کرتے کہنے لگا:

داستاں ختم ہوئی دل نہ دکھاؤ یارو
تھک گیا ہوں مجھے سگریٹ تو پلاؤ یارو

لیکن سگریٹ والے نے فوراً ہی یہ قطعہ پڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا:

پیارے درویش عرضِ حال نہ کر
شوقِ ماضی، کو بی کا کمال نہ کر
تکیہ میں گر پناہ لے لی ہو
دوستوں سے کوئی سوال نہ کر"

ڈاکٹر لیئق صلاح
(گلبرگہ)

اگر اور جیتے رہتے ۔ ۔ ۔ ۔ !

لفظ "بس" کے تعلق سے بہت سوچا، لیکن سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر ہم نے خیال کیا کہ یہ اپنے "بس" کی بات نہیں۔ اس مسئلے کو دانشوروں سے رجوع کرنا چاہیئے۔ لہذا انگریزی اور اردو کے اساتذہ کرام کی خدمت میں اپنا یہ عریضہ پیش کیا۔ للہ! آپ ہی ہماری اس مشکل کا حل تلاش کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتے اور ہماری دشواری دور کرتے، دونوں آپس میں اُلجھنے لگے۔ شعبۂ اردو کے دانشور نے اپنے بیان کے جواز کے لیے لغات اور فرہنگوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے خزانے میں تو اس کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ بس، بس بس، بے بس اور بے بسی وغیرہ بتلایئے پھر یہ لفظ انگریزی کا کیوں کر ہوا۔؟

ہم نے بڑے غور سے اُن کی بحث سنی، جو بحث سے تکرار اور تکرار سے للکار، بلکہ یلغار تک جا پہنچی۔ ہر وہ شخص جو اونچی آواز میں دوسرے کو مخاطب کرتا ہے، اپنی دانست میں سمجھتا ہے کہ وہ غالب آگیا اور دوسرے نے یقیناً ہار مان لی۔ لیکن فریق ثانی اس حقیقت کو جان لینے کے باوجود بھی زبانی اقرار کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یہ کوشش کی جاتی ہے کہ خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اور زیادہ گلا پھاڑنا چاہیئے۔ تاکہ فریق اول مان لے کہ ہم سے نبرد آزمائی آسان نہیں عموماً ایسے وقت جگر تھامنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ پتہ نہیں مجز "ا" نے جگر تھا یا نہیں لیکن ہماری سماعت اور ہمارے اعصاب اس قابل نہیں رہے کہ مزید ان کی نعرہ بازیوں سے واقعی سمع خراشی کریں۔ سر چکرانے لگا، کان بالکل بند ہوگئے اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ سامنے ہی دوا خانہ تھا سوچا کہ اس حالت میں گھر پہنچنا ممکن نہیں، بہتر یہی ہے کہ اپنا معائنہ کروالیں۔

سر کے چکرانے سے پریشان ہو کر سیدھا آنکھ کے ڈاکٹر کی سمت چلے۔ انھوں نے مختلف قسم کے شیشے لگائے اور بورڈ کی طرف اشارہ کرکے پڑھنے کے لیے کہا۔ ہم کو سوائے اُن دو چیزوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ بالآخر ڈاکٹر نے بیزار ہو کر کہا، کئی سال سے اس پیشہ سے وابستہ ہوں۔ لیکن اس طرح کے مریض سے مجھے آج تک واسطہ نہیں پڑا۔ میں تو بس، بے بس ہو گیا، ڈاکٹر کے آخری الفاظ پر حالت اور بے قابو ہوگئی۔ جن الفاظ کے سُننے کی تاب ہم میں نہیں تھی، گویا وہ ہمارے تعاقب میں تھے۔ یا اللہ! پیچھا چھڑاؤں تو کیسے؟ اعصابی تناؤ بڑھنے لگا تو آنکھ کے ماہر معالج ڈاکٹر نے یہ تجویز پیش کی کہ دراصل مرض کا تعلق موصوف کے شعبے سے نہیں اور ہیں ماہر اعصاب

کے یہاں جانا چاہیئے۔ میری مرضی دریافت کیئے بغیر ہی، پورے اعتماد کے ساتھ، ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں منتقل کیا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹر نے جب کیفیت سنی تو سیدھے ایکس رے کے کمرے میں بھیج دیا۔ تمام ماہرین متفکر کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ رپورٹیں نارمل، اور ظاہری حالت ناگفتہ۔ جب ڈاکٹروں کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں تو واقعی نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ بیماری کا کچھ اتا پتا نہ چلا تو انھیں اپنی نافہمی کا احساس اور زیادہ ہوا۔ اس لیے وہ ہمیں آزاد کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ پھر ہم کو ماہر قلب کے یہاں بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی نتیجہ صفر رہا۔ موصوف اپنے پیش روؤں سے کسی طرح کم نہیں تھے، بلکہ ان سے بھی آگے تھے۔ جب وہ بھی کچھ سمجھ نہ پائے تو انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس شہر سے باہر جانے کی تجویز پیش کریں۔ گویا انھوں نے اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا کہ مرض کی پہچان ہی یہاں کے ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں، چنانچہ ہدایت دی گئی کہ بیرون شہر جائیں اور وہاں بھی حسب حال نتیجہ برآمد نہ ہو تو بیرون ملک پہنچ جائیں۔ پھر وہاں سے ملک عدم کی تیاری کی جا سکتی ہے۔ بہرحال! ان تمام مراحل سے گزر کر ہم بس اسٹاپ پر آگئے۔ تب معلوم ہوا کہ جس اذیت ناک عذاب سے ہم گزرے، اس کی تفسیر یہاں پنہاں ہے۔ "بس" کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے لوگوں میں بے تحاشا اسی طرح اضافہ ہوتا گیا جس رفتار سے ہندوستان کی آبادی میں ہو رہا ہے۔ اس آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات یا "سیلاب" وغیرہ نہ ہوتے تو پتہ نہیں اور کیا حال ہوتا۔ "بس" کا انتظار کرتے کرتے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم مفکر اور ادیب بنتے جا رہے ہیں۔ معاشیات کے نظریات، تصور کی سطح سے اُبھر کر، آنکھ مچولی نہیں، بلکہ آنکھ میں آنکھ ملا کر دیکھنے لگے۔ وہ جو معاشیات کا ابتدائی درس تھا کہ جب مطالبات زیادہ ہوں تو وسائل محدود ہو جاتے ہیں۔ لاکھ سمجھانے، نوٹس لکھانے اور امتحانی پرچے حل کرنے کے باوجود۔ یہ اصول پلے نہیں پڑتے تھے۔ اور اب شعور اتنا پختہ ہو گیا کہ بھولے ہوئے سبق ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

ہر وہ سواری جس سے ہماری مطلب براری نہیں ہو سکتی، موجود تھی۔ بے حساب لاریاں، فراٹے بھرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اور ان میں بیٹھی ہوئی انسانیت ہماری بے بسی پر دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ نگاہ غلط انداز ڈال رہی تھی۔ لاری تو لاری، جی یہ چاہتا تھا کہ کوئی بنڈی والا ہی کم از کم ہم پر نظر عنایت کرے۔ ہمارا تو اب یہ عالم تھا کہ بحیثیت مجرم پولیس کی ویان یا مریض کی حیثیت سے ایمبولنس میں بیٹھنے کے لیے بھی تیار تھے۔

بس کو دور سے آتی ہوئی دیکھ کر سوکھے دھانوں پانی پڑنے لگتا ہے۔ تمام مرجھائے ہوئے کمھلائے ہوئے چہرے تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے آپ، پہلے آپ کی شائستگی کا اب کیا ذکر۔ زمانہ بدل گیا، ایسی شائستگی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اب تو نفسا نفسی کا عالم ہے، بلکہ قیامت کا فتنہ بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ "بس" میں سوار ہونے کے لیے، ایک لانبی قطار، مکوڑوں اور چیونٹیوں سے بھی زیادہ تعداد پر مشتمل ہوتی ہے اور اندر داخل ہونے کے بعد تو بس، یوں محسوس ہوتا ہے کہ چھوٹے سے ٹفن میں بے حساب سینڈوچیں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "بس" کا انتظار کرنے والوں میں "الف لیلوی" داستان کے کرداروں کی طرح مختلف ہستیاں ہوتی ہیں۔ جن کی شخصیتوں کی طرح، اُن کی کہانی بھی منفرد ہوتی ہے۔ ان میں کوئی کلرک ہوتا ہے جو صبح دیر سے اُٹھنے کی پاداش میں، اور صاحب کی ناراضگی کے خوف سے ناشتہ نہیں کر پاتا، طرفہ تماشا یہ کہ ٹفن بھی ساتھ رکھنا بھول جاتا ہے۔ موصوف پہلی تاریخ ہی کو اپنی مہینہ بھر کی کمائی بیگم کی نذر کر دیتے ہیں۔ اب جیب خرچ پر گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ کبھی کسی نے چائے پلا دی تو یوں محسوس ہوا کہ گویا قارون کا خزانہ

بل گیا۔ ایسا شخص سوچتے کہ کتنی رقم اپنی جیب میں روزآنہ رکھتا ہوگا! کبھی مجبوری کے عالم میں دل کھول کر اپنے آپ پر کچھ صرف کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو پلٹ استقلال کی لغزش ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نازک لمحہ ہوتا ہے جب دوسرا ساتھی بھی چائے پینے کی حامی بھر لیتا کینٹین تک پہنچتے ہوئے یہ فکر کہ "وڈا" کھائیں تو کیا تحریک آنے کا "اِڈلی" سستی رہے گی یا "اُپما"۔ "دوسہ" کے تعلق سے تو سوچنا ہی بیکار ہے۔ کاش سرکار! فاقہ زدوں کی طرح ملازمین سرکار کے لیے بھی میڈڈے میل کا انتظام کرواتی۔ ساتھی اگر موصوف سے مخاطب بھی ہو تو ان کا حال حاضر، غائب کی طرح ہوتا ہے۔ ساری باتیں واقعی ایک کان سے ہو کر دوسرے سے نکل جاتی ہیں۔

بس اسٹانڈ پر لوگوں کا ہجوم بعضوں کے لیے بہت سود مند ہوتا ہے۔ ٹھیلے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں یہاں ٹھہرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔ بیوپاری یہ گرم بازاری دیکھ کر مارکٹ کا گمان گزرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تماشا دکھانے والے بس اسٹانڈ کو ہی اکثر اپنا مرکز بناتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ تماشا دکھلانے والے کا وجود اس میں گم ہوگیا۔ نہ وہ نظر آرہا تھا اور نہ اس کے کرتب۔ جب بس قریب آئی اور ہم اس تک پہنچنے کی کوشش میں آگے بڑھے تو دیکھا کہ وہاں سپیرا ہے، اور سانپ پھن نکالے ہماری طرف آگے بڑھ رہا ہے۔

کنڈکٹر اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین، اور اہم شخص سمجھتا ہے۔ اس لیے بورڈ نہیں بدلتا۔ لوگ خوش فہمی میں غلط فہمی کا شکار ہو کر غلط بس میں جا بیٹھتے ہیں۔ نتیجتاً نہ منزل اُن تک پہنچتی ہے اور نہ وہ منزل تک۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کنڈکٹر نیچے ہی رہتا ہے اور بس چل پڑتی ہے۔ وہ بس پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو ڈرائیور سبقت لیجانے کی۔ ڈپو کو واپسی کی رفتار کا اندازہ تو ہم مولوی صاحب کے اس مقولہ سے لگاتے ہیں کہ وہ ایسے آڑے وقت، ایک کی بجائے دو یا تین بار آیۃ الکرسی پڑھا کرتے ہیں۔

ایک صاحب شہر سے باہر ایک شادی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ جوں جوں سیاہی پھیلتی گئی موصوف کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ وقفہ وقفہ سے کنڈکٹر سے دریافت کرتے رہے کہ بس مقررہ وقت پر پہنچے گی کہ نہیں۔ ان کے اس سوال کا بار بار جواب دیتے ہوئے وہ تنگ آگیا اور اُن کی بے چینی کا سبب دریافت کرنے لگا۔ موصوف نے بتلایا کہ انھیں شادی میں شریک ہونا ہے تب کنڈکٹر نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا حضور! بس تو ٹھیک وقت پر پہنچے گی لیکن قاضی صاحب کب تشریف لائیں گے؟

کنڈکٹر کے اس جواب سے ہمیں اندازہ ہوا کہ بس اور بے بسی میں کتنا فرق ہے!

▭ ▭

نامور مزاح نگار یوسف ناظم

کے مضامین کا مجموعہ!

البتہ ۱۰ روپے

توسط شگوفہ حاصل کیجیے

دلیپ سنگھ

غزل

کہتا ہے کس پارٹی کا ہے نہیں ہے نام یاد
کس امید پہ جس نے دیئے اُس کو کہیں گے زندہ باد

ل دہلی پہ اقبال کا قومی ترانہ پھر بجا
پھر کہیں شاید ہوا ہے فرقہ وارانہ فساد

اس قدر تبدیلیاں کیسے نمایاں ہو گئیں
ایک سال اور چھ مہینے لیڈری کرنے کے بعد

ناقد اس عقدے کو حل کرنے سے پہلے مر گیا
حال کیا ہوگا ادب کا میرے مرجانے کے بعد

عشق کا پودا پنپتا ہے دلِ معشوق میں
پھر ذرا سی ڈالیے اس میں اگر دولت کی کھاد

ہاتھ میں دو بوتلیں جب دیکھ لیں تو میرے دوست
بن گئے اشعار میرے خود بخود کتنے پُرکردار

○

ظفر رضوی کاکوی
(بہار)

شوہرنامہ

○

شدّاد ہے شوہر کبھی نمرود ہے شوہر
بیوی کی نظر میں گر امرود ہے شوہر

ہندی میں جو بیگم ہے تو اردو میں ہے بے غم
شاید اگر زوجہ ہے تو مشہود ہے شوہر

سجدے کے لیے حکم اگر ہوتا کسی کو
معبودِ مجازی بھی ہے مسجود ہے شوہر

اس دورِ پُر آشوب میں دیکھا ہے تماشہ
ہوشیار اگر زن ہے تو مجذوب ہے شوہر

اب نار کا ناری کا کوئی معنیٰ بتا دے
آتشکدۂ زیست کا وہ دود ہے شوہر

ہر گھر میں چلا کرتی ہے بیگم کی حکومت
اس کارگہِ ہست میں لولا لبد ہے شوہر

لعنت بڑھی جاتی ہے جہیز اور تلک کی
نادار کی بیٹی ہوئی مفقود ہے شوہر

ہوتی ہے ضعیفی میں سہارے کی ضرورت
بیگم ہے جواں کہتی ہے بے سُود ہے شوہر

بیگم سے ظفر میں نے کبھی اکثر یہ سنا ہے
شیطان ہے شوہر مرا مردود ہے شوہر

○

محمد رفیع انصاری
(بھیونڈی)

کتاب

بچپن میں ہم کتب فروشوں کے یہاں، لائبریریوں میں، دانشوروں کے ہاتھوں میں موٹی موٹی کتابیں دیکھ کر حسرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہوتے اور سوچتے کہ کاش ہم بھی کتابوں سے لدے پھندے ہوتے۔ جب بڑے ہوئے تو کتابوں سے کچھ رسم و راہ ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ سب سے پہلے ہمیں درسی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ کتابیں معیاری جماعتوں کی ہوا کرتی تھیں۔ یعنی جب ہم پانچویں جماعت میں تھے تو آٹھویں اور نویں جماعتوں کی اردو کی کتابیں مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی سناتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب کتاب خواں ہونا بڑی بات نہیں تھی۔ صاحب کتاب ہونا ضرور کمال تھا۔ اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ آج صاحب کتاب ہونا کوئی کمال نہیں، الٹا وبال ہے۔ جگر لخت لخت کو جمع کیجئے۔ خون دل جلائیے۔ کتاب چھپوائیے اور تا عمر اپنی تقدیر کو روئیے کہ یہی احسان و سلوک ہے۔

ہاں! تو جب ہمارا شوق کتب بینی پروان پڑھنے لگا تو ہم نے کتب خانوں کی سیر کی۔ دوستوں سے دلچسپ و عجیب کتابوں کی بابت دریافت کیا۔ اپنے کرم گستروں سے کتابیں ادھار لیں اور انھیں سینے سے یوں لگا لیا جیسے وہ ہماری متاع گم شدہ ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم سرے سے کتابیں ہی نہیں خریدتے تھے۔ آج بھی خریدتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر کتابوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو ہم دوسروں کی کتابوں کے ساتھ روا رکھتے رہے ہیں۔ "دراصل کسی سے کتاب مستعار لے کر اس کی واپسی کا مشکل سے سوال پیدا ہوتا ہے"، یہ بھی سچ ہے کہ کتابیں خریدنے والے قابل بھروسہ لوگوں ہی کو کتابیں دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے لین دین پر کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی۔ اگر کچھ حجت و تکرار ہوتی بھی ہے تو کتاب پڑھنے کے بعد۔ مثلاً ایک کتاب اگر چار دانشوروں نے پڑھی ہے تو اس پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے اکثر وہ اس نازک مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انھیں خود پر قابو نہیں رہتا۔

علمی، ادبی، تنقیدی اور فلسفیانہ کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ صرف حوالے کے لیے ہوتی ہیں۔ ایسی کتابیں شوق سے خریدی ضرور جاتی ہیں، پڑھی نہیں جاتیں۔ لوگ ایسی کتابوں سے بہت بچتے ہیں۔ کبھی سامنے آ جائیں نظر ہٹا لیتے ہیں۔ اس قسم کی کتابیں خاص خاص موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں۔ جیسے بڑی جماعتوں کے امتحانات کے دوران یا ریسرچ ورک کرتے وقت۔ لوگوں کے ناروا سلوک کے سبب بہت جلد یہ کتابیں کمیاب ہو کر بڑے بڑے کتب خانوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

لائبریریوں سے کتابیں گھر لے جاکر پڑھنے والے کتابوں کی درگت بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ لائبریریوں کی کتابوں میں جگہ جگہ آپ کو زمودات رقم کئے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ قارئین کرام کے زریں خیالات ہوتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے کسی جملے پر جب ان بالغ نظر قارئین کی طبیعت قابو سے باہر ہو جاتی ہے تو ان کا قلم تعریفی کلمات اگلنے لگتا ہے۔ اور اگر کوئی جملہ طبعِ نازک پر گراں گزرتا ہے۔ تو اُسے یوں کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے کہ جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

کتابوں پر انتساب بھی لکھا جاتا ہے۔ یعنی مصنف اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کرتا ہے جنگلی جانوروں سے متعلق ایک کتاب کو مصنف نے اپنے چہیتے ہاتھی کے نام معنون کیا۔ ایک شکاری نے اپنی روداد کو اپنے پالتو کتے کے نام منسوب کرتے ہوئے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔

برسوں پہلے ہم نے ایک کتاب دیکھی تھی۔ اس کے مصنف سے ہمیں آج تک ہمدردی ہے۔ اس نے انتساب کچھ یوں لکھا تھا۔

"میں اپنی اس کتاب کو اپنی بیوی اور بچوں کے نام منسوب کرتا ہوں کہ جن کی مدد اگر شاملِ حال نہ ہوتی تو میں اس کتاب کو آدھی مدت سے بھی پہلے مکمل کر لیتا"۔ یعنی جس کتاب کو انھیں دو سال سے بھی پہلے مکمل کرنا تھا اس کی تکمیل میں چار سال لگ گئے۔ اس کی جو وجہ انھوں نے بتائی ہے۔ اس میں کچھ سچائی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان سے ہمدردی ہے۔

آج کل وہ کتابیں عام ہوتی جارہی ہیں جنھیں پڑھنے والے اپنے والدین ہی کو نہیں بلکہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی خبطی سمجھنے لگتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے کہ یہ کتابیں قابلِ ضبطی کیسے ہو سکتی ہیں، جب کہ انھیں نونہالانِ قوم کی حمایت حاصل ہے۔ بچوں سے تو بادشاہ تک ہار جاتے ہیں۔ ہم آپ تو صرف عوام ہیں۔

ایک صاحب ایسے جیل خانے میں گئے جہاں کم عمر قیدی بند تھے۔ جب اُن صاحب نے نوجوانوں سے خیریت و عافیت دریافت کی تو سب نے یک زبان ہوکر کہا۔ ۔ ۔ اور سب تو ٹھیک ہے بس ہمیں جاسوسی ناول منگوا دیجئے۔ یہاں بڑی گھٹن ہوتی ہے۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ اس گرانی کے دور میں کتابوں کی قیمتیں بھی حد سے زیادہ بڑھی ہیں۔ اس بات کی سب سے زیادہ شکایت اردو کے قارئین کو ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے بیشتر کو کتابیں خرید کر پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ہمارے یہاں ایسے لوگ خال خال ہیں جو کتابیں خرید کر پڑھنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ پطرس بخاری اس رمز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے جب اُنھوں نے اپنی کتاب لکھی تو اس کے صفحۂ اول پر صاف صاف تحریر کر دیا۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور اگر آپ نے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں"

ہر صاحبِ قلم کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں صاحبِ کتاب ہو جائے۔ لیکن اس میں بڑا رسک (RISK) ہے۔ یہ معاملہ بہت دنوں سے زیرِ غور ہے کہ قلم کار آیا قبل از مرگ صاحبِ کتاب ہونے کا اعزاز پائے یا بعد از مرگ۔ مگر اس کی کوئی گیارنٹی نہیں کہ کسی مرحوم کی کتاب کی پذیرائی بھی ہوگی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اہلِ نظر اور صاحب الرائے اپنے قلمکار دوستوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی

تخلیقات کو کتابی شکل دے دیں۔ اس مشورے کے متعلق بے حد غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر کسی قلم کار سے انتقام لینا ہو تو اُسے صاحبِ کتاب ہونے کا لالچ دے دیا جائے۔ کتاب چھپتے چھپتے وہ صاحب، بھلے ہی نہ رہیں مگر کتاب ضرور بن جائیں گے ایسی کتاب جو دوسروں کے لیے درسِ عبرت ہوگی۔

قلم کاروں کو چاہیئے کہ وہ ایسے مخلص دوستوں سے ہوشیار رہیں۔ □□

دُلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند دوپٹہ!
دلہن سب سے زیادہ جن کپڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کپڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اس کے علاوہ
ہمارے شو روم کا کثیر اسٹاک:
بنارسی سلک ساڑیاں — تنچوئی — ساٹن — جارجٹ — آرگنزا — ٹشو — شفان — پٹولہ — بروکیڈ — دھرماورم — کانجی ورم — پوچم پلی — نارائن پیٹ — میسور کریپ — ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل۔
خصوصی کاؤنٹر:— میاچنگ کے بلوز، دوپٹے، کرتے اور فالس۔
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے۔ ایچ۔ زری والا
لاڈ بازار، حیدرآباد ۲۔ کیبل "زری والا"
Phone: 525232

غزل

شیخ و برہمن بیٹھے مل کر باہم، ہم تو چونک پڑے
دیکھ کے اِن دونوں کو خوش و خرم، ہم تو چونک پڑے

بیچ سڑک پر اپنی دھن میں مست رواں تھے ہم یارو
اتنے پاس سے گذری اُن کی ٹم ٹم، ہم تو چونک پڑے

مچھر بھی جس نے نہ مارا ہوگا اپنے جیون میں
دے دیا اُس نے ہم کو اُلٹی میٹم، ہم تو چونک پڑے

نیند کی بس آغوش میں جاتے ہی والے تھے شور ہوا
چھوڑ دیا کمبخت نے وہ ایٹم بم، ہم تو چونک پڑے

حضرتِ شیخ اُڑائیں چھپ چھپ مدیرا اتنی چاہت سے
اور برہمن کھائے مُرغِ مُسلّم، ہم تو چونک پڑے

اُردو، ہندی ہر اسکول میں ساتھ پڑھائی جائیں گی
ایسی خبر محبوب اُڑی ہے جس دم، ہم تو چونک پڑے

محبوب ماتھوئی بلاسپور، ایم پی

ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، دکن

ہے شگوفہ یہ مہکتا ہے گُلِ تر کی طرح
حیدرآباد سے چمکا ہے یہ خاور کی طرح

ہے بجا کہیئے اِسے طنز و مزاح کا مخزن
قدر میں کم یہ نہیں لعل و جواہر کی طرح

کامیابی کے کئی گاڑ چکا ہے جھنڈے
بڑھتا ہی جاتا ہے جیتے ہوئے لشکر کی طرح

آندھیاں کتنی مخالف تھیں مگر کچھ نہ ہوا
ہے یوں ہی سایہ فگن شجرِ تناور کی طرح

فخر کیوں کر نہ کریں اہلِ دکن اِس پہ مُدام
مصطفےٰ نے ہے تراشا اِسے آذر کی طرح

ہند اور پاک میں ہر سُو ہے اِسی کا چرچا
الغرض پھیلا ہوا ہے یہ سمندر کی طرح

اس کے صفحات پہ آتے ہیں نظر ایک سے ایک
نیلے آکاش پہ چھائے مہ و اختر کی طرح

آتے ہیں سب کو نظر اہلِ قلم، دانشور
اس کے صفحات پہ بکھرے ہوئے گوہر کی طرح

قہقہوں کا کہیں دریائے رواں ہے اس میں
ہے کہیں طنز بھی چبھتے ہوئے خنجر کی طرح

ہے دعا سارے زمانے میں اسی شان کے ساتھ
یہ مہکتا ہی رہے زلفِ معنبر کی طرح

یوں ہی پھیلاتا رہے روشنیٔ علم و ادب
یوں ہی روشن یہ رہے ماہِ منوّر کی طرح

اس پہ یارب نہ پڑے چشمِ خزاں کا سایہ
یوں ہی شاداب رہے ایک گُلِ تر کی طرح

گوپی چند نارنگ | خامہ بگوش کے قلم سے | کشور ناہید

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لِسانیات ہی کے نہیں

لَسّانیات کے بھی ماہر ہیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے تنگ مزاج نے بھی مانا ہے جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں۔ اپنے بارے میں اس لئے نہیں سوچتے کہ مسلمات پر بحث کرنا ان کی عادت نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ماہر لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند نے بھی عطا کی ہے جو خود اس میدان کے شہسواروں میں سے ہیں اور شہسوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جید عالم کو بھی اپنے توسنِ لسانیات کی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلے میں وہ معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر نارنگ لِسانیات ہی کے نہیں، لَسّانیات کے بھی ماہر ہیں۔ تقریر ایسی کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ دو تین سال پہلے پاکستان ٹیلی ویژن سے موصوف کا ایک طویل انٹرویو دیکھا اور سنا تھا۔ ہمیں خوشی ہوئی تھی کہ ٹیلی ویژن سے کوئی تو ڈھنگ کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا۔ نارنگ صاحب کی گفتگو بڑی عالمانہ تھی۔ ان کا جو علم گفتگو سے ظاہر نہ ہو سکا، وہ ٹیلی ویژن کیمروں کی تیز روشنی اور گرمی کی وجہ سے پسینہ بن کر پیشانی سے ظاہر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس گفتگو کا ہی فیضان ہے کہ اب ہم بھی اپنا شمار اہلِ علم میں کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں اپنا علم ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ہماری کالم نگاری سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، ہم اس پر اس لئے نادم نہیں ہیں کہ یہ اخفائے علم کا ایک ذریعہ ہے

ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت کا ظاہری حُسن بھی بے مثال ہے۔ اگر وہ ادب کی بجائے فلم کی طرف چلے جاتے تو اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہ ہوتا۔ ایک ضمنی فائدہ یہ ہوتا کہ وہ دہلی کے بہت سے اُردو کے استادوں کو بہتر روزگار دلوا دیتے۔ ڈاکٹر صاحب اگر دو پونے دو سو سال پہلے دنیا میں تشریف لے آتے تو آج ہمارے پاس میر تقی میرؔ کی غزلوں کے چھ نہیں سات دیوان ہوتے۔ رشید حسن خاں ساتویں دیوان میں بہت سا الحاقی کلام شامل کر کے اسے مرتب کرتے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لیتے جو ان کے تو کیا، کسی بھی معقول آدمی کے کام نہ آتی۔

ڈاکٹر نارنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اُردو کے بے لوث سپاہی ہیں۔ آج ساری اُردو دنیا میں انھیں عزت کی نظر سے اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ وہ اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے عملی ذہنی طور پر شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اُردو کا کام ہو، یہ وہاں پہنچ جاتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ کراچی کی انجمنِ سادات امروہہ کے مشاعرے میں بھی [illegible]

میں تامل نہیں کرتے، حالانکہ اس مشاعرے میں شرکت کے بعد مصحفی والے اس "امروہہ پن" سے زندگی بھر چھٹکارا نہیں ہوتا جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں کیا ہے۔

اگر وہ ادب کے بجائے فلم کی طرف چلے جاتے تو

اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہ ہوتا

ڈاکٹر نارنگ کے علمی و ادبی کارنامے بے شمار ہیں اور اتنے وزنی ہیں کہ ہمارا کالم اس بوجھ کو اٹھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ جس کاغذ پر چھپتا ہے، وہ خاصا کمزور ہے۔ لہٰذا ہم صرف ایک تازہ ترین کارنامے کا ذکر کرتے ہیں جس کا تعلق اردو کی درسی کتابوں سے ہے۔ ہندوستان کی قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیقات نے اردو کی درسی کتابیں تیار کرنے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی ڈاکٹر نارنگ کی سربراہی میں قائم کی تھی۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں تین کتابیں شائع ہوئی ہیں جو چھٹی، نویں اور گیارھویں جماعتوں کے لئے ہیں۔ ان کے مرتبین اور مؤلفین میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر ثریا حسین اور خود ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے ادیب شامل ہیں۔ یہ کتابیں اپنے مواد اور پیشکش دونوں کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہیں اور بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس نوعیت کی خوبصورت اور خوب سیرت درسی کتابیں اردو زبان میں پہلی بار شائع ہوئی ہیں ان میں ایسی منتخب تحریریں شامل کی گئی ہیں جن سے طالب علموں میں زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا ہوا ہوگا۔ لفظوں کے معنی بھی وہی لکھے گئے ہیں جو ہونے چاہئیں نہ کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی مرتبہ درسی کتابوں کی طرح "خلا" کے معنی "آسمان" اور "سراکٹے" کے معنی "کوڑیاں" بتائے جائیں۔

ان کتابوں کے چھپتے ہی ہندوستان کے بعض اخبارات میں کچھ لوگوں نے ڈاکٹر نارنگ پر الزام لگایا کہ انہوں نے ہندوستانی نصابی کتابوں میں پاکستانی مصنفین کو شامل کرکے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ان کتابوں میں جن پاکستانی مصنفین کی تحریریں شامل کی گئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مولوی عبدالحق، مشتاق احمد یوسفی اور ناصر کاظمی، معترضین کی بصارت اور بصیرت کی داد دینی چاہیئے کہ وہ اردو کی درسی کتابوں سے ان اکابر کو محض اس لئے خارج کرنا چاہتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہیں کل معترضین یہ بھی کہیں گے کہ تاج محل کو دیکھنا ہندوستانی قومیت کے جذبے کی منافی ہے کیونکہ شاہجہاں نے اسے ایک پاکستانی کی زیرِ نگرانی تعمیر کرایا تھا جس کا نام احمد معمار لاہوری تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کی خدمات کے اعتراف میں حال ہی میں علی گڑھ کے رسالے "الفاظ" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے جسے ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر نارنگ کے علمی و ادبی کاموں اور شخصیت پر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گیان چند، فضیل جعفری اور مغنی تبسم وغیرہ نے مضامین لکھے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "پیارے گوپی چند نارنگ، دنیا مجھے اور آپ کو دوست سمجھتی ہے لیکن کچھ لوگ ہمیں رقیب بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چلئے مجھے اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیونکہ ہم دونوں ہی عروسِ اردو کے دلدادہ ہیں اور جب معشوق ایک ہو اور عاشق دو تو رقابت کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔ جب آپ کی کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو مجھے رشک آتا ہے کہ کاش یہ میں نے لکھی ہوتی۔ کبھی میری بھی کسی ٹوٹی پھوٹی تحریر کو دیکھ کر آپ کا بھی جی للچاتا ہوگا۔"

یہ پڑھ کر ہمیں ایک واقعہ یاد آگیا ۔ بلاتشبیہہ عرض ہے ۔ ایک مرتبہ حبیب جالب نے ناصر کاظمی مرحوم سے کہا "جب کبھی آپ کی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں، دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی" ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا ۔ کچھ دیر بعد حبیب جالب نے پوچھا "میری غزل دیکھ کر آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے ؟" ناصر کاظمی نے کہا ۔ "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہی کے نام سے چھپی" ۔

"الفاظ" میں سب سے دلچسپ مضمون طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا ہے ۔ وہی مجتبیٰ حسین جنھوں نے اپنے ہم نام ایک پاکستانی نقاد کو یہ ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے کہ اب موصوف کی تنقیدی کتابوں کو بھی لوگ مزاحیہ کتابیں سمجھ کر پڑھتے ہیں اور مایوس ہوتے ہیں ۔

مجتبیٰ حسین کے مضمون کے دو ٹکڑے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

پروفیسر نارنگ کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے نظر آتی ہے وہ یہ کہ اُردو کے مصروف ترین اُستاد ہیں ۔ ان بارہ تیرہ برسوں میں جب بھی انہیں دیکھا کسی نہ کسی کام میں مصروف پایا ۔ مرہٹی میں ایک کہاوت ہے، گھوڑے کو بیٹھی ہوئی حالت میں دیکھا نہیں جاسکتا ۔ کام کے معاملے میں پروفیسر نارنگ بھی گھوڑے کی سی طاقت رکھتے ہیں ۔ گھوڑے کی بات میں نے اس لیے کی ہے کہ پروفیسر نارنگ میں کام کرنے کی جو توانائی ہے اس کو ناپنے کیلئے "مین پاور" کی جگہ "ہارس پاور" کی اصطلاح بھی ضروری ہے ۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو وہ نہ کرتے ہوں ۔ کام چاہے گھر کا ہو یا یونیورسٹی کا، ادب کا ہو یا کلچر کا، ہر کام یکساں خلوص اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں ۔ اپنے شاگردوں کی رہنمائی یہ کریں گے، ادیبوں کو گمراہ یہ کریں گے ۔ ادبی محفلوں میں تقریر یہ کریں گے، تقاریب کا اہتمام یہ کریں گے ۔ ریڈیو پر بھی سنائی دیں گے، ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی دیں گے ۔ دوستوں کی خانگی تقاریب میں یہ حصہ لیں گے ۔ شادی میں یہ موجود ہوں گے، جنازہ میں یہ شریک ہوں گے، یونیورسٹیوں کی سلکشن کمیٹیوں میں یہ موجود ہوں گے ۔ سرکاری مشاورتی کمیٹیوں میں یہ شامل کئے جائیں گے ۔ آج بمبئی میں ہیں تو کل حیدرآباد میں ہوں گے ۔ حیدرآباد سے نکلیں گے تو بنگلور میں جا نکلیں گے یا لکھنؤ میں جا براجیں گے ۔ بعض دفعہ انہیں دہلی سے بمبئی جانا ہو تو سیدھے بمبئی نہیں جائیں گے بلکہ براہ لندن بمبئی جائیں گے ۔ لندن بھی سیدھے نہیں جائیں گے بلکہ براہ ٹوکیو، لاس اینجلس، وسکانسن، واشنگٹن، شکاگو اور ٹورانٹو ہوتے ہوئے لندن جائیں گے ۔ دہلی سے بمبئی جانے کے لئے پروفیسر نارنگ کا شارٹ کٹ یہی ہے ۔

پروفیسر نارنگ کو دیکھ کر آپ صحیح معنوں میں خوش ہونا چاہتے ہوں تو انہیں تقریر کرتے ہوئے دیکھئے اور استطاعت ہو تو سُنیئے بھی، میں ان کی تقریر کا قائل بھی ہوں اور قتیل بھی ۔ جب بولنے کھڑے ہوتے ہیں تو لگتا ہے پوری اُردو تہذیب بول رہی ہے ۔ لہجہ کی شائستگی و حلاوت، اس کا اُتار چڑھاؤ، استدلال کی معقولیت، لفظوں کا انتخاب، خیالات کی فراوانی، بولنے کی روانی، ان سب کے امتزاج کا نام پروفیسر نارنگ کی تقریر ہے ۔ ہمارے ہاں ایسے مقرر تو بہت ہو سکتے ہیں جو بولتے ہیں تو لگتا ہے پھول جھڑ رہے ہیں، پروفیسر نارنگ بولتے ہیں تو منہ سے صرف پھول ہی نہیں جھڑتے بلکہ پھل بھی جھڑتے ہیں ۔ یعنی جو باتیں وہ کہتے ہیں وہ کارآمد، پُر مغز اور مفید بھی ہوتی ہیں ۔ اُردو والوں کے حصہ میں پھول بہت آچکے، اب پھل بھی آنے چاہئیں ۔ ہوا میں باتیں کرنا پروفیسر نارنگ کو نہیں آتا ۔ جذباتی باتوں سے گریز کرنے کے باوجود ہر جملہ پر سامعین کی تالیاں وصول کرتے جاتے ہیں ۔ نہایت نپی تُلی، سوچی سمجھی بات کرتے ہیں ۔ وہ اپنے واضح، صاف اور کھلے ہوئے استدلال اور تنقیدی بصیرت کے ذریعہ ذہن کی گرہیں

کھولتے چلے جاتے ہیں۔ موضوع ان کی تقریر میں پہنچ کر خود بخود نکھرتا، سنورتا اور بنتا چلا جاتا ہے۔ لفظ اور خیال میں ایک ایسی گہری مطابقت ہوتی ہے کہ مسئلہ خود بخود حل ہونے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ گتھیاں خود بخود سلجھنے لگ جاتی ہیں۔ ان کی تقریر کو سننا بھی ایک خوشگوار اور انوکھے تجربے سے کم نہیں۔ میں نے انہیں بعض لوگوں کی اشتعال انگیز تقریروں کے بعد بھی خیال انگیز تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ تہذیب اور شائستگی کا دامن ان کے ہاتھ سے آج تک نہیں چھوٹا۔ ■■

وہ بے مثال شاعرہ بھی ہیں اور پُرکشش متنازع شخصیت بھی

کشور ناہید جہاں ایک طرف بے مثال شاعرہ ہیں، وہیں دوسری طرف ایک پُرکشش متنازع شخصیت بھی ہیں۔ ان کے گرد روایتوں کا ایک ایسا ہالہ نظر آتا ہے جس کی بناء پر انھیں دیومالائی کردار کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان سے ان کے معاصرین کا رویہ عجیب وغریب ہے۔ کوئی انھیں جھانسی کی رانی کہتا ہے اور کوئی بھولن دیوی۔ کشور ناہید نے عورتوں کے حقوق کے لئے جو جدوجہد کی ہے، اس کے پیش نظر ایک مشہور شاعر اپنی بیگم کو ان سے پردہ کرواتے ہیں، اور اسی وجہ سے ایک دوسرے شاعر خود ان سے پردہ کرتے ہیں۔ لیکن کشور ناہید ان سب باتوں کی پرواہ نہیں کرتیں اور اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ اور کام یہ ہے۔ شعر کہنا، نثر لکھنا اور ان دونوں کی پیوندکاری سے نثری نظمیں تیار کرنا، گویا وہ کلام موزوں اور کلام ناموزوں دونوں میں طاق ہیں۔

کشور ناہید کی شاعری کی طرح ان کی باتیں بھی ہمیں بے حد پسند ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ شاعری تو کبھی کبھی ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے، لیکن باتیں سر تک پہنچنے سے پہلے ہی دل پر اثر کرجاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں کشور ناہید کے تین انٹرویو پڑھنے کو ملے ہیں۔ ایک ماہنامہ "کتاب نما" دہلی میں، دوسرا ڈیلی "اسٹار" کراچی میں اور تیسرا روزنامہ "جنگ" لاہور میں۔ یہ تینوں انٹرویو دلچسپ بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ کشور ناہید کا اندازِ گفتگو بے باکانہ ہی نہیں والہانہ بھی ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی جارحانہ بھی ہوجاتا ہے۔ فکر انگیز اس لئے کہ جب وہ ادب اور زندگی کے مسائل پر اظہارِ خیال کرتی ہیں تو خود ادب اور زندگی لاینحل مسئلے بن جاتے ہیں۔

یوں تو یہ تینوں انٹرویو اس لائق ہیں کہ ان سے لفظاً لفظاً استفادہ کیا جائے، لیکن کالم میں اتنی گنجائش ہے نہ ہم میں اتنا حوصلہ۔ بہرحال خاص خاص باتوں کا ذکر ہم کئے دیتے ہیں۔ جو ہم سے زیادہ حوصلہ رکھتے ہوں وہ اصل انٹرویو دیکھ لیں۔

محترمہ سے رائٹرز گلڈ اور اکادمی ادبیات کی کارکردگی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے ان دونوں اداروں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار نہایت بے رخی سے کیا۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ دونوں ادارے ادیبوں کو انعامات سے نوازتے ہیں، اس لئے ان کے قیام سے ادیبوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ محترمہ نے فرمایا۔ "ویسے تو بہت سے لوگوں کو زکوٰۃ فنڈ سے بھی فائدہ پہنچا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ہیروئین کی اسمگلنگ سے بھی فائدہ پہنچا ہے۔ اگر آپ کا ماٹو "کسی قیمت پر بھی فائدہ" ہے تو مجھے اس پر اعتراض نہیں۔

گلڈ کا شمار تو خیر اب متروکاتِ سخن میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے انعامات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی لیکن اکادمی ادبیات

کے انعامات کے بارے میں اس قسم کا اظہارِ خیال ہمیں پسند نہیں آیا۔ خاص طور پر یہ بات انتہائی قابلِ اعتراض ہے کہ ایک ادبی انعام سے ہونے والے فائدے کو اسمگلنگ کے فائدے سے تشبیہہ دی جائے۔ اسمگلنگ کرنے والے سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں

کشور ناھید نے عورتوں کے حقوق کیلئے جو جدوجہد کی ہے اسکے پیشِ نظر ایک مشہور شاعر اپنی بیگم کو اُن سے پردہ کرواتے ھیں

جبکہ ادبی انعام حاصل کرنے والے خوبیٔ قسمت یا خوبیٔ روابط کی وجہ سے سرخرو ہوتے ہیں۔

محترمہ کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ اکادمی ادبیات سینئر شاعروں کے مقابلے پر جونیئر شاعروں کو انعام کا مستحق قرار دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ادب کے معیار کا خیال رکھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ادب کو انعام ملتا ہے۔ اس کے جواب میں اکادمی ادبیات کے ہمدردوں کا یہ بیان ہم تک پہنچا ہے کہ ادب کے معیار کا خیال تو وہ لوگ بھی نہیں رکھتے جو ادب تخلیق کرتے ہیں۔ صرف انعامات سے محروم رہنے والے ادب کے معیار کی بات کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں اکادمی کے ہمدردوں کا جواب ادب کے معیار سے تو کیا، عام اخلاق کے معیار سے بھی گرا ہوا ہے۔ کشور ناہید نے اعتراض اس لئے نہیں کیا کہ پروین شاکر کی بجائے خود ان کو، امجد اسلام امجد کی بجائے منیر نیازی کو اور محسن احسان کی بجائے قتیل شفائی کو انعام ملنا چاہیے تھا بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ انعام دیتے وقت کسی شاعر کی مجموعی کارکردگی کے ساتھ ساتھ اس کی عمر کا خیال رکھنا ہی کافی ہے۔ مجموعی کارکردگی کی شرط غیر ضروری ہے کیونکہ ہمارے علم میں کوئی سینئر یا جونیئر شاعر ایسا نہیں ہے جو اپنی مجموعی یا جزوی کارکردگی کی وجہ سے انعام کا مستحق قرار پائے۔ ہاں اگر کارکردگی سے مراد مشاعروں میں شرکت ہے تو پھر یہ انعام ہر سال عطاء الحق قاسمی کو ملنا چاہیئے کہ موصوف پانچ غزلیں لکھ کر پانچ سو مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔

مشاعروں کا ذکر آ گیا ہے تو یہ سن لیجئے کہ کشور ناہید اس سلسلے میں بھی خوش نہیں ہیں۔ فرماتی ہیں: "مشاعرے کے ادارے کو مبتذل کرنے میں ہم شاعروں کا اپنا ہاتھ ہے۔ ... مشاعروں میں ہمارے بہت سے شعراء گزشتہ تیس برس سے اپنا پرانا کلام سنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعرے کا لطف کم ہو چکا ہے۔ ابلاغ کی ضرورت ہے کہ آپ ہر بار نئی بات کریں۔ ایک نیا پیغام دیں۔ ... شاعروں نے بھی خود کو تولنا شروع کر دیا ہے اور یہ رویّہ اختیار کیا ہے کہ انھیں کس مشاعرے سے زیادہ پیسے ملتے ہیں اور کھانا کیسا ملے گا۔"

قطعِ نظر اس سے کہ شاعروں نے مشاعرے ہی کو نہیں شاعری کو بھی مبتذل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ محترمہ نے جو کچھ فرمایا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ شاعروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مشاعروں میں ایک ہی جیسا کلام سنانے کی بجائے ہر بار نئی بات کریں اور نیا پیغام دیں، ہرن پر گھاس لادنے کے مترادف ہے۔ شعرائے کرام کشور ناہید کی طرح خواتین کے حقوق کی جدوجہد میں حصّہ تو نہیں لیتے جو ان کے خیال میں غیب سے مضامین آئیں اور ان کے پاس نئی باتوں اور نئے پیغاموں کا ختم نہ ہونے والا ذخیرہ ہو۔ ان بے چاروں کے پاس تو ہجر و وصال اور لب و رخسار کے دو چار مضامین ہیں۔ انھیں کو الٹ پلٹ کر باندھتے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی ان سے توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

محترمہ کشور ناہید کی یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ شعرا پیسوں اور کھانے وغیرہ کا خیال چھوڑ دیں اور شاعری

کے معیار کو بلند کریں۔ یہ نہایت ناعاقبت اندیشانہ مشورہ ہے۔ کھلاڑی اور گویّے وغیرہ بھاؤ تاؤ کے بغیر اپنی اہلیت تو کیا نا اہلیت کا بھی مظاہرہ نہیں کرتے اور شاعروں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیں، اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ ان بے چاروں کے ذہنوں پر پہلے ہی پتھر پڑ چکے ہوں۔

جب وہ ادب اور زندگی کے مسائل پر اظہارِ خیال کرتی ہیں تو ادب اور زندگی لاینحل مسائل بن جاتے ہیں

کشور ناہید کو یہ شکایت بھی ہے کہ۔ "بہت سے ایسے لوگ جو کچھ بھی نہیں ہوتے، اپنی شناخت کے لئے اپنے اوپر ادیب کا لیبل چسپاں کرکے اس مراعات یافتہ اور پُرکشش طبقے میں شامل ہو جاتے ہیں اور کئی مفادات اور ترجیحات حاصل کرتے ہیں"۔

ہمیں معلوم نہیں کہ محترمہ نے ادیبوں کے طبقے کو "مراعات یافتہ" اور "پُرکشش" طبقہ کیوں کہا ہے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے بعض لوگوں نے ادیب بن کر اکادمی ادبیات کے معذوروں کے فنڈ سے وظیفے لئے ہیں، یا پھر انتقال سے کچھ دیر پہلے امدادی رقم کے چیک وصول کئے ہیں جو بوجہ انتقال کیش نہ ہو سکے۔ ورنہ عام طور پر ہم نے اس طبقے کو پریشان حال ہی دیکھا ہے۔ باقی رہی لیبل چسپاں کرنے والی بات تو آج کل کے ادیب تخلیقی کاموں پر اتنی محنت بھی نہیں کرتے جتنی لیبل چسپاں کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ ہر ہے اس صورت میں اپنے اوپر ادب کا لیبل چسپاں کرلے والے اس کے مستحق تو ہیں کہ ان کی محنت کی داد دی جائے۔

کشور ناہید نے غیر ادیبوں کے ادیب بن جانے پر اظہارِ ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا۔ "اس بدعنوانی پر بندھ باندھنے کی ضرورت ہے۔ سوشلسٹ ممالک اور امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں ہر اس شخص کو جس کے ہاتھ میں قلم آجائے یا کسی تک بند کو ادب کو ادب، تاریخ، ادبی قواعد و ضوابط اور ادبی محاکات کے بارے میں تین سالہ کورس پاس کرنا پڑتا ہے"۔

ہمیں محترمہ کی اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ ادیب یا شاعر بننے کے لئے امتحانات پاس کرنے کی کڑی شرط عائد کرنا نہایت نامناسب ہے۔ ہمارے ہاں ادب سے جو لوگ دلچسپی لیتے ہیں ان میں زیادہ تر تلمیذ الرحمٰن قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان بے چاروں کو محبوب کی خاطر بے شمار امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے، لہٰذا ان پر مزید کسی امتحان کا بوجھ لادنا صریحاً ناانصافی ہے۔

شعر و ادب کے معاملے میں اگر امریکہ یا سوشلسٹ ممالک کی تقلید کی گئی تو سوائے کشور ناہید کے شاید ہی کوئی تین سالہ کورس پاس کر سکے۔ اس کا ناخوشگوار نتیجہ یہ ہوگا کہ دیگر اشیائے ضرورت کی طرح شعر و ادب کے لئے بھی ہمیں دوسرے ملکوں سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ ہم لے دے کے ایک ادب ہی کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ کشور ناہید چاہتی ہیں یہ امتیاز بھی چھن جائے۔

کشور ناہید نے بہت سی باتیں، اپنی ذات کے حوالے سے بھی کی ہیں۔ ان میں سے بعض بلا تبصرہ ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔ بلا تبصرہ اس لئے کہ کشور ناہید کی ہر بات پر تبصرہ کرنا ہمارے بس میں نہیں۔

"ایک فقرہ، مجھے اس عمر میں بھی جس کے سننے سے کوفت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہائے آپ کتنی اسمارٹ، کتنی ینگ ہیں۔ میں جب یہ سنتی ہوں تو کہتی ہوں کہ مجھے اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ بڑا لگنے

کا مرض ہے۔ میری اپنی جو عمر ہے، وہ میں ہوں۔ تو جس فلرٹیشن کے شوق میں ہماری نسل کا ہر مرد مبتلا ہے، اس کی اپنی گرسنگی صرف لفاظی تک محدود ہے، تو وہ بھلا کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ اس کے تجربے میں وہ باتیں نہیں ہیں جن کو بیان کرنے کی تھوڑی سی ہمت کرتی ہیں ...."

".... پہلے میں سمجھا کرتی تھی کہ عورت جب چالیس سال کی ہوجاتی ہے تو اس کے ساتھ دو تین باتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اسکینڈل ختم ہوجاتے ہوں گے۔ دوسرے اس کی SENSATION ختم ہوجاتی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ لوگ قبول کرلیتے ہوں گے کہ ہاں بھئی یہ ایک فرد ہے، چلو بھئی اس کو مان لو۔ لیکن اب اندازہ ہوا پینتالیس برس کی ہو کے کہ جب تک سانس ہے، اس وقت ان ساری چیزوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔"

"جب ادیب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ہمارے یہاں ایک طریقہ ہوتا ہے کہ عورتیں ایک طرف ہوتی جاتی ہیں اور مرد ایک طرف ہوتے جاتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ جہاں مرد بیٹھے ہوتے ہیں، ان کے درمیان جاکر بیٹھوں اور دو چار عورتوں کو بھی کہوں کہ بیٹھو۔ اس سے نہ کسی کی مردانگی جائے گی نہ کسی کی نسوانیت مجروح ہوگی۔" ■■

-:- -:- -:-

---

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف! اور ہزاروں کی دل پسند چائے

ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب

لاسا اسپیشل چائے

لمسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی

لاسا سوپر بلنڈ ٹی

■ ہیڈ آفس :- نیلگری ٹی ایمپوریم، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد، اے پی۔ انڈیا

رفیع احمد (مالیگاؤں)

شگوفے

کیسے کہہ دوں اُس کا خط آتا نہیں
ایسا لکھتا ہے پڑھا جاتا نہیں

کہہ گیا تھا صبح دم "آتا ہوں میں"
شام ہونے آئی پر آتا نہیں

حلوہ سازی ہم نے سیکھی اس لیے
وہ سوائے حلوہ کچھ کھاتا نہیں

صلح اب بیگم سے کرنی ہے مجھے
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں

عاشقوں پہ ظلم ہے کب سے روا؟
کوئی لیڈر پوچھنے آتا نہیں

چارسُو پھیلے ہوئے ہیں رہنما
راہ لیکن کوئی دکھلاتا نہیں

ہے کلیدِ کامرانی بس "عمل"
رہنما "بھاشن" سے باز آتا نہیں

بھوک ہڑتالوں سے عاجز آ گئے
ہم سے اب لیڈر رہا جاتا نہیں

شعریت باقی رہی نہ نغمگی
فلمی گانوں میں مزہ آتا نہیں

اب جہیزوں میں تصرّف کتنا ہے
ٹی۔وی بن بیوی کوئی لاتا نہیں

ہے رفیع اِستادہ مجھ سے بدگماں
میری غزلیں بھی کبھی گاتا نہیں

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

فاعِ + لات

ایک ہی رٹ ہے کہیں دن ہو کہ رات
فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

گھر کی صورت دیکھ لینا پھر کبھی
اس گھڑی ہے "واہ وا" کل کائنات

پانی پانی تم پکارو دوستو
ہم نے ٹھانی ہے کہ دیں بہروں کو مات

ہر ڈیزائین، ہر کلر کے رہنما
بارشیں لاتی رہیں گی اپنے ساتھ

دل، جگر، گردہ مرے محبوب کا
واہیات و واہیات و واہیات

کیا بھروسہ ہے گدھوں کا، ہاشمی
جانے کب یہ جھاڑ دیں تم پر بھی لات

محمد عبدالقادر
(بنگلور)

تالیوں کی زبان

اس کہاوت کا تعلق رانی سے نہیں نوک رانی سے ہے۔ یہ عام نہوتے ہوئے بھی آم کا مزہ رکھتی ہے۔ کہاجاتا ہے کہ "باندی سب کا منہ دھلاتی ہے لیکن اپنا ہی منہ دھونا بھول جاتی ہے"۔ اپنا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ احوال یہ ہے کہ پامسٹری یعنی ہاتھ کی لکیروں کے علم میں دخل در معقولات کرتے ہوئے تیس پینتیس سال گزر گئے، ہزاروں ہاتھوں کی لکیریں پڑھ ڈالیں لیکن اپنے ہی ہاتھ کی لکیریں پڑھنا بالکل بھول گئے۔ اب اچانک خیال آیا کہ چلو دیکھیں کہ ہمارے ہاتھ کی لکیریں کیا بولتی ہیں۔ بند مٹھی کھلی، ہتھیلی پر نظر ڈالی تو ہتھیلی مسکرا کر بولی:

"حضور آپ کی نظرِ کرم کا شکریہ۔ چلو دیر سے ہی سہی کچھ تو ہمارا خیال آیا کہ ہم بھی آپ کے ہمراہی ہیں اور آپ کا سایا ہی نہیں ہمسایہ بھی ہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ آج آپ کو پتہ چل گیا کہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ آج کل حال چال یہ ہے کہ لوگ ہمسائے سے ہی نہیں اپنے سائے سے بھی دُور بھاگتے ہیں۔ اب ہمسائے کی زبان کو کون پوچھتا ہے۔ سب کو اپنی اپنی بولی ٹھولی کی فکر پڑی ہے لیکن لوگ جانتے ہیں کہ ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہم جب بولنے پر اتر آتے ہیں تو طوفان بپا کر دیتے ہیں اور ایسا طوفان کہ ہر ایک کی بولتی بند کر دیتے ہیں۔ ہماری آواز اس قدر ہنگامہ پرور اور شور پرور ہے کہ ہر بندہ پرور ہماری داد کا طلبگار رہتا ہے کیونکہ ہماری زبان میں کئی سو بولتوں کا نشہ ہے۔ ہماری زبان کا نام ہے "تالیاں" جو ساری زبانوں میں قدیم ترین زبان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے پہلے انسان کا پہلا اظہارِ خیال تالیوں کے توسط ہی سے ہوا۔

"اردو زبان کی طرح ہماری زبان کا بھی کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے اور اردو زبان کی طرح ہماری زبان کا کوئی مذہب بھی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر مذہب، ہر علاقے اور ہر زبان کے لوگ ہماری زبان دل سے استعمال کرتے ہیں۔ کسی جبر یا دباؤ کے تحت نہیں ویسے تو جبر اور لالچ کے تحت زبان سیکھنا اور بولنا تو عام قاعدہ ہے۔" دنیا میں صرف ہماری زبان ہی ایسی ہے جو آسانی سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہم پیدائشی شاعر کی طرح پیدائشی طور پر سیکولر واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے سیکولرزم میں ملاوٹ ہے نہ نمائشی سجاوٹ، نہ دکھاوٹ اور نہ ہی کوئی کھوٹ بیٹ۔ ہمارا ہر ادا خالص جمہوری ہے اور مزاج بین الاقوامی ہے۔ ہم فیرفاکس کمپنی کی طرح جاسوسی پر زندہ نہیں ہیں بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم گفتار ہی کے غازی نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔ چنانچہ جب کبھی کسی ایک فریق کو شک شبہ

کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو غیر جانب دار اور انصاف پسند حضرات ہمارا ہی سہارا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: "تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی"۔

بین الاقوامی مزاج و کردار کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم جب کبھی اظہارِ مسرت کرنا چاہتی ہے تو وہ بلا تکلف تالیاں بجاتی ہے۔ انفرادی خوشی کا موقعہ ہو کہ اجتماعی مسرت کی واردات تالیوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بیرونی ممالک کے سربراہوں کا استقبال ہو کہ ہمارے سربراہوں کا بیرونی ممالک میں خیر مقدم، زبانیں نہ جاننے کے باوجود بڑی گرمجوشی کے ساتھ تالیوں اور پھولوں سے ہی کیا جاتا ہے۔ تالیوں کی زبان تمام زبانوں میں سرفہرست دکھائی دیتی ہے۔ اس کے چاہنے والے مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ تالیوں کی زبان انتہائی آسان اور عام فہم ہے۔

تالیاں اظہارِ خوشنودی کے علاوہ دلوں کو گرمانے اور حوصلہ بڑھانے میں کارگر ہوتی ہیں۔ ایوانِ پارلیمان ہو کہ اسمبلی کا ایوان، الکشن کا پلیٹ فارم ہو کہ احتجاجیوں کے جلسے، ادبی و ثقافتی اجلاس ہوں کہ مشاعرے کی محفلیں، رقص و سرور کی سبھائیں ہوں کہ نور و نغمات کی تقریبیں اگر سامعین تالیاں نہ بجائیں تو یہ سارے ایوان، یہ سارے پلیٹ فارم یہ ساری محفلیں اور ساری تقریبیں سونی سونی ہو جائیں۔ تالیاں کھیل کے میدان میں وہ گل کھلاتی ہیں کہ ساری دنیا کے ٹی۔ وی کے منہ پر رونق آ جاتی ہے۔ تالیاں کھلاڑیوں کا دل بڑھانے میں وہ جادو جگاتی ہیں کہ ان کا کھیل یادگار بن جاتا ہے۔

تالیاں جب تیر و نشتر چلانے پر مائل ہوتی ہیں تو ان کا انداز فوجیانہ ہوتا ہے جیسے فوج مارچ پاسٹ کر رہی ہو۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو تالیوں کے سُر تال کورس CHORUS میں بدل جاتے ہیں۔

اگر کسی جلسے میں مہمانِ خصوصی کی آمد میں تاخیر ہو جائے تو تالیوں کا جلال دیکھنے کے قابل ہوتا ہے خوش بختی سے وہ جلسہ کسی کالج کے لکچر ہال میں ہو تو معزز سامعین کا پیمانۂ صبر چھلکنے لگتا ہے۔ اس وقت تالیوں کا کورس CHORUS شروع ہو جاتا ہے۔ اور بانیانِ جلسہ کی رگوں میں لہو جمنے لگتا ہے۔ آج کل تالیوں کے کورس کی وبا پھیلتے پھیلتے آل انڈیا مشاعروں میں بھی داخل ہو گئی ہے۔ اکثر آل انڈیا مشاعروں میں مقامی شعراء کو ہوٹ اوٹ کرنے کے لیے یہی نسخہ استعمال ہونے لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ روم کی حکومت نے تالیاں بجانے کو بدتمیزی پر محمول کرتے ہوئے قانوناً جرم قرار دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کھیل تماشے بے جان ہو گئے، محفلیں سونی سونی ہو گئیں، سینٹ ہال پر ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ غرض سیاسی، سماجی، ثقافتی، و تہذیبی زندگی بے دلی و بے حسی کا شکار ہو گئی۔ حوصلے ٹوٹنے لگے، مسابقت کا جذبہ مفقود ہو گیا۔

واہ واہ مشاعروں ہی کی نہیں ہر محفل کی جان ہوتی ہے۔ واہ واہ ہندوستانی تہذیب کا شاندار ورثہ ہے لیکن انگریزی تہذیب کی وجہ سے وہ اپنا چولا بدل رہی ہے۔ اب اس کی جگہ تالیوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ شاعر کے مائک پر قبضہ جماتے ہی تالیاں بجتی ہیں۔ مشاعرہ پڑھ کر رخصت ہوتے وقت بھی تالیاں بجتی ہیں۔ اچھے شعر پر تو تالیاں ہی تالیاں!

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

"اکیسویں صدی"

خواجہ احمد عباس نے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام تھا "گیارہ ہزار لڑکیاں" چند بوڑھوں نے عباس صاحب سے سوال کیا کہ "گیارہ ہزار لڑکیاں" تو کہا گیا لیکن وہی ایک ہیروئن والی کہانی پیش کی گئی ہے۔ عباس صاحب نے جواب دیا کہ ایسی گیارہ ہزار لڑکیاں سارے ہندوستان میں مل جائیں گی۔ اسی طرح ۷۰ کروڑ کی آبادی کی ایک "اماں" ہوا کرتی تھیں اور ایک بڑے سے گھر کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھالتی تھیں اس بڑے سے گھر میں اٹھارہ سال تک اماں ـــ اماں کی دھوم مچی رہی۔ بیچ میں سترہ اٹھارہ مہینے کے لیے چند بوڑھوں نے ہاتھ میں جھاڑو لی اور اماں کو ہٹا کر باپ کا رول نبھانا چاہا۔ ہر بوڑھا خود کو صحیح سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ کبھی متفق نہ ہو سکے۔ اور آپس میں جھاڑو پکڑے کھینچا تانی خوب کی نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کا ابتدائی کام یعنی صفائی ہی ان سے نہ ہو سکی نتیجتہً آنگن میں جھاڑو بکھر گئی۔ دوبارہ اماں نے جھاڑو ہاتھ میں لی اور ۷۰ کروڑ کے کنبے افرادِ خاندان کے دلوں سے مائی باپوں کا غم دور کر دیا۔ گو کہ اماں کے آخری ایام میں چند ایک نے اماں کے بارے میں انگریزی میں شاعری کی تھی کہ "پرابلمس آر پلینٹی" "پرامیسس آر ایمپٹی" "ایس پکا بس شی از فور ٹوئنٹی" اس اماں کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ یہ اماں گھر چلانے کا ایک بہترین حربہ جانتی تھی ہر تھوڑے دن بعد ایک نیا نعرہ لگاتا۔ یہ نعرہ چند دن آرام سے گھر کے کام کاج چلانے میں مدد دیتا تھا۔ اماں نے چولھے کی حفاظت کرتے کرتے اپنی جان گھر پہ سے قربان کر دی۔ گھر کی چابیاں بیٹے نے لیں تو اس نے ایک چھوٹا سا نعرہ دیا "اکیسویں صدی"۔

اب ہمارے سامنے گزری ہوئی صدیاں بھی ہیں اور اکیسویں صدی بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ تیر کو ہے تو وہ میر کو۔ اکیسویں صدی کی خاص بات یہ ہوگی کہ اس میں بائیسویں صدی کا بے چینی سے انتظار کیا جائے گا۔ اسی طرح جس طرح صبح ہوتے ہی شام کا اور شام ہوتے ہی صبح کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی میر کا یہ شعر صبح شام پڑھا جائے گا کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ✦ یوں ہی زندگی تمام ہوتی ہے

وہی مشرق سے سورج طلوع ہوگا اور مغرب میں غروب ہوگا۔ وہی عید کا چاند ایک مسئلہ بنا رہے گا۔ مذہبی ادارے ہنوز منافع بخش رہیں گے لہٰذا اکیسویں صدی میں بھی مذاہب کا وجود باقی رہے گا اس کے باوجود نوجوان نسل نشہ آور اشیاء کی تلاش میں سرگرداں اور ناتواں نظر آئے گی۔ روٹی، روٹی نہ پایٹ کو پیٹ، پیٹ نہ روٹی کے پیڑے کو آج کی طرح ترستے رہیں گے۔

کپڑا ملوں میں ضرورت سے زیادہ تیار ہوگا لیکن جسموں پر کپڑے کی قلت بڑھتی جائے گی۔ اُونچی سے اونچی عمارتیں انسانیت کا منہ چڑانے میں آج سے زیادہ پیش پیش رہیں گی اور اموات کسی بادشاہ کی طرح یہ گنگناتی رہیں گی کہ ع

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اساتذہ اسی طرح طلباء کے مستقبل کو سنوارنے میں صبح و شام ہمہ تن کوشش ہوں گے اور انہیں ویڈیو پر "بلو فلمیں" دکھائیں گے اور پریکٹیکل کے لیے مختلف مقامات پر ساتھ لے جائیں گے۔ آج کے دور میں ساسیں اپنی بہوؤں پر گیاس کا تیل چھڑکنے اور آگ لگانے کی بہت زیادہ محنت سے گزرتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں ساسیں لائٹ اور فیان کے بٹنوں کی طرح صرف بٹن دبائیں گی اور یکے بعد دیگرے کئی بہوؤں کو بغیر کسی محنت کے سزایاب کریں گی۔

مہمان کو بیسویں صدی میں آفت ناگہانی سمجھا جاتا ہے لیکن اکیسویں صدی میں سرے سے کسی مہمان کا وجود ہی نہ ہوگا چونکہ سبھی انسان اس وقت تک دھوبی کے گدھے کی منزل پالیں گے کہ گھر کے ہوں گے اور نہ گھاٹ کے۔

شریکِ حیات کا دوسروں کی حیات میں منہ کے مزے کی تبدیلی کے لیے جانا آنا معمول کی بات ہوگی۔ بچوں کے بلڈ گروپ اپنے ماں باپ سے جدا ہونا ایک عام بات ہوگی، اناج میں ملاوٹ کے لیے تاجروں کی جانفشانی کی داد دی جائے گی اور ان تاجروں سے جن کے سرپرست آج کی طرح سیاست داں ہی ہوں گے عوام آج کی طرح خوفزدہ ہوں گے اور سیاست دانوں کی بے شرمی ترقی کرتی جائے گی۔

"چاند" جانے والی بسوں کے ساتھ بھی وہی اتفاقی حادثات ہوں گے جو آر ٹی سی کی زمینی بسوں کے مقابلے میں ہوتے ہیں وقت کی تنگی کے باعث آپ ٹفن بھول کر "چاند بس" پکڑنے بھاگیں گے۔ بھگ دڑ میں حسین اموات ایک معمول ہوگا۔ اکثر چاند بسیں اسی طرح لیٹ ہوں گی جس طرح آر ٹی سی کی بسیں اور ریلوے کی ٹرینیں۔ جب خودکشی کے لیے لوگوں کا دل بہت زیادہ مچل جائے گا جس طرح اس صدی میں مچل مچل جاتا ہے تو چاند بس میں بیٹھے بیٹھے خلائی سوٹ اتار کر چاند بس میں سے خلا میں چھلانگ لگائیں گے اور متحرک قبرستان میں اپنی لاش لیے تیرتے رہیں گے۔ اکثر روحیں چاند بسوں کا اغواء کریں گی اور چاند بسوں کو اپنے مختلف کھیلوں میں استعمال کریں گی۔ جب دل بھر کر کھیل لیں گی تو چاند یا زمین کی طرف دھکیل دیں گی اور کورس میں اقبال کی باتیں خلاء میں گونجیں گی کہ ع

طرزِ کہن پہ اڑنا آئینِ نو سے ڈرنا . . . .

زمین سے جنگل گدھے کی سینگ کی طرح غائب ہوں گے چونکہ انسان جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکے ہوں گے۔ سمندروں میں بوند بھر پانی نہ ہوگا ایک عالم آبِ زم زم سے سیراب ہوگا۔ جہاں ایمان کی حرارت والا طبقہ پورے جوش سے اٹھے گا وہیں ننانوے فیصد اصحاب تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنا فلسفہ بگھارتے رہیں گے۔ جرائم میں اضافہ کا ذمہ دار بھی سماج کا تعلیم یافتہ ہی ہوگا لہٰذا "چاند بس" میں بغیر ٹکٹ مسافرین کی تعداد قابلِ رشک ہوگی حالاں کہ کمپیوٹر انھیں پکڑ کر دیالاں کرتے رہیں گے پھر بھی یہ تعلیم یافتہ حضرات کمپیوٹروں کو بھی رشوت دینے کے طریقے ایجاد کریں گے تب گناہ گار اور شریف کمپیوٹروں میں شاعرانہ تبادلۂ خیال ہوگا کہ ع

تم اپنا منہ اُدھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں

کمپیوٹر بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہوں گے جیسے جوئے باز کمپیوٹر، آوارہ بدمعاش کمپیوٹر، عاشق مزاج، رنگین مزاج کمپیوٹر، جنسی امراض میں مبتلا کمپیوٹر، وزیر اور چپراسی کمپیوٹر، سود خوار کمپیوٹر کرائے کے غنڈے نما کمپیوٹر اور

سب سے بڑھ کر "خودکشی اسکواڈ کمپیوٹر" بلکہ ایسے کمپیوٹر بھی ہوں گے جن کی زمرہ بندی اس صدی میں مشکل ہے۔
اکیسویں صدی ایک طرح سے کمپیوٹروں کی صدی ہوگی حالات کے مشکل ترین ہونے کا احساس کمپیوٹروں میں بھی بہت زیادہ ہوگا اور ان مشکل ترین حالات میں بھی اردو مزدور مقبول رہے گی لہٰذا اکثر کمپیوٹر غلام محمد کی دھن میں گنگنا تے پائے جائیں گے کہ ع

رہیے اب ایسی جگہ ہم زباں کوئی نہ ہو

جہیز کی مانگ میں بہت ہی خوشگوار اضافہ ہوگا یعنی ہر قسم کے کمپیوٹر مانگے جائیں گے۔ امیر ترین لوگ کمپیوٹروں کے علاوہ "چاند کا ٹیاں" بھی جہیز میں دیں گے۔ دلہنوں کے مستقبل کا خیال کرکے آج کے دور میں "ابدی سکون" والا کوئی ساز و سامان نہیں دیا جاتا لیکن اکیسویں صدی میں جہیز کے ساتھ ہی "نیوکلیر اسلحہ" کا دنیا معمول کی بات ہوگی۔
عورتوں میں پردے کا رواج ماضی کی جہالت سے تعبیر کیا جائے گا کہ اکیسویں صدی میں کوئی PRIVACY سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ کسی بھی شخص کی حرکت کبھی بھی اس کے اپنے ٹی وی پر اسی وقت دیکھی جاسکے گی چاہے وہ کسی ضرورت میں مبتلا ہو کہ سہاگ رات منارہا ہو اور تو اور ایسے کیمرے بھی ایجاد ہوں گے جو ماضی کی متحرک تصویریں فلم کی شکل میں پیش کردیں گے لہٰذا سارے گزرے ہوئے بزرگ صاحبان کی زندگیوں کا ہر ہر لمحہ اچھا کہ برا بلکہ برے سے برا دیکھنے والوں کے سامنے ہوگا۔
ٹی وی ڈپارٹمنٹ جہاں ماضی کی مشہور ہستیوں کی "اصلی فلمیں" پیش کرے گا وہیں اس بات کی نشاندہی کرے گا کہ فلاں وقت، فلاں مقام پر کتنا بھیانک اور اہم ترین واقعہ وقوع پذیر ہوگا اور ڈپارٹمنٹ اسے ٹیلی کاسٹ کرے گا لہٰذا آپ اپنے ٹی وی پر اپنی پسند کا واقعہ چن کر قبل از وقت اپنے ٹی وی سیٹ کرلیں گے اور ان حادثات کا لطف اٹھائیں گے ایسا بھی ہوگا کہ دہشت ناکی آپ پر ہی نازل ہونے والی ہو اور ساری دنیا آپ کا نظارہ کررہی ہوگی۔ ٹی وی کے اعلانات سے ہوسکتا ہے، لوگ احتیاطی تدابیر اختیار کرلیں اور کسی ناگہانی صورتِ حال سے جان چھڑالیں۔ ہماری استدعا بیسویں صدی والوں سے بس اتنی ہے کہ اکیسویں صدی کی تفصیل سن کر اکیسویں صدی سے جان چھڑالیں اور اکیسویں صدی میں قدم نامبارک نہ ڈالیں اور اسی صدی میں عزت کے ساتھ راہی ملکِ عدم کو سدھاریں ــــ "پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔

عاتق شاہ چالیس سال سے لکھ رہا ہے۔ لیکن آج تک نہیں تھکا۔
ابھی اس کے قلم میں روشنائی اتنی ہی تازہ ہے جتنی پہلے تھی ــــ ملاحظہ کیجئے:

"دو منٹ کی خاموشی"

جو شاہ کی چودہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں نشتر ہی نشتر ہیں۔
خوبصورت ٹائیٹل ــ کتابت و طباعت عمدہ ــ صفحات ۱۲۸
ہم سے طلب کیجئے
شگوفہ پبلیکیشنز ــ ۱۳۱ بچلرز کوارٹرز ــ حیدرآباد دکن

عاصی سعید
عری کلاں (مرادآباد)

مزہ

لفظِ "مزہ" میں کوئی مزہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو فعل و عمل کے تابع نہ کیا جائے۔ فعل وہ کلمہ ہے جس سے کسی کام کا کرنا یا ہونا ظاہر ہو۔ لہٰذا خالی مزے میں مزہ نہیں، مزہ آنے یا مزہ لانے میں مزہ ہے۔ مزے کا تعلق حواس سے ہے۔ یہ علی الاعلان نہیں آتا۔ مزہ دبے پاؤں آتا ہے، چوروں کی طرح۔ مزہ اُسی کو محسوس ہوتا ہے جس کو آئے۔ یوں تو مزہ بڑے روپ رکھتا ہے، پھر بھی بے روپ ہے، خود نمائی سے بے نیاز ہے۔ یہ اپنی شکل اُسے بھی نہیں دکھلاتا جس کو آتا ہے، پس ثابت ہوا کہ مزہ ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔ یہ بتانا کہ مزہ قلب میں پیدا ہوتا ہے، یا دماغ میں، یا اعصاب میں، جگر میں، پھیپھڑے میں، تلی میں، یا پیٹ میں، بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو میڈیکل ریسرچ اسکالروں کا کام ہے۔ عام جنتا کو تو صرف اپنے مزے سے کام ہے۔ البتہ بعض مقاماتِ مزہ کی نشاندہی عوام کو بھی ہوتی ہے، جیسے زبان کا مزہ وغیرہ۔

مزے کے تانے بانے جنت سے ملائے جا سکتے ہیں۔ لیکن آدم نے جنت کی ہزار نعمتوں میں بھی خود کو بے مزہ پایا۔ حالانکہ مزے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ بعض اوقات حصولِ مزہ کے لیے موڈ (MOOD) بنائے جاتے ہیں۔ مزہ لانے کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔ مزے کے قیام رنجہ فرمانے کے لیے خوشگوار ہوائیں تک چلائی جاتی ہیں، کتابِ مزہ کے دیباچے کی ورق گردانی کی جاتی ہے، مگر مزہ تو اپنی خوشی سے ہی آتا ہے۔ اِن ترکیبوں سے نہیں آتا۔ مثل مشہور ہے مار مار کر گیت نہیں گوائے جاتے۔ یوں تو مزہ وسیع المشرب ہے سبھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

سُنا ہے ملنے میں زیادہ مزہ ہے، دوست سے ملنے یا محبوب سے، لیکن بعض نے تو بعض سے نہ ملنے کی قسمیں کھا رکھی ہیں، جیسے عاشقوں نے رقیبانِ روسیاہ سے، اُونچی ذات والوں نے نیچی ذات والوں سے، فی زمانہ روس اور امریکہ کی سیاست کی دیکھا دیکھی یہ قسمیں توڑ بھی دی جانے لگی ہیں۔ عاشقوں تک نے توڑ دیں۔ عارضی مزوں کے چکر میں آکر اپنی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی۔ محبوب کو پھانسنے کے جال رقیبانِ روسیاہ کی معیت میں بُنے جانے لگے۔ احساسِ مزہ کی متنوع شکلیں ہیں۔ محسوس بس اسی کو ہوتی ہیں، جس کو مزہ آ رہا ہو۔ جینے کا مزہ اُسے آتا ہے جو جی رہا ہو، صحت کا مزہ اسے جو صحت مند ہو، کھانے کا مزہ اُسے جو کھا رہا ہو، ملنے کا مزہ اسے جو مل رہا ہو (دوست سے، محبوب سے، یا بیوی سے، یا اولاد سے) پڑھنے کا مزہ اسے جو پڑھ رہا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ گھٹیا بڑھیا مزے کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے، جیسے شہرت کا مزہ گھٹیا، شیمپین کا مزہ بڑھیا۔

اقسامِ مزہ بے شمار ہیں، جیسے املی کا مزہ، نمک کا مزہ، شکر کا مزہ وغیرہ۔ یہ سب تو معمولی ہیں۔ در خورِ اعتنا نہیں۔ خاص مزے جو مانے جاتے ہیں وہ ہیں دولت کا مزہ، محبوب بیوی کا مزہ، اپنے بچوں کا مزہ، عزت کا مزہ، عہدے کا مزہ، شہرت کا مزہ، اور نیک نامی کا مزہ وغیرہ۔ ان سب کا مزہ بھی جبھی ہے کہ افعال و اعمال و اقوال و حرکات و سکنات سے ہرگز بھی یہ ظاہر نہ ہو کہ مزہ آرہا ہے، گویا چلو تو لنگڑوں کی چال چلو، پیو مگر نشہ مت کرو۔ بس صحت بنانے کے لیے پیو، چھچھ دو چھچھ۔ یاد رہے کہ سب مزے فانی ہیں، زندگی کے ساتھ تک ہیں۔ البتہ نیکوکاری کا مزہ لافانی ہے۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت ؎ نوشیرواں نمُرد کہ نامِ نکو گذاشت

بعض لوگ با مزہ جیتے ہیں، بعض بے مزہ اور بامزہ دونوں طرح، بعض بالکل ہی بے مزہ۔ جینا تو ہر سہ اقسام میں قدرِ مشترک ہے، بس خیریت میں اختلاف رہتا ہے۔ اول الذکر سے خیریت دریافت کیجئے تو کہتے ہیں او کے (O.K) آل رائٹ (ALRIGHT)۔ دوئم الذکر سے کیجئے تو کہتے ہیں، بس دعا ہے آپ کی۔ سوئم الذکر سے کیجئے تو کہتے ہیں، اجی کیا خیریت دیریت ہے، مطلب یہ کہ جی تو رہے ہیں، جینے کا مزہ کوئی نہیں۔

انسان کے بعض افعالِ مزہ سے محض فاعل ہی کو مزہ آتا ہے۔ بعض سے خود فاعل کو بھی، دیکھنے والوں کو بھی، جیسے کرکٹ، ہاکی کھیلنا، ناچنا گانا وغیرہ۔ بعض سے خود کو تو کوئی مزہ نہیں آتا، بس دیکھنے والوں کو مزہ آتا ہے، جیسے اُس منٹ کا کرتب، جو چار کوئنٹل کا پتھر چھاتی پر رکھوا کر اُس پتھر پر چاروں ٹانگوں سے ایک ہاتھی کھڑا کرا لے۔ وہ خود تو اپنی ہڈی پسلی چور چور ہونے سے بچانے کی فکر میں مزے سے بے مزہ ہی رہتا ہے، البتہ نمائش بینوں کو مزہ آجاتا ہے۔ بعض چوری چھپے کے افعالِ مزہ ایسے ہوتے ہیں کہ فاعل کو مزے کے حصول کے بدلے اُلٹی منہ کی کھانی پڑتی ہے، سرہم پٹی کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسی افعالِ مزہ کسی کو دکھلانے کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ البتہ کوئی سن پائے تو اُسے مزہ آجاتا ہے۔

اب کچھ دربارۂ ہوسِ مزہ۔ بڑا زمانہ ہوا، ساون کی گھٹائیں تھیں، باغوں میں جھولے پڑے تھے۔ دسوں کنوارے اور کنواریاں جھول رہے تھے۔ میں بھی جب کنوارا ہی تھا۔ ایک کنوارا لڑکا گھاس پر بیٹھا، اپنی لہر میں جھوم جھوم کر ایک فلمی گیت گا رہا تھا۔ کچھ اس طرح تھا۔ یوں ہوا، یوں ہوا، یوں ہوا، تو بڑا مزہ آیا، بڑا مزہ آیا۔ ووں ہوا، ووں ہوا، ووں ہوا، تو بڑا مزہ آیا، بڑا مزہ آیا۔ یوں اور ووں سے مطلب دنیا کی دولتوں، لذتوں اور نعمتوں سے تھا، جو کسی کو میسر ہوتی ہیں، کسی کو نہیں ہوتیں۔ گیت لکھنے والے کو تھیں۔ مجھے بھی وہ گیت سُن کر مزہ آنے لگا۔ اُس لڑکے سے لگ کر بیٹھ گیا، سنتا رہا، جھولوں کی طرف دیکھتا رہا، اپنے متعلق سوچتا رہا، ابھی کیا ہے، ابھی تو میدانِ مزہ میں قدم رکھا ہے، ذرا دیکھتے رہو۔ اس بات کو جگ بیت گئے، کتنے ہی ساون گزر گئے، جوانی سے بوڑھاپے میں بھی کوئی قدم آگے بڑھ لیا، مزہ نہیں آیا۔ اب سوچتا ہوں مزے کے لیے کوئی دوسرا جنم درکار ہے۔ اس کے علاوہ چارہ نہیں۔ لیکن سنا ہے انسان کو انسانوں کے جون میں جنم نہیں ملتا۔ پھر تو دوسرا جنم بے کار ہے۔ لہٰذا صبر۔ مزہ لینے کی آرزو کانٹے کی طرح اب بھی دل میں کھٹکتی ہے، زور لگانے پر بھی نہیں نکلتی۔ عزت، شہرت، دولت، طاقت، محبت اور سکون کے مزوں کی ہوس کو صبر نہ آئے گا، قبر آجائے گی۔ پالکی میں دلہن کے پاؤں ہی کیا، ساری دلہن نظر آرہی ہے۔ انسان مرجاتا ہے۔ ہوسِ مزہ مرتی بھی نہیں۔ دوسرا روپ دھار لیتی ہے۔ ہوس سے حسرت ہوجاتی ہے۔ اسی کو تو کلیجے میں دبائے دبائے غالب نے پروردگار سے اپنے گناہوں کی سزا کا حکم سن کر بقصدِ شوخی کہا تھا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ؎ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

عابدہ محبوب

دھجیاں

آش: کسی محلہ میں "میلادالنبیؐ" کا جلسہ تھا۔ ایک صاحب نے جنھیں اُس محلے میں آکر دو ماہ ہوئے تھے صدر جلسہ سے دو منٹ کی تقریر کے لیے اجازت لی اور حاضرین کو مخاطب کرکے کہا۔

"معزز حضرات، خواتین اور عزیز بچو! میری آپ سب سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔ جس زبان سے آپ کلمہ پڑھتے ہیں اسی زبان سے گالیاں نہ دیا کیجئے! میں اُمید کرتا ہوں آپ کی زبان آئندہ گالیاں دینے سے پرہیز کرے گی!"

ایک ہفتہ بعد کسی نے ان صاحب سے پوچھا۔

"آپ کی مختصر تقریر کا اہلیان محلہ پر کچھ اثر ہوا؟"

صاحب بولے "جی ہاں ـــ اثر تو ہوا۔ اب وہ زبان کے بجائے دل ہی دل میں کلمہ پڑھنے لگے ہیں"۔

گھر کی چیز: ایک اسکول کے چند لڑکے اپنی اپنی جائے پیدائش کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ایک امیر لڑکا فخریہ کہہ رہا تھا "میری ممی مجھے امریکہ کے دواخانے سے لے آئی ہیں"۔

دوسرا امیر لڑکا کیوں پیچھے رہتا۔ بولا "میری امی بھی مجھے کویت کے دواخانے سے لائی ہیں"۔

ایک غریب لڑکا جوان کی باتیں غور سے سُن رہا تھا بے نیازی سے بولا۔

"میری اماں کو باہر کی چیزیں بالکل پسند نہیں! انھوں نے تو مجھے گھر پر ہی بنایا ہے!"

جھوٹا کہیں کا: پانچ تا سات سال کی عمر کے لڑکے اپنا اپنا یوم پیدائش بتا رہے تھے۔

پہلا بولا "میں تو فرائی ڈے کو پیدا ہوا!"

دوسرا بولا "میں تو منڈے کو پیدا ہوا!"

تیسرا بولا "میں تو سنڈے کو پیدا ہوا!"

پہلا فوراً بولا "چل جھوٹا کہیں کا! اس دن تو چھٹی رہتی ہے"۔

سوال: بوڑھی دادی اماں اپنے پوتا پوتیوں کے درمیان بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اپنے ایک سب سے زیادہ شریر ولاڈلے پوتے کو وہ دُلار کرتی ہوئی بولیں۔

" دیکھنا میں اپنے اس بیٹے کے لیے چاند سی دلہن لاؤں گی !"
چھ سالہ پوتے نے حیرت سے پوچھا۔
" دادی اماں ! آپ اس وقت تک زندہ رہیں گی ؟"

چشم دید گواہ : ایئر انڈیا کے جمبو جیٹ طیارہ کی فضا میں تباہی کے بارے میں سب لوگ اظہار افسوس کر رہے تھے۔ کسی نے بتایا "سنا ہے کہ ایک گیارہ ماہ کا بچہ معجزانہ طور پر بچ گیا ہے !"
ایک آواز سنائی دی "اچھا ! تب تو حادثے کی تفصیل اس بچہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ وہی تنہا اس حادثے کا چشم دیدہ گواہ ہے۔"

قومی ملکیت : ایک صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے "اظہر الدین بڑا خوش نصیب کھلاڑی نکلا۔ دیکھتے دیکھتے خدا نے اس کو عزت، شہرت اور دولت دے دی۔ سنتے ہیں لاکھوں کی ذاتی ملکیت کا مالک بن گیا ہے ؟" دوست بولے "تم ذاتی ملکیت کی بات کرتے ہو ! اجی جناب آپ کو پتہ ہے وہ خود قومی ملکیت بن گیا ہے !"

طمانچہ : ایک صاحبہ کی پنشن کی کاروائی، کوشش کے باوجود متعلقہ صدر دفتر میں جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ وہ بار بار آفس کے چکر لگاتی رہیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن وہ دفتر گئیں تو متعلقہ کلرک سے پوچھا "آخر آپ میرا کام کب کریں گے ؟"
کلرک نے روایتی انداز میں جواب دیا "آپ ایسی جلد کریں گی تو کام کیسے ہوگا میڈم"۔
" جلدی ! وہ صاحبہ حیران ہو کر بولیں "جناب ! آپ کو پتہ بھی ہے کہ میں نو ماہ سے دفتر کے چکر کاٹ رہی ہوں"
" نو ماہ بھی کوئی مدت ہے میڈم" ! کلرک نے حسب عادت کہا۔ "برسوں کاروائیاں چلتی رہتی ہیں"
" برسوں !" ان صاحبہ کا لہجہ تیز ہو گیا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ نو ماہ کی مدت میں فائل سے ضروری کاغذ نہیں مل سکتا ! جبکہ نو ماہ ایک انسانی زندگی دنیا میں سانس لینے لگتی ہے !"

کام کا دن : ایک آفس کے لوگ کام کو "PENDING" میں رکھنے کے عادی تھے۔ ایک صاحبہ کو N.O.C کی سخت ضرورت تھی۔ وہ تین ہفتوں سے آفس کے چکر کاٹ رہی تھیں۔ کبھی متعلقہ کلرک سیٹ پر نہ ہوتا، کبھی ٹائپسٹ رخصت پر رہتا اور کبھی آفیسر میٹنگ میں مصروف رہتے۔ ایک نہ ایک وجہ سے دن بڑھتے جا رہے تھے ــــــ ایک دن وہ آفس گئیں تو مہینہ کا آخری دن یعنی تنخواہ کا دن تھا۔ دفتر میں N.O.C اجراء کرنے والے تمام متعلقہ افراد حاضر تھے۔ ان صاحبہ کو امید بندھ گئی کہ آج تو N.O.C ضرور مل جائے گا۔ مگر متعلقہ کلرک بولا۔
" میڈم ! آپ کو تو معلوم ہے کہ آج تنخواہ کا دن ہے۔ آج تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"
صاحبہ جل کر بولیں "میرے خیال میں کم از کم آج ایک دن تو آپ لوگوں کو کام ضرور کرنا چاہیئے !"

(تبصرہ)

پروفیسر عبدالمعبود تاج (علی گڑھ)

کفگیر ۔ مجموعۂ کلام ۔ از نظر برنی

مزاح کیا ہے؟ سٹیفن لی کاک نے اس کی تشریح کرتے ہوئے بجا کہا ہے کہ مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا اظہار فنکارانہ طور پر کیا گیا ہو۔ رونالڈ ناکس کا خیال ہے کہ مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔

مزاح اور طنز میں نمایاں فرق ہے۔ مزاح نگار کا مقصد محض تفنن طبع کا سامان فراہم کرنا ہے جبکہ طنز گو کا مقصد ارفع و اعلیٰ ہے اور اصلاح کا پہلو اس کے پیش نظر رہتا ہے رشید احمد صدیقی کے نزدیک بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔

طنز و مزاح کے اسی میدان میں نظر برنی کا نام نیا نہیں ہے۔ ان کا پہلا مزاحیہ مجموعہ کلام "چمچے" ادبی حلقوں میں کافی دھوم مچا چکا ہے۔ اب موصوف کا ادبی پر دموشن ہوگیا ہے اور وہ چمچوں کی بجائے کفگیر سے کام لینے لگے ہیں۔ چمچہ اور کفگیر ہمارے قومی مزاج کی دو علامتیں ہیں جو اقدار حیات کی پامالی، ریاکاری، خوشامد اور اخلاقی کھوکھلے پن کی ترجمان ہیں۔

نظر برنی نے "کفگیر" میں موجودہ معاشرہ کی بہت سی برائیوں کو ہدفِ ملامت بنایا ہے مثلاً ریاکاری، منافقت، دوغلا پن، خودگیری، خواہش پرستی، نمائشی نعرے، سیاسی بے راہ روی، دفتری بدعنوانی وغیرہ۔ ان کے کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا قومی کردار بہت بگڑ چکا ہے اور بقول خواجہ احمد عباس "ہم سب چور ہیں"۔

طنز اور تحریف کا حربہ بہت کاری حربہ ہوتا ہے جس کو نظر نے بڑے سلیقہ سے برتا ہے۔ بیانی ظرافت کا خام مال بطور راست سماجی بے راہ روی سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کا مخاطب سیاستداں بھی ہے اور دفتر کا اہلکار بھی، بیگم بھی ہے اور افسر بھی۔ ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں۔ ہماری شاعری ذات کے تنگنائے کی طرف چلی تو ہمارا طنز و مزاح ذات اور گھر سے باہر نکل کر سماج کی طرف گامزن ہوا ہے۔ یہ فال نیک ہے۔ اس راستے سے آگہی اور بصیرت تک رسائی ممکن ہے جو شاید ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو عصری حسیت سے ہمکنار کرسکتی ہے اور اس میں نئے اسلوب ہی نہیں، نئی پہنائی اور نئی وسعت لاسکتی ہے۔

حالاتِ حاضرہ کی ناہمواریوں کو نظر برنی نے خاص طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ طنز کے بطن

میں اصلاح کا پہلو ہوتا ہے ان کے سماجی طنز کے نمونے ملاحظہ ہو :

رسوا کرو، ذلیل کرو، سب قبول ہے — بندہ امیدوار ہے چرنوں کی دھول ہے
لیکن یہ یاد رکھیے الیکشن کو جیت کر — مُڑ کر نہ دیکھنا میرا پہلا اصول ہے

موجودہ زمانہ میں واقعاتی و بیانیہ مزاح کے بجائے سماجی و تہذیبی زندگی کی عکاسی سے مزاح پیدا کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے ۔ اب واقعات و کردار پر زور دینے کے بجائے انداز بیان اور الفاظ و محاورے کی تراش خراش پر زیادہ تکیہ کیا جاتا ہے رمزیہ شاعری نے اس پر مزید صیقل کا کام کیا ہے۔ موضوع بیان بھی کافی حد تک بدل گیا ہے اور گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر سماجی زندگی کی کھلی فضاء میں پہنچ گیا ہے۔ نظر برنی نے نیتاؤں کی کن کن خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے، ذرا ملاحظہ فرمایئے :

نیتاؤں کا حال نہ پوچھو — دیش کے ہیں یہ کھیون ہار !
تین گنوں کے مالک ہیں یہ — رشوت، چوری، بھرشٹا چار !

کل کے وزیر

نیتا بن کر وہ پائیں گے عزت — شہر میں جو حقیر ہوتے ہیں !
لکھنے پڑھنے میں جو پھسڈی ہوں — وہ ہی کل کے وزیر ہوتے ہیں !

نظر برنی کے طنز میں خشونت بھی ہے اور گریہ و زاری بھی۔ خشونت ان کے تیور میں پائی جاتی ہے جبکہ گریہ تہہ میں مل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر :

کیوں نظم گلستاں اب اُلٹا نظر آتا ہے — ہر شاخ پہ کیوں اُلّو بیٹھا نظر آتا ہے
کیا فیض کرپشن ہے کیا فیض بد عنوانی — افسر کا تو کتّا بھی تگڑا نظر آتا ہے
جو کام ہونا ممکن، پل بھر میں کراتی ہے — رشوت کا سرِ دفتر جلوہ نظر آتا ہے

نظر برنی صاف گو شاعر ہیں جو لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ان کا سماجی مطالعہ و مشاہدہ، سیاسی تجربہ اور صحافتی بصیرت فن کو نکھارنے میں بہت معاون ثابت ہوئے ہیں۔ ان کا کیمرہ سماج کی بے اعتدالیوں پر مرکوز ہوتا ہے اور وہ شہری زندگی کی تمام لعنتوں کو بے نقاب کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ زمین اور مکان کے سنگین مسائل، خوشامد، چوری، رشوت ستانی، استحصال، معاشی لوٹ کھسوٹ، سیاسی دیوالیہ پن، وزیروں کی ناجائز دولت، کالا دھن کی افزائش ایسے موضوعات ہیں جو نظر کی شاعری میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں۔

پیروڈی کا فن آسان نہیں ہے لیکن نظر برنی نے اس کو جس طرح برتا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ان کو تحریف کے فن میں خاص مہارت حاصل ہے۔ بعض جگہوں پر غالب کی غزلوں پر ان کی مزاحیہ تضمینیں ان کی فنی چابکدستی کی دلالت کرتی ہیں۔ بے حیا سیاسی خوشحالی کی بنیادوں پر وار دیکھئے :

نیا نسخہ

کوٹھیاں عالی شان رکھتا ہوں — عشق کی داستان رکھتا ہوں
آنکھ رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں — "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے ؟"

دے کے خط ۔ ۔ ۔ ۔ (مُراسلے)

کمال صاحب! آپ تو صاحبِ کمال ہیں ہی۔ سو آپ کے کمال بلکہ کمالات کی داد کون دے سکتا ہے۔ برسوں سے ہنستے ہنساتے رہنا۔ ایک فکر انگیز مگر بے ساختہ مسکراہٹ پہ مجبور کرنا کمالات سے بھی اُدھر کی چیز ہے۔ دیکھتے چلاتے، بہت کچھ ہاتھ آجاتا ہے۔ (یوں تہی دامنی اپنا مقصد ہے)۔ پچھلے تلے کا سرمایہ آپ کی نذر ہے۔ دوسرے کا بھی مال تیار ہے میرے شہر میرے لوگاں کی طرح ایک سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا مستقل نہیں۔ یعنی کبھی کبھی۔ ؛ شفیقہ فرحت (بھوپال)

محترمی۔ اسلام علیکم: ۔۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب اور "مجتبیٰ حسین نمبر" کے اعلان کے بارے میں پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب اور ماہنامہ شگوفہ کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مزاح دوسرے درجے کی چیز نہیں۔ اگر ارسطو اس دور میں ہوتا تو ضرور اس کا خیال بھی بدل جاتا۔

حلیمہ فردوس (بھوپال)

مکرمی تسلیم!
"شگوفہ" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ظرافت اور طنز و مزاح کے سلسلہ میں مضامین اور شعری تخلیقات قابلِ قدر ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد لائقِ صد ستائش ہے۔
اتفاقاً "شگوفہ" نے مجھ پہ یہ اثر ڈالا کہ ایک نظم ہو گئی۔ ظفر رضوی کاکوی۔ سہسرام

متحدہ عرب امارات U.A.E کا ویزا۔

خوشخبری: اُن مسافروں کیلئے جو نہ صرف اپنے دوست احباب رشتہ داروں سے ملنے کے لیے جو U.A.E میں مقیم ہیں بلکہ اُن سیاحوں کیلئے بھی جو متحدہ عرب امارات کے سات خلیجی ریاستوں [دبئی، ابوظہبی، شارجہ، اجمان، فوجیرہ، راس الخیمہ، ام القوین] کی سیر و تفریح کے علاوہ سامان کی خرید و فروخت کیلئے جانا چاہتے ہوں ان کیلئے 7 تا 15 دن کے ویزوں کا بندوبست معہ قیام و طعام نہایت ذمہ داری سے کیا گیا ہے۔ جو حضرات U.A.E میں اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کے ہاں بھی رہنا چاہیں تو بخوشی رہ سکتے ہیں۔ مزید تفصیلات کیلئے حسبِ ذیل پتہ پر ربط پیدا کریں۔

بہترین سروس مکمل آرام۔

مظہر ٹراویلس

مظہر منشن 4/293 ۔ 6 ۔ 3 حیدرگوڑہ۔ حیدرآباد۔ فون ۔255084

وزارت امورِ خارجہ حکومت ہند کا مسلمہ ٹراویل ایجنٹ۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ——

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

فون نمبر: 557716 فون مکان: 521064

جلد (۲۰) —— اگست ۱۹۸۷ء —— شمارہ (۸)

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

Dr. Zakir Husain Library, Jamia Nagar, New Delhi, J.M.I.

مجلس ادارت:

محمد منظور احمد، مسیح انجم، حمایت اللہ

مجلس مشاورت:

بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین

منیجر: مسیح جلیل ○ منیجر اعزازی (بمبئی): فیاض احمد فیضی

شمارۂ یومِ آزادی

کتابت: محمد غالب، محمد عبدالرؤف، مسعود انور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: ۵۰ روپے

غیر ممالک سے: ایک سو پچاس روپے

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۱

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیکس کے اسپیشلسٹ!

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔

ڈسٹری بیوٹرس برائے:-

۱. موہن میکن بریوریز ۲. ا جنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ ۴. ہارکوسری نگر
۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. میڈونا کیننگ کمپنی ۷. چمپئن وہائٹ روڈس۔
۸. پیری سونش اینڈ ٹافیس ۹. ڈرگ ہیوٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سل [جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی] وغیرہ!

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:

پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض حیدرآباد۔

ممی!

جشنِ آزادی مبارک

دلکش ڈیزائن، رسوم و رواج کے پاسدار نقش و نگار اور خیال و خواب کی طرح حسین
رنگوں میں پارچہ پر گل بوٹوں کی فن کاری

آپ کی خدمت میں ایسکو پیش کرتا ہے
پارچہ جات کی تمام قسمیں، ہر موقع اور محل کے لیے
سلک، پولیسٹر، پرنٹیڈ کاٹن، جنتا ساڑی اور دھوتی

تشریف لائیے ــــ اور ہمارے مختلف النوع کپڑوں سے
انتخاب کیجیے جو آپ کے بجٹ کے عین مطابق ہے

ــــ ایسکو ملازمین سرکار کو کریڈٹ پر خریدنے کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔

اپنے کپڑوں کی تمام ضروریات کے لیے آندھرا پردیش اور دوسرے صوبوں میں واقع ہمارے ۴۳۱ شوروموں
پر تشریف لائیے۔

ایسکو ــ منفرد فیبرکس ــ جو آپ کو دوسروں سے جدا، سمارٹ، فیشن ایبل اور آرام دہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں

دی آندھرا پردیش اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹڈ

70 ـ 7 ـ 6 ـ 5 ویورس بھون نارائن گوڑہ، حیدرآباد 500029.

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چنندہ آسام و نیلگری کے
باغات سے راست منگوائی
ہوئی چائے!
اسٹرانگ و خوش ذائقہ
آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام
ٹی
ٹریڈرس

روبرو

یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ حیدرآباد

PHONE
525444

نامور و منفرد مزاح نگار

مجتبیٰ حسین

کو ماہنامہ شگوفہ کا خراجِ تحسین

مجتبیٰ حسین نمبر

- فکر و فن اور شخصیت کا سیر حاصل جائزہ
- ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں، شاعروں، مزاح نگاروں اور نقادوں کی خصوصی تخلیقات
- مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب
- تصاویر اور دیگر دل چسپیاں

اکتوبر ۱۹۸۷ء میں اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی

تقاریب

۱۲ تا ۱۴ نومبر ۱۹۸۷ء

ہندو پاک کے نمائندہ مزاح نگاروں کا اہم اجتماع

تیاریاں زور و شور کے ساتھ جاری ہیں ـــ!

مجتبیٰ حسین

ساحر ہوشیار پوریؒ

ساحر ہوشیار پوری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں چار پانچ برس پہلے کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ ایک شام کافی ہاؤس میں میرے ایک دوست نے، جو بزنس مین ہیں اور چونکہ ادب سے کسی طرح کی دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے کامیاب بزنس مین بھی ہیں۔ مجھ سے پوچھا "ابھی پچھلے ہفتہ اردو کے ایک مشہور شاعر اس دنیا سے گزر گئے۔ غالباً پوری تھا ان کا نام۔ کیا وہ سچ مچ بہت بڑے شاعر تھے؟" میں نے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اردو میں ابھی تک پوری صاحب نام کا کوئی شاعر مشہور نہیں ہوا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس نام کا کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے تو اس کے گزر جانے کا کہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔"

میرے دوست نے کہا "میں نے خود اخبار میں پوری صاحب کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ ٹیلی ویژن پر بھی ان کے مرنے کی خبر آئی تھی۔ تم کیسے کہتے ہو کہ پوری صاحب نہیں مرے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے؟" میں نے حافظے پر پھر زور دیا۔ پچھلے ہفتہ میں اردو کے جتنے شاعر کفن باندھ کے مرے تھے ان کا حساب جوڑا تو احساس ہوا کہ ان مرنے والوں میں سرفہرست حضرت رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام ضرور شامل تھا۔ میں اپنے بزنس مین دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ ہر کام میں فائدہ کی چیز تلاش کرتے ہیں۔ انھوں نے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے لمبے نام میں سے "گورکھپوری" کے "گورکھ" کو نکال کر اپنے لیے "پوری" الگ سے بچا لی تھی اور "پوری صاحب، پوری صاحب" کہے چلے جا رہے تھے۔

ساحر ہوشیار پوری کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ واقعہ محض اس لیے یاد آگیا کہ دو ڈھائی برس پہلے ایک دن میں اپنے دفتر پہنچا تو میرے اسسٹنٹ نے اطلاع دی "صاحب! آپ کے لیے کسی پوری صاحب کا فون آیا تھا۔ آپ کو فون کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں نے بلراج پوری کے بارے میں سوچا مگر وہ تو ایک دن پہلے ہی جموں چلے گئے تھے۔ میرے ایک اور دوست پریم ناتھ پوری کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے بھی مجھے فون نہیں کیا۔ جھنجھلا کر جب میں نے اسسٹنٹ کو ڈانٹا کہ میرے دوستوں کے پورے نام کیوں نہیں پوچھتا تو بولا "صاحب! آپ کے دوستوں کے نام ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر آپ

کے ایک دوست رام کرشن مضطر ہوا کرتے تھے۔ رام کرشن تو سمجھ میں آجاتا ہے لیکن یہ مضطر کیا بلا ہے یہ چیز کبھی سمجھ
میں آج تک نہیں آیا۔ کشمیری لال تو ٹھیک نام ہے لیکن اس کے آگے ذاکر لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں خوب یاد آیا
آج صبح جن پوری صاحب کا فون آیا تھا اُن کے نام میں کچھ چالاکی اور ہوشیاری کا بھی ذکر تھا۔ اب آپ سوچ لیں کہ
یہ کونسے پوری صاحب ہیں؟ میں فوراً تاڑ گیا کہ یہ پوری صاحب ضرور ساحر ہوشیارپوری ہوں گے۔ میں نے انھیں
فون کیا تو پتہ چلا کہ فون انھیں کا تھا۔

اردو شاعروں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف خود ادب میں آنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے مقام پیدائش
یا آبائی مقام کو بھی اپنے ساتھ ادب میں لانا چاہتے ہیں۔ لندن میں تو میں ساز برمنگھمی اور بیکل بریڈ فورڈی تک
سے مل چکا ہوں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اصغر اگر نہ ہوتے تو گونڈہ کو کون پوچھتا۔ بسملؔ نہ ہوتے تو مچھلی شہر
کا کیا بنتا۔ شیو کمار بٹالوی نہ ہوتے تو بٹالہ کا جھنڈا ہی بیٹھ جاتا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ اس بچے
کو ایک عدد نام دے کر حکم دیتے ہیں کہ وہ اس نام کو دنیا میں روشن اور مشہور کرے۔ بعض والدین بچوں کے اتنے
مشکل نام رکھتے ہیں کہ اس نام والے کو اپنا نام روشن کرنے میں بڑی آفت جھیلنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر میرے
ہی نام کو لیجیے۔ یقین مانیے ادب کو سیکھنے میں مجھے اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ اس نام کو مشہور کرنے میں۔
میں اپنے والدین کی فرمانبردار اولاد ہوں اور پوری سعادت کے ساتھ ان کے رکھے ہوئے مشکل نام کو روشن کرنے
میں لگا ہوا ہوں۔ مجھ میں اگر یہ بزدلی کی حدوں کو چھوتی ہوئی سعادت مندی نہ ہوتی تو میں بھی ساحر ہوشیارپوری
کی طرح اپنے والدین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتا اور اپنا کوئی اچھا سا قلمی نام رکھ لیتا۔ ساحر صاحب کے
والدین نے ان کا نام رام پرکاش رکھا تھا۔ اچھا خاصا نام تھا اور مشکل بھی نہیں تھا مگر ساحر صاحب کو تو اپنے والدین
کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا تھا سو اس نام کو چھوڑ کر اپنا قلمی نام ساحر ہوشیارپوری رکھ لیا۔ اب وہ اپنے
نام اور اپنے آبائی مقام کا نام دونوں کو مشہور کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ایک پنتھ دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔ ہم نے
کہ آج تک ہوشیارپور نہیں دیکھا ساحر ہوشیارپوری کو ضرور دیکھا ہے اور ساحر ہوشیارپوری کے حوالہ سے ہوشیارپور
کو سمجھا ہے اُس سے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہوشیارپور میں پیدا ہونے کے لیے آدمی کا ہوشیار اور چالاک
ہونا ضروری نہیں ہے۔ آدمی میں اپنا بل بوتا ہو تو ہوشیارپور میں پیدا ہونے کے باوجود وہ حسبِ استطاعت سادہ،
معصوم اور دُنیاداری سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ بھلا بتایئے آپ اُس آدمی کو ہوشیار کیسے کہیں گے۔ جس کے
خاندان میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو رہے ہوں اور اس خاندان کا چشم و چراغ ردیف قافیہ کے چکر
میں پھنستا جائے۔ "عرض کیا ہے" اور "توجہ چاہتا ہوں" کے فقرے اُس کا تکیہ کلام بن جائیں۔ گاہکوں سے دولت
سمیٹنے کے بجائے اپنے سامعین سے داد کو سمیٹنا شروع کر دے۔ ساحر صاحب نے جب پہلا شعر کہا ہوگا تو اُن کے
دل پر جو گزری ہو گی سو گزری ہو گی لیکن اُن کے لکھ پتی بزرگوں کے دلوں پر جو گزری ہو گی اس کا اندازہ ہم
جیسے کنگال لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔ بخدا ہمارے پاس سچ مچ کی دولت ہوتی تو ہم کیوں خواہ مخواہ علم کی دولت کے
پیچھے بھاگ کر اپنے آپ کو ہلکان کرتے۔ خاندانی اثاثہ میں اضافہ کرنے کے بجائے شعر و ادب کے
سرمایہ میں اضافہ کیوں کرتے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے آدمی کو ادب کے دشت کی سیاحی سے کیا سروکار؟

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں۔

حضرات! مجھے یہ اعتراف کرنے دیجئے کہ میں ساحر ہوشیارپوری کا دوست نہیں بلکہ اُن کا ایک ادنیٰ سا مداح ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں میرے بزرگ ہیں۔ میں نے ابھی اس دنیا میں آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں تو تب بھی وہ اپنے شعروں سے بڑے بڑوں کی آنکھیں کھول رہے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب وہ پیدا ہوئے تھے تو ابھی پہلی جنگِ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ اپنے شروع ہونے کے لیے کسی معقول وجہ کا انتظار کر رہی تھی۔ ساحر ہوشیارپوری پیدا ہو گئے تو اُسے یہ معقول وجہ بھی میسر آ گئی اور وہ شروع ہو گئی۔ ساحر ہوشیارپوری نے دو عظیم جنگیں دیکھی ہیں۔ جبکہ میرے حصّہ میں صرف ایک جنگِ عظیم ہاتھ آئی ہے اور وہ بھی دوسری۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمر اور تجربہ میں وہ مجھ سے ایک جنگِ عظیم آگے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ساحر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ہم جیسوں کی سہولت کی خاطر اپنے سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ میں اُن کی بزرگی کا احترام کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میری خاطر اپنی قابلِ رشک بزرگی سے دستبردار ہو کر دوستی کی سطح پر اُتر آتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اُن کی طبیعت پر جو بوجھ پڑتا ہو گا اُسی کا اندازہ مجھے ہے۔

ساحر ہوشیارپوری کو میں نے اُس وقت دیکھا جب یہ ساری دنیا دیکھ چکے تھے۔ اور ہم جیسوں کو حیرت سے دیکھنے کی اُن کی باری تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اُن کو دیکھنے کے دن نہیں تھے۔ یہ بارہ تیرہ برس پہلے کی بات ہے جب میں حیدرآباد سے دہلی آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ "ماہنامہ تحریک" کے دفتر پر اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اگرچہ رسالوں میں اُن کے تازہ کلام کے ساتھ اُن کی پرانی یعنی نوجوانی کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اب جو ساحر ہوشیارپوری خود بہ نفسِ نفیس مل گئے تو میں نے انھیں اسی طرح دیکھنا شروع کیا جس طرح ایک تاریخ داں کسی تاریخی عمارت کے آثار کو دیکھ کر ان میں ماضی کی عظمتوں کی نشانیاں ڈھونڈ رہا ہو۔ باسٹھ ترسٹھ برس کے وقت نے اُن کے ساتھ اور اُنھوں نے وقت کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کا اندازہ انھیں دیکھ کر لگایا جا سکتا تھا۔ ان بچے کھچے ساحر صاحب میں جب میں ماضی کے ساحر صاحب کو تلاش کرنے لگا تو غالباً انھیں اس کا احساس ہو گیا کہ میں اُن کی ذات میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ اور بھی اکڑ کر بیٹھ گئے اور اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے نوجوان کرتے ہیں۔ بلکہ دو ایک حرکتیں بھی نوجوانوں کی سی کیں۔ ساحر صاحب کی یہ ادا مجھے بے حد پسند ہے کہ وہ ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ نوجوانوں سے نوجوانوں کی طرح پیش آئیں گے۔ بزرگوں سے بزرگوں کی طرح باتیں کریں گے۔ حد ہو گئی کہ خواتین سے خواتین کی طرح ملیں گے۔ مزاج کی یہ لچک، بات کرنے کا یہ سلیقہ، محفل کو اپنی ذات کی خوشگواری میں سمیٹ لینے کا یہ انوکھا انداز، ظاہر ہے کہ انھوں نے کچھ تو زمانے سے سیکھا ہو گا مگر یہ صفات بڑی حد تک ان کی اپنی ذاتی ہیں۔ اگر ایسی باتیں سیکھنے سے حاصل ہو جاتیں تو ہر آدمی ساحر ہوشیارپوری ہو جاتا۔

آدمی جب پچھتر برس کا ہو جاتا ہے تو فطری طور پر پیچھے پلٹ کر بھی دیکھتا ہے۔ زندگی کے حساب کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔ اس سفر میں کیا کھویا کیا پایا اس کا اندازہ لگاتا ہے، ساحر ہوشیارپوری کی زندگی کے یہ پچھتر برس جہاں ایک کامیاب انسان کی زندگی کے پچھتر برس نظر آتے ہیں وہیں ان پچھتر برسوں میں جو نشیب و فراز آئے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن زمانہ کی سنگینیاں اُن کی شخصیت کی رنگینی پر ڈاکہ نہیں ڈال سکی اور ان کی کلاہ کج آج بھی اسی بانکپن کے ساتھ ہے۔ اُن کی زندگی میں جتنے نشیب آئے ہیں اتنے ہی فراز

بھی ہیں، لکھ پتی باپ کی جائیداد سے یکلخت دستبردار ہو کر ایک معمولی ہوٹل کے کمرے میں چلے گئے۔ ہم جیسے تو ایک ہی شادی کے نتائج و عواقب کو جھیلنے کی سکت نہیں رکھتے، ساحر صاحب نے دو دو شادیاں کیں۔ غم زمانہ ہو یا غم ذات، ساحر ہوشیار پوری ہر غم سے نبرد آزما ہونے اور پھر اس میں سے کامیاب و کامران نکل جانے کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں۔ میں نے ساحر ہوشیارپوری کے وہ دن نہیں دیکھے جب حالات کی سنگینی سے لڑ رہے تھے۔ میں جب ان سے ملا ہوں تو وہ موٹر نشین تو تھے ہی لیکن تیور عالی شان کے سے تھے جو آج بھی ہیں۔

جب تک ساحر صاحب فریدآباد منتقل نہیں ہوئے تھے اور دہلی میں مقیم تھے تو اُن سے میری بیسیوں ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اُن کا کلام سُننا ایک مسرت تو ہے ہی لیکن اُن کی باتوں کو سُننا بھی کچھ کم مسرت نہیں ہے۔ جتنی محفلیں انھوں نے دیکھی ہیں بہت کم نے دیکھی ہوں گی۔ برصغیر کی کیسی کیسی عظیم الشان ادبی ہستیوں کی جلوت و خلوت دونوں میں شریک رہے ہیں۔ وہ جب باتیں کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ نہیں بول رہے ہیں بلکہ اردو ادب کے پچھتر برس بول رہے ہیں۔ اپنے اُستاد جوش ملسیانی کا ذکر کریں گے تو احتراماً نظریں نیچی کریں گے جیسے جوش ملسیانی اُن کے سامنے بیٹھے ہوں۔

ایک دن پرانی باتوں کا ذکر چل نکلا تو میں نے پوچھا "ساحر صاحب آپ کی پہلی شعری تخلیق کونسی ہے؟"

ایک آہ بھر کر بولے "میری پہلی شعری تخلیق ایک نظم تھی جس کا عنوان تھا "اصطخر"

میں نے کہا "مکرر ارشاد ہو، عنوان میں نے ٹھیک سے نہیں سُنا"

بولے "اصطخر۔ اصطخر۔ الف۔ ص۔ ط۔ خ۔ ر یعنی اصطخر"

میں نے اپنے سینے کے اندر ہی اندر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "واہ، واہ، 'اصطخر' کیا بات ہے اصطخر کی۔ اصطخر میں ایک عجیب کشش ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اصطخر ہی سب کچھ ہے۔ اصطخر نہ ہو تو دُنیا بے معنی ہے۔ زندگی کے اصطخر کو آپ نے جس طرح ادب کے اصطخر سے جوڑا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصّہ ہے سبحان اللہ اصطخر، مرحبا اصطخر"

ساحر ہوشیارپوری نے میری اس بے ساختہ داد کے جواب میں پوری انکساری کے ساتھ سلام کرتے ہوئے کہا "نوازش، عنایت۔ کرم، شکریہ۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اصطخر کو سمجھا تمہاری اصطخر فہمی کا میں قائل ہو گیا ورنہ ان دنوں ہر طرف جہلا پھیلے ہوئے ہیں کسی کو اصطخر کے معنی نہیں معلوم۔ دس برس بعد تم پہلے شخص ملے ہو جو اصطخر کا مفہوم جانتا ہے۔ اسی لیے تو تم جب بھی آتے ہو جی خوش ہو اُٹھتا ہے۔

میں نے کہا ساحر بھائی! زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ ہم جیسوں کو اور ہمارے اصطخر کو کون پہچانتا ہے۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں۔ بھلا بتایئے جو اصطخر کو نہ جانے وہ اردو زبان و ادب کو کیا خاک جان سکتا ہے" اس کے بعد ساحر ہوشیارپوری اردو معاشرہ کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس اور میری اردو دانی پر اظہارِ مسرت کرنے لگے مگر میں نے اُس دن انھیں زیادہ اظہار کا موقع نہیں دیا کیونکہ میں اصطخر سے گھبرا گیا تھا۔ فوراً وہاں سے چلا آیا۔ دو چار ادیب دوستوں سے اصطخر کے معنی پوچھے مگر وہ بھی اپنے کندھے اُچکا کر رہ گئے۔ دو ایک ڈکشنریاں دیکھیں تو

اُنھوں نے مجھے اُچکا دیا۔ چنانچہ آج تک مجھے اصطلاح کے معنی نہیں معلوم ہو سکے لیکن اس کے باوجود ساحر صاحب مجھ سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ میں اصطلاح کے معنی جانتا ہوں۔ اُس دن کے بعد میں اس راز کو پاگیا کہ علم کے اظہار کا نام علم نہیں بلکہ اپنی جہالت کو چھپانا ہی سب سے بڑا علم ہے۔ پتہ نہیں ساحر ہوشیارپوری نے اپنی پہلی تخلیق کا نام "اس کی دستک" کیوں رکھا حالانکہ اس کے بعد کی شاعری ہم جیسوں کی اردو دانی سے بالکل مطابقت رکھتی ہے۔

ایک بار قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (جو ساحر صاحب کے قریبی دوست ہیں) نے بتایا کہ ۱۹۵۰ء میں جب جشنِ جمہوریت کا پہلا مشاعرہ منعقد ہوا تو ساحر ہوشیارپوری کو اس کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ میں نے کہا "اس مشاعرہ سے ساحر صاحب کے اولین تعلق کا ہی نتیجہ ہے کہ آج تک اس مشاعرہ میں "شاعری" کم اور "جمہوریت" کا بول بالا زیادہ نظر آتا ہے۔ میں نے آج تک اس مشاعرہ میں کبھی چین سے شاعری نہیں سنی کیوں کہ ہر آدمی یہاں ہوٹنگ کرنے کے اپنے جمہوری حق سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ یوں بھی شعر کہنا شاعر کا جمہوری حق ہے اور ہوٹنگ کرنا سامعین کا۔ ساحر ہوشیارپوری اس معاملہ میں کیا کر سکتے ہیں۔

ساحر صاحب سے میری ملاقاتیں اُن دنوں بہت ہوتی تھیں جب ان کا دفتر ڈیفنس کالونی میں واقع تھا۔ اُن دنوں وہ MAN POWER یعنی بھولے بھالے ہندوستانیوں کو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھیجنے کا کاروبار کرتے تھے۔ بڑا شاندار دفتر تھا اُن کا ایک ریسپشنسٹ کیرالا کا رہنے والا تھا۔ بہت دلچسپ آدمی تھا۔ میں اکثر شام کے وقت وہاں جاتا تو وہ اکثر دروازے پر روک کر کہتا تھا "اب تو دفتر بند ہو گیا ہے۔ کل صبح کو آنا!"

میں کہتا "مجھے فوراً دوبئی جانا ہے اپنے صاحب سے ملنے دو"
وہ کہتا "اے مسٹر تم دوبئی جانا مانگتا یا پاتھ روم۔ دوبئی کے واسطے ویزا چاہیے۔"
میں کہتا "اپنے صاحب سے ملنے دو۔ میرا ویزا اُن کے پاس ہے"
وہ کہتا "کیا کوالیفکیشن ہے تمہارا؟ کیا کام کرنا مانگتا تم دوبئی میں؟"
میں کہتا "ویلڈر یا فرٹر بننا چاہتا ہوں"
وہ کہتا "پہلے ہمارے صاحب کو ویلڈنگ فٹنگ کر دو تب جانا۔"

اسی بات پر میں اپنا وزیٹنگ کارڈ اُسے دے کر کہتا کہ وہ اپنے صاحب کو دکھا دے وزیٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں لے کر کہتا "تم پہلا ویلڈر ہے جس کے پاس اپنا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ تم بڑا کلچرڈ ویلڈر لگتا ہے۔" ساحر صاحب مجھے فوراً اندر بلا لیتے۔ اُن کے ریسپشنسٹ سے میری بے شمار ملاقاتیں ہوئیں بلکہ آخر زمانہ میں تو اُسے میری بیروزگاری پر ترس بھی آنے لگا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "مسٹر تم کوئی دھندا کیوں نہیں پکڑ لیتا۔ صاحب تم کو باہر نہیں بھیجے گا۔ تم ایک سال سے ادھر آتا۔ کل بیس فٹر اور دس ویلڈر سعودی عرب کو گیا مگر صاحب تم کو نہیں بھیجا۔ تم کو ویلڈر بنانے کی آشا دلا کر تم کو باتوں کو اپنی شعر و شاعری سناتا۔ مسٹر کیوں اپنا ٹائم برباد کرتا ہے۔ میں تم کو ایک ایجنسی بتاتا، کوشش کر لینا۔"

"میں نے پوچھا کونسی دکینی"؟

سرگوشی کے انداز میں بولا "میں یہ نوکری چھوڑ کر جا رہا ہوں تم میری جگہ صاحب کے ریسپشنسٹ بن جانا"۔ میں ساحر صاحب کا ریسپشنسٹ بننے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ساحر ہوشیار پوری خود اپنی دوکان ڈیفینس کالونی سے بڑھا کر چلے گئے اور مستقلاً فرید آباد میں رہنے لگے۔ فرید آباد کو ان کی منتقلی کے بعد میری اُن سے ملاقاتیں زیادہ تر ادبی تقریبات ہی میں ہوتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے فرید آباد آنے کی دعوت دیتے ہیں مگر میں جب بھی فرید آباد جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو دل میں خیال آتا ہے کہ جب فرید آباد جانا ہی ہے تو کیوں نہ حیدر آباد چلا جاؤں۔

ساحر ہوشیار پوری کی محبت کا دوسرا نام خوشگواری ہے ان محفلوں میں اُن سے بیسیوں غزلیں سُنی ہیں۔ وہ جب کلام سُناتے ہیں تو اُن کی شخصیت کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ اُن کی موجودہ زندگی خود اُن کے ایک شعر کی تفسیر نظر آتی ہے۔ ؎

شام کو بادہ کشی، شب کو تری یاد کا جشن
مسئلہ یہ ہے کہ دن کیسے گزارا جائے

میری دُعا ہے کہ ہوشیار پوری صاحب برسوں ہمارے درمیان رہیں اور اپنی یادوں کے جشن میں ہمیں بھی شامل کرتے رہیں۔ ▭▭

"روزنِ دیوار سے" ـــــ "عطائیے" اور "خند مکرر"

کے بعد ہندو پاک کے نامور کالم نگار و
طنز و مزاح نگار

عطاء الحق قاسمی

کے مزاحیہ مضامین کا چوتھا مجموعہ

جُرمِ ظریفی

عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

زیرِ اہتمام:

سنگِ میل پبلشرز، سرکلر روڈ، لاہور ؛

رضا نقوی واہی

اکیسویں صدی کی ولادت قریب ہے

عالم میں چار دانگ صدائے نقیب ہے
اکیسویں صدی کی ولادت قریب ہے
خوش تر یہی ہے تو شاد سیاسی طبیب ہے

وہ غلغلہ ہے جیسے کہ گھمسان رن پڑے
ہیں محو انتظار منجھولے ہوں یا بڑے
قد آوروں کے غول میں بونے بھی ہیں کھڑے

لیزر شعاع کا کوئی درپن لئے ہوئے
اسٹار وار کا کوئی اینڈمن لئے ہوئے
واہی کھڑا ہے صرف ایئر گن لئے ہوئے

کچھ لوگ تو ہیں عازم تسخیر کائنات
ہے دل میں ان کے جستجوئے حل مشکلات
ہم ہیں اسیر گیسوئے مفعول و فاعلات

اِس بیسویں صدی میں بھی وہ اُتھل پُتھل
حالاتِ زندگی جو سبھی یکسر گئے بدل
ہم نے بھی خوب خوب لکھی نو بہ نو غزل

انساں کے پاؤں روند چکے چاند کی زمیں
ٹکنالوجی پہنچ گئی مریخ کے قریں
ہم رویتِ ہلال پہ بھی متفق نہیں

گزریں تمام قومیں عروج و زوال سے
غافل ہمیشہ رہ کے خود اپنے مآل سے
چمٹے ہیں ہم رسوم و عقائد کی ڈال سے

انگڑائی لیکے تیری دنیا بھی جاگ اٹھی
قرنوں سے جو دبے تھے انھیں روشنی ملی
کی ہم نے خوب بحرِ رجز میں شناوری

اوروں نے پائی منزلِ عرفان و آگہی
سائنس ہر قدم پہ معاون بنی رہی
ہم نے زباں کی نوک پلک ٹھیک ٹھاک کی

وہ اور ہیں کہ جن کے عزائم ہیں معتبر
امکاں کو جو بناتے ہیں جولانگہِ بشر
ہم تو ہیں صرف اپنے مقدر کے نوحہ گر

گردوں کا کہکشاں پہ ہے جانے کا حوصلا
ہم سے تو صحنِ مسجدِ اقصیٰ بھی چھن گیا
جو کل بنا تھا زینۂ معراجِ مصطفےٰ

ہم خواب دیکھتے ہی رہے رام راج کا
ڈھانچہ بدل سکا نہ ذرا بھی سماج کا
اپنا لیا ہے زیست نے رستہ نراج کا

دعویٰ تو کر رہے ہیں کرپشن مٹائیں گے
یہ بھی پکار ہے کہ غریبی ہٹائیں گے
جو آج کہہ رہے ہیں وہ کل بھول جائیں گے

بس ہم تو یوں دکھائیں گے اپنی چلت پھرت
ہوگی کچھ اور تیز قدم فرقہ واریت
آپس میں اور بڑھتی رہے گی منافرت

صدیوں سے زہر پیتے چلے آرہے ہیں ہم
اے کاش آنے والی نئی نسلِ تازہ دم
امرت کا جام پی کے بڑھاتی رہے قدم

○

اُردو شاعری کی داستانِ بے عنوان

مضطرؔ مجاز

ممکن نہیں ہے ہم سے یہ بے جان شاعری — دو چار پانچ شعر کی گمنان شاعری
تقریر ہے وہ، نعرہ ہے، کرتب ہے، وعظ ہے — جب تک کہ شعر کی نہ بنے جان شاعری
ہرگز یہ مشغلہ نہیں تعطیل کے لئے[1] — جینے کا مانگتی ہے بلیدان شاعری
رخصت ہوا شباب مگر پھر بھی چند لوگ — کرتے ہیں زلف و خال کی "بی جان شاعری"
ہوشؔ[2] ملیح آبادی بھی کرتے رہے اک عمر — لفظوں کی ارتھیوں پہ فراوان شاعری
مارا ہزار زور مگر کچھ نہ کرسکی — "بے کیف عازمی" کی کم امکان شاعری
"ماہر دھیانوی" کی وہ بے دھیان شاعری — فلموں کے آسرے پہ رہی زندہ چند روز
ہلکی سی ایک وقت کی دھمکی میں مر گئی — "بے روح" شاعروں کی سُبک جان شاعری
منوا سکی نہ خود کو خطابت کے زور پر — "سنسار ساحری"[3] کی "بھیمان شاعری"
آلو بخارا، چیل، بنفشہ، کرن، سراب — کرتی ہے سامعین کو حیران شاعری
نقاد کے اشارۂ ابرو کو دیکھ کر — کرتے ہیں میر چین قلی خان شاعری!
بے بحر ہوتے ہوتے در آئی ہے نثر میں — جب ہو گئی ہے بے سر و سامان شاعری
کیا مال و زر کہ عزت و عصمت ہی لٹ گئی — نکلی تھی لے کے لولوؤ و مرجان شاعری
لفظوں کی توڑ پھوڑ سے مجروح ہو گئی — آئی تھی لے کے نقدِ دل و جان شاعری
آئی ہمارے پاس تو پاکی کے واسطے — کرتی ہے آنسوؤں سے اب اشنان شاعری

مضطرؔ خفا ہوں لاکھ یہاں پیر و فقیل
کرتے ہیں ہم تو قاطعِ برہانِ شاعری

۱؎ یہ مصرع صلاح الدین سعدی کا ہے ۲؎ بہ روایت مشتاق احمد یوسفی ۳؎ بہ روایت پرویز یداللہ مہدی

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار
(پاکستان)

ادبی دوائیں

دلِ ناداں کی غلطیوں کی وجہ سے آج کل ایسی کئی بیماریاں نمودار ہو چکی ہیں جو انسان کے دل و دماغ اور جسم و جان کے لیے بیک وقت خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ دنیا بھر کے سیانے انگریزی دوائیں استعمال کر کے دل کی ان لطیف قسم کی بیماریوں کو ٹھیک کرنے بہت سی کثیف کوششیں کر چکے ہیں لیکن چنداں کامیابی نہ ہوئی بلکہ ایلوپیتھی نے کبھی بھی اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں لیا مثلاً سرجن لوگ تو اس وقت بھی دنیا میں پائے جاتے تھے جب مہیوال رانجھا اور محترمی مکرمی بیوں صاحب جیسے عاشقانِ کرام کے دم قدم سے یہ دنیا مزین تھی۔ یہ ایک تلخ حقیقت بلکہ کھٹی میٹھی حقیقت ہے کہ وارداتِ قلب کے نتیجے میں ہونے والی شرپسندی اور تخریب کاریوں کا جب انگریزی دواؤں سے علاج ممکن نہیں رہا تو ادبی دوائیں میدان عمل میں کود پڑی ہیں اور جب تک دل کی نازک بیماریوں کا قلع قمع نہیں ہو جاتا یہ میدان عمل میں کودتی رہیں گی۔ جب مہیوال نے اپنی ران کے ٹکڑے کر کے نمک مرچ لگا کر اور فرائی پان میں تلنے کے بعد سوہنی کے حضور پیش کیا (شاید بچوان آئیل استعمال کیا ہو) سوہنی تو چٹ پٹے کباب کھا کر انگلیاں چاٹتی رفو چکر ہو گئی لیکن مہیوال بے چارے کا کسی کو خیال نہ آیا کاش کوئی دردِ دل رکھنے والا سرجن اُس کی مرہم پٹی کرنے چلا جاتا۔

محنتِ شاق اور عرصہ دراز کی عرق ریزی اور کسری کشید کے بعد چند ایک مجرب قسم کی ادبی دوائیں ایجاد کی گئی ہیں جو دل کے فعل کو درست کر کے حساس طبیعت لوگوں کو تندرست بنا دیتی ہیں۔ ادبی دوائیں بھی سائیڈ ایکشن سے مستثنیٰ نہیں اگر ضرورت سے زیادہ ادبی دوائیں استعمال کی جائیں تو آدمی نرم اور گرم قسم کی غزلیں کہنا شروع کر دیتا ہے گل و بلبل کے متعلق اشعار سوز دل کرنے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں گریباں پر قینچی کا بے دریغ استعمال کرنے لگتا ہے۔ [اور محلے کے درزیوں کے کام میں اضافہ کا موجب بنتا ہے] بعد ازاں سر میں خاک ڈال کر صحراؤں کا رُخ کرتا ہے۔

ادبی دواؤں کے متعلق تحقیق کرنے والوں نے سب سے زیادہ توجہ زخموں پر دی ہے مثلاً سینے کا زخم روح کا زخم اور دل کا زخم وغیرہ۔ لیکن زخم جگر ان سب میں منفرد حیثیت کا حامل ہے یہ اگر دردِ دل رکھتے

والے پرانے مریض کو لگتا ہے۔ یہ زخم کسی تیز دھار آلے کی وجہ سے نہیں لگایا جا سکتا لہٰذا اس کے لیے اکثر تیرِ نگاہ استعمال ہوتا ہے ماہر لوگ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے اسے اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ یہ جگر کے ساتھ ساتھ دل میں بھی ترازو ہو جاتا ہے۔ تیرِ نگاہ کے متعلق ایک چیز قابلِ ذکر ہے کہ یہ اندھیرے میں نہیں چلایا جا سکتا اور اگر نگاہ کا تیر چلانے والوں نے آنکھوں پر عینک چڑھا رکھی ہو تو یہ تیر دو دھار نہیں ہوتا۔

اگر انسان دل و دماغ کو کنٹرول کیے رکھے تو یہ زخم شاذ ہی لگتا ہے اور اگر کبھی بھولے سے جگر پر زخم آ جائے تو اس کی احتیاط بہت کرنا چاہیے خصوصاً اسے نمک دانی سے بچانا چاہیے اور بچوں کی پہنچ سے دور رکھنا چاہیے چونکہ مہلک بہت ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف توجہ بہت دینی چاہیے۔ اگر یہ زخم پرانا ہو جائے تو مریض کوئی انتہائی احمقانہ اقدام بھی اٹھا سکتا ہے مثلاً جس طرح فرہاد اور مہیوال نے کیا تھا۔ زخمِ جگر کی بیماری خصوصاً نوجوان طلباء اور ابھرتے ہوئے سیاستدانوں میں پائی جاتی ہے۔ اس زخم کے مریضوں میں مندرجہ ذیل علامات اکثر پائی گئی ہیں:

رات کو تارے گننا
بھوک نہ لگنا
روزانہ کوئی نیا اخباری بیان داغنا
رقیبوں کی شان میں نازیبا کلمات کہنا
ٹھنڈی اور گرم آہیں بھرنا
بے وقوفوں کی طرح گھنٹوں خلاؤں میں گھورنا۔
رات دن ریڈیو کے ساتھ چپکے رہنا۔

زخمِ جگر کے مریض کو "پیار پائرین" کی ٹکیاں اور "بہار مائی سین" کا انجکشن دیا جاتا ہے جس سے اس کے چودہ طبق آنِ واحد میں روشن ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں ادبی دواؤں کے متعلق مزید یہ دریافت کیا گیا ہے کہ یہ سب سے پہلے مریض کے نظامِ تنفس پر حملہ آور ہوتی ہیں (لیکن یہ حملہ اس حملے سے تکنیکی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے جو احمد شاہ ابدالی نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے ضمن میں کیا تھا) پیار پائرین کے زیرِ اثر آنے کے بعد سانسیں مہکنا شروع ہو جاتی ہیں اور ٹھنڈی آہیں مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بہار مائی سین اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا نتیجہ جذبات کی ہلچل کی صورت نکلتا ہے۔

ادبی دواؤں پر تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بہار کے موسم میں اس زخم کے مریضوں کو باہر نہیں نکلنا چاہیے کیوں کہ حسین نظاروں اور سبزہ زاروں کو دیکھ کر اس زخم میں ایک خاص قسم کا درد بھی شروع ہو جاتا ہے جسے دردِ جگر کہتے ہیں طبی لحاظ سے یہ درد مرکوز نہیں ہوتا بلکہ دل اور منہ کی جانب پھیلتا ہے اور منہ سے آہوں اور سسکیوں کے اخراج کا باعث بنتا ہے۔ ذاتی تجربہ ہے کہ اسی قسم کے مریض کے سینے پر دل کے پاس سیٹھوسکوپ رکھی تو دل کی مخصوص دھڑکن کی بجائے آواز آ رہی تھی:

کلیاں نہ جاناں ساڈے نال نال چلو جی

موسم بہار میں اگر کسی مریض کو دردِ جگر کا دورہ پڑ جائے تو دل کے مقام پر مساج کریں اور کسی شیریں دہن کو اس کام پر مامور کریں کہ وہ تواتر کے ساتھ نامِرِ کاظمی، مقدم اور غالب کی غزلیں گاتا رہے مریض کی قمیص فوراً اتروالیں کیونکہ جب بھی دردِ جگر شدید صورت اختیار کرتا ہے تو مریض کا ہاتھ فوراً گریباں کی طرف جاتا ہے۔ اُس وقت اس کے دل میں یہ خواہش شدید ہوتی ہے کہ گریباں فوراً تار تار کر دیا جائے موسمِ بہار میں تو ویسے بھی فیشن کے حساب سے پھٹے ہوئے گریباں اِدھر اُدھر ملتے ہیں اگر دورہ شدید ہو تو مریض اپنے بالوں میں خاک بھی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس قسم کی باتیں بھی کر :

ع قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو

لیکن ایسے مریض کو پکڑ کر رکھنا چاہیئے اور کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دینا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو اس قسم کی تمام حرکات اور سکنات سے پہلو تہی کرنا ہوگی جو اس زخم کے وقوع پذیر ہونے کا سبب بن سکیں بہت سے محقق اس قسم کے زخم کو فضول گردانتے ہیں اور قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھتے شاید یہی وجہ ہے کہ عشق کی بیماری پر تحقیق کم ہوئی۔ لہٰذا غالب کو پوچھنا پڑا،

ع آخر اس درد کی دوا کیا ہے ؟

بتانے والے نے پہلے معذرت کی ہوگی اور پھر اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا ہوگا۔ زخمِ جگر اور دوسری ایسی جلد بیماریوں کے لیے ایک نادر ادبی نسخہ ہمارے پاس ہے جس کے چند اجزا ایک قدیم اور پھٹی پرانی کتاب سے اغوا کیے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے قارئین میں سے کسی کو اشد ضرورت ہو۔ اس لیے اس کے اجزائے ترکیبی جان لیں جو کچھ یوں ہیں :

پونے دو تولے گل وفا
دس عدد الفت کی گٹھلیاں
سوا تولہ پیار کے بیج (اس سے زیادہ بھی ہو جائیں تو مضائقہ نہیں بلکہ ذائقہ میں اضافہ کا سبب ہوں گے)
نخلِ محبت کے چند پتے۔

ان سب چیزوں کو دل کے ہاون دستے میں کوٹ لیں اس کے بعد شبِ وصال کی چھلنی میں چھان لیں اور روغنِ گیسو بھی ملا لیں۔ لیجئے مرہم تیار ہے اب اسے زمانے سے چھپ کر ہر ماہ چاند کی چودھویں کو کسی اچھے سے سنگِ آستاں پر بیٹھ کر استعمال کیا جائے۔ مرہم لگانے کے بعد زخم پر رومال محبت کا باندھ لیں۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ اس نسخے کا ایک سائیڈ ایفکٹ ہے کہ کبھی کبھی مریض اس قسم کی باتیں کرنے لگتا ہے "مجھے چادر اور چار دیواری میں قید نہ کرو میں ساون گھر بیٹھ کر گنوانا ہلاک نہیں کرنا چاہتا مجھے باغوں میں جانے دو" اس حالت میں اگر بلڈ پریشر چیک کیا جائے تو اس میں موجود پیار کی لذت کا بڑا پتا چلتا ہے۔

بہت سے دوسرے چھوٹے موٹے امراض کی ادبی دوائیں بھی بتائی گئی ہیں مثلاً سردرد کے مریض کو چاہیئے کہ صبح صبح جب ساری قوم خوابِ غفلت میں پڑی ہو چہل قدمی کرتے ہوئے کوچہ یار کی جانب جائیں لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قماش کے مریض محبوب کے پاؤں والے نشانات دیکھتے ہوئے چلتے ہیں اور جب سر اٹھاتے ہیں تو ایک جانکاہ انکشاف ہوتا ہے کہ رقیب کی گلی کی کوٹھی میں مریض کھڑا ہے [illegible] تو درد خود بخود غائب ہو جاتا ہے۔ [illegible]

آزمانے کے بعد کہا تھا :

ع اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل ؎ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

آنکھوں میں کوئی خرابی ہو تو مریض زہرا ر دیکھیں۔ پلکوں کی خارش ہے تو پلکوں کے ذریعے دریا پہ دستک دیں خارش ٹھیک ہوجائے گی۔ بعض اوقات یہ خارش سارے جسم پر پھیل جاتی ہے۔ اسی قسم کے مریض کو ہم نے کپڑے تبدیل کر کے سوتی کپڑے پہننے کو کہا تو جواب میں فرمایا تھا " ایسا ہونا ناممکن ہے کیوں کہ جس سنگِ آستاں پر ماتھا رگڑ دیتے ہیں اُن کا کہنا ہے :

ع انہی کپڑوں میں چل کے اگر آسکو تو آؤ ؎ میرے گھر کے راستے میں کوئی لانڈری نہیں ہے

بخار کے ضمن میں ملیریا اور ٹائیفائیڈ کا علاج تو عام ہے لیکن تپِ ہجراں کا علاج کبھی کسی نے نہیں سوچا۔ یہ ہجر کی وجہ سے ہوتا ہے اس لیے وصلِ یار سے کافی حد تک ٹھیک ہوجاتا ہے۔ اگر نزلہ ہو جائے تو پھولوں کی خوشبو سونگھیں صبح کی ٹھنڈی ہوا تناول فرمائیں۔ پٹھوں میں درد ہو تو روزانہ پچاس مرتبہ زلفِ جاناں کی بلائیں لیں اس سے ہاتھوں کی کافی ورزش ہوجائے گی۔

دل کا درد بھی ایک موذی مرض ہے ادبی حکماء کے خیال میں اس کی وجہ یوں ہے کہ اکثر دلوں کے اندر بہت زیادہ تصویرِ بتاں آویزاں کرلی جاتی ہیں۔ لہٰذا دل کو ایسی ویسی چیزوں سے بچا کر رکھیں کیوں ڈاکٹر تو اسے صرف پمپ کرنے والا عضو سمجھتے ہیں جب کہ ادیبوں کے نزدیک اس کے اور بھی افعال ہیں۔ کچھ بیماریاں ایسی بھی ہیں جن کی ادبی دوائیں ابھی تک ایجاد نہیں ہوسکیں مثلاً زخمِ دل، تپِ اُلفت، پیار کی کھانسی اور سینے کی جلن وغیرہ ویسے ان بیماریوں پر ضلع محبت پور کے قصبہ پیار نگر میں وسیع پیمانے پر ریسرچ جاری ہے !!!

□□

---

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف
اور ہزاروں کی دل پسند چائے!
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب!!

LASA
SUPERFINE
TEA

لاسا اسپیشل چائے
لاسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

سیل ایجنٹس
نیلگری ٹی ایمپوریم، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد اے۔پی، انڈیا۔

اقبال ہاشمی

کرسی نامۂ جدید

ترے بندوں نے فرمائش کی ہے ہر نام کی کرسی
الٰہی تو تو مالک ہے دلا دے کام کی کرسی

کسی کو یہ اٹھاتی ہے کسی پر بیٹھ جاتی ہے
کبھی پنجاب کی کرسی کبھی آسام کی کرسی

مراٹھی اور کنڑ میں عجب ناٹک دکھاتی ہے
کبھی بمبے کبھی میسور میں بلگام کی کرسی

گدھے کے سینگ کی صورت یہ اپنے گھر سے غائب ہے
مگر لبنان میں ملتی ہے ملک شام کی کرسی

چراغ کر تیل جلتی پر تماشا دیکھتی ہے یہ
خمینی کی ہو کرسی یا کہ ہو صدام کی کرسی

پٹاخے چھوڑتی ہیں جب گلی کوچوں میں کچھ تو میں
خوشی سے جھومتی ہے متحد اقوام کی کرسی

چھپتے ہیں سبھی میوزک پہ اپنی اپنی کرسی پر
کبھی مسٹر ہیں کرسی پر کبھی مادام کی کرسی

ہر اک نیتا ہے خطرے میں ہر اک نیتا مصیبت میں
مگر چھوٹے نہیں کوئی غم و آلام کی کرسی

کئی بوڑھے بھتیجے آج بھی اس سے لڑتے ہیں
کباڑی کی دکاں میں ہے جو انکل سام کی کرسی

اگر آمادۂ پیکار ہو جائے کبھی ایواں
تو کرسی پر بٹھاتی ہے اسے بلرام کی کرسی

الٰہی بھیج دے واپس انھیں بن باس سے اب تو
کھڑاؤں ڈھوتے ڈھوتے گھس رہی ہے رام کی کرسی

یقیناً ریوڑی بانٹے گا اندھا اپنے لوگوں میں
رفاہ خاص کرتی ہے رفاہ عام کی کرسی

جسے اپنی ہی خدمت سے کبھی فرصت نہیں ملتی
بزعم خود بنی بیٹھی ہے وہ خدام کی کرسی

اداکاری اداکاری میں بن بیٹھے ہو تم نیتا
چلو بیٹھو کہ اب تو مل گئی آرام کی کرسی

مجھے دفتر کی ہر کرسی بہت ہلکان کرتی ہے
بڑا آرام دیتی ہے مگر حجام کی کرسی

کلرکی ابتداء اس کی کلرکی انتہا اس کی
وہی آغاز کی کرسی وہی انجام کی کرسی

عجائب گھر بنا ڈالا ہے تم نے اچھا خاصہ گھر
کہیں اخروٹ کی میزیں کہیں بادام کی کرسی

ادھر ہو شہر ہو جنگل ہو افسر دولت ہو شہرت ہو
سجا کر بیٹھ جاؤں میں اگر ادہام کی کرسی

گلی کوچہ ہو مسکن ہو کہیں شادی ہو ماتم ہو
لیے پھرتے ہیں مولانا ترے پیغام کی کرسی

نحوست میرے گھر کے کونے کونے سے ٹپکتی ہے
اٹھا لایا ہوں جس دن سے میں اک نیلام کی کرسی

رُباعی گنگناتے ہو، شراب پیتے جاتے ہو
کہاں سے مل گئی تم کو عمر خیام کی کرسی

نجانے کب خطابات اور تمغے بھی چلے آئیں
ابھی صاحب سڑک پر آئی ہے انعام کی کرسی

ٹھکانے سے نہیں ہیں ہوش ان کے ہاشمی لیکن
ٹھکانے سے لگا دے گی اسے حکام کی کرسی

سید مقبول حسین عابدی حیدرآباد، پاکستان

...بکرے کا ہے

آج کل ماحول پیدا ایسا اثر بکرے کا ہے
ہر زباں پر تذکرہ مقصد بجز بکرے کا ہے

وصل کے دو چار لمحوں میں گنوا دائے بقر عید
ذکرِ حالِ دل ادھر قصہ ادھر بکرے کا ہے

شہر بھر میں جس شگافِ در سے جس چلمن کے پار
اشتیاقِ دید میں دیکھا تو سر بکرے کا ہے

اشرف المخلوق کی ہے دسترس میں کائنات
مرحلہ اس ضمن میں لیکن دگر بکرے کا ہے

اے تہی دستی مری میں کیا کروں گھر میں کوئی
میری سنتا ہی نہیں ہے گھر کا گھر بکرے کا ہے

ذہن میں دل میں تصور میں خیال و خواب میں
آج ہر منزل ہے بکرے کی گزر بکرے کا ہے

آج کل معدوم ہر جلسہ مگر مینڈی سبھی
آج کل موقوف ہر فقرہ مگر بکرے کا ہے

ہر در و دیوار سے سنتا ہوں "میں میں" کی صدا
ہے اگر کوئی تو حرفِ معتبر بکرے کا ہے

تف بر اے دانشوری اے شاعری دیدہ وری
آج سودائی ہر اک اہلِ نظر بکرے کا ہے

قطعات

رہیں وہ کوٹھیوں، بنگلوں، فلیٹوں میں مکانوں میں
خلا میں چاند تاروں میں فضا میں آسمانوں میں
مگر میرے لئے سرکار نے، یہ حکم فرمایا
"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"

اب نہ دیوانہ کہے گا کوئی دیوانوں کو
کوئی ڈھونڈے گا نہ اب عاقلوں فرزانوں کو
کمپیوٹر نے سنبھالا ہے خرد کا منصب
اب فقط کارِ جنوں رہ گیا انسانوں کو

عشق میں حالات سے ہر گام پر فائٹ[1] کیا
ناخنِ تدبیر سے ہر رانگ[2] کو رائٹ[3] کیا
جنگ کے دوران بھی چھوڑا نہ دامن عشق کا
تھا بلیک آوٹ مجھے جب اس نے انوائٹ[4] کیا

۱: FIGHT   ۲: WRONG
۳: RIGHT   ۴: INVITE

انیس سلطانہ (بھوپال)

ذکر اس پری وش کا

یہ قصّہ ہے جب کا آتش نہ صرف یہ کہ جوان تھا بلکہ بزرگی کا دم بھی بھرتا تھا۔ اور گلی کوچے میں اس کی شہرت بھی تھی۔ یعنی اب سے تقریباً پچیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ . . . اور اگر محترمہ فوقیت خانم کو ہمارے اس عامیانہ لب و لہجہ کا پتہ چل جائے تو فوراً اصلاح فرما دیں گی کہ یوں نہیں بھئی یوں لکھئے "(تا) ماقبل ربع صدی کا مذکور ہے" اور جو اس ناہنجار تحریر کا پتہ چل جائے تو ساری انشائیہ نگاری پر پانی پھر جائے۔

ہماری ان کی بڑی پرانی دوستی تھی۔ کہاں ان کی سنجیدگی، علم دوستی، علم شناسی، اور علم پروری وغیرہ وغیرہ اور کہاں ہماری غیر سنجیدگی، کم فہمی نیز کم علمی . . . جا و بیجا ان کی خفگی برداشت کرتے رہتے کہ ہمارے جیسے نامعقول تو ہزاروں اور ان جیسی شائستہ ہزاروں میں ایک۔ اب میں کیسے سمجھاؤں اس جاہل کتاب کو۔ کیونکہ ایک اور چار کی گنتی ذرا الجھانے والی ہے۔ یعنی ہماری سہیلیوں کی تعداد بے شمار اور ان سے ہمارا دلی معاملہ تھا کہ ؎ "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

خانم کے پاس عربی تھی۔ آج بھی عربی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ علمیت کا بوجھ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست انھیں کو عطا کیا تھا۔ سادہ زبان میں بات کرنا کسرِ شان سمجھتیں۔ سنجیدگی کا غلاف اوڑھے رہتیں جبکہ ہمیں ہلکے سے مسکرانے کی اجازت نہ تھی۔ ہم مسکرائے اور انھوں نے کنکھیوں سے گھورا۔ اس سلسلہ میں ہم پیدائشی مجبور۔ خندۂ دنداں نما کے پیچھے کونسی مصلحت تھی۔ یہ ہم انھیں کبھی نہ سمجھا سکے۔ جب مسکرانے کی سعیِ بیجا میں ہمارے تمام دانت (جو شاید بتیس (۳۲) سے ضرور زیادہ رہے ہوں گے) نمودار ہو جاتے۔ اور انھیں بڑا شاق گزرتا۔

"اسلام دینِ متین ہے"
راہ چلتے ہوئے نقاب سنبھالنا ہوتا۔
"پردہ عورت کا اکرام ہے"

ازراہِ شوخی کسی پر ہم نے فقرہ چست کیا۔ بول گیا ہوں میں۔ "پہلے تولو پھر بولو" چنانچہ [illegible] لیے انھوں نے عربی میں ایم۔ اے کر ڈالا۔ اور تاب دہریت سے محروم ہم بیچارے ابد تک [illegible] رہے۔ وہ [illegible] ان سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ انفرادی شان قائم رکھنے کا [illegible] بے شوق رہتا

جس راہ سے بھیڑ جا رہی ہوتی، وہ راستہ بدل دیتیں، لیکن روش عام پہ چلنے سے کتراتیں۔ چنانچہ عربی کے علاوہ محترمہ علم ریاضی میں بھی شغف رکھتیں۔ ایک مضمون اُن کا ریاضی بھی رہا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے روز جزا کے حساب کتاب کے خوف سے اس دنیا کے مادی حساب سے انھوں نے توبہ کرلی۔

پھر مقامی کالج میں میرا تبادلہ ہوگیا۔ محترمہ آج کل وہیں تھیں۔ برقع میں لپٹے لپٹائے ہم لوگ بھوبندی گھر سے کالج تک آتے۔ دروازہ میں داخل ہوتے کہ برقع پرس میں نظر بند۔ لیکن خانم کلاس روم تک اوڑھے ہوئے جاتیں۔ ہم تو ہمیشہ سے ان سے ڈرتے آئے تھے (اور تادم تحریر ڈر رہے ہیں ـــ!) دبی زبان سے کچھ کہتیں۔ ارشاد ہوتا۔

"جتنی دیر اس حیات مستعار میں شیطان لعین کے پھندے سے بچے رہیں، انسب ہے ـــ"

کبھی کبھی نہایت بے ساختگی میں فرماتیں۔

"جتنی دیر گناہوں سے بچے رہیں، غنیمت ہے۔"

پھر اچانک موصوفہ کو علمیت میں اضافہ کا خیال آیا۔ فارسی بقول ان کے، ان کی گھر کی لونڈی تھی۔ اس لیے انھوں نے فارسی میں بھی ایم اے کر ڈالا۔ بھوپال یونیورسٹی ابھی پردۂ ظہور میں نہیں آئی تھی۔ اجین میں جلسۂ تقسیم اسناد ہونے والا تھا۔ (پتہ نہیں بھوپال یونیورسٹی اپنی اسناد کس نوع سے مہیا کرتی ہے؟ شاید بھوپال یونیورسٹی نے آج تک اپنا کوئی جلسہ برپا نہیں کیا ـــ!) محترمہ ہر چند کہ پہلے سے ایم اے تھیں لیکن آج تک کبھی سند لینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رہبری کے لیے ہم پہ دباؤ ڈالا گیا۔ حالانکہ موصوفہ کے برادر عزیز ساتھ تھے۔ لیکن ہماری تجربہ کاری کے تحت ہم میر کارواں قرار پائے۔

طلباء کے لیے یہ سفر بڑا اہم اور دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ رات کی ٹرین کے تمام دوسرے مسافر سوائے فرسٹ اور ریزرو کے یہی قوم ہوا کرتی۔ اور اس قوم کی ہنگامہ آرائیاں۔ ٹرین جو رات کو تین بجے وہاں پہنچتی تھی۔ اس رات خصوصیت سے صبح سات بجے پہنچی۔ اگر ڈرائیور تیز رفتار سے چلانے کی کوشش کرتا تو زنجیر کھینچ دی جاتی۔ اور یوں قدم قدم پر نیا دانہ کھاتے، نیا پانی پیتے، اندر کم بیٹھتے، باہر زیادہ ٹہلتے روانہ ہو جاتے اور نہایت بے ہنگم بے سرے راگ الاپے جاتے۔ زندگی سے بھرپور یہ گیت۔

لیڈیز کمپارٹمنٹ میں خانم کی سمع خراشی ہو رہی تھی۔ بار بار اٹھ اٹھ کر گھورتیں (ہمیں نہیں لڑکوں کو) لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش؟

محترمہ نے کھولا، لپک کر کھڑکی سے لٹک کر گانے والے ایک صاحبزادہ کو ہلا دیا، بس جناب بپھر گئے۔

اب موصوفہ ہیں کہ کمبل تانے لیٹی ہیں۔ اور ہم ہیں کہ لڑکوں کو سمجھا رہے ہیں۔ ارے بھئی غلطی سے آپ پر چلا گیا ہوگا، کوئی جان بوجھ کر کیوں ایسا کرے گا ـــ؟ لیکن ادھر سے ـــ

"ہائے میڈم نمونیہ ہو جائے گا۔"

"[illegible] دوسرے کپڑے بھی نہیں۔"

اور [illegible] ہر انگ سردی ہے۔" (جنوری کا مہینہ تھا)

"میڈم کی جگہ کمبل میں لپٹے ہوئے بنڈل نے لے لی ہے تو ہر اسٹیشن پر پلیٹ فارم سے

تحفے تحائف کے ڈھیر آنا شروع ہوگئے۔ پہلے مونگ پھلی کے چھلکے آئے۔ پھر کیلے کے چھلکوں نے ان کی پیروی کی۔ گاجر اور شلغم تو مسلسل ان بنڈل پر نثار ہونے لگے۔ اور ہم تھے کہ مارے سردی (غصّہ ہرگز نہیں) تھر تھر کانپ رہے تھے۔ غنیمت تھا کہ کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں میں سلاخیں تھیں، نہ سہی شیشہ۔
پتہ نہیں کون سا دل لے کر آئی تھیں۔ وہ غریب بے چارا، سردی و پانی کا مارا، چلّا رہا تھا —
"بے بے میڈم چائے پیئیں گے۔
خانم میڈم چائے پلا دیجیے"۔
نہایت فیصلہ کن لہجہ میں (کمبل سے منہ نکال کر) — "معاف کیجیے یہ میرا پیشہ نہیں ہے"۔
بس یہ نہ پوچھیے کہ ہم پر کیا کیا نہیں گزری رو سکتے نہ تھے، ہنسنے کا یارا نہیں۔ درویشی کی اس ادا سے ہم نا واقف جو خود اپنی جانِ ناتواں پر قہر ڈھایا جاتا ہے تو کیوں کر — ؟؟
اگلے ڈبے میں محترمہ کے باڈی گارڈ (برادرِ عزیز) بھی موجود تھے۔ یقیناً اس ایکٹوٹی کی انھیں تفصیلی رپورٹ مل چکی ہوگی۔ فوراً بذریعہ بس، انھیں واپس لانا چاہا۔ کچھ ہماری مروت، کچھ مصلحت آڑے آئی۔ بڑی مشکل سے بات رفع دفع ہوئی۔
شناسا لوگوں سے ہم نے محترمہ کا تعارف کروایا لیکن تعارف ادھورا ہی رہ گیا۔ نام تو بتا دیا، یہ کیوں نہ بتایا کہ پروفیسر بھی ہیں۔ اور "یہ بھی" کیا معنی یعنی کہ بس پروفیسر ہیں۔ چنانچہ ہم نے آج کے دن کی پہلی خفگی ہنستے ہنستے برداشت کی۔
اِس تفصیل میں دوسری تفصیل رہی جا رہی ہے یعنی راحت فارسی کی لکچرر تھیں۔ نہایت الھڑ مزاج اسی سال ان کا تقرر ہوا تھا۔ خانم کی سنجیدگی کا ہم جتنا احترام کرتے، راحت اتنا ہی انھیں چٹکیوں میں اڑاتیں۔ وہاں ہم لوگ اپنی ایک سہیلی کے گھر زبردستی کے مہمان بن بیٹھے تھے۔ آتے ہی فرمائش ہوئی پہلے پانی ابلنا چاہیے۔ (محترمہ ہمیشہ ابلا ہوا پانی استعمال کرتی ہیں اور یوں بھی اُن کا پانی راہ گیروں کے کام آگیا تھا۔) پھر نہایت نفاست سے کی پلیٹ نکالی۔ چمٹی سے پکڑ کر جھولے میں سے ابلا ہوا انڈا برآمد کیا۔ توبہ! انڈوں کا جوڑا نکالا۔ ہم کوئی ان سے الگ تھوڑا ہی تھے۔ راحت دیکھتی رہیں۔ دیکھنے سننے پر کوئی پابندی تھوڑا ہی ہے — ہمارا کیا کیا جی چاہا کہ سب مل کر کھائیں لیکن یہ سماج وار انھیں قطعی پسند نہ تھا۔ راحت کی شوخیاں تو خیر لاعلاج ہوئیں ہی، سلمیٰ کی سنجیدگی اور متانت کی قدر داں ہوتے ہوئے بھی اس سے ایک ممتاز سلوک روا رکھتیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی لیکن بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکتی۔ ہم سب بچپن کے دوست تھے۔ دانت کاٹی دوستی، تکلفات میں بدل جائے گی، یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔
ایک روز کی بات ہے، سلمیٰ نہایت اداس تھی۔ اس کے باپ مستقل بیمار رہتے۔ ان کے بارے میں اس نے بتایا کہ دماغ میں خلل آگیا ہے۔ خانم سے برداشت نہ ہوا۔ کہنے لگیں "والدہ محترمہ کے لیے کوئی یوں کہتا ہے؟ یوں کہیے کہ ان کے قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں۔"
بہ صد مشکل تو سلمیٰ کی بڑی بہن نے اسے ہمارے ساتھ بھیج دیا تھا۔ کچھ تو ماحول بدلے گا لیکن یہاں تو اپنے ہی بدلے بدلے دکھائی دے رہے تھے۔ خیر —!!

ہمیں ایک گوشہ میں لے گئیں، گوشۂ عافیت سمجھ لیجئے۔ تمام تر توجہ ہماری ضیافت پر مرکوز کر دی گئی۔ دوست، دشمن سب جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں دھوبن آ دھمکی۔ ہم لگے دھوبن کی خیر خیریت کرنے ... خدا کی ذات ان کی طرف سے دھیان ہٹا تھا کہ محترمہ اپنے استری دار مکلف کپڑے لیے پہنچ گئیں۔ سوٹ کیس میں رکھتے سے استری خراب جو ہو گئی تھی: اور ساتھ میں اپنا تعارف بھی۔

دیکھو دھوبن باقی ہم لوگ پڑھتے نہیں، پڑھاتے ہیں۔ میں گزیٹیڈ آفیسر ہوں۔ اور یہ دیوانی بھی (ہماری طرف اشارہ کر کے، بڑے پیار سے فرمایا۔) گزیٹیڈ آفیسر ہیں۔" دھوبن بے چاری نے کبھی کا ہے کو یہ نئی دیکھی ہوگی۔ وہ تو یہی سمجھی ہوگی کہ کوئی نئی بات ہے۔

اس سے پہلے کہ میزبان سے ان کا تعارف ہوتا، بول اٹھیں "میں گزیٹیڈ آفیسر ہوں"۔ ہم سب مؤدباً سر جھکائے ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

پھر تو یہ ہوا کہ ہم چھتری چوک پہنچے، مہندی خریدنے، وہاں کے تمام دکانداروں کے علم میں اضافہ ہوا لاکھوں تو نہیں، البتہ لاکھ کی چوڑیاں خریدی گئیں۔ چوڑی والوں کے علم میں گزیٹیڈ آفیسری کا اضافہ کیا گیا کما حقہ کچھ دیا ... خوبصورت گیا ... میں بیٹھنے کا شوق ... موصوفہ تو تانگہ والوں کے علم میں اضافہ کا۔

بلکہ ادھوری رہی جاتی ہے، اگر اس موقع پر تصویر نہ کھنچوائی جائے۔ چنانچہ فوٹو گرافر کے یہاں پہنچے ہم لوگ کہ ہمارا قافلہ پنج تن پاک پر مشتمل تھا۔

محترمہ یوں بھی خاصی قبول صورت ہوا کرتی ہیں۔ انھیں خیال ہوا کہ ہمیں بھی سنوارا جائے۔ ہم کہاں ان چکموں میں آنے والے تھے۔ انھوں نے نہایت خلوص سے ایک جوڑا ایکسٹرا آویزے ہماری خاطر مہیا کئے۔ اب مصر ہیں کہ پہن لو۔ ہم بدستور انکاری۔

"ارے بھئی ماضی میں تو پہنتی تھیں۔"

اصرار و انکار کی اس فضاء میں کم و بیش دس بار ماضی میں بندے پہنائے گئے۔ راحت سے نہ رہا گیا ــ "ماضی میں پہنتی تھیں کہ کانوں میں؟" چپکا بہ جبیں تو ہوئیں۔ زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار تھوڑا سا لطف بھی لیا۔

ہم سب دراز قد، موصوفہ بوٹا سے قد کی مالک۔ چنانچہ بات کچھ جم نہیں رہی تھی۔ سو ہم لوگوں نے یوں کیا کہ ہم میں سے دو یا جوج خانم کے میمنہ اور دو ماجوج میسرہ پر تعینات ہوئے۔ ان کے پاس کیمبرج کی ڈگری ہمارے ہاتھ میں صرف اس کا خول کہ ان کا علم ٹھوس اور ہمارا صرف سطحی۔ اور پھر تصویریں یہ سب کہاں دکھتا ہے۔ گاؤن فوٹو گرافر نے مہیا کر دیا تھا۔ یوں ہم سب نے ان کے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔

شام کو طے کیا گیا کہ فلم دیکھی جائے۔ نہایت سختی سے انکار ہوا۔ عذاب قبر سے ڈرایا گیا۔

"جب باری تعالیٰ پوچھے گا، تمہارا رب کون ہے؟ کیا جواب دوگی؟"

پھر آپ ہی فرمایا:

"هو الا ستقتس فوق الا ستقسات"

ترجمہ سے بھی نوازا گیا۔

"وہ عنصر ہے سب عناصر پہ فائق۔"

لیکن ہم لوگوں پر ان کے وعظ و نصیحت کا کیا اثر ہوتا تھا۔ مجبوراً انھیں اقرار کرنا پڑا۔ بس وہی اولاد تھا جو بدبختی کے ہاتھوں قتل ہوتے وقت جیولس سیزر کا رہا ہوگا۔ حیرت اور افسوس کی اس فضاء میں جب ان کا اقرار نامہ ہم نے موصول کیا تو اُن کے چہرے پر بڑے بڑے سوالیہ نشان تھے۔ ہمارے اگلے پچھلے تمام گناہوں سے ڈرانے کو کافی تھے۔

دل آنند کی کوئی فلم تھی بشاید۔ جانی میرا نام۔ ہیرو کی جلد نوازیاں دیکھ کر ڈاہون والی تقصیدی پر ایمان لانا پڑا۔ ہیروئن کی واہیات حرکتیں۔۔۔ ان کی حرکت قلب تو نہیں ما تع نظر ضرور ہوئیں۔ گھٹنوں میں منہ دیئے توبہ استغفار میں معروف۔ اور ہم لوگ اس ڈانٹ ڈپٹ سے خائف جو واپسی میں ہم پر پڑنے والی تھی مگر کیوں جناب قسمت بھی ہم پر مہربان تھی۔ پکچر ختم ہوتے ہی واپسی کی ٹرین پکڑنا تھی۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ غالباً واپسی کی تفصیل نہیں بتاتا۔ فاہیان کے تجربات سے بھی دنیا مستفیض ہوتی رہی۔ لیکن گزیٹیڈ آفیسری واپسی نے تو تہلکہ ہی مچادیا۔

واپسی میں بھی ہم لوگوں نے لیڈیز کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کی ٹھانی۔ اب نہ وہ ہنگامہ آرائیاں تھیں، نہ وہ طبلہ نوازیاں۔ خاموشی سے سفر کٹ جاتا۔ لیکن ؎

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے۔

ٹرین میں حسب معمول بھیڑ تھی۔ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں نسبتاً کم بھیڑ تھی کہ اچانک کسی چھوٹے اسٹیشن سے ایک غول ہمارے کمپارٹمنٹ میں چڑھ آیا۔ شاید کسی گاؤں میں ہاٹ کا دن تھا۔ ہم لوگوں نے تھوڑا کھسک کر ان کے لیے جگہ بنانی چاہی۔ محترمہ فوقیت خانم کے لیے یہ امر نا قابل برداشت ثابت ہوا۔ گر جیسی بھی اور برسیں بھی پہلے تو ان حضرات کو نہایت شستہ و شائستہ زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی۔

"آپ لوگ نہایت نامعقول ہیں۔ خواتین کے کمپارٹمنٹ میں آپ کیسے آگئے؟"

کوئی جواب نہ پاکر اور چیں بہ جبیں ہوئیں

"ابھی اسی وقت تشریف لے جائیے" لیکن چلتی ٹرین نے تشریف لے جانے میں رکاوٹ ڈالی۔ ہم لوگ حیران ہی نہیں پشیمان بھی تھے۔

"سمجھتے کیا ہیں آپ لوگ، ہم کوئی جاہل محض ہیں ۔۔؟" ان حضرات کے ساتھ ساتھ بچے، عورتیں (ان کے ساتھ والیاں) خاموش تماشائی بنی ہوئی تھیں۔ اور ہم لوگ ہی کونسا ایکٹیو (ACTIVE) پارٹ ادا کر رہے تھے۔

"ابھی زنجیر کھینچتی ہوں۔ کیسے ہمت ہوئی آپ لوگوں کی۔ ابھی پتہ چل جائے گا۔ میں گزیٹیڈ آفیسر ہوں"

زنجیر تو خیر ان کے نازک نازک ہاتھوں سے کیا کھنچتی، البتہ گزیٹیڈ آفیسری نے تہلکہ مچادیا۔ اور گزیٹیڈ آفیسری کی تہمت لگائے، سر جھکائے، ہم بھی سمٹے، سکڑے ایک گوشہ میں بیٹھے رہے۔ راحت بے ساختہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ سلمیٰ تک مسکرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ منیرہ الگ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حیرانی لیے تاک رہی تھی۔ اور گزیٹیڈ آفیسر اپنے تمام رعب و داب کے ساتھ نادر شاہ درانی کی یاد تازہ کئے ہوئے تھیں۔ خدا کے حضور میں جھکنے پر مجبور کر رہی تھیں (دعائیں)

"اے خدا تیرے پاس انصاف ہے، اگر ہم نے زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہو۔۔ تو باری تعالیٰ

بس ایک دعا قبول کرے۔ ہمیں ایسے گزیٹیڈ آفیسر سے بچا۔ یا پھر انہیں اس عہدۂ جلیل سے بچا! کیونکہ یہ امر تو برحق ہے کہ

اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

اس عہدۂ جلیل پر یاد آیا کہ آج کل محترمہ ترکِ وطن کرکے، کسی یونیورسٹی کو آباد کیے ہوئے ہیں ــــ!!

دلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند **دوپٹہ**

دلہن سب سے زیادہ جس کپڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کپڑا دوپٹہ

صرف اور صرف

اے ایچ زری والا ــــ کا ہوگا

اس کے علاوہ ــــ ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک

بنارسی سلک ساڑیاں تنچوی ۔ ساٹن ۔ جارجٹ ۔ آرگنزا ۔ ٹشو ۔ شفان ۔ پٹولہ
بروکیڈ ۔ دھرماورم ۔ کانچی ورم ۔ پوچم پلی ۔ نارائن پیٹ ۔ میسور کریپ ۔ ایمبرائیڈری اور ڈیزائینر ساڑیاں

خصوصی کاؤنٹر: میاچنگ کے بلوز ۔ دوپٹہ ۔ کرتے اور فالس۔

ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے۔ ایچ۔ زری والا

لاڈ بازار، حیدرآباد۔۲۔ کیبل "زری والا"

PH: 525232

رؤف خوشتر (بیدر)

بیت الضعفا

وحشت، عدم تحفظ، اضطراب، تشویش، شکست در شکست (شکست و ریخت کی اصطلاح صرف تنقید میں رائج ہے) کے ملے جلے جذبات و احساسات سے اب ہم گزر رہے ہیں۔ جی نہیں اس سے آپ یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ ہم جدید ادب کا شدت سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور بھی غم ہیں زمانہ میں جدیدیت کے سوا۔ بات یہ ہے کہ ہماری کوچ دامن صاحبہ کے خیریت نامہ سے ہماری خیریت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اب کے مستقل طور پر ان کا ہمارے یہاں قیام پذیر ہونے کا ارادہ ہے۔ ادھر بیگم "کتنی حسین ہے زندگی کتنی جواں ہے زندگی" گنگنا رہی ہیں اور ادھر ہمارے شریر صاحبزادے نغمہ سرا ہیں۔

شاید میری دادی کا خیال دل میں آیا ہے ؛ اسی لیے ممی نے اپنی ممی کو بلایا ہے

اور ہم روتے بسورتے غزل سرا ہیں ع

عمر جلووں میں بسر ہو یہ ضروری تو نہیں

آخر کوئی آتش فشاں پہاڑ کے سائے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ ہمیں جاپانیوں کی جرأت مندی اور ان کی قوت برداشت پر رشک آیا۔ لیکن ان آتش فشاں پہاڑوں کی شعلہ روانی قبل از وقت معلوم ہو جاتی ہے اور یوں بچنے کی مہلت ملتی ہے۔ لیکن ہمارے متحرک آتش فشاں پہاڑ کی شعلہ بیانی اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ چھپنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ پھر صاحب اگر ہم بھی اتنے جرأت مند واقع ہوں تو ہم میں اور جاپانیوں میں کیا فرق رہ جائیگا۔

بہر کیف و صد حیف ہم خوش دامن کی اس دائمی آمد کو معروف و مغرور وزراء کے اپنے حلقوں کے بھولے بھٹکے دوروں کی طرح مختصر ترین کرنے کی تدبیر سوچنے لگے۔

پھر ایسے میں ہمیں اپنے دائمی کرم فرما نجم الدولہ کی یاد کیسے نہ آتی۔ دائمی کرم فرما اس لیے کہ ہمیں ازدواجی بندھن میں جکڑنے کا پورا سہرا آپ کے سہارے جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے حضور میں پیش ہوئے اور اپنی وحشت بتلائی۔ سن کر کہنے لگے۔

"ہاں یہ کونسا مشکل کام ہے۔ تم نے شاید سنا نہیں اور سنتے بھی کیسے شادی سے پہلے تم سمیع عالم تھے اب شادی کے بعد سمیع خانم ہو گئے۔ تمہارے کانوں پر بیوی اور آنکھوں پر فی دی کا مساوی قبضہ ہے اور۔۔۔

ہم نے کہا

بیوی کی باتیں، ٹی وی کی سماعتیں اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی اِن سے نجات پائے کیوں

یوم الدولہ پھر بولے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کسی مہربان نے نوجوانوں پر ترس کھا کر بیت الضعفا کھول رکھا ہے۔ جہاں معقول معاوضہ پر اب ہم اپنے بوڑھے بوڑھیوں کو رکھ کر مکانوں میں آنے والے زلزلوں سے نجات پا سکتے ہیں۔ چلو تمہیں وہاں لئے چلتا ہوں"۔

داماد کو اور کیا چاہیئے۔ لہٰذا ہم اُن کے ہمراہ بیت الضعفا پہنچے۔ مہتمم نے محاذ سے لوٹے ہوئے گھائل سپاہی کی طرح ہمیں گلے لگاتے ہوئے دلاسہ دلایا۔

"برخوردار تمہارا غم اب ہمارا غم۔ تمہاری آنے والی بلا کو ہم ٹال اور پال سکتے ہیں۔ بیت الضعفا اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ اپنے اُن رشتہ داروں کو جن سے آپ کی بنتی نہیں ہے، ہفتوں یا مہینوں ہمارے یہاں رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے اُن کے قیام طعام کا ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ آپ سے کنارہ کش اور آپ خواہشوں سے ہم کنار ہوں گے۔"

ہم نے اس اقامت گاہ کو زنانہ و مردانہ حصّوں میں بانٹ دیا ہے۔ مردانہ حصّہ میں بوڑھے سیاستداں کے لیے حاضرین، پُرانے اداکاروں کے لیے ناظرین اور ضعیف شعراء کے لیے سامعین کا خاص انتظام ہے۔ ایک بڑے ہال میں ڈھیر سارے اخبارات رکھے گئے ہیں۔ جہاں ضعیف حضرات ان اخبارات پر ٹوٹ کر حرف حرف چاٹ کر سیر حاصل بحث کرسکیں۔ چغلی یہاں کی خاص ڈش ہے۔ اس کے علاوہ غیبت گوئی، الزام تراشی دل آزاری، نوجوانوں کو کوسنے اور گالیاں دینے جیسے انڈور گیمس بلا ناغہ منعقد ہوں گے۔ بوڑھے اپنے دلوں کا غبار یہاں موقع بہ موقع نکال سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کے مکانات ان کی بوجھل نصیحتوں کے غبار سے پاک ہوں گے۔ خواتین کے حلقہ میں ایک سسکتا ہوا ہال ہوگا جہاں بڑھیوں کے ہاتھ میں ایک ایک گھڑا دیا جائیگا۔ تاکہ وہ دنیا بھر کا رونا روتے ہوئے گھڑا بھریں، ہماری خواتین کا اسٹاف اُن کی بہو کا رول ادا کریں گی تاکہ وہ ان کو کوس سکیں۔

ہمارے بیت الضعفا میں افتتاح کے دن سے نوجوان مرد و خواتین کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور ہر کوئی اپنے خسر و خوش دامن کو ہمارے یہاں شریک کروانا چاہتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اس فلاحی ادارے سے کتنے ہی خاندان اُجڑنے سے بچ جائیں گے گھریلو جھگڑے، رنجش، مقدمہ بازی اور طلاق جیسی واردتیں اب نہیں ہوں گی۔ خواتین کو ساس اور داماد کو خسر سے اب چھٹکارا مل جائے گا۔ ازدواجی زندگی خوش و خرم بسر ہوگی۔

بوڑھے سیاستدانوں کی ہمارے یہاں شرکت سے ملک کی کایا پلٹ ہوگی۔ جوان و تازہ خون ملک کی خدمت میں لگ جائے گا۔ اور یوں ملک اکیسویں صدی میں داخل ہوجائے گا۔ بیسویں صدی کی اشیاء میوزیم میں اور بیسویں صدی کے بوڑھے بیت الضعفا میں ہوں گے۔ ہم اپنے اس ادارے کی شاخیں ملک کے ہر بڑے

شہر میں کھول کر قوم و ملک کی مثبت خدمت سر انجام دیں گے۔

اب ہمارے بوڑھے سماج کو نوجوانوں کی ضرورت ہے اور بوڑھوں کو یک گونہ بے خودی چاہئے۔ اور یہ بے خودی انھیں یقیناً ہمارے ادارے میں میسر ہوگی۔ پند و نصیحت کے دریا وہ بہا سکتے ہیں جس میں ڈوبنے والا کوئی نہیں ہوگا؟

مہتمم بیت الضعفا کے بوڑھوں کے متعلق نئے خیالات سے ہم بے حد متاثر اور خوش ہوتے کہ چلو خوش دامن سے اب ہم چھٹکارا حاصل کریں گے۔ ایک دوسری دائمی تشویش کو دور کرنے کے لیے پوچھا۔

" آپ مظلوم و مجبور شوہروں کے لیے بھی کچھ کیجیے کہ وہ اپنی نصف بہتر کے ہاتھوں نصف بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔" مہتمم کا جواب تھا ـــــ

" بہت جلد شوہروں کے لیے بیت الاماں کھول رہا ہوں۔" اس جواب سے خود کو محفوظ جان کر ہم محظوظ ہوئے۔ امید کہ آپ بھی خوش ہوں گے۔

△△

نیک خواہشات کے ساتھ

ٹرو کیر بلڈنگ کنسٹرکشن سنٹر

TRUE CARE BUILDING CONSTRUCTION CENTRE

مقابل تاج آئس کریم نامپلی

فون: 234197

پروپرائٹر

محمد عبد السمیع خاں

غزلیں

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

بڑی بیوی تو یارو بھڑبھڑی ہے
مگر چھوٹی بہت ہی سرپھری ہے

جہیز پانے کی بابا کو خوشی ہے
دلہن نوشہ کی خالہ سے بڑی ہے

عمارت میں جو اتنی پختگی ہے
پرانی ہڈیوں میں اصلی گھی ہے

کہیں بیٹوں کی اک پلٹن کھڑی ہے
کہیں تو چھوکری پر چھوکری ہے

گیا جو باپ پر ہوَلا ہی نکلا
جو ماں پر گیا وہ نمبری ہے

ہوئے برباد سکے میں نہیں غم
ابھی سسرال میں اک دمڑی ہے

بھٹک کر آگیا واعظ کے گھر میں
یہ کالا مرغ قسمت کا دھنی ہے

بحث مت کیجئے گا آپ ان سے
یہ مولانا کی اُلٹی کھوپڑی ہے

وہاں ممکن نہیں "چکر" لگانا
سُنا اُن کی گلی بھی اک رُخی ہے

لگاؤ شاعرو اب کیو لگاؤ
چلے آؤ نئی محفل سجی ہے

وہاں سے بارہ شاعر آگئے ہیں
جو چندو لال کی بارہ دری ہے

اُگلواؤ غزل شاعر سے لیکن
کئی شعراء کے گھر میں کرکری ہے

وہ لندن ٹائم بتلاتی ہے یارو
جو میوہ مارکٹ والی گھڑی ہے

ظریف اس طرح پھرتا ہے اکڑ کر
وہ جیسے شاعروں کا چودھری ہے

بجلی کھونسلاوی (رائے پور)

لگا منہ سے پیالہ پی شراب آہستہ آہستہ
مگر ہر گھونٹ پر رکھا اک کباب آہستہ آہستہ

مسلّم مرغ و ماہی ہے ادھر بریانی کی ڈش ہے
ہے تجھ پر منحصر جتنا بھی داب آہستہ آہستہ

بشکم کو بھول جا" بس ذائقے پر جان دے پیارے
بلا سے کل کو لگ جائے جُلاب آہستہ آہستہ

مئے گل رنگ لاتی ہے سرور و انبساط اول
مگر کردیتی ہے خانہ خراب آہستہ آہستہ

امارت میں توازن آدمی جب رکھ نہیں سکتا
تو بیڑہ غرق ہوتا ہے جناب آہستہ آہستہ

حکومت اپنی جمہوری ہے لیکن آج کے وزراء
بنے جاتے ہیں راجہ اور نواب آہستہ آہستہ

ہزل میں بھی مقام اپنا بنے گا ایک دن بجلی
حقیقت بن کے اُبھرے گا یہ خواب آہستہ آہستہ

• پروفیسر — وجیش ساریکر
• مترجم — یٰسین رضا ایم اے، بی ایڈ

زندہ مُردہ

"سچ سچ بتاؤں —— یہ بات خود میرے لئے بھی ناقابل یقین تھی۔"

"بالکل آپ کی طرح —!"

"لیکن یہ ایک دم صحیح بات ہے کہ میں سچ مچ مرچکا ہوں۔"

"ہاں —! ہاں —! تم سمجھ رہے ہو اُسی طرح کی موت — اُسی طرح کی موت جو دوسروں کو آتی ہے۔ جسم ٹھنڈا ہوچکا ہے۔ بے جان۔ پلنگ پر بے حس و حرکت پڑا ہوں اور یہ سب کچھ انجانے میں واقع ہوا۔ مجھے خود بھی حیرت و استعجاب کا جھٹکا لگا جب مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ میں واقعی مرچکا ہوں۔"

دوستوں کو تکلفانہ ہی کیوں نہ ہو، دُکھ ظاہر کرنے کا موقعہ نہ دیتے ہوئے۔ ڈاکٹروں کی رنگی برنگی دوائیاں نہ لیتے ہوئے ان کی جیب نہ گرم کرتے ہوئے موت آجائے —— تو اُسے موت کیسے کہا جائے؟ موت کا خوف و ہراس پھیلنا چاہیئے۔ آنکھیں پتھرانی چاہیئے۔ گھگی بندھ جانی چاہیئے۔ جسم دھیرے دھیرے شل ہونا چاہیئے۔ اس طرح کے مرتے ہیں جو مرتے ہیں ... وہ اس کی بے موقع اچانک موت نے ختم کردیا۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔ موت کو آنا تھا۔ آگئی۔ اور میں مرا پڑا ہوں۔ دھیرے دھیرے میرے چاروں طرف بھیڑ اکٹھا ہو رہی ہے۔ میری بیوی گلہ پھاڑ کر بین کررہی ہے۔ میرے معصوم بچے میرے بے رنگ چہرے کو سوالیہ نظروں سے گھور رہے ہیں۔ انھیں ڈر سا لگ رہا ہے۔ بچوں کو چھاتی سے لگاکر وہ جو آہ و زاری کررہی ہے۔ اسے دیکھ کر مجمع کی آنکھیں بھی گیلی ہورہی ہیں۔ سچ کہوں — اگر میری بیوی نے اتنی محبت تمام زندگی میں ایک بار بھی دکھائی ہوتی تو میں آج کبھی نہ مرتا۔ اتنی پیار کرنے والی بیوی کو چھوڑ کر کون احمق ہے جو مرنے کی سوچے گا۔ اُس کی آہ و زاری دیکھ کر مجھے چند لمحوں کے لئے بہت عجیب سا لگا۔ وہ بین کرتے کرتے میری خوبیاں بیان کرتی جارہی تھی۔

"کیا کہوں — انہوں نے مجھے کبھی چار انگلیوں سے بھی نہیں مارا اور نہ کبھی دُکھ دیا جی زندگی میں —!" [مرنے کے بعد بھی تو کبھی سچ کہنا چاہیئے نہ، دوستو — سچی بات یہ ہے کہ میں نے اُسے اس لئے نہیں مارا کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا بلکہ مجھے اس کے مضبوط اور سخت ہاتھوں سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں مجھ پر نہ پڑ جائیں۔]

"مجھے کبھی کوئی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ کل ہی میرے لئے ایک قیمتی ساڑی لے آئے۔ میں نے کہا بھی کہ مجھ مردہ کے لئے کیوں لائے۔ اپنے لئے کپڑے لانا تھا۔"

[ساری اس لیے رونی پڑی تھی دو ستو کہ وہ روز سے لگاتار مجھ سے جھگڑا کر کے ناک میں دم کر رہا تھا میرا۔ وہ نہ کون عقل مند ہے جو اپنی بیوی کے لیے اتنی قیمتی ساڑی لاتا ہے۔ دوسرے اُس کی دردرغ گوئی سنو۔ وہ زندہ ہو کر خود کو مُردہ کہتی ہے۔ یہ کھلی ناانصافی ہے۔ میں خاموشی سے کیسے برداشت کروں۔ یہ ساری مُردہ برادری کی توہین ہے۔ زندہ لوگ — مردہ باد —!]

" کل ہی باہر کسی گاؤں سے آئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ موتی چور کے لڈو بناؤ۔ میرا بہت دنوں سے کھانے کو دل کہہ رہا ہے۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں جان پر آگیا میرے خدا۔ بنا لڈو کھائے مر گئے نا۔ کیا میں ان کے لئے لڈو بھی بنا کر دے نہیں سکتی تھی ؟"

[یہ بھی سراسر غلط — یہ صحیح ہے کہ مجھے لڈو پسند ہیں۔ پرسوں میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے دو لڈو مانگے تھے۔ ان لڈوؤں میں سے جو وہ بیچنے جاتے وقت ساتھ لئے جا رہی تھی، جواباً وہ مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔]

عقل مند عورتوں نے میری بیوی کو بہت دیر تک میرے پاس کھڑا رہنے نہیں دیا۔ دور ہٹا کر لے گئیں۔ اب میرے سامنے کچھ دکاندار کھڑے ہیں۔ جن کے قرض مجھ پر باقی ہیں۔ سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مگر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہر مہینے جب میں ان کے سامنے روتا تھا کیسے دانت نکالتے تھے۔ میرے اپنے چوڑے خاندان پر یوں طعن و تشنیع کرتے جیسے مجھ پر ان کا پیدائشی حق ہے۔ یہ طوطا رام کرانے والا — ایک کلو شکر مانگنے پر پاؤ بھر باندھ کر دیتا تھا۔ یہ چکٹ مل سندھی۔ ایک پاجامہ کا کپڑا مانگنے پر ایک چڈی کا کپڑا پھاڑ کر دیتا تھا۔ یہ راموں دودھ والا۔ ایک دن اس سے کہا تمہارے دودھ میں پانی زیادہ رہتا ہے تو کہنے لگا اس مہینے پانی لے لو۔ اگلے مہینے سے دودھ دوں گا۔ کیسے دنیا کے نرالے لوگ ہیں یہ —! ارے تھوڑا بہت طنز کیا تو کیا — طنز تو آج کی دنیا کا فیشن بن گیا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں، وہ دودھ میں پانی نہیں ملائے گا تو کیا عطر ملائے گا۔ اس پر اتنا اکڑنا چاہیئے کیا ؟ اچھا ہوا ! ان سب کی دو دو مہینے کی قسطیں بقایا رہ گئی ہیں۔

ارے یہ کون —؟ اوہ —! بیمہ ایجنٹ۔ بہت اچھے سالے مرا میں ہوں اور پیسہ ملے گا میری بیوی کو۔ خیر خوشی کی بات ہے کہ میں نے بیمہ کمپنی کو اچھا دس ہزار کے گڑھے میں اتار دیا ہے۔ بیمہ کمپنی کو پکا یقین تھا کہ میں مروں گا نہیں — اللہ اب — کیسی ٹھنڈی ہو گئیں عادتیں۔

اب سالا کتنا اچھا لگ رہا ہے دیکھو۔ بیمہ کمپنی والے رو رہے ہیں۔ گھر مالک رو رہا ہے۔ کرانہ والا رو رہا ہے۔ سندھی رو رہا ہے۔ دودھ والا رو رہا ہے۔ کبھی دو آنسو ٹپکائے تھے مجھ جیسے کی قبر پر۔ اب ٹپکاتے بیٹھو بیٹھو —!

ایسا کچھ کر میں نے میرا ہاتھ اوپر کیا — اور یہ کیا — تعجب ! تعجب ! میرا ہاتھ ہلا۔ بالکل زندہ لوگوں کی طرح — یا خدا شاید میں مرا نہیں زندہ ہوں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو خود کو ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پاتا ہوں۔ باہر نرم دھوپ پھیل رہی ہے — باپ رے میں نے اپنی موت کا منظر شاید خواب میں دیکھا ہے۔ پھر تمام مسائل جوں کے توں رہے۔ گھر مالک — کرانے والا — کپڑے والا — دودھ والا — میری بیوی کی گرجدار آواز گونجتی ہے۔

" آفس نہیں جانا ہے کیا —؟ کب تک سوتے پڑے رہو گے "

میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتا ہوں۔

آدھی صدی اُدھر کے جھروکے سے

آتی نہیں تھی خلق میں آنی بنی جگہ جگہ
پردے کے منہ نہ آتے تھے بیلن جگہ جگہ

سر پہ تھی کج کلاہ تو اچکن جگہ جگہ
کھڑکی پہ پردے ڈالے تھی چلمن جگہ جگہ

چولھوں سے گیاس کے نہ تھی مُردنی جگہ جگہ
جلتا تھا لکڑیوں ہی کا ایندھن جگہ جگہ

آدھی صدی اُدھر کے جھروکے سے جھانکیے
زائد ملے گا رنگ سے روغن جگہ جگہ

ہئیت میں برقعے ہوتے بڑے خوفناک تھے
اُن میں جو چیز تھی وہ مزین جگہ جگہ

آتی تھی دور ہی سے مہک زعفران کی
قلفی، کباب، مُرغ، مُتنجن جگہ جگہ

شکرام ہی میں پھرتے حسینانِ وقت تھے
جدت پذیریاں نہ تھی دُلہن جگہ جگہ

بیرونِ در ہی دھوبی رہا کرتا منتظر
ہر گھر میں ہو کے آتی تھی دھوبن جگہ جگہ

صابن کہاں کہ وہ تو تھے ایجادِ بعد کی
مَل مَل کے سب نہاتے تھے بیسن جگہ جگہ

چرکن تھا جس کا نام وہ مقبول کھیل تھا
خورد و کلاں میں عام تھی چرکن جگہ جگہ

ہوتی تھی بارہ بجتے ہی توپوں کی گھن گرج
یوں تھا نظامِ وقت معین جگہ جگہ

ہر صبح منھ میں نیم کی ہوتی تھیں داتنیاں
ہوتا تھا کوئلے ہی کا منجن جگہ جگہ

تھے نوک دار مونچھوں پہ لیمو کھڑے ہوئے
دیتے تھے اُن کو تاؤ مرد و زن جگہ جگہ

مونچھوں کا رُعب داب قیامت کی چیز تھا
مونچھیں نہ ہوں تو چلتا تھا بیلن جگہ جگہ

سڑکوں پہ رش تھا اور نہ بسوں کا ہجوم تھا
ہوتی نہیں تھی جیب کی کترن جگہ جگہ

ہوتی نہیں تھی نثر کی مجہول شاعری
تھی بحر کی ردیف نہ سوکن جگہ جگہ

اسٹیل کا رواج نہ ہی تھا پلاسٹک
تھے دستروں پہ کانچ کے برتن جگہ جگہ

طاقت میں نوجوان تھے افراسیابِ وقت
رستم جگہ جگہ تھے تہمتن جگہ جگہ

بھاتو مگر چلاتے نہ تھے پھر کے کُو بہ کُو
بھاتو چلانے کا نہ تھا فیشن جگہ جگہ

غالب رہا نہ کوئی نکتہ بحث میں اہلِ فن
اس فن میں بھی گھس آئے ہیں پُرفن جگہ جگہ

ڈاکٹر یوسف گوھر شاہجہاں پوری

"اکیسویں صدی"

چھلکیں گے روز ساغر اکیسویں صدی میں
برسے گا بادہ گھر گھر اکیسویں صدی میں

وی ڈی او ہر گلی میں ہر موڑ پر سینما
ناچیں گے گھر میں شوہر اکیسویں صدی میں

ایمان اور دھرم کو دے کر تیاگ یارو
ہر اک بنے گا ہٹلر اکیسویں صدی میں

بڑھتی رہی جو یوں ہی آبادیٔ وطن تو
سب کا وطن سمندر اکیسویں صدی میں

ماہر فنون کے سب بیچیں گے ساگ آلو
نااہل ہوں گے افسر اکیسویں صدی میں

جو بیسویں صدی میں وعدے ہی دے سکے ہیں
دکھلائیں گے وہ جوہر اکیسویں صدی میں

اسپورٹ میں بجز نام وطن بڑھانا
کیا لوگے لالہ پڑھ کر اکیسویں صدی میں

بارود کے بسیرے گندم کے گھر میں ہوں گے
فتنے اٹھیں گے گھر گھر اکیسویں صدی میں

ہر کارخانہ ہوگا کمپوٹرائزڈ یارو
بھوکے مریں گے ورکر اکیسویں صدی میں

ہم خصلتیں بدل کر کچھ اور ہوں گے گوھر
انساں بنیں گے بندر اکیسویں صدی میں

سنیل کمار تنگ عنایت پوری
سیوان (بہار)

تضمینات

اب خوف نہیں کوئی ہم کو خاموش وہ بالکل رہتی ہے
چاہے جتنا ہم ظلم کریں اس دیش کی جنتا سہتی ہے

بہتی گنگا میں دھوتے ہیں ہم ہاتھ تو حیرت ہے کیسی
"ہم اس دیش کے باسی ہیں جس دیش میں گنگا بہتی ہے"

جمہوریت کے نام پہ غنڈوں کو پال کے
بوگس تمام ووٹ کو بکسوں میں ڈال کے

تقریر کی بندوق چلا کر مری طرح
"اس دیش کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے"

لڑتا ہوں ہر الیکشن نسخے بدل بدل کے
غنڈوں سے مل ملا کے کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے

باقی ہیں اور نسخے تم سیکھو میرے چمچو
"یہ دیش ہے تمہارا نیتا تمہیں ہو کل کے"

سر سے باندھا تھا جس نے کفن سا تھیو
ایسے نیتا کا دیکھو چلن سا تھیو

جنگ جب دم چھڑی کہہ کے یوں چل دیئے
"اب تمہارے حوالے وطن سا تھیو"

خامہ بگوش

ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب ادبِ عالیہ کا بہترین نمونہ ہے

"مزدور تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہو رہا تھا"

"آفتاب کی کرنیں بہت دور دور تک اپنی کرنوں کا جال پھیلا رہی تھیں"

"انھوں نے صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کی"

"مجھے طلباء سے گہری ذہنی لگاوٹ پیدا ہوگئی"

"اسلام کا تقدس بے معنی ہے اگر اقتدار چراغوں کی زد پر ہے"

"وہ ملتِ واؤدی کی تربوں کے آشنا ہیں"

"ڈاکٹر صاحب کا قلم ہمیشہ گھٹا بردوش رہا"

ان جملوں میں زبان و بیان کا حسن اور اسلوب کی جو انفرادیت ملتی ہے، اس کی بناء پر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ کس کے شہب جہندۂ قلم نے میدانِ وسیعِ بیان میں یہ گل کترے ہیں (موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی) ممکن ہے بعض لوگوں کا دھیان میر امن دہلوی اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرف جائے لیکن ایسی فصیح و بلیغ اردو لکھنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم اپنے کالم کی تمہید کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر نہیں کرنا چاہتے، اس لئے عرض کئے دیتے ہیں کہ یہ جملے ڈاکٹر عالیہ امام کے ہیں جو ہم نے ان کی پچھلے ہفتے شائع ہونے والی کتاب "شاخ ہری اور پیلے پھول" سے کشید کئے ہیں۔ ان جملوں کے انتخاب کے لئے ہم نے دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ آنکھیں بند کرکے ورق گردانی کی اور سات جگہ شہادت کی انگلی رکھ دی۔ مذکورہ سات جملے بس اتنی سی محنت کا حاصل ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب سے ہم نے فال ہی نہیں نکالی، اسے پڑھا بھی ہے۔ بلکہ استاد لاغر مرادآبادی کو بھی یہ کتاب پڑھوائی ہے۔ استاد نے کتاب پڑھنے کے بعد معاوضہ طلب کیا۔ ہم نے عرض کیا، استاد یہ کتاب ہے، مشاعرہ نہیں جو آپ پڑھنے کا معاوضہ طلب فرما رہے ہیں۔ استاد نے فرمایا۔ "جب کاتب لکھنے کا معاوضہ لیتا ہے۔ پریس والا چھاپنے کی اجرت وصول کرتا ہے، جلد ساز اپنا محنتانہ طلب کرتا ہے تو قاری کو اس کی محنت کے صلے سے کیوں محروم کیا جائے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب کے پڑھنے میں جتنی محنت میں نے کی ہے۔ اتنی مصنفہ نے اس کے لکھنے میں نہیں کی۔"

ہم نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو استاد نے کہا: "یہ کتاب پڑھنے کے دوران بار بار یہ خیال آتا رہا کہ ڈاکٹر صاحبہ نے اسے کیوں لکھا ہے اور میں کیوں پڑھ رہا ہوں۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ عقدہ حل ہوا کہ یہ محض اس لئے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کے صبر کا امتحان لیا جائے۔"

اُستاد کی یہ بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ ہمیں تو یہ کتاب بہت پسند آئی ہے۔ اس کا ہر صفحہ دلچسپی کا خزینہ ہے بشرطیکہ اسے دوسرے صفحے سے مربوط نہ سمجھا جائے۔ ن م راشد نے ایک شاعر کے بارے میں کہیں لکھا تھا کہ اس کی نظموں کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی بجائے آخر سے شروع تک پڑھا جائے تو مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس پر یہ اضافہ کریں گے کہ اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی زیر نظر کتاب کو آخری صفحے سے شروع کر کے پہلے صفحے پر ختم کیا جائے تو کتاب کے لطفِ خواندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام بقولِ خود ادیبہ ہیں، ماہر موسیقی ہیں، خطیبہ ہیں، دانشور ہیں اور سیاستدان ہیں۔ گویا ان کی شخصیت ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگے پھولوں کا اجتماعِ ضدّین ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحبہ کو اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ عالیہ عسکری کہلاتی تھیں اور ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے تشریف لائی تھیں۔ اس زمانے میں طالب علموں کی تحریک چل رہی تھی۔ محترمہ نے غیر ملکی ہونے کے باوجود طالب علموں کے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کی اور اپنی آتش بیانی سے ہر طرف آگ لگا دی۔ حکومتِ وقت نے انھیں ۲۴ گھنٹوں کے اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم دیا اور وہ ہندوستان واپس چلی گئیں۔ آٹھ دس برس بعد وہ دوبارہ پاکستان آئیں اور کاظم امام صاحب کی وجہ سے وہ ۲۴ گھنٹوں میں پاکستانی شہری بن گئیں۔ اسی لئے اب وہ عالیہ امام کہلاتی ہیں۔

محترمہ نے بقولِ خود لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس ڈگری کے لئے انہوں نے جو مقالہ لکھا تھا، وہ فیض احمد فیض مرحوم کو برائے اشاعت دیا گیا تھا۔ اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دلِ ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ محترمہ کے پاس ڈگری رہ گئی اور وہ چیز گم ہو گئی جس کی بنا پر یہ ڈگری ملی تھی۔ سنا ہے فیض صاحب جس کتاب کی اشاعت پسند نہیں کرتے تھے، اس کا مسودہ عموماً ان سے گم ہو جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پاکستان آنے کے بعد محترمہ نے بقولِ خود، کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں اور کئی کالجوں میں ملازمت کی کوشش کی، مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں ملازمت سے محروم رکھنے کے لئے طرح طرح کے حربے آزمائے گئے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ سرسید گرلز کالج میں پرنسپل کی جگہ کے لئے انٹرویو دینے گئیں تو اُن سے کہا گیا آپ تو بہت قابل ہیں، یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں، بہتر ہو گا کہ آپ انٹرویو لینے والوں کے پینل میں شامل ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی جگہ کسی اور کو پرنسپل بنوا دیا پھر ایک مرتبہ فیض صاحب نے بڑی کوشش کر کے انھیں پی آئی اے میں ملازمت دلوا دی لیکن تیسرے مہینے انہیں بغیر وجہ بتائے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی کتاب میں خود بیان کی ہیں۔ جب حالات ایسے ہوں اور بیروزگاری کے سائے بڑھتے چلے جائیں تو آدمی زندگی کا راستہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ نے بھی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا اور سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ غالب کی کوئے ملامت کی طرح کوئے سیاست میں بھی داخلہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جسے کہیں اماں نہ ملے، اُسے یہاں سایۂ دیوار مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ پہلے نیپ میں شامل ہوئیں۔ جب بلوچستان میں نیپ کی حکومت بنی تو وہ "حکومت ساز" ٹولے میں شامل تھیں، جب اس حکومت پر زوال آیا تو "زمانہ سازی" کے اصول کے تحت موصوفہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئیں۔

"شاخ ہری اور پیلے پھول" ڈاکٹر عالیہ امام کی آپ بیتی ہے۔ اس ادب عالیہ کو انہوں نے دوستوں کے اصرار پر تخلیق کیا ہے۔ دیباچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب مجھ سے میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ میں اپنی یادداشتیں تحریر کروں تو مجھے اُن کی شوخیٔ طبع اور حسِ مزاح خاصی واضح نظر آئی۔ میں اور اپنی یادداشتیں؟ جگ ہنسائی کے علاوہ اور کیا ہے؟"

محترمہ کا یہ اعتراف صدق و خلوص پر مبنی ہے۔ ایسے ہی صدق و خلوص کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ کتاب کا نام تلاش کرنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیباچے کی ابتدائی سطروں ہی میں "شوخیٔ طبع" اور "جگ ہنسائی" کی ترکیبیں موجود

تحسین، انہیں بے تکلف کام میں لایا جاسکتا تھا۔ اس طرح کتاب کے نام اور مطالب میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی۔

کتاب کے شروع میں "مایۂ ناز" نقاد محمد علی صدیقی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے "تنقید کی دنیا میں محمد علی صدیقی ادبی سلیقے، تخلیقی رکھ رکھاؤ اور حکیمانہ ہمہ گیری کی علامت ہیں۔ وہ فنکار کے وجود میں اتر کر ادب اور سماج کے رشتے ڈھونڈتے اور ترسیل کی ناکامی میں عجز بیان کا سراغ لگانا جانتے ہیں ...... اس تبنمی مزاج ادیب کی کاوشوں سے میری یہ حقیر کوشش ممکن ہو سکی۔"

"حکیمانہ ہمہ گیری" والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ صدیقی صاحب کی تحریریں تنقیدی حکمت عملی کا نمونہ ہوتی ہیں لیکن یہ "تخلیقی رکھ رکھاؤ" کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ رکھ رکھاؤ کے لغوی معنی ہیں، دیکھ بھال اور خاطر داری کا برتاؤ۔ گویا تخلیقی رکھ رکھاؤ کا مطلب یہ ہوا کہ محمد علی صدیقی تنقید نہیں لکھتے، دوسروں کی خاطر داری کرتے ہیں، کم از کم ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ محمد علی صدیقی پر اس قسم کا الزام لگانا ادبی کفر ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد علی صدیقی "ترسیل کی ناکامی میں عجز بیان کا سُراغ لگانا جانتے ہیں"۔ نقاد کو سراغ رساں کے منصب پر فائز کر دینا ڈاکٹر عالیہ امام کا معجزۂ بیان ہے، ورنہ صدیقی صاحب سب سے پہلے خود ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں "ترسیل کی ناکامی" کا سراغ لگاتے۔

آخری جملے کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر صدیقی صاحب کی کاوشوں سے ڈاکٹر عالیہ امام کی حقیر کوشش کیوں کر ممکن ہو سکی؟ ظاہر ہے کہ صدیقی صاحب نے اس کتاب کا مسودہ تیار کیا ہوگا نہ اس کی کتابت کی ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نوک پلک درست کی ہوگی۔ لیکن اس کا بھی کوئی داخلی ثبوت نہیں ملتا۔ اب یہ صدیقی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کے رائیگاں جانے کا سبب کیا ہے۔

"شاخ ہری اور پیلے پھول" میں کوئی ہری شاخ نظر آتی ہے نہ کوئی پیلا پھول

"شاخ ہری اور پیلے پھول" بظاہر ڈاکٹر عالیہ امام کی آپ بیتی ہے، لیکن دراصل یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ہری شاخ نظر آتی ہے نہ کوئی پیلا پھول۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو غیر متعلق باتوں کا جھاڑ جھنکار کہیں، موسیقی کی تاریخ اس طرح بیان کی جا رہی ہے کہ اگر پڑھنے والے کو موسیقی سے دلچسپی ہو تو یہ دلچسپی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ کہیں اشتراکیت پر صفحوں کے صفحے اس طرح سیاہ کئے گئے ہیں کہ ان کے سامنے اشتراکیوں کی سیاہ قلبی بھی ماند پڑتی نظر آتی ہے کتاب کا ایک بڑا حصہ یوم میر انیس، جشن جگنو، جشن رئیس امروہوی اور پاک و ہند مشاعروں کی رودادوں کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اس قسم کی رودادیں اخباروں کے ادبی صفحات پر تو برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن ان کو کسی کتاب کی ضخامت میں اضافے کا سبب بنانا ڈاکٹر عالیہ امام ہی کا حوصلہ ہے۔ یہاں تک بھی معاملت غنیمت ہے، چلئے مصنفہ نہ سہی، کتاب تو آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ڈاکٹر محمود حسین کی ایک طویل تقریر نظر آئی جس کا تعلق میر انیس سے ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ اس تقریر کا زیر نظر کتاب سے کیا تعلق ہے۔ آخر اس عقدے کو استاد لاغر مراد آبادی نے حل کیا اور بتایا کہ یہ سہو قلم ہے۔ جس کاتب نے یہ کتاب لکھی ہے وہ ڈاکٹر محمود حسین کی تقریروں کا مجموعہ بھی کتابت کر رہا تھا۔ غلطی سے تقریر ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں شامل ہو گئی۔ ہم نے عرض کیا "ایسا بڑا سہو قلم پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔" انہوں نے فرمایا "آپ نے تو ایک ایسی کتاب بھی دیکھ لی ہے جو بہ تمام و کمال سہو قلم کا نتیجہ ہے۔"

معلوم نہیں لاغر صاحب کا اشارہ کس طرف تھا۔

زیر نظر کتاب کے وہ چند صفحات جن سے مصنفہ کی ذات پر روشنی پڑتی ہے، بے حد دلچسپ ہیں ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض نے انہیں "طوطیِ پاکستان" کا خطاب دیا تھا۔ اُردو میں طوطی بولنے کا محاورہ شائد اسی واقعہ کے بعد مروج ہوا ہے۔ ایوب خاں نے ڈاکٹر عالیہ امام کو وزارت اور سفارت کی پیشکش کی تھی۔ بھٹو ان محترمہ کو خوب صورت مقرر اور اسکالر کہا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی وزارت اُن کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ آغا شاہی بھی انھیں سفیر بنانے پر مصر رہے۔ لیکن محترمہ نے ان تمام پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس سے محترمہ کے اعلیٰ کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہاں تو وہ معمولی معمولی ملازمتوں کے لیے پریشان رہتی تھیں، اور کہاں بڑے بڑے عہدے ان کی نظر میں حقیر تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ محترمہ اگر ان عہدوں کو قبول کرلیتیں تو ایوب خاں اور بھٹو کے زمانۂ اقتدار کی میعاد کم ہو جاتی۔ اس خیال کی تصدیق علامہ نیاز فتح پوری کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے ایک مرتبہ علامہ نے فرمایا تھا "عالیہ ارے عالیہ۔۔۔ مجھے اگر ایسی بیوی مل جاتی تو اب تک میری سترہ، اٹھارہ برسیاں اطمینان سے ہوجاتیں!" (علامہ کا یہ جملہ خود مصنفہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۱ پر درج کیا ہے)

> **چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے لیے پریشان رہنے کے باوجود انہوں نے ایوب خاں اور بھٹو کی جانب سے وزارت وسفارت کی تمام پیشکشوں کو ٹھکرا دیا**

لیکن یہ مذاق کی بات تھی۔ علامہ کی اصل رائے کچھ اور تھی جس کا اندازہ ان کی ایک رباعی سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نیاز فتحپوری ڈاکٹر عالیہ امام سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ محترمہ کے شوہر کاظم امام صاحب تو گھر پر موجود تھے، لیکن محترمہ غائب تھیں۔ معلوم ہوا ایک مجلس میں شرکت کرنے گئی ہیں۔ علامہ ایک کاغذ پر یہ فی البدیہہ رباعی لکھ کر چھوڑ آئے۔

ہیں عالیہ آج کل مجالس کی نقیب
ملتا ہی نہیں پتا کہیں دور و قریب
کل تک تو مجھے ڈر تھا فقط کاظم سے
لو ہوگئے حسین بھی اب اپنے رقیب

ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں سب سے دلچسپ اور معنی خیز رائے بیگم جوش ملیح آبادی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جوش صاحب سے گہرے مراسم تھے وہ اکثر ان کے ہاں جاتی تھیں۔ یہ بات بیگم جوش کو پسند نہ تھی۔ ایک روز ان کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا آگے کا قصہ ڈاکٹر عالیہ امام کی زبانی سنیے۔ "میری طرف سے پیٹھ پھیر کر جوش صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو دوسروں کے کارخانے میں دخل دیں۔

ڈاکٹر عالیہ امام کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے، اس کی تفصیل انھیں کی زبان سے سنیے۔ "ہمارے کنبہ کی پور پور میں کلاسیکی موسیقی کی انگوٹھیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اسی لئے گھر میں ہر پندرھواڑے جلسے پر تکھریں مچلتیں، سارنگی کے تار کا نپتے ستار پر جھالا بجتا۔ خورشید فریدی کی پائلیں کھنکتیں، چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی سبھی جھوم جھوم کر گلباری کرتے۔ کرشن کنھیا کی مرلی

بھی، امی کو ابا سے زیادہ موسیقی پر عبور تھا۔ موسیقی کے ذریعہ گھر کی لڑکیوں کی تربیت بھی مقصود تھی۔"

یہ تربیت آگے چل کر بہت کام آئی۔ محترمہ کے دولت خانے پر طاؤس و رباب ہی نہیں ساغر و مینا بھی گردش محفل کا سبب بنتے لگے پینے پلانے کی ایک محفل کا دلچسپ حال محترمہ نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔ " ہمارے گھر پر فیض صاحب کی دعوت ہوئی۔ فیض صاحب شمع محفل طلوع ہوئے۔ اس محفل میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان ... کنور ادریس ... یوسف جمال تشریف فرما تھے۔ مہدی صاحب ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے ...... اندر جاکر دیکھا تو ہمارے بھائی صاحب (بہلولی) گھر والوں پر برس رہے تھے .... عالیہ کا گھر اس لائق نہیں رہا کہ کوئی شریف آدمی اس میں قدم رکھے .... سید زادی کہلاتی ہیں اور گھر میں جام پر جام ٹکرائے جارہے ہیں .... میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر آگئی۔ فیض صاحب مجھے دیکھتے ہی پریشان ہوگئے ..... بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا ؟ بھائی صاحب گھر چھوڑ کر جارہے ہیں آپ لوگوں کی وجہ سے، کہتے ہیں پینا قطعاً حرام ہے ... فیض صاحب بہت ہی سکون کے عالم میں بیٹھے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے تو کیا ہوا۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ بھائی صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ یہ تو عالیہ کی غلطی ہے۔ مجھے پہلے سے بتایا نہیں کہ آپ تشریف لارہے ہیں۔ ہم تو کسی کی عبادت میں مخل نہیں ہوتے۔ تو پھر آپ کیوں ؟ یہ جملہ سنتے ہی بھائی صاحب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ وہ سب سے آگے بیٹھے ہوئے فیض صاحب کے کلام پر داد دے رہے ہیں۔"

ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی شادی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بھی دلچسپی اور عبرت سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے اُن کی شادی کی بات بیت الآباد کے غیور نامی ایک صاحب سے چلی۔ یہ صاحب ویسے تو خاصے معقول تھے، لیکن پرانی فکر اور فرسودہ روایات میں گندھے ہوئے تھے اس لئے انھیں مسترد کردیا گیا۔ پھر کانپور کے ایک وکیل سلطان نیازی امیدوار ہوئے، یہ صاحب ... کی سیاسی و سماجی مشغولیات کو جاری رکھنے کے خلاف تھے، لہٰذا انھیں بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر کاظم امام صاحب میدان میں آئے۔ بقول ڈاکٹر عالیہ اُن سے ـــ

" ملاقاتیں ہوتی رہیں، وقت گزرتا گیا۔ دلچسپیوں کے دائرے وسیع ہوتے گئے۔ پھر صاحبزادے سویڈن چلے گئے۔ میرے گھر والے خوش تھے بات صحیح رُخ پر جارہی تھی کہ اچانک خط آیا۔ مجھے انجینئرنگ کا کورس کرنا ہے۔ وقت کی کمی ہے شادی ابھی نہیں کرنا ہے۔ خط ملتے ہی ہم پر اوس پڑگئی۔ اب تک تو کسی نے بھی اس طرح کی جرأت نہیں کی تھی۔ جس ملک کو چاہا تسخیر کیا اور پھر اُسے مفتوح کے حوالے کردیا۔ ہماری انا ریزہ ریزہ ہوگئی ..... میں سخت الجھن میں گرفتار ہوگئی ...... خطوں کی بارش کردی۔ ہر خط میں گلاب یا لڑی لگائی۔ پھول مہکے، خوشبو دور دور تک پھیل گئی ..... کاظم نے مجھے سویڈن لے جانے کی تیاری مکمل کرلی۔"

کاظم امام صاحب نے یہ نیکی کا کام کیا کہ ڈاکٹر صاحبہ کو سویڈن لے جانے کی بجائے پاکستان لے آئے اور یوں اہل پاکستان کو موصوفہ کے علم اور بصیرت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ محترمہ کے پاکستان تشریف لانے کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ پاکستان اور اسلام دونوں کے بارے میں ان کا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا اور ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں بلکہ " برطانوی سامراج نے عوامی متحدہ محاذ کو کمزور کرنے اور اس کے ہاتھوں سے اپنے چراغ کو گل ہوتا دیکھ کر، ہر نوآبادی کے سینے میں تقسیم کا خنجر پیوست کردیا۔ ہندوستان کی کوکھ سے ایک دوسری مملکت وجود میں آئی یعنی پاکستان ..... صدیوں کی ہندو اور مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں جو ساتھ رہنے بسنے سے اُگی تھیں، خون میں نہا گئیں۔" (ص ۳۳)

مذہب کے بارے میں محترمہ کا خیال یہ ہے۔ " علمائے اسلام نے مدت دراز سے انسانیت کو مومن و کافر اور دنیا کو دارالحرب اور دارالسلام میں تقسیم کردیا تھا۔ جہاد مسلمانوں کا صرف مذہبی نہیں قومی فریضہ تھا۔ یہ سب حربے عوام کو بے وقوف بنانے اور مذہب کی افیون دے کر سلانے کے تھے تاکہ ظل اللہ کا کاروبارِ حیات "بابر بہ عیش کوش" کے طور پر چلتا رہے۔" (ص ۴۵)

محترمہ نے تاریخ ہند کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ فرماتی ہیں — "غیر اسلامی سرزمین کو اپنا سمجھنا اور بزور شمشیر حاصل کرنا ... ہمارے حکمرانوں کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے۔ محمد تغلق جیسے فرماں روا نے اسلام کے اصولوں کے مطابق ہندوؤں کا خون بہایا اور پھر انہیں تحفے دینے میں لطف حاصل کیا اور ہندوؤں کو مفلسی کی قبا میں دیکھ کر خوش ہوا ...... علاؤ الدین خلجی، محمد بن قاسم، غیاث الدین نے اپنے مذہبی مشیروں کی مدد سے ہندوؤں کے خلاف ایسے قوانین وضع کئے تاکہ ان کی حیثیت گداگروں سے زیادہ نہ رہ جائے۔"

تاریخ ہند کے ساتھ ساتھ محترمہ کا اسلام کا مطالعہ بھی خاصا وسیع معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک مسلمان فرماں رواؤں سے منسوب مذکورہ اقدامات اسلام کے اصولوں کے مطابق تھے!

ڈاکٹر عالیہ امام کو اپنے اشتراکی ہونے پر فخر ہے۔ وہ روس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے میں بھی تکلف نہیں کرتیں روس سے ان کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے کتاب میں اپنے والد مرحوم کی تصویر کے بعد جو تصویر شامل کی ہے وہ گوربا چوف کی ہے ایوب خان اور یحییٰ ڈاکٹر عالیہ امام کو اگر سفیر بناتے تو یقیناً روس بھیجتے۔ لیکن زیر نظر کتاب پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے محترمہ پاکستان میں روس کی سفیر ہوں۔

یہ کتاب مصنفہ نے خود چھاپی ہے — ۳۳۶ صفحات، بہترین کاغذ، خوبصورت سرورق، روشن طباعت، عمدہ جلد سازی، اتنی خوبیوں کے ساتھ قیمت صرف تیس روپے ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تو اس کتاب پر لاگت آئی ہوگی۔ معلوم نہیں کتاب کی اس کم قیمتی کا راز کیا ہے۔ مصنفہ اگر چاہتیں تو کتاب کی قدر و قیمت میں با آسانی اضافہ کر سکتی تھیں اور وہ اس طرح کہ کتاب کے تمام صفحات سادہ ہوتے تاکہ ہر خریدار ان صفحات کو اپنی مرضی سے سیاہ کرتا۔ ڈاکٹر عالیہ امام آزادیٔ تحریر و تقریر کی زبردست حامی ہیں انہیں عام لوگوں کو اتنی آزادی تو دینی چاہیئے تھی۔

نامور مزاح نگار نریندر لوتھر کے
انشائیوں کا تازہ مجموعہ

الف تماشا

صفحات ۱۷۴
قیمت ۱۶ روپے

مطبوعہ زندہ دلانِ حیدرآباد

— مجید جمال (اورنگ آباد)
مہاراشٹرا

ہوئے پڑھ کے غرقِ دریا!

جب اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ ہم گریجوئٹ ہو گئے ہیں تو اچانک یوں لگا جیسے ہمیں سُرخاب کے پَر نکل آئے ہوں۔ پھر یہ خبر بھی ملی کہ All Round Best Student ہونے کی وجہ سے سونے کا تمغہ بھی ملنے والا ہے پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا۔ لیکن اس تمغے نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ ہماری حالت جو ہمیشہ غیر رہتی تھی غلط ہو گئی۔

پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے "

چھٹیاں ہوئیں اور گاؤں کی طرف روانہ ہوئے تو یہ سوچ سوچ کر کہ ہم نے اتنا کچھ کر لیا ہے۔ دل بلیّوں اچھلتا تھا۔ دوستوں اور گاؤں والوں پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ، قسم کے خیالات سے ہمارا زرخیز دماغ لبریز تھا۔ یہ فکر بھی تھی کہ ڈاکٹر نہ بن پانے کی وجہ گاؤں والوں کو کیا بتائیں۔ واضح طور پر ہمیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ گریجویٹ کس کام کا ہوتا ہے۔ ویسے ہم نے اپنے طور پر کوشش تو پوری کی تھی کہ ڈاکٹر بنیں۔ مگر جب جب امتحان کا نتیجہ نکلا ہمارا نام اوپر سے پہلا ہونے کی بجائے نیچے سے پہلا ہوتا تھا۔

ڈبویا پاس ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دوسرا مسئلہ تھا اپنے منہ میاں مٹھو کیسے بنیں۔ ڈگری اور تمغہ بھی ملا نہیں ورنہ گاؤن پہن کر فوٹو کھنچوا لیتے، تمغہ کوٹ پر لگا کر پھرتے دل چاہتا تھا کوئی ہر ایک سے تعارف کرواتا رہے۔ ان سے ملئے یہ ہیں ہونہار طالب علم جنہیں ڈگری کے علاوہ سونے کا تمغہ بھی ملا ہے۔ راستے بھر مختلف تدبیروں پر غور کیا۔ کس طرح اس سنہرے واقعے کی اطلاع گاؤں والوں کو دی جائے۔ گاؤں والے بھی کمال کرتے ہیں۔ ہر بُرائی سے باخبر اور اچھائی پر پردہ ڈالتے ہیں۔ شہر والوں سے پھر بھی اچھے ہوتے ہیں کہ شہر میں خود اچھائی کرنے والے پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے آخر یہ طے کیا کہ گاؤں پہنچتے ہی کوئی ایسا کارنامہ انجام دیں کہ ہمارے علم و ہنر کا سکّہ گاؤں والوں پر جم جائے۔ تار کھ پڑھ دینا، ENO — Fruit Salt سے ہاضمہ درست کر دینا، گلوکوس سے قوتِ مدافعت بڑھا دینا قسم کے معمولی کارنامے تو پہلے ہی انجام دے کر اپنا مقام بلند کر چکے تھے۔ اب کی بار مسئلہ ٹیڑھا اور معاملہ گریجویشن کا تھا۔ ہماری خوش قسمتی سے ایسا موقعہ ہمیں سفر ہی میں دستیاب ہو گیا۔ گاؤں جانے کے لئے جنکشن پر ریل گاڑی تبدیل کرنی ہوتی ہے۔ وہاں گاؤں جانے والے پانچ سات آدمی مل گئے (انہیں دیکھتے ہی ہماری باچھیں کھل گئیں) کچھ بچپن کے دوست، کچھ جانے پہچانے چہرے علیک سلیک، خیر خیریت کے بعد سوال پیدا ہوا، ٹکٹ خریدا جائے۔ سب نے یک نظر ہماری طرف دیکھا۔ ہم سمجھ گئے، ہم سے بہتر اس کام کے لئے کون موزوں ہو سکتا تھا؟ کچھ کر گذرنے کی خواہش لئے ہم ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ لائن میں کھڑے کھڑے جی چاہا کوئی ہم سے انگریزی میں بات کرے تاکہ ہم فرفر اپنی انگریزی سنا سکیں۔ گاؤں والے انگریزی بولنے والے کو عالم سمجھتے ہیں۔

انہیں خیالات میں مگن تھے کہ ایک عجیب واقعہ یاد آیا۔ اس طرح کے واقعات ہندوستانی فلموں میں کئی دن پیش آتے رہتے ہیں

جیسے بلیک ہی بیک کہا جاتا ہے۔

یہی اسٹیشن، یہی ٹکٹ کی لائن ہم چھٹے درجے کے طالب علم تنہا گاؤں واپس جارہے تھے۔ ہمیں ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ ہم سے آگے کھڑکی کے پاس چھ سات آدمی اور تھے جو ٹکٹ لینا چاہ رہے تھے۔ اچانک ایک پولیس والے نے آہستہ سے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ پہلے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ پھر وہ خود ہی بولا ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں ہم کو آدھا کرایہ دے دینا، تم جہاں جاہو، ہم تمہیں حفاظت سے پہنچادیں گے۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی بغیر ٹکٹ سفر کرلے۔ مبہوت ہوگئے۔ بھولے تو ہمیشہ تھے، پسینہ کا ریلا بہہ نکلا۔ اوسان کے علاوہ کوئی چیز خطا نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں ہمارا نمبر آگیا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے آواز آئی، کہاں جانا ہے؟ ہم نے گھگھیائے ہوئے لہجے میں اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ ٹکٹ لیا اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا، کہیں آس پاس پولیس والا تو نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا کردے۔

آج اس بات کو پورے گیارہ برس ہوگئے۔ ہم پھر اسی اسٹیشن پر ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہیں۔ چار پانچ آدمیوں کے بعد ہمارا نمبر آنے والا تھا۔ ایک پولیس والا ہمارے قریب سے کہتے ہوئے گذر گیا۔ آدھے پہ چلو آدھے پہ۔ یہ پیش کش ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہم نے فوراً قبول کرلی اور لائن سے باہر آگئے۔ ہماری کچھ کرنے کی خواہش دو آتشہ ہوگئی۔ سرخ روی کی تمنا اب ہمارے دل میں تھی کہ ہم Graduate Gold Medalist جو ٹھہرے۔ گاؤں کے ساتھیوں نے پوچھا، ٹکٹ کیوں نہیں خریدا۔ ہم نے پورا واقعہ کہہ سنایا۔ اور مشورہ دیا کوئی صاحب چپ چاپ ٹکٹ خریدلیں۔ دیکھئے اس بدمعاش کو کیسے سبق سکھایا جاتا ہے۔ ہمارا ایک ساتھی ٹکٹ لینے چلا گیا۔ دوسرے نے ہم سے پوچھا، آپ اِن کا کیا بگاڑلیں گے، یہاں تو آدھی گاڑی آدھے پہ چلتی ہے۔ ہم نے اپنے علم و ہنر کا دفتر کھول دیا۔ ہم اس کی شکایت درج کریں گے۔ اس کی انکوائری کرائیں گے۔ اس کو ملازمت سے معطل ہی نہیں برخواست کروادیں گے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم برائی کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ (آواز تو شائد ہماری بھی نہ اٹھتی لیکن ایک تو کچھ کر گذرنے کی خواہش دوسرے گاؤں والوں کا ساتھ) ہم نے اپنی تدبیر پر باقاعدہ تقریر شروع کردی۔ برائی کے خلاف آواز نہ اٹھانا بھی برائی ہے۔ برائی کو یہیں نہ روکا گیا تو عزت داروں کا عزت سے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔

(ہماری انا کو بہت تقویت مل رہی تھی، اور ہم بے تاب تھے پولیس والے کو زیر کرکے گاؤں کے تذکروں کے ہیرو بننے کے لئے) وہ ساتھی ٹکٹ لے آیا۔ اور ہم سب ریل کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ ہماری باتوں سے شائد ساتھیوں کو بھی کچھ جوش آیا۔ وہ بھی اس بات پر متفق ہوگئے کہ یہ کالا کاروبار بند ہونا ہی چاہیئے۔ تبھی تو ہر سال ریل کا کرایہ بڑھتا ہے۔ سزا ایماندار لوگوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ایک گاؤں والا جو شہر سے مال لاکر گاؤں میں فروخت کرتا تھا کہنے لگا۔ آپ کی شکایت پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ کیونکہ اوپر کے سبھی افسر ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم نے ترپ پھینکا۔ ہم منسٹر کو لکھیں گے۔ وہ پھر بولا اس سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھیا اپنا فائدہ کسے پسند نہیں۔ ہم خود بھی جب شہر سے سامان لاتے ہیں تو تیسرے درجہ کا آدھا کرایہ دے کر پہلے درجہ میں سفر کرتے ہیں۔ اپنے کو سب بابو لوگ پہچانتے ہیں۔ (ان صاحب کی یہ کم خرچ بالانشینی ممکن ہے موقع ملتا تو ہم خود بھی اختیار کرلیتے) لیکن ہمارے سامنے کرایہ بچانا اتنا اہم نہیں تھا، جتنا لاکھ روپے کی عزت کمانا۔ وہ شخص ہمیں اپنا رقیب لگا۔ کچھ کر گذرنے کے اس نایاب موقع پر رخنہ اندازی کر رہا تھا۔ ہم نے اسے ڈانٹ دیا۔ چُپ رہیئے۔ آپ ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے یہ کالا کاروبار فروغ پاتا ہے۔

ہمارا ایک ساتھی کہنے لگا۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے گاؤں پر ٹکٹ چیکر اور پولیس والے کو دھرلیں۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں پنچ نامہ کرالینا (باقی ہم دیکھ لیں گے) اپنے گاؤں سے ہر طرح کی مدد بھی مل جائے گی۔ ہمیں یہ تجویز بہت اچھی لگی۔ مگر اس کا توڑ

بھی گاؤں والوں نے کر دیا۔ گاؤں سے مدد وَدد کچھ نہیں ملے گی۔ پنچایت کے صدر خود انجن ڈرائیور کے دوست ہیں۔ سبزی اور اناج دے کر اس سے کوئلہ لیتے ہیں۔ انجن میں بیٹھ کر بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا۔ سوچا اخبار میں اپنی شکایت کون چھاپے گا۔ حوصلے پست ہونے لگے، باوجود گریجویٹ ہونے کے ہم اپنے آپ کو بہت کمزور سمجھنے لگے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کر چکے تھے ہمیں کچھ تو کرنا ہی تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد ایک منصوبہ ان سب کے سامنے رکھا۔ دیکھو بھئی ٹکٹ تو ہم نے لے رکھا ہے۔ جس کی اطلاع نہ چیکر کو ہے نہ اُس پولیس والے کو۔ ظاہر ہے وہ آدھا کرایہ لینے آئے گا۔ اس وقت ہم اس کو کھری کھری سنائیں گے۔ اس کو سب کے سامنے ذلیل کریں گے کہ اس کے علاوہ ہم اس کا کچھ اور نہیں بگاڑ سکتے۔ گاؤں والوں نے ہماری یہ بات پسند کی۔ اب ہم بہت بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگے کہ وہ آدھا کرایہ مانگنے آئے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب گاؤں سے پہلے والے اسٹیشن پر ٹی۔ سی نے کہا، آپ باہر آئیے۔ ہم نے ایک لمحہ کے لئے سوچا۔ باہر جا کر بات کرنے سے فائدہ نہیں۔ اُسے اندر بلا کر طے شدہ پروگرام کے مطابق سب کے سامنے ذلیل کرنا چاہئیے۔ ہم نے جواب میں انگریزی جھاڑ دی۔

"Why dont you come inside"

وہ مسکرایا۔ "اچھا تو آپ نے ٹکٹ لے لیا ہے" اور آگے بڑھ گیا۔

دس برس اور گذر گئے۔ کارنامہ اور کرشمہ دکھانے کی تمنا پوری طرح ختم تو نہیں ہوئی۔ مگر راکھ میں دبی چنگاری بنی رہی۔ اپنی ذاتی مجبوریوں جیسے پیٹ بھرنا، مروجہ طریقوں کے مطابق پیسے کمانا۔ نام نہاد عزت کی زندگی بسر کرنے کا مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔ اور اب بھی ہے۔ البتہ وہ تیزی اور طرّاری ختم ہوگئی جو کالج میں اور کالج چھوڑتے وقت ہوا کرتی ہے کہ

ع ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

اب ساری توجہ کا مرکز علم کا ایسا استعمال تھا جس سے اپنی زندگی خوشگوار گذرے۔ کاروبار کے سلسلہ میں شہر آنا جانا شروع ہوا۔ گاؤں کے لوگ اب ہم کو اپنے جیسا ہی سمجھنے لگے تھے۔ کہ ہم باوجود پوسٹ گریجویشن کے انھیں کی طرح تجارت کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ تو وہ ڈاکٹر، بیرسٹر، انجینئر اور کلکٹر کے علاوہ اُس ٹی۔ سی کو بھی سمجھتے جو اُن سے رشوت لیتا تھا۔ اُس کی دوستی پر فخر بھی کرتے اور بہت احترام سے اس بات کا تذکرہ کرتے، بابو کی اوپر کی آمدنی ہزاروں سے اوپر ہے۔ شہر سے ایک گاڑی ایسی چلنی شروع ہوئی کہ شام کو ۶ بجے تک کام کیا۔ گاڑی میں بیٹھے تین بجے صبح دَم، بیدم ہی سہی گھر پہنچ گئے۔ کچھ دنوں جیسا کہ ہمارے ملک کا دستور ہے کام ٹھیک چلتا ہے (ٹرین بھی ٹھیک چلی) پھر جب چل نکلتا ہے تو ہاتھ ہی سے نکل جاتا ہے۔ نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ ہمارے یہاں خوبی سے خرابی اور باقی دنیا خرابی سے خوبی پیدا کرتی ہے۔

خیر صاحب ہم بھی اس ٹرین سے سفر کرنے لگے، کچھ دنوں بعد ہم نے دیکھا۔ کچھ غنڈے ڈبوں پر قبضہ کر لیتے ہیں پھر ہر شخص سے پانچ روپے لے کر سیٹ پر بیٹھنے دیتے ہیں۔ ٹکٹ ہونے نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے اس ظلم کے خلاف کوئی مظاہرہ تو نہیں کیا، البتہ اپنے علم و ہنر کے بل بوتے پر بغیر پانچ روپے دیئے سیٹ حاصل کرتے رہے۔ غنڈوں نے شائد سوچا ہوگا اس جھکی آدمی سے بحث کرنے میں خود ان کا دھندہ مارکھاتا ہے۔ اس لئے ہمیں با ٹکٹ بلا کیشن بیٹھنے دیا۔

پھر ایک دن غنڈوں نے طے کر لیا کہ سبھی کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جائے گا چاہے وہ باٹکٹ پڑھا لکھا ہو یا کوئی ملرم خاں۔ ہر شخص کو مبلغ پانچ روپے ادا کرنے کے بعد ہی ڈبے میں داخلہ ملے گا۔ اور اگر کسی نے انکار کیا تو چاقو کی نوک پر پیسے رکھوا لئے جائیں گے۔ اس بات کی اطلاع ہمیں نہیں تھی۔ چنانچہ ہم تھے کہ عادت کے مطابق اپنے علم و عقل کی شان بگھارتے ہوئے اُن

سے بحث کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کسی چمکتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ ہر چیز جو چمکتی ہے چاقو
نہیں ہوسکتی۔ بحث و تکرار کی رفتار بڑھادی۔ غنڈے نے فوراً چاقو ہوا میں لہرایا۔ اور کہا جناب پانچ روپے۔ اب جو ہم نے
ہوا میں لہراتا ہوا رام پوری خنجر دیکھا تو سرپٹ رپٹ لکھوانے بھاگے۔ ؎

قاتل سے لڑنے والے اے آسماں نہیں ہم

ہمارے بھاگ اچھے تھے۔ پولیس والا آیا۔ سبھی غنڈوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا اور ہم کو باعزت طریقے سے ایک سیٹ پر بٹھاتے ہوئے
کہا۔ اب آپ آرام سے جائیے۔ لیکن چونکہ جواہر لال جی کہہ گئے تھے آرام حرام ہے اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم آرام سے سفر کرلیتے۔
ٹرین چلنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کئی لوگ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ لوگ ہم کو عزت
احترام کی نظر سے دیکھ رہے ہوں گے کہ ہماری وجہ سے سبھی کو اپنے پیسے واپس مل گئے مگر دیکھنے والوں کی نظر تعاقب اور سرگوشی
میں بدل گئی۔ پھر ہم اتنے غافل بھی نہیں تھے کہ قاتل کی نظر بھی نہ پہچان سکیں۔ اب ہمارے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی
ٹرین رات کے ۱۲ بجے جنکشن سے نکلتی ہے۔ تین بجے رات کو گاؤں پہنچتی ہے۔ ان تین گھنٹوں میں اگر کسی نے ہم کو موت کے گھاٹ
اتار دیا تو ہمارا سارا علم مٹی میں مل جائے گا۔ ہمیں اب بھی اپنی تعلیم پر بڑا ناز تھا۔ لیکن اب آپ سے کیا پردہ اس وقت ہمیں علم
کی آن بان سے زیادہ اپنی جان کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کہ جان ہے تو جہان ہے۔ چنانچہ فوراً ہم حفاظتی تدابیر پر غور کرنے لگے۔
ہماری خوش قسمتی کہ اپنے گاؤں کے چند لوگ مل گئے۔ ہم نے پہلی مرتبہ ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔ کورنش بجا لائے
پہلی فرصت میں انہیں بتایا کہ ہم سے حماقت سرزد ہوگئی ہے۔ (انھیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا)۔ ہم نے بات
کی سنگینی کو سمجھاتے ہوئے بتایا کہ ہماری جان خطرے میں ہے۔ ان لوگوں نے ازراہ ہمدردی کہا، خاطر جمع رکھو، ہم تمہیں مرنے نہیں
دیں گے۔ ہم نے کہا مگر وہ ہمیں جینے نہیں دیں گے۔ وہ لوگ کہنے لگے۔ ڈریئے مت، ہم سب ایک ہی ریل گاڑی کے مسافر
ہیں۔ آج ہم نے بھی وہی کیا جو آپ نے کیا ہے۔ یہ جان کر ہماری جان میں جان آئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہم نے اس گاڑی
سے سفر کرنا بند کردیا۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ہمارے علم کا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ ہم نے اس ظلم کے خلاف حکام بالا کو
یا اخبار میں لکھنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم صرف سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جو سوچتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ جو سوچتے
ہیں کر گزرتے ہیں۔ لیکن ہم آسانی سے ہار ماننے والے نہیں۔ گو ہمارا آدھا سر سفید اور آدھا بے بال ہوچکا ہے۔ ہماری
اس فلسفیانہ تاویل ملاحظہ فرمائیے جو ہم نے خود کو بہلانے کے لئے تراش لی ہے۔ جس ملک میں اناج، لوہا، شکر،
سیمنٹ، غرض ضروریات زندگی کی ہر شئے اجارہ داروں کے ہاتھ دبی ہو تو وہ لوگ کہاں جائیں جو کچھ نہیں دبا سکتے اور
ان میں سے کچھ لوگ ریل کا ڈبہ داب لیتے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تو اس میں آخر ایسی کون سی آفت آجاتی
ہے۔ ہم نے اپنے آپ سے سوال کیا' کیا آپ ضروریات زندگی کی بنیادی اشیاء کی اجارہ داری ختم کرا سکتے ہیں؟ اگر نہیں
تو آپ کو ان غریب لوگوں کے خلاف لکھنے کا کوئی حق نہیں۔ لکھنے کی خواہش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی اصل وجہ بھی
سن لیجئے۔ ہم نے سوچا، غنڈے ہماری صورت سے تو واقف ہو ہی گئے ہیں۔ اگر لکھ دیا تو نام بھی معلوم ہو جائے گا۔
پھر ریل گاڑی میں تو ہم سفر مل جاتے ہیں، زندگی میں ہم سفر ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کے سفر کی
راہیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ایک اور خواہش جنم لیتی ہے۔ اُن غنڈوں سے مل کر انھیں سمجھائیں کہ صرف انھیں لوگوں سے پیسے

لیں جو اپنے آپ کو تعلیم یافتہ، باعزت، اور چالاک سمجھتے ہیں۔ غریبوں اور اپنے ہی جیسے مظلوم لوگوں کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔ پتہ نہیں یہ مصلحت ہے کہ فطرت ہم اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔ کو چھوٹا چور ہو یا بڑا، اُن کا اپنا آپ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کے لئے اپنا پرایا کچھ نہیں ہوتا۔

اب آپ سے کیا چھپائیں، بچپن میں پہلی مرتبہ چلتی ہوئی ریل گاڑی سے بہادری دکھانے کے شوق میں جب کود پڑے تھے اور خوب چوٹ آئی تھی۔ اس کے بعد ہم نے چلتی ہوئی ریل سے اُترنا بند کردیا تھا اب ہم نے تنہا ریل گاڑی میں سفر کرنا بند کردیا ہے ....

کیا آپ ہم سفر بنیں گے ؟

U.A.E متحدہ عرب امارات کا ویزا

خوشخبری

اُن مسافروں کے لئے جو نہ صرف اپنے دوست احباب، رشتہ داروں سے ملنے کے لئے جو U.A.E میں مقیم ہیں بلکہ اُن سیاحوں کے لئے بھی جو متحدہ عرب امارات کے سات خلیجی ریاستوں (دوبئی، ابوظہبی، شارجہ، اجمان، فوجیرہ، راس الخیمہ، ام القوین) کی سیر و تفریح کے علاوہ سامان کی خرید و فروخت کے لئے جانا چاہتے ہوں ان کے لئے 7 تا 15 دن کے ویزوں کا بندوبست معہ قیام و طعام نہایت ذمہ داری سے کیا گیا ہے جو حضرات U.A.E میں اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کے ہاں بھی رہنا چاہیں تو بخوشی رہ سکتے ہیں

۔ مزید تفصیلات کے لیے حسب ذیل پتہ پر ربط پیدا کریں۔

۔۔۔ بہترین سروس مکمل آرام ۔۔۔

"مظہر منشن"
3-6-293/4
حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد
فون۔ 235084

مظہر ٹراویلس

(وزارت اُمور خارجہ حکومت ہند کا مسلمہ ٹراویل ایجنٹ)

صابر بہاری، رانچی

اینگلو انڈین قطعات

ہماری زندگی کیا زندگی ہے مصیبت ہی جہاں کمپلسری ہے
ادھر بچے ادھر بیگم مریضہ مکاں میرا ہے یا ڈسپنسری ہے

نظر سے نظر کا کنکشن غضب ہے محبّت میں یہ سیچویشن غضب ہے
محبّت کے پھندے میں آنا نہ صابر محبّت کا سر پہ روٹیشن غضب ہے

محبت وہ مرض ہے جسمیں انسان میڈ ہوتا ہے کنکشن دو دلوں کا انتہائی بیڈ ہوتا ہے
اِدھر عاشق تڑپتا ہے اُدھر محبوب بھی اُس کا نتیجہ دیکھنے والوں نے دیکھا سیڈ ہوتا ہے

ہے ٹیکس کی بھرمار سے حالت جو دگرگوں گھوڑا بھی نظر آتا ہے خجِّو نائنٹی* پرسینٹ
جی واپ کے محفل میں میرے دوستو ہنسنا ہنسنے پہ بھی لگ جائے نہ محصول** نائنٹی پرسینٹ

* ۹۰٪
** محصول

ظفر کمالی (پٹنہ)

غزل

گفتگو کرتا ہوں شب بھر دل کے ٹیلی فون سے عشق جب سے ہو گیا اک سرپھری خاتون سے
جو غلاظت دل میں ہے وہ دور ہوگی کس طرح گندگی تو جسم کی دھوتے ہو تم صابون سے
شیروانی اور ٹوپی جائے چولھے بھاڑ میں مجھ کو ہے رغبت فقط اب کوٹ سے پتلون سے
کیجئے یادِ خدا مرنے کے دن آئے قریب آ نہیں سکتی جوانی لوٹ کر معجون سے
ایک پاگل کہہ رہا تھا جس کی لاٹھی اس کی بھینس کون ڈرتا ہے یہاں پر کاغذی قانون سے؟
مولی گاجر پہ بھی لکھا ہو اگر مضمون تجھے! بات کا آغاز کرتا ہوں میں افلاطون سے
ایک ہی صورت ہے گزرے زندگی آرام سے خاندانی سلسلہ ملتا ہو گر قارون سے
دورِ نو کی کچھ عجب تشنہ لبی ہے اے ظفر پیاس جب بجھتی ہے اس کی تو ہمارے خون سے

برق آشیانوی

کیا کیا نہ کیا شاعر بننے کے لئے

{ نامور مزاح نگار برق آشیانوی مرحوم کی برسی کے موقع پر
ان کا یہ مضمون شگوفہ کے قارئین کی نذر ہے۔ ادارہ }

ایک دن ہمیں اس بات کا القا ہوا کہ آدمی کو زندگی میں کچھ نہ کچھ بننا چاہیئے۔ ورنہ جینے کو تو جانور بھی جیتے ہیں اور جانوروں کی طرح ہم نہایت کامیابی کے ساتھ جی رہے تھے کیوں کہ امریکہ جو گیہوں اپنے جانوروں کو کھلاتا ہے وہ ہمارے ملک کو بھیج رہا تھا اور ہم راشننگ کی دکان "پر کیو" میں گھنٹوں کھڑے رہنے کے بعد وہ گیہوں لاکر کھا رہے تھے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ چلو ہندوستان کے آدمی کی طرح نہیں تو کم از کم امریکہ کے جانور کی طرح جی رہے ہیں۔ یوں بھی امریکہ کے جانوروں کی فہرست میں شامل ہونا کچھ کم عزو شرف کی بات نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ آدمی کو سب سے پہلے انسان بننا چاہیئے لیکن مرزا غالب نے اس بات کا فیصلہ صادر فرمادیا تھا کہ ؎

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

جب ہم نے اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہم میں "آدمی" کی کوئی علامت ہی نہیں ہے۔ اسی لحاظ سے پہلے تو ہم کو "آدمی" بننے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد "انسان" بننے کے مسئلے پر غور کرنا تھا۔ لیکن تاریخ عالم کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب کبھی کوئی "آدمی" انسان بن گیا تو دنیا کے تمام "آدمی" اس کے دشمن ہوگئے بالآخر "آدمیوں" کے ہاتھوں "انسان" کہیں گولی کا نشانہ بن گیا تو کہیں سولی پہ چڑھ گیا۔ چنانچہ ہم نے انسان تو انسان آدمی بننے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ البتہ آدمی یا انسان بننے کے علاوہ کچھ اور بننے کے ارادے پر قائم رہے۔ سوچتے سوچتے ہم نے طے کرلیا کہ چاہے کچھ اور بنیں یا نہ بنیں شاعر تو ضرور بن جائیں گے۔ اس لیے کہ اس میں کچھ زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شاعر بننے پر نہ کوئی قانونی پابندی ہے' نہ اخلاقی بندش اور نہ کوئی سماجی بندھن۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے لیے نہ کسی تعلیمی سند کی ضرورت ہوتی ہے نہ فنی ڈگری یا ڈپلوما کی۔ جس شخص کا جی چاہے اور جس وقت بھی چاہے وہ شاعر بن سکتا ہے۔ ویسے لیڈر یا اداکار بننے کیلئے بھی متذکرہ صدر کی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن لیڈر یا اداکار بننے کے لیے کئی پاپڑ بیلنے کی ضرورت

ہوتی ہے جبکہ شاعر بننے کے لیے ایک پاپڑ بیلنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

شاعری میں ہمیں ایک خاص دلکشی نظر آئی۔ جب ہم دیکھتے کہ کوئی شاعر جھوم جھوم کر اپنا کلام سُناتا تو سامعین اس سے زیادہ جھوم جھوم کر داد دیتے۔ گوشے گوشے سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوتیں اور شاعر بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سب کو آداب بجالاتا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ شاعر کو مشاعرے میں کلام سُنانے کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ جس کی مقدار شاعر کی قدر و قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے۔ قدر و قیمت کا انحصار شاعر کی مختلف خصوصیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شاعر کی قدر اس کے کلام سے کی جاتی ہے اور کسی شاعر کی قدر اس کے ترنم سے کی جاتی ہے اور پھر قدر کے لحاظ سے "قیمت" کا تعین ہوتا ہے۔ البتہ کسی شاعر کی قدر کے بجائے عزت اس کی مالی حیثیت سے ہوتی ہے۔ ایسے شاعر کو معاوضہ دینے کے بجائے الٹا اس سے ہی کچھ وصول کرلیا جاتا ہے ایسے شاعر کو چاہے اس کے کلام میں کچھ معنی و مطلب نہ ہوں اور ترنم کا فقدان بھی ہو تو داد ضرور دی جاتی ہے تاکہ آئندہ بھی وہ غلط فہمی کی وجہ مشاعروں میں ضرور شریک ہو۔ ہم جہاں تک شاعر کی مختلف خصوصیات پہ غور کرتے گئے ہم میں شاعر بن جانے کا جذبہ اسی شدت سے جڑ پکڑتا چلا گیا۔ جب ہم نے اپنے دوست احباب سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا تو اس کا ردِ عمل مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ چند احباب نے ہمارے ارادے کی ستائش کی چند دوستوں نے مخالفت کی اور چند کرم فرماؤں نے لعنت ملامت کی۔ بعض مخلصین نے تو صاف کہدیا کہ ۔۔ "میاں تم شاعر بننے کے بجائے دھوبی بن جاؤ، حجام بن جاؤ، یا کسی ایسے ہی معزز روزگار سے لگ جاؤ لیکن خُدا کے واسطے ہرگز ہرگز شاعر نہ بنو" ایک ہمدم دیرینہ نے تو یہاں تک کہا ۔۔۔ "بھائی صاحب۔ شاعر بن کر کیوں اپنی زندگی کا بالا قساط خاتمہ کرتے ہو۔ زندگی سے ایسے ہی بیزار ہو تو شادی کرلو۔ اگر زندگی کا قرض یک مشت ادا کرنا چاہتے ہو تو یہ لو پچیس پیسے کھٹمل مارنے کی دوا لاؤ اور کھا کر اطمینان کے ساتھ سو رہو ۔۔۔ چند گھنٹوں میں وہ مقصد حاصل ہوجائے گا جو شاعر بن کر شاید برسوں میں حاصل نہ ہو" ایک مہربان نے اعتراض کیا۔ "برادرم۔ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں" ہم نے فی البدیہ جواب دیا "ہم پیدا ہوچکے ہیں۔ اور ہماری پیدائش کے وقت شاعری کے پورے آثار ہم میں پائے جاتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے سر کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ پیدائش کے وقت ایک جہاں دیدہ بزرگ نے ہمیں دیکھ کر فرمایا تھا کہ ۔ آج تک کسی نوزائیدہ کے بال اتنے بڑھے ہوئے میں نے نہیں دیکھے ۔ بڑا ہوکر یہ ضرور شاعر بنے گا" دوسرے یہ کہ ہم نے پیدا ہوتے ہی رونا شروع کردیا تھا۔ علاوہ ازیں ہماری پیدائش کے دوسرے دن ہی ہمارے دادا جان صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ تیسرے دن نانی جان صاحبہ پر فالج کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ انھوں نے چند ہی گھنٹوں میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ چوتھے روز بارش کی وجہ سے ہمارے آبائی مکان کی چھت منہدم ہوگئی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ والد صاحب کی چوتھی بیوی کی نیکیاں کام آگئیں کہ وہ ہم سب کو اپنی والدہ کے چہلم کی دعوت پر لے گئی تھیں۔ غرض یہ تمام نشانیاں اس بات کی شہادت تھیں کہ کوئی بڑا شاعر پیدا ہوا ہے۔ اس دلیل کو اُنھوں نے تسلیم کرلیا۔ بعض قدردانوں نے ہمارے اس ارادے کا "تالیوں" کی گونج میں پُرزور خیر مقدم کیا۔ ہم نے جواباً اس قدر شاندار خیر مقدم کیا کہ نہ صرف ہماری جیبیں بلکہ ہماری طبیعت بھی ہلکی ہوگئی ۔۔۔ البتہ شاعر بننے کا ارادہ "وزنی" ہوگیا۔

بہرحال اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے موسم گرما کی ایک تپتی ہوئی "خوشگوار"

دوپہر کو فیصلہ کر ہی لیا کہ ہم شاعر بن جائیں گے۔ موسم گرما کی دوپہر ایسے ارادے کے لیے غالباً نہایت موزوں تھی ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کسی اور معقول موسم کی معقول دوپہر کو ایسا نامعقول خیال کیوں کر آسکتا ہے۔

اِتنا تو ہمیں معلوم تھا کہ ایک کامیاب شاعر بننے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ترنم کے ساتھ شعر سُنانا چاہیے۔ کیونکہ بغیر ترنم کے شاعری کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کو بغیر نمک کے سالن کھلایا جائے یا کوئی بغیر بیوی کے کلب کو جائے۔ خود ہم کو ان شاعروں پر بے حد رحم آتا تھا جو ترنم کے بغیر شعر سناتے۔

جس طرح ہر نوجوان لڑکا یا لڑکی کو اس غلط فہمی میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ دُنیا میں اس سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ اسی طرح ابتداء میں ہر شاعر اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ ترنم کے ساتھ شعر سنا سکتا ہے۔ چنانچہ ابتداً ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ تاہم اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی دوسرا شخص ہمارا ترنم سُن کر کوئی صحیح رائے دے۔ چنانچہ ہم نے ایک دوست کو غالب کا ایک شعر ترنم کے ساتھ سنایا۔ انھوں نے مشکل سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا ——— "بھائی صاحب۔ آپ کا ترنم تو ایسا ہے کہ اِدھر سے لوگ جوتیاں بغل میں دبا کر بھاگنے لگیں گے اور اُدھر سے کوئی دھوبی بدحواسی کے عالم میں مشاعرے کی محفل میں داخل ہو جائے گا اور سیدھے آپ کے پاس آکر آپ کے گلے میں رسّی ڈال کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔" اُن کی اس دل خراش رائے سے ہمارے دل کو ایک دھکا لگا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک مُکا لگا۔ ایک صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم کسی استادِ موسیقی سے گانا سیکھ لیں۔ پھر ترنم نہ صرف ہماری شاعری بلکہ گفتگو سے بھی برسنے لگے گا۔ غرض ہم ایک استاد کے پاس پہنچے جو معاوضہ پہ گانا سکھایا کرتے تھے ہماری آواز سن کر اُنھوں نے فوراً کہا ——— "برخوردار تم گانا سیکھنے کے بجائے ناچنا سیکھو تو زیادہ کما سکو گے کیونکہ تمہاری آواز کے مقابلے میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی حرکات و سکنات میں زیادہ دلکشی اور آہنگ ہے۔" لیکن ہم نے بتایا کہ ہم گانا کمانے کے لیے نہیں بلکہ گنوانے کے لیے سیکھ رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئے۔

تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد بھی ہمیں "سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دا۔ نی۔ سا۔" بولنے کا ڈھنگ نہ آیا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ ——— "سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دا۔ نی۔ سا۔" ترنم کے ساتھ شعر سُنانے کے لیے کام نہ آئے گا۔ البتہ استادی گانا سیکھ لوگے جس کو سن کر مائیں اپنے بچوں کو کلیجے سے لگا لیتی ہیں۔ اِتنی ساری محنت رائیگاں ہوئی تو ہم نے طے کر لیا کہ بغیر ترنم کے ہی شاعری کریں گے۔ یہ اس لیے کہ بعض لوگوں نے بتایا کہ تحت اللفظ پڑھنا بھی ایک کمال ہے بس اس میں تھوڑی سی اداکاری بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے ہم نے از سرِ نو اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے پاس سونا بھی ہے اور سہاگہ بھی ——— یعنی ہمیں تحت اللفظ پڑھنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور اداکاری کے جوہر بھی ہم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اب دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ شاعری کیسے شروع کریں کیونکہ شعر کہنا تو درکنار ہمیں صحیح طریقے سے شعر پڑھنا بھی نہ آتا تھا۔ تحقیق کرنے سے ہمیں وہ راز کی بات معلوم ہو گئی جس پر عمل کر کے من چلے نوجوان چٹکیوں میں شاعر بن جاتے ہیں۔ اس طریقے سے شاعر بننے میں کچھ "خرچ" ہوتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ بغیر خرچ کئے کونسی چیز حاصل ہوتی ہے۔ گانا سیکھنے پر ہم کافی صرفہ برداشت کر چکے تھے۔ اور اب بھی خرچ کرنے کے لیے تیار تھے کیونکہ ہم اپنی محنت سے تو کچھ کماتے نہ تھے والد صاحب کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور موروثی جائیداد کی

آمدنی ہم بڑی آسانی سے خرچ کرسکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے نقد سودے سے شاعری شروع کردی۔

پہلی مرتبہ جس دکان سے ہم نے سودا کیا وہاں ہمیں دھوکا ہوا۔ اس لیے کہ دوکاندار ملاوٹ کا مال دیا کرتا تھا۔ مطلب یہ کہ غزل میں دو چار شعر کسی قدیم شاعر کے دیوان سے نقل کر دیتا تھا جس کی وجہ سے ہم کئی دفعہ پکڑے گئے۔ تاہم ہمیں یہ گر معلوم تھا کہ ایسے موقع پر آسانی سے یہ کہہ کر ٹال دینا چاہیئے کہ شعر لڑ گیا ہے۔ جب ہمارے اشعار بہت زیادہ کشتیاں لڑنے لگے تو ہم نے ایک دوسری دکان سے سودا طے کرلیا۔ یہاں ایک اور قسم کی پریشانی لاحق ہوئی۔ ایک تو دکاندار قیمت بہت زیادہ لیا کرتا تھا۔ دوسرے مال بالکل تھرڈ کلاس دیتا تھا۔ جس پر نہ کوئی داد ملتی تھی اور نہ واہ واہ ہوتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ پریشانی اس بات سے ہوتی تھی کہ مال وقت پر سپلائی نہ کرتا تھا حالانکہ مشاعرے سے کئی روز قبل آرڈر دیا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی پوری قیمت بھی اڈوانس ادا کردی جاتی تھی۔ اس کے باوجود عین مشاعرے کے روز گھر سے غائب ہوجاتا۔ ان تمام باتوں سے تنگ آکر ہم نے طے کیا کہ اب اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوجائیں گے۔ اور ایک روز واقعی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے۔ مطلب یہ کہ ہم نے خود شاعری شروع کردی۔ چونکہ قدیم طرز کی شاعری میں سیکڑوں قسم کی غیر ضروری پابندیاں تھیں اس لیے ہم نے ایک نئی طرز کی شاعری شروع کردی جس کا شاعری کی دنیا میں بول بالا تھا۔ اس قسم کی شاعری میں نہ کسی بحر یا وزن کی قید تھی اور نہ ردیف قافیہ کی — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معنیٰ و مطالب کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ چولھا پھونکنے، ترکاری بنانے۔ نہانے، شاپنگ کرنے۔ کھیلنے کودنے، چھلنے پھاندنے، لڑنے جھگڑنے غرض کسی موضوع پر بھی چند چھوٹی بڑی سطریں لکھ دو بلکہ ایک لفظ بھی لکھ دو تو ایک ایک مصرع بن جاتا ہے اور ایسے چند مصرعوں سے "ایک نظم" پوری ہو جاتی ہے۔ اس میں ہمیں بہت کامیابی ہوئی کیوں کہ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ترنم کی تو ضرورت ہی نہ تھی۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں جدیدیت کے دعویدار شعرا کی صفِ اول میں ہمارا شمار ہونے لگا۔

آخر میں دو ایک باتیں عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب والد صاحب کو معلوم ہوا کہ ہم شاعر بن گئے ہیں تو انھوں نے ہمیں گلے لگا کر اس طرح رونا شروع کردیا کہ جیسے ہمارا اچانک انتقال ہوگیا ہے اور وہ ہماری میت سے لپٹ کر رو رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جس دولت مند گھرانے کی لڑکی سے ہماری شادی کی بات پکی ہوئی تھی اس کے والدین نے اس لیے نسبت منسوخ کردی کہ ہم شاعر بن گئے ہیں پھر جہاں بھی ہماری شادی کی بات چیت ہوتی وہ اس لیے رد کردی جاتی کہ ہم شاعر ہیں۔ چنانچہ ہم اب تک لنڈورے ہیں۔ البتہ شاعری میں ہمارا ایک خیالی محبوب ہے جس کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شاعر بن جانے کے بعد محنت کر کے روزی پیدا کرنے میں ہمیں ذلت محسوس ہونے لگی۔ بھلا آپ ہی غور فرمائیے کہ ایک نامور شاعر کس طرح غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال سکتا ہے یا محنت مشقت کر کے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بیروزگاری ہماری شریکِ حیات بن گئی ہے!!!

□□

تبصرہ — تبصرہ نگار :- رضا نقوی واہی

"روشنی کی لہریں"

مصنف :- وجاہت علی سندیلوی

ایٹمی توانائی کی دریافت سے تقریباً ایک صدی قبل مولانا الطاف حسین حالی نے پانی پت کے میدان میں، غزل کے خلاف ایک جنگ چھیڑی تھی، جس کے اثرات محدود رہے۔ اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران، جب ہیروشیما پر ایٹم بم داغ کر تباہی پھیلائی گئی تھی تو پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے مولانا حالی کی ادبی جنگی پالیسی کی توسیع کرتے ہوئے، غزل کو 'نیم وحشی صنفِ شاعری' قرار دے کر میدانِ ادب میں ایک زوردار دھماکہ کیا۔ اس دھماکے کی چنگاریوں سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ چند حضرات، کچھ عرصے تک اپنے پٹاخوں کے فلیتوں کو آگ دکھاتے رہے۔ ترقی پسندی میں جب اعتدال آیا تو جدیدیت کے نام سے ایک نئی تحریک نے قدم جمانے کی کوشش کی۔ یہ قبیلہ دس برس تک غزل کے نادان دوستوں کا رول ادا کر کے اس کی مٹی پلید کرتا رہا۔ اس تحریک کی پشت پر چند انتہائی قسم کے چالاک لوگ تھے، جن کا مقصد ادب میں بے ادبی پھیلا کر اپنی چودھراہٹ قائم کرنا تھا۔ جب مقصد کسی حد تک پورا ہوگیا تو اُن کے گرد غزل کا چہرہ مسخ کرنے والوں کا جو گروہ منڈلاتا رہتا تھا اُسے ان چودھریوں نے دھکے دے کر اپنے حلقے سے باہر نکال دیا اور وہ بیچارے یوسفِ کارواں بن کر وقت کے دھارے میں بہہ گئے۔ اس مشترکہ حکمتِ عملی کا مقصد ایک ہی تھا کہ بیچاری غزل کو مار پیٹ کر، ایوانِ شاعری سے نکال باہر کیا جائے۔ لیکن برج بانو کی یہ چہیتی بیٹی اتنی سخت جان نکلی کہ ساری رسوائیاں سہنے کے بعد بھی اسی دم خم سے میدان میں ڈٹی رہی جیسی ایک ہزار سال سے ایران میں اور ڈھائی تین سو سال سے ہندوستان میں قدم جمائے کھڑی ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اب تو وہ اپنا دائرہ عمل ملک کی دوسری زبانوں، خاص کر ہندی پر بھی بڑھا رہی ہے اور ہندی کے اکثر نامور شاعر اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوکر، دھڑا دھڑ ہندی زبان میں غزلیں لکھ رہے ہیں۔

غزل کا ایک اچھا شعر کبھی کبھی طویل سے طویل نظموں کے مفہوم کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن بقولِ شاعر ؎

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے

یہ ہاتھ سودا۔ میر۔ غالب۔ شاد اور اردو کے دوسرے بڑے شاعروں نے اپنے اپنے وقت میں استعمال کیا اور غزل کی کاٹ دکھائی۔ یہ اور بات ہے کہ کمزور یا مفلوج ہاتھ سے جس طرح تلوار نہیں اُٹھ سکتی اسی طرح غزل گو شعراء کی کثیر تعداد غزل کو جوہری ڈھنگ سے برتنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ گذشتہ دو تین صدی کے اندر لاکھوں سے بھی زیادہ شاعر پیدا ہوئے اور مجموعی طور پر ٹن اور میگاٹن کے حساب سے غزلیں لکھی گئیں، لیکن ان کا انجام وہی ہوا جو خس و خاشاک کے ڈھیر کا دیاسلائی کی ایک تیلی کے سامنے ہوتا ہے۔ البتہ کچھ شعراء کا کلام آج بھی زندہ و تابندہ اس لئے ہے کہ اس میں جوہری توانائی موجود ہے۔ اس لئے صنفِ غزل کو گردن زدنی قرار دینے، اُسے نیم وحشی شاعری کا لقب دے کر بدنام کرنے یا جدیدیت کے برش سے اس کے چہرے پر کالک پوتنے سے اس کی جوہری قوت کو بے اثر نہیں کیا جا سکتا۔

اب روشنی کی قدر و قیمت کا تعین کرنے سے پہلے آیئے اس روشنی کے جنریٹر جناب وجاہت علی سندیلوی کی روشن طبعی پر ایک نظر ڈالی جائے۔ میری ان سے ایک طویل مدت سے آشنائی کی حد تک شناسائی ہے اور [illegible]

ہوں کہ میں اب تک اُنھیں صرف ایک منجھے ہوئے انشائیہ نگار اور سنجیدہ ظریفانہ مضامین کے خالق کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کے مضامین میں مجھے مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے فن کی آمیزش سے تیار کیا ہوا شربتِ روح افزاء جیسا ذائقہ ملتا تھا۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ "یک گیر و محکم گیر" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے وہ ایک متشرع عابدِ شب زندہ دار کی طرح مزاح نگاری میں ہی تن من سے ڈوبے رہتے ہیں۔ یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ موصوف ظرافت کے مُصلّے سے اُٹھ کر چوری چھپے سنجیدہ شاعری کی دیوی سے بھی گلے ملتے رہتے ہیں۔ "روشنی" کے دیدار کے بعد مجھے حیرت انگیز مسرت سے دوچار ہوتے ہوئے یہ اعتراف بھی کرنا پڑ رہا ہے کہ میں سخت مغالطے کا شکار تھا۔ شائد اکبر الہ آبادی نے کسی ایسے ہی بزرگ کی قلعی کھولتے ہوئے فرمایا تھا ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چوکتا بھی نہیں

کوئی ماہر فنکار یا شکاری ہی اندھیرے اُجالے میں نہ چوکنے کے گُر سے واقف ہوتا ہے۔ "روشنی" کے (۲۴۰) صفحات پر بکھری ہوئی غزلوں کی کہکشاں نے مجھے مزید حیرت میں مبتلا کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت بغیر نوٹس دیئے، بغیر کسی غزل کو کسی رسالے میں چھپوائے یا مشاعروں میں سُنائے ہوئے، اتنا بھاری بھرکم اور خوبصورت مجموعۂ غزلیات جس کا ہر صفحہ خوش ذوقی اور فکری پختگی کا مظہر ہے چُپکے چُپکے قارئین کی گود میں ڈال کر، سر جھکائے الگ کیوں کھڑے ہوگئے۔ آخر ایک شاعر ہوکر ان سے ایسی غیر شاعرانہ حرکت کیوں سرزد ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ تیس چالیس سال قبل جب پہلی غزل تولد ہوئی تھی تو ڈھول تاشے کے ساتھ منادی کرائی جاتی، عقیقے کی تقریب جیسی خوشیاں منائی جاتیں۔ احباب دعوتیں کھاتے، اخبارات میں وہ غزل چھپوائی جاتی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ کیا کہ نوجوانی سے جوانی تک چوری چھپے، اندھیرے اُجالے میں غزل سے دل لگانے کے واقعہ کو سنسر کے پردے میں چھپایا گیا اور جب بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھا گیا تب جاکر اس "غزل آشنائی" کے راز کو کھولا گیا۔ بڑے سے بڑا شاعر بھی شائد اتنے ضبط، اتنی رازداری کا متحمل نہیں ہوتا۔ لیکن حیرت ہے کہ وجاہت علی سندیلوی ایک عرصۂ دراز تک اپنی غزل گوئی کو اپنی "جانِ غزل" تک سے چھپائے رہے۔ شائد اُردو شاعری کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے۔

میری نظم "تبصرہ نگاری" کا ایک مصرعہ ہے۔ بن
پڑھے کے لکھا تو تبصرہ کیسا ؟

میں روشنی کی ہر غزل کو ایک عام قاری کی نظر سے پڑھ گیا ہوں۔ پڑھتے ہوئے کلام پر اظہارِ خیال کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مروجہ اصولِ تنقید سے انحراف کروں اور اس طرح نقادوں اور مبصروں کی خفگی مول لوں۔ اس کے علاوہ میں اپنے آپ کو ایک عام قاری سے زیادہ ذہین اور سخن فہم سمجھنے کی غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوں، اس لئے فارمولا ٹائپ کے چند مثبت اور منفی جملے لکھ کر قارئین کا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مُشک کی خوشبو کسی چرب زبان عطار کی محتاج نہیں ہوتی۔ البتہ دورانِ مطالعہ مجھے جو اشعار پسند آئے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں تاکہ قاری دیگ کے دوچار چاول ہی چکھ کر اندازہ لگا سکے کہ باورچی اپنے ہُنر میں کتنا مشّاق ہے۔

غیر کی آتش زنی سے کچھ بچا سامان تھا
گھر سے میرے وہ بھی ہمسایہ اٹھا کر لے گیا
چند خوشیاں چھین کر میری زمانہ شاد ہے
اوس کی بوندیں چُرا کر اک سمندر لے گیا

غریبی دور کرنا کیا اُنھیں کا کام ہوتا ہے
غریبوں کے لہو سے سُرخ جن کا جام ہوتا ہے
انھیں سے جاں بخشی کی توقع ہم کو ہے یارو
اشارے پر ہی جن کے روز قتلِ عام ہوتا ہے
اندھیرے جھونپڑوں کی روشنی چھینی ہے محلوں نے
شفق کے خون سے رنگیں سبوئے شام ہوتا ہے

تم اک زنجیر سے کیسے اُسے پابند کرتے ہو بڑی پابندیوں کو توڑ کر دیوانہ بنتا ہے
صنم اپنی اَنا کے شیخ نے کیسے تراشے ہیں حرم جس کو بناتا ہے وہی بت خانہ بنتا ہے

یاد کیا ہم کو نہیں اہلِ چمن کی بےرُخی ہم قفس سے کیوں رہائی کی دعا کرنے لگے
حیف ہم نے دل کے زخموں کو کبھی دیکھا نہیں اور چمن کے رنگ و بو پر آسرا کرنے لگے

ہوں گردشِ دوراں کوئے جام میں رقصاں یہ جام سفالی بھی مرا ساغرِ جم ہے
چلتے ہیں ابھی شیخ بس اک جام تو پی لیں میخانے سے دو گام یہ دیکھو وہ حرم ہے

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسبِ ذیل کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

الف تحاشہ	نرنیدر لوتھر	مجموعۂ کلام	۱۶ روپے
آدمی نامہ	مجتبیٰ حسین	خاکے	۹ "
قصہ مختصر	"	مضامین	۱۲ "
بالآخر	"	"	۱۲ "
تکلف برطرف	"	"	۱۴ "
قطع کلام	"	"	۱۲ "
البتہ	یوسف ناظم	"	۱۰ "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸ "
ٹائیں ٹائیں فش	پرویز یداللہ مہدی	"	۱۵ "
چنانچہ	مسیح انجم	"	۱۲ "
تسی سنائی	لئیق صلاح	"	۱۰ "
کوئیم مشکل	ڈاکٹر حبیب ضیاء	"	۱۲ "
غبارِ خاطر	رؤف خوشتر	"	۱۲ "
سکنڈ ہینڈ	رفیق شاکر	"	۱۰ "
مطلع عرض ہے	ملا دو نگار	مجموعۂ کلام	۱۲ "
مزاج لطیف	رشید قریشی	مضامین	۲۰ "

— عابدہ محبوب (حیدرآباد)

دھیان

"مشکل کام"

دسویں جماعت کے ششماہی امتحان میں زبانِ اوّل 'اُردو' کے پرچہ دوم میں ایک سوال انگریزی عبارت کو اُردو میں ترجمہ کرنے کا تھا۔ ایک طالبہ نے انگریزی عبارت کا پورا پیراگرف جوابی بیاض پر اتار دیا اور پھر اس کے نیچے ایک جملہ لکھ دیا کہ :۔

" انگریزی کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے !"

متعلقہ ٹیچر نے پرچوں کی جانچ کے وقت طالبہ کے جملے کے نیچے ایک جملہ لکھ کر سائن کر دی کہ :۔

" نمبر دینا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے !"

"اڑان"

ایک تقریب میں چند بے تکلف دوست ایک ہی میز پر بیٹھے ڈٹ کر کھا رہے تھے۔ ایک صاحب مرغ کے بہت شوقین تھے۔ وہ بار بار مرغ کی ڈش اپنی پلیٹ میں انڈیل رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ایک دوست نے آنجہانی پنڈت نہرو کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

" آہستہ کھاؤ ... مرغ اُڑ نہیں سکتا !"

صاحب بولے " جانتا ہوں مرغ اُڑ نہیں سکتا۔ مگر جلدی اس لئے کھا رہا ہوں کہ کہیں تم اُسے اڑا نہ دو !"

"درخواست"

(دروغ برگردنِ راوی)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی لڑکی تہذیب زورؔ سفر یونیورسٹی میں داخل لیا تھا۔ ایک بار کوئی جلسہ تھا اور ہال میں شور ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم نے مائیک سے اعلان کیا۔

" معزز حاضرین ! میری مودبانہ درخواست ہے کہ آپ زور سے بات نہ کریں " تہذیب " سے بات کریں۔ شکریہ !"

" دور اندیشی "

ایک ہندوستانی خاتون بھانجی کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی گئی۔ دو ماہ قیام کے بعد جب وہ انڈیا واپس آنے لگیں تو ان کی آٹھ سالہ لڑکی بولی " امّی ! آپ میری شادی کراچی میں کردیں نا !"

خاتون پہلے تو حیران ہوگئیں پھر ہنستے ہوئے پوچھا

" کیوں ؟ تمہاری شادی کراچی میں کیوں کردیں ؟"

لڑکی بولی " انڈیا میں ابّا جان آپ پر حکم چلاتے رہتے ہیں اور یہاں خالہ جان ، خالو جان پر حکم چلاتی رہتی ہیں !"

" علامہ اقبالؔ "

شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کی ایک مشہور تصویر ہے جس میں علامہ سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنا سیدھا گال رکھے ، غور و فکر میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ جب بھی کوئی پاکستانی اس طرح بیٹھتا ہے تو دوسرا اس سے پوچھتا ہے۔

" کیا بات ہے بھائی جان ، آج کل علامہ اقبال بنے ہوئے ہو !"

دلچسپی پیڑوں سے نہیں آم سے !

" کل " باغِ عام " میں خواتین کا اتنا بڑا جلسہ تھا اور تم نہیں آئیں !"

" باغِ عام کی بجائے " باغِ آم " میں ہوتا تو ضرور آتی !"

خدا رحمت کند......

حیدرآباد کے ایک جیّد عالم، نامور شاعر، دانشور اور صوفی بزرگ شاعر مولانا سید معزالدین قادری ملتانی کا گزشتہ مہینے حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔ مولانا کے معتقدین اور شاگرد ہندوستان اور بیرون ملک میں سینکڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ آزادی سے قبل حیدرآباد میں تشکیل دیے گئے "تالگو برادران" گروپ کے وہ ایک رکن تھے۔ ان کی زندگی، دوست داری اور احباب نوازی کے چرچوں کے ساتھ ساتھ ان کی عالمانہ، فقیرانہ اور درویشانہ زندگی اہل حیدرآباد کے لیے نمونہ تھی اور رہے گی۔ طنز و مزاح ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی ابتدائی محفلوں میں وہ شریک رہ چکے تھے۔ ایسے عالم بے بدل کے انتقال سے حیدرآباد کی علمی و ادبی محفلیں سونی پڑ گئی ہیں۔ ہم ان کے انتقال پر ملال پر ان کے فرزند اکبر جناب مصلح الدین سعدی اور دوسرے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں——

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے سابق ریڈر واستاد محترم ڈاکٹر سید حمید شطاری کا امریکہ میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ موصوف اپنے دور کے نہایت مقبول اور ممتاز اساتذہ میں سے تھے۔ اردو عربی اور فارسی پر انھیں یکساں عبور تھا۔ قرآن مجید کے اردو تراجم پر پی ایچ ڈی کے لیے انھوں نے جو مقالہ لکھا تھا، شائع بھی ہوا۔ شطاری صاحب متقی و پرہیزگار انسان تھے، لیکن طبیعت میں بلا کی شوخی تھی، طالب علموں کی زائد از نصاب سرگرمیوں سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی۔ یوں تو سب کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ اور مہربانہ تھا لیکن وہ مجھے بے حد چاہتے اور عزیز رکھتے تھے "شگوفہ" کے اجرا اور اس کی توسیع اشاعت سے بھی انھیں تعلق خاطر تھا۔ ان کا انتقال میرے لیے ایک شخصی حادثہ ہے——

ماہنامہ "ذوق نظر" کے مدیر جناب محمد بشیرالدین وارثی کا اچانک انتقال ہوگیا۔ یوں تو وہ گزشتہ دو ڈھائی سال سے "ذوق نظر" بڑی پابندی کے ساتھ شائع کر رہے تھے۔ لیکن ادب و شعر کا چسکہ انھیں عرصۂ دراز سے تھا۔ فوج سے علاحدہ ہونے کے بعد وہ انکم ٹیکس پریکٹشنر کی حیثیت سے جو کچھ کماتے تھے، اس کا بڑا حصہ ادبی محفلوں کے انعقاد اور ادیبوں و شاعروں کی مدد کے لیے خرچ کر دیا کرتے تھے۔ بعض کتابیں محض ان کی مالی اعانت کی وجہ سے منظر عام پر آ سکیں۔ بلاشبہ وہ ایک اردو کے بے لوث اور خاموش خدمت گار تھے۔ ان کے انتقال سے حیدرآباد کی ادبی و شعری محفلوں کو بڑا دھکا پہنچا۔

—— خدا سے دعا ہے کہ مرحومین کو جوار رحمت سے نوازے۔

آزاد بھارت کے چالیس سال

آزاد بھارت نے گذشتہ چار دہائیوں میں تمام شعبوں میں اہم پیش رفت کی ہے۔ ہم سب متحد ہو کر ایک ہی نصب العین کے حصول کے لئے کام کرتے رہے ہیں اور وہ ہے بھارت کو ترقی کی چوٹی پر پہنچانا۔

ہماری کامیابیاں ایک نظر میں

- ہم اپنی غلّے کی ضروریات میں خود کفیل ہو گئے ہیں اور پیداوار تین گنی ہو گئی ہے۔
- ستر فیصد گاؤوں میں بجلی لگائی جا چکی ہے۔
- آبپاشی کی سہولیات میں شاندار اضافہ ہوا ہے۔
- کمزور طبقات، بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے خصوصی پروگرام زیر عمل لائے گئے ہیں۔
- صرف گذشتہ چند برسوں میں ہی لگ بھگ دس کروڑ افراد کو خط غربت سے اوپر اٹھایا جا چکا ہے۔
- چیچک اور طاعون کی بیخ کنی کی جا چکی ہے۔ صحت کی سہولیات میں وسیع پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔
- پیدائش پر متوقع اوسط عمر 32 سال سے بڑھ کر 55 سال ہو گئی ہے۔
- خواندگی کی شرح دُگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اور اسکولوں اور داخلوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔
- ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی سہولیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔
- فولاد کی پیداوار میں نو گنا سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ اور المونیم کی پیداوار تقریباً ستر گنی ہو گئی ہے۔
- خام تیل کی پیداوار 120 گنی ہو گئی ہے۔
- کوئلے کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔
- بھارت واحد ترقی پذیر ملک ہے جو اُن سات یا آٹھ ملکوں میں شامل ہے جنہیں نیوکلیائی ایندھن کی مکمل ٹکنالوجی میں مہارت حاصل ہے۔
- بھارت دنیا کا ساتواں ملک ہے جس نے اپنا مصنوعی سیارہ خود اپنے راکٹ سے چھوڑا ہے۔
- آج بھارت کا شمار دنیا کے چوٹی کے دس صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔

ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن ابھی ہمیں مہاتما گاندھی کا خواب پورا کرنا ہے۔ ہر انسان کی آنکھ سے آنسو پونچھنا ہے۔ درحقیقت ابھی ہمیں بہت مسافت طے کرنی ہے۔ پھر بھی اس وقت تک ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں

ترقی جو ہمارے لئے قابلِ فخر ہے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان ہے

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

فون نمبر: 557716   فون مکان: 521064

جلد (۲۰) ——— ستمبر ۱۹۸۷ء ——— شمارہ (۹)

Zakir Husain Library
J. M. I. New Delhi

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت:
حمایت اللہ، محمد منظور احمد، مسیح انجم

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین

مینیجر:
سمیع جلیل

مینیجر اعزازی (دہلی)
فیاض احمد فیضی

★

کتابت: محمد عبدالرؤف، مسعود انور ○ طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: ۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۱

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ !

کراچی بیکری

معظم جاھی مارکٹ؛ حیدرآباد !

ڈسٹری بیوٹرس برائے:

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ ۳. انڈین الیٹ کمپنی لمٹیڈ ۴. ہارکوسری نگر
۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶. میڈونا کیننگ کمپنی ۷. چمپین دہائٹ رولس ۸. بیری شوٹلس اینڈ ٹافیس
۹. ڈرگ بھوٹان فوڈ پراڈکٹس
۱۰. SIL سل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:

پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس

کما. ز ار حوض، حیدرآباد

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

چُننده آسام و نیلگری کے باغات سے راست منگوائی ہوئی
چائے
اسٹرانگ و خوش ذائقہ
آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد
یاقوت محل ٹاکیز
یاقوت پورہ، حیدرآباد
PHONE
525444

نامور و منفرد مزاح نگار

مُجتبیٰ حسین

کو ماہنامہ شگوفہ کا خراج تحسین

مُجتبیٰ حسین نمبر

- فکر و فن اور شخصیت کا سیر حاصل جائزہ
- ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں، شاعروں، مزاح نگاروں اور نقادوں کی خصوصی تخلیقات
- مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب
- تصاویر اور دیگر دلچسپیاں

نومبر ۱۹۸۷ء میں اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی

تقاریب

۱۸ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۸۷ء

ہند و پاک کے نمائندہ مزاح نگاروں کا اہم اجتماع

— تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں —

اس موقع پر

- طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کا کل ہند انعامی مقابلہ۔ تفصیلات صہ ۵۸ پر

یوسف ناظم

سرکاری ہڑتال

آج ہماری ضروریات کے مطابق جو بیماریاں دُنیا میں رائج ہیں وہ پہلے بھی موجود تھیں لیکن چونکہ اُس زمانے میں اتنے روزنامے اور ہفتہ وار اخبار (بمعہ اشتہارات) نہیں چھپتے تھے، ذرائع ابلاغ محدود تھے اور ترسیل کا المیہ ذرا زیادہ تھا اس لیے نہ تو ان بیماریوں کے نام رکھے گئے تھے اور نہ اِن بیماریوں میں کسی کے مُبتلا ہونے کی خبر غیر متعلق لوگوں کو بھیجی جاتی تھی۔ بیماری تو بیماری موت کو بھی بالکل ایک گھریلو معاملہ سمجھا جاتا تھا صرف چند شرفاء کو خبر کر دی جاتی تھی اور لوگ مرنے والے کی آخری رسوم سے جلد از جلد فارغ ہو جاتے تھے ٹریجیڈی کو کامیڈی نہیں بنایا جاتا تھا۔ پہلے زمانے میں کسی بھی شخص کی میت کو تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ (آج کل کی بات اور ہے۔ مرنے والے کی زندگی میں اس کے کون سے کام وقت پر ہوتے تھے کہ مرنے کے بعد اسے فوراً رخصت کر دیا جائے۔ مرنے کے بعد بھی اُسے ایک آدھ ہفتہ جانے نہیں دیا جاتا) جس طرح بیماریوں کے نام اور اُن کی دیگر تفصیلات سے لوگ لاعلم رہتے تھے اسی طرح اور بہت سے واقعات کا اشتہار نہیں دیا جاتا تھا اس لیے ایک عام خیال یہ ہے کہ پچھلے زمانے میں ہڑتالیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس زمانے میں بھی آخر ہمارے ہی آبا و اجداد دنیا میں رہتے تھے جو ہم سے مختلف نہیں ہو سکتے ہماری کچھ تو خُو بُو اُن میں ہوگی۔ وہ لوگ ٹھنڈے مزاج کے ضرور ہوتے ہوں گے لیکن اُن کا مزاج اتنا بھی برفیلا نہ ہوتا ہوگا کہ ایک ہڑتال نہ کر سکیں۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ ضرور درج ہے کہ پچھلے زمانے میں رعایا چین کی بنسی بجایا کرتی تھی۔ ضرور بجاتی ہوگی کیوں کہ اس زمانے میں بجانے کو اور تھا ہی کیا۔ لیکن اس چین کی بنسی کے بجانے میں کچھ وقفہ تو ہوتا ہی ہوگا اور چین کی بنسی تو آج بھی بجتی ہے لیکن یہ سب تھوڑے سے ہی بجاتے ہیں جو نہیں بجاتے یعنی جن کے پاس یہ ہوتی نہیں ہے وہ لوگ ہڑتال پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اور اب تو حالات اتنے ناگفتہ بہ ہو گئے ہیں کہ عوام تو عوام ہیں خود سرکار کو بھی ہڑتال پر جانے کی سوجھی ہے۔ (یوں بھی سرکار کو کہیں نہ کہیں جانے کی عادت ہوتی ہے) ویسے سرکار کی ہڑتال کا یہ پہلا واقعہ ہے۔

اتنی دردناک صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی اور عوام بالکل حیرت زدہ ہیں (ان میں سے ایسے عوام جن کی انگلیاں فگار نہیں ہیں اور جن کے دانت کسی وجہ سے اب تک صحیح سلامت ہیں وہ انگشت بدنداں بھی ہیں)۔ عوام کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا ہے کہ اُن سے ایسا کیا قصور سرزد ہوگیا کہ سرکار جیسی معزز جماعت کو ہڑتال کرنی پڑی (عوام تصویر کا دوسرا رُخ کبھی نہیں دیکھتے)

سرکار کی ہڑتال کے آثار بہت دن پہلے پیدا ہوگئے تھے۔ اصل میں عوام کا رویّہ سرکار کے ساتھ کبھی اچھا نہیں رہا عوام سرکار کو بالعموم ٹیڑھی نظر سے دیکھتے رہے ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو سرکار نے ہمیشہ اخلاقاً عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ ہمیشہ ان کے لیے ریلیف کیمپ قائم کئے بلکہ ریلیف کیمپ قائم کرنے کی سرکار کو اتنی مشق ہوگئی کہ ادھر کچھ ہوا نہیں کہ اُدھر ایک ریلیف کیمپ کھُل گیا۔ جب بھی کوئی حادثہ ہوا مرنے والوں کے ورثا کو فوراً معاوضہ دیا گیا حالانکہ بہت کم ورثاء کا پتہ چلا اور تو اور زخمیوں تک کو معاوضہ پیش کیا گیا۔ سرکار نے جگہ جگہ پُل بنائے عوام نے اِن پُلوں پر چلنا مناسب نہیں سمجھا وہ الگ بات ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو سرکار نے عوام کی خاطر انجام دیئے۔ جگہ جگہ اعلیٰ پیمانے پر فیسٹیول منعقد کئے جس پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا۔ لیکن اس کا صلہ سرکار کو اچھا نہیں ملا۔ ہڑتال پر جانے سے پہلے سرکار نے عوام کو اپنے خاص لیڈروں کے ذریعہ کہلوایا بھی تھا کہ عوام کو بھی سرکار کے مطالبات پر غور کرنا چاہیئے۔ سرکاری مطالبات اور سرکار کے مطالبات میں بڑا فرق ہوتا ہے لیکن عوام اس فرق کو محسوس نہیں کرسکے۔ وہ اپنی دانست میں سمجھتے رہے کہ سارے سرکاری مطالبات تو سالانہ بجٹ کے موقع پر قبول کرلیے جاتے ہیں پھر یہ الگ سے کون سے مطالبات ہیں۔ عوام کی دانست ہوتی ہی اِتنی ہے معقول دانست [illegible] جانتے کہ سرکار کے کچھ ذاتی مطالبات بھی تو ہوسکتے ہیں اور جب یہ نکتہ اُن کی سمجھ میں آیا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ عوام اُس وقت جاگے جب سرکار کے سونے کا وقت آگیا۔ جس طرح دیر سے کئے جانے والا انصاف، انصاف نہیں ہوتا اُسی طرح کسی کے مطالبات پر دیر سے غور کرنے کو غور کرنا نہیں کہا جاسکتا۔ اِسے صرف افسوس کرنا کہا جاسکتا ہے۔ عید کے پیچھے ٹر سے کوئی فائدہ نہیں۔ (بلکہ اب تو خود عید بھی مُفید نہیں رہی کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اصل عید تو بعید ہوگئی ہے)۔

ایسا نہیں ہے کہ عوام میں سرکار کے بہی خواہ ہیں ہی نہیں۔ یہ کافی تعداد میں ہیں اور جب بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ بہی خواہی کرتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر لوگوں نے سرکار کے ہڑتال پر جانے کی خبر سُن کر عوام اور سرکار کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ ان ہی خواہوں کو ہمارے یہاں ایلڈرس (ELDERS) کہا جاتا ہے۔ ایلڈرس اور بلڈرس میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ انھیں بھی تعمیراتی کاموں سے بہت دلچسپی ہے بس فرق یہ ہے کہ ایلڈرس کے تعمیراتی کام کسی بلو پرنٹ کے محتاج نہیں ہوتے۔ اِن لوگوں نے سرکار کی ہڑتال شروع ہونے سے پہلے دونوں فریقین کو سمجھایا کہ سرکار اور عوام دو الگ نام ضرور ہیں اور بادی النظر میں دو مختلف النوع چیزیں نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک اِن دونوں کی ماہیئت کا تعلق ہے یہ دونوں بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے یہاں

ہمیشہ ہر چیز کی بنیاد ضرور دیکھی جاتی ہے۔ ادب کے میدان میں بھی اگر کوئی شاعر نظم اور غزل دونوں اصناف سخن پر ہاتھ صاف کرتا ہے تو نقاد اس شاعر کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ شاعر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔ دو نقاد بالعموم دو مختلف رائے دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی رائیں پڑھنے کے بعد شاعر کی غزل میں نظم کا رنگ اور نظم میں غزل کے اشعار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ نقادوں کو اور کیا چاہیئے ـــ اس طرح ہمارے کئی شاعر تباہ و برباد ہو گئے۔ پہلے بھی کچھ زیادہ آباد نہیں تھے۔ یہ البتہ آج تک ظاہر نہیں ہوسکا کہ خود تنقید نگار بنیادی طور پر کیا ہوتے ہیں۔

ایلڈرس، جنھیں اکثر لوگ فرط عقیدت میں بزرگ دانشور کے نام سے بھی یاد کر لیتے ہیں۔ اپنی مصالحت کی کوششوں کی رفتار میں تیزی نہیں پیدا کرسکے۔ اس معاملے میں اُن کی کوئی ثانی نہیں بلکہ پیرانہ سالی عارض رہا۔ بزرگ دانشوروں کو تیز رفتاری نئے معاملے میں ہمیشہ شبکی ہوئی ہے جب کہ ان کے برخلاف بلڈرس ضرورت سے زیادہ تیز بھاگتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو ۱۰ منزلہ عمارت کا اجازت نامہ حاصل کرتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ۱۵ منزلہ پختہ عمارت اس تیزی سے کھڑی کر دیتے ہیں کہ پیچھے کی اصل ۱۰ منزلیں نیم پختہ رہ جاتی ہیں۔ بالائی پانچ پختہ منزلوں کو بعد میں میونسپل کارپوریشن تہہ و بالا کر دیتی ہے ـــ

اس بات کا امکان تھا کہ سرکار اپنی ہڑتال کا فیصلہ واپس لے لیتی کیونکہ ہمارے یہاں واپس لینے کا رواج بھی کافی مقبول ہے۔ بہت سی چیزیں جو برضا و رغبت واپس نہیں لی جاتیں کسی نہ کسی طریقے سے واپس کر دی جاتی ہیں مثلاً اکثر دولھنوں کو چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے واپس کر دیا جاتا ہے اور اگر واپس بھیجنے میں کوئی دِقت محسوس ہوتی ہے تو انھیں ایسی جگہ بھیج دیا جاتا ہے جہاں سے مزید واپسی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ سرکار بھی شاید ہڑتال کا فیصلہ ـــ اسے فیصلہ کیوں کہا جائے یہ تو صرف عندیہ تھا کیونکہ فیصلے تو ہم لوگ آئندہ نسلوں کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔ بہر حال ہوسکتا تھا کہ یہ ہڑتال ہوتی ہی نہیں لیکن ان مُبینہ دانشوروں نے اپنے جوش مصالحت میں کہیں یہ کہہ دیا کہ سرکار آخر ہڑتال پر کیوں مُصر ہے ہڑتال تو اس صورت میں کی جاتی ہے جب لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ نازیبا ریمارک سرکار کو بے حد ناگوار گزرا۔ اصل میں دانشوروں کو کڑوی باتیں کہنے کی عادت ہوتی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر شکر کی کوئی چیز نہیں کھا سکتے۔ اِن میں کوئی بھی گوڑ بولے نہیں ہوتا۔ بس اسی بات پر معاملہ بگڑ گیا۔ مطالبات و طالبات تو ضمنی چیزیں ہیں اور مطالبات کی لمبی فہرست میں سے ایک مطالبہ بھی منظور کر لیا جائے تو معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ لیکن اب تو بات وقار کی آگئی تھی اور جب بات وقار کی آجائے تو پھر آدمی کیا اوتار بھی اُسے سنبھال نہیں سکتے ـــ اِس نوبت پر عوام نے بھی کہا کہ ہم تو سیدھے سادے عوام ہیں، ہمارا دانشوروں سے کیا تعلق ہے اور ہم نے اِن دانشوروں سے کب کہا تھا کہ اپنے اپنے شیشے کے اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے گھروں سے نکل کر ہمارے آپس کے معاملے میں دخل دیں۔ اِن میں سے کچھ عوام تو اس حد تک آگے چلے گئے کہ دانشوروں

کی طرف سے معافی مانگنے کا بھی وعدہ کرلیا ــــ یہ طریقہ بھی ہمارے یہاں مستحسن ہے اور کسی اصل شخص کی جگہ کوئی اور شخص جو اس کا خودساختہ نائندہ ہوتا ہے معافی مانگتا ہے جو قبول بھی کرلی جاتی ہے مثلاً بیوی کوئی بات کہے اور شوہر معافی مانگے تو آدمی بیچ جاتا ہے۔ ہاں شوہر اگر کوئی نازیبا بات کہے اور اس سلسلے میں کسی بڑی ملامت کے ہونے کا یقین ہو تو بیوی معافی نہیں مانگتی کیونکہ کوئی شوہر جب بھی کوئی نازیبا بات کہتا ہے بیوی ہی کے مشورے پر کہتا ہے۔ شوہر، بیوی کی اجازت کے بغیر معافی مانگ نہیں سکتا اس لیے وارداتیں ہوکر ہی رہتی ہے۔ پولیس بھی ایسی ہی واردات کی تفتیش میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے کیونکہ جرائم اب اس محکمہ کے لیے بے مزا ہوکر رہ گئے ہیں۔

عوام نے جب دانشوروں کی طرف سے معذرت کرنے اور اُن کے کہے ہوئے الفاظ واپس لینے کی پیشکش کی تو سرکاری بنچوں پر بیٹھے ہوئے افراد میں سے اکثر کا دل چاہا کہ پیشکش قبول کرلی جائے (یاد رہے کہ سرکار بیٹھتی تو صوفوں پر ہے لیکن ان صوفوں کو بنچ ہی کہا جاتا ہے) لیکن جب انھیں یاد دلایا گیا کہ اب بات مطالبات کی نہیں بلکہ وقار کی ہے اور یہ کہ اگر اس نوبت پر ہم نے کسی پس و پیش کا مظاہرہ کیا تو عوام سمجھ جائیں گے کہ ہوا دل ناکام ہو رہے ہے۔ اور ہماری (رہی سہی) ساکھ باقی رہے گی۔ (کسی نے تو یہ بھی کہا کہ یہ راکھ ہو جائیگی)۔ ایسی اور دو چار باتیں سن کر ان لوگوں کی رگ حمیت ازسرِ نو پھڑکی اور ان کے مخالف ہڑتال خیالات پر اوس پڑگئی۔ (پتہ نہیں اوس پڑنے کو برا کیوں سمجھا جاتا ہے حالانکہ اوس پڑنے سے تو برگ و شجر دُھل جاتے ہیں۔ ان پر جمی گرد صاف ہو جاتی ہے۔ زمین پر بچھی نرم گھاس نکھر جاتی ہے اور سبز باغ کا منظر پیدا ہو جاتا ہے جو عوام کے لیے بہت فرحت بخش ثابت ہوتا ہے۔)

آج کل کے زمانے میں دفعہ ۱۴۴، ہڑتال، کرفیو، اور اس قسم کے دوسرے ذرائع ابلاغ بہت ضروری ہوگئے ہیں۔ ہڑتال تو اب اس لیے بھی ضروری ہوگئی ہے کہ اگر کسی ادارے میں کوئی ہڑتال نہیں ہوتی ہے تو اس ادارے کے سربراہ [illegible] کرفیو کے بارے میں تو افراطِ زر کے ماہرین کی رائے ہے کہ غذائی مسئلے کا آسان ترین حل کرفیو ہے۔ کرفیو نافذ کرنے کا مہذب اور مؤثر طریقہ یہ ہے کہ کرفیو ۲۴ گھنٹوں کا ہونا چاہیے لیکن دن کے اوقات میں ایک گھنٹے کے لیے اسے اٹھا بھی دینا چاہیے تاکہ لوگ گھر سے باہر نکلیں تو اس ایک گھنٹے میں گھر واپس نہ آسکیں ــــ دفعہ ۱۴۴ البتہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب سے ٹیکسیوں میں ۴ مسافروں کو بیٹھنے کی اجازت دیدی گئی ہے دفعہ ۱۴۴ بے معنی ہوکر رہ گئی ہے۔ اور بعض شہروں میں تو سرکاری دفاتر میں سگریٹ نوشی ممنوع کیے جانے کی وجہ سے سڑکوں پر مجمع اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ ہر اصلاح کے ساتھ ترمیم بطور ردیف استعمال کی جانی چاہیے ــــ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سرکاری ہڑتال سے عام حالات متاثر نہیں ہوتے ہیں اور لوگوں کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے بلکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب راشن کی دوکان پر کبھی کبھی گیہوں بھی ملنے لگا ہے۔ ہم اس معاملے میں اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے کیوں کہ ہم بذاتِ خود ملازم سرکار ہیں جو کچھ معاملے میں بندھے کسی طرح بھی کچھ چلے جاتے ہیں۔ بالعموم مستقبل کی طرف ــــ!!

رضا نقوی واہی

اکیسویں صدی کی ولادت قریب ہے

(قسط نمبر ۲)

○

گزرے گا انقلابی اُلٹ پھیر سے سماج　　تبدیل ہوں گے مطلب و مفہوم ازدواج
ہوگا نئی صدی میں فقط عورتوں کا راج

اب تک تھے زن مُرید ہی محکوم بیگمات　　آئے گی ان کے دام میں اب پوری کائنات
تابع رہے گا ان کا ہر اک شعبۂ حیات

صدیوں کا بُغض دل سے نکالیں گی بی بیاں　　مردوں کو کرسیوں سے اُچھالیں گی بی بیاں
دفتر کا کام کاج سنبھالیں گی بی بیاں

اب صنعتی اداروں کا بدلے گا خط و خال　　کل کارخانوں میں وہی تیار ہوگا مال
جو کام آ سکے پئے آرائشِ جمال

حجّام خانے جتنے ہیں ان سب کو توڑ کر　　ان کی جگہ کھلیں گے نئے بیوٹی پارلر
نائی کے بدلے آئیں گی واں نائنیں نظر

مردوں کے دَور میں تھی جو مقبول بے خلل　　متروک ہو کے شہر بدر ہوگی اب غزل
اس کی جگہ پہ ریختی کا راج ہوگا کل

ہوگی اسمبلی میں کبھی کوئی بحث جب　　میزائلوں سے تیز چلیں گے زبان و لب
اک دوسرے کو نوچنے دوڑیں گی سب کی سب

کل تک پڑوسیوں سے جو ہوتی تھی لفظی جنگ　　ایوان ساز بزم میں بدلے گا اس کا ڈھنگ
کچھ تجّتی بڑھے گی تو برسیں گے خشت و سنگ

دولھا کے گھر برات دُلہن لے کے جائے گی　　رخصت کرا کے ڈولی پہ دولھا کو لائے گی
اپنی سہیلیوں کو ولیمہ کھلائے گی

دولھا کا باپ دے گا نہ پورا جہیز اگر　　نوشہ میاں کے جسم پہ پیٹرول ڈال کر
بھیجے گی خود دلہن انھیں شمشان گھاٹ پر

مَردوں کے ذمے ہوگی گھر آنگن کی دیکھ بھال چولھے کے پاس رہ کے پکائیں گے بھات دال
اور بی بیاں دکھائیں گی بیرونِ در کمال
ہوگی نہ ماں پہ خلقتِ اولاد منحصر جرثومۂ حیات کو نلکی میں ڈال کر
کھٹکا دبایا اور برآمد کیا پسر
ان نلکی زادگاں کی نگہداشت کے لیے ہاتھوں میں اپنے دودھ ملائی لئے ہوئے
اک پیر پر رہیں گے کھڑے مرد ملب بیٹے
اب تک گزر رہے تھے شب و روز موج سے "اکبر دبے نہ تھے کسی دشمن کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے"

O

غزل

نسیم سحر
(جدہ)

گرچہ مشہور یہ ہے دانۂ گندم سے ہوئی
کچھ یہاں ہم سے خرابی ہوئی کچھ تم سے ہوئی
خیر سے یہ بھی گلوکارہ، گلوکار تھا وہ
جنگ بھی دونوں میں آدابِ ترنم سے ہوئی
مجھ کو معلوم نہ تھا فرق گدھے گھوڑے کا
لید سے بھید کھلا، جانچ مجھے سُم سے ہوئی
نفسِ مضمون تو تھا شیخ کا اچھا لیکن
ضد مجھے اُس کے عجب طرزِ تکلم سے ہوئی
عشق صادق ہے مرا، کہتا ہوں ہر لڑکی سے
"کب ہوئی ایسی محبت جو مجھے تم سے ہوئی"
اُس نے مضمون تو باندھے تھے غزلیں اچھے
اتنی ہوٹنگ مگر اس کے ترنم سے ہوئی
"ھاٹ لائن" یہ خدا سے کبھی پوچھیں گے نسیم
کیوں ہمیں اپنی خبر بھی مہ و انجم سے ہوئی

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

طنز و مزاح کا اکبر بادشاہ

کچھ مہینے پہلے فکر تونسوی نے جب اپنی کتاب "فکر بانی" کی ایک کاپی مجھے عنایت کی تھی تو اُس پہ لکھا تھا "طنز و مزاح کے نئے تخت نشین دلیپ سنگھ کی نذر" اِتنے بڑے ادیب سے ایسا سرٹیفکیٹ ملنے پر چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اُسے اپنی پیشانی پر چپکائے پھرتا لیکن مشکل یہ آ پڑی ہے کہ فکر تونسوی بلا کا طنز نگار ہے۔ اس کے اس جملے سے کئی طرح کے معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح کی سلطنت کے زوال کی حالت ملاحظہ فرمائیے کہ دلیپ سنگھ جیسے لوگ میرے بعد تخت و تاج کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر تو میں اِس سرٹیفکٹ کو چھپائے رکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی جب کوئی اور طنز و مزاح نگار خود سے فکر ثانی ہونے کا اعلان کرتا ہے تو میں یہ سرٹیفکیٹ اُس کے سامنے کر دیتا ہوں کہ دیکھ لو بھیا یہ تخت و تاج مجھے خود طنز و مزاح کے اکبر بادشاہ نے بخشا ہے۔ یہ ضمنی بات ہے کہ سرٹیفکیٹ دیکھ کر وہ مجھے تو گالیاں دیتا ہی ہے۔ خود اکبر بادشاہ کو بھی نہیں بخشتا۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا طنز و مزاح کے اکبر بادشاہ نے واقعی حکومت سے کنارہ کشی کر لی ہے؟ اِس جملے کو دیکھ کر شاید یہ شک آپ کے دل میں اُٹھا ہو کیونکہ ہمارے ادیب کی شان میں یا تو جلسہ ہوتا ہے اُس کی موت کے بعد یا پھر تب ہوتا ہے جب وہ خود لزشت گا رنٹی دیتا ہے کہ میں اب کبھی نہیں لکھوں گا فکر نے تو اِن دونوں معرکوں میں سے کوئی بھی سر نہیں کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جلسوں کے منتظمین نے اپنے احوال بدل لیے ہیں۔ فکر یقیناً اُس شدت سے نہیں لکھ رہا جیسے اُس نے پچھلے کئی سال لکھا ہے لیکن اب بھی ہفتے دس دن میں اُس کے قلم سے چنگاریاں اُٹھتی تو میں نے خود دیکھی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فکر کو آج کل اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اُس کے طنز کے تیر و نشتر نے وہ کرشمہ نہیں دکھایا جس کی وہ اُمید لگائے بیٹھا تھا۔ ابھی اگلے دن کی بات ہے۔ جامعہ ملیہ کے MASS COMMUNICATION ڈیپارٹمنٹ کے صدر جمال قدوائی

صاحب نے کچھ ادیبوں کو بلا کر اُن سے درخواست کی تھی کہ ہم لوگ دیہات سدھار کے مسئلہ پر کچھ پروگرام لکھیں۔ فکر نے وہاں بیٹھے بآوازِ بلند کہا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ قدوائی صاحب نے قدرے متعجب ہو کر پوچھا "فکر صاحب ایسا کیوں؟" فکر نے جواب دیا "پہلے جو اتنا لکھ چکا ہوں اس پر کون سا عمل ہو رہا ہے؟"

فکر ایک دن خود مجھ سے کہہ رہا تھا کہ "زندگی بھر میں نے بُت شکنی کی ہے، جہالت کی بُت شکنی، تعصب کی بُت شکنی، فرقہ پرستی کی بُت شکنی اور ایک ایسے مذہب کا پرچار کیا ہے جو ساری انسانیت کا ہو لیکن کل ہی میری بیوی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ چلو ویشنو دیوی کے درشن کر آئیں۔ آخری عمر میں گویا مجھے میرے ہندو ہونے کا احساس دلایا جا رہا ہے"۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، بیوی سے مُراد فکر کی منکوحہ بیوی نہیں ہے یہ تو ایک سمبل ہے اُن تمام لوگوں کا جنھوں نے فکر کو طنز و مزاح کے نشتر چلانے کا موقع بہم پہنچایا۔ اس کی منکوحہ بیوی نے تو ایک بڑا عظیم کام کیا کہ اُس نے فکر کے گھر کے مورچے کو سنبھالے رکھا تاکہ وہ جہالت سے جنگ آزما ہو سکے۔ فکر کو یقیناً اس قربانی کا احساس ہے۔ ایک دن اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فکر نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے بتایا کہ اس کی بیوی کو جوانی میں لوگ میم کہتے تھے۔ میں نے بھابی کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا کہ فکر کے ہاتھ میں ایک اچھی چیز سونپنے سے کتنے لطیف نتائج نکل سکتے ہیں۔

فکر سے میری قریب تیس سال سے اُوپر کی دوستی ہے۔ اُسی نے مجھے لکھنے کے لیے اُکسایا۔ اُسی نے مجھے یہ احساس دلایا کہ لکھو تو عوام کے لیے لکھو خواص کے لیے مطالعہ ایک دماغی عیاشی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ عوام شاید اس سے کچھ فائدہ بھی اُٹھا سکیں۔ اُس نے ہمیشہ میرے مضامین اور میرے ڈراموں کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس لیے میں اُسے اپنا کرم فرما بھی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن جب بھی کبھی ہم دونوں نے مل کر شراب نوشی کی ہے۔ فکر نے ہمیشہ مجھ سے میرے حصّے کی شراب کے پیسے دلوائے ہیں۔ یہ کوئی دوست ہی کر سکتا ہے۔ کرم فرما ہوتا تو کہتا کہ پوری بوتل تم خرید کر لاؤ۔

[illegible] ادیب فکر نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ایک منفرد ادیب ہے۔ جس نے طنز و مزاح کے ایک خاص اسکول کو جنم دیا ہے۔ اُس نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک مقصد سے IDENTIFY کیا ہے شاید اسی لیے اُس کا کسی اور طنز نگار سے کوئی جھگڑا نہیں وہ سمجھتا ہے کہ ایک ہی منزل کے مسافروں کا آپس میں تفرقہ کیسا۔ دو سال پہلے میں جب آسٹریا کی راجدھانی وی آنا میں ملازمت کر رہا تھا تو میں نے وہاں سے ایک طویل خط فکر کو لکھا تھا۔ جس میں وی آنا کی زندگی کا ایک خاکہ بھی تھا۔ فکر نے وہ خط جوں کا توں اپنے کالم میں شامل کر لیا۔ اُس کے بعد جب میں نے اُسے ایک رسمی خط لکھا جس میں اپنی خیریت کا ذکر اور اُس کی خیریت مطلوب تھی تو اُس نے جواب میں لکھا کہ اچھا ہوتا اگر تم خط کی بجائے ایک مضمون لکھ بھیجتے۔ جہاں تک تمہاری خیریت کا تعلق

ہے۔ یورپ میں اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ اور میری خیریت اسی میں ہے کہ اچھا لکھتا رہوں اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیتا رہوں کیونکہ "میرا پیغام مسرت ہے جہاں تک پہنچے"۔

ادیبوں کی ایک خاصیت ہے کہ اپنی ادبی زندگی کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر عوام سے منہ پھیر لیتے ہیں اور دانشوروں کی صف میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادیب اگر شاعر ہے تو اس مقام پر پہنچ کر اپنی نظموں کو پیچیدہ کرتا چلا جاتا ہے۔ کہ عوام انھیں سمجھ نہ سکیں۔ اگر وہ افسانہ نگار ہے تو کہانی کہنے کی بجائے قاری کو افسانہ نگاری کے نئے نئے تجربوں کی دلدل میں پھنسا دیتا ہے۔ اور اگر وہ ناقد ہے تو فرانس اور جرمنی کے ادیبوں کے تنقیدی مضامین کو اپنا تکیہ بنا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کچھ سال پہلے مجھے دور درشن کی طرف سے کچھ ادیبوں پر فلمیں بنانے کو کہا گیا تھا۔ مقصد ہمارا یہ تھا کہ ادیب کا ایک عام سیدھے سادھے قاری سے تعارف کرایا جائے۔ اُسے بتایا جائے کہ ادیب بھی ہماری طرح گوشت پوشت کا بنا ہوا انسان ہے۔ وہ بھی صبح گھر میں جھاڑو لگاتا ہے۔ سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کرتا ہے۔ اور ہوسکے تو روز نہاتا ہے اس سلسلے میں میں ایک ادیبہ کے گھر گیا۔ دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ انھیں پھول پودوں کے ساتھ گہری دلچسپی ہے۔ میں فلم میں اُن کا چھوٹا سا باغیچہ دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے اُن سے کہا "آپ پودوں کو پانی دیجئے۔ میں آپ سے سوال کروں گا "پودوں کو پانی دیا جارہا ہے"۔ آپ جواب میں اپنی پودوں سے محبت کا ذکر کر دینا۔ اس طرح ہم آپ کا باغیچہ دکھا سکیں گے۔

چنانچہ میں نے سوال کیا " پودوں کو پانی دیا جارہا ہے" ادیبہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بالوں کو ایک خاص انداز میں سنوارا اور کہا "میں تو چاہتی ہوں آسمان کو بھی دھو دوں بہت گدلا ہو رہا ہے"۔ جواب سُن کر مائک میرے ہاتھ سے گر گیا مجھے کیا معلوم تھا کہ محترمہ دانشوری کے دور میں داخل ہو چکی ہیں۔

اچھے بھلے ادیب دانشور بننے کی کوشش کیوں کرتے ہیں اس کا جواب تو کوئی ماہر نفسیات یا کوئی دانشور ہی دے سکتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں ادب کے بڑے انعامات صرف اُنہی ادیبوں کو ملتے ہیں جو دانشوروں کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ اربابِ بست وکشاد جو اُن انعاموں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر انہیں ادیب کی بات سمجھ میں آجائے تو پھر انعام کس بات کا۔

میری بات کی تصدیق اس اَمر سے ہوتی ہے کہ آج تک طنز ومزاح کے کسی ادیب کو کسی بڑے انعام سے نوازا نہیں گیا فکر تونسوی کو بھی نہیں۔ کیونکہ فکر کے مضامین کو سمجھنے کے لیے کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کی مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اِن کو تو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا سمجھ لیتا ہے۔

فکر تونسوی دانشور نہیں بن سکا۔ اور نہ ہی مجھے اس کی کوئی ایسی اُمید نظر آتی ہے اُس نے نہ صرف عوام کے لیے لکھا ہے۔ بلکہ ہمیشہ انہی کے مسائل کے بارے میں لکھا ہے۔ عوام سے مُراد اس کی وہ شخص ہے جو زندگی بھر دال کے ساتھ روٹی کھاتا ہے۔ ایسے ہی ایک عوام جب قریب المرگ ہوا تو فکر نے اس

پوچھا کہ "تمہاری آخری خواہش کیا ہے" عوام نے جواب دیا "میں آخری بار دال کے ساتھ روٹی کھانا چاہتا ہوں"

فکر عوام کے دکھ درد اور ان کی خوشیوں سے پوری طرح واقف ہے۔ کیونکہ وہ خود انہی کا حصہ ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اسے بھیڑ کا آدمی کہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اس کے لیے اس سے بہتر خطاب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ویسے تو جس طرح کی زندگی اس نے جی ہے۔ اس میں عوام کے مسائل کو سمجھنے میں کچھ مشکل نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن فکر نے ہم دوستوں کے ساتھ کئی پوری راتیں دلی کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس لیے گزار دیں تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ عوام کی رات کیسے بسر ہوتی ہے۔

فکر کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہوا جب اُسے عوام سے الگ ہونے کا ایک موقع ملا۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ دلی کے گل مہر پارک میں اس کی ایک کوٹھی بن گئی۔ لیکن اگر آپ کو کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو آپ کو محسوس ہوگا کہ کوٹھی میں رہنے سے فکر کی شان نہیں بڑھی۔ البتہ کوٹھی کی اکڑ۔فوں کم ہوگئی ہے۔

فکر آج ستر برس کا ہوگیا ہے۔ جس طرح وہ بڑی بڑی بیماریوں کو پچھاڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے مجھے یقین ہے کہ ابھی اُسے بہت دور تک جانا ہے، ہماری دُعا ہے کہ وہ طنز و مزاح کے تخت پر اسی شان سے بیٹھا رہے۔ رہ گئی ہماری بات کہ ہم کو یہ تخت کب نصیب ہوگا تو اس کی فکر کرنے کی اُسے ضرورت نہیں ہے۔ ہم انتظار کریں گے آخر ملکہ الزبتھ کا بیٹا فلپس بھی تو انتظار کرتے کرتے بوڑھا ہوگیا ہے۔

△▲

نامور مزاح نگار شفیقہ فرحت
کے ۱۳ انشائیوں کا
دوسرا مجموعہ

رانگ نمبر

قیمت : ۱۶ روپے ★ صفحات : ۹۶

ملنے کا پتہ : مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار دہلی ۶
مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

صفیر احمد سحر سندیلوی

پکڑے گئے

ناپ اور تول کے محکمہ کے ایک انسپکٹر صاحب کے ذہنِ رسا کی داد دیجئے کہ کل اُنھوں نے بڑے بڑے شاعروں کے گھروں پر چھاپا مار کر بہت سے شاعروں کو مع ان کے تصنیف شدہ دواوین کے کم تولنے کے الزام میں چالان کر کے عوام کو حیرت زدہ کر دیا۔ محفلِ شعراء میں صفِ ماتم بچھ گئی اور گھبرائے ہوئے اس آسمانی قہر سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے سب سے پہلے اُنھوں نے رشوت کا سہارا لیا کہا جاتا ہے کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کی رشوت ہوتی ہے اول تو بے چارے شاعروں کے پاس رشوت کے نام پر دینے کے لیے تھا ہی کیا پھر بھی اُنھوں نے کچھ نہ کچھ سودی اُدھار اور گھر کا سامان فروخت کر کے جمع کیا تھا گو کہ شاعر ازل ہی سے بے سر و سامان ہوتا ہے۔ وہ انسپکٹر صاحب نے قبول نہ کیا اور شعراء کی اس پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ وہ رشوت خور نہیں ہیں حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان سے وہ ایک موٹی رقم چاہتے تھے بہت دنوں کے بعد ایسی نرم گردن کے مرغے ہاتھ لگے تھے جن پر وہ اب ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ابھی شاعروں کے کم تولنے کی بات حکومت کے دماغ میں بھی نہ آئی تھی اور عوام بھی اس مسئلہ سے پوری طرح ناواقف تھے۔ ایسی صورت میں اگر شاعر ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے تو انھیں اس الزام سے بری کرنے کے لیے ان کے پاس کافی جواز تھا۔ وہ آسانی سے انھیں چھوڑ بھی سکتے تھے میرے دوست حضرت ظہیر مینائی پر بھی یہ آفت ناگہانی نازل ہو گئی تھی وہ سیدھے سادھے آدمی تھے تین پانچ ان کو آتے نہیں تھے وہ بے حد پریشان تھے رات ہی میں ساڑھے نو بجے وہ میرے یہاں آ دھمکے کیونکہ وہ جانتے تھے میرے انسپکٹر ناپ اور تول سے اچھے تعلقات ہیں ایک دن وہ ان کے یہاں میرے ساتھ جا بھی چکے تھے۔

میں نے ان کی حالت زار اور پریشانی کے آثار دیکھ کر ان کی خیریت پوچھی۔

"خیریت کیا خاک ہے آپ کے انسپکٹر صاحب نے مجھے بھی کم تولنے کے الزام میں دھر لیا" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

"آپ سے اور کم تولنے سے کیا تعلق کیا آپ نے کوئی نئی تجارت شروع کر دی؟" میں نے ہنستے پوچھا

" بھائی کیا بتاؤں کل انھوں نے شہر کے تمام شاعروں کے گھروں پر چھاپا مارا اور ان کے دیوانوں اور مجموعۂ کلام کو مہر بند کر دیا اور سب شاعروں کا کام تولنے کے الزام میں چالان کر دیا میرے بھی چند اشعار انھوں نے پکڑ لیے جن کے دوسرے مصرعے پہلے سے کم وزن کے تھے گو کہ میں نے بہت منت سماجت کی ہاتھ پیر جوڑے کہ انسپکٹر صاحب میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا سہو یا لاعلمی سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے جو قابل معافی ہے۔ لیکن وہ کسی صورت سے نہ مانے۔ انھوں نے اپنی مختصر روداد سنائی۔

" یار غضب کر دیا انھوں نے" میں نے تعجب کا اظہار کیا

" آپ تو جانتے ہی ہیں میری معاشی حیثیت کیا ہے میں مقدر لیے ہوئے سے رہا۔ میرے ذریعہ معاش کا سہارا تو لے دے کر صرف شاعری ہے ہیں انھیں سے جو آمدنی ہوتی ہے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں اب بتائیے میں مشاعروں میں شرکت کروں گا یا کچہری میں حاضری دوں وکیل اور ان کے محرر کے گھر کا طواف کرنے کی نہ مجھ میں ہمت نہ پیر میں طاقت ہے" انھوں نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

" بھائی میں آپ کی روداد سن کر خود ہی کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر ان کے دماغ میں یہ بات آئی کیسے کہ شاعروں کے پاس بھی شعر تولنے کے باٹ یا کچھ پیمانے ہوتے ہیں اور یہ کہ شعراء بھی ناپ وتول کا کام کرتے ہیں میں سمجھتا ہوں اردو شاعری کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ آگ کسی دشمن نے لگائی ہے"

" اب یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ آگ کسی دشمن نے لگائی ہے یا خود اُن کے ذہن و دماغ کی اختراع ہے۔ بہر حال کوئی معشوق اس پردۂ زنگاری میں ضرور پوشیدہ ہے" انھوں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

" اچھا خیر کل صبح آپ آجائیے گا میں ان سے کہوں گا کہ آپ نے بیچارے شاعروں کی گردن کیوں ناپ دی؟" میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

" بھائی اس بار آپ مجھے بچا لیجئے۔ میں دُنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاؤں گا اگر مجھے اس معاملے میں سزا ہوگئی۔ آئندہ کے لیے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں شاعری ہی چھوڑ دوں گا ایسی شاعری سے کیا فائدہ جس میں عزت بھی محفوظ نہ رہے؟" انھوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے مجھ سے اس طرح کہا جیسے میں انسپکٹر ہوں۔

دوسرے دن صبح میں ظہیر مینائی کو لے کر انسپکٹر تیواری کے در دولت پر حاضر ہوا وہ ابھی ضروریات سے فارغ ہوکر نکلتے ہی والے تھے کہ ہم لوگوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔

" آئیے! آئیے میں کئی روز سے آپ سے ملنا چاہتا تھا ادھر آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہاں کئی بار آپکا خیال آیا لیکن سرکاری مصروفیت کی وجہ سے آپ سے نہ مل سکا" تیواری صاحب نے ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہیں۔

" اس وقت میں بھی آپ کے پاس سرکاری کام ہی سے آیا ہوں سُنا ہے اِدھر آپ نے شعراء کے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آخر ان لوگوں سے آپ کو کیا شکایت ہے؟" میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے بطور تمہید کے کہا۔

" بھائی صاحب خدا آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ شاعر تو خود کیا اپدیشک ہوتا ہے مصلح قوم ہوتا تھا

کی برائیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اچھا انسان ایک اچھا شہری ہوتا ہے جب یہ شاعر ہی کم تولنے اور پیمائش میں کتر بیونت جیسی ذلیل حرکتیں کرنے لگے تو یہ کتنے شرم کی بات ہے جب ہر قوم ہی گمراہ ہو جائے تو ملک و قوم کی کیا حالت ہوگی آپ خود ہی سوچئے یہ کس قدر بری بات ہے" تیواری صاحب نے رک رک کر کہا۔

"یہ تو صحیح ہے لیکن آپ کا اتنے بڑے پیمانے پر ایک مشتبہ قدم اٹھانا مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا ہے" مینائی نے ایک قانونی کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

"جی! سنئے تو سہی میں ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعہ بار بار اس بات کی تاکید کرتا رہا کہ جن لوگوں کے پاس پرانے باٹ ہیں ان پر نئی مہریں لگوالیں یا نئے کام کرنے والے محکمہ سے سند یافتہ دوکان داروں سے نئے کانٹے باٹ خرید لیں اور رسید کو حفاظت سے رکھیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ بلکہ میں نے تو ایک ہفتہ پہلے گشتی مشتہری کے ذریعہ بھی مزید تاکید کر دی تھی کہ اس اعلان کے ایک ہفتہ کے بعد پکڑے گئے ملزمان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی لیکن اس کے باوجود بھی ان لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور میرے اس اعلان کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا اور یہ لوگ اپنے اپنے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اب بتائیے ایسی حالت میں میری کیا غلطی ہے" انسپکٹر صاحب نے پُر زور لہجہ میں کہا" بظاہر آپ کی کوئی غلطی معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود میں سفارش کروں گا کہ آپ قانونی نکات کی طرف نہ دیکھ کر ان معصوموں کی طرف دیکھئے یہ فرشتہ صفت انسان قانون اور تجارت کے اصولوں سے بالکل ناواقف ہیں کم از کم ایک بار انھیں معاف کریں" میں نے ظہیر مینائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں! جی ہاں" مینائی صاحب نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

"بھائی جب تک اس معاملے میں کوئی سخت قدم نہ اٹھایا جائے لوگ کم تولنے سے باز نہیں آسکتے اور اس کے لیے میں اب پوری طرح تیار ہوں اب مزید طرح دینا میری سمجھ میں نہیں آتا" انسپکٹر صاحب قدرے غصہ سے بولے" نہیں انسپکٹر صاحب ایک بار آپ میرا کہنا مان جائیے۔ مجھے یقین ہے کم از کم یہ شاعر حضرات جو سنجیدہ اور دور اندیش بھی ہوتے ہیں آئندہ ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوں گے" میں نے انسپکٹر صاحب کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

"جناب آپ ان کم تولنے والوں کی نفسیات سے واقف نہیں ہیں مجھے بیس سال کا تجربہ ہے میں اپنے تجربہ کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آسکتے۔ ان کے ساتھ میں چاہے جتنی رعایت برتی جائے کچھ فرق نہیں پڑتا" انسپکٹر صاحب نے انکاریہ لہجہ میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب دیکھئے یہ ادب پرست لوگ بھی خیالی دنیا میں رہتے ہیں عملی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ان کے پاس تو زبانی جمع خرچ کی باتیں ہیں ان کے کم تولنے سے کیا فرق پڑتا ہے" میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں آپ کو بتاؤں ایک ہندوستانی کہاوت ہے کہ درزی اگر کم نہ ناپے تو وہ درزی نہیں سنار اگر سونے چاندی کی چوری نہ کرے تو وہ سنار کہلانے کا مستحق نہیں اسی طرح بنیا اگر کم نہ تولے تو اس کی برادری والے برادری سے باہر نکال کر دانہ پانی بھی بند کر دیں ہندوستان میں یہ کم تولنے اور کم ناپنے کی بیماری ایک وبائی شکل اختیار کر چکی ہے ساری تجارت کا دارو مدار ناپنے اور تولنے پر ہے اگر اس کے تدارک کی کوشش نہ کی گئی تو دنیا الٹ پلٹ ہو جائے گی حکومت بھی اس کے مضر اثرات سے بہت پریشان ہے اور اس کے انسداد کے لیے اس نے ایک باقاعدہ محکمہ بھی کھول رکھا ہے۔ اس محکمہ کا کام یہ ہے کہ کانٹے باٹ اور آلات پیمائش کے سادے سامان حکومت کے لائسنس یافتہ دوکان داروں ہی کے ذریعہ فروخت کروائیں اور ہر دوسرے تیسرے سال ان فروخت شدہ آلات کی دوبارہ جانچ کر کے مہر لگائیں مہر لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ترازو خراب تو نہیں ہے باٹ کاٹ چھانٹ کر کے یا گھس کر کم تو نہیں کر دیئے گئے لیٹر اور میٹر خریداری کے بعد کم تو نہیں کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت کی اس چابکدستی اور انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک بازار میں لوگ کم تولتے اور کم ناپتے ہیں اس صورتِ حال میں قطعی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ہم اگر اسی طرح درگزر سے کام لیتے رہیں گے تو ملک ترقی کیا خاک کرے گا۔" انسپکٹر صاحب نے اپنے محکمہ کی کارگزاری پر مختصر سی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیکن انسپکٹر صاحب! شاعر کوئی بنیا درزی یا سنار تو نہیں ہوتا" میں نے تھوڑی سی جرح کی

"یہ صحیح ہے لیکن کام کی نوعیت کے لحاظ سے یہ سب برابر ہیں سنار زیورات گڑھتا ہے شاعر شعر گڑھتا ہے درزی کپڑا کاٹتا ہے شاعر زبان کاٹتا ہے بنیا کم تولتا ہے شاعر شعر گھاٹ تولتا ہے۔ بہرحال مجھے اس کا مزید افسوس ہے کہ بنیا تو کم تولنے کے لیے ابتدائے آفرنیش سے دنیا بھر میں مشہور ہے لیکن اس دور کے شاعروں خصوصیت سے جدید شاعروں کو ڈنڈی مارنے کی لت کہاں سے لگ گئی اور اس کا ذخیرہ میں اب انھیں وہ لطف آنے لگا ہے کہ اگر کسی خاص وجہ سے انھیں ڈنڈی مارنے کا موقع نہ ملے تو وہ پاسنگ تو قطعی کسی نہ کسی طریقہ سے مار ہی دیتے ہیں اور یہ کام اتنی بے باکی سے کرتے ہیں کہ اچھے سے اچھے سامعین اور بڑے سے بڑے نقادانِ فن ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں ان شاعروں کی شاطرانہ فنکاری کا کمال یہ ہے کہ آج تک وہ محکمہ کی دست برد سے محفوظ ہے۔ لیکن اس کی وجہ تو یہ ہے کہ اب تک محکمہ نے اس طرف اپنی توجہ ہی مبذول نہ کی تھی اور کچھ شعرا بھی محکمہ کی نظروں کو دھوکا دے کر بچتے رہے لیکن اب بچ کر کہاں جائیں گے" انسپکٹر صاحب نے پُرجوش لب و لہجہ میں کہا۔

"معاف کیجیے گا انسپکٹر صاحب آپ نے تو شاعروں کو اور بنیوں سناروں اور درزیوں کو ایک قطار میں لا کر کھڑا کر دیا۔ شعر کوئی ہلدی مرچا اور دھنیا تو ہوتے نہیں جو گرام ڈیسی گرام اور کلوگرام کے حساب سے تولے جاسکیں اور نہ اشعار کوئی تھیلیاں کی آنت ہوتے ہیں جو سنٹی میٹر ڈیسی میٹر اور میٹر کے پیمانوں سے ناپے جاسکیں۔ ہاں شعروں کو

کچھ لفظی اوزان پر مزدور وزن کیا جاسکتا ہے۔ یہ لفظی اوزان خلیل احمد نے بنائے تھے واضح ہو ان کا خلیل خاں سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو فاختہ اُڑایا کرتے تھے اس سے پہلے کچھ پچھلے شاعروں نے مزدور بے راہ روی اختیار کر رکھی تھی وہ اپنے شعروں کو بانس کی تیلیوں سے اپنے اپنے معیار کے مطابق ناپتے تھے سید انشاء نے بھی غیر معیاری کچھ باٹ بنائے لیکن چونکہ وہ سائنٹیفک نہ تھے اس لیے رائج نہ ہوسکے اس سے پہلے ممکن ہے اشعار ترازو پر تلے جاتے ہوں اور بقول بزرگان جس طرح اُن کے بچپن میں آم ٹوکریوں اور ڈھیری کے حساب سے پھر جوانی میں گن کر سیکڑوں میں اور بڑھاپے میں وزن میں بکنے لگے اسی طرح شعروں کی بھی کوئی صورت رہی ہو لیکن میرے ہوش سنبھالنے کے بعد سے وہی خلیل احمد کے ایجاد کردہ اوزان پر ہی اشعار وزن کیے جاتے رہے ہیں" مینائی صاحب نے بھی زبان کھولی جو ابتک خاموش تھے۔

"یہ تو اور بھی بڑا جرم ہے کہ آپ کمپیوٹر کے زمانے میں بابا آدم کے زمانے کے اوزان استعمال کرتے ہیں ہاں اگر کمپیوٹر کے ذریعہ شعر کا وزن نہ کرکے کم سے کم ان قدیم اوزان کو موجودہ عہد کے اعشاریہ نظام کے مطابق ہی "نئے اوزان بنا کر شعروں کو تولتے تو بھی کسی حد تک مان بھی سکتا تھا۔ اب تو آپ پر ایک جرم اور بھی بنتا ہے۔" انسپکٹر صاحب مینائی صاحب پر برس پڑے۔

"ٹھہر جائیے انسپکٹر صاحب اپنا لہجہ درست کرلیں جب آپ کے محکمہ کے سند یافتہ شعر ولا کرنے والے کمپیوٹر فروخت نہیں کرتے اور نہ اعشاریہ نظام کے تحت جدید باٹ اور نہ بابا آدم کے زمانے کے لفظی اوزان تو آپ ہم لوگوں پر مقدمہ کیسے قائم کرسکتے ہیں؟ مینائی صاحب دُور کی کوڑی لائے شاعر کبھی کبھی وکیل بھی بن جایا کرتا ہے یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی۔

"ارے مینائی صاحب آپ بُرا مان گئے"۔ میں تو دوسرے شاعروں کی بات کر رہا تھا آپ کو میں بالکل ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسا بھائی صاحب کو۔ انسپکٹر صاحب ایک دم ٹھنڈے پڑ گئے۔

"دیکھیے مینائی صاحب یہ بات آپ نے یہاں تو کہہ دی ہے لیکن باہر نہ کہیے گا ورنہ ہمارے سارے مقدمے ہار جائیں گے اس میں میری اور محکمہ کی بھی بدنامی ہوگی" انسپکٹر صاحب نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

"کچھ ہو انسپکٹر صاحب میں یہ قانونی نکتہ ہر ایک کو بتاؤں گا کیونکہ یہ میری اور تمام شاعروں کی عزت کا سوال ہے"۔

"بھائی صاحب مینائی صاحب کو کسی طرح راضی کیجیے ورنہ تو سارا کھیل ہی بگڑ جائے گا" انسپکٹر صاحب بے چارگی سے بولے۔

"اب آپ سے عدالت میں بات ہوگی" مینائی صاحب اُٹھ کھڑے ہوگئے۔

"چلئے بھائی صاحب مینائی صاحب نے مجھے اُٹھاتے ہوئے کہا میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا انسپکٹر صاحب ہم دونوں کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ ••

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

غزل

بیوی جب تک کہ گھر نہیں آتی — کوئی اُمید بر نہیں آتی
سوچتا ہوں کہ بعض ہو لوں کو — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جالو اولاد کے سدھرنے کی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
پہلے لڑنے پڑوسن آتی تھی — اب کسی بات پر نہیں آتی
پینے والوں کے ساتھ رہتا ہوں — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
کچھ خطا اور بھی تو کر لیجئے — عمر بارِ دگر نہیں آتی
خبریں ٹی وی سے سب کی آتی ہیں — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
ہم تو بکواس کے نہیں قائل — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

شعر لکھوا کے پڑھ رہے ہو ظریف
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نٹ کھٹ عظیم آبادی

غزل

بن گیا حلوا مگر کشمش بہت مہنگی پڑی — دوستو شبرات کی یہ ڈش بہت مہنگی پڑی
جب کیا اظہارِ الفت تو پڑی چپل کی مار — اس کی چاہت کی مجھے کوشش بہت مہنگی پڑی
بعد شادی لگ گئی بچوں کی اِک لمبی قطار — تیری قربت کی مجھے خواہش بہت مہنگی پڑی
آ گئے سسرال کے سب لوگ کھانے دعوتیں — ہر نئے بچے کی پیدائش بہت مہنگی پڑی
سر منڈاتے ہی پڑے اولے میرے سر پر میاں — ہر برس بچوں کی افزائش بہت مہنگی پڑی
دھر لیا اینٹی کرپشن نے رنگے ہاتھوں انھیں — لی بڑے بابو نے جو بخشش بہت مہنگی پڑی
جھاڑو برتن چولھا چوکا سب مرے ماتھے پڑے — اپنی بیگم کی مجھے رنجش بہت مہنگی پڑی
خرچ بڑھتا ہی گیا اور قرض لینا ہی پڑا — ان کا میک اپ ان کی آرائش بہت مہنگی پڑی
ہو گئی چندیا صفاچٹ بال سارے گر گئے — ناک [illegible] کی [illegible] بہت مہنگی پڑی

یہ گرانی لے چلی نٹ کھٹ کو مرگھٹ کے قریب
نت نئی بیگم کی فرمائش بہت مہنگی پڑی

انوار انصاریؔ
—— (مانجھی۔ بہار) ——

گنّے کا کھیتؔ

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے ارہر کے کھیت کی افادیت اور اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے یہ ارہر کا کھیت لندن کے ہائیڈ پارک سے کم نہیں۔ گاؤں والوں کے لیے یہی ارہر کا کھیت پارلیامنٹ بھی ہے جہاں جہاں عاشق و معشوق کا ملن، ساس بہو کے جھگڑے اور گھر گھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ رفع حاجت کیلئے بہترین اور موزوں جگہ بھی یہی ارہر کا کھیت ہے۔ ارہر کے کھیت کی طرف ہر نامراد جاتا ہے اور بامراد ہو کر واپس لوٹتا ہے۔ کھوئے ہوئے گدھے بھی اسی ارہر کے کھیت میں مل جاتے ہیں۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ یہیں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے؟ دارد غہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنائے۔ رکمنیا کو بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا غرض کہ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض فطری حوائج اور معاشرتی حوادث اسی ارہر کے کھیت میں پیش آتے ہیں۔

آج سے چالیس پچاس برس پہلے ارہر کے کھیت کی اہمیت ممکن ہے کچھ زیادہ ہی ہوگی مگر اب تو گنّے کے کھیت کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ اس کھیت کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ کیونکہ گنّے کے کھیت میں بھگائی ہوئی دوشیزائیں چھپائی جاتی ہیں۔ ان کی عصمت دری کی جاتی ہے اور آخر میں ان کو جان سے مار کر گنّے کے کھیت میں پھینک دیا جاتا ہے۔ چوری چماری، چھینا جھپٹی کے سامان گنّے کے کھیت میں حفاظت سے رکھے جاتے ہیں، کچے نامراد عاشق اپنے عشق کی ریہرسل اسی گنّے کے کھیت میں انجام دیتے ہیں۔ آتنک وادی فائرنگ کرنے کے بعد اپنی جائے پناہ اسی گنّے کے کھیت میں پاتے ہیں۔ بچھڑے ہوئے جانوروں اور عاشق و معشوق اپنے ہوس کی تکمیل یہیں کرتے ہیں۔ غرض کہ جملہ فرائض اور شہوانی جذبات اسی گنّے کے کھیت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

گنّے کی کاشت بڑھانے کے لیے آج کل بے پناہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اس پر ریسرچ کرائے جا رہے ہیں تاکہ فصل تگڑی ہو اور گنے سے چینی خوب تیار ہو۔ چینی بھی انسانی ضرورت کے لیے ایک اہم شئے ہے۔ ہر گھر میں چینی کا استعمال ناگزیر ہے۔ اسی لیے شہروں اور دیہاتوں میں چینی کنٹرول سے فروخت کی جاتی ہے تاکہ اس کا استعمال زیادہ نہ ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چینی کی ماترا بڑھ جانے سے لوگ چینی کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ جن حضرات کے جسم میں چینی بڑھ جاتی ہے وہ چینی سے پناہ مانگتے ہیں اور اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں بھی چینی سے دوستی ٹھیک نہیں۔ چینی سے رفاقت بڑھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی آتنک وادی یا فسادی سے دوستی بڑھانا۔ جس طرح آج کل انسان کے قول و فعل میں تضاد ہے اسی طرح چینی کے زیادہ استعمال میں بڑا خطرہ پوشیدہ ہے۔ لہٰذا چینی سے دُور رہیئے۔

گنے کے کھیت میں بہار کا آنا اور پودوں کا لہلہانا جس طرح بے کار ہے اسی طرح سردیوں کی چاندنی اور مفلس کی جوانی کا اجتماع بے کیف ہے۔ گنے کے کھیت میں ہوا چلنے سے جو سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں بھی دہشت سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔ آج ہر انسان دہشت میں مبتلا ہے اور اس سے سکونِ قلب غائب ہے۔

آج کل پینے کی ہر شئے پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ مثلاً شراب مضرِ صحت ہے۔ تمباکو نوشی عذابِ جان ہے۔ چائے بھوک کو کم کرتی ہے۔ پانی شہروں اور دیہاتوں میں اچھی طرح دستیاب نہیں۔ مگر گنے کا رس پینے سے کوئی کسی کو روکتا نہیں ہے۔ لہٰذا اب شراب پینا چھوڑ دیجئے تمباکو نوشی کو گولی ماریئے۔ چائے کو گھر سے الوداع کیجئے۔ پانی کو دُور ہٹائیے اور گنے کا رس ڈٹ کر استعمال کیجئے۔ اس سے آپ کو ذہنی اور جسمانی آسودگی نصیب ہو گی۔

ان دنوں مشاعروں کا چلن بڑھنے لگا ہے۔ قوال نما شاعروں کی مانگ روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ قوال نما شاعر گنے کے کھیت میں سکونِ قلب کے ساتھ لحنِ داؤدی کی مشق جاری رکھیں۔ گنے کا کھیت ان شاعروں کے لیے مشقِ سخن کے لیے محفوظ مسکن ثابت ہوگا۔ اس مشقِ سخن سے ان کے گلے میں مٹھاس پیدا ہوگی قوال نما شاعروں کی تجارت کو فروغ حاصل ہوگا۔

گنے کے کھیت چونکہ گاؤں سے جڑے ہوتے ہیں اس لیے دیکھ ریکھ اور کاشت میں گاؤں والوں کو آسانی ہوتی ہے بلکہ آج کل تو زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو گاؤں میں اجتماعی آگ زنی، لوٹ مار، قتل غارت گری کا عمل شروع ہو چکا ہے اس لیے گنے کے کھیت بھی اجتماعی آگ زنی سے محفوظ نہیں رہ سکتے ہیں۔

بہترے حضرات جو صرف شہروں ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ دیہات جا کر گنے کے کھیت کا معائنہ کریں تاکہ گنے کے کھیت کی افادیت سے وہ واقف ہو سکیں۔ گنے کے پودے تقریباً پانچ چھ فٹ کے ہوتے ہیں اور گھنے ہوتے ہیں۔ گنے کے کھیت میں اگر کوئی چھپ کر آنکھ مچولی کھیلنا چاہتے تو یہ ممکن نہیں ہاں گنے کے کھیت میں اگر کوئی روپوش ہونا چاہے تو اس کا پتہ لگانا آسان نہیں۔ گنے کے کھیت کی بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں پوری آسانی سے چھپا جاتی ہے۔ اپنی غلطی اور بداعمالیوں پر تھوڑی دیر کے لیے پردہ پڑ جاتا ہے۔

رفیع احمد (مالیگاؤں)

اخبار

دُنیا میں وہ ایک یادگار دن تھا جس روز پہلا اخبار عالمِ وجود میں آیا۔ آج ساری دنیا میں اخبار ہے یا یوں کہیئے اخبار میں ساری دنیا ہے۔ آج دنیا کے حالات جاننے کے لیے جامِ جمشید کی ضرورت نہیں، اس کے لیے اخبار کافی ہے۔ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں مندروں کے گھنٹوں اور موذن کی صداؤں سے آغازِ سحر ہوتا ہے تو بڑے شہروں میں اخبار کے ہاکروں کی آوازیں صبح کی آمد کا پتہ دیتی ہیں۔

اخبار میں دنیا بھر کی خبریں ہوتی ہیں۔ سیاسی واقعات، عوام کے مطالبات، چوری ڈاکے کی وارداتیں، جرائم کی حکایات، عدالتوں کے احکامات، سائنس کی ایجادات، اہم شخصیتوں کے حالات، فلموں کے اشتہارات، چھوٹوں کی باتیں، بڑوں کی راتیں، لیڈروں کی گھاتیں، ادباء و شعراء کی حماقتیں، صنفِ نازک کی نزاکتیں، بچّوں کی شرارتیں وغیرہ غرض اخبار میں کیا نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ نہیں ہوتا وہ بھی اخبار میں موجود ہوتا ہے۔

انسانوں کی طرح اخبارات کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ بعض سیاسی ہیں تو بعض مذہبی، کچھ ادبی ہیں تو کچھ فلمی۔ ان میں سیاسی اخباروں کی کھپت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا ہر شہری سیاست کا مریض ہے۔ ہمارے ملک کو "کسانوں کا دیس" کی بجائے لیڈروں کا دیس کہنا چاہیئے۔ سیاسی اخباروں کے نام کے ساتھ عموماً لکھا جاتا ہے "عوام کا بے باک ترجمان"۔ ایسے اخبار عوام کے کم اور کسی پارٹی کے ترجمان زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنے دہی کو کھٹا نہ کہنا اور دوسروں کے شربت کو لیموں کا رس ثابت کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ مذہبی اخبارات اللہ میاں کی گائے ہوتے ہیں۔ یہ رشد و ہدایات سے لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں اور گائے کی طرح کبھی کبھی سینگ بھی مار دیتے ہیں۔ ادبی اخبارات بڑے سنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کی جنگ بڑی مہذب ہوتی ہے۔ ان کی جنگ دیکھ کر ہی شاید غالب نے کہا تھا:

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

فلمی اخبار کے قارئین "نابینا" ہوتے ہیں کیونکہ اس کے پڑھنے والے زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں اور بزرگوں کا قول ہے کہ جوانی اندھی ہوتی ہے۔ فلمی اخبارات پڑھے کم اور دیکھے زیادہ جاتے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کے قارئین میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔ اب قارئین میں بچے اور بارلیش بزرگ بھی شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ بچوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ چاہے انھیں اپنا نام لکھنا نہ آتا ہو مگر تصاویر سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہوں گے اور بزرگوں کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

موسم برسات درختوں کے لیے نئے برگ و بار لاتا ہے اور الکشن ہمارے لیے نئے اخبار لاتا ہے۔ الکشن نئے اخبارات کی پیدائش کا زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں ہر سیاسی پارٹی اور ہر لیڈر کو ایک اخبار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اخبارات کے ذریعہ وہ اپنے سیاسی جراثیم کو عوام میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑا بینک بیلنس رکھنے والی پارٹیوں کے اخبارات الکشن کے بعد بھی جاری رہتے ہیں لیکن کمزور پونجی کے اخبارات کو الکشن کا سیلاب اپنے ساتھ ہی بہالے جاتا ہے اور قارئین یہ شعر پڑھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بھارت سرکار بے کاری کا مسئلہ حل نہ کر سکی۔ اخبارات نے اس کام میں حکومت کا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ اخبارات نے کتنے ہی لوگوں کو روزگار سے لگا رکھا ہے۔ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اس کے علاوہ نامہ نگاروں اور ہاکروں کی ایک فوج۔ غرض یہ سب اپنا پیٹ پالنے کے لیے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے محتاج نہیں۔ ردّی فروش اور کاغذ کی تھیلیاں بنانے والے بھی اخبارات کے احسان مند ہیں کتنے ہی چائے خانے انھیں کے بل بوتے پر جاری ہیں۔

اخبارات میں بعض جگہ چوکھٹوں میں ہدایات درج ہوتی ہیں جن پر عمل کرنا صرف قارئین کے لیے ضروری ہے ایڈیٹر کے لیے نہیں۔ مثلاً افواہیں مت پھیلائیے۔ افواہیں پھیلانے کا بڑا ذریعہ تو اخبارات ہی ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ایسا سنا جاتا ہے ترجمان کا بیان ہے کا سہارا لے کر افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ کبھی چوکھٹے میں درج ہوتا ہے "اخبارات خرید کر پڑھیئے"۔ آپ ہی بتائیے جس ملک میں ہر طرف غریبی اور بے کاری کا راج ہو جہاں مٹھی بھر اناج کے لیے لوگوں کو اپنے بچے فروخت کرنے پڑتے ہوں، وہاں کے لوگ اخبار خرید کر کیسے پڑھیں گے؟ اس ہدایت کا یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ اخبار مانگ کر نہ پڑھیئے۔ جس قوم کے لوگوں میں پی۔ ایل [illegible] کا گیہوں خون بن کر دوڑ رہا ہو، جہاں کی حکومت کا شمار دنیا کے بڑے "مانگنے والوں" میں ہوتا ہو، جہاں

"مانگنا" ایک پیشہ بن چکا ہو، وہاں کے لوگ اخبار کیوں خریدیں گے؟ یہاں الکشن میں لیڈر ووٹ مانگتے ہیں بینک لوٹ مانگتی ہے۔ آفسوں میں کلرک اور آفیسران رشوت مانگتے ہیں۔ کارخانوں میں مزدور بونس مانگتے ہیں۔ بازار میں تاجر زیادہ منافع مانگتے ہیں۔ غرض ساری قوم ہی مانگنے کے مرض میں مبتلا ہے تو ہم نے اگر اخبار مانگ کر پڑھ لیا تو کون سی قیامت آگئی؟

اخبارات میں صرف خبریں ہی نہیں ہوتیں بلکہ آج کل کی فلموں کی طرح ہر قسم کا مسالہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے فلمی صفحہ، مذہب پرست لوگوں کے لیے مذہبی صفحہ، عورتوں کے لیے خواتین کا صفحہ، کھلاڑیوں کے لیے اسپورٹس کے کالم، ادباء وشعراء کے لیے علمی وادبی صفحہ، تاجروں کے لیے بازار بھاؤ اور بے کاروں کے لیے وانٹیڈ کے اشتہارات وغیرہ وغیرہ غرض اخبار نہ ہوا پھیل لوری کی دکان ہوگئی۔

اخبارات کے قارئین بھی الگ الگ ٹائپ کے پائے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب خبروں کے لیے اخبار پڑھتے ہیں۔ کوئی خدا کا بندہ ردّی فروخت کرنے کے لیے اخبار پڑھتا ہے۔ بعض بزرگ وقت گزاری کے لیے اخبار چاٹتے ہیں۔ کچھ منچلے صرف فلمی اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار اٹھاتے ہیں۔ بعض بے چارے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ ظاہر کرنے کے لیے اخبار ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں۔ ہم نے بعض ایسے اخبار کے کیڑے بھی دیکھے ہیں کہ بغیر اخبار کا مطالعہ کیے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اخبار کے لیے انھیں چاہے پڑوسی کے گھر جانا پڑے، کسی ہوٹل میں چائے پینی پڑے، کسی ڈاکٹر کے دوا خانے میں داخل ہونا پڑے، وہ اخبار ہر حال میں پڑھیں گے چاہے ان کی چال میں فرق آجائے۔

آپ نے ضرب المثل سنی ہوگی" ایک پنتھ دو کاج"۔ اخبار کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایک پنتھ بیسیوں کاج۔ اخبار صرف پڑھنے کی چیز نہیں۔ اخبار دسترخوان کا کام بھی دیتے ہیں اور تولئے کا بھی۔ گرمیوں میں آپ ان سے پنکھے کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ ان سے تھیلیاں بنا کر آپ اپنی غریبی دور کر سکتے ہیں۔ بڑے لوگ اخبار سے منہ چھپاتے ہیں اور بچے کتابیں چھپاتے ہیں۔ بس یا ٹرین میں اپنی نشست کو محفوظ کرنا ہو تو اخبار ریزرویشن کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ اشیاء کی پیکنگ کے لیے بھی ان کا دامن ہمیشہ دراز رہتا ہے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ اخبار ردّی ہو کر اور کار آمد بن جاتا ہے۔ ▭▭

نامور مزاح نگار یوسف ناظم
کے مضامین کا مجموعہ!

البتہ

۱۰ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے۔

شبنم کاروراری

تضمین

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

بیاباں میں جو رہنا ہے تو پھر اپنا مکاں کیوں ہو؟
کریں ہم طنز جب اُس پر پھر وہ مہرباں کیوں ہو؟
جلے سینے میں دل تو منہ میں سگرٹ کا دھواں کیوں ہو؟
"کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فُغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو؟"

لگائیں کیوں کسی کو منہ اگر منہ موڑنا ٹھہرا
دعا کیوں ہو دوا بھی کیوں اگر دم توڑنا ٹھہرا
مریں چوکھٹ پہ کیوں اُس کی جو یہ در چھوڑنا ٹھہرا
"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟"

یہ عاشق موٹا تازہ تیری قربانی کو کیا کم ہے
اگر یہ مل گیا تو تیری بریانی کو کیا کم ہے
جو ایسی میزبانی ہو تو مہمانی کو کیا کم ہے
"یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

غزل

محبوب مانجوی

اک روز وہ کہنے لگے دِکھلا کے دھتورہ　　مرنا ہے اگر تجھ کو تو مر کھا کے دھتورہ
سقراط کبھی زہر کے پینے سے نہ مرتا　　اِسٹاک میں رکھتا جو نہ منگوا کے دھتورہ
سر پھوڑ کے مرنے کی اذیت تو نہ ہوتی　　سو جانا تھا فرہاد کہیں کھا کے دھتورہ
جنات تو کیا ہے کوچ فرشتے بھی کریںگے　　دُھونی جو ذرا دیجئے جلوا کے دھتورہ
محفوظ رکھے گا یہ بلاؤں کے اثر سے　　چوکھٹ پہ رکھا کیجئے لٹکا کے دھتورہ
محبوب یہی ہے مری تحقیق کا موضوع　　مجنوں تھا ہوا دشت میں کب کھا کے دھتورہ

ڈاکٹر سید محمد ظفر امام نظامپوری
نیو یارک۔ (یو۔ایس۔اے)

بڑے غلام زوجہ خاں

اگر عنوان پڑھتے ہی آپ کا تصور آپ کو ساز و آواز کی دنیا میں لے جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، کہیں نہ کہیں یہ بات بھی ان نغمات سے سرشار ہے جو بہت سے انسانوں کا مقدر ہوتے ہیں اور کبھی کبھی دردسری۔

مرد تپتی دھوپ میں پانی تلاش کرتا ہے، سخت زمین سے اناج اُگاتا ہے، کشتی اور جہازوں کے ذریعہ [illegible] کو تلاش کرتا ہے، قطب شمالی جہاں آنکھوں سے نکلا ہوا آنسو اور منہ سے نکلی ہوئی بھاپ جم جاتی ہے، اس پہ اپنے خیمے نصب کر کے اپنی فوقیت کی مہر لگاتا ہے، ہمالیہ کی بلندی کو سر کر کے اس پر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑتا ہے سمندروں کی گہرائیوں سے موتی نکالتا ہے، خلائی یہ دانوں سے سیاروں میں جا پہونچتا ہے، جنگیں لڑتا ہے، تیر و تفنگ سے لے کر بڑے بڑے ٹینکوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے، آتشیں اسلحہ اور بموں سے بھرے ٹرکوں کو مخالفین کے مرکز سے ٹکرا دیتا ہے، اندھیرے گھنے جنگلوں میں ہاتھی، شیر اور خوفناک درندوں کا شکار کرتا ہے مگر یہ سب تو کچھ بھی نہیں۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ زندگی گزار لیتا ہے۔!

بڑے غلام زوجہ خاں قد میں چھوٹے عمر میں بڑے ایک منحنی سے بہت ہی مہمان نواز اور عجز و انکسار کے پتلے، ہمیشہ مُسکراتے رہنے والے انسان کا نام ہے۔

ایک بار جب ہم "تلاشِ جنت" میں نکلے تو دہیں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان کے دوستوں اور عزیزوں سے جب اچھی طرح تعارف ہو چکا تو ان لوگوں نے بتایا کہ وہ بہت ہی خدمت گزار، وفادار اور ایماندار انسان ہیں مگر پھر بھی تلاشِ جنت میں سرگرداں ہیں اگرچہ ان کی اپنی واحد شریکِ حیات کی خدمت گزاری اور ناز برداری ہی حصولِ جنت کے لیے کافی تھی۔

جس سال ہندوستان کو آزادی ملی اسی سال بڑے غلام زوجہ خاں کی آزادی سلب ہوگئی اور غلامی کا طوق ان کے گلے پڑا۔ محکمۂ تعمیر میں نوکری ملی اور سارے ہندوستان کی گشت نوردی قسمت ٹھہری، تھوڑا بہت گلہ یا شکوہ انھیں ہے کہ ان کے والدین نے ایک بڑی زبردست مگر زندہ دل عورت کی خاوندی میں انھیں دے دیا اور آپ کی ساری اُمنگیں پھولنے پھلنے کے بجائے کمھلانے لگیں، غلامانہ ذہنیت آپ کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی، حالانکہ آپ جمہوریت اور آزادی کے علمبرداروں میں تھے اور نوکری کے ساتھ ساتھ آپ خانہ داری کے سارے تجربات حاصل کرنے لگے ویسے ہر قدم پر اپنے ضمیر کو بھی مطمئن کرتے جاتے، صبح کی نماز کے لیے تو اُٹھنا پڑتا ہی ہے اگر چائے بھی بنالی خود ہی پیالی سہی تو اس میں کیا قیامت آجائے گی، اور اپنی قمیص کے کالر پر آئرن کرتے ہوئے اگر بلاؤز پر بھی پریس کر دیا جائے تو کوئی گناہ تو نہ ہوگا۔ مگر ساڑی کی بات اور تھی اس پر استری کرتے وقت یہ اچھی طرح اطمینان کر لیتے کہ کسی اور استری کی نظر ان پر نہ پڑ جائے، وہ دوسروں کے سامنے ہمیشہ مسکراتے رہتے، کبھی کسی کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ دال میں کچھ کالا ہے، ہاں قریبی لوگ یہ ضرور جانتے تھے کہ آپ دال اچھی پکا لیتے ہیں۔

نوکری گھر اور شریکِ حیات کے ساتھ زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی کہ ان کی شریکِ حیات نے انھیں مژدہ سنایا کہ ان کی پُر مسرت زندگی میں کوئی اور بھی شریک ہو رہا ہے، آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر طب کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایسے زمانے میں شوہروں کا بھی جی متلانے لگتا ہے، مگر آپ اس دَور اور اس درد سے آشنا نہ ہو سکے، گرچہ گرم پانی ٹھنڈا کر دو ٹھنڈا پانی گرم کر دو اور ایسے تمام فرائض بخوبی انجام دیتے رہے اور قدرت کی گھڑی نے گھومتے گھومتے آپ کو بظاہر والد بنا دیا، ورنہ آپ "والدہ" کے سارے فرائض بخوبی انجام دے رہے تھے، دودھ بنانا، مالش کرنا، کاجل لگانا اور دودھ پلانا آپ کے لیے کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا، شریکِ حیات اکثر پارٹیوں، جلسوں اور دعوتوں میں جاتیں اور آپ تمام فرائض مادری پدری شفقت سے ادا کرتے، ابھی چونکہ صاحبزادے کم سن تھے اس لیے ماں باپ کی شناخت میں کوئی اُلجھن محسوس نہیں کرتے۔

آپ کی شریکِ حیات کی صفائی پسندی انتہا پسندی کو پہونچی ہوئی تھی اس لیے گھر ہمیشہ صاف ستھرا رہتا اور آپ اس محنت شاقہ کے عادی ہو چکے تھے کون سی چیز کہاں رکھی جائے، کون سی چیز کہاں ملے گی اور کس حال میں ملے گی اس سے واقفیت آپ کے سلیقہ شعاری کا ثبوت تھا۔

علم العمال و افعال اعضا یا ایسے ہی کسی اور علم سے آپ کو دلچسپی رہی ہو تو یہ بات آپ کے علم میں ضرور ہوگی کہ انسان اور حیوان کسی خاص حالت اور کسی خاص موقع کے لیے اضطراری طور پر متحرک ہو جاتے ہیں، جیسے ٹیلیفون کی گھنٹی کا کسی خاص وقت پر بجنا اور کسی کے متوقع ٹیلیفون کی اُمید میں گھنٹی بجتے ہی آپ فوراً متحرک ہو جاتے ہیں ویسا ہی حال غلام زوجہ کا کسی مہمان کی آمد پر ہوتا ہے آپ فوراً متحرک ہو جاتے اور چند منٹ میں آپ کھانے کی ہلکی پھلکی

چیزیں ٹرے میں سجا کر اور چائے بنا کر مہمان کے پاس آ بیٹھتے اور تب ان کی شریک حیات بہت ہی نفاست سے آپ کی خدمت میں چائے پیش کرتیں۔

آپ اپنے حلم، اور بردباری کے لیے بھی بہت مشہور ہیں اور مغربی تہذیب کے مطابق عورتوں کے پیچھے چلنے کے بھی عادی ہو گئے ہیں، اور اسی طرح ایک بار آپ ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوئے کافی خریداری ہو چکی تھی، تب دکاندار نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیگم صاحبہ یہ کپڑا اپنے ڈرائیور کے لیے خرید لیں بہت ہی اچھا کپڑا ہے۔" آپ خاموشی سے مسکرائے اور ایک "نظر مالش" نگاہ دکاندار پہ ڈالی اور بیگم صاحبہ کے پیچھے پیچھے دکان سے باہر چلے آئے۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ ہر حال میں مسکراتے رہنا چاہتے ہیں آج بھی محفل جمی ہوئی تھی، اِدھر اُدھر کی باتیں زور وشور سے ہو رہی تھیں مَردوں کی گفتگو کا موضوع عموماً سیاست ہوتا ہے یا عورت، اور عورت ہی مرکز گفتگو تھی۔ نئے شادی شُدہ، نئے شادی شدہ، پُرانے شادی شدہ، دوبارہ شادی شدہ، کئی کئی بار شادی شدہ لوگ اس کا ذکر کر کے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ جو غائب ہو کر بھی موجود ہوتا ہے جس کا ذکر محفل کی جان تھی اور جس کا تصوّر محفل کو گلزار کئے ہوئے تھا، ہنستے ہنستے ایک بہت ہی قریبی دوست نے بڑے غلام زوجہ خاں سے کہا۔ "آپ بھی تو کچھ کہیں نا؟"

ان کے دوسرے دوست گویا ہوئے "یہ کیا کہہ سکتے ہیں۔ عمر ساری کٹی آہ وزاری میں، بیکاری میں اور یہ کرتے رہے اُٹرن ساری میں۔ ڈر ہے ریٹائرڈ ہوتے ہی کہیں آپ لوگوں کو بھی یہ مرض نہ لگ جائے بے کاری میں۔" کسی نے کہا "جو کچھ ہم لوگ آپ کے بارے میں سنتے ہیں کیا یہ سب سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو آپ بہت عظیم ہیں اور اس نام کے مستحق بھی۔"

اس کے ساتھ ہی قہقہہ اپنی بلندی پر جا پہونچا اور پھر دھیرے دھیرے، دبی دبی ہنسی سنی جا سکتی تھی کہ اِس درمیان بڑے غلام زوجہ خاں گویا ہوئے "کون کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتا گردن جھکائی اور تصویر دیکھ لی تصویر نظر آئے یا نہ آئے مگر آپ خوب غور سے دیکھیں تو یقینی طور پر مَرد کے اندر ایک غلام زوجہ خاں، چھوٹا یا بڑا ضرور نظر آئے گا، خواہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں۔" اور ان کی اس بات کو سُن کر نئے شادی شدہ، پرانے شادی شدہ، دوبارہ شادی شدہ اور کئی کئی بار شادی شدہ تمام لوگ خاموش ہو گئے، جس کی مسکراہٹ جہاں تھی وہیں جم کر رہ گئی، منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ایک متعدد شادی شدہ نے کہا "بھائی حقیقت تو یہ ہے کہ چھوٹے قد کے بڑے غلام زوجہ خاں نے بات بہت بڑی کہہ دی۔" اور اچانک جیسے انھیں کچھ یاد آ گیا ہو۔ اپنی کُرسی سے تیزی سے اُٹھتے ہوئے بولے "دیر بہت ہو چکی ہے اور میں گھر چلا۔"

ان کے چہرے سے خوف اور پریشانی عیاں تھی۔

مستقل فیچر

م۔میم

.... اسی روش میں الجھ کر ....!

— "انڈین ایکسپریس" میں ۲۳ لاکھ روپے کا گھپلا۔!

* انفورسمنٹ بیورو کا عظیم کارنامہ! ؎

کوداترے گھر میں کوئی یوں دھم سے نہ ہوگا
وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا

-ء- -ء- -ء-

— "کوئی اور بڑا ہاتھ ——؟"

* سویڈش ریڈیو کوئی انکشاف کرے تو ہم ضرور کوئی کارروائی کریں گے۔

-ء- -ء- -ء-

— "نورالحسن گورنر مغربی بنگال کا نام نائب صدر جمہوریہ ہند کے لئے زیر غور تھا۔ کیوں خارج ہوگیا؟"

* "کیونکہ وہ دہریے ہیں!" ؎

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

-ء- -ء- -ء-

— "امیتابھ بچن پارلیمنٹ کی رکنیت سے مستعفی"

* ؎

بہلا نہ دل نہ تیرگی شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

-ء- -ء- -ء-

— "امیتابھ بچن کو بوفورس کمپنی کا صداقت نامہ ایمان داری۔"

* ؎ چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

-ء- -ء- -ء-

— "ہماری پارٹی سیاست اور عوامی زندگی سے بدعنوانیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ملک گیر پروگرام مرتب کررہی ہے۔"

(چندرا بابو نائیڈو، جنرل سکریٹری تلگو دیشم)

* ؎

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

-ء- -ء- -ء-

— ڈی۔پی۔سنگھ کا نیا نعرہ!

* دیش کا پیسہ دیش میں لاؤ
بے ایمان کو دور بھگاؤ!

-ء- -ء- -ء-

— بلا تبصرہ:

"کیا اخبار "انڈین ایکسپریس" کے دفاتر پر دھاوے آپ کی علم و اطلاع میں دکر کئے گئے تھے؟"

"میں اس وقت راجستھان میں تھا۔"

(راجیو گاندھی)

-ء- -ء- -ء-

قلمی معاونین تخلیقات پر اپنا پتہ لکھنا نہ بھولیں۔

* * *

• شفیقہ فرحت
(بھوپال)

غیر مستقل، مستقل کالم

چلتے چلاتے

چلتے چلاتے، سڑک پہ نہیں بلکہ چھت پہ کہ جیسے کسی پرسکون آسودہ حال زمانے میں، کسی مہذب زبان میں "چاندنی" کہا جاتا تھا۔ کہ ارباب ذوق یہاں سے ہر قسم کے چاند دیکھا کرتے تھے۔ مگر اب۔ "بے کسی ہائے نظارہ ۔۔"
تارے تو اکثر دن میں کسی نہ کسی بہانے نظر آتے رہتے ہیں۔ رہا چاند اور اس کی کبھی زرد، کبھی پھیکی چمکیلی روشنی، تو اس کی دید کی کسے فرصت ۔ کہ وہی وقت بازار سے لے کر چترہار اور باروار کا ہوا کرتا ہے۔ تو اب ہر جگہ "نظارہ درمیاں ہے"۔ جو کچھ دیکھنا ہوگا چشم بینا کے بجائے نگاہ غیر عرف ٹی۔ وی کے واسطے سے دیکھ لیں گے۔
تو خیر اسی چاندنی پہ بغیر چاند کے سہارے یعنی صبح صبح ہم چل رہے تھے اور ہماری رفتار پہ اِدھر اُدھر سے تاکا جھانکی کرنے والوں کو ٹہلنے کا شبہ ہو رہا تھا۔ ویسے یہ عرض کر دیں کہ اس غیر روحانی آؤٹ ڈیٹیڈ Orthodox حرکت یعنی چلنے کے لئے سڑک کے بجائے چاندنی کا انتخاب اس لئے کیا کہ سڑک نہ امراء کے ٹہلنے کے قابل رہی ہے۔ نہ شرفاء کے چلنے کے ۔ اور ہر شہر کی کارپوریشن ہر دور کے محبوب سے بھی گئی بیتی ہے۔ کہ محبوب اپنے اور بڑکھا بڑ سنگ آستاں کو تو بدل دیا کرتے تھے۔ بطور سند ملاحظہ فرمائیے شعر غالبؔ ؎

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
نشانِ سجدہ سے مرے سنگ آستاں اپنا

اور سڑکیں گھستے گھستے آپ مٹ چلی ہیں۔ مگر کسی کو ریپیر سے واسطہ نہیں۔ اور ریپیر (Repair) ہوتی بھی ہے تو "دھارا دایک" یعنی ایک ریپیر کے ساتھ ساتھ دوسری ریپیر کی گنجائش اور ضرورت باقی رکھی جاتی ہے۔ اور پھر سڑکوں پہ اُڑنے (چلنے والی نہیں ۔!) والی سواریاں، سرکاری گاڑیاں جنھیں ہر سال چار چھ ایکسیڈنٹ کرنے کی چھوٹ دی گئی ہے۔ اور دو پہیوں پہ سوار تین تین، چار چار، بلکہ پانچ پانچ لڑکے، جن کا لہو نہ صرف حضرت اقبالؔ کے شاہین کی طرح گرم ہے، بلکہ یووا کانگریس، N.S.U.I وغیرہ وغیرہ کی طرح ہر وقت Boiling Point پر رہتا ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے سڑک پر ٹہلنے کی جرأتِ رندانہ کون کر سکتا ہے۔
تو آئیے! پھینکیں چھت پہ کمند۔ اس چھت سے اُسی پلے گراؤنڈ پر نظر جا رہی ہے، کہ جہاں پہ چلتے چلتے اور دوڑتے دوڑتے ہم پچھلی بار رُک گئے تھے۔ تو واقعی یہ ہے "گذشتہ سے پیوستہ"! کہ دوڑ اس میدان میں اب بھی ہو رہی ہے۔ مگر اس بار کیسا دوڑ ہے۔ سبحان اللہ ـــ ماشاء اللہ ـــ اور انشاء اللہ۔
ہر دوڑاک (بروزن تیراک ۔!) میں وہ تازگی وہ تیزی تندی، وہ پھرتی پھرکی ہے جو فارن سے علاج کروا کے لوٹے مریضوں میں ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔

پہلی ریس تھی خالص لوکل۔ گریڈ تھری۔ گریڈ فور۔ صرف چار سو میٹر کی۔
اور آج کی دوڑ ——— ؟
چار کلو میٹر کی — وہ بھی سیاسی اور سرکاری گز فیتے سے ناپی جانے والی۔ اس ریس میں سیٹی بجانے اور جھنڈی دکھانے والا تھا غریب اسپورٹس آفیسر۔ آج جھنڈی پیسیتے پھلتے پھولتے جھنڈا بن گئی۔ جسے لئے کھڑے ہیں لکھیہ عنتری کا جھو دیہ — اور اس کی ڈور بذریعہ ریموٹ کنٹرول دلی میں اُنٹھے "دست غیب" میں ہے۔
یہ اور بات ہے کہ پانچ اور پانچ دس (دکھائی دینے والی) انگلیوں کے باوجود سب دوڑیں اُلجھی پڑی ہیں۔ اور کوئی ایک سے لے کر سو کی مثال میں یہ تک نہیں گا سکتا — " بالما اُلجھی لٹ سلجھا دے —! "
اور تیسری بات یہ کہ یہ چالیسویں سالگرہ کی دوڑ ہے۔ قومی ایکتا کی دوڑ ہے۔
اور قومی ایکتا ہو نہ ہو اتنی ایکتا اس دوڑ میں ضرور ہے کہ سب دوڑ رہے ہیں۔
پیسہ لے کے دوڑنے والے۔ اور پیسہ دے کے دوڑانے والے۔
دوڑتے، دوڑتے وہ سب تو نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ قومی ایکتا کی طرح ، تو ہم بھی چلیں ۔ مگر رُخ بدل کے۔ یعنی پیچھے کی طرف — گو چال ٹیڑھی نہیں ہوگی۔
بہ تقریب سالگرہ آزادی — چالیسویں ——!
کاش کہ کوئی سالگرہ اسپیشل ہوتی یا سالگرہ انسائیکلو پیڈیا جس کی مدد سے ہم "چالیسویں سالگرہ" کی خوش بختی خوش گواریت اور اہمیت سے واقف ہو سکتے۔ اور عقل اور علمیت کے خالی بلکہ Bankrupt خزانے میں کچھ اُدھار کے سکے ڈال سکتے —! چالیس — تو چالیسویں سے زیادہ قریب ہے —! کیا ہم آزادی کا "چالیسواں" منا رہے ہیں؟
— مگر وہ تو سنا ہے ابھی زندہ ہے —— " دروغ برگردنِ راوی —! "
چالیسویں کی اس تقریبِ سعید میں سارے دیش کی مٹی لائی جا رہی ہے، کہ دیش کو مٹی میں پہلے ہی ملایا جا چکا ہے۔
چلتے چلاتے گذر اُس جا پہ ہوا جہاں بہ فیضِ چالیسواں آزادی (بہ فیضِ فن و شاعری نہیں —!) تقریب تقسیم اعزازاتِ واقعی و غیر واقعی منعقد ہو رہی تھی۔ اور قومی ایکتا کی دوڑ کی طرح شاعری کی دوڑ میں چالیس سال اور چالیس قدم دوڑنے والے ہر شاعر کی خدمت میں ایک عدد شال اور ایک قلم پیش کیا جا رہا تھا۔ ایک شاعر صاحب نے دونوں چیزیں لینے سے انکار کر دیا اور اس ادھار کے بجائے نقد طلب کیا۔ یعنی قلم کو اَونے پونے بیچ دیا۔
ٹھیک ہی تو کیا — آپ پچھلے چالیس برسوں سے عمر کے ساتھ قلم کا بھی چالیسواں منا رہے ہیں اور گذشتہ سے پیوستہ یعنی پچھلے سرمایے کے سود پر چل رہے ہیں اور سننے والوں کو چلا رہے ہیں۔ سو قلم کا ان کیلئے مصرف کیا ؟
رہا شال — تو اجنتے جس سال کے سال ایسے ایسے کوٹ ، اوور کوٹ کوڑیوں کے دام مل جاتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔
تو نیا شال بھی اُن کے لئے نئے سال کی طرح پُرانا اور بیکار ہے —!

-٠- -٠- -٠-

بابو آر کے (اچل پور شہر)

کرکٹ اور ہم

کرکٹ کمنٹری سننا، کرکٹ دیکھنا اور اس پر بحث کرنا اس پوری دہائی میں ہم ہندوستانیوں کے رگ و ریشے میں رچ بس گیا ہے . . . . پہلے پہل ہمیں اس کھیل کی بے جا طوالت اور جان لیوا اکتاہٹ "انتظارِ جاناں اور شبِ ہجراں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے تھے۔ اسی لیے ایک زمانے تک ہم اس کھیل سے بے نیازی برتتے رہے لیکن جب آہستہ آہستہ یہ کھیل ہماری بھارتیہ سنسکرتی میں پڑاؤ ڈالتا گیا اور ہماری سبھیتا کا ایک انگ بن گیا تب . . . ایسی صورت میں اس کھیل سے نابلد رہنے کی تہمت اپنے سر لیے پھرنا ہمارے لیے ناممکن ٹھہرا۔ گویا ہمیں ماڈرن دَور کے جدید تقاضے کرکٹ کے بغیر آدھے ادھورے محسوس ہوئے۔ اور پھر . . . اس کھیل کی مقبولیت نے آپ ہی آپ ہمیں یہ باور کرا دیا کہ فی زمانہ اگر ہم کرکٹ پر گہرائی کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکے تو . . . ہم جیسا غیر مہذب اور دنیا بیزار آدمی دوسرا کوئی نہیں ہوگا۔ یوں بھی موجودہ دَور میں کسی اچھے بھلے آدمی کا معزز شہری سمجھا جانا بس اسی پہ منحصر رہ گیا ہے کہ وہ کرکٹ کو کتنا اور کہاں تک جانتا ہے؟

اس کھیل میں بے شمار خامیوں کے ساتھ ہی چند ایک خوبیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ جو خوبی ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ ہے اس کھیل کے اصول اور ضابطے۔ اسی لیے صدرِ پاکستان نے وہاں کی اپوزیشن پارٹیوں سے کہا کہ وہ سیاست کو کرکٹ کی طرح اصول و ضابطے سے مزین کریں اور ہاکی کی طرح اُسے ہاہاکار اور مارا ماری کی آماجگاہ نہ بننے دیں۔ اسی طرح اس کھیل کی جو نمایاں خوبی ہے وہ ہے اس کے ریکارڈس۔ حقیقتاً کرکٹ کے ریکارڈس کے آگے نزول کے ریکارڈ آف رائٹس بھی WRONG نظر لگتے ہیں اور M.H.7 جیسے ریکارڈس بھی بے سرے ہو جاتے ہیں۔ اکثر آسمانی صحیفوں میں تک تحریف و اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ توڑی مروڑی گئی۔ ملکوں کے آئین، آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے بدلے گئے۔ لیکن کرکٹ کے ریکارڈس میں ترمیم چند کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ویسے بھی یہ کرکٹ کے ریکارڈس کوئی سرکاری یا نیم سرکاری محکموں کے ریکارڈس

تو ہیں نہیں کہ جس میں اُلٹ پھیر یا کم و بیش کی گنجائش رہے۔ نیتا۔ اجینیا۔ کرکٹ اور گرگٹ یہ سب رنگ بدلنے کے معاملہ میں ایک دوسرے کے سنگی ساتھی رہے ہیں۔ . . . اور انھیں نیر نگیوں سے کرکٹ کی رنگا رنگی میں اضافہ ہوا ہے . . . . پہلے پہل سرد ممالک میں یہ کھیل SUN BATH دھوپ سینکنے کے لیے کھیلا گیا اور شاید ایسا اس لیے بھی ہوا کہ نقل کو عقل سے کبھی علاقہ ہوتا ہے نہ واسطہ۔ اس کھیل میں بیٹنگ اور بولنگ دو شعبے ہوتے ہیں۔ بیٹسمین چھا پہ مارٹیں کے قائل ہوتے ہیں۔ مارو اور بھاگو کی پالیسی پہ عمل کرتے ہوئے رن کبھی کبھار ہی بنا پاتے ہیں جبکہ زیادہ تر حالتوں میں گیند خود بلّے سے لگ کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہے اور خود رن بٹورلیتی ہے۔ سرکش ندیوں کے کنارے ہوں یا کرکٹ بیٹ کے کنارے دونوں ہی خطرناک ہوتے ہیں ایک بستیاں ڈبوتے ہیں تو دوسرے بیٹسمین کی لُٹیا۔ اس کھیل میں بولنگ کی دو مخصوص قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک فاسٹ اور دوسری اسپین۔ فاسٹ باؤلر اور اسپین باؤلر کی تعریف اگر کوئی ہم سے جاننا چاہے تو ہم اپنے مشاہدے کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ فاسٹ بولر یہ ذرا نفاست پسند ہوتا ہے۔ یعنی جہاں یہ پسینے ولعاب دہن وغیرہ سے گیند گندی کرتا ہے وہیں اِسے صاف رکھنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتا ہے جبکہ اسپین بولر یہ تو سرے سے ہی گیند کو میلی کرنے کی روٹی کھاتا ہے۔ دنیا کے سارے ہی فاسٹ اور اسپین بولر کو بولنگ کرتے ہوئے دیکھنے کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ خارش کی وباء تبدیلیٔ جگہ کے ساتھ دونوں قسم کے بولرس میں پائی جاتی ہے یعنی ایک کی ران میں تو دوسرے کی ہتھیلی میں۔ اسی لیے تو فاسٹ بولر اپنی ران کی کھجلی گیند سے رگڑ رگڑ کر مٹاتا ہے اور اسپین بولر گیند گھما پھرا کر اپنی ہتھیلیوں کی خارش کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اور شاید یہی جان لیوا عارضہ گیند بازوں کو زیادہ عرصہ تک کرکٹ میں ٹکنے نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے اپنی ساری کرکٹ لائف میں کھجا کھجا کر جی ہلکان کر لیتے ہیں اور پھر ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتے ہیں۔

بہت جلد SHAPELESS ہو جانے کی ریکارڈ خصوصیت ہندوستانی بیویوں کی طرح ہی کرکٹ کے بال میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہم لوگ بھلے ہی ٹینک اور میزائیل بنالیں لیکن عمدہ کوالٹی کی گیند بنا پانا آج بھی ہمارے لیے چیلنج سے کم نہیں۔ یوں تو ہر کھیل میں کھلاڑی کو مار لگتی ہے لیکن صرف کرکٹ کا کھیل ہی وہ کھیل ہے جس میں معمولی سی چوٹ بھی خطرناک صورت حال اختیار کر جاتی ہے۔ چونکہ یہ کھیل لارڈز وں اور دانشوروں کا رہا ہے اس لیے تھوڑے کو زیادہ اور [illegible] معمولی سمجھنا اس کھیل کی روایت میں شامل ہے۔ دوسرے کھیلوں میں کھلاڑی کو آئی بڑی سے بڑی چوٹ بھی نظر انداز کر دی جاتی ہے جبکہ کرکٹ کھلاڑی پہ اگر سنگترے کا چھلکا بھی اچھال دیا جائے تو وہ اس کی نازک جِلد کے لیے ایسڈ کا کام کرنے لگتا ہے اور ایسا ہونا اس لیے بھی واجبی ہے کہ واقعی سنگترے میں ایسڈ جو ہوتا ہے اس لیے کرکٹ کا کھلاڑی اگر حملہ ہو جائے تو اس میں بھلا اس بے چارے کا کیا قصور! جتنا نازک اور انگیزی ساتھی کرکٹ کے کھلاڑی کا ہوتا ہے اس سے کہیں نازک مزاج اس کھیل کی پچ بھی رکھتی ہے۔ میدان اس کی حفاظت کتنے ہی جتن سے کیوں نہ

کی نمائشے پھر بھی اس میں کھڈ نکل آتے ہیں یا درستگی کی طالب یہ ہمیشہ ہی رہتی ہے۔ اب یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سڑکوں اور قومی شاہراؤں کے کچے پن کے معاملے میں ہمارا محکمہ P.W.D خواہ مخواہ ہی بدنام ہوتا آیا ہے جبکہ اپنے دیش کی مٹی کا مزاج ہی بگڑا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کرکٹ پچوں کی اتنی ناز برداری کے باوجود ان کی اتنی مٹی پلید نہ ہوتی۔ اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کو حادثات کی یا محکمہ ریلوے کو تاخیر وقت کی جو ضد ہے بس ویسی ہی ضد ان پچوں کو بھیگ جانے کی ہوا کرتی ہے۔ یہ معمولی پانی سے بھی پچا پچ ہو جاتی ہیں اسی لیے انھیں پچ کہا جاتا ہے۔ ویسے تو شائقین ہر کھیل کے ہوا کرتے ہیں لیکن کرکٹ کے شائقین کی شان جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کھیل کے دسیاؤں کا سلسلہ گود سے شروع ہو کر گور تک جاتا ہے۔ کرکٹ دیکھتے وقت بچے جوان بوڑھے عورت مرد سب ہی آپے سے باہر ہوتے ہیں۔ بیٹسمین کے اچھے اسٹروک پر جہاں بچے تالیاں بجاتے اور جوان چیختے چلاتے ہیں وہیں بڑے بوڑھے اپنے پوپلے منہ سے چوکر کرتے تک بیٹ سے نکلے چوکے کی تعریف کرتے نہیں چوکتے۔ ہر میچ کی طرح اس کھیل میں بھی امپائر کی موجودگی ضروری ہوتی ہے دیگر کھیلوں کے امپائر WHISTLE کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی کبھی چیخ چلا کر بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں جب کہ کرکٹ کا امپائر PIN DROP SILENCE کا قائل ہوتا ہے۔ اور اردو غزل کے معشوق کی طرح اشاروں کنایوں میں امپائرنگ کا فرض انجام دیتا ہے۔ امپائروں کے ناز و انداز اور ان کا اِٹھلانا بل کھانا بھی دیدنی ہوتا ہے۔ امپائر کا چوکے کا اشارہ اور بھارت ناٹیم کا نظارہ یکساں ہوتا ہے۔ کرکٹ کے امپائر کی ساری جان اور توانائی بلکہ قوت گویائی بھی اس کی کلمے کی انگلی میں سمٹی رہتی ہے۔ نو بال کے وقت بھی یہی انگلی سگنل دیتی ہے اور چھکے کے وقت بھی۔ وکٹ گرانے کے لیے بھی یہی انگلی فضاء میں لہرائی جاتی ہے تو ثابت یہ ہوا کہ کرکٹ امپائر بننے کے لیے جسم میں دوسرے اعضاء بھلے ہی بہ ہوں لیکن ہاتھ کے پنجے میں کلمے کی انگلی بہت ضروری ہوا کرتی ہے۔ ایک اور خصوصیت کرکٹ امپائر کی یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ بیٹسمین اور گیند باز کی دی ہوئی ہر چیز کا بوجھ اپنے اوپر بلا تامل ڈال لیتا ہے اور وہ بھی اتنی خوبی کے ساتھ کہ کتنی ہی چیزیں دی جائیں تب بھی اس کے دونوں ہاتھ خالی ہی رہتے ہیں۔ امپائر کی کوٹ کی جیب کی وسعت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ گیند باز کا دیا ہوا لحیم شحیم سوئٹر ان کی جیب کے کسی گوشے میں ننھی سی دستی کی طرح سما جاتا ہے اور گیند باز کو اسے لوٹاتے وقت جیب کے اندر بہت دیر اور بہت دور تک تلاش و کھوج درکار ہوتی ہے۔

اس کھیل سے لوگوں کا شغف دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگا ہے۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی ماں باپ اپنے نونہالوں کو کرکٹ کھلاڑی دیکھنا پسند کرتے ہیں اسی لیے تو وہ اپنے بچوں کے ہاتھ میں قلم کتاب دیکھ کر جل بھن جاتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں گیند بلا دیکھ کر سو جان سے وارے جاتے ہیں . . . . اور ہم . . . . کرکٹ کی اس ہر دلعزیزی کے پس منظر میں یہ سوچ سوچ کر اپنا خون پانی کر رہے ہیں کہ اس کھیل کے ساتھ ساتھ کہیں ہماری بے اصولی زندگیوں میں اس کا DIB GIPLING کا رسیلی بھی رواج نہ پالے . . . !!

ڈاکٹر چاپل ناگپوری

تو یہ ہیں ہمارے چچا!

آپ بھلے ہی تسلیم نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے چچا ایک بہت بڑا چمچہ ہیں۔ چمچہ وہی کہلاتا ہے جو انہونی کو ہونی کردے یعنی جو بات کسی کے شان وگمان میں نہ ہو وہ کرکے دکھا دے ۔ تو ایسی کتنی ہی باتیں اور کتنے کام ہمارے چچا کرکے دکھا چکے ہیں۔ مگر بھائی اسے تو آپ مانیں گے ناکہ چمچہ بھی آخر بشر ہے اور بشر ہونے کے ناطے اسے شوہر بنا پڑتا ہے، باپ بنا پڑتا ہے اور "بہ سسر" بھی بننا پڑتا ہے کہ آخر بشری تقاضوں کی تکمیل بھی ہو ۔ تو ہمارے چچا، چمچہ ہونے کے علاوہ بشر بھی ہیں اور وہ بھی پورے ارتھ پورن بشر۔ ارتھ پورن بشر بنا کوئی کھیل تو ہے نہیں۔ کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کتنی جھک ماری کرنی پڑتی ہے۔ کیا کیا داؤں پھینکنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر پیٹ میں پڑتی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر پیٹ میں کچھ زیادہ ہی پڑ جائے تو پھر ہری ہری بھی سوجھتی ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو اس میں بندے کا کیا قصور؟ بنانے والے نے ایسا دل ہی کیوں تخلیق کیا جو ایک یا دو چار ارمانوں کی تکمیل پر قناعت ہی نہیں کرتا۔ ایک تو دل ناصور اور اس پہ شاعرانہ طبیعت کی گوٹ۔ تو پھر تمنا کا دوسرا قدم کہاں کہاں پڑے گا۔ اسی لیے تو چچا کو ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔ خوب تر کی تلاش میں وہ سرگرداں رہتے ہیں۔ اس سرگرانی نے انھیں ولایت کے درجے کو پہنچا دیا۔ ہمارے چچا ولایت سے مُراد یوروپی ممالک ہی لیتے ہیں خیر یونہی سہی، ہمارے چچا کی رسائی ہو از ہو (WHO IS WHO) تک ہی ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک فلم دیکھی تھی جس کا ہیرو ایک شطرنجی بردار تھا۔ وہ شطرنجی اسے کیا زمین کیا آسمان اور کیا خلاء ہر جگہ کی سیر کراتی تھی۔ ہمارے چچا یہی کام اپنی شاعری سے لیتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی کسی طلسمی شطرنجی سے کم نہیں۔ جس پر بیٹھ کر وہ جہاں جی چاہے ہو آتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، مشاعرہ، سمینار، یونی ورسٹی، کنونشن اجلاس، سمپوزیم، انجمن، اکیڈمی غرض کوئی گوشہ ہو، ان کی شطرنجی (معاف کیجئے شاعری) انھیں چاروں کھونٹ گھماتی ہے اب کہیں چاروں کھونٹ بولنے سے آپ انھیں کولہو کا بیل نہ سمجھ بیٹھیں جو آنکھوں پر پٹی باندھے

پھر گھانے کے چاروں طرف گھومتا ہے. یہ تو سچ ہے کہ ہمارے چچا کی آنکھوں پر بھی پٹی پڑی ہوئی
ہے مگران کا ولی ہونا یہاں بھی ثابت ہے کہ یہ پٹی کسی) اور کو ہرگز دکھائی نہیں دیتی. یہ تو اس جادوئی
ٹوپی جیسی ہے جسے پہن کر جادوگر غائب ہو جاتا ہے. ہمارے چچا بھی ایسے کسی جادوگر سے کم نہیں.
وائس چانسلر ہو یا شکشا منتری، چیرمین اکادیمی ہو یا چیف منسٹر آف دی اسٹیٹ، جسے چاہیں اسے
مدحت و تہنیت کی پٹی باندھیں اور اپنا پٹا تیار کرلیں اور پھر انھوں نے تو پٹا ہی نہیں پٹے بھی تیار کر لیے ہیں.
بھی ایک نہیں پورے چار.

چچا بڑے دوراندیش آدمی ہیں. چچا پھونک پھونک کر پیتے ہیں. انھیں خبر ہے کہ دنیا حاسدوں کا ٹولہ ہے.
پتہ کل کو ان کی ترقیات سے جل کر کوئی پلٹ کر بھی نہ دیکھے تو وقت آخر کم از کم ان کے اپنے چاروں پٹے
ساتھ رہیں — دنیا تو حاسدوں کا ٹولہ ہے. ارے بھائی ترقی آپ بھی کیجیے نا کس نے روکا ہے آپ کو؟ آپ
ں نہیں ارباب اختیار سے لوہا منواتے، آپ کیوں نہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے. آپ کیوں حکام اعلیٰ اور
مام بالا سے بدکتے ہیں.

ہاتھ پاؤں ہلائیے نہیں تو پھر ہمارے چچا کی "حرکات و سکنات" پر تنقید مت کیجیے وہ بے چارے دنیا داری
سے دنیا کما رہے ہیں. اب ان کی کمائی ہوئی دنیا اتنی بھی نہیں کہ قارون، فرعون، نمرود، سکندر یا فرنگی فرماں روا لوگوں
یاد آجائے. انھوں نے تو جتنا بویا اتنی ہی فصل کاٹی. زندگی بھر قلم اور کتاب سے واسطہ رہا. اچھا پڑھایا برا
پڑھایا خراب اس سے انھیں کیا لینا دینا. ہاں اگر اچھا نہ پایا" ہو تو پھر یقینا چچا آپ کے مجرم ہیں.

دراصل چچا کا ستارہ بہت بلند ہے. ان کی راس بہت "مکڑی" ہے. کوئی بھی مشکل ہو، کوئی
مسئلہ ہو، کوئی بات ہو جہاں انھوں نے ہاتھ ڈالا کہ بازی انھیں کے ہاتھ لگ گئی — اب اسی اکیڈیمی کو لیجیے. شہر
میں دھوم تھی. کیا ہم نہیں جانتے کہ لوگ کیسے کیسے ڈول ڈال رہے تھے. مگر اس سے کیا ہوتا ہے. پانی تو
کی بالٹی میں آگیا.

گویا چچا کے پاس پانی ہے — تو اب یہی پانی دیکھنا ہے — دیکھنا ہے چچا کتنے پانی میں ہیں؟ جب
سے ان کا منہ پوپلا ہوا ہے وہ یہی کہتے آرہے ہیں کہ ہمیں تو دنیا سے محبت نہیں رہی بہت دنیا کمالی. اب یہ دنیا
نئے خون کو ملنی چاہیے. مگر اتفاق سے دنیا پھر اسی کھوسٹ لہو کو مل گئی ہے اگر وہ پانی والے نہیں تو دنیا سے
دست بردار ہو کر دکھائیں. چھوڑ دیں کسی نئے خون کیلیے.

ارے جاؤ میاں — بڑے آئے چچا کو جاننے والے — اپنا چلو اٹھاؤ — چچا تو کب کے ڈوب چکے. اب
بس ایک بوالہوس، شہرت پسند اور زر پرست بوڑھا زندہ ہے.

— نہیں جی بوڑھا نہیں — وہ تو اب بھی یہی گنگناتے ہیں — ابھی تو میں جوان ہوں ابھی تو میں جوان ہوں!

▲ △

امجد علی فیض
(اسلام گڑھ)

آئی ایم سوری......!

یہ انگریزی لغت کے الفاظ ہیں مگر جب سے ہندوستان آزاد ہوا تب سے ان کو ہندوستانیوں نے انگریزوں سے چھین کر آزادی کے ساتھ ہی قیدی بنالیا۔ اور یہ الفاظ کئی بار دہرائے جاچکے ہیں' دہرائے جائیں گے لیکن کوئی اسے دہرائے یا نہ دہرائے ہم تو دہرائیں گے ضرور۔ کیونکہ ان الفاظ سے ہمیں مٹھاس کی خوشبو آتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں؟ ویسے سونگھنے کے معاملے میں ہم بڑے تیز ثابت ہوئے ہیں (کتوں سے بھی کہیں زیادہ)

"آئی ایم سوری" ——— ان الفاظ کی وجہ ہمیں بڑی کوفت بھی ہوئی کہ کس عقلمند نے ان الفاظ کو ایجاد کر کے اپنی دانائی کا ثبوت دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ عقلمند ہندوستانی نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمارے ہاں چراغ لے کر اور ہر ایک کا سر پھوڑ کر بھی دیکھیں تو کسی کے دماغ میں یہ صلاحیت نہیں ملے گی کہ ایک نئے لفظ کو ایجاد کرے۔ ہم عقل سے زیادہ نقل کے معاملات میں پیش پیش ہیں۔ جو چیز ہمیں اور ہمیں نصیب ہوئی وہ ہے بھوک۔ کوئی دولت کا بھوکا' تو کوئی روٹی کا۔ کوئی عشق کا' تو کوئی حسن کا۔ کوئی شراب کا تو کوئی شباب کا۔ کوئی علم کا تو کوئی روزی کا۔ غرض ہر طرف اسی کا چلن ہے اور ہر طرف بھوکے ہی بھوکے نظر آتے ہیں۔ فلسفی مفکر لیڈر و سائنسداں سب اس کام پر لگے ہیں کہ وہ بھوک کو ختم کرکے ہی دم لیں گے مگر وہ بے چارے خود بھوکے' کیا ختم کریں گے بھوک کو' یہ تو ایسی بات ہوگئی ننگے نے بھوکے سے دوستی کرلی۔

خیر! صاحب گفتگو ہو رہی تھی 'آئی ایم سوری' کی ——— ایک بار ہم اپنی اہلیہ کے ساتھ بازار سے گذر رہے تھے کہ اچانک محترمہ ایک دیہاتن سے ٹکرا گئیں اور جھٹ سے کہہ دیا۔ "آئی۔ ایم۔ سوری"۔

تو وہ عورت کہنے لگی "ہائے بی بی یہ بھی کوئی ساڑی ہے' نہ کوئی بارڈر ہے نہ کوئی پلو' کہیں تم نے اسے الٹا تو نہیں پہنا ہے"۔ وہ ہماری شریک حیات کا اسکرٹ الٹ پلٹ کر سڑک پر ہی حیرت سے دیکھنے لگی۔

ہماری اہلیہ ذرا سا شرما کر مسکرائیں اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں کہ "ایڈیٹ کو ذرا بھی پتہ نہیں کہ اسکرٹ کسے کہتے ہیں اور فیشن میں اسکرٹ کا کیا کردار ہے"۔

یوں تو "آئی ایم سوری" بڑا آسان سا فقرہ ہے لیکن سننے والے کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایک بار ہم صبح سویرے باتھ روم کی طرف جا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہم نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک میٹھی و سُریلی آواز سنائی دی۔ "ڈیرلنگ آج شام ہوتے ہی باغ میں ملنا ہم آج شاپنگ کریں گے اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھائیں گے"۔

یہ سنتے ہی ہمارے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ ہم نے سنبھل کر کہا۔ "ظالم یہ کسی عاشق کا گھر نہیں جو یاد رکھو اور

فائیو اسٹار ہوٹلوں میں گل چھرّے اُڑائے ، یہ تو ایک بیوی پرست شوہر کا گھر ہے ۔"

دوسری طرف سے کسی محترمہ نے نرم لہجہ میں کہا " آئی ایم سوری ۔ رانگ نمبر ! "

فون سے نپٹ کر ہم باتھ روم میں داخل ہوگئے اور جھٹ پٹ نہا کر باہر نکلے ، اور گھر کے کام سے فارغ ہونا ہی چاہ رہے تھے کہ گھنٹی بجی ۔ لیکن یہ فون کی نہیں بلکہ کال بل تھی ۔ ہم دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھے جیسے ہی دروازہ کھولا ، ہمارے سامنے ہماری پڑوسن شیلا کھڑی تھی ، کہنے لگیں " بھائی صاحب آج میرے بچّی کو زیادہ ٹمپریچر ہے ، وہ بے چارہ اُٹھ نہیں رہا ہے ۔ پلیز ! ذرا ڈاکٹر کو بلا دیجئے ۔"

ابھی ہم اپنی پڑوسن کے کام سے فارغ ہو کر برآمدے میں سستانے کے لئے لیٹے ہی تھے کہ غریب خانے پر ایک فقیر نے آواز لگائی کہ " سخی اللہ کے نام پر مجھے کچھ دو ، خدا تمہارا بھلا کرے گا ۔"

جیسے ہی یہ آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی ، ہم سوچنے لگے کہ کیا آج بھی سخاوت باقی ہے ...! ؟ ہم نے تو سنا تھا کہ سخاوت حاتم کے ساتھ ہی ختم ہوگئی ۔ اگر تھوڑی سی بچی بھی ہو تو فقیروں نے ہر ایک کو سخی کہہ کر ختم کر دیا ۔ چونکہ ہم کوئی حاتم نہیں تھے اس لئے مجبوراً فقیر سے کہا ۔ " آئی ایم سوری ، میری بیوی گھر پر نہیں ہے ، آپ پھر کبھی آئیے ! "

فقیر نے التجا کی ۔ " صاحب بڑی اُمیدوں کے ساتھ آیا ہوں کچھ تو دید یجئے گا ۔"

" نہیں بالکل نہیں جب تک میری بیوی اجازت نہیں دیتی میں کوئی کام نہیں کرتا ۔ اگر میں بغیر اجازت کوئی کام کروں تو پھر مجھے بھی آپ کی برادری میں شامل ہونا پڑے گا ۔"

اتنا سُنتے ہی فقیر نے جھٹ کہا ۔ " آئی ۔ ایم ۔ سوری ، میں غلط گھر پر آگیا ۔ صاحب پھر کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا ..... چلتا ہوں .... "

وہ کم بخت تو چلا گیا اور ہم بیٹھے اپنی نادانی پر آنسو بہاتے رہے ۔ اتنے میں اچانک ہماری بیوی گھر میں داخل ہوگئی تو ہم " آئی ایم سوری " کہتے ہوئے اٹھے اور دوپہر کا کھانا میز پر لگانے کے لئے چلے گئے ۔

اگر آپ کو ہمارے بیوی پرست ہونے پر برابر شک ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ " آئی ۔ ایم ۔ سوری ! "

زندہ دلان حیدرآباد کی تازہ پیشکش !
ممتاز انشائیہ نگار ڈاکٹر رشید موسوی کے مزاحیہ دلچسپ مضامین کا مجموعہ !!

کاغذی ہے پیرہن

* خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور *
* صفحات : (۱۴۰) ڈیمائی * قیمت : (۲۰) روپے

ویریندر پرشاد سکسینہ

آہ کرگس سہسوانی!

اُردو کے ایک ممتاز مزاح نگار شاعر کرگس سہسوانی کا کلام شگوفہ میں ۱۹۸۰ء تک پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ وہ شگوفہ کے سالانہ خریدار بھی تھے۔ پہلے تو ہر دوسرے مہینے دو چار چیزیں ضرور ارسال کیا کرتے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیوں ۱۹۸۱ء کے بعد سے چپ سادھ لی۔ نہ خط نہ کلام۔ "ہماری زبان" کے تازہ شمارہ میں شائع شدہ ذیل کا مضمون نظر سے گذرا تو سخت افسوس ہوا کہ کرگس صاحب چل بسے اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ پرانے کاغذات، تلاش کرنے پر ان کا غیر مطبوعہ کلام اور چند خطوط ملے۔ اس مضمون کے ساتھ مذکورہ کلام بھی زیر نظر شمارہ میں شریک کیا جا رہا ہے۔ کرگس صاحب نہایت پُرگو شاعر تھے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک انھوں نے مختلف پبلشروں کے دروازے کھٹکھٹائے دلی کا بھی چکر لگایا لیکن کہیں بات نہ بنی۔ ان کا سارا کلام یکجا شائع نہ ہو سکا جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ ——————— مدیر ———————

* * *

سہسوان عہد قدیم سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ اپنے دامن میں اعلیٰ پایہ کے مدبر، مفکر، ادباء اور شعراء سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کے لوگ مغل بادشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درباروں سے وابستہ رہے ہیں۔ ہمراطی اورنگ زیب نے ہندوؤں کے دھارمک استھان سرسوتہ کو جو سہسوان میں واقع ہے ایک جاگیر عطا کی تھی۔ مولوی انوار حسین تسلیم سہسوانی اور منشی نرائن پرشاد مہر جیسے اساتذۂ سخن کا وطن سہسوان تھا۔ کانگریس کی ابتدائی قومی تحریک کے رہنما مولانا عبد الودود درد بریلوی بھی سہسوانی تھے۔ جدید دور میں ڈاکٹر حنیف نقوی سہسوانی کا اُردو تحقیق میں ایک مرتبہ ہے۔ کرگس سہسوانی، شاداں بدایونی اور دلاور فگار کی طرح طنز و مزاح میں سارے ہندوستان میں مقبول تھے اور ہندی اور اُردو دنیا ان کے نغموں سے محفل قہقہہ زار بن جاتی تھی۔ تین سال سے ٹی۔ بی کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ان کو پیام اجل نے آ دبوچا اور ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ اُردو کے ایک ماہنامے "گل کدہ" سہسوان کے علاوہ کسی اخبار یا رسالے میں ان کی وفات کی خبر میری نظر سے نہیں گذری۔ کتنا حسرت ناک مقام ہے۔

کرگس سہسوانی سے میرے برادرانہ تعلقات پندرہ سال سے قائم تھے اور جب میرا تبادلہ کلکٹریٹ بدایوں سے تحصیل سہسوان کو ہوکر ۸ر نومبر ۱۹۸۲ء کو آیا تھا تو مجھ سے سہسوان کے اہل ذوق و ادب کے ساتھ ملنے آئے تھے اور یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اب سہسوان کے قدیم اور جدید شعراء اور ادیبوں پر تخلیقی کام ہونا چاہیئے۔ میں نے برادرم ڈاکٹر حنیف نقوی کے تحقیقی کام کی تعریف کی تھی جو سہسوان کے ماحولِ شعر و سخن پر ہے۔ دن ڈھلنے کے بعد کبھی کبھی میں ان کی گیہوں اور پٹرومکس کی دوکان پر جاکر اردو اور ہندی ادب کا چرچا ان سے کرتا تھا۔ اور کبھی بہت سے شعراء اور ادیب شام کو ان کی دوکان پر جمع ہوجاتے تھے۔ کرگس صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے انسان تھے اور پرانی تہذیب کے نمائندے تھے اور جدید ہندستان کی ترقی دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے تھے۔ جدید ہندوستان کی تعریف میں پچاس سے زیادہ قطعات لکھے تھے جو ان کے انتخابِ کلام میں شامل تھے جن کو وہ جلد شائع کرانا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ تمنا دل ہی دل میں رہ گئی اور اس حسرت کو لے کر دنیا سے چل بسے ان کے احباب کو اب اس انتخاب کو شائع کرانا چاہیئے۔

جناب ثناءالحسن کرگس سہسوانی کی پیدائش ۳ر مارچ ۱۹۲۶ء کو تھانہ 'ایکہ' ضلع مین پوری میں اتر پردیش میں ہوئی تھی۔ یہاں آپ کے والد منشی قمرالحسن محکمۂ پولیس میں ہیڈ کانسٹبل تھے اور جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آپ نے اپنا تمام خاندان پولیس کے محکمہ میں ملازم پایا تھا۔ عمر کے اٹھارہ سال اپنے والد مرحوم کے ساتھ مین پوری کے تھانوں میں گذارنا پڑے۔ آپ کی اردو تعلیم کا سلسلہ مین پوری ہی میں ختم ہوا، اور اردو میڈل کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں مین پوری سے ۱۹۴۰ء میں پاس کیا تھا۔ منشی دیبی پرشاد مائل مین پوری شاگردِ داغ آپ کے والد کے دوستوں میں تھے۔ اس لئے ان کی شاعری کا ذکر کرگس صاحب اکثر کیا کرتے تھے اور ان کی منظوم رامائن کے کچھ اشعار بھی سناتے تھے جو ان کو یاد رہ گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں جب آپ کے والد محترم پنشن لے کر سہسوان آئے تو آپ کو جنوری ۱۹۴۵ء میں اپنے وطن عزیز آنا پڑا۔ اس دور میں جناب اقبال احمد شوق سہسوانی اور جناب نذرالحسن صاحب راز سہسوانی جیسے اردو کے اساتذۂ سخن کا بول بالا تھا۔ اور یہاں کے ہر گلی کوچے میں ان ہی سے شعراء حضرات مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ کرگس صاحب ۱۹۴۹ء میں جناب شوق سہسوانی کے شاگرد ہوئے۔ شوق کی وفات کے بعد جناب واحد حسین صاحب واحد کو کلام دکھایا۔ اپریل ۱۹۷۸ء میں "شانِ ہند" دہلی میں جناب کرگس سہسوانی نے اپنی شانِ نزول ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

کرگس سہسوانی کے دو خط

مدیر شگوفہ کے نام

محترم سلام مسنون!

" تازہ تخلیق روانہ کر رہا ہوں، امید کہ پسند فرمائیں گے۔ ویسے تو میں دیکھ رہا ہوں کہ شگوفہ میں میری تخلیقات کم ہی شائع ہو رہی ہیں پھر بھی میں کچھ نہ کچھ برابر روانہ کرتا رہتا ہوں۔ میرا کام تو صرف تخلیقات کو بھیجنا ہے اور پسند نا پسند آپ کی مرضی پر ہے۔ ساتھ ہی آپ لکھ چکے ہیں کہ آپ میرے کلام سے کافی مطمئن ہیں مگر پھر بھی کم ہی "لفظ" دے رہے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

مورخہ ۱۱ر اگست ۷۸ء

" اپنے مجموعے کی بابت پھر لکھوں گا۔ دہلی جاکر وہاں پر بھی تخمینہ بنوا لوں۔ اب صفحات دو سو رکھوں گا۔ بقیہ کلام دوسرے اور تیسرے مجموعے کے لئے ریزرو کر دوں گا۔ کلام کا ذخیرہ بہت ہے۔"

۱۰ر جون ۷۹ء

مخلص
کرگس سہسوانی

۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء کی دوپہر کو بمقام پولیس اسٹیشن "ایکہ" ضلع مین پوری یوپی میں نازل ہوا۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں والد صاحب کے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے پر اپنے آبائی وطن سہسوان ضلع بدایوں، یو۔پی آگیا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں شعری مذاق سوجھا جو آج تک برقرار ہے۔ ۱۹۶۲ء تک شرف تلمذ جناب واحد حسین واحد صاحب سے رہا۔ ۱۹۶۲ء میں ان کے انتقال کے بعد ... چل رہا ہوں۔ صرف مذاق سلیم ہی اب میرا رہنما ہے۔ والدین نے میرا نام قمرالحسن عرف لڈن رکھا جس کو میں نے تبدیل کرکے شنارالحسن عرف لڈن بہ تخلص کرگس رکھا۔ میرے پاس تقریباً آٹھ ہزار اشعار کا اسٹاک ہے۔ کاروباری زندگی ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۸۰ء کو پٹنہ میں ایک مشاعرہ سنجیدگی کی شامت یعنی جشنِ ظرافت شاعری ہوا تھا اس میں کرگس مرحوم نے چند قطعات پڑھے تھے۔ دو قطعات ملاحظہ ہوں ؎

پی کے بھٹی سے جو اک رندِ بلا نوش چلا
جب ہوا ہوش سے بے ہوش تو نالی میں گرا
منہ میں کُتّے نے جو پیشاب کیا بول اٹھا
ساقیا اور پلا اور پلا اور پلا

●

مادرِ ہندوستان کی کوکھ سے
ایک جنتا نام کا بچہ ہوا
یاد کر کے رو رہا ہوں اب اسے
ڈھائی سالہ عمر پاکر مر گیا

●

بدایوں کے ایک مشاعرے میں ۱۴ جنوری ۱۹۷۸ء کو آٹھ قطعات پڑھے تھے۔ دو قطعات ملاحظہ فرمائیے ؎

پوچھی جو اُن سے غیر کی تعریف تو کہا
تم کو پتہ نہیں یہ ہمارا فرینڈ ہے
میں نے کہا حضور ذرا یہ رہے خیال
میدانِ عشق میں یہ ابھی ان ٹرینڈ ہے

●

جو سُنیں گے مجھے توجہ سے — ولس فلٹر انھیں پلاؤں گا
اور کھُل کر مجھے جو دیں گے داد — لیلیٰ مجنوں انھیں دکھاؤں گا

کرگس صاحب کی ایک نظم "بیگم صاحبہ" ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ اہلِ ذوق و ادب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

"بیگم صاحبہ"

بھر کے سر میں ڈھیر سا سیندور بیگم صاحبہ — بن گئی ہیں جانے کیوں لنگور بیگم صاحبہ

یوں چلی ہیں آج کرنے "ٹور" بیگم صاحبہ
جیسے جاکے لیں گی دم میسور بیگم صاحبہ

آپ کی تعریف کو الفاظ تو ملتے نہیں
ہو سراپا نور، رشکِ حور بیگم صاحبہ

ہو سکا ممکن تو لے آؤں گا چندن کا ہار
آپ کا غصہ کروں گا دور بیگم صاحبہ

تم تو میک اپ کرکے بن جاتی ہو چودہ سال کی
اور پھر لگتا ہوں میں لنگور بیگم صاحبہ

آپ نے بچوں کی کر ڈالی ہے اتنی ریل پیل
عشق میرا ہوگیا کافور بیگم صاحبہ

کھل اٹھیں گی ایک دن پروین بابی کی طرح
روز اگر کھاتی رہیں انگور بیگم صاحبہ

جب سے ان کے چار چھ بچے سیانے ہوگئے
ہوگئی ہیں بے طرح مغرور بیگم صاحبہ

بات جب بھی راز کی ان کو بتاؤں گا کبھی
پھونک دیں گی شہر بھر میں صور بیگم صاحبہ

ساٹھ سے اوپر ہی ہوگی عمر اب تو آپ کی
پھر بھی لگتی ہو مجھے تم حور بیگم صاحبہ

ریل گاڑی میں بھی اک بچہ تولد ہوگیا
کر رہی تھیں اس گھڑی بھی ٹور بیگم صاحبہ

آپ کے میکے سے آجاتا ہے جب مہماں کوئی
گھر سے کر دیتی ہو مجھ کو دور بیگم صاحبہ

تم تو میکے جا کے مجھ کو بھول ہی بیٹھیں مگر
میں تمہارے غم میں ہوں رنجور بیگم صاحبہ

دیکھنے والے پٹاخہ جان کہتے ہیں تمہیں
اور کہتے ہیں مجھے لنگور بیگم صاحبہ

حضرتِ کرگس کی جب سے ہوگئی ہے پینشن
اور بھی رہنے لگی ہیں دور بیگم صاحبہ

ذکرگس مہسوانی کا غیر مطبوعہ کلام ـــ پرچہ

---

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف اور ہزاروں کی دل پسند چائے

ملک کے ہر گوشے اور ہر دوکان پر دستیاب

لاسا اسپیشل چائے

لاسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی

لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس ـــ نیلگری ٹی ایمپوریم۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔ اے پی، انڈیا

عرشی سہسوانی

"علاج عشق"

اک مریضِ عشق آیا حضرتِ کرگس کے پاس
شکل سے وحشت عیاں تھی پارہ پارہ تھا لباس

آکے بولا حال پر میرے کرم فرمایئے
مبتلائے عشق ہوں اب کیا کروں بتلایئے

میں نے جب اُس کی سُنی یہ داستانِ جانگزا
دیدیا پھر اِس طرح کا مخلصانہ مشورہ

یہ بتاؤ تو کہ تم ہو کس کی زلفوں کے اسیر
کس کی خاطر بن گئے ہو خیر ہے کلوا فقیر

نبض پر میں ہاتھ رکھتا ہوں بتاؤ حال تم
کون سی سن میں ہوئے پیدا بتاؤ سال تم

بولا پیدائش ہوئی تھی ساٹھ کے لگ بھگ مری
اِس جواں عمری میں میری آنکھ اک دم لڑ گئی

عارض و رُخ کی کروں تعریف کیا اُس کا بیاں
اک جھلک دیکھی ہے اور بس بن گیا مجنوں میاں

اپنی خالہ کے یہاں آئی تھی وہ جانِ بہار
دیکھتے ہی جس کو مجھ پر چڑھ گیا جاڑا بخار

لاکھ چاہا میں نے آجائے وہ میرے روبرو
چند ساعت کے لئے ہوجائے اُس سے گفتگو

میں نے اُس کو دیکھنے کا جس قدر جھنجھٹ کیا
"لفٹ" دینا تو کجا اُس نے فقط گھونگھٹ کیا

چند لمحوں بعد وہ اپنے مکاں کو چل پڑی
تب مرے ارمان و حسرت میں پڑی اک کھلبلی

اُس گھڑی سے رات دن کا چین غارت ہوگیا
عیش اور آرام سارا نذرِ وحشت ہوگیا

کوئی صورت اُس سے ملنے کی نظر آتی نہیں
مدتیں بیتی ہیں وہ خالہ کے گھر آتی نہیں

ہجر میں آخر کہاں تک نالۂ پیہم کروں
تا بکے نظمِ دو عالم درہم و برہم کروں

اب میں سمجھا تیری حالت واقعی گمبھیر ہے
فیس دے کاغذ اُٹھا نسخہ لکھوں اکسیر ہے

جب ستائے تجھ کو اُس کی کج روی کا عارضہ
صبح دم ہر روز کر خونِ جگر کا ناشتہ

اور جب دل میں ترے کچھ میٹھا میٹھا درد ہو
پی لیا کر شربتِ دیدار آتشِ سرد ہو

اور جب کچھ ناتوانی تجھ کو کر ڈالے نڈھال
گیروا کپڑے پہن لے اور منڈا دے سر کے بال

آتشِ فرقت میں جب جلنے لگے تیرا بدن
تب یہ لازم ہے کیا کر رات دن مشقِ سخن

شامِ غم میں جب نہ آئے تجھ کو اک لمحہ قرار
تب اندھیری رات کو اختر شماری میں گذار

خون جب تیری رگوں میں منجمد ہونے لگے
دھجیاں کر جیب و داماں کی گریباں پھاڑ لے

اور جب سمجھے کہ آ پہنچی جدائی کی گھڑی
اک کلو پی بھنگ تاکہ دل پہ کچھ آئے تری

آتشِ غم سے ترا بن جائے جب دل بھی کباب
آدھ پاؤ کھا لیا کر روز معجونِ شباب

اور جب چاہے کہ ہاتھ آئے ترے وہ مہ جبیں
اُس کے گھر میں کُود پڑ دونوں چڑھا کر آستیں

اِن دواؤں پر اگر تجھ کو نہ ہو کچھ اعتقاد
تازہ گوبر کا کیا کر اپنے چہرے پر ضماد

"میری تعریف"

اے صدر و سامعین مرا آپ کو سلام
اوصاف اپنے آج کروں گا بیاں تمام

ہاں صدرِ محترم ذرا قائم رہے نظام
ہر فعلِ بد ہے میری نگا ہوں میں نیک کام

احقر کو خوب جان گئے بھارتی عوام
پڑھنے لگا ہوں جب سے میں "انپور ٹڈ" کلام

سمجھے نہ کوئی شاعرِ اعظم مجھے تو کیا
میں خود ہوں اپنے شہر کا بے مقتدی امام

تقطیع کے حساب سے کورا ہوں اس سے کیا
گانے کے فن میں طاق ہوں اس میں نہیں کلام

ہوتا ہے واہ واہ کا جس وقت شور و غل
جھک کر ہر ایک شخص کو کرتا ہوں میں سلام

شاعر بنا ہوں خدمتِ اُردو کے واسطے
ٹھرّے کے روز پیتا ہوں کمرے میں چند جام

آتا ہے جب سرور تو چلتا ہے یوں قلم
گھوڑے کو جیسے چھوڑ دے سائیس بے لگام

کیسی عروض، کیسے قواعد، کہاں کا وزن
چلتا ہے بے مہار کے جب اونٹ تیز گام

کوئی مشاعروں میں نہیں پوچھتا تو کیا
چھپتا تو ہے رسالوں میں اکثر میرا کلام

آل انڈیا میں ہر جگہ "نوٹ قبول" ہی ملا
سو بار کر کے دیکھ چکا سعیٔ نا تمام

اُستاد دیں گے نازِ سخن کا مجھے خطاب
مدّت سے میرے دل میں ہے یہ بھی خیالِ خام

جو چھاپتا نہیں غزلیات کو مری
کرتا ہوں اُس رسالے کو میں دور سے سلام

خود پر تو مجھ کو ناز ہے گو شعر پر نہیں
گھر سے پہ میرے آؤ تو دکھلاؤں تام جھام

غیبت ہر ایک شخص کی مرغوب ہے مجھے
اس کے علاوہ اور نہیں کوئی کام دھام

اپنوں کے ساتھ کرتا ہوں ہر طور سے دغا
لیتا ہوں اُن سے اُن کی محبت کا انتقام

اس سے غرض نہیں مرا لگتا ہے کون کیا؟
تضحیک اس کی کرنے میں ہوتا ہوں شادکام

قصبے کے لوگ صرف سمجھتے ہیں بادہ نوش
ویسے کئی "بلیک" کے کرتا ہوں چھپ کے کام

دراصل جتنے فن ہیں زمانے میں آج کل
استاد کاش! سب کا کہیں شہر کے عوام

میری زباں پہ مہرِ خموشی تو ہے مگر
کھل جائے وہ تو ہوتی ہے اک تیغِ بے نیام

پیسے کی میرے پاس بڑی ریل پیل ہے
جو بھی ہے میرے پاس وہ سب مال ہے حرام

لوگوں نے مجھ کو لاکھ کہا بد چلن مگر
بوتل نہ پھینکی ہاتھ سے، توڑا نہ میں نے جام

ہو چاہے میری جیب میں کتنا ہی مال و زر
مانگے کوئی فقیر تو دیتا نہیں چھدام

ایسی بھی ایک دل میں تمنا ہے جاگزیں
پرلا کے ساتھ ساتھ ہی آئے مرا بھی نام

سواگت ہو اس طرح سے مرا ہر مقام پر
جو دیکھ لے مجھے وہی جھک کر کرے سلام

چُشکی کی میری جو کسی شکل مل گئی
جھک کر کروں گا اہلِ سیاست کو میں سلام

اوصاف اور آپ سے کتنے بیاں کروں المختصر کہ سمجھو چڑی کا مجھے غلام
کرگس کے ساتھ میں نے کیا ہے سلوک وہ کرتا ہے جس کو یاد وہ منحوس صبح و شام
لیکن جناب آپ سے یہ عرض ہے میری
مجھ جیسا ہو خدا نہ کرے آپ کا غلام

قہقہے

حالِ دلِ بیمار وہی ہے "پپلے" ہے وہی گھر بار وہی ہے
آنے سے تو کتراتے ہیں وعدوں کی بوچھار وہی ہے
تیری طبیعت اللہ اللہ نخروں کا طومار وہی ہے
جو ہے تیری آنکھ کا تارا میری نظر کا خار وہی ہے
ہاتھ بھی جوڑے پیر بھی پکڑے اُن کا مگر انکار وہی ہے
لاکھ پڑھا لاحول کا منتر بھوتوں کا آزار وہی ہے
گو ہے ہر جا فیشن تازہ بیگم کی شلوار وہی ہے
مجنوں کو جو روگ لگا تھا مجھ کو بھی آزار وہی ہے
غیروں سے چاہت کی باتیں؟ میرے لئے دھتکار وہی ہے
دُھن پر جو نوشاد کی گالے آج بڑا فنکار وہی ہے
فرق نہیں کچھ نسبندی سے بچّوں کی بھرمار وہی ہے
آج ہر اک بازارِ وفا میں جسموں کا بیوپار وہی ہے
حسن کے چرچے بند مگر ہیں "نیوز" وہی اخبار وہی ہے
دھرم کے ٹھیکے دار وہی ہیں مذہب کی دیوار وہی ہے
کام نہ آئے وہ ہے دشمن کام جو آئے یار وہی ہے
"کینگ" وہی ہے کرگس والا غنڈوں کا سردار وہی ہے

* * *

گھر میں زیبائش کا جب سامان آدھا رہ گیا اپنا بیگم کی نظر میں مان آدھا رہ گیا
ہجر میں گھُل گھُل کر دلِ نادان آدھا رہ گیا وصل کا جو دل میں تھا ارمان آدھا رہ گیا
غور سے دیکھا، ٹٹولا تب غلط فہمی گئی ہم سمجھتے تھے ہمارا کان آدھا رہ گیا
وہ نہیں آئے ابھی تک کیا خبر کب آئیں گے رات آدھی رہ گئی امکان آدھا رہ گیا
یوں تو تھا بحرِ محبت میں بڑا جوش و خروش ڈوبی جب کشتی تو پھر طوفان آدھا رہ گیا
لگ "[illegible] "آبِ حیات" چرس اور تاڑی پہ ہر بہتان آدھا رہ گیا

"سن رسیدہ ڈاکٹر"

ہیں ہمارے شہر میں ایک سن رسیدہ ڈاکٹر
دیکھ کر روگی کو کہتے ہیں اسے ہے کینسر

طبِّ یونانی کا ملکہ ، ایلوپیتھک میں گرو
ایم بی بی ایس کہلانے لگے ہیں چار سو

یہ بھی دعویٰ ہے کہ اتنی قابلیت ہے انھیں
شاعری کے ہر مرض سے واقفیت ہے انھیں

ایک دن اُن کے مطب میں میں بھی پہنچا الغرض
میں نے پوچھا واقعی مجھ کو بھی ہے کوئی مرض

نبض میری دیکھ کر یوں مسکرائے زیرِ لب
صاف ظاہر ہے تمہارے "نوپریشر" کا سبب

پھر یہ بولے آپ تیرہ سال سے بیمار ہیں
پیٹ کی ہر آنت میں اٹکے ہوئے اشعار ہیں

جس کے باعث رات دن رہتی ہے سینے پر جلن
ڈر ہے لے ڈوبے نہ اک دن آپکو مشقِ سخن

وزن ہے کچھ کا غلط اور کچھ کی ہے صورت قبیح
مصرعۂ اولیٰ میں سستی مصرعۂ ثانی فصیح

کچھ ہیں خارج از بحر سے اور کچھ کی ہے بھونڈی ردیف
کچھ کی تو املا غلط ہے کچھ کے ہیں مضمون ضعیف

فارسی اشعار میں بھی ہے اضافت کی کمی
کچھ میں ایطائے خفی ہے کچھ میں ایطائے جلی

کچھ توارُد ہو گئے ہیں اور کچھ چوری کے ہیں
کچھ ہیں اشتر گونڈوی کے اور کچھ فانی کے ہیں

شاعری کرتے ہو تو گانے کا فن بھی سیکھ لو
ورنہ بہتر ہے کہ یہ مشقِ سخن بھی چھوڑ دو

صبح اُٹھ کر روغنِ بادام بھی سر پر ملو
آمدِ اشعار میں جس سے گرانی دور ہو

حلق میں پھر ڈال کر اُنگلی غرارے بھی کرو
تاکہ کچھ آواز میں پیدا لچک ہو ، لوچ ہو

پھر کرو ہندی کی کویتاؤں میں بھی کچھ اُنتی
تب ملے گی عقل کے کیٹاڑوں کو کچھ بلی

ہوگا اس پر کار ہندی اور اُردو کا ملن
اس پہ بزیمر ہے ہماری سنستھاؤں کا چلن

الغرض میں اپنے سر کو پیٹ کر چلنے لگا
تاکہ مجھ کو مل سکے کچھ سوچنے کا حوصلہ

میری حسرت جو کسی روز نکل جاتی ہے
سینۂ غیر پہ ایک مونگ سی دل جاتی ہے

کون سی آنکھ سے دیکھوں رُخِ رنگیں کی بہار
حُسن پر تیرے نظر بھی تو پھسل جاتی ہے

وہ جو آتے ہیں تو آتے ہیں عدو کو لے کر
اُن کے آنے کی خوشی غم سے بدل جاتی ہے

خیمہ لیتا ہے شب و روز بلائیں ان کی
دال اپنی تو کسی سال میں گل جاتی ہے

سینڈل ان کا میں آنکھوں سے لگا لیتا ہوں
میری ہر بات بگڑ کر بھی سنبھل جاتی ہے

ہو اجازت تو چلو آج ہی کشتی لڑ لیں
گل کی ہر بات یہ دیکھا ہے کہ ٹل جاتی ہے

وہ سمجھتے ہیں مجھے ایک درندہ کرگس
دیکھ کر اُن کو طبیعت جو مچل جاتی ہے

معین شاہد (گیا)

بہار کے چند مزاح نگار شعراء

اصنافِ ادب میں جہاں نثر کے متنوع فنی تجربے کئے گئے ہیں اور جہاں مقالہ، تحقیق، تنقید، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ وغیرہ میں نت نئے فنی اسلوب اور تشکیل و توازن کے لحاظ سے اصناف نثر کو کئی خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ وہاں منظوم اور شعری ادب میں بھی اصناف شعر کے کئی فنی اصناف شعر کے کئی تجربے کئے گئے ہیں اور جو مستقل اوزان اور بحور کے لحاظ سے اور شعری ہیئتی طور سے ایک فن کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ غزل، قطعہ، رباعی، مرثیہ، نظم کی طرح شعری اور منظوم ادب میں طنزیہ اور مزاحیہ نظموں اور غزلوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ظرافت نگاری اور شگفتہ مزاجی ہی کے بطن سے دراصل ریختی، ہجو، ہزل، واسوخت، پیروڈی وغیرہ جیسے اصنافِ شعر کی تشکیل ہوئی ہے۔

بہار میں ظرافت اور مزاح نگار شعراء کی کمی نہیں، ان میں جناب پروفیسر عبد الغفور شہباز، جناب علامہ جمیل مظہری، جناب نجم مانپوری، جناب سید ظفر الدین شمس گیاوی، ہمزاد بہاد، جناب سید شاہ فضل امام واقف عظیم آبادی، جناب رضا نقوی واہی جناب گستاخ گیاوی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر شہباز آرہ، بہار کے رہنے والے تھے۔ اورنگ آباد دکن کے کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۵۸ء میں ہوئی تھی۔ ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو انتقال فرمایا۔ کلکتہ کے سرکاری قبرستان میں مدفون ہیں۔ آخری عمر میں کلکتہ میں رہتے تھے اور نواب سید احمد خاں آزاد کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

نظیر اکبر آبادی پر ایک کتاب ۱۸۹۲ء میں "زندگانی بے نظیر" کے نام سے نول کشور پریس سے چھپوائی تھی۔ پروفیسر شہباز کی حیات اور فن سے متعلق "سراج و منہاج" میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے۔ ماہنامہ 'ندیم' کے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں جناب محمد بشیر الحق دسنوی نے، ذکر و مطالعہ میں پروفیسر ذکی الحق دسنوی نے سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر شہباز نے خیالاتِ شہباز اور مفرح القلوب، دونوں ہی میں مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً حضرت رمضان کا فوٹو، داڑھی مونچھیں، پھرت، تہذیب قیس، خاتون قسمت، ایکٹرس، جواہر کا نوحہ وغیرہ۔

"مونچھیں" کا ایک بند دیکھئے۔

سر شام کوٹھی سے اپنی نکل کر ٹھاتی ہوئی دم بدم لطف منظر
لگاتی ہوئی لان کے گرد چکر بیٹر ہاف کے ساتھ عمدہ فٹن پر
ہوا کھا رہی ہیں کمشنر کی مونچھیں

علامہ جمیل مظہری کی فکری اور فلسفیانہ شاعری پر ہمیں جتنا ناز ہو کم ہے۔ علامہ جمیل مظہری جب کلکتہ میں تشریف فرما تھے تو ملکی صحافت کی دنیا میں اپنے قلم کا جوہر اور جولانی طبع دکھایا کرتے تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک کا ہے۔ وہ فلمی صحافی اور شاعر کی حیثیت سے خوب چمکے اور ان کی مقبولیت کا سبب فلمی ایکٹریسوں اور رقاصاؤں کی ہجو نگاری تھی۔ انہوں نے ان فلمی صحافیوں اور ایڈیٹروں کی خوب کھنچائی کی جو ایکٹرسوں کے دربار دار تھے۔

جمیل مظہری صاحب نے پٹنہ کے "مولوی محسن" پر جو ہجو لکھی ہے وہ ایک شاہکار ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

اے مولوی قربان تیری فتنہ گری کے ۔۔۔ دوکان میں بکتا ہے ترے نام سے گھی کے
مسجد کے چراغوں کا چرایا ہوا روغن ۔۔۔ اے مولوی محسن ، اے مولوی محسن

حضرت وانچی نے ماہنامہ "سہیل" گیا کے جمیل مظہری نمبر میں "جمیل مظہری کی ہجو نگاری" پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر علامہ مرحوم کو ہجو نگاری کی دنیا میں زندہ جاوید بنا دیا۔

علامہ جمیل مظہری یکم جنوری ۱۹۰۴ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ جولائی ۱۹۸۰ء کو بھیکن پور (مظفر پور) میں انتقال فرمایا۔

حضرت انجم مانپوری کا نام طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا ایک اہم نام ہے۔ نثر میں ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین اور ظریفانہ انشائیے ملتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں "میر کلو کی گواہی"، "کرایہ کی ٹمٹم"، "سکنڈ ہینڈ موٹر" کو لوگ ابھی بھولے نہیں ہیں۔ انجم مانپوری کی پیدائش گیا کے ایک محلہ مانپور میں ۱۸۸۱ء میں ہوئی اور محلہ صوبیا گھاٹ، گیا میں اپنے رہائشی مکان میں جو پھلگو ندی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے ۷ر اگست ۱۹۵۸ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار کربلا کے قبرستان میں واقع ہے۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ "ندیم" گیا سے جاری کیا جو آپ کی ادارت میں ۱۹۳۷ء تک نکلتا رہا۔ آپ کے انشائیوں اور طنزیہ مضامین کے چار مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) طنزیات مانپوری حصہ اول (مطبوعہ ۱۹۳۸ء) (۲) طنزیات مانپوری، حصہ دوم (مطبوعہ ۱۹۴۰ء)
(۳) مطائبات مانپوری (مطبوعہ ۱۹۵۴ء) اور مرنے کے بعد (مطبوعہ ۱۹۶۳ء)

حضرت مانپوری مرحوم نے مزاحیہ اور طنزیہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "کلام انجم مانپوری" (مرتبہ معین شاہد) شائع ہو چکا ہے۔ مانپوری کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بجائے علم و ہنر، سیکھے ایجی ٹیشن فقط ۔۔۔ ہیں جن کے نکلے ہوؤں کالج سے ایجوکیٹ فقط
سزائے جیل ملی جس کو وہ منسٹر ہے ۔۔۔ سزا دی جس نے، رہا وہ مجسٹریٹ فقط

کیا غم ہے جو عیب اگر میری چال اور چلن میں ہے ۔۔۔ عیبوں کا پردہ پوش تو کھدر بدن میں ہے
بولے فرشتے اس کے گناہ سب معاف ہیں ۔۔۔ کھدر کا پورا تھان پلیٹا کفن میں ہے

ظریفانہ اور طنزیہ نظموں میں "میونسپل کمشنری کا ماتم"، "میونسپل کمشنری کا سہرا"، "آپ ہی ہیں کونسل کے کینڈیڈیٹ"، "این سعادت بزور بازو نیست"، "پھر فضا میں چاہیے" ملاحظہ کریں۔

صرف ایک چھوٹی سی نظم "این سعادت بزور بازو نیست" ملاحظہ فرمائیے۔ جناب مولوی تفضل حسین مرحوم نے مولوی سعادت صاحب کی شان میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ دونوں مسجد میں تھے۔

ایک صاحب بوجہ کمزوری — [illegible] سے تھے اپنی شرمندہ
تھی جو بیوی کو خواہش اولاد — بیوی تھی آشنا کی جوئندہ
مل گیا ایک ہٹا کٹا مرد — سچ ہے جوئندہ ہر کہ یابندہ
ہوا پھر بعد نو مہینے کے — لڑکا اک مشعل چہرتا بندہ
شمس کے اولاد کی خبر بولے — مُفت کا ہے، خدا رکھے زندہ
بستی والوں نے جب سُنی یہ خبر — بولا ہر ایک وہاں کا باشندہ

"این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

جناب سید ظفر الدین شمس گیاوی ایک بے بدل اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ نے ۱۹۳۴ء میں گیا سے ایک مزاحیہ ہفتہ وار ’ہمزاد‘ نکالا۔ دراصل یہی ہفتہ وار اخبار آپ کے ظریفانہ کلام کا محرک بنا۔ آپ نے ہجو نگاری اور ہزل گوئی میں جو نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں وہ شاہکار ہیں۔

ہجو (Punch) اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس میں مذمت، دل آزاری، تنقید، نوک جھونک اور پھبتی سے کام لیا جاتا ہے، اس صنف میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، انشاء اللہ خاں انشاءؔ، مصحفیؔ کو شہرت دوام حاصل ہو چکی ہے۔

ہزل (Ridicule) شوخی اور ظرافت کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ طبیعت کی جھنجھلاہٹ، کثافت اور بدمزگی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس میں پاکیزہ اور صاف ستھرا مزاج بالکل نہیں ہوتا۔ ہزل گوئی زیادہ تر کسی شخص سے پرخاش، لڑائی کی جھونک [illegible]، اور گالی گلوچ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے۔ اردو ادب میں ہجویات اور ہزلیات کو شمس گیاوی نے گالی گلوچ اور فحاشی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔

جناب شمس گیاوی نے جب ’ہمزاد‘ اخبار نکالا تو وہ ہمزاد بہادر بن گئے اور لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا شروع کیں۔ کچھ مقامی حضرات نے نوک جھونک اور خشکی شروع ہو گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمزاد بہادر کے نام سے ان کے خلاف ہجو اور ہزل لکھنا شروع کر دی۔ جب تک ہمزاد نکلتا رہا، ہجو نگاری اور ہزل گوئی کا سلسلہ چلتا رہا۔ "نمکدانِ ظرافت" کے عنوان کے تحت ہمیں ہجویات اور ہزلیات کے کافی اشعار ملتے ہیں۔

یہاں میں ان کی شہرۂ آفاق ہجو "چندے پر بسر کرتا ہے اوقات حکیموا" خاص طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بیچارے حکیم جی کو سوداؔ سے لے کر امداد امام اثرؔ صاحب تک نے ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ سوداؔ کی وہ ہجو بہت مشہور ہے جو انہوں نے "حکیم غوث" کے عنوان سے لکھی تھی اور جس کے دو اشعار کافی مشہور ہیں ؎

شکل ہے شیطان کی اور غوث نام
جگ میں ہلاکو کا ہے قائم مقام
کشتنِ خلق غرض اس کا کام ہے
مرگ و قضا مفت میں بدنام ہے

خان بہادر شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ عظیم آبادی مرحوم نے کسی حکیم کی حکمت سے بیزار ہو کر ایک ہجو لکھی تھی جس کا مصرعہ تھا ؏ پاجامہ پہنتا ہے کلی دار حکیموا۔ اسی مصرعہ پر ہمزاد بہادر نے ایک حکیم صاحب [illegible]

ہیں۔ دل آزاری ان کا مقصد نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ مقصود ہے۔

حضرت واہی پندرہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ماہنامہ "ندیم (گیا)" کے شمارہ مارچ ۱۹۳۳ء میں ان کی نظم "رواداری" شائع ہوئی تھی۔ یعنی ۵۴ سال قبل واہی صاحب معیاری رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت وہ صرف رضا نقوی تھے۔ ماہنامہ ندیم (گیا) کے شمارہ جولائی ۱۹۳۵ء کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

نگاہیں جس طرف اٹھتی ہیں تو ہی تو جھلکتا ہے
یہ تکمیل محبت ہے کہ تو ہر سو جھلکتا ہے
مکدر ہے، شکستہ ہے، مگر محبوب ہے ہم کو
ہمارا دل وہ آئینہ ہے جس میں تو جھلکتا ہے

حضرت واہی کو غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۵ء کا غالب ایوارڈ دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو ۱۹۷۶ء میں بہار اردو اکادمی ایوارڈ اور ۱۹۸۵ء میں میر اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ واہی صاحب پر رانچی یونیورسٹی سے ایک صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔

ابھی ابھی کراچی (پاکستان) سے ایک شعری مجموعہ "طنزیات گیاوی" موصول ہوا ہے۔ جس کے شاعر جناب سید نور عالم صاحب گستاخ گیاوی ہیں۔ "طنزیات گیاوی" جناب گستاخ گیاوی کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۷۴ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

"طنزیات گیاوی" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت گستاخ گیاوی بھارت کے رہنے والے تھے لیکن ۱۹۴۶ء میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ان کا آبائی مکان موضع سونبرسا، ڈاکخانہ رفیع گنج، ضلع گیا (بہار) تھا اور اب ڈی ۴-۸۵، کالونی، کراچی میں مستقل سکونت پذیر ہیں۔ آپ حضرت شفق عماد پوری کے نواسے ہیں۔ کراچی میں جا کر مختلف اخبارات و رسائل میں کالم اور طنزیہ و مزاحیہ نظمیں لکھنے لگے اور خوب چلے۔ مولانا ظفر نیازی کے اخبار "انقلاب" میں دس سالوں تک مستقل لکھتے رہے۔

یہاں کچھ کلام کے نمونے پیش خدمت ہیں۔

الوداع ماہ صیام

رخصت اے ماہِ مبارک الوداع ماہِ صیام — جاتے جاتے تو لئے جا ہم غریبوں کا سلام
ہم تو روزہ دار تھے اور سیٹھ روزہ خور تھے — اس طرف تھا پیٹ خالی، اس طرف تھا پیٹ جام
خالی معدے کی وہی حالت رہے گی تیرے بعد — تو گیا تو کیا ہوا، بھوکا ہی ہے قائم مقام
رات دن کا تا بھانا منتقل ہو جائے گا — کل جو سو [illegible] ہے جلد مساجد کے امام
تاجروں کو کس قدر تھا تیری عظمت کا لحاظ — تیرے آتے ہی یہاں ہر چیز پر چڑھتے ہیں دام
تاجروں کی اس قدر مضبوط تھی ہم پر گرفت — [illegible] کے شکنجے میں جکڑ دیتے تمام
جب سنا گستاخ کو روزہ داروں نے [illegible] — [illegible] شیریں سے بہت آگے بڑھا تیرا کلام

مندرجہ ذیل دو قطعات دیکھئے، شاعر نے آج کے پاکستان کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ اور طنز بھر پور وار کئے ہیں۔

چوری، ڈاکہ، قتل و غارت، ہر گھڑی ہر آن ہے
کیسی آفت میں پھنسی اب آدمی کی جان ہے
نام پر اسلام کے کیا خوب ہے بازی گری
جھوٹ کا وعدہ ہے لب پر، ہاتھ میں قرآن ہے

آپ کو بنگلہ ملا، گاڑی ملی، عہدہ ملا
یعنی اسلام آباد پہنچے، اور جو چاہا ملا
جعلی ووٹوں سے تو مانا آپ بن بیٹھے وزیر
اب ذرا فرمائیے حضرت کہ ہم کو کیا ملا

دلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لئے من پسند دوپٹہ
دلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے۔ ایچ۔ زری والا — کا ہوگا

اس کے علاوہ ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک:
۔ بنارسی سلک ساڑیاں ۔ تنچوی ۔ ساٹن ۔ جارجیٹ ۔ آرگنزا ۔ ٹشو ۔ شفان ۔ پٹولہ
۔ بروکیڈ ۔ دھرماورم ۔ کانچی ورم ۔ پوچم پلی ۔ نارائن پیٹ ۔ میسور کریپ ۔ ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل

ہر خصوصی کاؤنٹر ۔ میاچنگ کے بلوز ۔ دوپٹہ ۔ کرتے اور فالس

ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا

اے۔ ایچ۔ زری والا

لاڈ بازار۔ حیدرآباد ۲
کیبل: "زری والا"
فون نمبر: 525232

تبصرہ

از اندر جیت لال

"انشائیہ پچیسی"
مصنف : ڈاکٹر جاوید وششٹ
صفحات : ۱۲۸
سائز : ۲۲ × ۱۸
قیمت : چالیس روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

اردو میں انشائیہ ایک خوبصورت، دلچسپ اور قابلِ قدر صنف ہے، گو کہ اس کی کوئی متفق علیہ تعریف ابھی وضع نہیں ہو سکی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نثری صنفِ ادب میں مصنف کسی موضوع کے مختلف جہتوں اور پہلوؤں کا ہر ہلکے پھلکے اور خوشگوار تخلیقی اسلوب میں اپنے مشاہدے، مطالعہ اور سوچ کا اظہار کرتا ہے۔

انشائیہ نگار اپنے مرکزی خیال یا موضوع کے ساتھ بڑا مشغول رہتا ہے۔ وہ اس کے تمام ابعاد کو بغور دیکھتا۔ اس کی جزئیات کا جائزہ لیتا۔ اس کے قریب و دور کے امکانات پر نظر ڈالتا، اس کے تمام زمانوں اور اوقات کا مطالعہ کرتا، روشنی اور اندھیرے میں رکھ کر اس کی شباہت کو دیکھتا اور اس کے حسن و قبح پر تبصرہ کرتا اور اس سارے عمل سے لطف لیتا ہے۔ اور پھر اس لطف کو اپنی نگارش کا حصہ بنا دیتا ہے۔ انشائیے کا دامن دنیا جہان کے موضوعات کو اپنے اندر جگہ دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار کا فن اسی میں مضمر ہے کہ وہ موضوع کو سمیٹنا بھی جانتا ہے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ڈاکٹر جاوید وششٹ بطور شاعر و نثر نگار، محقق اور معلم بڑے کامیاب ہیں۔ بہتا جاتا ان کی مادری زبان ہے۔ یہ وہ جا شاسہ [illegible] زبانِ دہلوی کا ٹھیٹ ہے۔ جس طرح اردو جاوید وششٹ کی اکتسابی زبان ہے۔ ان پہ کمال یہ ہے کہ وہ بڑی حسین با محاورہ اور دلکش اردو لکھتے ہیں۔ اور اس کی پہچان ہے انشائیہ پچیسی۔ جو مصنف کے پچیس انشائیوں پر مشتمل ہے، کتاب کی ایک خوبی قابلِ ذکر ہے کہ یہ دہلی، بہار اور ہریانہ اردو اکادمیوں تینوں سے گرانقدر انعامات کی مستحق قرار دی گئی ہے۔ ان انشائیوں میں تنوع ہے، رنگا رنگی ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خوبصورت انداز میں نقد و تبصرہ کیا گیا ہے انشائیوں کی ترتیب حرفِ تہجی کے مطابق ہے اور ہر انشائیہ کے آخر میں سالِ تصنیف بھی درج ہے یوں لگتا ہے کہ پچیس انشائیے چندہ برسوں

مزاحیہ نثر و نظم کا کل ہند انعامی مقابلہ

(بہ تعاون "احمد سنس شوروم" پتھر گٹی۔ حیدرآباد)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر طنز و مزاح کے فروغ کے لئے مزاحیہ مضامین اور منظومات کا ایک کل ہند انعامی مقابلہ منعقد کیا جارہا ہے۔ نثر و نظم کے مقابلوں میں عام لکھنے والے بھی حصہ لے سکتے ہیں جبکہ کالجوں میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کے لئے صرف مزاحیہ نثر نگاری کا مقابلہ رکھا گیا ہے۔ کالج گروپ کے انعامی مقابلے کے لئے مزاحیہ مضمون کا عنوان "نقل مارنے کے موڈرن طریقے" رکھا گیا ہے جس میں سب سے عمدہ مضمون پر انعام اول چار سو روپے، انعام دوم تین سو روپے اور انعام سوم دو سو روپے نقد دیئے جائیں گے۔ عام مقابلے کے لئے مزاحیہ مضمون کا عنوان "روزگار کی تلاش" اور مزاحیہ نظم کے لئے عنوان "آج کا نیتا" رکھے گئے ہیں۔ مزاحیہ مضامین اور نظموں کے مقابلے میں یا انعام اوّل پانچ سو روپے اور انعام دوم تین سو روپے نقد الگ الگ دیئے جائیں گے۔ ان کے علاوہ ترغیبی انعامات بہ شکل کتب بھی دیئے جائیں گے۔ ان انعامات کو "احمد سنس شوروم، پتھر گٹی، حیدرآباد" نے اسپانسر کیا ہے۔ ہر دو انعامی مقابلوں کی تخلیقات کی وصولی کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء ہے۔ کالج کے طلباء و طالبات کے لئے یہ لازم ہوگا کہ وہ اپنے مزاحیہ مضمون کے ساتھ مصدقہ تعلیمی صداقت نامہ (BONAFIDE CERTIFICATE) منسلک کریں۔ ورنہ مضمون شریکِ مقابلہ نہ ہوگا۔ مزید تفصیلات کے لئے زندہ دلانِ حیدرآباد کے جنرل سکریٹری جناب مسیح انجم سے دفتر زندہ دلان، کمرہ نمبر ۲۷، بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱ پر ربط یا خط و کتابت کی جاسکتی ہے۔ اس انعامی مقابلے کے کنوینر جناب وہاب قیصر ہیں۔ انعامات کی تقسیم نومبر کے تیسرے ہفتے میں منعقد ہونے والی زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر عمل میں آئے گی۔ انعامات کی درجہ بندی کے سلسلے میں ججس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔ ادارۂ زندہ دلانِ حیدرآباد کے عہدیدار اور اراکینِ عاملہ اس انعامی مقابلے میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ انعام یافتہ تخلیقات زندہ دلانِ حیدرآباد کے ترجمان ماہنامہ "شگوفہ" میں شائع ہوں گی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

فون نمبر 557716   فون مکان: 521064

جلد (۲۰)   اکتوبر ۱۹۸۷ء   شمارہ (۱۰)

★

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ ، نریندر لوتھر
یوسف ناظم ، مجتبیٰ حسین

مجلس ادارت:
حمایت اللہ ، محمد منظور احمد ، مسیح انجم

مینیجر: سید جلیل   مینیجر اعزازی (بمبئی): فیاض احمد فیضی

کتابت: محمد عبداللطیف ، سمیع اللہ   طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد

فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:
۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔

ڈسٹری بیوٹرس برائے

۱. موہن میکن بریوریز ۲. اجنتہ ڈیری آگرہ
۳. انڈین ایسٹ کمپنی لمٹیڈ ۴. ہارکوسری نگر ۵. کیکو کیننگ انڈسٹریز لمٹڈ ٹریچور۔
۶. میڈونا کیننگ کمپنی ۷. جمبن وہائٹ رودلش ۸. پیری سوئٹس اینڈ ٹافیس۔
۹. ڈرگ مجوٹان فوڈ پراڈکٹس ۱۰. SIL سِل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ!

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض۔ حیدرآباد

نامور و منفرد مزاح نگار مجتبیٰ حسین

کو ماہنامہ شگوفہ کا خراج تحسین

مجتبیٰ حسین نمبر

- فکر و فن اور شخصیت کا سیر حاصل جائزہ
- ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں، شاعروں، مزاح نگاروں اور نقادوں کی خصوصی تخلیقات
- مجتبیٰ حسین کے نام چند اہم ادیبوں کے خطوط
- مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب
- تصاویر اور بے شمار دلچسپیاں

قیمت ۵۰ روپے

نومبر ۱۹۸۷ء میں اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب

۱۸ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۸۷ء

کے موقع پر شگوفہ

سووینیر شائع ہوگا

قیمت چھ روپے

شہر حیدرآباد میں بورویل سے متعلق

کسی بھی قسم کے کام کیلئے

ہماری خدمات حاصل کیجئے

ہمارے فنی ماہرین حسب ذیل اُمور کیلئے نہ صرف حیدرآباد بلکہ بیرونِ حیدرآباد بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں

- بورویل کی کھدائی 4½" ڈائی میٹر و 6" ڈائی میٹر
- دوبارہ بورنگ یا بورویل کی گہرائی میں اضافہ
- بورویل پمپ، ہینڈ پمپ وغیرہ کی درستگی

وقت اور وعدہ کی پابندی کے ساتھ نہایت اطمینان بخش کام ہماری خصوصیت ہے

کریسنٹ انٹرپرائزس اینڈ کریسنٹ بورویل کمپنی

حسینی علم روڈ۔ حیدرآباد ۔ فون نمبر 521317

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

مال مفت (انشائیے)

پچورت (منظومات)

چنیدہ

آسام و نیلگری

کے باغات سے راست منگوائی چائے اسٹاک

و خوش ذائقہ آپ کے ذوق کے عین مطابق

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد

یاقوت محل ٹاکیز

یاقوت پورہ، حیدرآباد

Ph: 525444

مزاحیہ نثر و نظم کا کُل ہند انعامی مقابلہ

(بہ تعاون "احمد س کلاتھ شو رُوم" پتھر گٹی، حیدرآباد)

زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے سلسلے میں جو کُل ہند انعامی مقابلہ رکھا گیا ہے اس کے لیے مزاحیہ مضامین اور نظموں کی وصولی کی آخری تاریخ ۱۵ ر اکتوبر سے بڑھا کر ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کر دی گئی ہے۔

اس مقابلے کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱. کالجوں کے طلباء و طالبات کے لیے مزاحیہ مضمون کا عنوان: "نقل مارنے کے ماڈرن طریقے"

انعام اول: چار سو روپے (Rs. 400/-)

انعام دوم: تین سو روپے (Rs. 300/-)

انعام سوم: دو سو روپے (Rs. 200/-)

۲. علم لکھنے والوں کے لیے مزاحیہ مضمون کا عنوان: "روزگار کی تلاش"

انعام اول: پانچ سو روپے (Rs. 500/-)

انعام دوم: تین سو روپے (Rs. 300/-)

۳. علم لکھنے والوں کیلئے مزاحیہ نظم کا عنوان: "آج کا نیتا"

انعام اول: پانچ سو روپے (Rs. 500/-)

انعام دوم: تین سو روپے (Rs. 300/-)

(نوٹ: ان انعامات کے علاوہ ترغیبی انعامات بھی بشکل کتب دیئے جائیں گے۔)

شرائط: ۱. مضامین و نظموں کا طبع زاد اور غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

۲. کالجوں کے طلباء و طالبات کے لیے مضمون کے ساتھ تعلیمی صداقت نامہ (مصدقہ) منسلک کرنا ضروری ہے۔

- انعامات کی درجہ بندی کے سلسلے میں ججس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔
- انعام یافتہ تخلیقات ماہنامہ "شگوفہ" میں شائع کی جائیں گی۔
- زندہ دلان حیدرآباد کے عہدیدار اور اراکین عاملہ اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔

تخلیقات بھیجنے کا پتہ:۔ زندہ دلان حیدرآباد، کمرہ نمبر 27، بسچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ آندھراپردیش

- کنوینر مقابلہ جات:۔ وہاب قیصر

مجتبیٰ حسین

فِکر تونسوی

فکر تونسوی نے آج اپنی زندگی کی پیاز کا آخری چھلکا بھی اُتار دیا۔ اس پیاز میں اتنے ہی چھلکے تھے، اور آج میں فکر کی یاد کا پہلا چھلکا اُتار رہا ہوں۔ زندگی کی پیاز کا آخری چھلکا اتر جاتا ہے تو یادوں کی پیاز کے چھلکے اُترنے شروع ہو جاتے ہیں اور یادوں کی پیاز میں زندگی کی پیاز سے زیادہ چھلکے ہوتے ہیں۔ اس وقت تک یادوں کی پیاز کے چھلکے اتارتے رہو، جب تک خود اپنی زندگی کی پیاز کا آخری چھلکا نہ اُتر جائے۔ آج پتہ چلا کہ یادوں کی پیاز، زندگی کی پیاز سے بڑی ہوتی ہے۔

ابھی دس دن پہلے کی بات ہے کہ صبح صبح فکر تونسوی کا فون آیا۔ بہت جلدی میں تھے۔ انھیں ایک پاکستانی ادیب کی کتاب کی ضرورت تھی۔ میں نے پوچھا "یہ صبح صبح آپ کو اس کتاب کا خیال کیوں آگیا؟" بولے۔ "اسی ڈھنگ سے میں بھی ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی کتاب لکھنے سے پہلے ذرا اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی پچھلے دنوں تو آپ کی دو کتابیں چھپ کر آئی ہیں۔ اب آپ ایک اور کتاب لکھنے چلے ہیں۔ آپ باز نہیں آئیں گے۔ ستر برس کے ہو گئے، کچھ تو آرام کیجئے۔"

ہنس کر بولے۔ "بیٹا اب مشورے دینا بند کرو۔ ستر برس کے آدمی کو مشوروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مجھے آج ہی یہ کتاب چاہیئے۔"

انھیں اگر جلدی تھی تو مجھے بھی کم جلدی نہیں تھی۔ میں نے آدھے گھنٹے کے اندر ہی یہ کتاب ان تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔ بہت خوش ہوئے۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے پھر فون کیا۔ بولے: "تم اتنے ذمہ دار آدمی کب سے بن گئے۔ لگتا ہے تم میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے تمہارے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کتاب اگر آج مانگی تھی تو یہ سوچ کر مانگی تھی کہ تم کل تک یہ کتاب ضرور پہنچا دو گے۔ تم نے آدھے گھنٹے میں ہی بھجوا دی۔ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "آپ نے جلدی جو دکھائی تھی، اتنی جلدی کبھی نہیں دکھائی تھی۔ مجھے تو اصل میں آپ ہی میں کچھ خرابی نظر آرہی ہے۔"

ہنس کر بولے۔ "ستر برس کے ہو جاؤ گے تو پتہ چلے گا کہ ستر برس کے آدمی کو کس بات کی جلدی ہوتی ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ، کب آؤ گے؟"

میں نے کہا: "دو دن بعد"۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ میں فکر تونسوی سے، جن سے زندگی میں ہزاروں باتیں کی تھیں، آخری بار بات کر رہا ہوں۔ دو دن بعد میں ان کے ہاں جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ فون آیا۔ "فکر صاحب، کل رات سیڑھیوں سے گر گئے۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائینسس میں ان کا داخلہ نہیں ہوا تو صفدر جنگ میں داخل کرادیا ہے۔ بے ہوش ہیں اور ان کے سیدھے بازو پر فالج کا حملہ بھی ہوا ہے۔"

مجھے اس اطلاع سے تھوڑی سی تشویش تو ضرور ہوئی لیکن پریشانی بالکل نہیں ہوئی کیونکہ فالج سے فکر کی دوستی بہت پرانی تھی۔ دو بار فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ فالج سے لڑنا وہ خوب جانتے تھے بلکہ اس معاملے میں اتنے چوکس تھے کہ کبھی فالج کو اپنے بائیں بازو پر حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میں اکثر مذاق میں ان سے کہتا تھا۔ "آپ سچ مچ لیفٹسٹ ہیں اور اتنے کٹر لیفٹسٹ ہیں کہ فالج تک کو اپنے بائیں بازو پر حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ فالج کے دونوں حملوں کے لئے ہمیشہ دایاں بازو ہی پیش کیا، بایاں بازو نہیں۔" میں مطمئن تھا کہ فالج کا تیسرا حملہ بھی دائیں بازو پر ہی ہوا ہے۔ رہی بات گرنے کی تو، فکر کے لئے گرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ زندگی بھر گر گر کر سنبھلتے رہے۔

میں اور دیوان بریندر ناتھ اسپتال پہنچے تو فکر تونسوی ایک عام وارڈ میں ایک معمولی مریض کی طرح بے ہوش پڑے تھے۔ گھر کے سارے افراد پریشان تھے۔ مسز فکر تونسوی روئے جا رہی تھیں۔ وہ فکر تونسوی جو مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اُچھل پڑتے تھے اور ان کا چہرہ دمک اٹھتا تھا۔ اب بے حس و حرکت ایک بستر پر پڑے تھے۔ فکر کو آج تک ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ میں سر جھکائے کھڑا تھا کہ ایک لمحہ کیلئے فکر نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے غور سے دیکھا، اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا، کچھ کہنے کی کوشش کی مگر لفظ بڑبڑاہٹ سے آگے نہ بڑھے۔ مسز فکر تونسوی، جو پلنگ کی دوسری جانب کھڑی تھیں ایک لمحے کے لئے خوش ہو گئیں، دوڑی دوڑی ہماری جانب آئیں اور بولیں۔ "دیکھیے، ذرا دیکھیے فکر صاحب آپ کو پہچان رہے ہیں، انھیں پکاریئے۔"

میں نے کہا "فکر بھائی! آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری اس بات پر فکر تونسوی نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لاکر وہاں سے کھسکنے لگا تو فکر تونسوی میرے ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو گھماتے چلے

گئے۔ یہاں تک کہ ان کی پتلیاں پیشانی سے لگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ فکر تونسوی کو اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ جب تک ان کے دماغ میں خون کا اخراج بند نہیں ہوگا تب تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تین دن صفدر جنگ اسپتال میں ان کے علاج پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی گئی تو انہیں جی بی پنت اسپتال منتقل کیا گیا۔ میں روز انھیں دیکھنے کے لئے جاتا رہا۔ فکر نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر کسی کو نہیں پہچانا۔ قسم قسم کے ٹیوبس میں جکڑے ہوئے فکر تونسوی کو میں نے آٹھ دنوں تک موت کے فرشتے سے گھمسان کی لڑائی لڑتے ہوئے دیکھا ہے وہ اپنے جسم کو زندہ رکھنے کے لئے موت کے فرشتے سے ایک ایک سانس چھین کر لے آتے تھے۔ کیسی غضبناک لڑائی تھی۔ وہ معاملہ اُن کا اور موت کے فرشتے کا تھا۔ ہم صرف تماشائی تھے۔ نہ اپنی سانسیں انھیں اُدھار دے سکتے تھے اور نہ ہی موت کے فرشتے کی کلائی مروڑ سکتے تھے۔

اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ فکر میں جینے کی کتنی آرزو تھی۔ زندگی سے کتنا پیار تھا انھیں ان کا جسم تو اتنا کمزور تھا کہ موت کے فرشتے کا ایک ہی وار ان کی سانس کے سلسلے کو روکنے کے لئے کافی تھا لیکن موت کے فرشتے کو کیا پتہ تھا کہ اس جسم میں ایک ادیب اور فنکار کی ایک طاقت ور (WILL POWER) بھی موجود ہے۔ لگاتار آٹھ دنوں تک وہ اپنے جسم کی طاقت کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے جینے کی اُمنگ کے ذریعہ موت سے بھرپور لڑائی لڑتے رہے۔ فکر تونسوی کی عادت تھی کہ ہر دس پندرہ منٹ بعد وہ اپنی گھڑی میں وقت دیکھ لیا کرتے تھے۔ ریٹائر منٹ کے بعد بھی جب اُن کے پاس وقت ہی وقت تھا ان کی عادت نہ گئی۔ وہ گھڑی کو اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں اوپر کی طرف نہیں بلکہ اندر کی طرف باندھتے تھے۔ اسی لئے ہاتھ کو اُلٹا کرکے گھڑی میں وقت دیکھ لیا کرتے تھے۔ آٹھ دنوں کی لگاتار بے ہوشی کے دوران میں ان کے جسم کے مختلف حصے ایک ایک کرکے اپنا کام بند کرتے چلے گئے لیکن ان کا بایاں ہاتھ غالباً ان کے جسم کا آخری عضو تھا جو مقررہ وقفہ کے ساتھ اُٹھ اُٹھ کر انھیں گھڑی دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، بلکہ ہاتھ میں گھڑی بھی نہیں تھی، لیکن ہاتھ پہلے تو خود بخود اُلٹ جاتا تھا اور پھر اُٹھ کر اُن کی آنکھوں تک جاتا تھا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو " فکر تونسوی! دیکھو تمہاری زندگی میں اب اتنا وقت بچا ہے۔ موت کے فرشتے سے جنگ کرو اور گنتی ختم ہونے تک موت کے چنگل سے نکل آؤ۔" آخری رات بھی جب موت کا سایہ پوری طرح ان پر پھیل چکا تھا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بڑی پابندی کے ساتھ اُٹھتے دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رات ان پر بھاری ہے میں نے اُن کے بیٹے پھول کمار کو تسلی دی اور چلا آیا۔ رات کے تین بجے جب میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے ریسیور اٹھا کر یہ نہیں پوچھا کہ کون بول رہا ہے اور کیا بولنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا " فکر بھائی کب گذر گئے؟"

دوسری طرف سے پھول کمار کی آواز آئی " آپ کے فکر بھائی رات ڈیڑھ بجے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے"۔

فکر تونسوی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ان کی کتنی یاد آرہی ہے ۔ مجھے یاد ہے آج سے لگ بھگ پچیس برس پہلے روزنامہ ملاپ' میں فکر تونسوی کا کالم "پیاز کے چھلکے" میں کچھ ایسی پابندی سے پڑھا کرتا تھا جیسے کوئی پابندی سے گیتا کا پاٹھ کرتا ہو۔ محض "پیاز کے چھلکے" کی خاطر میں ملاپ کی سالم کاپی یوں خریدا کرتا تھا جیسے کسی دوشیزہ کے گال پر خوشنما سیاہ تل کو دیکھ کر بعض نا عاقبت اندیش نوجوان سالم دوشیزہ سے محبت کرنے لگتے ہیں ۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپریل ۱۹۶۶ء میں ڈرتے ڈرتے پہلا خط لکھا تھا۔ سوچا تھا کہ فکر تونسوی اتنے بڑے ادیب ہیں' مجھ جیسے معمولی آدمی کے خط کا کیا جواب دیں گے ۔ مگر تیسرے ہی دن مجھے جب فکر تونسوی کا جواب مل گیا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ واقعی بڑے ادیب نہیں ہیں بلکہ مجھے شدید کوفت بھی ہوئی کہ آخر میں کیوں اتنے دنوں تک فکر تونسوی کو اتنا بڑا ادیب سمجھتا رہا۔ یہ تو بہت معمولی آدمی ہیں۔ اپنے ہر پرستار کے خط کا جواب دے دیتے ہیں۔ پھر ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔ (خط وہ لکھتے تھے "کتابت" میں کرتا تھا) یہ خط و کتابت بڑی حد تک "عشقیہ خط و کتابت" کی تعریف میں آتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ؎

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

اگست ۱۹۶۶ء میں مجھے دہلی آنے کا موقع ملا۔ جس دن دہلی پہنچا اس شام کو کناٹ پیلس کے "ٹی ہاؤس" میں یوں ہی چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ چائے پی رہا تھا کہ مجھے سامنے والی میز پر ایک ایسا شخص نظر آیا جو HUNCH BACK OF NOTREDAM سے بڑی مشابہت رکھتا تھا۔ میں دل ہی دل میں قدرت کی ستم ظریفی پر ہنستا رہا کہ وہ کیسی کیسی صورتیں بنا کر دنیا میں چھوڑ دیتی ہے ۔ ابھی میں اس شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ۔ پھر سوچا کہ HUNCH BACK OF NOTREDAM کو چونکہ میں پڑھ چکا ہوں، شائد اسی ناول میں اسے دیکھا ہو ۔ کبھی کبھی ادب بھی تو زندگی سے قریب ہو جاتا ہے ۔ میں دماغ پر زور دے ہی رہا تھا کہ مجھے کسی رسالے میں چھپی ہوئی فکر تونسوی کی تصویر اچانک یاد آگئی۔ اس شخص کا حلیہ فکر تونسوی کی تصویر کے حلیہ سے بہت ملتا جلتا تھا۔

جب مجھے گمان ہوا کہ یہ شخص بھی ہو سکتا ہے تو میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ بڑے ہی نرم لہجے میں پوچھا " کیا آپ فکر تونسوی ہیں ؟"

وہ شخص بڑے کرخت پنجابی لہجہ میں بولا " ہانجی "

پھر کیا تھا۔ میں اپنا تعارف کرائے بغیر ان سے بغل گیر ہوگیا۔ وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھتے رہے۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو فکر تونسوی نے کسی قدر شرماتے ہوئے پوچھا " آپ کی تریف ؟ " (فکر تونسوی اپنے لہجہ کے زیر اثر تعریف " تریف " ہی بولتے تھے)

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے کہا "اوہو، معاف کیجئے۔ میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ مجھے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں"۔

یہ سنتے ہی فکر تونسوی۔ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "پہلی بار تم بغلگیر ہوئے تھے، اب مجھے بغل گیر ہونے کا موقعہ دو۔ بغلگیری دو طرفہ ہونی چاہیئے یکطرفہ نہیں"۔

فکر تونسوی کئی باتوں کی وجہ سے میری کمزوری رہے ہیں۔ ادیب کی حیثیت سے میں انھیں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مضامین لکھتے تھے۔ ادب میں آج تک کسی نے اس طرح مضامین لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جس طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ہر گواہ یہ کہتا ہے کہ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔" اسی طرح فکر تونسوی اپنا ہر مضمون لکھنے سے پہلے اپنے آپ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے تھے اور اعلان کرتے تھے کہ "جو کچھ بھی لکھوں گا وہ سچ لکھوں گا اور سچ کے سوائے کچھ بھی نہیں لکھوں گا"۔ میں نے فکر تونسوی کے لاتعداد مضامین پڑھے ہیں اور ان مضامین میں مجھے ایک ہی چیز نظر آئی اور وہ ہے "سچ"۔

اس سیدھے سادھے اور عملی زندگی میں بڑی حد تک معصوم آدمی کو جب بھی دیکھتا تھا تو حیران رہ جاتا تھا کہ آخر اس شخص میں اتنا "STAMINA" کہاں سے آگیا کہ برسوں سے لکھ رہا ہے مگر پھر بھی "خرچ" ہونے میں نہیں آتا۔ اس شخص کی ذات میں آخر طنز کے کتنے سرچشمے ہیں جو اُبلتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی سوکھنے کا نام نہیں لیتے۔ جو ادیب روزانہ کالم نگاری کی اذیت سے دوچار ہو چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روزانہ کالم نگاری کتنا جان لیوا پیشہ ہے۔ اچھے اچھوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔

میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اُردو کے اس "طنز نگار" کے اندر ایک معصوم گنوار چھپا بیٹھا ہوا تھا۔ یہ گنوار انھیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفے پر اُکڑوں بٹھواتا تھا۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھواتا تھا۔ یہی گنوار انھیں چائے کی پیالیوں میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور تو اور یہی گنوار اُن سے ریفریجریٹر میں خود اپنی کتاب کے نسخے رکھواتا تھا۔ ایک دن میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ "بدنام کتاب" کے دو نسخے بڑی قابل رحم حالت میں وہاں پڑے تھے۔ میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لئے بولے "بھئی میں نے اصل میں پانی پینے کے لئے فریج کھولا تھا۔ شائد غلطی سے یہ نسخے وہاں رہ گئے، ایمان سے"۔ پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اُچھالتے ہوئے بولے "مگر یار! یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اُردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر ہی میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں"۔

میں پھر ہنسنے لگا تو بولے "دیکھ بیٹا! مجھے یہ فریج، یہ ٹی وی، یہ صوفہ سٹ، یہ قالین ایک آنکھ نہیں بھاتے، ایمان سے۔ میں تو بڑی مشکل کے ساتھ ان سے ایڈجسٹ کرتا ہوں۔ یہ پھول کمار نہ جانے گھر میں کیا کیا

لاکر بھرتا چلا جارہا ہے ؟

فکر تونسوی نے یہ بات کچھ اس معصومیت سے کہی کہ میں اپنے سارے وجود میں مٹی کی سوندھی سوندھی محسوس کرنے لگا۔ مجھے اپنے بچپن اور نوجوانی کے وہ دن یاد آگئے جو کھیتوں کے درمیان گذرے تھے۔ تازہ فصلوں کی مہک، ہرے بھرے کھیتوں کی دوشیزگی، مویشیوں کی آوازیں سب کچھ ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے فکر تونسوی کے اندر چھپا ہوا گنوار میرے اندر چھپے ہوئے گنوار کو آنکھ مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ ٹی۔ سیٹوں، ریفریجریٹروں، گیزروں، ایرکنڈیشنروں، صوفہ سیٹوں اور نیون سائن لائٹوں کے نیچے دبے ہوئے گنوار جاگ پڑتے ہیں تو کتنے معصوم اور قابل محبت نظر آتے ہیں۔

ایک بار مجھے اور فکر تونسوی کو ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ ریل کا ریزرویشن نہیں مل رہا تھا۔ میں نے بڑی بھاگ دوڑ کی اور جان پہچان کے ایک کلرک کو دس روپے فی برتھ رشوت دے کر ریزرویشن کروایا۔ میں نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا تو دوسرے دن "پیاز کے چھلکے" میں اس کلرک کے خلاف ایک لمبا چوڑا کالم لکھ مارا۔ کلرک دوسرے دن بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "غضب ہوگیا۔ آپ کے فکر صاحب نے میرے خلاف کالم لکھ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی مدد کی تھی۔ آپ نے خوب صلہ دیا۔"

کالم پڑھ کر مجھے بھی غصہ آیا۔ اسی حالت میں ان کے پاس پہنچا۔ جب سارا ماجرا کہہ سنایا تو بڑے نادم ہوئے، کہنے لگے۔ "بھول ہوگئی۔ آج کا کالم تو جا چکا ہے، پرسوں کا کالم اس کلرک کی حمایت میں لکھوں گا۔" میں نے کلرک کو اطلاع دی کہ "اب اگلا کالم تمہاری حمایت میں آئے گا۔ تم فکر مت کرو۔"

دوسرے ہی دن کلرک نے مجھے فون کرکے کہا "فکر صاحب سے کہیں کہ وہ اب میری حمایت میں کالم نہ لکھیں۔ کیونکہ ہمارے ڈپارٹمنٹ نے اب تک ان کے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ اب خواہ مخواہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے کیا حاصل۔"

کلرک کی بات معقول تھی۔ میں پھر فکر تونسوی کے پاس گیا اور بولا "حضرت اب آپ کالم نہ لکھیں کیونکہ پہلے کالم کا ڈپارٹمنٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ معاملہ دب گیا ہے۔ اب آپ اس مسئلہ کو پھر کیوں چھیڑتے ہیں۔" یہ سنتے ہی حضرت آگ بگولہ ہوگئے، بولے "کیا کہا ڈپارٹمنٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ یہ تو میری توہین ہے۔ میں اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ میں کل ہی اس ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھوں گا کہ وہ شکایتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔"

وہ تو ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھنے پر تلے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے انھیں نتائج و عواقب سے آگاہ کیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ان نتائج و عواقب سے اس بے چارے کلرک کی قسمت کس طرح وابستہ ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی سمجھ میں بات آئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، ورنہ بے چارے کلرک کا نہ جانے کیا بنتا۔

اسی حیدرآباد والے سفر کی بات ہے۔ ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے اور فکر صاحب کا بیا

ں بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔ اسی لئے ڈبے میں سوار ہوتے ہی انھوں نے ڈبہ کی ایک
شئے کو چھو کر دیکھنا شروع کیا تاکہ پتہ چلے کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ کیسا ہوتا ہے۔ ابھی وہ ڈبے کا جائزہ لے ہی
تھے کہ دو فوجی عہدیدار جنھیں ہمارے کیبن میں جگہ ملی تھی داخل ہو گئے۔ حضرت نے دبی زبان میں مجھ سے کہا۔
یہ تو بہت بُرا ہوا، کیا یہ حیدرآباد تک ہم پر پہرہ دیتے رہیں گے؟"
میں نے کہا "لگتا تو ایسا ہی ہے"
کچھ دیر تک حضرت سہمے رہے اور کہا "معاف کیجئے" پھر کھلکھلاتے ہوئے فوجی عہدیداروں سے بولے۔
پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا ہوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"
وہ بولے "نہیں ہے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"
پھر حضرت خود ہی بولے: "میں فکر تونسوی ہوں، اُردو طنز و مزاح کا بریگیڈیر ہوں۔ اور یہ ہیں مجتبیٰ حسین،
طنز و مزاح کے فیلڈ مارشل"
فوجی عہدیداروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اب جو حضرت نے اس قہقہہ کو پکڑ کر ان دونوں کے
لے اُتارنے شروع کئے تو میں گھبرا گیا کہ کہیں یہ فکر تونسوی کے خلاف سنگینیں تان کر نہ کھڑے ہو جائیں۔ عجیب
ب سوالات اُن سے پوچھتے رہے۔ پوچھا "محاذِ جنگ پر اگر آپ شکست کھا جائیں اور آپ کو مورچہ چھوڑ کر
گنا پڑے تو کیا آپ جوتوں سمیت بھاگتے ہیں یا آپ کو جوتے اُتارنے پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں فوجی قانون
ہے؟"
اب بےچارے فوجی عہدیدار اس کا کیا جواب دیتے۔ نظر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ فکر تونسوی نے پے بہ پے
پر حملے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ آدھے سفر کے بعد دونوں تقریباً پسپا ہو گئے اور اپنی اپنی وردیوں سے
نکل گئے۔ حیدرآباد تک فکر تونسوی انھیں اس طرح تنگ کرتے رہے کہ لگتا تھا یہ دونوں عہدیدار نہیں
Prisoners of War ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکندرآباد کے اسٹیشن پر یہ دونوں عہدیدار ہم
ے نظریں بچا کر چھپتے چھپاتے اپنا سامان لے کر بھاگنے لگے تو حضرت نے پکار کر کہا۔ "اب بھاگے جا رہے ہو تو
ر بھاگنا مگر محاذِ جنگ پر خدا کے لئے ہرگز نہ بھاگنا، یہ میری وصیت ہے، سمجھے، ایمان سے"
میں نے بعد میں حضرت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ "یہ کیا آپ خطرناک مذاق کرتے ہیں۔ فوجی عہدیدار ہیں،
گولی چلا دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے"
بولے "یار، یہ [illegible] ٹھیک ڈھنگ سے گولی نہیں چلا سکتے، دوست پر کیا گولی چلائیں گے۔
بات کہ میں نے انھیں کیوں چھیڑا، تو بیٹا جواباً عرض ہے کہ فکر ہمیشہ اپنے سے طاقتور آدمی سے لینی چاہیئے
ر یہ بات بھی دھیان میں رکھو کہ تلوار اور قلم کی جنگ میں ہمیشہ فتح قلم کی ہوتی ہے" یہ کہہ کر حضرت نے سینہ
ں تان لیا جیسے وہ محاذِ جنگ سے فتح یاب ہو کر واپس ہوئے ہوں۔

ان کی ایک اور کمزوری لاہور تھی جسے وہ پیار سے "لہور" کہتے تھے۔ بات کسی بھی شہر کی چلے وہ اسے لاہور پر ہی لے جاکر ختم کرتے تھے۔

فکر تونسوی کی کس کس بات کو یاد کروں اور کتنا یاد کروں۔ لکھنے بیٹھوں تو دفتر کے دفتر لکھے جائیں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جلسوں، جلوسوں سے وہ بہت دور بھاگتے تھے مگر میری خاطر ہر جگہ چلنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ حیدرآباد، بمبئی، پٹنہ، چنڈی گڑھ اور نہ جانے کہاں کہاں انھیں زبردستی لے گیا۔ وہ اپنے گھر کا ہی ایک فرد تصور کرتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ لہٰذا ہم لوگ اکثر ان کے گھر پر جمع ہو جاتے تھے۔ دوست احباب بالخصوص دیوان بریندر ناتھ، بلراج کومل، دلیپ سنگھ، تارا سنگھ کامل، جوگیندر پال، اور کرشن لال ساقی، نارنگ ان کے گھر پر اکٹھے ہو جاتے تھے تو بہت خوش ہوتے تھے۔

آخری دنوں میں فکر کو اپنے بیٹے پھول کمار کی بہت فکر لگی رہتی تھی جو کنارا بنک میں کام کرتے ہیں اور جن کا تبادلہ پچھلے برس کرناٹک کے ایک چھوٹے سے مقام دھارواڑ پر ہو گیا تھا۔ گھر پر اُن کی دیکھ بھال کے لئے کوئی مرد رکن خاندان نہیں رہ گیا تھا۔ ہمیشہ فکروں میں کھوئے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود لکھنے پڑھنے سے کبھی غافل نہیں رہے۔ فکر نے آخری وقت تک لکھا اور بہت بھرپور ڈھنگ سے لکھا۔ فکر جیسا توانا اور بھرپور ادیب اُردو کو اور اُن جیسا طرح دار دوست ہم جیسوں کو اب شائد پھر کبھی نصیب ہو۔ ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔

نامور مزاح نگار مُجتبیٰ حُسین کے مجموعے

قصہ مختصر -/۱۲ روپے　آدمی نامہ -/۱۲ روپے　بالآخر -/۱۴ روپے

تکلف برطرف -/۱۴ روپے　قطع کلام -/۱۲ روپے　جاپان چلو -/۱۴ روپے (سفرنامہ)

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے

شفیقہ فرحت
(بھوپال)

غیر مستقل، مستقل کالم

چلتے چلاتے

لیجئے چلتے چلاتے فکر تونسوی اتنی دور نکل گئے کہ واپسی ممکن نہیں۔ وہ بڑی پابندی سے صبح کی سیر کیا کرتے تھے اور صبح کے وقت ہی اپنی روانگی ڈالی۔ غالباً سیر کا ارادہ ہوگا، عالم بالا کی۔

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضاء اور سہی،
کہ ملک خدا تنگ محسوس ہو رہا ہوگا۔

لیکن انہیں جانے کی ایسی کیا جلدی تھی۔ ہمیں تو یہ کچھ صحافیوں کی سازش معلوم ہوتی ہے۔ فالان ہینڈ — "اپر ہینڈ" (Upper hand)۔

خواجہ احمد عباس پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اور جاتے جاتے اپنے ساتھ "پیام تعلیم" کے ولی شاہجہان پوری کو بھی لیتے گئے۔ خواجہ نے ساری عمر بلٹز کا آخری صفحہ لکھا۔ (کس چیز کی کمی تھی خواجہ ترس گئی ہیں)۔ 'بلٹز' اب بھی نکلتا ہے۔ لیکن آخری صفحہ آخری نہیں رہا۔ پہلا بھی نہیں ہوا۔ بس ایک عام سا صفحہ بن گیا۔ یعنی اپنی پہچان کھو بیٹھا۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سب سے بڑا مسئلہ پہچان کا ہے اور پھر جان پہچان کا۔

خواجہ احمد عباس نے دنیا میں جان پہچان کے سلسلے میں کوئی دھاندلی کی ہو یا نہ کی ہو، مگر انتقال کے بعد "اپنے والوں" کو ہٹ لسٹ میں شامل کروالیا۔

فکر تونسوی ساری عمر "پیاز کے چھلکے" اتارتے رہے۔ شائد اسی لئے پیاز سب کی نظروں میں چڑھ گئی تھی۔ گراں قدر، گراں قیمت —! بازی گران ملک وملت نے سوچا ہوگا۔ بڑھاؤ قیمت۔ نا بازار میں ملے گی پیاز، نہ اتریں گے چھلکے۔ مگر دیگر تمام اسکیموں کی طرح یہ اسکیم بھی فیل ہوگئی۔

خیر —! اب یہ تینوں مل کر وہاں اخبار نکالیں گے۔ شائد اس میں کوئی نیا پن ہو۔ ورنہ دنیا کے ہر تازہ اخبار کی تازہ خبر، روز اول کی طرح باسی لگتی ہے۔

تو ذکر ہو رہا تھا فکر تونسوی کی چال کا کہ جو وہ چل گئے اور سب کو مات دے گئے۔ یہیں دلی کے گل مہر پارک کی کشادہ سڑکوں پر ہی چلتے رہتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ جانا کہ یہ سڑکیں بھی اب اتفاقات زمانہ کے ہاتھوں چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہیں۔ مگر اتنا اونچا اڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ ستر میں

پچپن سال تو اپنا رشتہ زمین سے جوڑے رکھا۔ اور ایک جھٹکے سے سارے رشتے ناطے توڑ اجنبی بن گئے۔
کیا انہیں شادیٔ مرگ ہوگیا تھا، اس خبر پر کہ اردو کے ایک ادیب کا سیریل ٹی۔ وی کے لئے منظور ہوگیا۔
اور وہ خوش نصیب ادیب اتفاق سے وہ خود ہی تھے۔

جی ہاں "فکر نے کہا" کے عنوان سے فکر تونسوی کا پہلا Episode بروز منگل بتاریخ ۸ ر ستمبر
بوقت صبح ۵۰-۷ پر پیش ہوا تھا اور چوتھے دن فکر رخصت۔!

فکر صاحب۔ اپنا نہیں تو بقیہ نسل کا خیال کیا ہوتا۔ دشمنِ جاں و زباں یہی کہیں گے کہ اُردو والے تو
بس ایک پھونک کے ہیں۔ ایک episode پر جان نثار کر دیتے ہیں۔ (یا ایک ایک episode
پر جان دیتے ہیں —!) لہذا بچے کھچے پچیس پچاس کو تو یوں نپٹایا جا سکتا ہے۔

مگر فکر اتنے کم ظرف نہ تھے۔ سب کچھ تو جھیل گئے۔
انعام۔ اکرام۔ اعزاز۔ مدارتیں۔ صدارتیں۔ جلسے جلوس۔ جشن۔ بھلا اس ٹی۔ وی سیریل کی کیا بساط، کیا
مجال کہ انہیں لرزا دے۔ وہ تو ہندی اُردو ایکتا کے مارے ہوئے ہیں۔ ہندی کی مُہان کویتری، مہا دیوی ورما
رات کو سدھاریں۔ کئی گھنٹے فکر نے انتظار کیا کہ اُردو دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کوئی تو اپنی خدمات پیش کرے
مگر سورج نکل آیا اور کوئی مرد افگن طلوع نہ ہوا اور ایکتا کی شان اور اُردو کی آن پر بٹہ لگنے لگا۔ تو خود بڑھ کے
جامِ شہادت نوش کرلیا۔

کہ مہا دیوی کی ٹکر کا اور تھا بھی کون —؟
اور راویانِ چشم دید کی اطلاع یہی ہے کہ گئے وہ چلتے چلاتے۔ یعنی زینہ اُترتے۔

-٭- -٭- -٭-

نامور مزاح نگار نریندر لوتھر کے انشائیوں کا تازہ مجموعہ

اَلف تماشا

صفحات : ۱۷۴
قیمت : ۱۶ روپیے

مطبوعہ :- زندہ دلان حیدرآباد

جاوید حیات (پٹنہ)

★

فکر تونسوی کے مختلف مضامین سے چند جملے چُرا کر یہ مضمون تیار کیا گیا ہے ـــــ

آہ! فکر تونسوی

"بالآخر ہندوستان کے (بزعم خود مشہور و معروف) ادیب جناب فکر تونسوی راہیٔ ملک عدم ہو گئے ...
مرحوم اس سے پہلے بھی ایک بار فوت ہوئے تھے ... مگر اس مرتبہ حقیقتاً انتقال کر گئے ہیں اور ان
کی موت کی تصدیق بڑے بڑے اہل الرائے اور ثقہ حضرات نے کی ہے"۔
اس دفعہ بھی ہوا یہ کہ اہل الرائے حضرات نے اس کی تصدیق تو ضرور کر دی لیکن وہ "عالم بالا پر" جا کر لوٹ آئے اور "خدا کی
جنت" کی سیر کرنے کے بعد اُن کی "قبر سے واپسی" ہو گئی اور انھوں نے یہ لکھ کر اعلان کر دیا کہ "میرا پنر جنم" ہو گیا لیکن اب
تو ریڈیو اور ٹی وی نے بھی تصدیق کر دی۔ "واقعی فکر کا انتقال ہو گیا" "جنم سے پنر جنم تک" کا سفر طے کرنے کے بعد ۱۲؍
ستمبر ۱۹۸۷ء کو اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ غالب نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ؛ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

"اور آج جب کہ مرحوم اس دنیا سے اُٹھ گئے ہیں ان کے کارہائے نمایاں کی دوبارہ قدر و منزلت کرنا ضروری ہے۔
چنانچہ تعزیتی پیغامات کے بعد "طنز نگار فکر تونسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ" منعقد کیا گیا۔
"دوستو مقام تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تونسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے۔
وہ ہمارے طنزیہ ادب کو سونا کر کے چلا گیا"۔
ایک اور صاحب اُٹھے۔ ان کے کارہائے نمایاں کی قدر و منزلت کرنا ان کے لیے ضروری جو تھا کہنے لگے۔
"میں ... میں ... میں ساہتیہ اکیڈمی سے پوچھتا ہوں کہ مرحوم کو ادبی ایوارڈ کا مستحق کیوں نہیں
سمجھا گیا تھا؟ اور اگر زندگی میں نہیں سمجھا گیا تو کم از کم موت کے بعد ہی انہیں ایوارڈ دے دیا جائے"۔
اور پھر تقریروں کا جو لمبا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیا ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تونسوی
کو قریب سے جانتا ہے"۔ ایک نے کہا۔
"مرحوم چند ایک اوصاف حمیدہ کے مالک تھے اور چند ایک اوصاف حمیدہ کے مالک نہیں تھے
اس لیے بڑے متوازن انسان تھے"۔

دوسرا کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔

"مرحوم اچھے خاصے انسانیت پرست تھے ہر وقت انسانیت کی بربادی کا خطرہ لاحق رہتا جتنی دیر بہبودی آدم کے غم میں بیٹھے اور اگر عرضِ خضر بھی مل جاتی تو بھی بہبودیٔ آدم کرتے رہتے۔"

تیسرا بھلا کیوں خاموش رہتا اُسے تو خاص طور پر اظہارِ غم کے لیے T.A دے کر بلایا گیا تھا اس نے تقریر شروع کی

"مرحوم ضلع تونسہ ملک پنجاب میں پیدا ہوئے تھے مگر مرے دہلی میں موت کے وقت بریلی میں ہوتے تو بریلی میں مرتے جوانا مرگ نہیں تھے اور خوشی کا مقام ہے کہ وہ اپنی عمر سے نسبتاً زیادہ ہی جی کر مرے۔"

"مرحوم کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا بڑا شوق تھا اور یہی شوق انہیں لے ڈوبا۔"

"بہرکیف انہوں نے زندگی بھر بنی نوعِ انسان کی خاطر کام کیا مثلاً نظموں کی ایک کتاب قلم بندکی مگر اس میں بہبودیٔ آدم کچھ زیادہ گہری ہوگئی کہ کسی آدم کے سمجھ میں نہ آسکی۔ . . . . . "

"اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھُسر پھُسر کرنے لگے ایک نے کہا "خوامخواہ بکواس کر رہا ہے"۔ دوسرا بولا۔ "میں نے سُنا ہے کہ فکر تونسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا"۔ اسی بیچ پچھلی بینچ سے آواز آئی "بات دراصل یہ ہے کہ جنازہ کے وقت ہی تمام دشمنوں نے اعلان کر دیا آج سے دشمنی ختم اور اب ہمیں مرحوم سے کوئی گِلا نہیں رہا" بہر حال سارے ماحول پر اُداسی اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے سیاہ پردے کے سامنے مائیک پر کوئی کہہ رہا تھا

"مرحوم اچھے خاصے انسانیت پرست تھے"

"انسانیت کو بلند کرنے کے سلسلے میں انہوں نے آدھ درجن طنزیہ کتابیں لکھ ڈالیں جو سب کی سب مقبولِ عام و خاص ہوئیں اگرچہ ان کے پبلیشروں کو یہ شکایت رہی کہ ان کی کتابیں بکتی ہی نہیں جاسوسی ناول زیادہ بکتے ہیں ایک بار انہوں نے جاسوسی ناول بھی لکھا دہ بھی . . . . . "

. . . . . . اعلیٰ پایہ کی ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے ایک نہایت گھٹیا بازاری عشق سے بھرپور ناول بھی لکھا جو گاجروں کی طرح خوب خوب بکا . . . . . "

جذبات سے داد کی تالیاں بجائی گئیں اور پھر کوئی ان کے کارناموں کو یوں یاد دلانے لگا۔

"مرحوم کی زندگی کا آغاز بے وقوفیوں سے ہوا اس لیے والدین کی مالی حالت پر رحم کھا کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور ایک انگریز کے یہاں پگڑیاں اور دوپٹے رنگنے کا کام کرنے لگے . . . . . .

. . . . مرحوم نے رنگ ریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے۔ رنگ ریزی، کمپوزیٹری، کلرکی، اسکول ماسٹری، پینٹری، دکانداری، چپراسی گیری اور جب کہیں کامیاب نہ ہوسکے تو . . . . . ادیبوں کی کئی انجمنیں قائم کیں جو آپس میں لڑ جھگڑ کر ختم ہوگئیں دو ہفتہ وار اخبارات اور چار ادبی ماہنامے جاری کئے جو بنی نوعِ انسان کی عدم توجہی کے باعث یکے بعد دیگرے بند ہوگئے۔ . . . .

. . . اور اب یہ دنیا کا فرض ہے کہ . . . جس عظیم کام کو مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں اسے پورا کرے . . . . "

ماتم گُسار احباب نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں "ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار ہوتا ہے" بہرکیف تالیوں کی گونج کے درمیان یہ تجویز پاس کی گئی۔

"آج جب کہ مرحوم دنیا سے اُٹھ گئے ہیں اُن کے کارہائے نمایاں کی دوبارہ قدر و منزلت کرنا ضروری ہے چنانچہ اس کے لیے "فکر تونسوی میموریل کمیٹی" کے قیام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ جس کا فرض ہوگا کہ اُن کی خوبیوں کو یتیموں کی طرح پالے پوسے۔"

دوسری تجویز یہ پاس کی گئی کہ "مرحوم کا میموریل ہال بنایا جائے۔" یہ کام بھلا بغیر پیسے کے کیسے پورا اور ممکن ہے۔ اور پھر مرحوم کے ذریعہ ادھورے چھوڑے گئے کام کو پورا کرنے کے لیے بھی تو پیسے کی ضرورت پڑے گی جس کے لیے "فکر تونسوی میموریل کمیٹی" قائم کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کارِ خیر کے لیے چندے کی اپیل کی گئی۔

"ایک والیٔ شہر نے برسرِ جلسہ اعلان کیا کہ انہوں نے ایک فرم سے ڈیڑھ سو روپے لینا ہے وہ وصول کرکے میرے چندے میں شمار کیا جائے۔ ایک پبلشر نے وعدہ کیا کہ انہوں نے مرحوم پر جو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ کر رکھا ہے اسے واپس لیتے ہیں اور اس واپسی کو ہی ان کا امدادی نذر تصور کیا جائے۔"

"تالیاں بجائی گئیں اور پبلشر کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔"

[فکر تونسوی کی روح سے معذرت کے ساتھ]

دولھن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند دوپٹے!

دولھن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے۔ ایچ۔ زری والا کا ہوگا!

اس کے علاوہ ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک:۔

* بنارسی سلک ساڑیاں * تنچوی * ساٹن * جارجیٹ * آرگنزا * ٹشو * شفان * پٹولہ * بروکیڈ * دھرماورم * کانجی ورم * پوچم پلی * نارائن پیٹ * میسور کریپ * ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل

★ خصوصی کائی نوٹ:۔ میاچنگ کے بلوز * دوپٹہ * کُرتے اور فالس۔

ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے ایچ زری والا

فون: 525232 لاڈ بازار حیدرآباد ۲ کیبل: "زری والا"

رشید الدین

احمد جمال پاشا مرحوم

صبح کی معمول کی چہل قدمی کے بعد ۲۸ ستمبر ۸۷ء کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ پہلے ہی صفحہ پر ایک مختصر سی خبر پر نظریں گردش کیں لکھا تھا "ممتاز طنز و مزاح نگار احمد پاشا کا انتقال" تادیر افسوس ہوتا رہا۔ پھر ذرا طبیعت میں یکسوئی پیدا ہوئی تو جیسے یادوں کے دریچے کھل گئے اور ۳۰ سال پہلے کا وقت آنکھوں کے سامنے آگیا۔ سن غالباً ۱۹۵۵ء کا ہوگا۔ میں نے کالج میں نیا نیا داخلہ لیا تھا ایک دن اورنگ آباد کالج کی لائبریری میں بیٹھا نئے رسالے دیکھ رہا تھا کہ ماہنامہ "شاہراہ" (دہلی) کا تازہ شمارہ دیکھ کر طبیعت کھل اٹھی۔ اُس زمانے میں اُسے ظ۔ انصاری ایڈٹ کر رہے تھے اور اس کا ہر شمارہ بہت باغ و بہار ہوتا تھا۔ وہ نئے نئے شاعروں اور ادیبوں کو متعارف کرواتے تھے۔ ترقی پسندی کا شہرہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور یہ رسالہ اسی تحریک کا ترجمان تھا جس سے ماضی میں ساحر لدھیانوی، فکر تونسوی اور پرکاش پنڈت جیسے ترقی پسند وابستہ رہ چکے تھے۔

"شاہراہ" کے اُس شمارہ میں بھی ظ۔ انصاری نے دو نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا تھا۔ ایک تھے مزاح نگار احمد جمال پاشا اور دوسرے تھے افسانہ نگار اقبال مجید۔ وہ نئے لکھنے والوں کے بارے میں ایک بڑا اچھا تعارفی نوٹ دیتے تھے۔ بعد میں ان دونوں فنکاروں نے اُردو ادب میں کافی نام پیدا کیا۔ آج ان میں سے پہلا نام میرے پیش نظر ہے جس کے بارے میں ذہن تیزی سے گردش کر رہا ہے کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ خدا دوسرے کو تادیر ہمارے درمیان رکھے۔

اس شمارہ میں احمد جمال پاشاہ کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ تھا "یونیورسٹی کے لڑکے"۔ پہلا ہی جملہ اتنا شاندار تھا کہ آج تک ذہن میں محفوظ ہے:

> "صاحب، لڑکوں کی اِن دنوں بھرمار ہے۔ گھر اندر لڑکے گھر باہر لڑکے پاس پڑوس میں، لڑکے دیس بدیس میں، لڑکے اور، یونیورسٹی کا کیا کہنا یہاں تو لڑکے اس طرح ڈھالے جاتے ہیں جیسے ٹکسال میں سکّے۔"

ایم اے کرنے کے بعد بھی انھوں نے لکھنا جاری رکھا۔ ان کی اُردو میں کافی پذیرائی بھی ہوئی یوں بھی اس زمانے میں طنز و مزاح لکھنے والوں کا قحط الرجال تھا۔ اپنے پہلے ہی مضمون سے احمد جمال پاشا اردو کے جو ممتاز طنز و مزاح نگار بنے تو مرتے دم تک بنے رہے اب تک ان کی کوئی ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بعض تحقیقی اور سنجیدہ بھی تھیں۔ پیروڈی ان کا خاص میدان تھا اور اس میں اُنھوں نے بہت کام کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے لکھنؤ سے اپنا ذاتی پرچہ جاری کیا۔ نام تھا "اودھ پنچ"۔ دراصل یہ وہی مشہور رسالہ تھا جسے منشی سجاد حسین نے اردو میں پہلی بار جاری کیا تھا اور جس میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ احمد جمال پاشاہ نے جب اپنے رسالہ کے لیے یہ نام لیا تو یہ اس رسالہ کا تیسرا دور تھا۔ دو بار یہ پرچہ بند ہو چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا "جاری شدہ ۱۸۷۸ء اشاعت کا تیسرا دور، اردو کا اکلوتا، قدیم تاریخی ضدی، علمی، ادبی بلند پایہ طنزیہ مزاحیہ ماہنامہ"

لیکن یہ رسالہ اپنے تیسرے دور میں بھی چار پانچ سال سے زیادہ نہیں نکل سکا اور بند ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ ایک خالص مزاحیہ رسالہ تھا اور ہر ماہ اسے ڈھیر سارا مزاحیہ مواد ملنا مشکل ہو رہا تھا۔ مصطفےٰ کمال صاحب کے پاس پتہ نہیں کونسا اسم اعظم ہے کہ مسلسل ۲۰ سال "شگوفہ" بلا ناغہ نکل رہا ہے۔

اس اثناء میں میں نے بھی مزاح نگاری شروع کر دی تھی اسلیے احمد جمال پاشا سے دوستی ہونا یقینی تھا۔ اب میں ان کا فین نہیں بلکہ کنٹری بیوٹر اور ہم عصر تھا اور وہ ایک ادیب اور ایڈیٹر ہی نہیں تھے بلکہ میرے دوست بھی تھے۔ نیا نیا شوق تھا اس لیے میں انھیں مضمون کے ساتھ طول طویل خط لکھا کرتا تھا جسے وہ بے حد پسند کرتے۔ ایک بار لکھا "آپ کے خطوط آپ کے مضامین سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔"

"اودھ پنچ" بند کرنے کے بعد وہ روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں ملازم ہو گئے تھے لیکن وہاں بھی ادب کا چسکا نہیں گیا۔ روزآنہ اس اخبار کا مزاحیہ کالم "گلوریاں" لکھا کرتے تھے۔ صحافت سے طبیعت اوب گئی تو اردو کے لکچرر بن گئے اور سیوان (بہار) جا بسایا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی اہلیہ بھی سرور جمال کے نام سے مزاحیہ مضامین لکھتی ہیں۔ احمد جمال پاشا میں بیک وقت کئی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ اردو کے اُستاد تھے۔ ادیب اور محقق تھے صحافی تھے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

زندہ دلان حیدرآباد کی تازہ پیشکش!
ممتاز انشائیہ نگار ڈاکٹر رشید موسوی
کے بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ!

کاغذی ہے پیرہن

★ خوبصورت دو رنگی ڈسٹ کور۔

★ صفحات (۱۴۰) ڈیمائی ★ قیمت: (۲۰) روپے

نیاز سواتی (پاکستان)

نمکین غزلیات

(۱)

کبھی تولہ، کبھی ماشہ سُسر یُوں بھی ہے اور یوں بھی
اسامی دشمنی، بنیادِ شر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

کسی کو آدھا مرا کرتی، کسی کی جان لیتی ہے
دوا ہر ایک اس کی بے اثر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

کھلا رکھ سکتا ہوں اس کو نہ اس کو ڈھانپ سکتا ہوں
بلا ہے جاں مرا گنجا یہ سر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

ملائک سے کبھی بڑھ کر، کبھی شیطان سے آگے
ہر اک حالت میں لاثانی بشر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ قد اور کاٹھا اچھا ہے نہ اس کی عادتیں اچھی
وہ بونا ہر طرح سے مختصر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ ہم میں دوغلہ پن ہے نہ ہم میں جھوٹ کی عادت
مخالف اس لیے سارا نگر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ اس پر بال اُگتے ہیں نہ یہ خشکی سے خالی ہے
سراپا کھیل کا میداں یہ سر۔ یوں بھی ہے اور یوں بھی

کبھی کرتا ہے غم خواری، کبھی کرتا ہے بمباری
ہمارے باس کی ہم پر نظر یوں بھی ہے اور یوں بھی
BOSS

(۲)

کھا کے رشوت آپ کو بیمار ہونا تھا، ہو گئے
مشکلوں سے لازماً دو چار ہونا تھا ہو گئے

اُن کو دفتر کے لیے تیار ہونا تھا ہو گئے
نیند سے بارہ بجے بیدار ہونا تھا ہو گئے

لکھنے پڑھنے سے ہمیں کوئی بھی دلچسپی نہیں
ہم کو بس لیسے دے کے ٹھیکیدار ہونا تھا ہو گئے

ساتھ مدت تک نہیں دیتا کبھی مالِ حرام
سیٹھ جی کو ایک دن نادار ہونا تھا ہو گئے

سب جہاں نسوار چی تھے اس جگہ رہتے تھے ہم
ہم کو آخر عادی نسوار ہونا تھا ہو گئے

جو مکاں ٹھیکے پہ ٹھیکیدار سے بنوائے تھے
اک مہینے میں انہیں مسمار ہونا تھا ہو گئے

صبح سے تا شام گو سنتے رہے میرا کلام
شعر سن کر سینکڑوں بیزار ہونا تھا ہو گئے

خیر کب تک مانگتے بکروں کے باپ اور ماں نیاز
ذبح اک دن اُن کو آخر کار ہونا تھا ہو گئے

بانو سرتاج

بارے مُسافر کا کچھ بیاں ہو جائے

سفر نامے آپ نے پڑھے ہوں گے۔ سفر کی روداد یں بھی آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ ان کا مرکزی کردار 'مُسافر' بھی کوئی شئے ہوتی ہے۔ عجیب ہی نہیں عجیب تر۔ کچھ تو نادر الوجود، محیّر العقول وغیرہ وغیرہ۔ بارے ایسے ہی ایک مسافر کا یہاں کچھ بیان ہو جائے۔

یہاں مُسافر سے مُراد کوئی فرد عمومی نہیں بلکہ بیان ہے ایک خاص الخاص شخصیت کا، جس نے مُسافر تخلص اپنا رکھا ہے۔ چونکہ جدت پسند واقع ہوئے ہیں اس لیے ایک زائد نام (جو ادھر کے ہاٹ میں المعروف بہ سر نیم ہے) بھی تخلص کے ساتھ ٹانکے پھرتے ہیں۔ یعنی حتمی طور پر اب وہ مسافر سیر گاؤں کر کے نام سے معروف و نامقبول ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ بتلاتی ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل شمالی ہندوستان میں دراوڑ قوم آباد تھی آریوں نے انھیں اُن علاقوں سے بے دخل کر کے جنوب کی طرف بڑھا دیا۔ دراوڑ اس وقت تو اس حملہ سے ہراساں ہو کر پس قدمی پر آمادہ ہو گئے لیکن بعد میں ہر دور میں اپنے زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیتے آئے ہیں۔ مُسافر سیر گاؤں کر روزانہ بلاناغہ گھنٹوں بیٹھ کر جو ہمیں بور کرتے ہیں تو غالباً محلے والوں کی بے اعتنائی کا بدلہ لیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہماری اس محلے میں آمد سے قبل مُسافر نہ صرف اس محلّے کے بلکہ آس پاس کے چار چھ میونسپلٹی وارڈوں کے حدود میں خاصے مشہور واحد ادیب تھے۔ گو ان کی تخلیقات کبھی کسی رسالے کی زینت نہیں بنی تھیں مگر اپنے ذاتی صرفے سے چھپائی گئیں اور محلہ والوں میں مُفت تقسیم کی گئیں کی کتابوں بلکہ کتابچوں اور مخطوطوں کے وہ بیک مصنّف، خطّاط، ناشر، تقسیم کار وغیرہ قرار پائے تھے۔ ان کی کتابوں میں "رابطہ" اور ملنے کا پتہ جیسی فضولیات نہیں رہتی تھیں کہ اُمید وار اور خواہشمند کو عموماً وہ خود ہی دے دیا کرتے تھے اور اس طرح کتابوں کی جلدوں کی نکاسی عمل میں آتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح کہیں کوئی مندر

خستہ حالت میں پایا جائے یا مورتیوں کی حالتِ زار پر نظر پڑنے پر آسانی اسے مسلمان حکمرانوں کی حرکت قرار دے دی جاتی ہے (اسے تاریخی تحقیق کہا جاتا ہے) اسی طرح کسی کتاب کا ذکر نکلا کہ مہابور ہے، بکواس ہے، خوشگوار ذریعۂ تضیع اوقات ہے تو ایک خلقِ خدا شاہد ہے کہ لوگ فوراً کہہ اُٹھتے کہ مسافر کی مصنفہ ہوگی کچھ منچلوں کو اکثر کہتے ہوئے سُنا گیا کہ اگر کچھ بور ہے، بکواس ہے، اور زشت بھی ہے تو ہمیں است ہمیں است ہمیں است ہمیں است'

مُسافر کی نظریں محلّے والوں کا، انھیں بطور ادیب دوسرا درجہ دے دینا ایسا ہی فعل تھا جیسے آریوں کا دراوڑوں کو اُن کے حقوق سے بے دخل کر دینا۔ ابتدا میں وہ ان لوگوں کو احسان فراموش (پتہ نہیں کون کون سے احسان انہوں نے فرمائے تھے) موقع شناس کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے رہے پھر اچانک یا انتقاماً ہمارے گھر پہنچ کر ہمیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ وہ بھی جیّد فاضل، مجتہد العصر اور تاریخ ساز شخصیتوں میں شامل ہے کہ سربرآوردہ اور ممتاز ادیب ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے کہنے پر کہ سب کچھ تسلیم لیکن شاید آپ کو زمانہ ساز کہنا بھی مقصود تھا اس لیے کہ جو پیدا ہو جائے اور کوئی بھی بھلا بُرا کام کرے اُس ۰ کا نام یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ ساز تو کوئی بھی ہوتا ہے اور یہ کوئی ناز و افتخار کی بات نہیں۔ تو جز بز، چیں بجبیں اور آخر میں چراغ پا ہو کر بولے "میں جناب کو زبان کا فاضل بھی سمجھتا تھا مگر......"

جب ہمارا ذکر ان سے کیا گیا تو انھوں نے اسے لوگوں کی کم عقلی سے تعبیر کیا کیونکہ بقول مسافر خواتین میں کوئی ایک وصف بھی ہو تو مرد انہیں آسمان پر چڑھا دیتے ہیں مگر مردوں کی خصوصیات پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ ہم سے پہلی دفعہ ملاقات کی غرض سے آئے اور بولے "میں مسافر سیرگاؤں کر ہوں"۔

ہمیں حیرت ہوئی۔ آدمی تو وہ کافی مختصر تھے مگر نام! ہم نے دریافت کیا "یہ محض آپکا نام ہے یا مکمل تعارف؟"

بولے "یہ فقرہ دراصل ایک تاکید، ایک نشان، ایک علامت اور ایک تحریک ہے۔ میرے لیے کہ اسے مسافر! گاؤں گاؤں، شہروں، شہروں کی سیر کر . . . کہ سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں ؟ مگر بجائے مکمل جملے کے میں نے مسافر تخلص اور سیرگاؤں کر سرنیم مناسب سمجھا۔ ویسے والدین نے میرا نام سید شریف الدین معصوم رکھا تھا۔" پھر آپ معصوم سے مُسافر کیسے بن گئے ؟ کیا شاعری سے بھی شوق فرماتے ہیں"؟

وہ غصّے سے بولے "میں شاعری کیوں کرنے لگا ؟ میرے نزدیک شاعری بے کاروں کا شغل ہے۔ جیسے جیسے بے کاری بڑھ رہی ہے شاعروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں بیکار نہیں ہوں۔ مچھلیوں اور مرغیوں کا بزنس ہے میرا!"

" شاعری سے شوق نہیں فرماتے تو افسانے ضرور لکھتے ہوں گے"۔ ہم نے اپنے قیاس کی بنا پر کہا۔

وہ ناگواری سے بولے۔" افسانے خواتین لکھا کرتی ہیں یا نسوانی ذہنیت کے مرد"۔

" تو پھر آپ ہی بتادیں کہ کیا شغل فرماتے ہیں آپ ؟ تنقید، ڈرامہ، طنز و مزاح، یا کسی نئی صنفِ اظہار کے

موجد ہیں آپ؟

"جی نہیں۔ ان میں سے کچھ نہیں۔ میں خالص مردوں والا ادب تصنیف کرتا ہوں آپ اس صنف کو صنفِ اصیل کہہ سکتی ہیں۔"

"اصیل!" ہم بے طرح چونکے۔ "یہ اصیل صنف کیا بات ہوئی؟"

فرمایا "اصیل آپ بھی نہیں سمجھیں؟ اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔ اصیل سے مراد ہے صحیح النسل۔ اصیل مرغ سنا ہوگا آپ نے۔ وہ، جس کی نسل اس کے اجداد سے صحیح اور خالص چلی آرہی ہو۔ جس میں دوغلا پن، طوطا چشمی اور ملاوٹ کا نام کیا شائبہ بھی نہ ہو۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ طبع آزمائی کے لیے اس صنف کا انتخاب بھی وہی شخص کرتا ہے جو۔۔۔ جو۔۔۔" غالباً وہ مناسب الفاظ تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ کہ ہم نے کہا "آپ تو ادباء کی ذاتیات پر اُتر آئے۔"

وہ چونک گئے۔ پھر سنبھل کر بولے "میری مراد یہ ہے کہ سفرنامہ نگاری، مردوں والا ادب ہے اور بس۔ اس پر خامہ فرسائی کرنے کے لیے مرد کے شکوہ، جلال، جراءتِ رندانہ، ہمت، فراست اور مشاہدہ و تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"مگر یہ مردوں والا ادب کیا ہوا؟ ادیب ادیب ہے۔ اُسے مرد ادیب اور خاتون ادیب میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" ہم نے اعتراض کیا۔

"ضرورت ہے" اُنھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا "خواتین ان اوصاف سے متصف نہیں ہوتیں جو سفرنامہ نگاری کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس میدان میں اگر کوئی مداخلتِ بے جا کا مرتکب بھی ہوتا ہے تو اس کا حشر بے حد عبرت ناک ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "ہم آپ کے موخرالذکر فرمودہ کا مطلب نہیں سمجھ سکے وضاحت کیجئے۔"

فرمایا "ابھی حال ہی میں ایک ایسی کوشش میں بطوط اور بطوطی کی قلابازی تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔"

۔۔۔ فوراً ہی پینترہ بدل کر بولے۔۔۔ "شاید آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میں بتلا دوں کہ اس ضمن میں درستی اور اصلاح کا اقدام نیک بھی ایک مرد ہی نے انجام دیا تھا۔ خواتین کیا لکھتی رہیں؟ گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر خیالی تکّے چھوڑتی ہیں۔ مرد باہر کی دنیا میں گھومتا پھرتا ہے اس لیے سفرنامے لکھتا ہے۔"

"مگر خواتین بھی تو سفرنامے لکھتی ہیں۔" ہم نے دلیل دی۔

"لکھنے کو تو نامرد بھی افسانے لکھتے ہیں۔" وہ بھی تڑ سے بولے۔

"خیر چھوڑیئے۔" ان کی اوٹ پٹانگ دلیلوں سے تنگ آکر ہم نے کہا "کیا آپ سفرنامے کا روباری نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں؟"

"ج، نہلو، ہ، اور، ہ، ہم شلزمر کے سخت خلاف ہوں۔" وہ خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھ کر بولے۔ "آپ

کو یہ خیال آیا کیسے ؟"

ہم نے صفائی پیش کی "سفرنامہ ہر کوئی تو لکھ نہیں سکتا، نہ ہی ہر سفر کا سفرنامہ لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی کے سفر سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

وہ بولے "میں اپنے ہر سفر کا سفرنامہ لکھتا ہوں بلکہ سفرنامہ لکھنے کے لیے ہی سفر کرتا ہوں۔ اور یہ خوب کہی آپ نے کہ کسی کے سفر سے دوسروں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یہ بتائیے آپ نے اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں؟

ہم نہیں سمجھ پائے کہ بات ان کے سفرناموں سے ہمارے افسانوں تک کیسے آ گئی۔ جواب نہ دینا بداخلاقی ہوتی یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سمجھتے ہم نے بس دو چار افسانے یونہی لکھ مارے اور مشہور ہو گئے ہیں۔ اس لیے ایمانداری سے بتلا دیا "پچاس ساٹھ سے کم تو نہیں لکھے ہوں گے"۔ انھوں نے تیزی سے کہا۔ "تو آپ کے پچاس ساٹھ افسانوں سے قارئین کو دلچسپی ہے۔ میر اور غالب سے دلچسپی ہے۔ جدید شعراء کی اوٹ پٹانگ شاعری اور عجیب و غریب علامتوں والے افسانوں سے دلچسپی ہے تو میرے گیارہ سفرناموں سے دلچسپی نہیں ہو سکتی ؟"

"گیارہ سفرنامے لکھے ہیں آپ نے ؟" حیرت سے ہمارا منہ کھلا رہ گیا۔

"گیارہ شائع ہو چکے ہیں۔ ڈو پریس میں ہیں، ایک تکمیل کے مراحل سے گزر رہا ہے"۔ انھوں نے خلوص سے کہا۔

ہم پانی کا گلاس اٹھا کر ایک سانس میں خالی کر گئے۔ پھر کہا "اپنے ایک دو سفرناموں کے نام بتائیے۔ شاید ہماری نظر سے گزرے ہوں"۔

"ضرور . . . ضرور"۔ انھوں نے تپاک سے کہا "میرے مشہور سفرنامے ہیں مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک، بحر ہند سے خلیج بنگال تک، ہمالہ سے سہیادری تک اور گوداوری سے جہلم تک"۔

ہم پر دوبارہ حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹا "یہ سفرنامہ ہیں یا جغرافیائی ڈکشنریاں"۔

"مسافران سُنی کرتے کہتے گئے"۔ ان کے علاوہ میں نے کاروباری سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ مطلب یہ کہ جغرافیائی معلومات بہم پہنچانے کے لیے میں نے جغرافیائی سفرنامے لکھے تو کاروباری نقطۂ نظر سے کئے گئے سفروں کا بیان کاروباری سفرناموں میں میں نے کیا ہے"۔

"مثلاً" ہم نے پوچھا۔

"مثلاً گوداوری سے جہلم تک میں ہندوستان کی تمام ندیوں کا، ہمالہ سے سہیادری تک میں جملہ پہاڑوں کا اور مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک میں ہندوستان کا پورا جغرافیہ آ گیا ہے"۔

"تو اس کے لیے "ہندوستان کا جغرافیہ" نامی کتاب لکھ دیتے . . . یا مشاہدات مسافر سیر گاؤں کر لکھتے۔ الگ الگ سفرنامے لکھنے کی کیا ضرورت تھی ؟" ہم نے دبی زبان سے اعتراض کیا۔

وہ اپنی دھن میں کہتے گئے . . . "جانا ہمارا سمدھیانے میں، اور میکے سے سسرال تک" ہمارے دو مشہور کاروباری سفرنامے ہیں۔ ان میں ہم نے اپنی اور اپنے فرزندوں کی شادیوں کے سلسلے میں کئے گئے سفروں کا حال

لکھا ہے۔ میری ایک ہوچو بیس پرگنہ کی، دوسری متھرا کی اور تیسری بڑودہ کی ہے۔ چوتھے لڑکے کی بات ترپتی میں چل رہی ہے۔ ان چاروں مقامات کے شادی بیاہ کے رسم و رواج کا تفصیلی بیان میں نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ کاروباری سفرناموں میں وہ سفر بھی ہیں جو میں نے مچھلی اور مرغی کے بزنس کے سلسلے میں کئے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور وینگرولا کے مارکٹ اور وہاں بزنس کے امکانات پر بحث کی ہے۔"

"آپ کی کوئی دختر نہیں ہے؟ اس کی شادی کے سلسلے کا کوئی سفر؟" ہم نے باادب دریافت کیا۔ چہک کر بولے "ہے نا! ایک بیٹی ہے۔ اس کی شادی کی بات دبئی میں رہنے والے ایک خاندان میں چل رہی ہے۔ شادی ہوجائے تو ایک چکر وہاں کا لگاؤں گا۔ ہر چند کہ ہندوستان سے باہر جانا مجھے پسند نہیں۔ مگر ایک سفرنامہ غیر ملک کا بھی تو ہونا چاہیئے۔"

اچھا یہ سب تو ٹھیک ہے۔ یہ بتایئے کوئی ادبی سفرنامہ بھی لکھا آپ نے؟"

آنکھیں گول گول گھما کر پوچھا مسافر نے "یہ کیا ہوتا ہے؟"

"جو ذاتی نوعیت کا نہ ہو۔ جس میں صنفِ سفرنامہ کی تکنیک روایات اور فنی تقاضوں کا التزام رکھا گیا ہو۔"

"سفرنامے کے لیے کوئی شرط رکھی جائے یہ مجھے منظور نہیں۔ بغیر پلاٹ کے افسانہ لکھا جاسکتا ہے عروض کی واقفیت کے بغیر شاعری کی جاسکتی ہے تو سفرنامہ کی تکنیک سے واقف ہونے کی شرط کیوں؟" وہ ہٹ دھرمی پہ اتر آئے "پھر سفر ہم اپنے لیے کرتے ہیں یا ادب کے لیے۔ ادب کو فائدہ پہنچانے کے ہم ٹھیکیدار نہیں ہاں عوام کو فائدہ پہنچے اس کا خیال میں ضرور رکھتا ہوں۔ جیسے میں نے اپنے سفرنامہ شمال سے جنوب تک کے لیے جموں سے کوچین تک جس ٹرین میں سفر کیا اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا کہ ٹرین کب جموں سے نکلتی ہے؟ اس میں کتنی بوگیاں ہوتی ہیں؟ کونسا اسٹیشن کتنے بجے آتا ہے؟"

"یہ سب تو ریلوے ٹائم ٹیبل سے بھی معلوم ہوجاتا ہے۔" ہم نے قطع کلام کیا۔

"خاک معلوم ہوتا ہے! ٹائم ٹیبل یہ کہاں بتلاتا ہے کہ کھانا کون سے اسٹیشن پہ سرو کیا جاتا ہے؟ کس اسٹیشن کا سنترہ اور کس اسٹیشن کا آم مشہور ہے؟ کہاں سے کون سی اسٹیٹ شروع ہوتی یا ختم ہوتی ہے؟ کون سا اسٹیشن بے مزہ اور کون سا خوشگوار ہے؟ اب یہ سب بتانے میں ادب کہاں سے آگیا؟ ادبی سفرناموں سے کہیں آپ کا مقصود یہ بتانا تو نہیں کہ کس شہر میں منوں کے حساب اور کس شہر میں ٹنوں کے حساب سے شاعر پیدا ہوئے؟ کس زبان کے افسانہ نگار مشہور ہیں تو کس ریاست کے تنقید نگار؟ کس شہر میں کسی کے کتنے دوست اور قارئین ہیں؟ کہاں کے لوگ اردو پڑھتے اور انگریزی بولتے ہیں؟ ہمیں ان باتوں سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟"

ہم سر پکڑ کر خاموش ہو رہتے۔ مسافر روز اسی قسم کی بحث کرتے جس کا حاصل ہمارے سر درد کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ایک روز ارادہ ظاہر کیا "دو چار سفرنامے اور لکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ کچھ شہروں کے نام بتایئے جو مقفیٰ ہوں۔ سنتے ہی کانوں کو بھلے لگیں۔"

ہم نے ذرا بھی دلچسپی نہ دکھاتے ہوئے کہا "آپ کیا سفر کئے بغیر سفرنامہ لکھ دیں گے؟ واقعتاً آپ اپنے شہر سے کسی دوسرے شہر یا ملک کا سفر کرکے سفرنامہ تحریر کریں تو مناسب ہوگا۔ یہ نہیں کہ اُٹھتے بیٹھتے کہیں کا بھی سفرنامہ لکھ مارا۔"

فرمایا "سفرنامہ کے مطالعہ سے یہ کہاں کھلتا ہے کہ صاحبِ سفر نے سفر انجام ہی دیا ہوگا۔ کوئی سند یا ثبوت تو اس کے ساتھ منسلک نہیں پایا جاتا اور پھر یہ تو زیادتی ہے کہ جن مقامات پر آپ جائیں وہاں کے تحصیلدار سے سرٹیفکٹ بھی حاصل کریں کہ آپ نے یہ سفر بہ نفسِ نفیس انجام فرمایا ہے۔ اور یہ کہ . . . خیر چھوڑیئے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ تو قیود میں اضافہ کا مترادف ہے اور میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ سرگشتۂ خمارِ رسوم قیود، کم از کم میں نہیں ہوں۔ میں پہلے ایک مقام پر پہنچوں گا۔ وہاں سے دوسرے مقام کا سفر کروں گا۔"

ہم نے سوچا مسافر سے مہینہ دو مہینے نجات پانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ انھیں سفر پر روانہ کردیا جائے۔ کہا "رانچی سے سانچی تک، انبالہ سے کھنڈالہ تک، کاچی گوڑہ سے ہوڑہ تک، چرالونچی سے گھاٹنچی تک، آکولہ سے آملہ . . گلبرگہ سے گلمرگ، ملتائی سے ملتان . . . بہت سارے مقفیٰ مقام ہیں۔"

یہاں ہماری گفت گو کا خاتمہ بالخیر ہوا اور دوسرے ہی روز ہمیں اطلاع ملی کہ مسافر جو کل آمادۂ سفر اور پابہ رکاب تھے، سفر پر روانہ ہوگئے۔

مگر ٹھیک سولھویں دن وہ لوٹ آئے۔ ہم نے حیرت سے پوچھا "کیا اتنی جلد پاکستان بھی ہو آئے؟"

"پاکستان کا یہاں کیا ذکر؟" وہ ہم سے بھی زیادہ حیرت سے بولے۔

ہم نے کہا "ملتان نہیں گئے؟ ملتان کیا ہندوستان میں ہے؟"

خلاء میں تاکتے ہوئے وہ بولے "بجا فرمایا آپ نے میں نے اپنا سفر مدھیہ پردیش میں ٹھیک ملتائی سے شروع کیا تھا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گڑبڑ کہاں ہوئی؟ تین روز تک تلاش کرنے کے باوجود ملتان ہندوستان کے نقشے میں نہیں ملا۔ کمال ہے . . . تو ملتان پاکستان میں ہے؟"

ہم نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور دریافت کیا "سفر کیسے رہے؟ کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟"

"کوئی خاص نہیں سوا اس کے کہ رانچی والے میرے سفرناموں کے بارے میں جان لینے کے بعد مجھے واپس نہ آنے دیتے تھے۔ دوسرے، جن پرچیوں پر میں نے یادداشتیں تحریر کی تھیں اُن میں سے دو پرچیاں گُم ہوگئیں۔ اب یاد نہیں آرہا ہے کہ امام ضامن حلیمہ پھوپھو نے باندھا تھا یا ذاکرہ ممانی نے۔ پھر ہماری بیگم نے خریداری کی مگر حساب نہیں رکھا۔ پورے ۳۳ تینتیس روپیوں کا حساب نہیں مل رہا ہے۔"

"تو کیا بیگم آپ کے ہمراہ گئی تھیں؟"

"ہاں، انھیں پاگل خانہ دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔" اچانک بات بدل کر پوچھا "آپ نے ان دنوں کون سا افسانہ لکھا؟"

آج پہلی مرتبہ مسافر نے ہم سے ہمارے افسانوں کی بات کی تھی ورنہ انھیں اپنے سفرناموں کے ذکر سے

فرصت نہ ملتی تھی۔ شاید یہ ہم قافیہ شہروں کے سلسلے میں رہنمائی کا فیض تھا۔ ہم نے کہا "دیکھیے، ہم ہر پندرہ دن میں ایک افسانہ نہیں لکھتے۔ البتہ ایک سفرنامہ ہم نے اس مرتبہ لکھ ڈالا ہے۔"

"آپ نے۔ ۔ ۔ آپ نے سفرنامہ لکھا؟" وہ یوں بوکھلا کر بولے جیسے ہم اُن کے حقوق پر ڈاکہ زن ہوئے ہوں۔ "مگر میں نے تو کبھی افسانے کے میدان میں طبع آزمائی نہیں کی۔" "آپ نے افسانہ نہیں لکھا تو کیا ہمیں بھی سفرنامہ نہ لکھنا چاہیے؟ کیا سفرنامہ لکھنے کے جملہ حقوق آپ نے اپنے نام محفوظ کر لیے؟" ہم نے تیوریاں چڑھائیں تو وہ گڑبڑا گئے۔ "میرا مطلب ہے آپ کئی ماہ سے شہر سے باہر نہیں گئے ہیں۔ یعنی جہاں تک مجھے علم ہے۔" ہم نے یادداشتوں کی مدد سے سفرنامہ تحریر کیا ہے۔ عنوان ہے 'حمام خانے سے بیت الخلاء تک' (ویسے اس سفرنامے کے عنوان کے لیے ہم قافیہ الفاظ تلاش کرنا چنداں مشکل نہ تھا مگر یہ بات سوقیانہ اور مبتذل قرار پائی۔)

غصّے سے اُن کے نتھنے پھولنے لگے "یہ سفرنامہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا آپ دو منٹ کے سفر کو سفر کہیں گے؟ کیا اس نوعیت کے سفر کی روداد سفرنامہ کہلائی جا سکتی ہے؟" ہم لو لے اور خاصی تمکنت سے بولے "مسافر صاحب، اطلاعاً عرض ہے کہ یہ سفر دو منٹ کا نہیں پورے ایک گھنٹہ سترہ منٹ کا ہوتا تھا۔ بمبئی کی جس چال میں ہمارا قیام تھا اُس کے بائیس مکانوں میں بچانوے افراد رہتے تھے۔ ان تمام لوگوں کے لیے آٹھ غسل خانے مشرق میں تو آٹھ بیت الخلاء دو کلومیٹر دور مغرب میں بنے تھے۔ اِن دونوں کے درمیان کے سفر میں روزانہ جو نئے نئے تجربے ہمیں ہوتے تھے اُن کا سیدھا سادا بیان کیا ہے ہم نے۔"

مسافر بے یقینی سے ہماری طرف دیکھتے رہے۔ دراصل وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ ہم مذاق کے موڈ میں ہیں یا سنجیدہ ہیں۔ ہم نے پھر کہا "ہم عنقریب ایک سفرنامہ آلو کی شان میں بھی لکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح کھیت سے ڈائننگ ٹیبل تک پہنچتا ہے۔"

مسافر کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھ کر چل دیئے۔

مُسافر سیر گاؤں کر ہندوستان کے تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کر چکے تب تک اُن کے سترہ سفرنامے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے تھے۔ کئی مرتبہ انھوں نے کوشش کی کہ ان کا کوئی سفرنامہ پڑھ کر (یا بغیر پڑھے ہی) تبصرہ لکھ دیں۔ مگر ہم ٹال گئے۔ سفرنامہ میں کچھ ہوتا تو پڑھتے بھی۔ ایک روز اسی بات پر بحث چھیڑ بیٹھے۔ "آپ کیسی ادیبہ ہیں؟ آپ دوسروں کی تخلیقات نہیں پڑھیں گی تو آپ کے افسانے کون پڑھے گا؟"

"نہ پڑھے، ہماری بلا سے۔" ہم نے سر جھٹک کر کہا "ہم نے آپ سے کب کہا ہے کہ ہمارے افسانے پڑھیں۔"
"یہ میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔" مسافر جھلّا گئے۔ "لکھنے کے بعد میں خود اپنی تحریر نہیں پڑھتا، مگر میں نہیں پڑھتا تو کیا دوسرے بھی نہ پڑھیں؟"

"دوسروں کا دماغ خراب ہوا ہے؟" ۔ ۔ دبی زبان سے کہہ کر ہم رہ گئے۔

ایک روز کسی عزیز کے گھر ہم کسی تقریب میں گئے۔ لوٹنے لگے تو خیال آیا کہ مسافر صاحب کا دولت کدہ قریب

ہی ہے۔ ہمیشہ وہ ہمارے نہ آنے کی شکایت کرتے۔ ہم نے سوچا آج اُن کی شکایت رفع کر دیں۔

ہم جب اُن کے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو انھیں اس حال میں پایا کہ آرام کرسی میں دھنسے الماری میں سجی اپنی تصانیف کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد وہ بولے "کوئی ایسا مقام بتلائیے جہاں کے حالات پردۂ راز میں ہوں اور میرے سفرنامے کے ذریعہ دنیا کے سامنے آئیں۔ دراصل پھر سفر کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

ہم نے فوراً کہا "ایسا مقام ہے تو۔ مگر وہاں کا سفر جغرافیائی ہوگا نہ کاروباری۔ نہ عنوان کے لیے قافیہ پیمائی ہوگی۔"

وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولے "ادبی بھی نہ ہونا چاہیئے۔"

ہم نے کہا "وہ فلاحی سفر ہوگا۔ فلاحی سفرنامہ اب تک آپ نے لکھا بھی نہیں ہے۔" کہتی جائیے۔ "وہ شانِ بے نیازی سے بولے "میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ فلاحی کا مطلب نہیں سمجھ پائے ہیں۔ ان کا زبان کا علم بس ایسا ہی تھا۔

"عوام کی فلاح کے لیے، انھیں فیض پہنچانے کے لیے ایک سفر آپ کر ہی لیجئے۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد سفر کی ضرورت نہ پیش آئے ۔ ۔ ۔ وہ مقام ہے خلد بریں۔ خلد بریں کے حالات ۔۔ عوام کو پوری طرح واقف کرانے کے لیے آپ وہاں چلے جائیں۔"

ہم فوراً ہی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ویسے اُن کی زبان کی واقفیت سے یہ اُمید نہ تھی کہ وہ خلد بریں کا مطلب سمجھ جاتے۔

مسافر نے قطع کلامی کی گستاخی کی مگر وہ ہمیں مجبور محض نظر آئے۔ کہا "خلد بریں کے نام پر یاد آیا کہ ہمارے ایک عزیز بھی خلد آشیاں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی چار ماہ پہلے مرحوم تایا جان کے متعلقین کا خط اُن کے ایک دوست کے نام آیا تھا۔ انھوں نے ہی مجھے اطلاع دی تھی میں سوچتا ہوں یہ دونوں مقامات کشمیر کی حسین وادی میں کہیں ہونے چاہیئے۔ جبھی تو وہ عزیز چار ماہ کے گئے اب تک نہیں لوٹے۔

ہم کیا کہتے؟ خاموشی سے نکل آئے۔

بہت دن گزر گئے ہیں مسافر کی خیریت کی کوئی اطلاع ہمیں نہیں ملی۔ کبھی کبھی خیال گزرتا ہے کہ سچ مچ کہیں وہ خلد بریں کا سفرنامہ لکھنے کے شوق میں خلد آشیاں تو نہیں ہوگئے۔

نامور مزاح نگار
یوسف ناظم
کے مضامین کا مجموعہ

البتہ

۱۰ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے۔

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

غزل

چور آئے گا تو شرمندہ کرے گا، جان رکھ
شرم سے بچنے کو گھر میں قیمتی سامان رکھ

لڑکیوں کو خط جو لکھنے ہوں تو کام آئے گا وہ
اس لیے کہتا ہوں گھر میں داغ کا دیوان رکھ

عاقبت میں کام آئے گا خدا کو دل میں رکھ
لیکن اس دنیا میں اپنے ساتھ تو شیطان رکھ

کیا پتہ کب دل بدل کر دشمنوں سے جا ملے
ووٹ جب دینے گئے اس بات کا بھی دھیان رکھ

رشتے اپنے آپ آئیں گے تو اک کوٹھی بنا
پھول آئیں گے تو اپنے پاس اک گلدان رکھ

عشق کا اپنے ڈھنڈورا دوستوں میں پیٹ خوب
اپنی بیوی کو مگر اس عشق سے انجان رکھ

اب جو تجھ کو گالیاں دیتا ہے کیوں روتا ہے تو؟
اور اپنے گھر میں اپنی ساس کو مہمان رکھ

ہم کو لیڈر کہہ رہے ہیں لوگ سترہ سال سے
تیری حالت بھی سدھاریں گے تو اطمینان رکھ

تو کہے گا اور کچھ ناقد سمجھ لے گا کچھ اور
اپنے شعروں کی زبان آسان سے آسان رکھ

مقبول عابدی (حیدرآباد پاکستان)

شادی کے بعد

ہر گھڑی آفت کی ہے پیغامبر شادی کے بعد
کیا خبر تھی اس طرح ہوگی بسر شادی کے بعد

اک ذرا سی بات نے دنیا بدل ڈالی مری
تھا پسر شادی سے پہلے ہوں پدر شادی کے بعد

گل کھلائے عشق نے اتنے مرا گھر بھر دیا
عشق کے عقدے کھلے مجھ پر مگر شادی کے بعد

اضطراب و بے قراری بے کلی بے تابیاں
تھیں اِدھر شادی سے پہلے ہیں اُدھر شادی کے بعد

بارور ہر سال میرے عشق کا نخلِ مراد
پا رہا ہوں پے بہ پے دادِ ہنر شادی کے بعد

عشق ہر حالت میں ہے اک دردِ عاشق کے لیے
"دردِ دل شادی سے پہلے دردِ سر شادی کے بعد"

ہوگئیں مقبول ذوقِ عشق کی جولانیاں
مختصر در مختصر در مختصر شادی کے بعد

- پاگل عادل آبادی

غزل

رستم ہے اُس کا نام تعجب کی بات ہے
جورو کا ہے غلام تعجب کی بات ہے

بکتے ہیں مفت آم تعجب کی بات ہے
ہیں گٹھلیوں کے دام تعجب کی بات ہے

مصرعے ہیں نا تمام تعجب کی بات ہے
اُستاد کا کلام تعجب کی بات ہے

رفتار ہے ٹرین کی بنڈی سے بھی سُلو
ہے نام تیز گام تعجب کی بات ہے

کوّے کی چونچ میں ہے کلی اب انار کی
حیرت کا ہے مقام تعجب کی بات ہے

مینڈک کی تو ہے مینڈکی اب کیکڑوں کو بھی
ہونے لگا زکام، تعجب کی بات ہے

اُن کی گلی میں ہے سُنا عشاق کے لئے
ہارن کا انتظام تعجب کی بات ہے

دیکھا ہے میری آنکھ نے کیا گھر میں شیخ کے
ڈسکو کا اہتمام تعجب کی بات ہے

شربت کے اک گلاس پہ ٹرخا رہے ہیں وہ
تھی دعوت طعام تعجب کی بات ہے

چشمہ لگائیے بھی تو آتا نہیں نظر
ڈنلپ ہے پھر بھی نام تعجب کی بات ہے

صدر مشاعرہ کی طرف سے ہے شاعرو
سحری کا انتظام تعجب کی بات ہے

مئے خانے سے نکل کے یہ کہتے ہیں شیخ جی
دو چار گام تھام تعجب کی بات ہے

باتیں ہیں ساری ہوش کی پاگل ہے پھر بھی نام
اللہ رے یہ مقام، تعجب کی بات ہے

- اعجاز وارثی
مرادآباد (یوپی)

..... ہوگئے

وقت نے کروٹ جو بدلی، نقشے اُلٹے ہوگئے
سچّے جھوٹے ہوگئے اور جھوٹے سچّے ہوگئے

نام جمعہ تھا مگر دورِ ترقی کے نثار
بی جمالو کے میاں مسٹر جمالے ہوگئے

اک زمانہ تھا کہ وہ ہم سے جُدا ہوتے نہ تھے
اب یہ عالم ہے کہ بس منڈے کے منڈے ہوگئے

جن کے دسترخوان پر رہتا تھا چمچوں کا ہجوم
وائے قسمت، ایک دن وہ خود بھی چمچے ہوگئے

تلخیٔ دوراں میں سبزی کی گرانی مل گئی
حد یہ ہے کونین کے داموں کریلے ہوگئے

زعم خودداری رہا تو خشک ٹکڑے ہی ملے
اے خوشامد! تیرے دم سے تر، نوالے ہوگئے

حضرت اعجاز کو جب داد کا چسکا پڑا
شعر تو کیا کہتے البتہ گویّے ہوگئے

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار (پاکستان)

مقابلہ عقل و عشق

(کلامِ اقبال کی روشنی میں لکھی گئی تحریر)

معزز حاضرین و ناظرین، شائقین و ملاحظہ باز حضرات انجمن فروغِ کشتیاں کی جانب سے سب کو خوش آمدید۔ آج کا یہ مقابلہ اس لحاظ سے انوکھا ہے کہ اس میں تن سازی اور کسرتی بدن سے بے نیاز بیٹھکوں اور ڈنڈ پیلنے سے نفرت کرتے والے، دو پہلوان حصّہ لے رہے ہیں جو صرف گفتار کے غازی ہیں اور کردار کو لفٹ نہیں کراتے ادارہ رازِ ہستی کی جانب سے مسٹر عشق میدانِ عمل میں کودیں گے اور دن ڈھلے تک کودتے رہیں گے۔

ادارہ ہوش و خرد کی جانب سے مس عقل مقابلے میں آئیں گی ریفری کے فرائض غیر منصبی سرانجام دینے کے لیے آپ کے سامنے حاضر ہوں بلکہ واحد حاضر ہوں۔ ذرا حاضرین کو دونوں پہلوانوں کی ڈگریوں اور چیرہ دستیوں کے متعلق بتاتا چلوں محترمہ مس عقل سلیما انتہائی اعلیٰ ایجوکیشنل کریئر کی مالک ہیں۔ راد ہائے گوناگوں میں فرسٹ ڈویژن نمبر لے کر میٹرک کیا۔ پھر تفاسیر کتابِ ہستی میں ایف اے کی ڈگری چھینی۔ بعد ازاں غیرتِ لعلِ بے بہا میں بی اے کا تمغہ جھپٹا۔ محترمہ کا خیال تھا کہ انھیں علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے سلسلے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملے گی گو اعزازی ہی سہی۔ لیکن حکومت نے صرف شمعِ محفلِ صداقت کا سرٹیفکیٹ دینے پر اکتفا کیا۔ مسٹر عشق علمی لحاظ سے [illegible] رماضی تو نہیں رکھتے۔ نہ ہی کسی باقاعدہ گورنمنٹ ہائی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل کی لیکن پرائیویٹ طور پر سوز و دروں میں پرائمری پاس کی پھر یک لخت [illegible] یف دستی اور فن کے علوم میں پی ایچ ڈی کر لی۔ مس عقل کے برعکس انھیں کبھی صلے اور ستائش کی تمنا نہیں رہی۔

فریقین کے درمیان متوقع سر پھٹول کو غیر متوقع بنانے کے لیے اور تماشائیوں کو شائستگی سکھانے کے لیے پولیس کو فون کر دیا ہے اس لیے لاٹھی چارج سے بچنا اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ تماشائی اپنی جیبوں کی خود حفاظت کریں۔ قابلِ صد احترام غنڈہ عناصر اور دل پھینک حضرات سے التماس کہ بلاوجہ خواتین انکلوژر کی طرف نہ دیکھیں اپنے جسم کا کوئی حصّہ اپنی سیٹ سے باہر نہ بھیجیں۔ ریفری اور گیٹ کیپر آپ کے خادم ہیں ان سے تعاون کریں، مقابلہ دیکھنے سے پہلے اپنے زندگی بھر کے گناہوں کی معافی مانگ لیں کیا پتہ ابھی لاٹھی چارج ہو اور کسی پولیس والے کا

شتر بے مہار قسم کا ڈنڈا آپ کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

لیجیے رنگ میں دونوں پہلوان داخل ہو گئے ہیں مس عقل اونچے اسٹول کی بجائے بناؤ سنگھار کرنے والے چھوٹے سے بنچ پر تشریف فرما ہیں۔ ان کے کوچ گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے کی سعی میں ہیں! دوسری جانب مسٹر عشق ایک ٹوٹی ہوئی کرسی میں دھنسے بیٹھے ہیں ان کے کوچ ایک ہاتھ رخسار کے ساتھ لگائے ہوئے کسی گہری سوچ میں مستغرق! تو سامعین۔ ٹن کی آواز آتی ہے اور یوں پہلا راؤنڈ شروع ہوا۔

مسٹر عشق :۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

مس عقل :۔ (اِٹھلاتے ہوئے) قبول کیا جاتا ہے۔

مسٹر عشق :۔ محترمہ کل آپ انارکلی میں مٹرگشت فرما رہی تھیں۔ کسی خاص شخص سے گئی ہوئی تھیں یا جلوت میں خلوت تلاش کر رہی تھیں۔

مس عقل :۔ نہیں تو! میں ذرا کچھ پرانے چاک سلوانے گئی تھی۔

مسٹر عشق :۔ واہ۔ بادشاہ ہو۔ مجھے حکم دیا ہوتا۔ میں پرانے چاک بے سوزن و تار و رفو سی کر پیش کرتا۔؟

مس عقل :۔ بس بس زیادہ ڈینگیں نہ مارو۔ شیخی نہ بگھارو میں خود اچھی خاصی ٹیلرنگ جانتی ہوں۔ تمہارا کیا ہے بے خود ہو کر کام کرتے ہو، اپنا گریباں چاک کر دو گے یا دامنِ یزداں۔

مسٹر عشق :۔ تمیز کے دائرے بلکہ مستطیل کے اندر رہ کر بات کریں۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں مجھے تو اتنی سخت قسم کی ٹیلرنگ آتی ہے کہ میرے استاد ٹیلر ماسٹر نے میرے کام کی رفتار کو دیکھ کر کہا تھا: بچوسے دے گا تمام عقل کے بخیئے اُدھیڑ کو

مس عقل :۔ باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ یہ فن سکھلانے کے لیے کوئی انسٹی ٹیوٹ کھول لو۔ کوئی کام تو کرتے نہیں سارا دن مکھیاں مارتے رہتے ہو۔ مکھیوں کی نسل کو تم سے سخت خطرہ لاحق ہے۔

مسٹر عشق :۔ تو آپ ہی نشاندہی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے مسز عقل!

مسز عقل :۔ مسز نہیں مس کہو۔ تمہیں کبھی خیال آیا مسجد قرطبہ کی فضا صدیوں سے بے اذان ہے۔ فلپائن میں آج سے چار سو سال قبل چار کروڑ مسلمان تھے اب صرف پچاس لاکھ ہیں۔ بغداد کے مدد سے اُجڑ گئے۔ تم نے اس صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کسی میں کوئی ولولہ پیدا نہ کیا۔ صیہونی پنجہ عربوں کو جکڑے ہوئے ہے۔ افغانستان میں سرخ سیلاب بڑھتا آ رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں عشق بلاخیز کا قافلہ کن وادیوں میں آوارہ گردی فرما رہا ہے۔

(حاضرین کی سیٹیوں اور تالیوں کا شور)

مسٹر عشق :۔ (دانت کچکچاتے ہوئے) منہ نہ کھلواؤ میرا۔ میں کیا بتاؤں؟ بارہا سوچا کہ حرم قرطبہ آباد ہو۔ قبلہ اول آزاد ہو۔ میں نے نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرنا چاہا۔ اُن کے دل و جگر "ہیٹ اپ" کرنے کی پوری سعی کی۔ لیکن میری ناکامی کی بڑی وجہ تم ہو صرف تم ہو۔

مس عقل :۔ ہائے ہائے مجھ نگوڑی کو کیوں موردِ الزام ٹھہراتے ہو۔

مسٹر عشق :۔ ہاں جب بھی کسی نوجوان کو باطل پر پل پڑنے کا مشورہ دیا تم راستے کی دیوار بن گئیں کبھی حکمت کبھی

شائستگی اور مفاہمت کے بہروپ میں۔ تم تو عیار ہو سوجھیں نبالیتی ہو میں بیچارہ نہ مُلّا نہ زاہد نہ حکیم۔
مس عقل :۔ غلط کہہ رہے ہو آج کل کسی بھی نوجوان کو دیکھ لو عشق میں پھنسا ملے گا۔ عشقیہ خطوط لکھے گا۔ عشقیہ شاعری پڑھے گا۔
مسٹر عشق :۔ مجھے آپ کی سطحی نظر پر بڑا افسوس ہے آپ ہوس کاری کو عشق جیسے اعلیٰ جذبہ سے تعبیر کرتی ہیں۔ عشق تو باطنی آشنا قت کا نام ہے۔ یہ تو ایمان کی اصل ہے۔ میں تہ تاب دلوں کی دوا ہوں حتیٰ کہ ربِ جلیل کا عرش ہوں۔
(ٹن کی آواز آتی ہے۔ پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ دونوں پہلوان اپنے اپنے کونوں میں چلے گئے ہیں جہاں ان کے مالشیے چھوٹے چھوٹے تولیے اُن کے سر پر رگڑ رہے ہیں۔ "آبِ جو" والی بوتلوں پر چابی کی مدھر آواز آرہی ہے اور مونگ پھلی بیچنے والے کم سن لڑکوں کی صدائے درد۔ کچھ تماشائیوں نے حرارتِ سوزِ دروں سے سگریٹ سلگا لیے ہیں۔ دلوار گیر مائیک سے "چشمے کی سورشوں" والا باجا بجنے کی آواز اور چوڑیوں کے چھپے سُنائی دے رہے ہیں۔ ٹھہریئے میں بھی بوتلوں والے کو بلاؤں
"اوئے چھوٹے ایک بوتل "موجِ بیکراں" کی مجھے بھی دینا کیونکہ ؎

فانٹے کی بوتلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب ؛ کیا لُطف بوتلوں کا جب دل ہی بجھ گیا ہو!

اب انتظامیہ کی طرف سے "پچھلے پہر کی کوئل والا" گانا نشر کیا جا رہا ہے چلیئے آپ کو یہاں بنی ہوئی کینٹین پر لے چلیں۔ سورشِ شب سے خانہ والی چائے چشم باطن والے کریم رول۔ ذرہ خاک والے بسکٹ یہاں ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ لیجئے ٹن ٹن کی آواز دوبارہ آئی۔ دوسرا راؤنڈ شروع)
مسٹر عشق :۔ آپ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہتی ہیں یا نہیں؟
مِس عقل :۔ کوشش تو کرتی ہوں۔
مسٹر عشق :۔ کن ذرائع سے
مِس عقل :۔ بس لوگوں سے سُن سُنا کے۔
مسٹر عشق :۔ کیوں؟ میرا تو خیال تھا کہ آپ کے ہاں رنگین ٹی وی ہوگا۔
مِس عقل :۔ (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) پچھلے دنوں ضمیر بیچا تھا تو کافی نقدی حاصل ہوئی تھی۔ سوچا کہ کلر ٹی وی خرید لوں پھر خیال آیا کہ عقل کے ناخن ارزاں قیمت پر مل رہے ہیں۔ تھوڑی سی ہوش و خرد اور کچھ جمہوری نظام خریدا۔ رنگین ٹی وی کے لیے تو وافر پیسے چاہئیں۔ ویسے بھی ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ؛ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مسٹر عشق :۔ اجی چھوڑیئے مِس۔ آپ کو کیا پتہ دنیا کدھر جا رہی ہے عوام سے رابطہ ہی نہیں۔
مس عقل :۔ کیوں نہیں۔ ابھی کل میں لاہور کے مضافات میں گئی یہ دیکھنے کے لیے کہ لہلہاتی فصلوں کے درمیان فطرت کیسے بے نقاب ہوتی ہے؟ نشترِ قدرت کیسے مفیدِ آفتاب کھولتا ہے۔
مسٹر عشق :۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہیں آپ شاید نہیں جانتیں کہ یہ ساری گفتگو جو آپ نے ابھی منہ سے انڈیلی۔ عریانی اور فحاشی کی ذیل میں آتی ہے ہر چیز کو پردہ نور میں منور رہنے دیں۔
مِس عقل :۔ مجھے سمجھاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم تو خود ایک زمانے میں عریاں رہ چکے ہو۔
مسٹر عشق :۔ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

مِس عقل :۔ وہ اقبال نے ہی کہا تھا کہ کبھی میدان میں زرہ پوش ہو کر عشق آتا ہے اور کبھی عریاں حالت میں بے تیغ و سناں آتا ہے۔

مسٹر عشق :۔ مجھے پھر آپ کی سطحی نظر پر بڑے پیرودں افسوس رہے گا۔ آپ سے پوچھتا ہوں کہ اب تک کوئی ایک بھی اچھا کام آپ سے سرزد ہوا ؟ آپ نے نوجوان نسل پر نگاہِ غلط ڈالی۔ انھیں کوئی مقصد دیا؟ کوئی منزل دکھائی ؟

مِس عقل :۔ بڑے سیانے بنتے ہو۔ تم نے اس سلسلے میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

مسٹر عشق :۔ میں نے انھیں رضائے الٰہی کی منزل دکھائی۔ طارق بن زیاد، مصعب بن عمیر۔ بیبرس۔ بدر بن مغیرہ۔ ٹیپو سلطان اور پھر غازی علم دین نے میری بات مان لی۔ انہوں نے سب سے بڑا نفع بخش کاروبار کیا اور جاتے جاتے مجھ سے ڈرتے ہوئے مجھے کہہ گئے ؎

تیری منزل پر پہنچنا کوئی آسان نہ تھا سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے۔

(حاضرین کی تالیاں)

مِس عقل :۔ اچھا (آخری الف کو لمبا کرتے ہوئے) تو سرحد پر [illegible] نے انھیں کچھ نہ کہا؟ ابلیس۔ شیخ و برہمن۔ ناصح اور قاضی شہر وغیرہ اکثر سرحدِ عقل پر پھرتے رہتے ہیں۔ دیوانوں اور فرزانوں کو یہی لوگ قابو کرتے ہیں۔ آپ جن نوجوانوں کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ یقیناً ان [illegible] سے بچ نکلے۔ میں ان سب کی چھٹی کراتی ہوں۔ مُفت کی تنخواہ لیتے ہیں۔

مسٹر عشق :۔ واہ۔ آپ کیا تنخواہ دیتی ہیں ان کو؟

مِس عقل :۔ ابلیس کو "شعاعِ نور" الاٹ کر دیتی ہوں۔ نکما کہیں کا۔ قاضی شہر کو ہر مہینے کی یکم تاریخ کو قبائے زر دیتی ہوں۔ یہ بھی ھذٰ حرام نکلا۔ شیخ و برہمن کو "لہو اسلاف کا" ہر مہینے میسر کرتی ہوں بے شک اے جی آفس والے بل نہ پاس کریں یہ بھی غافل ثابت ہوئے ہیں۔

مسٹر عشق :۔ ہاؤس رینٹ نہیں دیتیں انھیں۔

مِس عقل :۔ صرف شیخ و برہمن کو ہاؤس رینٹ اور مہنگائی الاؤنس دیتی تھی۔ ویسے بائی دی وے آپ آج کل کہاں رہتے ہیں۔

مسٹر عشق :۔ میرے لیے رہائشی جگہوں کی کمی نہیں۔ میں کوئی نکما متوڑی ہوں۔ میں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے قیصر و کسریٰ کو مار بھگایا آتش کدہ ایران کو ڈیپ فریز کیا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر دودھ کی ندیاں بہا دیں۔

مِس عقل :۔ پنجابی فلموں والوں بڑھکیں مت لگاؤ میں جانتی ہوں آج کل تمہیں کوئی رہائشی پلاٹ نہیں ملا بس صرف یار کی گلی کا طواف کرتے رہتے ہو۔ پہاڑ کاٹنے کی وجہ بھی کچھ اور تھی۔ ایک شاعر نے تمہارا یہ راز فاش کر دیا ہے۔ ؎

اب ٹھکانہ ہے یہیں عشق کے دکھیاروں کا ؛ کوچۂ یار شفا خانہ ہے بیماروں کا

پاس شیریں تھا جو فرہاد نے کاٹا کہسار ؛ ورنہ یہ کام ہے مزدوروں کا معماروں کا

(مِس عقل کے مداح داد کے ڈونگرے برساتے۔ شور و غوغا کرتے ہوئے غُل غپاڑے سے پر اُٹھائے ہیں اور رنگ میں داخل ہو کر بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔ آج کے مقابلے میں مسٹر عشق اور مِس عقل کی بجائے رنگ تماشائیوں کے ہاتھ رہا ہے۔ میں رنگ میں زبردستی داخل ہونیوالے پانچ چھ تماشائیوں کے ہاتھ فضا میں بلند کرتا ہوں۔ تماشائی وی و فرز" لوگوں کے نظم و ضبط برقرار نہ رکھنے پر میں

قمر الزماں قمر (رانچی)

○

(حضرت غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ)

★

جو دل ہی ہو نہ سینے میں تو پھر آہ و فغاں کیوں ہو
اگر خالی ہو سر بھیجے سے تو منہ میں زباں کیوں ہو

لگا کر آگ گھر کو وہ ہمارے کہتے پھرتے ہیں
ہمارے عاشقوں میں گھر جلا "اہلِ مکاں کیوں ہو"

ہمیشہ نوچتا رہتا ہے پر صیاد رہ رہ کر
وہ میرٹھ ہو کہ دلی ہو اسے فکرِ زیاں کیوں ہو

وزارت بیچ کر، ایمان و دیں حاصل کیا ہم نے
ہمیں اس نے خریدا ہے تو ہم پر مہرباں کیوں ہو

محبت ہم میں اس میں ہو گئی ہندوستاں والو
تو اُس کا باپ بھائی پھر ہمارے درمیاں کیوں ہو

ہزاروں ہی طریقے پھوٹنے کے سر کو ہیں رائج
"تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"

ہمارا فیصلہ کیوں روزِ محشر بھی وہاں ہوگا
یہ جھگڑا ہے یہاں کا فیصلہ اس کا وہاں کیوں ہو

ہمیں آتا ہے سب کچھ پر خوشامد ہی نہیں آتی
ہمارا اے قمر ثانی بھلا پھر ہم زباں کیوں ہو

گرگٹ گورکھپوری

○

میکشو میکدے سے دور کھڑا زاہدِ خشک سا بنا ہی رہو
جیب میں دام ہی نہیں ورنہ ڈٹ کے پینے میں میں بھی ماہر ہوں

کیا ہوا گر پڑا ہوں گھوروں میں نام تو ہے مرا جموروں میں
شعر کہنے کی گر نہ ہو قدرت "آٹھ نو" دس سُروں کا ماہر ہوں

آپ پوچھیے نہ مجھ سے اے صاحب گل رُخوں سے نہیں کوئی مطلب
تھے صنم کل بھی میری کمزوری آج بھی طالبِ نوادر ہوں

ہے فقط اک پناہ کی چاہت مجھ کو خیرات کی نہیں حاجت
شکل مانا کہ ہے فقیروں سی ورنہ سچ پوچھیے مسافر ہوں

دے سکا ٹیکس جب نہ الفت کا راستہ یہ ملا بریت کا
سونپ کر راج پاٹ بیگم کو اپنے ہی گھر میں اب مہاجر ہوں

مثلِ مرہم ہے میرا طنز و مزاح میں ہوں زخمی سماج کا جراح
ہے مجھے صرف شوقِ چارہ گری نہ تو مجروح ہوں نہ ساحر ہوں

یہ سبب رنگ میں بدلتا نہیں کوئی خطرہ تو ہے ضرور کہیں
میں ہوں گرگٹ مجھے نہ جل دیجے جانیے شاطروں میں شاطر ہوں

غالب حیدرآبادی

دروغ گوئی سے، غیبت سے آنا کانی سے
ہزار کام لیے میں نے خوش بیانی سے

کہا یہ ڈوئی نے مجھ سے یہ فالتو لیڈر
ابھر کے آئے ہیں چمچوں کی مہربانی سے

یہی نہیں ہے کہ اک ساس سے نہیں بنتی
لڑائی نند سے ہے چپقلش جٹھانی سے

اگر بٹھانی ہو دھاک اپنی قابلیت کی
تو آپ بولیے انگلش بڑی روانی سے

اگرچہ بن کے پھروں شیر گھر کے باہر میں
تو بھیگی بلی بنوں اپنے گھر کی رانی سے

نہیں ہے پاس مرے ٹھیکرا کہ بھنگ بھنوں
ہے واسطہ مرا اصحابِ خاندانی سے

ہمیشہ کہتا ہوں بیگم سے سر کو منڈوا دو
ہے میرے سر میں جوئیں ان کی مہربانی سے

جو مال مُردوں کا غالب ہو دستیاب مجھے
خوشی سے کام کروں میں بھی جاں فشانی سے

رؤف رحیم حیدرآباد

میں ہوں لاغر، وہ پہلوان خدا خیر کرے
میری آفت میں ہے یہ جان خدا خیر کرے
ایک شاعر کا ہوں مہمان خدا خیر کرے
اس کے ہاتھوں میں ہے دیوان خدا خیر کرے
اک حسین بت میں پڑی جان خدا خیر کرے
لڑکھڑانے لگا ایمان خدا خیر کرے
نیند میں چیختا رہتا ہے وہ "چوکا چھکا"
اس پہ کرکٹ کا ہے شیطان خدا خیر کرے
گھر میں چاول ہے نہ آٹا ہے نہ ادرک لہسن
پھر بھی پکچر کا ہے ارمان خدا خیر کرے
زعفرانی ہے ہر اک چیز مرے لیڈر کی
یہ سیاست کا ہے یرقان خدا خیر کرے
چھیڑ کر آیا تھا جس شوخ حسینہ کو ابھی
بھائی اس کا ہے پہلوان خدا خیر کرے
پیٹ میں آنت نہیں منہ میں کوئی دانت نہیں
اس پہ شادی کا ہے ارمان خدا خیر کرے
مجھ سے بیگم کا تقابل تو فقط اتنا ہے
میں دیا ہوں تو وہ طوفان، خدا خیر کرے
میں تو داماد ہوں الٹا بھی تو داماد رہا
اور نادان بھی نادان خدا خیر کرے
اس سے پہلے ہی پٹائی ہوئی گلیوں میں تری
پھر مچلنے لگے ارمان خدا خیر کرے
جب سے کرکٹ کی وبا پھیل گئی ہے یارو
بن گئے ہیں سبھی عمران خدا خیر کرے
کتنی غزلوں کو خدا جانے سنائیں گے رحیم
ہیں ترنم میں جو غلطان، خدا خیر کرے

نسیم انصاری (بھوپال)۔

"مشورے"

مشورہ دینے کے سلسلے میں ہم لوگ ساری دنیا میں سب سے آگے ہیں کوئی مسئلہ ہو۔ کوئی دکھ بیماری ہو۔ ہر آدمی ذاتی طور سے مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے مثلاً اگر آپ بیمار ہیں تو ہر آدمی آپ کو مشورہ دے گا "آپ اپنا علاج کرائیے" اگر کسی گھر میں کوئی شخص پاگل یا سنکی ہو تو ہر شخص فوراً فوراً مشورہ دے گا "اسے پاگل خانہ میں داخل کرائیے" ایک زمانے میں میں بے حد دُبلا تھا۔ اس وقت ہر شخص مجھے موٹا ہونے کا مشورہ دیتا تھا۔ پھر سعودی عرب کی آب ہوا مجھے بہت راس آئی، اور میں موٹا ہوگیا۔ اب ہر شخص مجھے دُبلا ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص کنوارہ ہو تو ہر شخص چلتے پھرتے اسے شادی کا مشورہ ضرور دیتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ لوگ بھی شادی کا مشورہ دیتے ہیں جو یا تو کنوارے ہوتے ہیں یا شادی کرکے چھوٹ چکے ہوتے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ لوگ شادی شدہ کو طلاق کا مشورہ نہیں دیتے اور شاید اس کی وجہ اندیشہ ہائے دور دراز ہیں۔

بعض مشورے عقل و فہم سے بالاتر بھی ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مشورہ دیتے ہیں جبکہ وہ خود اس مقصد کے لیے سمندر کا استعمال نہیں کرتے۔ میرے ایک دوست نے ایک راہ چلتی لڑکی کو مشورہ دیا "خاتون ذرا سلیقہ کے کپڑے پہن کر گھر سے نکلا کیجیے"۔ حالانکہ وہ خاصے دل چسپ لباس میں تھی۔ ایک دوسری خاتون کو جو حد سے زیادہ میک اپ کرکے نکلی تھیں میرے دوست نے مشورہ دیا "آپ تھوڑا سا میک اپ کرلیا کیجئے اچھی لگیں گی" میرے یہ دوست اکثر راہ چلتی خواتین کو بلا طلب مشورے دیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک نو عمر لڑکی نے انھیں مشورہ دیا "آپ کو شرم آنی چاہیئے" میرے دوست نے جواب دیا "میں بنیان اور نیکر پہن کر تھوڑی گھوم رہا ہوں"۔

مشوروں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض مشورے صحیح بھی ہوتے ہیں اور موثر بھی مثلاً "نماز پڑھا کیجیے، قبل اس کے کہ آپ کی نماز پڑھی جائے"۔ بعض لوگ جب بھی ملیں گے ایک ہی مشورہ دیں گے۔ میرے ایک دوست مجھے ہمیشہ مشورہ دیتے ہیں "سگریٹ چھوڑ دو۔ سگریٹ چھوڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے میں کئی بار چھوڑ چکا ہوں"۔ اسی طرح ایک صاحب جن کا دفتر میرے گھر سے نزدیک تھا اکثر دفتر کے اوقات میں میرے پاس آجاتے چائے طلب کرتے اور مشورہ دیتے "جھوٹ کبھی نہیں بولنا چاہیئے۔ نہایت بُری بات ہے" جب چلنے لگتے تو کہتے "ابھی چلتا ہوں کافی دیر ہوگئی۔ کوئی بہانہ بنانا پڑے گا"۔ پابندی نماز پر اکثر مشورے اذان کے وقت دیئے جاتے ہیں اور لیکچر کی شکل اختیار کرلیتے ہیں حتیٰ

کہ نماز کا وقت گزر جاتا ہے۔!

ماں باپ ازل سے اپنی اولاد کو مشوروں سے نوازتے آرہے ہیں بلکہ بعض اولادوں کو وراثت میں صرف مشورے ملتے ہیں۔ اولاد اپنی اولاد کو یہ وراثت منتقل کردیتی ہے۔ اس میں کسی جذبے کو دخل نہیں ہوتا بس ایک فرض کی ادائیگی ہوتی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے باپ حقے کا کش لے کر بیٹے سے کہتا ہے "بیٹا سگریٹ نوشی بہت بُری چیز ہے اسے ہرگز اختیار نہ کرنا" بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو جھوٹ نہ بولنے کی تلقین کرتا ہے اور اتنے میں کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے تو باپ بیٹے سے کہتا ہے "کہدو ابا گھر میں نہیں ہیں"۔ اساتذہ ہمیشہ طلباء کو محنت سے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں حالانکہ طلباء انھیں پڑھانے کا مشورہ کبھی نہیں دیتے۔ کچھ مشورے ہم خود طلب کرتے ہیں فیس دے کر۔ جیسے ڈاکٹر کا مشورہ، جیسے وکیل کا مشورہ۔ ہر ڈاکٹر دوا کے علاوہ پرہیز کا مشورہ دیتا ہے اور پرہیز کوئی نہیں کرتا۔ ہر وکیل مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ کبھی کبھی سرکاری افسر کو بھی مشورہ کی فیس دینا پڑتی ہے بغیر رسید کے۔

مشورے دینے کا سب سے زیادہ شوق قومی لیڈروں کو ہوتا ہے۔ یہ جب بھی تقریر کرتے ہیں مشوروں سے شروع ہو کر مشوروں پر ختم کردیتے ہیں۔ الکشن میں ہر لیڈر ایک ہی مشورہ دیتا ہے "ہماری پارٹی کو ووٹ دیجیئے"۔
مشورے لینے اور دینے میں خواتین بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ خانگی معاملات، شادی، بیاہ، زچگی وغیرہ میں تو مشوروں کا لین دین چلتا ہی ہے تمام تر بیویاں شوہروں کو ساسوں کے خلاف مشورے دیتی ہیں اور یہ مشورے بڑے کارگر بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ شوہر ہیں تو آپ کو ان مشوروں کا کچھ تجربہ ضرور ہوگا۔ چھپانے سے کیا فائدہ۔

۵۱ سال سے ملک کی مشہور و معروف اور ہزاروں کی دل پسند چائے
ملک کے ہر گوشے اور ہر دکان پر دستیاب۔

LASA
SUPER BLEND
TEA

لاسا اسپیشل چائے
لاسا اسپیشل چاکلیٹ ٹی
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس: تیلگری ٹی امپوریم معظم جاہی مارکٹ۔
حیدرآباد اے پی، انڈیا۔

یزداں یار (حیدرآباد)

ایک ناچیز طوطا

صبح کی ملائم دھوپ کچھ دیر اور کمرے میں رہے گی۔ صبح کی تازگی ہوا میں موجود ہے۔ آرام کرسی پر دراز ہو کر اخبار کی سرخیوں کی سبک سیر کرتا ہوا پیر پھیلائے، سگریٹ کا ہلکا کش لیا تھا کہ کسی نے السلام علیکم کہا۔ دروازے کی طرف نظر اٹھائی۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ بلکہ کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ابھی اسی ُمدمے سے سنبھلا تھا کہ دائیں جانب کی میز پہ کچھ حرکت سی ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک طوطا گردن کو دائیں بائیں گھما گھما کر گویا کمرے کا جائزہ لے رہا ہے۔ اور ایکبارگی مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں۔ طوطے میاں نے دوبارہ "السلام علیکم" کہا۔ میں حیرت اور اچانک سی خوشی میں گویا گنگ سا ہو رہا تھا۔ طوطے نے پھر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں آپ کی اخبار نوشی میں حرج آگیا ـــ" اخبار نوشی پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "صبح سویرے فرصت کا وقت اخبار پڑھنے میں گزار رہا تھا۔ چھٹی کا پورا دن پڑا ہے ـــ"

میں نے گویا صفائی میں کہنا چاہا۔ طوطا میز پر کھڑا اب کچھ مطمئن سا نظر آرہا تھا۔ طوطے کے اس سوال جواب پر میں حیرت زدہ بھی تھا۔ طوطے نے ہلکی سی اڑان بھری اور میز سے لگی کرسی کی پیٹھ والی پٹی پر آبیٹھا۔ اب اس کے پنجوں کی گرفت کرسی پر گویا مضبوط تھی۔ "گستاخی معاف" طوطا بولا۔ ایک بات میرے لیے بہت اہم ہے۔ "مجھے یہ اطمینان دلا دیجئے کہ آپ نے بلی صاحبہ کو تو پال نہیں رکھا ہے۔" میں نے سوچا دھونس جما دوں۔ دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ اگر ڈر گیا تو طوطا اڑ نکلے گا۔ یا پھر اگر ٹھہر بھی گیا تو سہمی سہمی حالت میں دل لگا کر بات نہ کر سکے گا۔ میں نے اطمینان دلایا کہ آس پاس بلی موجود نہیں ہے۔ میں نے پوچھا۔ "جناب شانِ نزول سے واقف کروائیں۔"

"ضرور ضرور"۔ طوطے نے کہا۔ "بلکہ رسمی تعارف بھی ضروری ہے۔" طوطے نے ہلکی سی سُریلی سیٹی بجائی۔ "یہ سیٹی دراصل مجھ بے زبان کا اظہار خوشی ہے۔ ہنسی کے لوازمات، یعنی تبسّم۔ قہقہہ وغیرہ سے ہم محروم ہیں۔" طوطے نے گردن کو دائیں بائیں موڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "اس ایک مُشت بال و پر کا کوئی نام نہیں۔ ایک آم کے پیڑ کی کھوہ یاد ہے جہاں میں عدم سے وجود میں آیا۔ ایک ویران سا باغ تھا۔ سوکھتے درختوں کے جھنڈ تھے۔ شاید کبھی وہ باغ سیر کی اچھی جگہ بھی رہی ہو۔ میں اپنے گھونسلے سے نکلا اور پہلی اڑان بھری تو دنیا کو بڑی حریص نظروں سے دیکھا

رہا۔ موسم شناسی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ مردم شناسی میں دیر لگی۔ دیر و حرم۔ سماج اور ماحول۔ انسان کی بلندی و پستی غرض، اس ایک مشتِ بال و پر نے آپ کو میرا مطلب ہے آدمی کو خوب طرح پہچان لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب یہ بتائیے آپ کو کس نام سے یاد کروں"

ہلکی سی سیٹی طوطے نے بجائی۔ اور بولا۔ "نام، ابن آدم کی خصوصیت ہے فلاں ابن فلاں۔ خاندان، شجرہ، حسب نسب ان تمام باتوں سے ہم پرندے اور جانور بے نیاز ہیں۔ آپ لوگوں نے اپنے لیے نام و نسب اختیار کئے اور عالم تمام کی مخلوق کی درجہ بندی، وغیرہ بھی کر دی۔ ہمارا شمار پرندوں میں ہے اور پھر ہم لوگ 'طوطے' کہلائے جاتے ہیں دوسرے پرندوں کو بھی علحدہ علحدہ نام آپ نے ہی دے رکھے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آدمی اور جانور میں بھی ساتھ رہنے کا تعلق ہے۔ پالتو جانوروں سے اپنے کام کی خاطر آدمی نے ہمیشہ رشتہ جوڑ کر رکھا ہے۔ پرندوں کو تو محض تفریح اور زینت کے لیے پال رکھا ہے۔ بولنے والے پرند، چہچہاتے پرند۔ کوکتی کوئل، پی کہاں پی کہاں کی پکار والے پپیہے۔ یہ سب انسان کے ذوقِ سلیم کا مظہر ہیں۔"

طوطے نے بات کاٹ کر کہا۔ "ذرا تھم جائیے۔ آپ کو تو ایک سند ملی ہوئی ہے کہ آپ کائنات کی احسن ترین مخلوق ہیں دنیا کے سارے وسائل آپ کو مہیا ہیں۔"

"بے شک بے شک۔" میں نے کہا۔ "انھی میں ہماری عقل و فراست کارفرما رہتی ہے چنانچہ چاند تارے ہمارے لیے اب فرش بن رہے ہیں۔" طوطے نے کہا۔ "سند کی ایک ہی سطر آپ بھی مجھ طوطے کی طرح رٹ چکے ہیں۔ دوسری ذمہ داریوں اور شرطوں کی طرف دھیان دینے کی بات بھول جاتے ہیں یہ آدمی کی مکاری بھی ہے اور خود فریبی بھی۔"

"میاں مٹھو بیٹھے" میں نے جل بھن کر تقریباً دانت پیستے ہوئے کہا۔ "دنیا چلانے کے کاروبار سے آپ کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے ویسے اعتراض کر دینا بہت آسان بھی ہوتا ہے۔"

طوطے نے سیٹیاں بجائیں۔ پروں کو خوب پھڑپھڑایا۔ اور ایک بار گویا ساکت و صامت ہو کر بیٹھ رہ گیا۔

میں نے کہا۔ "میاں مٹھو۔ صبح صبح گھر والی سے لڑ کر نکلے ہو۔ مزاج میں تلخی زیادہ ہے"، طوطے نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ "آدمی کا کھسیانا پن بھی دیکھنے کے لائق ہوتا ہے دنیا کو چلانے کا کاروبار آپ کا دردِ سر ہے۔ دنیا کے وسائل کے لیے آدمی آدمی سے لڑتا ہے وسائل بانٹ کر آپس میں تقسیم کر لیتا ہے۔ ایک محروم ہو جاتا ہے دوسرا قابض ہو جاتا ہے۔ ہم جانوروں کے لیے اپنے آپ کو گوشت خور پرندوں اور درندوں سے محفوظ کر لینا ہی ایک مسئلہ ہے۔ ورنہ اولاد آدم نے کرۂ ارض پر اپنی غرض کے لیے اپنے ہی بھائیوں کے خون کے دریا بہا دیئے ہیں۔ بڑے پیمانے کی جنگ، عالمی جنگ کو چھوڑیئے اپنے شہر میں، قصبے میں، اپنے مکان کی چھت کے نیچے ذرا ٹٹول کر دیکھئے معیار کی انسانیت برقرار ہے۔ . . . ."

"مٹھو میاں" میں نے پوری بات کو نظر انداز کر کے ٹالنے کی خاطر عنوانِ گفتگو بدلنا چاہا۔ "تمہارا سلسلہ نسب اُن طوطوں سے تو نہیں ہے جن کا ذکر شاہزادہ جان عالم اور شہزادی بدر منیر وغیرہ کے قصوں میں آیا ہے۔ . . ."

طوطے میاں پر ایک گویا مسرت کی لہر دوڑ گئی دو چار مسلسل چھوٹی چھوٹی سیٹیاں بجاتے رہے۔ اور پھر بولے "خوب یاد دلایا۔ آداب عرض ہے۔ ہم طوطوں کو گھر کی بیبیوں کا دشمن سا بنایا گیا ہے۔" حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک بات صاف اور واضح یہ ہے کہ ہم سچ بولتے ہیں۔ آئینہ صفت ہیں۔ آپ لوگوں کا معیارِ وفا ہی کچھ نرالا ہے۔ کُتّے کی وفاداری جاں نثاری کے چرچے خوب ہیں وہ بے زبان بے چارہ روٹی بوٹی پر قناعت کر کے گھر کی دربانی کر لیتا ہے دنیا میں خلوص کے ساتھ ساتھ سلوک بھی ضروری ہے سلوک بھی بے لوث ہونا چاہیئے ورنہ کتے کی وفاداری پر جان چھڑکنے والا انسان اپنے ہی بھائی کو عورت، اور مال کے لیے کتے کی موت مار دیتا ہے"۔ میں نے دیکھا طوطے میاں جلی کٹی پر آ گئے ہیں۔ درمیان میں بات ان کی روک کر میں بول اٹھا "تمہارے لیے کچھ میوہ ڈھونڈھ کر لاتا ہوں"۔ اندر مکان میں تلاش کرنے پر گاجر اور مونگ پھلی کے دانے مل گئے۔ ایک طشتری میں رکھ کر لے آیا اور میز پر اُن کے قریب رکھ دیا۔ پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ تب تک بڑے غور سے گردن کو گھما گھما کر طوطے میاں نے کمرے کا مکمل جائزہ سا لے لیا۔ اب پُھدک پُھدک کر میز پر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد بڑی باوقار چال سے شغل کرتے رہے۔ پھر گاجر سے شغل کیا۔ اور پھر کرسی کے ہتے پر آ بیٹھے۔

"میرے خیال میں اب ضروری ہے کہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں"۔ طوطے میاں بڑی سنجیدگی سے بولے میں نے کہا۔ "میرا کچھ کہنا بے کار ہوگا۔ اب تم ایک بار آ ہی چکے ہو۔ آتے رہو۔ ملتے رہنے میں عیب ہنر معلوم ہو جائیں گے"۔
طوطے میاں نے سیٹی بجائی۔ اور بولے "خوب خوب۔ میرا اندازہ درست نکلا"

"کیسا اندازہ ـــ"؟ میں نے واقعی حیرت سے پوچھا۔

"آدمی گہرے ہو۔ مگر ڈوبے ہوئے نہیں ہو"۔ طوطے میاں بولے

"یعنی"؟ میں نے پوچھا "کیا مطلب"۔؟

"مجھے خواہ مخواہ ہی سیکھنے آپ سے ملتے رہنے کی خواہش ہوتی رہی ہے۔ آئندہ بھی ضرور آؤں گا۔ مگر میری طبیعت کا بھی لحاظ آپ کو رکھنا پڑے گا"۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ "آیئے۔ قریب آ جایئے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں آپ کو تھام کر آپ کے دل کی دھڑکن اور بال و پر کی حرارت محسوس کرنا چاہتا ہوں"۔
طوطے میاں وہاں سے اُڑ کے میری کلائی پر آ بیٹھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ان کو سمیٹ لیا ان کے ننھے سے دل کی دھڑکن میں کوئی غیر معمولی تیزی نہیں تھی۔ گوشت اور ملائم پروں سے بہت ہی خوشگوار حرارت نکل رہی تھی۔ میں نے یوں ہی اُٹھائے ہوئے اپنے چہرے کے مقابل کر لیا۔ مضبوط سرخ چونچ۔ خلائی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک۔ میں نے دوبارہ میز پر انھیں چھوڑ دیا۔ وہ بولا:
"آپ کے کمرے میں یوں لگتا ہے آپ کو کوئی آ کر چھیڑنے والا نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ "تو یہ ایک باہمی سمجھوتہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے اپنے وقت پر آنے والے آتے ہیں۔ آج اور ابھی کسی کی توقع نہیں ہے۔ تم آرام سے ٹھہر سکتے ہو"

"میں سمجھتا ہوں ضروری ہے کہ آپ میری باتوں کا ذکر کسی سے نہ کریں"۔

"کیوں بھئی؟" میں نے پوچھا۔ "طوطے تو بولتے ہی ہیں۔ لوگوں کو اچنبھا کیوں ہوگا؟" طوطے نے ایک عجیب سے زاویئے پر گردن موڑ دی۔ وہ بولا "میں چاہتا ہوں ہماری یہ ملاقاتیں محض راز ہی رہیں۔ میرے ہنر کی تشہیر نہیں ہوگی۔ بات یہ ہے کہ بہت عرصہ ہوا میں خاموشی سے سنتا آرہا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں اب مگر کچھ بولنا بھی چاہتا ہوں بات سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

میں نے دیکھا کہ طوطے میاں بڑے سنجیدہ بن رہے ہیں۔

"یار تم لوگوں ہی کے طریقے پر محاورہ طوطا چشم، بنا ہے۔ تم آؤ گے یا نہیں"؟ ہلکی سی سیٹی طوطے نے بجائی اور بولا۔ "آدمی اپنے معیار سے اپنے مطلب اور فائدے کی کسوٹی پر کسی کو بھی کچھ کہہ لے ورنہ پنجرے سے باہر آزاد فضا میں مرجانا بہتر ہے یا قفس میں آرام سے زندہ رہنا۔ یہ آپ نہیں سمجھ پائیں گے"۔

اور پھر طوطے نے ہلکی سی اڑان بھر کے کمرے ہی میں طواف جیسی گردش لگائی اور میز پر آبیٹھا۔ "آپ اگر چاہیں اور مجھے موقع ملتے رہیں تو ملنے اور بات کرنے کے لیے آتا ہی رہوں گا۔ لیکن آپ میرے لیے سونے چاندی کا پنجرہ بنا کر دیں اور چاہیں کہ اس میں بند رہوں۔ یہ مجھے قبول نہیں ہوگا"۔

میں نے کہا۔ "آوارہ مزاجی جوہری"۔ اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ طوطے میاں بولے۔ "سنیئے شوخی اور بھکڑ پن میں تمیز اصل چیز ہے۔ ناز کرنا اور غرور کرنا۔ علحدہ علحدہ چیزیں ہیں۔ آوارگی اور شوخی میں آپ فرق نہ کریں تو شیوہ اہلِ نظر کا حشر معلوم . . . " میں نے اور ہی ڈھنگ سے دام پھیلانا چاہا۔ کہا۔ "بات یہ ہے کہ چہیتی چیز کو نظروں کے سامنے ہی رکھنا ضروری ہوتا ہے لمحہ بھر کی جدائی بھی بارِ خاطر ہوجاتی ہے۔ اب تم جیسا طوطا حادثاتِ زمانہ کے خطرات میں گھرا ہوا رہے تو تمہارے چاہنے والے بےسکون و راحت ہوجائیں گے۔ اس انتشار بھرے ماحول میں بقول خود تمہارے "ایک مشت غبار" بال و پر کہاں کہاں جان بچاتا پھرے گا؟"

طوطے میاں نے گردن لمبی کرکے میری پوری تقریر سنی۔ اور بولے۔ "ذرہ نوازی بہت۔ آئیں کے لیے شکریہ۔ آپ یقین کیجئے کہ توکل اور خدا پر بھروسہ موت پر یقین ہم میں رچا ہوا ہے۔ ہاں احتیاط کو ہمیشہ علاج سے بہتر جانتے ہیں۔ مگر ہر وقت ہر بات پر سمجھوتہ ہم نہیں کرتے۔ کم از کم "میں" ناچیز تو اس پر پابند ہوں۔ پر بند قفس میں رہ کر بھی موت سے فرار نہیں۔ پھر آزاد فضا میں آخری سانس لینا ہی بہتر ہے"۔

"سنو" میں نے کہا۔ "تم کو اگر میں "ناچیز" کے نام سے بلاؤں تو کیسا رہے گا ـــــ"

نیم دائرے کی شکل میں طوطے کی گردن مڑ کر رہ گئی۔ پھر بولا۔ "مناسب ہے۔ بہتر ہے۔ آپ ناچیز ہی سمجھیں۔ آخر کو ابنِ آدم نہیں ہوں ـــــ" لہجے میں شوخ اداسی سی آگئی تھی میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کو حقیر جان کر ایسا کہا ہے۔ تم واقف نہیں ہو انکساری سے کام لے کر مستند عالموں نے اپنے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے ـــــ

طوطے نے کہا۔۔۔ خوب جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کو پتہ نہیں ناچیز دو چار زبانوں سے بھی واقف ہے۔ پڑھ لیتا ہوں سن کر سمجھ لیتا ہوں۔۔۔" میں نے بات کاٹی اور کہا۔" تب تو سچ مچ تم ناچیز کہلانے کے لائق ہو۔۔ اور آج، بلکہ ابھی سے تمہارا نام ناچیز قرار پایا۔۔ بولو۔ منظور؟" طوطے نے سیٹی بجائی۔ اور پھر بولا" قبول کیا میں نے۔ ۔ ۔ آج سے یہ بندہ آپ کے لیے ناچیز ہوگا۔۔۔"

میں نے شرارتاً کہا۔" ناچیز بھی ایک چیز ہے،

" جی ہاں۔۔ طوطے نے کہا کیا چیز ہے۔ واللہ ۔۔۔ میں تو ہنستا رہا اور ناچیز ہلکی ہلکی سیٹیاں بجاتا رہا۔

ناچیز نے کہا۔۔" اچھا جناب۔ آپ میری وجہ سے آج کا تازہ اخبار پڑھنے سے رہ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے ٹوک دیا۔" اخبار پڑھ چکا تھا۔ سرسری طور پر۔ ہاں تفصیل سے چن چن کر خبروں کو دیکھنا چاہتا تھا۔" " برا مت مانیے" ناچیز نے کہا۔۔ اخبار کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اخبار کی سطروں کو پڑھ لینے کے بعد اتنا شعور ضرور چاہیئے کہ بین السطور یعنی "BETWEEN THE LINES" بھی پڑھ سکیں۔۔" کچھ دیر ہم دونوں پر خاموشی طاری رہی۔ لیکن اس میں بوجھ، دباؤ یا گھٹن پیدا کرنے والی بات نہیں تھی۔

" مجھے معلوم ہے" ناچیز نے کہا" آپ میں یہ صلاحیت ہے۔ میں طبیبِ حاذق کی طرح علامتوں سے آدمی کو جان لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔۔۔ اپنے حالات سے باخبر رہنے کے لیے اخباروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ تجزیہ تحقیق اور حالات سے مقابلہ کرکے سچ اور جھوٹ کی تمیز کرلی جاسکتی ہے۔ ناچیز نے بات کاٹی۔" یہ اخبار، خبروں کا حامل دھوکے اور فریب دینے کے لیے استعمال ہورہے ہیں۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے، بے صبری کے ساتھ اس کو ٹوکا۔

" ہر ملک کا آدمی اب باشعور ہے۔ دھوکے کی سیاست، دھوکے کے سماج اب زیادہ نہیں پنپ سکتے۔"

" ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ایک حد تک ہی درست ہو۔ ورنہ ہمارے اس ملک میں ابھی اخبار پڑھنے والے لوگ کتنے ہوں گے۔ اور پھر پڑھ کر سمجھنے والے کتنے ہوں گے"۔ طوطے میاں ناچیز نے فرمایا۔

" تم فقط مایوس کرنے والا پہلو ہی دیکھتے رہو گے"، میں نے چڑ کر کہا۔ ناچیز نے فوراً کہا۔" خوش فہمی اور خود فریبی نے آپ کو دھندلا دیا ہے۔ وہ ہیں نا ایک احمد ندیم قاسمی۔ انھوں نے شاید کہا ہے۔" کانچ کے سپنے ٹوٹ نہ جائیں۔ آہستہ آہستہ بولو۔" میں حیران یاد کرتا رہ گیا کہ احمد ندیم قاسمی کی کونسی نظم سے یہ مصرعہ اٹھایا گیا ہے۔ ناچیز کہہ رہا تھا۔" رفتارِ زمانہ اتنی تیز ہے کہ آپ اپنے حواس سمیٹتے ہی رہ جاتے ہیں اور عیاروں کا طربیہ طاالٹ دیتا ہے۔ اب میرا بھی موڈ بگڑ رہا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے آئندہ پھر کبھی آجاؤں گا۔۔" پھر لیک کراس نے اڑان بھری اور کھڑکی میں جا بیٹھا۔ میری طرف رُخ کرکے ایک بار سیٹی بجائی۔ اور کہا آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی اگلی فرصت معلوم کرکے ہی آجاؤں گا "مگر اس طرح ادھوری باتوں سے تشنگی باقی رہ جائے گی"۔۔ میں نے قریب جاکر کہا۔" تشنگی بھی خواہشوں کی طرح ہے کب پوری طرح سیر کب ہونگے؟ ہر خواہش پر دم نکلتا سا لگتا ہے۔ اب خدا حافظ" اور پلٹ کر اس نے پر تولے۔ ایک لمحے میں اُڑ

غزلیں

مسعود احمد جھاپڑ
(ناگپور)

اُن کے ڈیڈی کو رام کرلوں کیا — ٹوڈی میں ہیں سلام کرلوں کیا
قوم کے مال کو ہڑپ کرکے — میں بھی کچھ نیک کام کرلوں کیا
مجھ کو معلوم ہے گدھا ہے وہ — اس کا میں احترام کرلوں کیا
بیوی کے رعب و داب میں رہ کر — اپنا جینا حرام کرلوں کیا
اپنے قبضے میں وقت کھتا ہے — میکدے کا نظام کرلوں کیا
مجھ کو دھکا جو دے رہے ہو تم — دل میں گھس کر مقام کرلوں کیا
روز لڑ لڑ کے اپنی بیگم سے — صبح کو کالی شام کرلوں کیا
شاعر آل انڈیا بن کر — تم سے بھی ہڑ کلام کرلوں کیا
مار کر سب کو طنز کے جھاپڑ — اپنا دنیا میں نام کرلوں کیا

٭ ٭ ٭

ٹیم کا کپتان، ہوتا ہے گماں دم باز ہے — اس لئے چوپٹ ہمارے گیم کا انداز ہے
صرف اپنی ہی نہیں یہ خلق کی آواز ہے — پندرھویں ہجری صدی کا ڈینجر آغاز ہے
اللہ اللہ قوم کے لوگوں کی کیا پرواز ہے — ہے پتنگ باز اب کوئی، کوئی کبوتر باز ہے
لوگ جس سے لیتے تھے جاکر سبق اخلاص کا — اب ریاکاری کا اڈّا اس کی بزم ناز ہے
وہ مری تعریف کرتا ہے کبھی تو اس طرح — شعر تیرے کچھ بھی ہوں تو شاعر ممتاز ہے
نغمۂ ملت کہو کس طرح ہم آہنگ ہو — حال بے تال اپنا، اپنی بے سُری آواز ہے
میں پڑا تھا پاؤں پھیلا کر کسی نے دی صدا — "اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے"
آج کے بیماروں میں افسوس ہے کل کا حکیم — کل کا بیمار آج کے حکماء کا چارہ ساز ہے
جلد ہی دنیا کا جھاپڑ بجنے والا ہے بگل — سب کو اپنی جارحانہ قوتوں پر ناز ہے

محمد حفیظ الدین فردوس
(کریمنگر) اے پی

"بیسویں صدی کا دَوْر"

دادا گری میں نام کمانے کا دور ہے — نکٹے کے آگے ناک کھانے کا دور ہے
کھانے کا دور ہے نہ کھلانے کا دور ہے — مہماں جو آئے گھر تو بھگانے کا دور ہے
لاٹھی ہے جس کے پاس وہی بھینس ہانک لے — لٹھ کو ہوا میں اپنی گھمانے کا دور ہے
یارو! اُدھار مانگ کے شرمندہ مت کرو — دے کر اُدھار جان گنوانے کا دور ہے
زندوں کے نام پر کبھی مُردوں کے نام پر — چندہ وصول کرکے کمانے کا دور ہے
دھوکا، فریب، جھوٹ، ریاکاری، دشمنی — ایک دوسرے کا خون بہانے کا دور ہے
یہ بیسویں صدی کا اے فردوسؔ دور ہے — کل جگ ہے شان جھوٹی دکھانے کا دور ہے

عاصی سعید
(عمری کلاں مرادآباد)

سکھی رہو بچہ

ایک دُعا ہے، مشہور و مقبول و معروف و موثر۔ ہر کس و ناکس نہیں دے سکتا، ہر کس و ناکس کو نہیں دی جاتی۔ کسی کسی کے مقدر میں ہوتی ہے، کسی کسی مقدر میں۔ زبان ہی سے دی جاتی ہے۔ فی زمانہ آنکھوں آنکھوں میں، اشاروں میں، کنایتہً چہرے کی حرکات اور ہاتھوں کی جُنبش سے بھی دی جانے لگی ہے۔ ہوا یوں تھا، جب حیاتِ مستعار اجسادِ خاکی کے پنجروں میں مقید کر کے عالمِ بالا سے روئے زمین پر بھیجی گئی تھی تو اُسے بیماریوں، زلزلوں، طوفانوں، حادث؟ غرض جملہ بلیاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ و مامون رکھنے کے لیے دعاؤں کا نزول بھی ساتھ ہی ساتھ ہوگیا تھا۔ سکھی رہو بچہ، انھیں دعاؤں میں سے ایک ہے، جو بمنزلہ حفاظت کی گارنٹی کے کچھ خوش نصیبوں کو مل جاتی ہے۔ حفاظت کی یہ گارنٹیاں نہیں ہوتیں تو قوم نوح کے ساتھ نوح کی کشتی میں رکھے ہوئے مخلوقِ خدا کے چند جوڑے اور خود نوح بھی اُس سیلاب کی زد سے نہیں بچ سکتے تھے، جو ایک بڑھیا کے چولھے سے اچانک اُبل پڑا تھا۔

"سکھی رہو بچہ" ایک دُعائے خاص ہے۔ دعا کی جان دُعا کا مفعول یعنی بچہ ہے، جیسے غزل میں بیتِ غزل، جیسے بندوں میں ٹیپ کا بند، جیسے خلئے میں مرکزِ حیات، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی اُونچے سے نیچے کو دی جارہی ہے، کسی عالمِ بالا والے کی طرف سے کسی عالمِ اسفل والے کو، جیسے ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کو دان، فاعل کے خالص کرم کا نتیجہ۔ دُعا دینے والے کی نظر میں چھ برس کا بچہ ہے، ساٹھ برس کا بڈھا بھی بچہ، گویا لفظ بچہ، بچہ نہیں، علامت ہے عالمِ اسفل میں رہنے والے کسی کسی قابل ترین انسان کی۔ یہ دُعا خاص مخلوق کے مُنہ سے نکلتی ہے، جو مخلوق بہ نسخۂ خاص تیار شدہ ہوتی ہے۔ اس مخلوق کو سائیں بابا کہتے ہیں۔ سائیں باباؤں سے مراد اُن عام بھکاریوں سے نہیں جو ایک ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا لکڑی کا سونٹھا لئے، دوسرے ہاتھ میں کشکول، کمر پر جھولی ڈالے، دریوزہ گری کرتے بھیک مانگتے "جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اُس کا بھی بھلا" کی صدائیں لگاتے پھرتے ہیں۔ سائیں بابا تو عظیم انسانوں سے ہیں، ارض و سما کی حقیقت سے آگاہ شرابِ معرفت سے مدہوش، سکونِ قلب کی دولت سے الامال، عیال داری اور ازدواجی بندھنوں کے جال سے باہر، فکرِ معاش سے آزاد، دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز۔ کسی ایک جگہ مستقلاً اقامت پذیر نہیں ہوئے، خانہ بدوشوں کی طرح بھی نہیں پھرتے۔ زمان و مکاں کی حد بندیوں سے ماورا، "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"، اُن کی پرواز دنیا داروں کی رسائی سے باہر کہیں آسمانی فضاؤں میں ہوتی ہے۔ ثمرِ نجات پائے ہوئے، ذہانت اور فطانت سے مملو، اعلیٰ و ارفع مقامات

حاصل کیئے ہوئے۔ اُن کی آنکھوں کے مرکزی نقطوں میں ایک کشش ہوتی ہے، وہ خدارسیدہ ہوتے ہیں، گویا خدا تک جا ہی چکے تھے، پھر سے ارضِ حقیر پر بھیج دیئے گئے ہوتے ہیں، کہ یہاں تو تمہاری سیٹ فرسٹ کلاس میں ریزرو ہو چکی ہے، تمہارا کچھ کام ابھی دنیا میں باقی ہے، دنیا والوں کو ابھی تمہاری فیض رسانی کی ضرورت ہے۔ دنیا میں آکر یہ بزرگ چھپے ہوئے ہی رہتے ہیں، کبھی کبھی ہی ظاہر ہوتے ہیں، وہ بھی کسی کسی کو، حقوقِ شہریت سے محروم ہوتے ہیں، ووٹرس لسٹ VOTERS LIST تک میں اِن کا نام نہیں ہوتا۔ اچانک وہ کہیں بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ دنیاداروں میں کسی کو بھی "سُکھی رہو بچہ" والی دعا دے جاتے ہیں۔ اُن کی مرضی راجہ بھوج کو دے دیں یا گنگا تیلی کو۔ اکثر دُعا دے کر دعا کے معقول کو عالمِ حیرت میں چھوڑ کر، چشمِ زدن میں کھڑے کھڑے غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتے ہیں جس کے پکڑنے کے لیے صدہا لوگ وظیفے پڑھتے ہیں کہ سائیں بابا، جنگل میں، آبادی میں، کنوئیں میں، پہاڑوں میں، کہیں بھی انھیں مل جائیں، دُعا بھی دے جائیں دوا بھی بتلا جائیں، یہی کوئی جنگل کی جڑی بوٹی جو بواسیر کا حُکمی علاج ہو، یا درد مفاصل کا، یا عرق النسا کا، یا ضیق النفس کا جس سے وہ پُرانے لیترے کی طرح گٹھے جائیں، مالامال ہو جائیں، اور سائیں بابا کو تا زندگی دُعا دیتے رہیں۔ نالائق نہیں جانتے کہ سائیں باباؤں کو دُعاؤں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ دُعائیں لیتے نہیں، دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں ہر چیز کا اِمی ٹیشن (IMITATION) چل پڑا ہے، سونے کا، چاندی کا، سنگِ بنیاد گھر لوٹ کا، باٹا کے جوتوں کا وغیرہ۔ بعض لوگ کتے نہیں ہوتے، پھر بھی کتوں کی طرح بھونک لیتے ہیں، بکری کی طرح ممیا لیتے ہیں۔ اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ بیل تانگے میں بیٹھ کر ہم ایک دیہاتی میلہ دیکھنے گئے۔ وہاں ایک خیمے کے پیچھے میدان میں تانگہ چھوڑ دیا۔ اُس خیمہ کے اندر ایک شیر تھا۔ شیر بار بار دہاڑ رہا تھا۔ ہمارے بیل شیر کے دہاڑنے پر کبھی تو بِدک جاتے کبھی کان کھڑے کر لیتے تھے، چوکنا ہو کر بھاگنے کے لیے رسّے تڑاتے تھے۔ شیر کی اکثر دہاڑوں پر اُن کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ ہم نے اپنے بیل بان سے کہا! یہ کیا معمہ ہے؟ اُس نے خیمے کا زمین پر لٹکا ہوا پردہ اٹھا کر جھانکا۔ دیکھا کہ جب مالک کمپنی شیر کے ملازم کے ڈنڈے سے مارنے پر بھی اکثر شیر نہیں دہاڑتا، تو کٹہرے کے پیچھے چھپا ہوا ایک ملازم، ایک ڈھول پر چڑھی ہوئی ہر دو طرف کی کھال کے درمیان بنائے ہوئے سوراخوں میں، بانس کی ایک بھیگی ہوئی پتلی سی تراشیدہ چھڑ رگڑ دیتا ہے، جس سے بالکل شیر کے دہاڑنے کی جیسی آواز نکلتی ہے۔ جانور اُسے پہچان جاتے ہیں، انسان دھوکے میں آجاتے ہیں اور غصیارے شیر کو دیکھنے کے لیے باہر بکنگ آفس سے ٹکٹ خرید کر جوق در جوق خیمے کے اندر چلے جاتے ہیں۔ بس سائیں بابا کی مذکورہ دُعا "سُکھی رہو بچہ" کی بھی یار لوگ نقل کرنے لگے ہیں، قطع نظر اس سے کہ اُن میں دور دور تک کچھ سائیں باباؤں والے خواص نہیں!

اِس زُمرہ میں، موجودہ چند ہمارے وہ یار لوگ بھی ہیں، جو کبھی ہمارے جگری دوست تھے، اب خالی دوست بھی نہیں رہے، شناسائی تک سے چھٹی ہو گئی، اس لیے کہ اب وہ اونچے ہو گئے، ہم نیچے رہ گئے۔ ہم اپنے پرانے جھونپڑوں میں پڑے رہ گئے، وہ اپنے پرانے جھونپڑے چھوڑ کر (یونہی چھوڑ کر نہیں، بیچ کر۔ آج کل یونہی چھوڑ دینے یا کسی کو پُن کر دینے کا زمانہ کہاں؟ زمینیں، مربع سینٹی میٹروں میں بک رہی ہیں) عالیشان محلوں اور کوٹھیوں میں رہنے لگے۔ وہ کاروں میں دوڑنے لگے، ہوائی جہازوں سے اُڑنے لگے، ہم پیدل ہی گھسٹتے ہیں، ہوائی جہاز تو کبھی قریب سے دیکھا تک بھی نہیں، بس اُڑتا دیکھا ہے۔ الغرض، ہم کثافتوں سے دوچار ہیں، وہ لطافتوں سے ہمکنار ہو گئے۔ ہم زمین کی پستیوں پر ہیں، وہ آسمان کی بلندیوں پر۔ وہ صحیح معنوں میں جی رہے ہیں، ہم صحیح معنوں میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ہم اُن کے عروج کے مقناطیس کی کشش سے اُن کی طرف تابع مہمل کی طرح کھنچ جانا چاہتے ہیں، وہ ہمیں مُنہ بھی نہیں لگاتے، گھاس ہی نہیں ڈالتے، لفٹ ہی نہیں دیتے، اس لیے کہ اب ہم کالے آدمی ہیں، اور وہ [illegible] (SUPERIOR) [illegible]

کچھ سپیریرٹی کمپلکس (SUPERIORITY COMPLEX) کی افیون بھی جان بوجھ کر کھائے رہتے ہیں جس کا اثر اُن کے اُٹھنے بیٹھنے، لوگوں سے ملنے جلنے میں، اُن کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہوجاتا ہے، جیسے بی کمپلکس B-COMPLEX کے کیپسول کھانے والے کے بول میں

بصد جرأت و بہ ہزار حماقت خود، کبھی ہم انھیں یاد دلا دیتے ہیں کہ آپ اور ہم کبھی ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے، آپس میں جگری دوست تھے، گویا "کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" تو وہ بظاہر یادوں کے گھوڑے پر سوار، ماضی کے تصورات کے میدان میں اُتر تے، بڑی دیر تک اپنے دماغ پر بڑا زور ڈالتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری شومیٔ قسمت سے انھیں یاد ہی نہیں آتا۔ پھر بھی بطور کرم خاص ہمیں سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے آنکھوں اور لبوں کے ہلکے تبسم کے ساتھ، وہ اپنا داہنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے اس طرح حرکت دیتے ہیں، جیسے ہمیں دوری سے تھپک رہے ہوں۔ اُن کی آنکھوں سے ہمیں آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اُن کا اوپر نیچے (VERTICALLY) اور آہستگی سے ٹھہر ٹھہر کر ہلتا ہوا چہرہ اس کی غمازی کرتا ہے کہ پہچان تو نہیں سکے، کوئی بات نہیں، اشاروں اشاروں میں دُعا گو ہیں کہ پھر بھی "سکھی رہو بچّہ" اشاروں میں اس لیے کہ اپنے نقلی سائیں بابا ہونے کا تو انھیں بھی احساس ہے، زبان سے اعتراف اچھا نہیں ہوتا۔ ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر بھیجتے ہوئے، خوشی خوشی گھر کو دوڑے چلے آتے ہیں کہ سکھی رہو بچّہ ہی تو کہا، دکھی رہو بچّہ بھی تو کہہ سکتے تھے نقلی سائیں بابا جو ٹھہرے۔ ہمیں ایسے موقعوں پر جانوروں کا سا شعور حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ صد فیصد نقلی سائیں بابا ہیں۔

دنیا کی متنوع خوش رنگیوں میں ایسی بد رنگیاں خال خال ہیں، ہونی چاہیں۔ کالے نہ ہوں تو گوروں کو کون پوچھے، اُن دوستوں کی کہاں قدر ہو جو جاہ و منصب و ناموس سے ہمکنار ہونے کے باوجود، مدت کے بچھڑے پُرانے دوستوں کو دیکھ کر گلاب کی طرح کھل جاتے ہیں، گھر چلنے اور ساتھ کھانے کے لیے اصرار کیا کرتے ہیں۔ نقلی سائیں باباؤں سے بچنے کا [illegible] اور طریقہ یہی ہے کہ "تسلیمات"، وہ بھی جب، جب وہ آداب بجالائیں۔ نہیں تو اللہ اللہ خیر صلاّ۔ وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش!

نامور مزاح نگار
جے ت نیف یدُاللہ مہدی کی
کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ!
ٹائیں ٹائیں فش
قیمت : ۱۲ روپے

نامور مزاح نگار
مسیح انجم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ!
چنانچہ
قیمت : ۱۲ روپے

دوسرے کے خط ——— (مراسلے)

——— آپ کے خط کے کچھ دن بعد ہی فکر صاحب ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ ان کی موت میرے لیے ایک عظیم ذاتی حادثہ تھا۔ میں ان سے قریب پینتیس برس کا یارانہ تھا۔

دلیپ سنگھ ، نئی دہلی

"غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

اخبار میں جناب فکرؔ تونسوی کے انتقال کی خبر سن کر ملال ہوا ۔ مرحوم ملک کے نامور ادیب تھے ایسے نامور ادیب کو "زندہ دلانِ حیدرآباد" ہر سال حیدرآباد بلا کر اپنی محفل کی رونق بڑھاتے تھے

مجھے یاد ہے پہلی بار جب حیدرآباد مشاعرے میں مدعو تھا تو میں اور جناب فکرؔ تونسوی ایک کمرہ میں ٹھیرے تھے اور مجھے ان کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ مرحوم بہت سیدھے سادے اور نیک انسان تھے ۔

کمال صاحب یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فکر تونسوی صاحب طنز کا ایک سمندر تھا جو روز اخباروں میں بہتا رہتا تھا۔

کمتر ۔ مقرب حسین (دیگلام)

——— یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آئندہ نومبر میں آپ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ۲۸ سالہ جشن منا رہے ہیں اور اس موقعہ پر ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین پر ایک ضخیم نمبر بھی شائع کر رہے ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔ مجتبیٰ صاحب جو دوسروں کے فن کے لتّے لیا کرتے تھے اب ان کے فن کے لتّے اٹھائیں گے ۔

[illegible]
حیدرآباد

انجمن زندہ دلانِ بمبئی کی تشکیل

بمبئی (ڈاک سے) جناب یوسف ناظم کے دولت کدے "الہلال" واقع باندرہ بمبئی پر مزاح نگاروں اور طنز و مزاح کے شائقین کی ایک نشست میں "زندہ دلانِ بمبئی" کی تشکیل عمل میں آئی۔ اتفاق رائے سے درج ذیل عارضی انتظامیہ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر : یوسف ناظم، جنرل سکریٹری ۔ فیاض احمد فیضی، خازن : اے ۔ اے ۔ کاٹھے ۔

ممبران : ڈاکٹر رفیعہ شبنم، یونس پیلا، عبداللہ مہدی، الیاس شوقی، ساجد رشید، ابراہیم دلیلے، محمد یوسف خان، سید شرف حسین ۔

شرکائے میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے جنرل سکریٹری فیاض احمد فیضی نے کہا کہ بمبئی شہر کی تین سربرآوردہ شخصیتوں ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا جناب شیام کرشن نگم اور جناب سلطان ناتھانی نے انجمن زندہ دلانِ بمبئی" کی سرپرستی قبول فرمائی اور زندہ دلانِ حیدرآباد نے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔ میٹنگ میں طے کیا گیا کہ ۱۶ اکتوبر ۸۷ء کو الماس لطیفی ہال میں زندہ دلانِ بمبئی کی افتتاحی تقریب منعقد کی جائے گی جس میں مزاحیہ مشاعرہ، محفل لطیفہ اور مختلف مزاحیہ پروگرام ہوں گے ۔ اس موقع پر شائع ہونے والے سووینیر میں شاعروں اور فن کاروں کی تصاویر، کلام اور مضامین بھی شائع کیے جائیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا معیاری تفریح مہیا کرنے اور طنز و مزاح کی ترویج و اشاعت کے لیے مستقبل میں باقاعدگی سے سمینار، کانفرنس اور ایسے تفریحی پروگرام منعقد کیے جائیں گے ۔ ۱۶ اکتوبر کو منعقد ہونے والی افتتاحی تقریب کا نام "شام قہقہہ" ہوگا ۔

اداریہ

پچھلے ایک مہینے میں طنز و مزاح کے دو چراغ بجھ گئے جن کی تحریروں کی روشنی نے اردو طنز و مزاح کے ایوان کو منور کر رکھا تھا۔ جن کی دوستی اخلاص اور محبت سے دور رہنے والے لوگ ایک عجیب قربت و یگانگت محسوس کرتے تھے جو طنز و مزاح کے ذریعے ایک سماجی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ میری مراد فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا سے ہے۔

شگوفہ اور فکر بھائی کا تعلق وہی تھا جو اس پرچے سے اس کے مدیر کا ہے۔ انھوں نے شگوفہ کو کبھی خود سے الگ نہیں کیا۔ جب شگوفہ کے اجرا کا خیال ہوا تو میں نے دلی پہنچ کر ان سے آشیرواد حاصل کی۔ انھوں نے ہمت بندھائی۔ لیکن دبے لفظوں میں یہ بھی کہا کہ کچھ دن کے لیے ہی یہ شوق پورا کر لیجیے۔ تب تک پرچہ بند نہ ہو جائے وہ قلمی تعاون سے دریغ نہیں کریں گے۔ شگوفہ چھپتا رہا۔ وہ اپنے ہر خط میں دریافت کیا کرتے کہ شگوفہ کب بند کر رہے ہو؟" چار چھ سال کے بعد تھک ہار کر اس سوال کو اپنے خط کے "نصاب" سے خارج کر دیا۔ اب وہ یہ راز جاننا چاہتے تھے کہ آخر شگوفہ پابندی سے نکلتا کیسے ہے؟ فکر بھائی ایک طرف شگوفہ کے بند ہونے کی تاریخ پوچھتے رہے تو دوسری جانب اس کے استقلال کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے رہے۔ خود شگوفہ کے لیے لکھتے رہے اور دوسروں کو اس طرف راغب کیا۔ یہ سلسلہ ان کے انتقال تک جاری رہا۔ ستمبر کے شمارے میں جو فکر صاحب کے انتقال کے دن شائع ہوا۔ جناب دلیپ سنگھ کا ایک مضمون "طنز و مزاح کا اکبر بادشاہ" شریک تھا۔ فکر بھائی نے دلیپ سنگھ جی سے کہا تھا کہ یہ مضمون شگوفہ میں شائع ہونا چاہیے۔ ستمبر کے شمارے کی کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ جناب مجتبیٰ حسین نے فون پر اطلاع دی کہ فکر بھائی پر غشی طاری ہے۔ بچنے کی توقع نہیں۔ دل دھک سے رہ گیا۔ چند دن بعد جو خدشہ تھا پورا ہوا۔ خبر آئی کہ اب فکر بھائی اس دنیا میں نہیں۔ فکر بھائی نے اپنی زندگی ہی میں "تعزیتی قراردادوں" کا نمونہ تیار کر لیا تھا۔ ان روایتی جملوں کو اس اداریہ میں دہرانا نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ طنز کے میدان میں فکر تونسوی نے جو جگہ خالی کی ہے اس کا پر ہونا محال نظر آتا ہے۔

مخدوم احمد جمال پاشا کا شگوفہ سے دیرینہ تعلق تھا طنز و مزاح کے فروغ کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر دیا تھا اور وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی جٹے ہوئے تھے۔ ان کے اچانک انتقال پر یقین نہیں آیا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ یوں بھی اپنی بیماری کی کبھی خبر ہی نہیں دی۔ محترمہ مہرو جمال کو ان کے انتقال سے جو صدمہ ہوا اس غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ — حیدرآباد

فون نمبر: 557716 — فون نمبر مکان: 521064

سوونیر

جلد (۲۰) — نومبر ۱۹۸۷ء — شمارہ (۱۱)

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کنوینر سوونیر کمیٹی:
صلاح الدین نیر

مجلسِ مشاورت
بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر
یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ، محمد منظور احمد، مسیح انجم

منیجر: مسیح جلیل — منیجر اعزازی (بمبئی): فیاض احمد فیضی

سرورق: طالب خوندمیری

کتابت: محمد غالب، محمد ماہر الزماں — طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

قیمت: ۷ روپے

زرِ سالانہ: ۵۰ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: پبلشرز گوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے

۱۔ موہن میکن بریوریز ۲۔ جلتہ ڈیری آگرہ ۳۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹیڈ ۴۔ ہارکوسری نگر
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز ٹریچور ۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی ۷۔ جیپین وہائٹ روڈس ۸۔ بیری سوئٹس اینڈ ٹافیز
۹۔ ڈرگ بھوٹان فوڈ پراڈکٹس ۱۰۔ SIL سِل (جیمس اسمتھ اینڈ کمپنی) وغیرہ۔

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیارکنندگان

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض۔ حیدرآباد

زندہ دلانِ حیدرآباد

صدر :

جناب نریندر لوتھر

آئی۔ اے۔ ایس

نائب صدور :

جناب رشید قریشی

جناب حمایت اللہ

جناب مصطفیٰ علی بیگ

معتمد عمومی :

جناب مسیح انجم

نائب معتمدین :

جناب بوگس حیدرآبادی

جناب احمد سلطان

خازن :

جناب محمد سلیمان

اراکین :

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جناب طالب خوندمیری

ڈاکٹر حبیب ضیاء

جناب برہان حسین

جناب وہاب قیصر

جناب اسلم فرشوری

جناب یوسف شریف

مجتبیٰ حسین تہنیت کمیٹی

سرپرست :

جناب اندر کمار گجرال

جناب ہاشم علی اختر

جناب عابد علی خاں

نائب صدر :

پروفیسر اشتیاق عابدی

جناب کمال الدین احمد

جناب شریف الحسن نقوی

جناب محبوب عالم خاں

جناب زاہد علی خاں

اراکین

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر خلیق انجم

جناب یوسف ناظم

جناب پروفیسر قمر رئیس

جناب بھارت چند کھنہ

جناب رضا نقوی واہی

جناب غلام احمد

جناب خلیل الرحمٰن یم پی

ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر مغنی تبسم

جناب کے ایم خاں

جناب شمس الزماں

جناب ساحر ہوشیارپوری

جناب راشد آذر

جناب ڈاکٹر رشید موسوی

جناب محمد حمایت اللہ

جناب طالب خوندمیری

جناب مسیح انجم

جناب مصطفیٰ علی بیگ

کنوینرس :

جناب کے ایل ساقی نارنگ (دہلی)

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

فینانس کمیٹی :

جناب کے ایم خاں (صدر)

جناب محمد ستار

جناب محمود الحسن خاں صوفی

جناب محمد اعظم

جناب بہاء الدین

جناب سید تہور علی

°°°

زندہ دلان حیدرآباد سلور جوبلی تقاریب ۱۸ر تا ۲۱ر نومبر ۱۹۸۷ء

○ **افتتاح سلور جوبلی تقاریب:**

۱۸ر نومبر ۸۷ء ۵ بجے شام

مقام: نمائش کلب

افتتاح: جناب بھارت چند کھنہ

صدارت: جناب نریندر لوتھر

مہمانان خصوصی: جناب یوسف ناظم

جناب مجتبیٰ حسین

○ **کل ہند ادبی اجلاس**

۱۸ر نومبر ۸۷ء ۵½ بجے شام

مقام: نمائش کلب

صدارت: منفرد طنز نگار جناب فکر تونسوی مرحوم

کو خراج عقیدت کے طور پر کرسی صدارت

خالی رکھی جائے گی۔

○ **مزاح نگار:**

یوسف ناظم، نریندر لوتھر

مجتبیٰ حسین، رشید قریشی

مسیح انجم، پرویز ید اللہ مہدی

دلیپ سنگھ، فیاض احمد فیضی

سید نصرت، ڈاکٹر حبیب ضیاء

حلیمہ فردوس

کنوینر ادبی اجلاس:

محمد برہان حسین

○ **جلسہ اعتراف خدمات مجتبیٰ حسین**

۱۹ر نومبر ۸۷ء ۵ بجے شام

مقام: نمائش کلب

صدارت: جناب عابد علی خاں

مہمان خصوصی جناب ہاشم علی اختر

اظہار خیال: جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

جناب نریندر لوتھر

پروفیسر اشتیاق عابدی

پروفیسر شمیم حنفی

جناب اختر حسن، جناب دلیپ سنگھ

پروفیسر مغنی تبسم

پروفیسر نثار احمد فاروقی

کنوینر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

○ **تنقیدی اجلاس**

۲۰ر نومبر ۸۷ء ۳ بجے سہ پہر

مقام: نمائش کلب

صدارت: پروفیسر گیان چند جین

موضوع: آزادی کے بعد حیدرآباد میں طنز و مزاح کا ارتقاء

مقالہ نگار: ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

ڈاکٹر یوسف زئی

ڈاکٹر اشرف رفیع

مباحث: ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، پروفیسر سیدہ جعفر

ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر شمیم حنفی

کنوینر: ڈاکٹر بیگ احساس

○ **محفل لطیفہ گوئی**

۲۰ر نومبر ۸۷ء، ۷ بجے شام

مقام: نمائش کلب

صدارت: جناب نریندر لوتھر

مہمانان خصوصی: جناب مجتبیٰ حسین

جناب دلیپ سنگھ

لطیفہ گو:

مصطفیٰ علی بیگ ، رشید قریشی
دولت رام ، حمایت اللہ ، محمد سلیمان
بالا پرشاد گوڑ ، موہن پرشاد
طالب خوندمیری ، مسیح انجم ، اظہر افسر
رجا سیٹھ ، عرفان خوندمیری
فیاض احمد فیضی ، ڈاکٹر بیگ احساس
ذہانت علی بیگ ، افشاں جبیں
کلیم صدیقی ، حامد کمال ، منور علی مختصر
کنوینر محفل لطیفہ گوئی : اسلم فرشوری

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

۲۱ نومبر ۸۷ ، ۸ بجے شب
مقام : نمائش میدان
افتتاح : شریمتی کمودبین جوشی ، گورنر آندھرا پردیش
مہمان خصوصی : ڈاکٹر عبدالرحیم اندرے (بمبئی)

شعرائے کرام :

عمر خیامی (دہلی) ، دلکش بدایونی (یوپی)
عادل لکھنوی (یوپی) ، خواہ مخواہ ، بمبئی
پاپولر میرٹھی (یوپی) ، عظمت بھلاوا (ناندیڑ)
مختار یوسفی (مالیگاؤں) ، پاگل عادل آبادی
ظہیر قدسی (مالیگاؤں) ، چکر نظام آبادی
سنیل کمار تنگ ، عنایت پوری (بہار) ، بیلن نظام آبادی
سراج نرملی ، علی صاحب میاں ، حمایت اللہ
اسمٰعیل ظریف ، طالب خوندمیری ، سربرٹ حیدرآبادی
مصطفیٰ علی بیگ ، احمد سلطان ، بوگس حیدرآبادی
اشرف خوندمیری ، صبغت اللہ بھیا ، رشید عبدالسمیع جلیل
اقبال ہاشمی ، ان پڑھ بھونگیری ، رؤف رحیم ، معین امر بمبو
شاداب ، بے دھڑک مدراسی ۔

کنوینر مشاعرہ : طالب خوندمیری

ذیلی کمیٹیاں

سوونیر کمیٹی :
کنوینر : صلاح الدین نیر

انتظامی کمیٹی :
کنوینر : محمد عبدالقیوم
اراکین : لئیق انصاری
یوسف شریف
عبدالقدیر صابر
سلطان عمر
رحمت یوسف زئی

نشر و اشاعت :
کنوینر : عابد سلطان شاہین
رکن : ان پڑھ بھونگیری

رابطہ کمیٹی :
کنوینر : احمد سلطان
اراکین : محمد سلیمان
معین امر بمبو
محمد فضل ، عبدالحق روفی
دولت رام

کنوینر انعامی مقابلہ جات :
وہاب قیصر

اسٹیج اینڈ ڈائس کمیٹی :
کنوینر : سعادت علی خاں
اراکین :
مصطفیٰ علی بیگ
حمایت اللہ
علی الدین

فرنشنگ کمیٹی :
کنوینر : وہاب قیصر
رکن : رؤف رحیم

بکنگ کمیٹی :
کنوینر : محمد سلطان
اراکین :
احمد سلطان
مرتضیٰ

بک اسٹال کمیٹی :
کنوینر : مرزا تقی علی بیگ
اراکین : طارق نیری
طلعت مہدی

انتظامی کمیٹی برائے خواتین :
کنوینرس : بتول فاطمہ
بشیر سلیمان
شبینہ انجم

کل ہند انعامی مقابلہ (مزاحیہ نثر و نظم)
اسپانسر :
احمد ٹل کلاتھ شوروم
پتھر گٹی
حیدرآباد

نیک خواہشات کے ساتھ

اسکول یونیفارم، سوٹنگ، شرٹنگ

معیاری ملز کا تیار کردہ

- ہمہ اقسام کا کپڑا
- ہمیشہ نیا اسٹاک

پورے اعتماد کے ساتھ تشریف لائیے

یف۔ ڈی۔ خان
اینڈ
کمپنی

کلاتھ مرچنٹ و گورنمنٹ کنٹراکٹرس

اسکولوں اور انڈسٹریز کو فراہم کنندگان۔

فون: 232491

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

چورت (منظومات)

مغل آرٹس اکیڈیمی کی عظیم الشان پیشکش

ہندوستان کے چار بڑے شہروں میں عوام کا جمگھٹ

بیرونی ممالک اور دیگر شہروں کیلئے پیش خدمت ہے

اگر سنگیت میں مزاح کی چاشنی نہ ہو تو مزہ ہی نہیں آتا
ہندوستان کے اور خصوصاً حیدرآباد کے
منتخب شاعروں کا کلام مختلف سازوں پر

شکیل احمد اور شریمتی شانتا مورتی

پیش کریں گے۔

جنہوں نے مہاراشٹرا، مدھیہ پردیش، اترپردیش
اور سرزمین دکن کی کئی ایک محفلوں میں اپنے فن کا
سکہ جما دیا ہے۔ حیدرآباد دکن کے ہردلعزیز سینئر موسٹ کامیڈین

حمید رشید ۔ مزاحیہ کلام کا قوالی روپ لیئے
اور نت نئے دکھنی خاکے اور لطیفے جنہیں عام و خاص میں
مقبولیت حاصل ہے۔ ضروری اطلاع آرگنائزروں کیلئے
بالمشافہ راست ان ہی آرٹسٹوں سے ربط رکھئے پتہ جب ذیل

(۱) حمید رشید اے آئی آر اینڈ ٹی وی آرٹسٹ
مکان نمبر 12-2-355/2 سید علی گوڑہ پوسٹ
صابر نگر حیدرآباد اے پی

(۲) محمد شکیل احمد مکان نمبر 1-5-58
نزد ہوٹل نصرا ریڈ ہلز نامپلی بازار گھاٹ چوراہا
حیدرآباد اے پی۔

حمید رشید   شکیل احمد   شانتا مورتی

حبیب میوزک کیسٹس کی جانب سے حمید رشید کا "دھمال" اور شکیل احمد
کا "ہم خیال" کیسٹس بازار میں آ چکے ہیں

شہنشاہ ظرافت **حمید رشید**

کامیڈی میکر کے کسٹ بھرے خاکے اور قوالیاں
ہر وقت مشہور ہیں

غزل اور مزاح

جناب عابد علی خاں

سرپرست مجتبیٰ حسین تہنیت کمیٹی
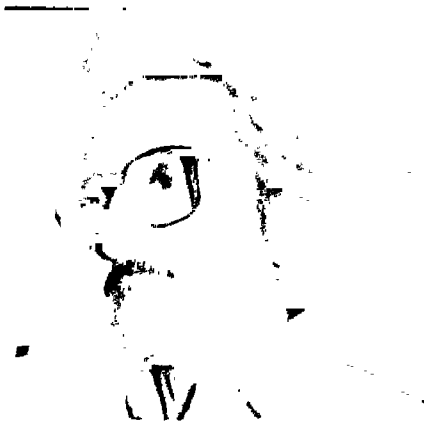
جناب سید ہاشم علی اختر

مہمان خصوصی

جناب بھارت چند کھنہ

سرپرست، زندہ دلانِ حیدرآباد

جناب نریندر لوتھر

صدر زندہ دلانِ حیدرآباد

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
صدر مجتبیٰ حسین تہنیت کمیٹی
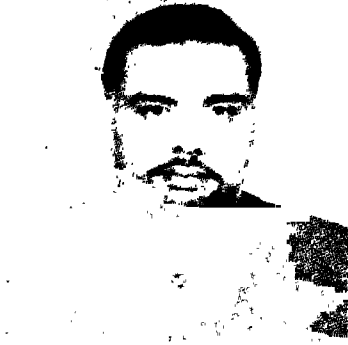
نواب محبوب عالم خاں
نائب صدر تہنیت کمیٹی

پروفیسر اشتیاق عابدی
نائب صدر، تہنیت کمیٹی

جناب زاہد علی خاں
نائب صدر، تہنیت کمیٹی

جناب کمال الدین احمد
نائب صدر تہنیتی کمیٹی

جناب کے یل ساقی نارنگ
کنوینر (دہلی) تہنیت کمیٹی

جناب رشید قریشی
نائبِ صدر زندہ دلان

جناب حمایت اللہ
نائب صدر زندہ دلان

جناب یوسف ناظم

جناب مصطفیٰ علی بیگ
نائبِ صدر، زندہ دلان

جناب مسیح انجم
معتمدِ عمومی زندہ دلان
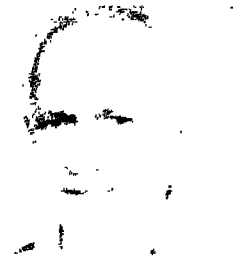
جناب بوگس حیدرآبادی
نائبِ معتمد زندہ دلان

جناب احمد سلطان

نائب معتمد زندہ دلان

جناب محمد سلیمان

خازن

جناب طالب خوندمیری

کنوینر مشاعرہ

ڈاکٹر حبیب ضیا

رکن

جناب وہاب قیصر
کنوینر ادبی مقابلہ

جناب اسلم فرشوری
کنوینر محفلِ لطیفہ

جناب یوسف شریف
رکن

جناب برہان حسین
کنوینر ادبی اجلاس

جناب صلاح الدّین نیّر
کنوینر سوونیر کمیٹی

جناب بیگ احساس
کنوینر تنقیدی اجلاس

جناب مجتبیٰ حسین

WORLD HUMOUR CONFERENCE

आप कद्रदान है चारमिनार के

आप के

فروری ۱۹۸۵ء میں منعقدہ ہندپاک مزاحیہ مشاعرہ کا ایک منظر
بائیں سے دائیں:۔ عطاءالحق قاسمی، جناب مکثر شاہ، جناب شنکر دیال شرما (مہمان خصوصی)
نواب شاہ عالم خاں (صدر مشاعرہ)، جناب ضمیر جعفری، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
جناب مرلی دھر شرما، جناب طالب خوندمیری، جناب مصطفیٰ کمال، جناب مجتبیٰ حسین

"زندہ دلانِ حیدرآباد" سلسلے کا پہلا مشاعرہ ریاستی سطح پر ۱۷؍مارچ ۱۹۶۲ء کو ۹ بجے شب بمقام اردو ہال منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی جو نیوز "ملاپ" مورخہ ۱۹؍مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی من و عن پیش ہے۔

اُردو ہال ڈھائی گھنٹوں تک گونجتا رہا

زندہ دلانِ حیدرآباد نے اُردو ہال کو زعفران زار بنا دیا

طنز و مزاح کو ہماری زندگی میں خصوصی اہمیت حاصل ہے

(شری نریندر لوتھر)

حیدرآباد۔ ۱۹ مارچ۔ اردو ہال کل رات ڈھائی گھنٹوں تک سیکڑوں زندہ دلوں کے مسلسل قہقہوں سے گونجتا رہا اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ اپنی طرز کا سب سے کامیاب اور یادگار مزاحیہ مشاعرہ ثابت ہوا۔ شری نریندر لوتھر ناظم اطلاعات عامہ نے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ وہ مشاعرہ سے اتنے محظوظ ہوئے کہ آخر وقت تک مزاح اور قہقہوں کے اس طوفان میں شامل رہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد بھی انھوں نے کچھ دیر تک مخصوص محفل میں مزاحیہ شعرا کا کلام سنا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے اس مشاعرے کی صدارت دکنی زبان کے مزاحیہ شاعر علی میاں (عرف بھوئی) نے کی رگھوبنسی نرمل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیے۔ حمایت کی نظم "میک اَپ کا ڈبہ" اور گستاخ حیدرآبادی کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ سلیمان خطیب نے جن کی دکنی زبان کی شاعری کا اپنا الگ رنگ ہے محفل میں جان ڈال دی۔ علی صاحب میاں صدر مشاعرہ کی شاہکار نظم "پلنگ" میں دکنی زبان کی مزاحیہ شاعری بلندیوں پر نظر آرہی تھی۔ بقول عام شاعر سرور ڈنڈا نے اپنی طویل نظم "شاہ پور واقعہ" سنا کر داد حاصل کی۔ مسافر نلگنڈوی، مصطفیٰ، سرپٹ حیدرآبادی، احمد اللہ قادری، مخلص حیدرآبادی، فریس، گڈبڑ حیدرآبادی، بوگس، مرشد خلیل، ماجد، نصرت اور دوسرے شعرا نے بھی اپنے مزاحیہ کلام سے مشاعرے کی کامیابی میں حصہ لیا۔ حیدرآباد میں اب تک اتنا بڑا مزاحیہ مشاعرہ منعقد نہیں ہوا۔ اردو ہال، اہلِ ذوق سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال سے باہر بھی بے شمار زندہ دل کھڑے ہوئے مشاعرے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ مشاعرے کے دو دور ہوئے۔ پسندیدہ شعرا کو بار بار اپنا کلام سنانا پڑا

——— ابتدا میں شری نریندر لوتھر نے دلچسپ افتتاحی خطبہ میں طنز و مزاح، ہنسی اور قہقہوں کی ہماری زندگی میں اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارے ادب میں مزاح کی کمی ہے۔ تقریباً سبھی شعرا زندگی کا صرف ایک ہی سنجیدہ رخ پیش کرتے ہیں۔ مزاحیہ ادب کے ذریعے زندگی کے دوسرے رخ کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف ہونا چاہیے۔ انھوں نے فائن آرٹس اکیڈیمی کو زندہ دلانِ حیدرآباد کے اتنے بڑے اجتماع کے لیے مبارکباد پیش کی۔ شری رگھوبنسی نرمل کے شکریہ پر مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

(بھارت نیوز)

فائن آرٹس اکیڈیمی کے زیر اہتمام

زندہ دلانِ حیدرآباد کا پہلا مزاحیہ مشاعرہ

۱۷ مارچ ۱۹۶۲ء بمقام اردو ہال

افتتاحی تقریر

از --- نریندر لوتھر آئی اے ایس

ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

آج شام ہم سب یہاں اردو کے مزاحیہ شعرائے کرام کا کلام سننے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ آج اردو ہال جنت نشان بنا ہوا ہے۔ لیکن جسطرف بھی نظر اُٹھایئے ایک بھی "لاکھ برس" کی حور نظر نہیں آتی۔ یہ الزام تو فائن آرٹس اکیڈیمی کے سر ہے کہ اس نے مجھے شاعروں کے اور آپ کے درمیان لاکھڑا کردیا ہے لیکن ارادہ شاید یہ تھا کہ انتظار کی گھڑیاں اور بھی لمبی ہوجائیں اور پھر شاید میری خشک اور رسمی اور بدمزگی کی راگنی کے بعد آپ کلام سے اور بھی زیادہ محظوظ ہوسکیں۔

آج کا مشاعرہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے منعقد کیا ہے۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد میں اتنے زندہ دل لوگ موجود ہیں۔ اردو شاعری میں نسبتاً مردہ دلی کی روایت زیادہ ہے اور زندہ دلی کی کم قنوطیت اور ایک حد تک (MORBIDITY) زیادہ ہے۔ بیشتر شعرا عام طور پر گھسے پٹے راستوں پر ہی چلتے ہیں۔ عشق و محبت، وصل و ہجر، محبوب و رقیب، جام اور ساقی، گل و لالہ، عارض و گیسو، لیلیٰ مجنوں اور ایسی دوسری فرسودہ اصطلاحیں اس کی جان ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ غیر ضروری ہیں۔ عشق و محبت اور اس کے انجام کے بغیر ہندوستان کی آبادی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ محبوب و رقیب کے بغیر ہماری عدالتوں کا کیا حال ہوگا۔ لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو شاعری اس بوجھ سے بہت دبی ہوئی سی ہے۔ بڑے شاعروں کو تو آپ چھوڑ دیئے دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں کے لیے تو یہ بوجھ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ شاعری ردیف اور قافیہ کی پابندیوں میں لفظوں کے ہیر پھیر کا سوال بن جاتی ہے۔ شاعر خالق سے کاریگر بن جاتا ہے۔ غزل گو شاعروں میں سو بار مرتا ہے سو بار جیتا ہے لیکن پھر بھی اتنا سخت جان ہوتا ہے کہ کم بخت مرتا ہی نہیں۔ اس لیے اس کا حال بھی ویسا ہے کی طرح جس نے دو بار "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" کا جھوٹا نعرہ لگایا تھا۔ شاعر کا اعتبار بھی کافی حد تک اُٹھ گیا ہے۔ اس کی وجہ میرے خیال کے مطابق یہ ہے کہ شاعر تجربہ کی بنا پر کم اور روایت کی بنا پہ زیادہ لکھتے ہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مزاح نگاری نثر اور نظم میں بچوں کا کام ہے۔ ہنسنا ہنسانا مسخروں

کا کام ہے ۔ شریف زادے معقول اور سلجھے ہوئے انسان اس سے دور رہتے ہیں۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں وہ شائد یہ نہیں جانتے کہ انسان اور حیوان میں تفریق کی ایک وجہ یہ ہے کہ جانور ہنس نہیں سکتا اور انسان ہنس سکتا ہے۔ جانوروں میں حسِ مزاح نہیں ہوتا اور انسان میں ہے ۔ سب جانور سنجیدہ ہوتے ہیں صرف انسان ہی طنز و مزاح کو سمجھ سکتا ہے ۔ اور پھر آپ دیکھئے کہ کسی کو ہنسانا کوئی آسان کام نہیں اور پھر ہندوستان میں جہاں ہمارا بڑھاپا (۲۵) برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے ۔ مجھے خود کئی بار بڑے بوڑھوں نے سمجھایا کہ برخوردار اب تو یہ مسخراپن چھوڑ دو اب تو تمہارے داڑھی بھی آگئی ہے ۔ داڑھی کا اور تمسخر کا آپس میں کیا تعلق ہے مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر اس اعتراض کو ختم کرنے کے لیے میں نے شیو بھی کرنا شروع کر دیا ۔ ورنہ شائد ابھی تک اچھی خاص داڑھی کا مالک ہوتا ۔

ہندوستان گرم ملک ہے اور گرم ملک میں جوانی جلدی آتی ہے اور بڑھاپا جلدی آتا ہے اور پھر موت جلدی آتی ہے ۔ اور پھر شائد گرمی کی وجہ سے ہمارے ملک کے لوگوں کے مزاج بھی اکثر گرم ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہماری قوم میں ۔ اور نتیجتہً ہمارے لٹریچر میں مزاح کی بہت کمی ہے ۔

یہ ضروری نہیں کہ مزاحیہ قسم کے لوگ غیر سنجیدہ اور نامعقول ہوتے ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ اصلیت اسکے بالکل برعکس ہے ۔ نامعقول لوگ بھیس بدل کر سنجیدگی اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہ تو بات کرنے کا ڈھنگ ہوتا ہے ۔ ایک بات ادا کرنے کے دو ڈھنگ ہو سکتے ہیں ۔ ایک واعظ اور زاہد کا اور دوسرے رند کا MATHEW ARNOLD نے کہا ہے کہ بہتر طریقہ CHASTENNING MORALS WITH RIDICULE کا ہے یعنی تمسخر کے ذریعے لوگوں کے اخلاق سنوارنے کا۔ فرانس میں یہی طریقہ والتیر VOLTAIRE نے اپنایا۔ انگلستان میں برنارڈ شا اس کے لیے مشہور تھا اور اردو زبان میں اس کی مثال اکبر الہ آبادی میں اچھی ملتی ہے ۔ آپ دیکھیے حالی اور اکبر کا مقصد تقریباً ایک ہی تھا۔ اکبر لوگوں کو ہنسا کر ان کی خامیوں سے آگاہ کرتے تھے۔ مثلاً پردے کی حمایت میں کیا خوب کہا ہے :

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ‏ ‏ اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ‏ ‏ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

انسانی زندگی میں NONSENSE نامعقولیت کو بہت اہمیت ہے ۔ ہماری زندگی میں ٹریجڈی اتنی ہے کہ ہم اگر صرف المیہ کو ہی دیکھیں تو زندگی واقعی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی مزاح کی حس SENSE OF HUMOUR ایک قسم کا SAFTY VALVE ہوتا ہے اور اگر ہم گاہے بگاہے اس SAFETY VALVE کا فائدہ نہ اٹھائیں تو ہمارا دم گھٹنا شروع ہو جائے ۔ نامعقولیت کی ایک مثال شفیق الرحمٰن کے ہاں بہت اچھی ملتی ہے :

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں تتلیاں

زندگی میں ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ المیہ پہلو تو آپ کو دوسرے شعرا دکھاتے ہی ہیں۔ آج کے شعرا آپ کو دوسرا پہلو دکھائیں گے اور آپ کی تصویر مکمل ہو جائے گی۔ صبح شام کو آپ ہنسیں گے۔ اس سے آپ کی صحت یقیناً بہتر ہو جائے گی اور اس کے لیے ہم تحسب اکیڈیمی کے شکر گزار رہیں گے

آپ لوگ یہاں مشاعرہ سننے اکٹھے ہوئے ہیں مقالہ نہیں۔ میں اتنی دیر تک صرف اسی لیے بولا کہ سب شعرا اکٹھے ہو سکیں اور اکیڈیمی کے انتظامات مکمل ہو سکیں اور پھر اس انتظار سے آپ کے اشتیاق کی چنگاریاں شاید اور بھی سلگ گئی ہوں۔ اس کے لیے مدعو شعرا کو میرا احسان مند ہونا چاہیے۔

آخر میں میں اکیڈیمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے حیدرآباد میں زندہ دل لوگوں کے وجود کا ثبوت دیا اور مجھے موقع دیا کہ میں بھی یہ مشاعرہ سن سکوں۔ اب میں بخوشی اس مشاعرے کا افتتاح کرتا ہوں۔

گھر ہو کہ دفتر
شادی خانہ ہو کہ پکنک کی جگہ
کسی بھی قسم کی دعوت کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

★ ٹی پارٹی
★ ایٹ ہوم
★ لنچ، ڈنر وغیرہ

کے لیے ہماری خدمات حاصل کیجیے:

ہندوستان کیٹرنگ سروسیز

فون نمبر 38411

ال[illegible] پیٹھ پھونگیری 2/419-2-12 الایتی نگر۔ مہدی پٹنم حیدرآباد 500028

ہریانہ اُردو اکادمی فریدآباد کا

سہ ماہی

ادبی میگزین

جمناتٹ

جس کا خصوصی شمارہ ادبی ہونے کے ساتھ ریاست ہریانہ پر تاریخی اور ثقافتی دستاویز بھی ہے

اس کا

ہریانہ نمبر

منظرِ عام پر آرہا ہے

ادب تحقیق اور تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے یہ نمبر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

قیمت فی شمارہ -/4

ایجنٹ حضرات کے لیے مناسب رعایت پر

رابطہ کریں

ہریانہ اُردو اکادمی 465 سیکٹر 16، اے فریدآباد

سیکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی، فریدآباد

یوسف ناظم (بمبئی)

حیدرآباد اور بمبئی میں توارد

زندہ دلانِ حیدرآباد کے جواب میں تو نہیں لیکن اُن کی غائبانہ صحبت اور معیت کے لئے بمبئی میں بھی ایک انجمن انجمن زندہ دلانِ بمبئی وجود میں آگئی۔ نام خواہ بچوں کے ہوں یا انجمنوں کے ان کی بڑی قلت ہے اور یوں بھی زندہ دلانِ حیدرآباد نے بڑی مروت سے کام لیا تھا۔ انھیں بہت پہلے چاہیئے تھا کہ وہ مرکزی حکومت کے رجسٹرڈ ٹریڈ مارک اور پیٹنٹ شناخت ناموں کے آفس میں اپنے نام کو صرف اپنے لئے محفوظ کروانے کی کارروائی کرتے۔ یہ کام تھوڑی سی فیس ادا کرنے پر ہوجاتا (آج سے ۲۵ سال پہلے فیس بھی معمولی تھی اور سرکاری کارروائیاں بھی ذرا جلد تکمیل پا جاتی تھیں)۔ اب بہت دیر ہوچکی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی عمر پختہ ہوگئی اور اس سال انھوں نے اپنی عمر عزیز کے ۲۵ سال پورے کرلئے۔ ہنستے کھیلتے ایک ربع صدی گذر گئی۔ یہ اُن کے جشنِ سیمیں کا سال ہے۔ چاندی ہی چاندی ہے۔ اس رو پہلے موقعہ پر اہلِ بمبئی کا سونا مناسب نہیں تھا اور زندہ دلانِ بمبئی کی تشکیل کا یہ بہترین موقعہ تھا۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر جب زندہ دلانِ حیدرآباد اپنا جشنِ طلائی منائیں گے تو اُس وقت زندہ دلانِ بمبئی بھی اُن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے نظر آئیں گے۔ (آج تو یہ پر ابجن ہے)۔

شہر بمبئی اصل میں ہے ہی زندہ دلوں کا شہر۔ زندگی کو متحرک دیکھنا ہو تو بمبئی میں دیکھنا چاہیئے۔ یہاں وقت کی رفتار، دوسرے شہروں کے مقابلے میں ذرا تیز ہے۔ زمین بھی شاید زیادہ تیزی سے گھومتی ہے۔ اس لئے یہاں سستی اور کاہلی نام کی اشیاء دستیاب نہیں ہوتیں۔ اور جو شخص بھی ان اشیاء سے ذرا سا بھی تعلق رکھتا ہے، زندگی کی سستی خیز دوڑ میں کچھوے سے بھی پیچھے رہ جاتا ہے۔ (اسی لئے بمبئی میں خرگوش کم نظر آتے ہیں)۔ اس جملۂ معترضہ کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی اہلِ بمبئی کو یہ احساس ہوا کہ زندہ دلوں کے شہر میں ایک انجمن زندہ دلانِ بمبئی بھی ہونی چاہیئے، اور یہ کہ اس کام کی تکمیل میں اُن سے غفلت کیسے ہوگئی انھوں نے فوراً اس کی تلافی کا انتظام کردیا۔ حالانکہ ہمارے یہاں کسی کام کے نہ کرنے پر صرف اظہارِ افسوس اور افسوس کرنے کے عمل کو بنظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے۔ بالعموم اصل کام پر کفِ افسوس ملنے کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن بمبئی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ جولائی کے مہینے میں انجمنِ زندہ دلانِ بمبئی کی ولادت عمل میں آئی۔ اور جس

نے بھی اسے نظر بھر کر دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے واہ کیا چاند سی صورت پائی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو صرف اس کے چہرے ہی کو نہیں، اس کے چکنے چکنے پات کو بھی سراہا (کہا جاتا ہے کہ چکنے چکنے پات موقعہ بے موقعہ پھسلنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور بچہ کافی ہونہار ثابت ہوتا ہے)۔ بمبئی میں مزاح نگاروں کو عام طور پر مزاح نگار نہیں کہا جاتا۔ ان پر صحافی یا کالم نگار کی سرخی لگائی جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے شناختی کارڈ میں انشائیہ نگاری اور مزاح گوئی کی "خصوصیت" کا اندراج نہیں کیا جاتا۔ مزاح گو شاعر بھی یہاں تعداد میں کم ہیں (بمبئی بڑا پُرامن شہر ہے)، اس نوع کے شاعروں کو یہاں ٹارچ لے کر ڈھونڈا جاتا ہے۔ مزاحیہ مشاعروں کا رواج بھی یہاں برائے نام ہے۔ اس کام کیلئے باہر سے کمک بلانی پڑتی ہے اور جب بھی ایسا کوئی واقعہ یہاں ہوتا ہے لوگ اسے چشم دید اور گوش شنید واقعہ میں بدل دیتے ہیں۔ اسٹیج پر پیش کئے جانے والے مزاحیہ ڈرامے تو یہاں ہوتے ہی رہتے ہیں اور باہر سے جب بھی کوئی مزاحیہ قافلہ یہاں آتا ہے اس کی پذیرائی، کرکٹ یا ہاکی ٹیم کی پذیرائی کی طرح تو نہیں ہوتی (ہونی بھی نہیں چاہیئے) لیکن پذیرائی ضرور ہوتی ہے اور موسم بے حد خوشگوار ہوجاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ پروگرام "مس فائر" کی نذر ہو جاتے ہوں کیونکہ بمبئی شہر میں مسیں ذرا زیادہ رہتی ہیں۔ (اکثر نوجوانوں کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی مسیں بھیگنے سے پہلے ہی ان کے گھر میں سبزہ اُگ آتا ہے)۔

اہل بمبئی کھلے دل سے مزاح کا استقبال کرتے ہیں۔ تغافل یا تکلف کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انجمن زندہ دلان بمبئی کی افتتاحی تقریب کے موقعہ پر بھی اسی خوش دلی کا اظہار ہوا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے تقریباً سبھی فنکار اور شعراء اس موقعہ پر بمبئی میں جمع ہوئے۔ (انھیں شائد یقین نہیں آیا تھا کہ زندہ دلانِ بمبئی بھی وجود میں آگئی ہے)۔ حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، محمد سلیمان، اقبال ہاشمی حیدرآباد سے، پاگل عادل آبادی، عظمت بھلاوال، ناندیڑ سے اور مالیگاؤں سے مختصر مگر مفید شاعر مختار یوسفی سبھی بمبئی پہنچ گئے۔ ان پر مستزاد، غریب دولت رام کی موجودگی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے بھی موقعہ واردات پر موجود رہنا ضروری سمجھا۔ مصطفیٰ کمال نے اصل میں رابطے کا کام انجام دیا اور حسنِ اتفاق سے بخوبی انجام دیا۔ مشہور یہ ہے کہ حیدرآباد کا قافلہ جب مینار ایکسپریس سے اپنے اپنے توشے کے ساتھ حیدرآباد سے روانہ ہوا تو اس توشے کی مہک، دور دور تک پھیل گئی اور دوسرے ڈبوں کے مسافر بھی اسی ڈبے میں گشت کرنے لگے۔ خاص طور پر محمد سلیمان کے ڈبل کے میٹھے کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں تہلکہ مچ گیا۔ بمبئی پہنچ کر محمد سلیمان المعروف بہ استاد نے راقم الحروف کو بتایا کہ اس میٹھے کی تیاری میں دیگر ضروری اجزاء کے علاوہ اصلی زعفران بھی استعمال کیا گیا تھا۔ حمایت اللہ نے کہا کہ اس زعفران کی خوبی یہ ہے کہ جب تک زبانی طور پر اس کی خبر مشتہر نہ کی جائے کسی کو زعفران کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میٹھے سے خاکسار کو بھی مستفید ہونا پڑا (منہ پھر گیا)۔ دولت رام نے بھی اس توشے کی داستان سنائی۔ داستان بہرحال پرلطف معلوم ہوئی۔ (پری وش کی صورت البتہ نظر نہیں آئی)۔ اہلِ حیدرآباد کی زندہ دلی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ دیارِ غیر میں بھی غریب الوطن نظر نہیں آتے۔ اُن کے ٹھہرنے کا انتظام گو کہ کچھ اس قسم کا تھا کہ انھیں اپنی پیشانی پر کم سے کم

ایک شکن تو ڈال ہی لینی چاہیئے تھی لیکن شاید سفر نے انھیں بہت تھکا دیا تھا وہ ایک شکن بھی نہیں ڈال سکے۔ یوں بھی زندہ دلانِ حیدرآباد ہر حال میں مست رہنے کے شوقین ہیں (میزبانوں کو اُن کی کوتاہیوں کا احساس دلانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے)۔ انجمن اسلام بوری بندر کے ہوسٹل میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو، اس کا محل وقوع غیر معمولی اچھا ہے۔ ہر چیز ہوسٹل کے زیرنگیں معلوم ہوتی ہے۔ ٹرین، ٹیکسی، ہوٹل اور ان سب کے ساتھ "شاپنگ" کی سہولت۔ باہر سے آنے والے حضرات یہاں شاپنگ کرنے کے لئے صبح سویرے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور مہنگے داموں پر غیر ضروری اشیاء خرید کر خوش ہوتے ہیں کہ واہ کیا شاپنگ کی ہے (ہندوستان میں غیر ضروری اشیاء کی قیمتیں ہیں بھی کم۔ دودھ اور دیگر اشیائے خوردنی کی قیمتیں البتہ ایسی رکھی گئی ہیں کہ یہ عوام کی دسترد سے محفوظ رہیں)۔

۱۶ر اکتوبر ۸۷ء کو رات میں ½۸ بجے المار لطیفی ہال میں زندہ دلانِ بمبئی کی افتتاحی تقریب جو سہ رخی تقریب تھی، بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔ (لطیفی ہال کو لطیفہ ہال بنا دیا گیا)۔ شہر میں کئی دنوں سے اس تقریب کا چرچا تھا۔ اگرچہ اس تقریب کی تشہیر اُس پیمانے پر نہیں ہوئی تھی جس پیمانے کی تشہیر کا یہ شہر عادی ہے۔ یعنی نہ تو اخبارات میں اس کے اشتہارات شائع ہوئے اور نہ شہر کی دیواروں پر پہلے سے لگے ہوئے پوسٹروں کی تعداد میں کوئی اضافہ ہوا۔ لیکن جو چند اعلانات، مقامی روزناموں اور چند ادبی رسائل میں چھپے، رسوائی کے لئے کافی تھے۔ ہال بھر گیا تھا۔ (جو کرسیاں خالی رہ گئی تھیں وہ غالباً آسیب زدہ تھیں)۔ شہ نشین کی آراستگی نے اسے ملکہ نشین کی شکل دے دی تھی۔ (نفاست کی طرف اشارہ ہے)۔ گنجائش بھی بہت تھی۔ لوگ کھُل کر بیٹھے تھے (انھیں کھُل کر ہنسنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ ہوئی ہوتی تو ضرور اس کی شکایت کرتے)۔ اس تقریب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں گل پوشی کا بندوبست نہیں کیا گیا (مہمانوں نے چشم پوشی سے کام لیا)۔

پروگرام کا آغاز لطیفہ گوئی سے ہوا۔ صدر انجمن (جو فی الحال عارضی صدر ہیں) یوسف ناظم کے تعارف، ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے افتتاحی جملوں اور صدر محفل ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا کی لطیفوں بھری صدارتی تقریر سے ہوا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری فیاض احمد فیضی نے نظامت کی اور سامعین نے ان کی نظامت کی بھی داد دی۔ فیاض فیضی اچھے خاصے مزاح نگار ہیں۔ کم چھپے ہیں، لیکن کم چھپنا بھی ایک خوبی ہے۔ مائیکروفون کا بھی انھیں اچھا سلیقہ ہے۔ بولتے ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھ میں آتا ہے۔ ہر لفظ کو دوسرے لفظ سے کافی فاصلے پر رکھتے ہیں اور لطیفہ بھی اس طرح سناتے ہیں گویا سُنا نہیں سمجھا رہے ہوں۔ معمولی لطیفہ بھی اچھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ میزبان لطیفہ گو حضرات میں ڈاکٹر وہاب دانش، پرنسپل قادر حسین، پرنس قمر، حامد کمال صدیقی اور شمیم عباس نے محفل کو لالہ زار بنایا۔ مہمانوں میں مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، محمد سلیمان، حمایت اللہ، عظمت بھلا داں، مختار یوسفی اور دولت رام نے لطیفے سنا کر دھوم مچا دی۔ (یہ لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں)۔

پروگرام کا دوسرا باب مشاعرے پر مشتمل تھا۔ مشاعرے کی نظامت طالب خوندمیری نے کی اور کیا خوب کی۔ سامعین بہ

ہمہ تن گوش رہے ۔ میزبان شعراء میں پھکڑ کانپوری اور سارتھی لاکھن پوری کا اضافہ ہوا اور یہی سبھی کمی پوری ہوگئی۔ سارتھی لاکھن پوری کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کبھی کبھی ان کا حافظہ ان سے شرارت پر آمادہ ہوجاتا ہے لیکن انھیں شاعروں کا تجربہ ہے سامعین کو بہلا لیتے ہیں۔ یوں بھی اس محفل کے سامعین عام شاعروں کے سامعین سے مختلف تھے۔ کبھی کسی گوشے سے کچھ کہا بھی گیا تو تفریح کے لئے کہا گیا تنبیہہ کے لئے نہیں۔ واد دل کھول کر دی گئی اور مہمان شاعروں پر تو داد کے ڈونگرے برسائے گئے۔ (کلام بھی تو ویسا ہی سنا)۔ سبھی شاعروں کو اپنے اپنے حصّہ کی داد ملی۔ پاگل عادل آبادی ترنم سے کلام سناتے ہیں اور فلمی گانوں کی پیروڈی لکھ کر اسی دھن میں نذرِ سامعین کرتے ہیں۔ مزاح اور موسیقی کے امتزاج نے انھیں عوام سے بے حد قریب کردیا ہے۔ عظمت بھلاداں کا ترنم سکندر علی وجد کے ترنم کا زیراکس ہے۔ دکھنی زبان میں بھی یہ شعر کہہ لیتے ہیں۔ بمبئی میں دکنی زبان کے پرستار بکثرت ہیں۔ خوب لطف اُٹھاتے ہیں۔ (مصرعہ بھی اُٹھاتے ہیں)۔

مصطفیٰ علی بیگ اور حمایت اللہ تو بمبئی میں بے حد مقبول ہیں۔ مصطفیٰ علی بیگ کی اینگلو اُردو شاعری ان کے اینگلو اُردو ترنم میں بہت لذیذ ہوتی ہے۔ سب اَٹینشن ہوجاتے ہیں۔ (لفظ اَٹنشن کو اسی طرح ادا کرنا چاہیئے جس طرح مصطفیٰ علی بیگ ریلیشن، ریفریجریشن اور انسپریشن کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔ ذرا مشکل ہے لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ بس بیچ میں ہنسنا نہیں چاہیئے)۔ حمایت اللہ کی پیروڈی تو لوگوں کو حفظ ہوگئی ہے لیکن دل نہیں بھرتا۔ بار بار سُننے کو جی چاہتا ہے۔ طالب خوندمیری نے اپنی شاعری کا الگ ہی ڈیزائن بنایا ہے۔ ان کی شاعری اورینٹل بھی ہے اور ماڈرن بھی۔ غالب ان کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اس موضوع پر بنایا ہوا ان کا بلو پرنٹ بہت مقبول ہوگیا ہے۔ طالب نے غالب کو مغلوب تو نہیں کیا لیکن اپنا مطلوب ضرور بنالیا ہے۔ وہ غالب کو مختلف روپ میں دیکھتے رہے ہیں۔ کبھی آرکیٹیکٹ کے روپ میں تو کبھی آئی اے ایس آفیسر کے روپ میں ــــــ اِدھر نئی پیڑھی کے شاعروں میں اقبال ہاشمی نمایاں ہیں اور اپنے پیشروؤں کو اس بات کی اطلاع دیتے ہیں کہ اُن کے پیچھے اگر بہت زیادہ ہنگامہ نہیں ہے تو سناٹا بھی نہیں ہے ــــــ یہ تو حیدرآباد کے شعراء کا ذکر ہوا۔ مالیگاؤں میں مختار یوسفی ہیں جنھوں نے "یوسفی" نام کو زندہ رکھا ہے۔ کسی بھی شاعر کے اچھے خاصے مصرعے کی گت بنا دینے میں انھیں لطف آتا ہے۔ فلمی اداکاراؤں کی تصویروں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں ہیں اور گھر داماد کے بارے میں اُن کا فیصلہ ہے کہ اس شخص سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی۔

ہاں یہ بات تو معرضِ تحریر میں آنے سے رہ ہی گئی کہ مشاعرے میں خواتین کی نمائندگی بھی ہوئی اور ممتاز نکہت نے ایک نہایت ہی گھریلو لیکن دلچسپ نظم سُنا کر ڈھیر ساری داد حاصل کرلی۔ (سامعین میں مردوں کی تعداد زیادہ تھی)۔ ان کی نظم کے سارے اشعار ازدواجی معاملات سے متعلق تھے۔

میں سمجھا تھا صرف ایک بات کہنے سے رہ گئی۔ ایک اور بھی رہ گئی اور کافی اہم۔ اس مشاعرے میں خواہ مخواہ حیدرآبادی بھی شریک تھے۔ اصل میں، میں اس مخمصے میں رہا کہ انھیں میزبان کہوں یا مہمان۔ رہتے بمبئی میں ہیں بلکہ بمبئی کے ہوکر رہ گئے

ہیں لیکن تخلص کے ساتھ حیدرآبادی بطور لاحقہ موجود ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ لاحقہ خواہ مخواہ نہیں ہے، حقیقت ہے۔
پچھلے سال جب یہ حیدرآباد میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعرے میں شریک ہوئے تھے تو انھوں نے دونوں ہاتھوں سے 'مشاعرہ' لوٹا تھا (اب تک ان کے گھر میں رکھا ہوا ہے) اب شگوفے میں پابندی سے چھپنے لگے ہیں۔ جس مشاعرے میں جاتے ہیں کامیابی ان کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ (کبھی کبھی سیریل آرڈر بدل بھی جاتا ہے)۔ انھوں نے اس مشاعرے میں بھی کافی تالیاں بٹورائیں۔ شعر پڑھنے کی رفتار تیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے سیلاب آیا ہوا ہے۔ (وہ کلام بھی تو ٹکڑے آپاشی میں لکھتے ہیں)
مشاعرے کی یہ محفل بے حد کامیاب رہی۔ سامعین کی تو خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ابھی جاری رہے لیکن مزاحیہ خاکے بھی تو ہونے تھے۔ ان کے لئے وقت کہاں بچتا۔
مزاحیہ خاکوں میں پرنس قمر، محمد سلیمان اور دولت رام نے رنگ جمایا۔ محمد سلیمان اب بھی جوان ہیں۔ ان کی آواز کے زیروبم کو لوگ اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا محبوب کی زلفوں کے پیچ وخم کو پسند کرتے ہیں اور دولت رام کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب تو انھوں نے فلسفیانہ تقریر کرنا بھی سیکھ لیا ہے۔ مجمع کی نبض تو وہ پہلے بھی دیکھتے اور سمجھتے تھے اب ان کی تشخیص پختہ ہو گئی ہے کوئی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ سامعین کو اپنی گرفت میں رکھنے کے کئی نسخے ان کے پاس ہیں۔ دوا تو ایک ہی ہے لیکن رنگ بدل بدل کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کہ محفل رنگ پر آجاتی ہے۔ دولت رام اور بمبئی میں اب زیادہ فاصلہ نہیں رہا ہے۔ رات کے کوئی ایک بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔
۷؍اکتوبر ۸۷ء کو زندہ دلانِ حیدرآباد نے "آوارہ گردی" میں نام کمایا۔ کون کہاں گیا اور کس نے کیا کیا صیغۂ راز میں ہے، لیکن شام کو کوئی ۷ بجے، پروگرام کے مطابق سارے ظرفا، شرفا کی طرح "الہلال" میں جمع ہو گئے اور رات میں ساڑھے نو بجے ایک مخصوص محفل میں سب نے اپنے اپنے کمالات دکھائے۔ علی سردار جعفری نے اس محفل کی صدارت کی۔ مہمانوں میں عزیز قیسی، حسن کمال اور ندا فاضلی موجود تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بے تکلف محفل زیادہ پُرلطف رہی۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کا خیال غلط نہ ہو کیونکہ سامعین تقریباً سب کے سب 'اہلِ حیدرآباد' تھے۔ آج سامعین میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ داد کی دبی دبی آوازیں اُدھر سے بھی آرہی تھیں (نشست کا انتظام ایل ٹائپ میں ہو تو خواتین کو نشست و برخاست میں آسانی رہتی ہے)۔ "الہلال" کی ٹیرس پر اس سے پہلے بھی زندہ دلانِ حیدرآباد ایک مرتبہ اپنا نمونۂ کلام و کمال پیش کر چکے ہیں۔ یہ دوسرا دور تھا اور نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد زاول، کا عملی مظاہرہ۔
۸؍اکتوبر ۸۷ء کی دوپہر کی ٹرین سے جب یہ قافلہ حیدرآباد واپس ہوا تو بہت دیر تک دھنک کے رنگ فضاء میں لہراتے رہے۔ شاید جگر مرادآبادی نے کہا تھا ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں ۔۔۔ یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

یہ سب لوگ وعدہ کر کے گئے ہیں کہ اس وقت تو وہ جا رہے ہیں لیکن اگلے پروگرام میں بھی یقیناً آرہے ہیں ــــ ہمارا بھی وعدہ رہا کہ اگلی مرتبہ انھیں ہوسٹل میں نہیں ہوٹل میں ٹھیرایا جائے گا۔ محمد سلیمان نے الگ سے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ ڈبل کے میٹھے میں وہ زعفران ڈالنا نہیں بھولیں گے۔

ــ ــ

ضیاء الحق قاسمی (پاکستان)

زندہ دلانِ حیدرآباد کے نام منظوم خط

ہم یہاں سے دور ہیں رشتہ مگر ٹوٹا نہیں
کچی مٹی کا گھڑا دریا میں ہے پھوٹا نہیں

یاد تشیش تو ہوئی ہے ان زمینوں کی جناب
دونوں جانب دل دھڑکتے ہیں یہ ہیں خانہ خراب

دادا ہندوستان میں ہے نادی پاکستان میں
ان کے پوتوں کی ہوئی ہے شادی پاکستان میں

منگنی ہوتی ہے یہاں تو شادی ہوتی ہے وہاں
آدھی ہوتی ہے وہاں تو آدھی ہوتی ہے یہاں

جو دلہن ہے اس طرف ہے اس کا دولہا اس طرف
یعنی ہنڈیا اس طرف ہے اور چولھا اس طرف

اُس طرف گر پیر میں چبھتا ہے کانٹا آپ کے
اس طرف ہوتا ہے دل میں درد بھائی باپ کے

آپ ڈھولک تو بجائیں ہم بھی ناچیں گے یہاں
ناچنے میں ہرج کیا ہے وہ یہاں ہو یا وہاں

آپ کے بچے اگر اسکول جانا چھوڑ دیں
اپنے بچے مدرسوں سے اپنا ناتا توڑ دیں

آپ میں کوئی خدا ناخواستہ بیمار ہو
ویرانے کے چلنے کو پھر ہر کوئی تیار ہو

آپ نے اپنا لیا ہے گر وہاں طنز و مزاح
ہم نے بھی تو بس ظرافت سے رچایا ہے نکاح

آپ اپنے دیس میں ہنستے ہنساتے ہی رہیں
ہم ظرافت کے یہاں پھول کھلاتے ہی رہیں

کچھ شگوفے آپ چھوڑیں اے مدیرِ محترم
اور ظرافت کے پیالوں میں ڈبوئیں ہم قلم

آپ کی زندہ دلی سے بات کا بن جائے ڈھنگ
اور اپنی شوخیٔ دل بھی اِدھر کچھ لائے رنگ

آؤ مل کر ہم لگائیں قہقہے اس زور سے
نفرتوں کے جن نکل بھاگیں ہمارے شور سے

ہر طرف ہی نفرتوں کی گندگی کا راج ہے
گندگی سے ان کے نتھنوں میں پرانی کھاج ہے

آؤ اس کھجلی پہ کر دیں طنز کا ہم اسپرے
SPRAY
ایسا کہ جو اِن رِستے زخموں کو بھر دے

نریندر لوتھر

ہم پہ ڈھایا ہے ستم ___ کثرتِ اولاد نے*

معاف کیجیے صاحب۔ غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ کثرتِ اولاد کی بیماری ہمیں نہیں کسی اور کو ہو گی۔ ہمارے تو لے دے کے صرف دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اس کے بعد ہم نے بیگم سے ایک منظوم سوال پوچھا تھا سنیے:

حکومت کی پالیسی کہ کنبہ رہے تھوڑا
ایسا ہو گھر بار
کہ لوگ رہیں بس چار
ایک باپ جو باہر کا کام کرے
ایک ماں جو اندر کا کاج کرے
کام کاج تو ہو گیا پورا
اب اور کیا چاہیے
ایک لڑکا
جو بات بات پہ بھڑکا شعلے کی طرح
اور ایک بیٹی
جو سدا رہتی ہے کتابوں میں لیٹی
اس کے بعد بھی از راہِ انشورنس
ایک اور بچے کی مل سکتی ہے کلیرنس
اب بتائیے آپ کو کیا چاہیے
لیٹی یا بھڑکا؟

بیگم نے ابھی تک ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے ہم نے بھی اس معاملے میں کوئی پیش قدمی نہیں کی اور نتیجۃً ہماری اولاد کی تعداد اتنی ہی رہی۔ یعنی دو! لیکن ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے

---

* "ہم پہ ڈھایا ہے ستم" سلسلے کا ریڈیائی مضمون

بہت کثرتِ اولاد کے مارے ہوئے ہیں۔ ایک بار ہمیں کسی دوست کے ہاں جانا تھا۔ اس بار راستہ بھول گیا۔ ایک سات آٹھ سال کے بچے کو روک کر اس سے پتہ پوچھا۔ اس نے بڑی پتہ اور پھر راستہ بتایا۔ چلتے چلتے ہم نے اس کا نام پوچھا۔ کس کلاس میں پڑھتے ہو، کہاں رہتے ہو اور پھر یونہی پوچھ بیٹھے :

"تم کتنے بھائی بہن ہو؟"

اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا "سترہ"

"کتنے؟ ہمارا سوال ہمارے حلق میں اٹک گیا۔

اس نے پھر دُہرایا۔ "سترہ"

"سترہ؟" ہم نے پھر توثیق چاہی

"جی ہاں۔ سترہ۔ دس پر سات"۔ اس نے پوری وضاحت کردی۔

زندگی میں پہلی بار ہم ایسا بچہ دیکھ رہے تھے جس کے سولہ بھائی بہن تھے۔

"تم سے چھوٹا بچہ بھی ہے کوئی؟"

"جی ہاں تین بہنیں مجھ سے چھوٹی ہیں۔

پھر ہمیں خیال آیا کہ یہ بھی پتہ کرلیں کہ پیدا دگار کے علاوہ ان کی دال روٹی

"تمھارے بابا کیا کام کرتے ہیں؟"

"جی۔ یہی!" بچے نے بڑی معصومیت سے جواب دے کر ہمیں لاجواب کر دیا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہیں یہ بچہ ہمارے ایک مرحوم شاعر دوست کی اولاد تو نہ تھا۔ بقول خود ایک دن وہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جوں ہی مسجد سے نکلے تو ایک بچہ روتا ہوا ملا۔ انھوں نے اس سے اس کا اتہ پتہ پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن بچہ بلک بلک کر روئے جا رہا تھا یہ دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے اسے گود میں اٹھا لیا بہ مشکل تمام اسے چپ کرایا اور پھر اُسے اپنے گھر لے آئے۔

گھر آکر انھوں نے بیگم سے کہا۔ یہ بے چارہ کسی کا بچہ کھو گیا ہے۔ اُسے اس کے ماں باپ کہاں ہیں . . . ؟

بیگم نے قہقہہ لگایا اور اُنہیں ڈپٹ کر بولیں "ارے یہ تو ہمارا مجو ہے!"

ہمیں یقین ہے کہ یہ کہانی سچی ہے کیونکہ ہمارے دوست نے ہمیں اُس وقت سنائی تھی جب وہ غالباً آپ نے محمد یونس صاحب کی خود نوشت میں درج یہ واقعہ بھی پڑھا ہو نہرو پہلی بار سعودی عرب گئے تھے، وہاں شاہ ابنِ سعود نے اپنے بتیس شہزادوں کا تعارف کروایا۔ تعارف کے بعد یونس صاحب نے پنڈت نہرو کو سرگوشی کے انداز میں کہا کہ اور کہاں آپ کی صرف ایک بیٹی۔ آپ تو احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ یہ سن

نے یونس صاحب کو بازو سے پکڑ کر اُن کا تعارف شاہ ابنِ سعود سے یوں کروایا کہ یہ اپنے باپ کی پینتالیسویں اولاد ہیں۔ دروغ یا مبالغہ بر گردنِ راوی۔ لیکن سُنا ہے کہ یہ اعداد و شمار علی گڑھ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں موجود ہیں جہاں یونس صاحب کے بیشتر بھائیوں نے تعلیم حاصل کی۔

اولاد کے بارے میں کوئی کسی کو کیا کہہ سکتا ہے۔ یہ تو ایسی دین بھی جاتی ہے جو ہر مذہب کا خدا اپنے پیروؤں کو اپنے موڈ اور اُن کی بساط کے مطابق دیتا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ کسی کو ہونہار کسی کو نالائق کسی کو نسواں کسی کو نرینہ، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرح اس میں بھی انسان اُس غیبی ہستی کو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ لاتا ہے۔ زیادہ اولاد والوں کے تعلق سے ہی خدا نے خدائے سخن میر کی معرفت یہ مصرعہ کہا تھا

'چاہتے ہیں سو آپ کریں، ہم کو عبث بدنام کیا'

اب ہمارے منجھلے چچا کی سنیے۔ اُن کی پہلی بیوی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو جنم دے کر دنیا سے فارغ ہو گئی، دوسری بیوی آئی تو اُس نے کہا یہ بچے تو میرے نہیں، مجھے تو اپنا ذاتی سیٹ چاہیے۔ وہ ہر بار اولادِ نرینہ کے لیے کوشاں اور دُعا گو رہتی لیکن ہر بار لڑکی ہی پیدا ہوتی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اُن کے ہاں نو لڑکیاں پیدا ہوئیں، ہمیں یاد نہیں آتا کہ ہم نے کبھی اپنی چچی کو حمل یا زچگی کے علاوہ کسی اور حالت میں بھی دیکھا ہو۔ آخر ایک دن اولادِ نسوانی کی کثرت اور اولادِ نرینہ کی حسرت لیے ہمارے چچا اپنی پہلی بیوی سے جا ملے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جو لوگ، جو معاشرہ اور جو ملک زیادہ بچے پیدا کر سکتے ہیں اور اُن کی پرورش کر سکتے ہیں، وہ عموماً کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اور ملک اس کے اہل نہیں ہوتے وہ اولاد کی کثرت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پچھلے کئی دہوں سے یورپ کے ملکوں کی آبادی کی تعداد ساکت ہے۔ اس کے برخلاف غریب اور پسماندہ ملکوں میں آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر کئی ترقی یافتہ اور کم آبادی والے ملکوں نے کافی مقدار میں ہندوستانیوں کو برآمد کیا تاکہ وہاں کے باشندے زیادہ بچے پیدا کرنے کی تکنیکی جانکاری حاصل کر سکیں لیکن جو ہندوستانی باہر جاتے ہیں اُن میں گویا وہ صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کئی ماہروں کا خیال ہے کہ یہ آب و ہوا کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک مدرسۂ فکر کا نقطۂ نظر ہے کہ جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ویسے ہی حمل کو نہ دیکھ کر حمل ٹھہرتا ہی نہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جو ہندوستانی چند دنوں کے لیے ہی باہر جاتے ہیں وہ بھی اس بیماری کے ساتھ واپس آتے ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں میں بھی مقابلتاً خوشحال لوگوں کے بچے کم ہوتے ہیں۔ یہ تجربہ دیکھ کر بیشتر پسماندہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم خوشحال ہو جائیں گے تو ہمارے بھی خود بخود ہی کم بچے پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے، وہ بیچارے یہ سیدھی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ خوشحال لوگوں کی خوشحالی چھوٹے کنبے کی وجہ سے ہے نہ کہ اُن کا چھوٹا کنبہ خوشحالی کا نتیجہ ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جہاں ہم ہندوستانی باہر کے ملکوں میں جا کر کم اولاد پیدا کرنے کی قومی رسم سے متاثر ہو کر اسے اپنا لیتے ہیں، وہاں غیر ملکی لوگ ہندوستان آ کر بھی اپنی کم اولاد والی عادت نہیں چھوڑتے۔ ہم نے کئی لوگ ایسے دیکھے ہیں جو برسوں یہاں رہ کر گئے۔ لیکن جتنے بچوں کے ساتھ وہ آئے تھے اتنے ہی کے ساتھ واپس گئے بلکہ کثیر اولاد یا کم اولاد والے لوگ ایک آدھ ہندوستانی بچہ اپنا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی غیر ملکی شخص

نے ہمیں تسلی دینے کے انداز میں کہا ۔" میں آپ کے ملک کے لیے اور تو کچھ نہیں کرسکا سوچا چلو آپ کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ ہلکا کرنے میں کچھ مدد کردوں"۔

ہم نے کہا ایک بچے کو لے جانے سے کیا ہوگا۔ اس نے جواب دیا' اسے چھوٹی سی بات نہ سمجھو۔ یہی بچہ پچیس برس میں چھ سات بچے اور بڑھائے گا اور ان میں سے ہر بچہ اپنی جگہ چھ سات بچے اور پیدا کرے گا۔ اس طرح ذرا حساب کرکے دیکھو تو.....

ہم نے مستقبل بعید کے نتائج کے بارے میں سوچ کر اس شخص کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور پھر پوچھنے کی جسارت کی کہ اس بچے کو لے جانے سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔ اس نے جواب دیا۔ یہ بچہ بڑا ذہین ہے۔ ہندوستان میں رہے گا تو رکشہ چلاتے گا یا کسی کے جھوٹے برتن صاف کرے گا۔ ہمارے ملک جائے تو ہوسکتا ہے بڑا ہوکر نوبل پرائز حاصل کرے گا۔ ہم نے کہا اگر یہ بات ہے تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیے کیوں کہ ہمیں بھی نوبل پرائز حاصل کرنے کی بڑی شدید خواہش ہے۔ لیکن اس نے ہماری درخواست رد کردی۔

جو حال انسانوں کے سماج کا ہے ویسا ہی حیوانوں کا ہے۔ ان کے ہاں بھی گھٹیا اور کمزور قسم کے جانوروں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں اور قوی اور بڑھیا جانوروں کے بچے کم۔ ایک بار ایک لومڑی ایک شیرنی کے پاس گئی اور اس سے بڑے غرّے سے بولی۔ تم جنگل کی رانی بنی پھرتی ہو، لیکن سال میں ایک ہی بلا پیدا کرتی ہو۔ مجھے دیکھو میں ہر چھ مہینے میں چار پانچ بچوں کو جنم دیتی ہوں۔ شیرنی نے ناک سکیڑ کر جواب دیا۔ یہ صحیح ہے کہ میں سال میں ایک ہی بچہ پیدا کرتی ہوں لیکن وہ بچہ جنگل کا راجہ ہوتا ہے۔ یہ سن کر لومڑی دم دبا کر بھاگی اور سیدھی فیملی پلاننگ کلینک پہنچی۔ وہ دن اور آج کا دن اس لومڑی کے اور کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا اور شیرنی اور لومڑی دونوں ایک ہی گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں اس شیرنی کے ساتھ جو روایت پڑے بکری پانی پیا کرتی تھی' اس کو ایک دن غصے میں آکر شیرنی نے کھا لیا کیوں کہ اس نے لومڑی کے دو بچے نہ جننے کے بارے میں کوئی ناشائستہ بات کہی تھی۔ لومڑی کے دو بچے اب جوان ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اچھی تعلیم پائی اور اب وہ محکمۂ جنگلات میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ انھیں میں سے ایک بچے نے ہمیں بتایا کہ وہ جو کچھوے اور خرگوش کی دوڑ کے مقابلہ والی کہانی بچوں کو سنائی جاتی ہے۔ اس میں خرگوش کے ہارنے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ دوڑ کے دوران اسے دو چار بار رستے میں اپنی بیوی کی زچگی کے لیے جانا پڑا۔ اس اثنا میں کچھوا آگے بڑھتا گیا۔ آج کے خرگوشوں کو بھی لومڑی کو دیکھ کر سبق حاصل ہوگیا ہے اور انھوں نے بھی اب نس بندی کروانا شروع کردی ہے۔ اس لیے آج کا نوجوان خرگوش ریس میں کچھوے سے نہیں ہارے گا۔ یقین نہ ہو تو اسے دوڑا کر دیکھ لیجیے۔ یہ بات واقعی صحیح ہے کیوں کہ ہم نے حال ہی میں دیکھا ہے کہ شکاری کتے بھی خرگوشوں کی رفتار سے دوڑ نہیں پاتے۔ اسی لیے انگریز اپنے کتوں کو دوڑنا سکھانے کے لیے خرگوشوں کا پیچھا کرواتے ہیں۔

لومڑیوں اور خرگوشوں نے تو سبق سیکھ لیا۔ لیکن ہندوستان کا عام انسان اب بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ کہتے ہیں انسان اشرف المخلوقات ہے۔ بہترین پیداوار ہے۔ لیکن ایسا کون کہتا ہے؟ خود انسان ہی۔ کبھی حیوان نے یہ بات مانی ہے؟ ذرا سوچیے۔

طالب خوندمیری

غالب حسینوں کے جھرمٹ میں

کالج کے گیٹ پر تھیں کھڑی چند لڑکیاں　　غالب پہ پڑ گئی جو نظر ان کی ناگہاں
کوندیں لبوں پہ اُن کے شرارت کی بجلیاں　　آگے بڑھیں وہ لینے کو غالب کا امتحاں

چاروں طرف سے گھیر لیا ان کو آن کے
لالے پڑے تھے حضرتِ غالب کی جان کے

اک گلبدن نے چھیڑ کے ان سے کہا، کہو　　قبلہ کو ہم سے بیر ہے کیسا ' ذرا کہو
ہم نے کبھی کسی کا بگاڑا ہے کیا، کہو　　کیوں ہر غزل میں آپ ہمیں کو بُرا ' کہو

یہ کیا ضرور ہے کہ غزل عاشقانہ ہو
چاچا کبھی تو ہم پہ نظر بزرگانہ[1] ہو

خود کو فریبِ جوشِ جوانی دیئے ہوئے　　دو چار پیگ اُدھار کی وہسکی پیے ہوئے
آنکھوں میں رنگِ شوق تماشا لیے ہوئے　　"بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے"

بوڑھے دماغ میں ہے جوانی بسی ہوئی
چنگاری راکھ میں ہے ابھی تک دبی ہوئی!!

غالب نے ہنس کے اس سے کہا یہ جواب میں　　گستاخی کیا ہوئی ہے تمھاری جناب میں
"ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں"　　ایسی حسین شکل بھی اتنے عتاب میں

میں بھی سنوں قصور یہ بندے سے کیا ہوا؟
کیوں حُسن کا ہے عشق پہ نزلہ گرا ہوا؟؟

میں نے یہ کب کہا ہے کہ اچھا کہیں مجھے　　یہ بھی تو ناروا ہے کہ بوڑھا کہیں مجھے
تم سی پری نژاد بھی چاچا کہیں مجھے!　　میرا تو مشورہ ہے کہ "نوشہ" کہیں مجھے

بوڑھا ہوا تو کیا ' مری آنکھوں میں دم تو ہے
تم سب سے مل کے عمر کا احساس کم تو ہے

یہ سن کے ایک نازنیں اُن پر بپھر گئی　　پوچھا! وہ شاعرانہ شرافت کدھر گئی؟؟
کیا عاشقی حواس سے بیگانہ کر گئی　　یا "آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی"؟؟

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"
پھر بھی بڑے میاں ہیں ابھی تک شباب میں

[1] ضرورتِ شعری کے لیے اس لفظ میں "ز" متحرک کیا گیا ہے

حضرت! یہ بات آپ نے کیوں بار بار کی جس مہ جبیں کو دیکھ لیا، جاں نثار کی
اس عمر میں ہوس کی روش اختیار کی کیوں آپ نے بھی حسن پرستی شعار کی؟!

تھا آپ کا تو پیشۂ آبا سپہ گری
کرتے ہو "مہ رخوں کے لیے کیوں مصوری"؟!

پہلے تو دھوئے پینے کو اک سیم تن کے پانو پھر دابنے کو بیٹھ گئے راہ زن کے پانو
سب قافیوں میں جوڑ دیئے مرد و زن کے پانو کیا دکھ رہے تھے آپ کی فکرِ سخن کے پانو؟

وہ آپ کی انا، وہ حمیت کہاں گئی؟
وہ کج کلاہی آپ کی حضرت کہاں گئی؟؟

صحبت میں عاشقوں کی پڑی ہے کہیں یہ خو جو آپ تاک جھانک میں پھرتے ہیں کو بہ کو
کیوں آپ کو ہے زہرہ جبینوں کی جستجو؟ کیا ہو چکی مشاہدۂ حق کی گفتگو؟!

فرمائیے! بیاں وہ تصوف کا کیا ہوا؟!
ہستی کا فلسفہ ہے دھرے کا دھرا ہوا

اک شوخ نے کہا کہ سنبھل جائیو اسد قابو میں اپنے دل کو ذرا لائیو اسد
ایسا نہ ہو کہ آپ بھی پچھتائیو اسد یک آپ کے مت فریب میں آجائیو اسد

کالج تمام حلقۂ دامِ شباب ہے
یہ وہ جگہ ہے جس کی حقیقت بھی خواب ہے

کب تک نظر کو حسن کی برسات چاہیئے نوخیز گل رخوں سے ملاقات چاہیئے؟!
کیوں بے خودی یہ آپ کو دن رات چاہیئے؟ کیوں آپ کو یہ ساری خرافات چاہیئے؟!

کب تک رہے گا سر میں یہ سودا بتائیے
کس منہ سے کعبہ جاؤ گے قبلہ بتائیے

غالب نے سب کو درپئے آزار دیکھ کر طعنوں کے تیر طنز کی تلوار دیکھ کر
فرمایا! گفتگو کو شرر بار دیکھ کر "ڈرتا ہوں تم کو برسرِ پیکار دیکھ کر

منہ کھولنے میں شامتِ جاں کا گماں ہے
کیسے کہوں کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے"

شعروں میں بھر رہا تھا مذاقِ نظر کو میں کیا کچھ سمجھ رہا تھا متاعِ ہنر کو میں
دیواں پہ کیوں نہ مارلوں اب اپنے سر کو میں؟! "حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں"

کیا خوب شاعری کا ملا ہے صلہ مجھے
"شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"

○

ساغر خیامی

اگر جنگ ہوگئی

ابر ہوگا نہ سمندر نہ زراعت ہوگی
دھرتی ہوگی نہ ہوا اور نہ حرارت ہوگی
بم جو برسیں گے خلاؤں سے قیامت ہوگی
عالمی جنگ سے دنیا کی یہ حالت ہوگی
قیس دکھلائی نہ دیں گے کہیں چھونے کے لیے
ہاتھ آئیں گی نہ لیلائیں نمونے کے لیے

گیس بن جائے گا ہر پھول چمن زاروں میں
بھر لیا جائے گا انسان کو غباروں میں
بیٹھ کے دو ستورفتار کے طیاروں میں
بھاگ جائیں گے بڑے لوگ تو سیاروں میں
بھوت رہ جائیں گے مُردوں میں سمانے کے لیے
مولوی ہوں گے نہ یٰسین سنانے کے لیے

جرأتیں دیکھ کے لگتا ہے یہ فرزانوں کی
شمع بجھ جائے گی اس بھیڑ سے پروانوں کی
باتیں سچی بھی ہوا کرتی ہیں دیوانوں کی
مونچھیں گُدّی میں نکل آئیں گی انسانوں کی
وقت سے پہلے قیامت کے قیامت ہوگی
اُستروں سے نہیں تولیوں سے حجامت ہوگی

خار پیوست مرے دل سے نکل سکتے ہیں
جو ہیں مفلوج رہِ شوق میں چل سکتے ہیں
عالمی جنگ کے خطرات بھی ٹل سکتے ہیں
چند مٹی کے کھلونوں سے بہل سکتے ہیں
صاحبو، وقتِ مدد ہے مری امداد کرو
عشق کرنے کے طریقے نئے ایجاد کرو

اس سے پہلے کہ زمانے میں قیامت ہو جائے
گورے کالوں سے ملیں سانولی رنگت ہو جائے
عالمی جنگ کے خطرے سے بھی راحت ہو جائے
پوری دنیا میں اگر عام محبت ہو جائے
اس سے پہلے کہ جدا سارے کنکشن ہو جائیں
ایک دنیا کی حکومت ہو الکشن ہو جائیں

اسرار جامعی (پٹنہ)

احمد جمال پاشا

تم کو پکارتا ہوں دیوانہ وار پاشا
احمد جمال پاشا یاروں کے یار پاشا

تم بانٹتے تھے خوشیاں غم آشنا دلوں کو
ہو گی اجل بھی تم سے اب شرمسار پاشا

پطرس، رشید احمد اور فکر تونسوی کو
شاید جہانِ نو میں تھا انتظار پاشا

شاید اسی سبب سے جلدی پڑی تھی تم کو
سُن لی تھی دل نے شاید اُن کی پکار پاشا

ورنہ ابھی ضرورت اُردو کو تھی تمھاری
تاکہ کچھ اور لاتے اس میں نکھار پاشا

میں آخری دنوں تک ہمراہ تھا تمھارے
تم موت سے لڑے تھے مردانہ وار پاشا

لب پہ تھا کلمۂ حق اور دم نکل رہا تھا
معبود سے تھا رشتہ یوں استوار پاشا

مہر و رجمال کو میں کیا کہہ کے دوں تسلّی
ان کی تو زندگی ہے اب دشتِ نار پاشا

فن کار تھے تم اعلیٰ طناز بے بدل تھے
طنز و مزاح کے تھے تم تاجدار پاشا

عظمت میں تھے ہمالہ ملتے تھے سب سے جھک کر
تھی شخصیت تمھاری کوہِ وقار پاشا

کرتے تھے چپکے چپکے حاجت روائی سب کی
محتاج و بے نوا کے تھے غم گسار پاشا

دُکھ درد جو تھے دل میں اس کو سمیٹ کر تم
ماحول کو بناتے تھے خوش گوار پاشا

گزرا ہے جو بھی اس پر کس کو سناتے جا کر
اُردو ادب ہے غم سے زار و نزار پاشا

اُردو رہے گی جب تک زندہ رہو گے تم بھی
ہے فن تمھارا ایسا ہی پائیدار پاشا

تم نے معاشرے کی دُکھتی رگوں کو پکڑا
کہتی رہے گی دنیا یہ بار بار پاشا

بس گدگدی لگا کر زخموں کو چھیڑتے تھے
رکھتے تھے تیز اتنی نشتر کی دھار پاشا

اسرار کی دعا ہے شایانِ شاں تمھارے
ہندوستاں میں قائم ہو یادگار پاشا

مسیح انجم

دسواں ستّارہ جہیز یار جنگ

"گوری بی بی ی . . . . ! بتاتوں ! مزا بتاتوں !—"

ہر روز سرِ شام محلّے میں ایک نوجوان کی آواز گونجتی اور محلّے کے سارے لوگ کام دھام چھوڑ کر اس آواز کی طرف لپکتے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری ٹریفک جام ہو جاتی۔ نشّے میں دُھت اس نوجوان کو دیکھتے ہی محلّے کے بعض منچلے بے ساختہ کہہ اٹھتے :

"ارے آگیا ! دلاور خاں آگیا ! جہیز یار جنگ آگیا !"

لڑکوں کا یہ فقرہ جلتی پر تیل کا سا کام کرتا اور دلاور خاں بھڑک کر بڑی تیزی سے ایک جست لگاتا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنے گھر کی دہلیز پر ہوتا۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر وہی صدا بلند کرتا۔

"گوری بی بی ی ! دھرا ! میں آگیا ہوں ! اب بتاتوں !"

یہ سن کر گوری کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور وہ کڑھ کر رہ جاتی کہ اس کے والدین نے اس کی شادی ایک اُجڈ اور گنوار سے کیوں کی ؟ اور وہ بھی ڈھیر سارا جہیز دے کر ! بادلِ ناخواستہ گھونگھٹ ڈالے رسوئی گھر سے نکلتی اور شرماتی لجاتی آہستہ آہستہ صحن میں آکھڑی ہوتی۔ اسے اس بات کا دھڑکا لگا رہتا کہ دیر ہو جائے گی تو اس کا شوہر اسے کس طرح پیٹ دے گا۔ صحن میں آنے کے بعد جیسے ہی اس کی نظر باہر کھڑے ہوئے مجمع پر پڑتی تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ لیکن اس کے شوہر دلاور خاں کو قطعی شرم نہ آتی وہ اپنی نئی نویلی بیوی کو صحن میں کھڑا دیکھ کر بے ساختہ جھوم اٹھتا اور پھر اس سے پوچھتا۔

"گوری بی بی ! یہ اس سوال کا جواب نہیں دے پاتی۔ کیوں کہ اس پر حیا اور نسوانیت غالب آجاتی۔ یوں بھی ہندوستانی بیوی اپنے شوہر کا نام لینا کب پسند کرتی ہے ! بہت ہی اصرار ہوا تو صرف یہی کہے گی۔

"اُنوں ! ہمارے اُنوں ! ہمارے وہ !"

گوری کی خاموشی کو دیکھ کر دلاور خاں پر گالیوں کا دورہ پڑتا۔ پھر بھی گوری ٹس سے مس نہ ہوتی۔

تب بڑی بوڑھیاں اسے جھنجھوڑتیں۔

"اری بیٹی بول ! کچھ تو بول ! کچھ نہیں تو ہمارے اُنوں" ہی بول !" اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوتی اس کی خاموشی اس بات کا احتجاج ہوتی کہ اس کی شادی میں دلاور خاں کو منہ مانگا جہیز کیوں دیا گیا ؟ گویا دلاور خاں نے گوری سے شادی نہیں کی تھی، بلکہ جہیز سے شادی کی تھی۔ یہی بات گوری کو بہت کھلتی وہ یہی سوچتی کہ میں دلاور خاں کا نام کیوں لوں ! اس نے تو جہیز سے شادی کی تھی۔ یہ تماشہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ چناں چہ جب ایک

دلاور خاں نے حسبِ معمول وہی رٹ 'میں کون ہوں؟' کی لگائی تو گوری سے رہا نہ گیا۔ بالآخر اس نے بہت ہمت کرکے کہہ ہی دیا:

"آپ میرے شوہر دلاور خاں نہیں بلکہ جہیز یار جنگ ہیں!"

اس جملے پر اگر کوئی حیا دار نوجوان ہوتا تو وہیں زمین میں گڑ جاتا۔ لیکن دلاور خاں نے اپنا سینہ ٹھونک کر بڑے فخر سے کہا:

"ہاں! ہم جہیز یار جنگ ہیں ـــــ جہیز یار جنگ ـــــ!!"

اس واقعے کو گزرے ہوئے کوئی چالیس سال بیت چکے ہیں۔ ہم اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ ہم نے خود اس جہیز یار جنگ کی شادی میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی اور چوتھی کے کھانے میں نوشہ کو ہم طعامی اور ہم کلامی کا شرف بخشا تھا۔ یہی نہیں جہیز کو ملاحظہ فرمانے کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جہیز کو ملاحظہ فرماتے وقت ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ "زن مرید" کا لفظ کہیں زیادہ "زر مریدی" کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شادیوں کے موقع پر جہیز کی کچھ اس طرح نمائش کی جاتی ہے کہ۔

نوجوانوں کا جہیز نہ لینے کا عہد متزلزل ہو جاتا ہے یہی نہیں۔ بعض شادی شدہ حضرات کو عقدِ ثانی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

ہم نے یہ چالیس سال پرانا واقعہ محض اس لیے سنایا کہ نوجوان عزت بچائیں اور سیدھی سادھی شادیاں کریں یعنی "زر" کی بجائے "زن" سے شادی کریں۔ چالیس سال پہلے ہم نے صرف ایک گوری کو پٹتے اور گالیاں کھاتے دیکھا تھا۔ لیکن آج کل جہیز اور جوڑے کی رقم کے نام پر کئی گوریاں پٹ رہی ہیں۔ گالیاں کھا رہی ہیں۔ خودکشی کر رہی ہیں۔ لیکن ہمارے نوجوان ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پتہ نہیں، نوجوانوں کی حمیت کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب نوجوان اپنی پسند کی گوری کو حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتے۔ سوئمبروں میں شرکت کرتے اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے۔ مختصر یہ کہ گوری کو حاصل کیے بغیر ان کو چین نہ آتا۔ اس کے برعکس آج کے نوجوانوں کو لیجیے۔ کوئی رشتہ طے ہونے پر لڑکی والوں سے یہی کہیں گے کہ "لڑکی کو آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجیے البتہ جہیز دے دیجیے"۔ دیکھا آپ نے زر پرستی اور زر مریدی نوجوانوں کو کہاں سے کہاں لے گئی ہے! اس زر پرستی سے تو زن مریدی اچھی کہ کم از کم شرفا کی عزتیں تو نیلام نہیں ہونے پاتیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے زمانے میں لڑکی والے اپنے داماد کو جہیز نہیں دیتے تھے؟ ضرور دیتے تھے مگر حسبِ حیثیت ان کی فراخ دلی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اگر جہیز کی فہرست میں کچھ چیزیں دینے سے رہ جاتیں تو ان مابقی آئٹموں کے لیے لکھائی پڑھائی کی صورت میں ادھار کھاتہ تک کھول دیا کرتے تھے اس طرح داماد کو وعدۂ فردا پہ ٹال دیا جاتا۔ ٹال کیا دیا جاتا، اکثر ٹرخا دیا جاتا۔ یہیں سے خوشدامن کے روپ میں لڑکی کی ماں کے رول کا آغاز ہو جاتا۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا پارٹ نبھاتی۔ اس دور کی خوشدامنیں بڑی چالاک اور ہوشیار ہوا کرتیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے دامادوں کو نہ جانے کیا گھول کر پلاتیں یا کیا ٹوٹکے کرواتیں کہ داماد اپنی نئی نویلی بیویوں کے چکر میں پڑ کر نہ صرف مابقی جہیز کے مطالبے کو بھول جاتے نتیجتاً لڑکے کے والدین اپنے لڑکے پر "زن مریدی" کا لیبل لگا کر کفِ افسوس ملتے ہوئے یہ فرماتے کہ "ہمارا لڑکا تو اب

ہاتھ سے گیا۔ مختصر یہ کہ خوشدامن اپنے دامن کی کچھ ایسی ہوا دیتی کہ سرکش سے سرکش داماد کسی سرکس کے سدھائے ہوئے جانور کی طرح ساس کے اشاروں پہ ناچنے لگتا۔ پتہ نہیں وہ خوشدامنیں کہاں گئیں؟ اور کیوں ناپید ہو گئیں ہو سکتا ہے کہ شائد ساس کے اُن پرانے نسخوں میں اب کوئی جان باقی نہ رہی ہو۔ یا یہ بھی عین ممکن ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کے معدے ہی اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ ساس کے آزمودہ نسخوں کو پچا سکیں۔

جہیز کا مسئلہ کوئی آج کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بڑا پرانا اور گمبھیر مسئلہ ہے اس کی جڑیں ہمارے سماج میں بڑی اندر تک مضبوطی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کوئی معمولی کام نہیں بڑے بڑے مصلحین نے بڑی کوششیں کیں کہ اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں لیکن ان کوششوں میں وہ خود اس جہانِ فانی سے اکھڑ گئے اور جہیز کا مسئلہ جوں کا توں باقی رہا۔

شادی کے موقع پر لڑکے والوں کے بے تکے مطالبات کے پیشِ نظر تلگو کے مشہور ادیب چلگامرتی نے پون صدی پہلے ہی داماد کو ایک عجوبہ قرار دے کر اس کو "دسواں سیارہ" کے لقب سے نوازا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے سماج میں کوئی بھی طبقہ ایسا نہیں رہا جس کی لڑکیاں جہیز اور جوڑے کی رقم بھینٹ نہ چڑھتی ہوں اب آپ ہی غور کیجیے کہ دسواں سیارہ "داماد" نظامِ شمسی والے نو سیاروں سے کتنا زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔

ہم کوئی ماہرِ فلکیات تو ہیں نہیں کہ نظامِ شمسی سے وابستہ نو سیاروں مریخ، مشتری زہرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات پیش کریں اور نہ ہم کوئی علمِ نجوم کے ماہر ہیں ہاں ہم اس حد تک قصوروار ضرور ہیں کہ ہمارے نام کا ایک جزء "انجم" ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کونسا سیارہ اور کونسا ستارہ انسانی زندگی پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ساری باتیں ماہرِ فلکیات اور ماہرینِ نجوم جانیں یا آپ جانیں۔ البتہ دسواں سیارہ داماد کے بارے میں ہمارے پاس اتنی ساری معلومات ہیں کہ ہم بڑی آسانی سے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ سکتے ہیں ہے کوئی داماد کا مارا غم کا مارا خسر جو ہم سے یہ خدمت مستعار لے!

دسواں سیارہ داماد نو سیاروں سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ رہتا تو زمین پر ہی ہے لیکن دامادی رشتے سے منسلک ہونے کے بعد اچانک اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ اپنی گردش اور سابقہ روش یکلخت بدل دیتا ہے اس کے نام کی خوبی یا خامی یہ ہے کہ "نادان کو اُلٹا بھی دیا تو نادان رہا" کے مصداق "داماد" کو الٹ دیں تو داماد ہی رہے گا۔ سیدھا بھی داماد۔ الٹا بھی داماد۔

چت بھی اُسی کی پٹ بھی اُسی کا۔ اس معاملے میں لنگڑے، لولے، اندھے کانے جاہل، نیم جاہل، ان پڑھ تعلیم یافتہ ڈپلوما ہولڈر وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ داماد سارے کے سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ نو سیاروں کا مرکز سورج ہوتا ہے تو دسواں سیارہ داماد کا مرکز سسرال ہوتی ہے۔ اور اس کی نظریں ہمیشہ سسرال کی جائیداد اور مال پر لگی رہتی ہیں۔ جب تک اس کو سسرال والوں سے سلامیوں کے عنوان سے خیر خیرات ملتی رہتی ہے۔ وہ امن اور چین سے رہتا ہے جیسے ہی یہ سرچشمہ بند ہو جاتا ہے اس کی روش ایکدم بدل جاتی ہے اور وہ مار توڑ گالی گلوج پر اُتر آتا ہے اُس کو یہ پسند نہیں کہ لڑکی والے چین اور سکون کی زندگی گزاریں بالآخر وہ سسرال والوں کو لنگوٹی لگا کر چھوڑتا ہے۔ اتنی بڑی لوٹ کھسوٹ کے بعد لڑکی والوں کے گھر پیسہ کا کوئی کھٹکا نہیں رہتا۔ اصولاً ہر شادی کے اختتام پر لڑکی والوں کو ڈھولک پر گیت گانا چاہیے۔

ہمیں تو لوٹ لیا مل کے دلہن والوں نے ۔۔۔ تمام دن کے اجالوں میں منہ کے کالوں نے ۔۔۔

خواہ مخواہ (بمبئی)

جلوؤں کو اپنے بام پہ لانے میں رہ گئے
ہم دیکھنے میں اور دکھانے میں رہ گئے

اہلِ چمن تو جشنِ بہاراں منا چکے
ہم اپنا آشیانہ سجانے میں رہ گئے

ان واقعات پر ہی وہ برہم بہت ہوئے
جو واقعات میرے فسانے میں رہ گئے

درسِ خودی کو ان کے سبھوں نے بھلا دیا
اقبالؔ صرف قومی ترانے میں رہ گئے

اپنے شکستہ گھر کی نہ لی ہم نے کچھ خبر
دیوار دوسروں کی گرانے میں رہ گئے

واعظ گئے تھے مے کدہ پینے سے روکنے
رندوں کے ساتھ پینے پلانے میں رہ گئے

چھت بھی ٹپکنے لگ گئی بارش میں اور ہم
اشکوں سے دل کی آگ بجھانے میں رہ گئے

الزام جن کے سر تھا ضمانت پہ ہیں رہا
ضامن ہوئے تھے جو وہیں تھانے میں رہ گئے

رہنے کو گھر نہ تھا تو نکاح اُن سے کر لیا
داماد بن کے اُن کے گھرانے میں رہ گئے

با روزگار تھے تو وہ مَردوں کے ساتھ تھے
بے روزگار ہو کے زنانے میں رہ گئے

جلدی میں ہاتھ آ گئی بیگم کی ڈائری
اشعار میرے میز کے خانے میں رہ گئے

دعوت میں ہم نے چھیڑ دیا ذکرِ شاعری
ہم کھا گئے وہ شعر سنانے میں رہ گئے

صحت کا اپنی ہم نے نہ رکھا کوئی خیال
ہر روز صبح اُٹھ کے نہانے میں رہ گئے

کوئی تو مغفرت کی مری مانگتا دعا
چہلم میں سارے دعوتی کھانے میں رہ گئے

میک اپ تمام کر کے وہ تیار ہو گئیں
بالوں میں ہم خضاب لگانے میں رہ گئے

آیا نہ راس شاعری کرنا بھی خواہ مخواہ
بدنام ہو کے سارے زمانے میں رہ گئے

دلیپ سنگھ
(نئی دہلی)

زندہ باد - مُردہ باد

پرانی بات ہے ایک بار ہم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دروازہ اُس کی بیوی نے کھولا اور بتایا کہ خاوند بیمار ہیں۔ پوچھا "یہ اچانک کیا ہوا" کہنے لگی کل شاپنگ کے لیے چاندنی چوک گئے تھے۔ شاید وہاں انہوں نے کوئی گندی چیز کھائی جس سے پیٹ خراب ہو گیا۔" میں نے کہا "بھابی غلطی سے اس نے کوئی صاف ستھری چیز کھائی ہو گی جس سے پیٹ خراب ہو گیا ہو گا۔ گندی چیزیں تو وہ بچپن سے کھا رہا ہے!"

ایسی ہی پریشانی ہم ہندوستانیوں کو ہوتی ہے جب ہم امریکہ یا یورپ جاتے ہیں۔ وہاں کا ایک دم صاف ستھرا کھانا ہمارے پیٹ کو موافق نہیں ہوتا۔ وہاں ہمیں یاد آتی ہیں دلی کی جلیبیاں جن پر سڑک کی گرد کا ورق لگا ہوتا ہے۔ یاد آتے ہیں وہ سموسے جن کو قریبی مل کا دھواں کچھ سلیٹی سا رنگ دے دیتا ہے۔ اور جب یہ چیزیں ہمیں وہاں میسّر نہیں آتیں تو ہم بیمار پڑ جاتے ہیں۔

میں جب ملازمت کے سلسلے میں چار سال کے لیے یورپ گیا تو مجھے ان چیزوں کے علاوہ جس چیز کی وجہ سے وطن کی یاد آتی تھی وہ تھے جلسے جلوس۔ پورا ایک سال گزر گیا میں نے وہاں کوئی جلوس نہ دیکھا۔ میرے کان زندہ باد، مردہ باد، ہائے ہائے اور امر رہے کے نعرے سننے کو ترس گئے۔ کبھی کوئی آواز نہ سُنی کہ یہ رہے کے رہیں گے۔ نہ کسی نہ کہا کہ یہ دے کے رہیں گے۔ میں نے سوچا اگر یہی حال رہا تو اپنا یہاں گزارا کیسے ہو گا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ جلسے جلوس ہماری زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہیں۔ اس سے بے کار لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ نعرہ لگانے کی وجہ سے گلا صاف اور بیماری سے پاک رہتا ہے۔ جلوس میں چلنے کی وجہ سے اہلِ جلوس کی ورزش ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح اُن کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ غصّے میں آ کر جب اہلِ جلوس بسوں کو جلا دیتے ہیں تو سرکار کو نئی بسیں خریدنی پڑتی ہیں۔ اس طرح ملک کی اقتصادی ترقی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بظاہر یوں لگتا ہے۔ جیسے جلسے جلوسوں کی وجہ سے کچھ لوگوں کا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس ظاہر نقصان کے پیچھے کتنا بڑا فائدہ چھپا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ تو میرا ایک ہم جماعت جلوسوں میں اس شدت سے حصّہ لیتا رہا کہ بے چارہ بی اے میں لگاتار کئی سال فیل ہوتا رہا۔ لیکن سیاست کا گہرا تجربہ ہو جانے کی وجہ سے بعد میں وزارت کے عہدے تک جا پہنچا اور اسے محکمۂ تعلیم کا انچارج بنا دیا گیا۔ آپ ہی بتائیے تعلیم میں سدھار لانے کے لیے اُس سے بہتر کون ہو سکتا

جس سے ہم سے کئی زیادہ سال یونیورسٹی کے ارد گرد چکر لگاتے گزار دیئے۔

مجھے لگا کہ اگر یورپ میں لوگ جلسے نہیں کرتے یا جلوس نہیں نکالتے تو شاید اس لیے کہ وہ ان کے فوائد سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے سوچا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا چنانچہ کچھ کرگزرنے کی خواہش میں میں ایک دن گنٹریا کی مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے ملنے چلا گیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ کیسے سیاست داں ہیں کہ آپ جلوس ہی نہیں نکالتے۔ کہنے لگا جلوس کس لیے نکالیں۔ میں نے کہا "یہ کیا سوال ہوا۔ اگر آپ حکومت کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ اُس کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ یا آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے مطالبات پر غور کرے تو جلوسوں سے بڑھ کر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ جلوس نہیں نکالیں گے، نعرے نہیں لگائیں گے تو آپ کی آواز حکومت تک کیسے پہنچے گی۔ جتنا لمبا جلوس ہوگا اور جتنا اونچا نعرہ ہوگا، اتنی جلدی آپ کی شنوائی ہوگی۔ اُس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے اُسے میری دماغی صحت پر کچھ شک ہوا اور کہنے لگا کہ حکومت کوئی بہری عورت تو نہیں ہوتی کہ وہ سوائے نعروں کے اور کوئی آواز سن نہیں سکتی۔ ہمارا اپنا اخبار ہے۔ اُس میں ہم اپنی پالیسیوں کی چرچا کرتے رہتے ہیں۔ حکومت وہ اخبار پڑھ کر سمجھ جاتی ہے کہ ہم کیا چاہتے۔ میں نے کہا "بھائی جان میں آپ کی خود اعتمادی کی داد دیتا ہوں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت نہ صرف اخبار پڑھتی ہے بلکہ مخالف پارٹی کا اخبار بھی پڑھتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی خود اعتمادی کا یہی حال رہا آپ کا کام ہو چکا"۔ وہ کہنے لگے آپ کی بات اگر درست بھی ہے تو آپ ہی بتایئے جلوس میں شامل ہونے کے لیے آدمی کہاں سے آئیں گے۔ لوگوں کی اکثریت تو حکومت کے ساتھ ہے تبھی تو انہیں ہم سے زیادہ ووٹ ملے۔ میں نے کہا اگر آپ کو جلوس نکالنے کے لیے بھیڑ اکٹھا کرنا بھی نہیں آتا تو پھر آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔ آپ کبھی ہندوستان آکر دیکھیے جب جنتا پارٹی جلوس نکالتی ہے تو اُس میں صرف جنتا پارٹی کے حمایتی شامل نہیں ہوتے۔ نہ ہی کانگریس کے جلوسوں میں کانگریس کے حمایتی۔ جلوسوں میں تو بس جلوسیے ہی شامل ہوتے ہیں۔ پوچھنے لگا "یہ جلوسیے کیا ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا یہ وہ پیشہ ور لوگ ہیں جو جلوسوں میں حصہ لینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ انہیں اس بات سے کیا سروکار کہ جلوس کس پارٹی کا ہے۔ نعرہ کیا لگانا ہے انہیں تو اپنی دہاڑی ملنی چاہیے۔ جو "پیسے دے گا اُس کے جلوس میں شامل ہو جائیں گے۔ کہنے لگا یہی تو مشکل ہے پہلے تو یہاں آدمی ملیں گے نہیں کیونکہ سب اپنے اپنے دھندے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اگر کوئی جلوس میں حصہ لینے کے لیے رضامند بھی ہو جائے تو کم از کم پچاس روپے فی گھنٹہ سے کم پیسے نہیں لے گا۔ میں نے کہا اگر آپ کے عوام میں سیاسی شعور ہی نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

یوں تو میں مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا لیکن پھر ہمت کر کے کہا کہ اگر آپ جلوس نہیں نکال سکتے تو اپنے مطالبات کو منظور کروانے کے لیے کم از کم بھوک ہڑتال کا انتظام تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس سے بھی آپ کے دیش میں کچھ چہل پہل آ سکتی ہے۔ ہم تو سیاسی مقاصد کے لیے بھوک ہڑتال کا استعمال اکثر کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگا ہم نے تو سنا ہے کہ آپ کے ہاں ویسے ہی ہزاروں لوگوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے کہا وہ الگ بات ہے۔ لیکن بھوک ہڑتال کو سیاسی ہتھیار کے طور پر وہ لوگ

استعمال کرتے ہیں جنہیں اتنا کھانا نصیب ہوتا ہے کہ اُس سے دس آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ وہ صرف اپنے مقصد کے حصول کے لیے کھانا کھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ حربہ بڑا کامیاب گنا جاتا ہے۔ سرکار پہلے تو اُن کی منت سماجت کرتی ہے کہ بھائی کھانا کھالو تو ہمارے مطالبات پر غور کریں گے۔ لیکن اگر وہ پھر بھی انکار کریں تو اُن کے مطالبات کو کئی بار مان بھی لیا جاتا ہے۔

وہ کہنے لگا مان لیجیے ایک آدمی بھوک ہڑتال کرتا ہے۔ اور سرکار اُس کے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ تو وہ آدمی تو مر جائے گا نا۔ اس طرح ایک قیمتی جان چلی جائے گی۔ میں نے کہا بھوک ہڑتال سے کبھی کوئی نہیں مرتا۔ کہنے لگا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی آدمی لگاتار کئی دن فاقے کرے گا تو یقیناً مرے گا میں نے خود اخباروں میں پڑھا ہے کہ آپ کے ہاں مسلسل فاقوں کی وجہ سے کئی لوگ مر جاتے ہیں۔ میں نے کہا وہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ بھوک ہڑتال اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ بھوک ہڑتال بھی چلتی رہے اور موت بھی نہ ہو۔

میں نے جب مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری بات اُس کے پلّے پڑ نہیں رہی میں نے سوچا اُس پر مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اب یہاں سے کھسکنا چاہیے۔

وہاں سے نکل کر میں سیدھا برسر اقتدار پارٹی کے دفتر پہنچا اور اس کے سکریٹری جنرل سے ملاقات کی۔ حالانکہ میرے سوال وہی تھے جو میں مختلف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے پوچھ چکا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اسے سمجھنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اس کے مخالفین کو۔ اس نے بھی شروع شروع میں کہا کہ ہم کیوں جلوس نکالیں؟ لوگ تو ویسے ہی ہمارے ساتھ ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو کیسے پتہ۔ کہنے لگا انھوں نے ہمیں ووٹ دیئے ہیں۔ تبھی تو ہم حکومت میں آئے ہیں۔ میں نے کہا بھیا ان کے بھروسے نہ رہنا۔ ان کا کیا پتہ کب کسی بات پر آپ سے روٹھ جائیں اور اگلے الیکشن میں آپ کو ہاتھ ملتا چھوڑ کر ووٹ مخالفوں کو دے دیں۔ اس لیے آپ کا فرض ہے کہ انھیں ہر دم یاد کراتے رہیے تاکہ آپ ان کے لیے کتنے اچھے کام کر رہے ہیں۔ اور پھر لوگ جلوسوں میں شامل ہو کر آپ کے کیے ہوئے کاموں کی تعریف کریں گے تو باقی جنتا کے ساتھ ساتھ خود آپ کو بھی محسوس ہوگا کہ لوگ واقعی آپ کے ساتھ ہیں۔ میں نے اسے اپنے گاؤں کے میراثی کا ایک قصہ سنایا جس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ قصہ یوں ہے کہ میراثی نے اپنے بیٹے کی شادی پر نہ گاؤں میں کسی کو کھانا کھلایا اور نہ مٹھائی بانٹی۔ لیکن رات کے اندھیرے میں کمبل اوڑھ کر گلیوں میں کہتا رہتا تھا کہ واہ غلام محمد کیا پارٹی کی تو نے اپنے بیٹے کی شادی پر کہ لوگ رہتی دنیا تک یاد رکھیں گے۔ بار بار اس کا نعرہ سننے کے بعد گاؤں کے لوگوں کے ساتھ خود میراثی کو یقین ہو گیا کہ پارٹی ضرور ہوئی ہوگی شاید ان کی نظریں دھوکہ کھا گئی ہوں گی۔

برسر اقتدار پارٹی کے سکریٹری جنرل نے مجھ سے پوچھا کہ جلوس میں شامل ہونے کے لیے لوگ کیا اجرت کتنے دیں گے تو میں نے اس کا دھیان سرکاری ملازموں کی طرف دلایا۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کو جلوس میں شامل کیجیے۔ تنخواہ تو وہ دفتر سے لے ہی رہے ہیں ایک دن کام نہیں ہوگا تو کیا ہو جائے گا۔

میں نے دیکھا کہ بات اس کے پلّے پڑ رہی ہے۔ پھر اس نے پوچھا ان لوگوں کو جلوس میں شامل کرنے کے لیے بسیں اور ٹرک کہاں سے آئیں گے۔ میں نے کہا ٹرکوں اور بسوں کے پرمٹ اپنے ہاتھ میں لیجیے۔ پھر دیکھیے وہ لوگ اپنے ٹرک اور بسیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے میں کتنی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

سکریٹری جنرل نے پھر پوچھا کہ اگر ہم ہی جلوس نکالیں تو اس میں مطالبات کیا رکھیں۔ میں نے سوچا اتنا بڑا آدمی اور اتنا سادہ سوال۔ ارے بھائی وہی مطالبات رکھو جو بہرحال آپ نے منظور کرنے ہی ہیں۔ پہلے تو صاف کہہ دیجیے کہ مطالبات کو منظور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر اور جلوس نکلیں گے۔ چھ بار اس طرح کرنے کے بعد مطالبات مان لیجیے۔ وہ پوچھنے لگا اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ میں نے کہا فائدہ یہ کہ ان جلوسوں کا لیڈر جو آپ ہی کی پارٹی کا ہوگا۔ اگلی بار الیکشن یقیناً جیت جائے گا۔

مجھے گنٹریا سے آئے ہوئے اب تین چار برس ہو چکے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آج کل وہاں جلسوں جلوسوں کا زور و شور ہے جس کی وجہ سے گنٹریا کے شہروں میں اکثر ٹریفک جیم دکھائی دیتے ہیں دفتروں میں کوئی کام کرتا نظر نہیں آتا۔ لاوڈ اسپیکروں کے کرائے بڑھ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا لگایا ہوا پودا پنپ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اگر دوبارہ وہاں جاؤں تو لوگ میرے نام پائندہ باد کے نعرے لگائیں گے۔

دلہن کی خوب صورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند دوپٹّا! دُلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹّے میں خوب صورت لگے، وہ کھڑا دوپٹّہ صرف اور صرف

اے ایچ۔ زری والا کا ہوگا

اس کے علاوہ ہمارے شوروم کا کثیر اسٹاک
بنارسی سلک ساڑیاں، تنچوی، ساٹن، جارجٹ، آرگنزا، ٹشو، شفان، پٹولہ، پروکیڈ دھرماورم، کانچی ورم، پوچم پلی، نارائن پیٹ، میسور کریپ، امبرائیڈری اور ڈریس میٹریل
خصوصی کاونٹر میاچنگ کے لیے بلوز، دوپٹّہ کرتے اور فالس

ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے ایچ زری والا لاڑ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
فون: 525232 کیبل "زری والا"

پاپولر میرٹھی

فرضی مشاعرہ

برسوں کے بعد کل جو ہوا تھا مشاعرہ
ہوٹنگ کی نذر ہو گیا سارا مشاعرہ

دیکھا نہ تھا کبھی کہیں ایسا مشاعرہ
تھا اپنی نوعیت کا انوکھا مشاعرہ

شاعر تمام نشۂ غفلت میں چور تھے
یہ حال تھا تو کون جگاتا مشاعرہ

ہر سمت سامعین یہ کہتے سنے گئے
قوالیوں کی بزم ہے یہ یا مشاعرہ

منظر ہر اک نگاہ میں تھا رقصِ جام کا
آئینہ میکدے کا تھا گویا مشاعرہ

آمادہ تھا نہ کوئی نظامت کے واسطے
خود صدرِ محترم نے چلایا مشاعرہ

وہ پڑھ گیا تھا حضرتِ غالب کی اک غزل
آغاز جس نے آ کے کیا تھا مشاعرہ

ہر شخص بزمِ شعر میں تھا قہقہوں میں گم
جیسے کہ بن گیا تھا تماشا مشاعرہ

جب پاپولر نے شعر سنائے مزاح کے
تب جا کے تھوڑا رنگ پہ آیا مشاعرہ

اہلِ غزل تو کر گئے ماحول کو خراب
میں نے ہی بار بار سنبھالا مشاعرہ

تھا پوسٹر میں کیفی و مجروح کا بھی نام
محروم دونوں سے تھا بچارا مشاعرہ

اعلان تو جنابِ خمار و فنا کا تھا
لیکن بغیر اُن کے ہوا تھا مشاعرہ

شاعر تمام کرتے تھے اک دوسرے پہ طنز
تھا جیسے شاعروں کا اکھاڑا مشاعرہ

بزمِ سخن میں حضرتِ بیدار تھے مگر
کچھ کر نہ پائے وہ بھی جو سویا مشاعرہ

مہمان شاعروں کا عجب حالِ زار تھا
پایا نہ اُس کو جس نے کیا تھا مشاعرہ

سب اپنے شہر لوٹ گئے اس دعا کے بعد
اللہ اب نہ دیجیو ایسا مشاعرہ

اسمٰعیل ظریف

قطعات

○

شہروں میں ان دنوں اک عجب انتشار ہے
بے تاب ہے کوئی تو کوئی بے قرار ہے
تخصیص عمر کی ہے نہ تخصیص جنس کی
ہر فرد کو یہ لگتا ہے کرکٹ بخار ہے

○

چرچا کرکٹ کا آج ہے گھر گھر
تبصرے ہو رہے ہیں کرکٹ پر
خواب میں بھی ہے جس کے یہ منظر
بڑ بڑاتا ہے نیند میں اکثر

○

چوّا مرے لگ گئے کبھی چھکا مرے آگئے
گلیوں میں ہے کرکٹ کا تماشا مرے آگے
جب گیند پڑی جسم کے تو یاد آیا یہ مصرع
"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے"

○

میں اپنے سالے کو اب کرکٹر بنا دوں گا
یہ رن بنانے کے گر بھی اُسے سکھا دوں گا
ہے جس کو شوق وہ شاگرد میرا بن جائے
میں چار دن میں ہی "ظہیر" اسے بنا دوں گا

○

نوجواں اس نئے زمانے کے
دانت ہاتھی کے ہیں دکھانے کے
وہ کھلاڑی جو ہو چکے بوڑھے
ابھی قابل ہیں رن بنانے کے

○

پہلے شہرت تھی اور کھیلوں کی
اب یہ کرکٹ کا سلسلہ کیا ہے
جس کو دیکھو ہے اس کا دیوانہ
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

○

جو گزرتی ہے اک کھلاڑی پر
آپ بندہ نواز کیا جانے
اس کو بس دھن ہے رن بنانے کی
وہ نشیب و فراز کیا جانے

کھیل کرکٹ کا

ہمارے دوست جو اسکول کے ہیں وہ بھی آئیں گے
وہاں لیڈیز بھی آتی ہیں اکثر دیکھنے کرکٹ
کہا دادا نے یہ سن کر اگر یہ بات ہے تو پھر
بہت دن سے نہیں دیکھا ہے ہم نے کھیل کرکٹ کا

فیاض احمد فیضی
(بمبئی)

دُشمنی ہزار نعمت ہے

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی ساری عمر دوستوں کے پیچھے بھاگنے اور نئے دوست بنانے کے چکر میں اپنے آپ کو برباد کر لیتا ہے اور سوائے افسوس کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ اس کے باوجود دوست اور دوستی کی چاہت کم نہیں ہوتی۔ دوستوں کی بے وفائی برداشت کرنے کی ایسی لت لگ جاتی ہے کہ کبھی کوئی دوست کئی ہفتوں تک دل نہ دکھائے تو تعجب ہونے لگتا ہے کہ آخر یہ ہمیں نقصان کیوں نہیں پہنچا تا کہیں یہ ہمارا دشمن تو نہیں ہو گیا ہے!

اس کے بالکل برعکس لوگ دشمنوں سے کتراتے ہیں۔ ان کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھر لیتے ہیں پتہ لگ جائے کہ کسی پارٹی میں دشمن بھی شریک ہونے والا ہے تو وہاں جانے کا خیال ترک کر کے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے ہیں! کسی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھتے ہیں تو یہ نہیں پوچھتے کہ حضرت، کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟ اس کی بجائے یوں گویا ہوتے ہیں "دو جناب خیریت تو ہے، آج آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے"! اور یہ سن کر مخاطب کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جتنا نقصان دوست ہمیں پہنچاتے ہیں اتنا ہی زیادہ فائدہ دشمنوں کی ذات سے ہمیں پہنچتا رہتا ہے۔ دوست تو ہمیں دودھ سے بھی جلا دیتے ہیں جب کہ دشمن ہمیں چھاچھ پھونک پھونک کر پینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جس شخص کے جتنے زیادہ دشمن ہوں گے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہوگا۔ دُنیا میں آج تک جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں ان کا نام اپنے کارناموں سے اتنا مشہور نہیں ہوا جتنا ان کے دشمنوں نے انہیں مقبول بنا دیا۔ دنیا کے کئی بڑے آدمی تو اپنے دشمنوں کی بدولت امر ہو گئے۔

سچ پوچھئے تو مفت پبلسٹی کے لیے دُنیا بھر کی کرتب بازی دکھانے کی بجائے یہ کام اپنے دشمنوں کے سپرد کر دینا چاہئے اگر شہرت کی خواہش ہے، اور یہ خواہش تو فقیروں، سادھوؤں کو بھی ہوتی ہے، تو فوراً ایک آدھ دشمن پال لینا چاہئے وہ آپ کی شہرت بلڈنگ اور کالونی کے اندر اچھی طرح کرنے کے بعد گلی، محلے اور شہر بھر میں کرنے [illegible] سے بیٹھے گا۔ ———— جس دن آپ کے ہاں [illegible] آئے اسے آس پڑوس کے لوگوں کو مختلف بہانوں سے بلا بلا کر ہر گز نہ دکھائیں بلکہ کوشش یہ کریں کہ دشمن یا دشمنوں تک اس کی خبر پہنچ جائے۔ پھر دیکھئے دوسرے روز سے ہی پڑوسیوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ اکثر اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بعض دشمن اس قدر باخبر اور زُود حِس ہوتے ہیں کہ ادھر آپ نے کسی بڑے کام کا ارادہ باندھا ادھر

دشمنوں نے تو سونگھ لی جس طرح ایک ملک اپنے پڑوسی ممالک کے مستقبل کے تمام ارادوں سے آگاہ رہتا ہے۔ یہی نہیں آپ کے گھر کون سا مہمان آیا، اس کی بیوی نے کیسا لباس پہن رکھا تھا، اپنی بیوی سے روزانہ آپ کے کتنے جھگڑے ہوتے ہیں، آپ کا کون سا بچہ کتنے دنوں سے بیمار رہا ہے، آپ نے نئی قمیص کب سلوائی، آپ کے گھر میں گیس کب ختم ہوئی، آپ کی تقریر ریڈیو سے کب نشر ہونے والی ہے، آپ کی تصویر اخبار میں کب چھپی، ان تمام باتوں کی خبر دشمن ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور بڑی مشقت سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور آپ کا کافی بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔

پھر مزے دار بات یہ ہے کہ کسی سے دشمنی پیدا کرنا بہت ہی آسان کام ہے کسی کو دوست بنانے جائیں تو حالاں کہ وہ خود بھی آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہے مگر جیسے ہی اسے یہ خبر لگی کہ آپ اس سے دوستی کے خواہاں ہیں وہ ادائیں دکھلانا شروع کر دیتا ہے۔ جب کہ دشمن یا ہونے والے دشمن اس طرح کی اوچھی حرکتیں بالکل نہیں کرتے، ذرا سی کوشش سے فوراً دشمنی پر اُتر آتے ہیں اور آپ کی دلی مراد بر آتی ہے۔

زندگی کے ہر کٹھن مرحلے پر دشمن ہمارے کام آتے ہیں۔ دوستوں کا تو وطیرہ رہا ہے کہ وہ کبھی بھی ہماری توقعات پر پورے نہیں اُترے جب کہ دشمنوں کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے اندازے سے کہیں آگے نکل جاتے ہیں آپ پر کوئی بڑی مصیبت آجائے تو یار دوست آکر جھوٹی تسلیاں دے کر غائب ہو جاتے ہیں اور آپ بھی پست ہمت اور بزدل ہو جاتے ہیں جب کہ آپ کو مصیبت میں گھرا دیکھ کر دشمن آپ کی ہنسی اس طرح اڑائیں گے کہ آپ کے اندر حالات سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہو جائے اور آپ جوش میں آکر ناکامی کو کامیابی سے بدل ڈالیں۔ اسی طرح اگر آپ کو کوئی بڑی خوشی مل جائے تو دوستوں کا جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ مبارک باد کے ساتھ دعوت اور پارٹی کے مطالبات ہونے لگتے ہیں اور کبھی کبھی تو ہاتھ لگنے والی رقم سے کہیں زیادہ دوستوں کا منھ میٹھا کروانے میں خرچ ہو جاتا ہے جب کہ دشمن آپ کی خوشیوں کو دیکھ کر مارے رنج اور حسد کے کھانا پینا بھول جاتا ہے اور اس قدر غم زدہ ہو جاتا ہے کہ اسے دیکھ کر آپ کی خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ دراصل دشمن، دوست سے کہیں زیادہ مخلص بھی ہوتا ہے اور بہادر بھی۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ آپ نے اگر کوئی بہت عمدہ اور نفیس سوٹ زیبِ تن کیا ہوا ہے تو وہ اسے دیکھ کر بالکل خاموش ہو جائے گا یا ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک آدھ نقص نکال ہی لے گا جب کہ دوست اس کی ضرورت سے زیادہ تعریف کر کے آپ کا دماغ بھی خراب کر دے گا اور اپنی تعریف کا معاوضہ چائے ناشتہ کے علاوہ چھوٹے موٹے قرض کی صورت لے جائے گا۔ اسی طرح اگر دشمن کو یہ پتہ لگ جائے کہ آپ نے آج پھٹا ہوا موزہ پہن رکھا ہے تو اس کی خبر مزے لے کر وہ اس طرح نشر کرے گا کہ آئندہ آپ ایسی غلطی کرنا بھول جائیں گے جب کہ دوست آپ کو تسلی دیں گے "بھئی پھٹا ہوا موزہ پہننا کوئی بری بات نہیں ہے بھری محفل میں کون آپ کا موزہ دیکھے گا۔ ہم خود اکثر سوراخوں سے سجا موزہ پہن کر دعوتوں میں جاتے رہتے ہیں۔

آدمی کو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے دشمنوں کی تعداد کبھی کم نہ ہو، بلکہ بڑھتی رہے یہی اس کے ذہنی ارتقا کی پہچان ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کا ایک دشمن، دوسرے دشمن کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا ہے اور آپ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک پڑوسی کا حال آپ کو سنائیں۔ نام ان کا پروفیسر گل گلی ہے اسم بامسمّیٰ ہیں۔ اُن کا بچہ کئی دشمنوں کے برابر ہے وہ جب بھی آتے ہیں اپنے لاڈلے کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور ہمیں باتوں کے طلسم میں باندھ لیتے ہیں جب وہ رخصت ہو جاتے ہیں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ ان کا ہونہار بچہ ہمارے شوکیس میں

رکھی گڑیا کا ہلتا ہوا سر، اس کے دھڑ سے الگ ہو گیا ہے۔ میز پر رکھی الارم گھڑی کہ جس کے شیشے میں بال آ گیا تھا اس شیشے کو وہ کرچیوں میں تبدیل کر چکا ہے اور ہمارا قلم کہ جس کا ڈھکن وہ پچھلی ملاقات میں لے گیا تھا اب اس قلم کا باقی حصّہ بھی لے جا چکا ہے۔ یہ تمام حرکتیں دراصل ہماری اصلاح کے لیے ہوتی ہیں تاکہ ہم ٹوٹی پھوٹی چیزیں استعمال کرنے کی بجائے نئی لے آئیں اور اپنا معیارِ زندگی بہتر بنائیں۔

ایک دن پروفیسر اپنے ریفارمر بچے کے ساتھ وارد ہوئے تو ہم دروازے سے نکل رہے تھے۔ کہنے لگے "یہ مُنّا آپ کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے کہا چلو انکل سے ملا دیتے ہیں"۔ ہم نے التجا کی "حضور اس وقت تو ہم آفس جا رہے ہیں۔ شام کو ہم آپ کے مُنّے سے ملنے خود آ جائیں گے"۔ پروفیسر صاحب اپنے مُنّے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "دیکھو بیٹا" انکل تو آفس جا رہے ہیں۔ تم ایسا کرو ان کے ساتھ آج ان کے آفس ہی چلے جاؤ"۔ مُنّے نے باہیں پھیلا دیں۔ ہم نے مجبور ہو کر کہا "چلئے آج ہی سہی"۔ پروفیسر فرمانے لگے "کیا سچ مچ اسے آفس لے جائیں گے! ہمارا مُنّا ورانٹ کھٹ ہے۔ آپ کام کیسے کریں گے"؟ ہم نے جواب دیا "کچھ نہیں یہ تو بہت آسان ہے۔ ہم آپ کے مُنّے کو اپنے دشمن کی میز پر بٹھا دیں گے"۔

بہت سے دشمن ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر دشمن معلوم ہوتے ہیں، بباطن کچھ اور ہوتے ہیں۔ بچپن میں جھڑکی اُدھیڑنے والے والدین اور اساتذہ دشمن دکھائی دیتے ہیں مگر بعد میں جب شیطانی اولادوں اور شاگردوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں۔ جوانی میں ہر لڑکی کا باپ اور بھائی یہاں تک کہ محبّت کا مخالف سارا زمانہ دشمن ہو جاتا ہے مگر شادی کے چند دنوں بعد ہی لڑکا اور لڑکی دونوں پر اس دشمنی کا بھید کھلتا ہے اور عمر بھر کھلا رہتا ہے مگر اب پچھتائے کیا ہوت اسی طرح ادھیڑ عمر میں بیوی زہر کی پڑیا اور جان کی دشمن اور آفس سکریٹری شہد کا چھتّہ معلوم ہوتی ہے مگر بڑھاپا سر پر آتے ہی وہی زہریلی بیوی بہترین ساتھی میں تبدیل ہونے لگتی ہے (اور بے چاری کرے بھی کیا!) اور اس کی دشمنی بھی ہوا ہونے لگتی ہے۔ بڑھاپے میں اپنے ہر وارث پر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ میرے مرنے کی دعائیں مانگ رہا ہے' یہ میری جان کا دشمن ہے حالاں کہ ورثا دعائیں مانگنے کے لیے ہمارے بوڑھے ہونے کا انتظار نہیں کرتے ہا مگر مشکل بس یہ ہے کہ مرنے کے بعد پتہ نہیں لگ پاتا کہ اپنا شک درست تھا یا نہیں اور زندگی کے دکھوں سے نجات دلانے میں قدرت کا کتنا ہاتھ تھا اور دشمن ورثا کا کتنا۔ دراصل آدمی زندگی بھر یہ راز نہیں سمجھ پاتا کہ اس کا ہر دشمن اس کا دوست ہے اور ہر دوست درحقیقت دشمن ہے۔

دشمنوں کے ہزار روپ ہیں، شاعری میں یہ رقیب کی شکل میں آتا ہے' فلم میں ویلن کے روپ میں۔ اگر یہ دونوں نہ رہیں تو عاشق و معشوق' ہیرو اور ہیروئن سبھی اپنا چارم کھو بیٹھیں گے۔ سچ پوچھیے تو اس کی دنیا کی ساری رونق' ساری ہنگامہ آرائی دشمنی کی بدولت ہے۔ خدا نہ کرے کبھی وہ وقت آئے کہ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے لگیں اور دنیا ان دونوں کا فرق بھول جائے۔ دنیا کی بڑی طاقتیں ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گی۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی بہترین دشمن ہیں بلکہ دشمنی کی تبلیغ اور پرچار کر کے بنی نوعِ انسان کی سب سے بڑی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ دشمنی دنیا کی ترقّی کا راز ہے۔ دشمنی ہزار نہیں لاکھ نعمت ہے۔

●●

سرپٹ حیدرآبادی

★

سامنا ہوا اپنا جب بھی بے شماروں سے
دب سکے نہ ہم تنہا ہو کے بھی ہزاروں سے

ہے گناہ روگرداں، ہم گنہگاروں سے
ترکِ سود خواری کا ڈر ہے سود خواروں سے

رعبِ حسن سے اُن کے ہوتی ہے زباں بندی
بات چیت کرتے ہیں اُن سے ہم اشاروں سے

پھول اب سے کھلنے سے پہلے سوکھ جاتے ہیں
دوستی خزاں کی ہے آج کل بہاروں سے

آہ کر نہ بیٹھیں یہ جرم، عشق کے خوگر
احتیاط لازم ہے آفتوں کے ماروں سے

حسن، ناز، نخرے سے یوں چپک کے رہتا ہے
کوئی مقتدر جیسے اپنے اقتداروں سے

مٹ کے راہِ الفت میں ڈھیر ہو گئے ہیں ہم
روزِ حشر اُٹھیں گے ہم اِنھیں ڈھگاروں سے

شاید آنے والا ہے کوئی فاتحہ پڑھنے
باہر آ کے بیٹھے ہیں مُردے سب مزاروں سے

دوڑ ہو کوئی سرپٹ حسن گر مقابل ہو
شوق سے بدل دیں ہم اپنی جیت ہاروں سے

پاگل عادل آبادی

★

کھیلوں میں ایک ایسا بھی کھیلا دکھائی دے
مجنوں کے ہاتھ میں مجھے کنگھا دکھائی دے

واعظ کے گھر میں خود مجھے لفڑا دکھائی دے
گُردے کا پرہیزی گُلگُلے کھاتا دکھائی دے

بچے یتیم خانے کے مریل ہیں سب مگر
منشی یتیم خانے کا بھینسا دکھائی دے

نیرنگیِ حیات کے قربان جائیے
مرغی کے بدلے انڈوں پہ مرغا دکھائی دے

دعوت بغیر کیسے گھسوں جب کہ گیٹ پر
ہاتھوں میں میزبان کے ڈنڈا دکھائی دے

بابا کی جب نمازِ جنازہ پڑھی گئی
مسجد سے دور بیٹا ٹہلتا دکھائی دے

بیگم کی گود میں مجھے ہر سال اک نہ اک
منی دکھائی دے کبھی منا دکھائی دے

چہرے پہ جس کے ناک ہے گز بھر کی دوستو
دیکھو جو غور سے اُسے نکٹا دکھائی دے

جو تیس مار خاں ہے وہ دادا ہے شہر کا
وہ بھی تو گھر میں جورو سے ڈرتا دکھائی دے

ہے صرف بالغوں کی فلم مگر جا کے دیکھیے
نابالغوں کا ہال پہ قبضہ دکھائی دے

سروس کے انتظار میں پاگل کا یہ ہوا
گٹھلی بغیر آم کا چھلکا دکھائی دے

○

دلیپ سنگھ

غزل

یہ چلن ٹھہرا کہ ہر کام پہ شمشیر کریں
دلِ معشوق کو بندوق سے تسخیر کریں

دل میں خواہش ہے کہ ہم بھی کبھی اندر جا کر
پارلیمنٹ میں بے معنی سی تقریر کریں

رات یہ خواب نظر آیا کہ ہم پکڑے گئے
کیوں نہ اس خواب کی اس طرح سے تعبیر کریں

ہتھکڑی بن کے جکڑ لے ہیں گجرا تیرا
اور تری زلف کو اپنے لیے زنجیر کریں

عاشقی کو کسی بابو نے کہا "صبر طلب"
کیوں کہ یہ لوگ ہر اک کام میں تاخیر کریں

سب کو معلوم ہے انعام ہیں ملتے کیسے
تم کو لینا ہو تو پھر ویسی ہی تدبیر کریں

تم ہو گر نور جہاں تو یہ کہو تم بھی تاہو
تاکہ ہم خود کو گھڑی بھر کو جہانگیر کریں

وہ رُلانے کو لکھیں اور میں ہنسانے کو لکھوں
کیا ضروری ہے کہ میں وہ کروں جو میر کریں

لاکھ ڈھونڈا کہیں ملتی نہیں ممتاز محل
جس کے دفنانے کو ہم تاج کی تعمیر کریں

رسم اجرا ہو کتابوں کا چلن یہ ٹھہرا
مجتبیٰ[1] خاکہ پڑھیں گوپی[2] جی تقریر کریں

ہم سے بڑھ کر کوئی شاعر ہی نہیں اُردو میں
اس حقیقت کی نہ کیوں آپ ہی تشہیر کریں

۱؎ مشہور خاکہ نگار مجتبیٰ حسین
۲؎ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۰ کلرک دفتر نما

ظہیر ابنِ قدسی

غزلیں

بیمارِ شاعری ہوں دوا دیجیے مجھے
معجونِ واہ واہ کھلا دیجیے مجھے

میں بھی مدد کروں گا غریبی ہٹانے میں
پہلے کہیں وزیر بنا دیجیے مجھے

یونورس میں کروڑوں کمایا ہے آپ نے
دو ٹنگ کا میری کچھ تو صلا دیجیے مجھے

میں کھٹ سے ٹارزن کی طرح اڑ کے آؤں گا
مستے کے ابا کہہ کے صدا دیجیے مجھے

روزانہ چاہیے شرفِ تلمذ کی بی کے آپ
غزلیں ظہیر دے کے رٹا دیجیے مجھے

○

حکیم آتے نہیں، ڈاکٹر نہیں آتے
وزٹ کے واسطے شاعر کے گھر نہیں آتے

تمام شعرا سے پوچھیں یہ بیگمات ان کی
کہاں پہ رہتے ہو، کیوں رات بھر نہیں آتے

جو دوستوں سے ہو بچا تو قرض دے دیجے
یہ قرض لے کے مہینوں نظر نہیں آتے

ہیں چاپلوسی، خوشامد ضروریاتِ حیات
وہ مر ہی جائیں، جنھیں یہ ہنر نہیں آتے

ہو جن کے ذمے صدارت یا افتتاح ظہیر
مشاعروں میں کبھی وقت پر نہیں آتے

مختار یوسفی

چارپائی دے

مرغا، بٹیر، فاختہ، مچھلی فرائی دے
لیڈر کو خواب میں یہی ہر دم دکھائی دے

منڈپ میں گھس کے دولہے کا جوتا چرا لیا
واپس اگر ہو لینا تو جوتا چرائی دے

آفس میں جھٹ سے کام اگر ہو نکالنا
چپراسیوں کو پہلے ذرا سی ملائی دے

دیوان اس کے نام سے منسوب میں کروں
دیوان چھاپنے کی مجھے جو چھپائی دے

جو لوگ دور رہتے ہیں تھیٹر کے سائے سے
ان کے گھروں میں شان سے ٹی وی کمائی دے

کھٹیا کھڑی ہے اتنی گرانی ہے دوستو
مجھ کو کوئی ادھار میں اک چارپائی دے

زد میں فساد کی مرا بھائی گزر گیا
"امداد کی بجائے مجھے میرا بھائی دے"

دن رات کر رہے ہیں دعا یہ جنابِ شیخ
ان کو بگاڑ والا کوئی گھر جوائی دے

داخل ہے اسپتال میں جورو کا بھائی آج
اس کو سنبھالنا ہے پڑوسن چٹائی دے

سالوں کو بیچ بیچ کے مختار تھک گیا
خصلت ہے خاندان کی جو کم سنائی دے

رشید عبدالسمیع جلیل کی نظم

سیاست خانم

تو کہ دوشیزۂ بدنام سیاست خانم
تیرے شیدائی تجھے کہتے ہیں جانم جانم

ماننی آئی ہے سقراط کو جدِّ اعلیٰ
زہر کا جس نے پیا تھا تری خاطر پیالہ

باپ ارسطو ہے ترا، پوتی ہے افلاطوں کی
تجھ سے منسوب تجارت ہوئی بہتے خوں کی

فلسفہ، منطق و حکمت ہے بچھونا تیرا
اور تاریخ کا ہر باب کھلونا تیرا

حکمرانی کے طریقوں کو ابھارا تو نے
اپنے ایوان میں کرسی کو اتارا تو نے

تھی شہنشاہوں کے فرسودہ حرم میں پنہاں
اب تو جمہور کے آگے بھی کھڑی ہے عریاں

تیرے پیکر کی پرستار ہے دنیا ساری
تیری زلفوں میں گرفتار ہے دنیا ساری

تیرے رخسار پہ ہے تل بھی کوئی قہر و بلا
قد و قامت کا تعین تو بہت دور رہا

تیرے جلووں کی تمازت ہے حسینوں کی صلیب
رشتۂ غم جو بھلا دے ہے وہی تجھ سے قریب

تو کہ ابلیس کے اعصاب پہ رہتی ہے سوار
تیرے غمزوں نے کیا آدم و حوا کا شکار

تو ستم پیشہ ہے، قاتل بھی ہے، محبوب نہیں
سرکشی تیرا ہنر، دلبری مطلوب نہیں

آج تک تو نے جلائے نہیں الفت کے چراغ
جو گیا بزم سے تیری نہ ملا اس کا سراغ

تو نے سیکھے نہیں انداز مسیحائی کے
تیرے سب طور طریقے ہیں تماشائی کے

تیری فہرست میں سب کچھ ہے مروت کے سوا
تیری زنبیل میں کردار ہیں مصروفِ دغا

ماہرِ رقص ہے انگلی پہ نچائے سب کو
اک تماشا سا مداری کا دکھائے سب کو

راج لکشمی ہے سبھی تیرے پجاری ٹھہرے
ہر گنہ گار کے گھر تیری سواری ٹھہرے

رہبرِ قوم رہا جو بھی ہوا تیرا غلام
اک اطاعت میں تری جس پہ ہوئی نیند حرام

درس گاہوں پہ ترا جب سے چمتکار رہا
طفلِ نوخیز بھی اک عاشقِ رخسار رہا

باپ بیٹے میں کبھی، شوہر و بیوی میں کبھی
ایک ہی گھر میں ہوئی تیرے لیے رسہ کشی

یدِ طولیٰ تجھے حاصل ہے نظر بندی میں
روز و شب جیسے اضافہ ہے ہنر مندی میں

قوم کے غم میں ڈنر کھا کے لگے ہے گلفام
اپنے منصوبوں کی خاطر ہوئی ہر شب نیلام

عالمی امن سے ہر موڑ پہ گھبراتی ہے
قصۂ غم کبھی یو۔این میں بھی دوہراتی ہے

رخنہ انداز ہے ہر قوم کی یک جہتی میں
آج آفاق بھی گم ہیں تری اک ہستی میں

نقش بر آب نہیں وقت کی تحریر ہے تو
شب کی دیوار پہ ٹانگی ہوئی تصویر ہے تو

یاد آیا جنھیں پانی کا ہوا ہو جانا
تو نہ ان کے لیے اک دشتِ صدا ہو جانا

محوِ نظارہ ہیں ہر رنگ ہوا ہو جانا
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا ہو جانا

دلکشؔ بدایونی

ون پرسینٹ

اُس نے اُلٹی نقاب ون پرسینٹ
دل ہوا فیض یاب ون پرسینٹ

ہم سے پردہ ہے نائن ٹی نائن
اور عدو سے حجاب ون پرسینٹ

ساقیا ہے یہ حد آمیزش
جام میں ہے شراب ون پرسینٹ

سب سمجھتے ہیں پارسا لیکن
شیخ بھی ہیں خراب ون پرسینٹ

گن مشینوں کا رخ ہماری سمت
دوسروں پر عتاب ون پرسینٹ

گل [illegible] نائن
ہے چمن میں گلاب ون پرسینٹ

آپ کس عمر میں قریب آئے
رہ گیا جب شباب ون پرسینٹ

آج رندوں نے شیخ صاحب کو
کر دیا بے نقاب ون پرسینٹ

عشق میں ہم نے سو دُعائیں کیں
ہاتھ آیا ثواب ون پرسینٹ

اُن کے در پر ہزار عاشق ہیں
اُن میں ہے انتخاب ون پرسینٹ

کس پہ بجلی گرانے جاتے ہو
رُخ پہ ڈالے نقاب ون پرسینٹ

آدمیت پرست ہوں دلکشؔ
مجھ سے ہوگا حساب ون پرسینٹ

قطعات

بیسواں جشنِ بہار

اک سعادت مند بیوی نے یہ شوہر سے کہا
موسمِ آمید میں جی میرا گھبرانے لگا
ہونے والا ہے چمن میں بیسواں جشنِ بہار
آشیاں پہ برق کا خطرہ نظر آنے لگا

خوش اخلاق ہونا چاہیے

دیکھ کر غصے میں اک گنجے کو یہ میں نے کہا
بھائی صاحب آبرو کو یوں نہ کھونا چاہیے
یہ غضب ہے؟ آپ کے سر پہ نہیں کوئی سپیڈ
آپ گنجوں کو تو خوش اخلاق ہونا چاہیے

دستور ہے لنگوٹی کا

ننگے بھوکے ہیں دیش کے اتہاس
ان کو سمجھو فقیر جوٹی کا
رشیوں منیوں کا دیش ہے اپنا
اس میں دستور ہے لنگوٹی کا

قوم کا غم کھائیے

ایک لیڈر نے کیا یہ عام جلسے کو خطاب
ہم نے یہ مانا گرانی ہے تو پھر کم کھائیے
پیٹ بھرنے کے لیے آلو کی سبزی کم نہیں
کون کہتا ہے کہ یہ مرغِ مسلم کھائیے

صبر کیجے کچھ نہیں جب گھر میں کھانے کے لیے
اشک پی کر دل پہ تازہ زخم ہر دم کھائیے
دیکھیے میری طرف ہیں کتنے صحت مند ہم
جیسے میں کھاتا ہوں ایسے قوم کا غم کھائیے

اقبال متین
حیدرآباد

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

معمولی سی لکڑی کی کرسی دھری تھی۔ اس سے لگی ایسی ہی میز اور اس کی دوسری جانب ایک اور کرسی۔ دواخانۂ زہرہ سے ذرا آگے سڑک کی دائیں جانب، گلی میں ایک چھوٹا سا مکان تھا اور اس چھوٹے سے مکان میں ایک دراز قد چھریرے بدن کا ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ میرے منان بھائی تھے جو صرف میری ممتاز آپا کے ساتھ رہتے تھے۔ ویسے ڈاکٹر منان آج بھی میرے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اب ایک عالم ان کے ساتھ ہے اور اب یہ میرے نہیں ہمارے ہوگئے ہیں۔ جس کو دیکھو وہی دعویدار ہے کہ منان اسی کے ہیں۔ آج بھی یہ ممتاز آپا کے ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن خلقتِ خدا ان کے ساتھ رہتی ہے۔

میں نے انھیں پہلی بار اپنی پھوپھی اماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ غالبًا میٹرک کا بگڑا ہوا طالب علم تھا۔ میں اور لطیف ساجد اسکول اور کالج سے بھاگ کر آصفیہ لائبریری میں دن گذارتے تھے۔ جانے کیا افتاد پڑی تھی۔ کچھ ہوگیا ہوگا۔ اسکول میں میری حاضری کم پڑگئی ہوگی۔ پھوپھی اماں نے یہ کہہ کر میرے تردد کو دور کیا کہ چلو ممتاز بی کے دلہا سے تمہارے لئے طبی صداقت نامہ لے لیتے ہیں۔ اس طرح پہلی ملاقات میں ڈاکٹر منان سے میں نے اپنی کسی بیماری کا علاج نہیں کروایا بلکہ ایک بیماری ان سے حاصل کی اور جیب میں رکھ لی۔ اور اسکول میں میرا کام بن گیا۔

اس طرح منان بھائی نے میری عادتیں خراب کیں۔ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں حیدرآباد چھوڑنے تک میرے محکمے کی آدھی نوکری میں نے کی اور آدھی ملازمت ڈاکٹر منان نے سرانجام دی۔ میں نے ہر قسم کی رخصت حاصل کی۔ بھلا کوئی ملازم سرکار ایک دن کی رخصت خاص بھی اس آسانی سے لگا دیتا ہے؟ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ عہدیدار تنگ تھے۔ کارنامۂ ملازمت، نامۂ اعمال سے کم سیاہ نہ تھا۔ اور اس سیاہی کے پوتنے میں منان بھائی ہاتھ بٹاتے جاتے تھے۔ مجھے بیمار پڑنے کی ضرورت ہوئی کہ میں اپنی صحت کے ساتھ ان کی طرف لپکتا۔ منان بھائی میڈیکل سرٹیفکیٹ چاہیئے۔ منان قلم اٹھانے کے بہانے [illegible] بڑھا کر قلم کے ساتھ کسی بیماری کو بھی دبوچ لیتے جو سامنے ہی دست بستہ کھڑی ملتی اور اس بیماری [illegible] دیتے

عطا کردہ صداقت نامہ میری جیب میں ہوتا۔ عہدہ داروں پر ڈاکٹر کے نام اور ڈگریوں کی دھونس جم جاتی۔
اور میرا کام بہرحال بن جاتا ۔ آپ نے کہیں ایسا مسیحا دیکھا ہے جو جب چاہتا ہے بیماری چھین لیتا ہے اور
جب چاہو بیماری سے نواز دیتا ہے۔ منان واقعی قلم کے دھنی ہیں اور دل کے غنی بھی۔ جو بیماری چاہو
دے جاؤ اور جو بیماری چاہو لے جاؤ۔ اس طرح انھوں نے اپنی میز پر بیٹھ کر میرے محکمے کی آدھی ملازمت
میرے بچائے کی۔ اور وقتاً فوقتاً نئی نئی بیماریوں سے مجھے نوازا ۔ یہ سب کچھ آپ کو اس لئے بتا رہا
ہوں کہ آپ نے ان کی صرف مسیحائی دیکھی ہوگی۔ یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دوسروں کا دکھ درد بٹورنے کے لئے
اپنی میز پر بیٹھ کر دوسروں کا دفتری کام بھی انجام دیا کرتے ہیں۔
منان بھائی کی شخصیت بڑی پر کھا شخصیت ہے بلکہ وہ ایک مشن ہیرا ہیں۔ ان کی شخصیت کا احاطہ
کرنے کے لئے ان پر آٹھوں کھونٹ ، وار کرنے پڑیں گے۔ یہ مشن ہیرا ہر نظر کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔ کیا اپنا کیا
پرایا ، سب کے سب گھائل بھی ہیں قائل بھی۔ میں ایک راز کی بات بتاؤں ؟ ۔ اور منان بھائی سے اجازت
لئے بغیر بتاؤں ! میں ایک دن ان کی کلینک کے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ ایک بے پردہ خاتون ، برقع پوش
خاتون سے کہہ رہی تھیں۔

" یہ عجیب ڈاکٹر ہیں ، ان سے علاج کرواتے ہوئے بیمار رہنے کو جی چاہتا ہے "
برقع پوش خاتون نے کہا۔ " اسی لئے تو کہتی ہوں ، پردے کی بڑی فضیلت ہے۔ مجھے دیکھو ،
برقع نے لاج رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کب سے ان کی بیمار ہوں ؟
دروغ برگردن راقم ۔ ویسے راوی اور راقم میں زیادہ فرق نہیں۔ رے ، الف ، زبر را دونوں میں
مشترک ہے جیسے دونوں خواتین کے درمیان آنکھوں کا پردہ اور برقع کا پردہ دونوں مشترک ہیں۔
آپ کو راز دار بنانا ہی ٹھہرا تو ، پھر ایک اور راز کی بات سناؤں۔ مسز منان یعنی اپنی ممتاز آپا سے
اجازت لئے بغیر۔ ایک بار میں منان بھائی کے گھر میں بیٹھا آپا سے باتیں کر رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔
آپا نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ بغور سنتی رہیں۔ پھر بڑی سادگی اور دھیرج سے کہنے لگیں۔
" ابھی تو ڈاکٹر صاحب نہا دھو کر بچ دھج کر باہر گئے ہیں۔ ان کا موٹر بس گیٹ تک پہنچا ہوگا۔ قریب
ہوتا تو روک کر آپ سے بات کرواتی۔ مجھے آپ کا نام تو نہیں بتایا ' ہاں کہیں اور ' ناشتے ہی پر گئے ہیں ،
اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کچھ بتا بھی رہے تھے۔ کوئی خانم یا بیگم کہا تھا۔ شائد لنچ تک آپ کے پاس بھی
پہونچ جائیں "
ریسیور رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ " جانتے ہو کس سے بات کر رہی تھی ؟
میں نے کہا : جی نہیں ۔ نہیں جانتا۔ کوئی خاتون ضرور تھیں "
کہنے لگیں۔ " بہت بے چین لگتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ناشتے پر بلایا تھا "

میں جانتا تھا۔ منان بھائی نے ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا۔ آپا کہنے لگیں ۔ "کیوں کیسا مذاق کیا ہے۔ بےچاری منتظر ہوں گی اور خفا بھی ہوں گی کہ ناشتہ مجھ کو چھوڑ کر کس کے ساتھ کرلیا۔" آپا بڑے اعتماد سے ہنستی رہیں اور میں ان کے اعتماد پر ہنستا رہا۔ یہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ دروغ برگردن راوی۔

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گذر کو کیا خبر ہے

منان بڑے آدمی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بڑا آدمی اتنا ہی پیارا بھی ہو جتنے منان ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرحداری، ان کے لہجے کی گھلاوٹ، ان کی بات چیت کی نرم نرم سپردگی ۔ جو بھی ان سے ملتا ہے انھیں کا ہو رہتا ہے۔ بھری محفل سے آدمی کو چرالیں گے اور اس سرقے میں سب سے زیادہ دخل ان کی انسان دوستی کو رہے گا اور ان کے اس وصف سے آپ سب ہی واقف ہیں لیکن ان کی اس معصومیت سے کتنے لوگ واقف ہوں گے۔ مجھے علم نہیں۔

مجھے جب قلب کا عارضہ ہوا اور یہ احساس ہوا کہ میں بھی صاحب دل ہوں تو میں نے فرورتاً اپنے قلب کی حفاظت کے لئے منان بھائی سے کچھ جھجک کر، کچھ تامل کرکے آخر پوچھ ہی لیا۔

"کیا میں مہینے میں آٹھ دس بار ڈیڑھ دو پگ وہسکی پی سکتا ہوں؟"

کچھ سوچ کر پوچھا ۔ " متین بھائی۔ پگ کتنے اونس کا ہوتا ہے؟"

میں دم بخود رہ گیا ۔ ان کے سامنے سر بھی نہیں پیٹ سکتا تھا۔ دل پیٹ لینا بس میں نہ تھا۔ سوچتا رہا کہ اس شخص نے مغربی ممالک میں تعلیم پائی۔ وہیں برسوں گذارے۔ کیا اپنی تمام "گرل فرینڈس" کو پگ (PEG) کی بجائے اونس (OUNCE) پر ٹرخایا ہوگا۔ اور پھر منان بھائی تو نظام سرکار کی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ کیا نظام کی ساری فوج پگ (PEG) کی بجائے اونس (OUNCE) میں ہی ٹامک ٹوئے مارتی رہی ہوگی۔ ایسی پاکیزہ معصومیت پر پیار بھی آتا ہے ترس بھی آتا ہے۔

منان فارسی فرفر بولتے ہیں۔ بقول کسے (نام نہیں بتاؤں گا) منہ زبانی فارسی بولتے ہیں۔ لیکن نہ خمینی کی جمہوریت سے واقف نہ ان کی جمہوری ملائیت سے واقف۔ نہ دخترِ رز کی عشوہ طرازی معلوم نہ ظرف قدح خوار کا اندازہ۔ نہ پیر مغاں سے نسبت نہ مغبچے سے آشنائی۔ فارسی بولنا جانتے ہیں۔ فارسی برتنا نہیں آتا۔

احمد فراز کا یہ شعر اک ذرا تصرف کے ساتھ منان بھائی کی نذر کروں ۔

یہ میں بھی کیا ہوں، اسے جان کر اسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا، ہم سفر اسی کا رہا

بہرحال میرے معالج تو وہی تھے ۔ ساقی گری کی شرم کو کتنی صفائی سے کلینک کی سخاوت میں بدل کر

رکھ دیا۔ نسخہ وہی لکھتے۔ اُٹھ کر اپنی الماری سے دوائیں وہی نکالتے اور ہاتھ میں تھما کر اس طرح خوش ہوتے جیسے کچھ دینے کی بجائے لے رہے ہوں۔

PEG اور OUNCE کا سانحہ الگ رہا۔ اس پر مستزاد یہ برخوردارانہ انداز تو دیکھئے۔ متین بھائی پگ کتنے اونس کا ہوتا ہے۔ جی جل کر رہ جاتا۔ ہوتا ہوگا پانچ، پچاس اونس کا یا آدھے پاؤ اونس کا۔ مگر یہ متین بھائی کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ منان عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ رشتے میں بھی بڑے ہیں۔ انسان تو وہ مجھ سے بڑے ہیں ہی۔ پھر یہ متین بھائی کیوں بھئی۔ اپنی عمر چھپانے کے لئے اپنے سے چھوٹوں کے آگے ایسی برخورداری، ایسی کسر نفسی۔ لیکن میرے لئے صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ کون تسلیم کرے گا کہ میں منان سے عمر میں چھوٹا ہوں۔ لوگ ہنسیں گے۔ مرد تو صرف مسکرا کر رہ جائیں گے، عورتیں تو غصے میں مسکرا بھی نہ سکیں گی۔ انتقام لینے کا بھی وسیلہ نہیں۔ بہت جی کڑا کرتا ہوں لیکن ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ رعب ہی ایسا گانٹھ رکھا ہے منان بھائی نے۔ ہر طرف جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ دوائیں، یہ ساری میڈیکل سائنس تو ان کے گھر کی داسیاں ہیں۔ ہم نے ادب کو اپنے لئے چُن لیا تھا۔ عمر بھر قلم گھس کر ادب کے پھوس کی ایک جھونپڑی اپنے لئے بنالی تھی۔ انھوں نے یہاں بھی محل کھڑا کر دیئے۔ ہر ادبی انجمن ان کی زنبیل میں۔ ہر اصلاحی اور فلاحی ادارے کے وہ کرتا دھرتا۔ ہر امدادی یا خیراتی اسکول کے وہ ان داتا۔ ساری نیکیاں بس اسی ایک نام کے ساتھ منسوب۔ سارا علم و ہنر ان کا۔ ساری باشعوری اور دانشوری ان کی۔ جب کوئی بُت بن کر سامنے کھڑا ہو جائے تو پوجنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

دراصل کچھ اُتھل پتھل مجھ ہی میں ہے۔ اتنے نیک اور اچھے انسان مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ ہر دل میں گھر کئے بیٹھے ہیں ـــ واہ بھئی کوئی اجارہ داری ہے۔ ہمارا بھی تو کچھ ہو۔ آپ تو ہمارے سائے تک اٹھالے جانے کے درپے ہیں۔ ہم ادھر بضد ہیں کہ اپنا پرتو بھی کچھ تو آپ پر پڑے۔ اپنی پرچھائیاں بھی کہیں تو آپ کا راستہ روکیں۔ میں نے بھی ٹھان رکھی ہے۔ ایک دن اتنا جی کڑا کروں گا، اتنا جی کڑا کروں گا کہ ہانپتے کانپتے ان کے بنگلہ تک پہونچوں گا۔ چاہے دل رہے یا نہ رہے۔ بھلے سے اس کا عارضہ ہی رہ جائے۔ میں تو جھجکے کے پیچھے کھڑا زور زور سے پکاروں گا۔ منان میاں ـــ کوئی تو اِدھر اُدھر سے مجھے دیکھے کہ ایسا جی دار بھی ہمارے شہر میں ہے۔ لیکن اگر ایسے میں منان بھائی مسکراتے ہوئے چھجے پر آجائیں تو سب کیا دھرا غارت۔

مجھے بڑی تمنا تھی کہ منان بھائی کے خلاف بھی کبھی کہیں کچھ سنوں۔ ایک دن یہ تمنا پوری ہوتی نظر آئی۔ دل بیمار بلّیوں اُچھلنے لگا۔ ایک صاحب اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ منان بھائی کے لکھے نسخے ہاتھ میں تھے۔ خوبصورت سی بیوی۔ بھلے سے میاں، اچھا سا بچہ گود میں۔ بہت دل برداشتہ لگ رہے تھے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ کوچۂ منان کی خاکِ شفا سے ان کی پہلی پہلی شناسائی ہے۔ اپنی مسز سے

کہہ رہے تھے ۔ " بس نام ہی نام ہے۔ اونچی دوکان پھیکا پکوان والی بات لگ رہی ہے ۔ کچھ دیکھا ہی نہیں۔ سنا ہی نہیں۔ ببلو کی تو پھر آنکھیں دیکھیں ۔ تمہاری تو آنکھیں بھی نہیں دیکھیں اور دونوں کے لئے دوائیں لکھ ماریں " جی چاہا اس نوجوان سے کہوں ۔

" فکر نہ کرو ، منان جانتے ہیں کہ کون سی آنکھیں کہاں دیکھنی چاہیں "

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ۔ اپنے صاحب سے ببلو کی ممی کہہ رہی تھیں ۔

" کچھ دن علاج کرکے دیکھ ہی لیتے ہیں ۔ آخر فیس تو دے ہی دی ہے نا ۔"

دراصل ڈاکٹر منان کو اپنی مسیحائی کا عرفان ہوچکا ہے اور اسی عرفانِ مسیحائی نے ان کی دوکان بچا رکھی ہے ۔ ورنہ ان صاحب کو تو ڈاکٹروں کے معمولی حربے بھی نہیں معلوم ۔ لیکن دو ہی دن گذرے ہوں گے ، وہی خوبصورت جوڑا اپنے بچہ کے ساتھ منان بھائی کے کلینک میں خوش خوش بیٹھا اپنا نمبر لگنے کا انتظار کررہا تھا شائد اس اونچی دکان کے پھیکے پکوان کا مزہ لگ گیا تھا اسے ۔

منان بھائی جیسا قلندر صفت آدمی مجھے نہیں ملا ۔ شہر کے ان چوٹی کے ڈاکٹروں میں شامل ہیں جو انگلیوں پہ گنے جاتے ہیں ۔ لیکن آج تک نہ معائنہ کرنا آیا نہ مریض کو اس کی بیماری بتلانا ۔ مرض ادھر ان کے ہاتھ لگا اُدھر اس کا مرض گیا ۔ یوں دوکان نہیں چلتی بھائی ۔ پہلے معائنہ کرنا چاہیئے ۔ مریض کو لٹانا چاہیئے ۔ پھر بٹھانا چاہیئے ۔ بٹھانے کے بعد انگلیوں سے اس کی پیٹھ ٹھونکنی چاہیئے ۔ پیٹھ ٹھونکنے کے بعد ذرا اس طرح غور و خوض کرنا چاہیئے کہ ڈاکٹر کے اس عالم مراقبہ کو مریض بھی بغور دیکھے ۔ پھر اس کو چت لٹا کر پیٹ پر سے قمیص کھسکا کر اپنے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں اس کے پیٹ کے کسی پسندیدہ حصے پر رکھ کر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کو بجانا چاہیئے اور آواز کو بغور سننا چاہیئے ۔ خواہ کوئی آواز آئے کہ نہ آئے بغور سُننے کی شرط لازم ہے ۔ یہ عمل تین بار کرنا ضروری ہے ۔ اس کے بعد اسٹتھسکوپ کا استعمال کیا جاسکتا ہے دیکھا گیا ہے کہ جو ڈاکٹر اس عمل معائنہ سے گریز کرتے ہیں ان کی مسیحائی مسلم ہو بھی جائے تو ان کی مالی توانائی مشکوک رہتی ہے ۔ چونکہ ڈاکٹر منان کا طریقۂ معائنہ ان اصولوں پر پورا نہیں اترتا ، اس لئے آپ ان کے بنجارہ ہل کے مثالی گھر میں جو کبھی فلم کی شوٹنگ تک کے لئے استعمال کیا جاتا تھا آج اُردو ادب و شعر کی ساری پرچھائیوں کو اس گھر میں ناچتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں ۔ یہاں آپ کو قمقموں کی روشنی میں موم بتیوں کا گداز مل سکتا ہے ۔ یہاں آپ کشنس کے صوفوں کی نرمی کو بستر شب ہجراں کی سلوٹوں کی صورت دیکھ سکتے ہیں ۔ چنانچہ میرے محترم منان بھائی سے بصد ادب التماس ہے کہ فن معائنہ کی طرف توجہ دیں ۔ اب بھی بہت وقت پڑا ہے ۔

منان کی ڈاکٹری کو ان سارے بندھے ٹکے اصولوں سے بیر سا ہے ۔ ان کی مسیحائی چہرہ دیکھ کر کام کر جاتی ہے ۔ اگلے وقتوں میں ایک طبیب حاذق ہوا کرتے تھے ۔ نام تھا حکیم نابینا صاحب ۔ صاحب گویا نام

کا عجز تھا۔ نبض دیکھ کر بیماری تو کیا سلسلۂ حسب و نسب بھی جان لیتے تھے۔ ان دنوں بھی ایک ڈاکٹر ہے جو صرف چہرے پر نظر ڈال کر بیماری تو کیا ذہن و دل کا سارا کرب پہچان لیتا ہے۔ یقین ہے حکیم نابینا صاحب کی طرح سنہ ۲۰۸۷ء میں یعنی سو سال بعد لوگ منان بھائی کو ڈاکٹر بینا صاحب کے نام سے یاد کریں گے۔

ایک اور راز کی بات بتاتا چلوں جو کم از کم مجھے نہیں بتانی چاہیئے۔ یہ ڈاکٹر میرے قبیلے کا بڑا دیوانہ ہے۔ اور یہ قبیلہ اپنی انا۔ اپنے پندار، اپنی اکڑفوں اور کھردرے پن کے سبب پہچانا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ ادیبوں اور شاعروں کا قبیلہ ہے۔ اس قبیلے میں کوئی فرد چھوٹا نہیں ہے۔ ہر ایک، دوسرے سے بڑا ہے۔ اس بڑائی کا کوئی اور چھور بھی نہیں ہے۔ کوئی پیمانہ یا آلۂ پیمائش بھی نہیں ہے۔ اس بڑائی کے لئے کسی سند کی بھی ضرورت نہیں۔ نجاری اور خیاطی سے لے کر جراحی اور مسیحائی تک ہر چھوٹے بڑے علم و ہنر کا امتحان ہے۔ میرے قبیلے کا علم و ہنر یہ ہے کہ وہ تلمیذ رحمانی سے راست نسبت خاص رکھتا ہے۔ اس لئے کوئی بندۂ خدا اس کا امتحان لینے کا اہل نہیں ہے۔ اور اسی لئے وہ خود بھی اپنا امتحان نہیں لے سکتا۔ کائنات چونکہ میرے قبیلہ کی جیب اور دامن میں ہے اس لئے میرے قبیلے کا قد کائنات میں سما ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر منان کو ایسے ہی دیوانے اور سرپھرے پسند ہیں۔ اسی لئے میرے قبیلے کا علاج معالجہ، دوا دارو، ڈاکٹر ستان اس قدر محبت اور عزت سے بلکہ خشوع و خضوع سے کرتے ہیں کہ میرے قبیلے کی توقیر مستم ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ دیکھا آپ نے بس یہی فرق نابینا حکیم اور بینا ڈاکٹر میں ہے۔ حکیم نابینا سب کچھ پہچان کر بھی قبیلہ نہیں پہچان سکتے تھے اور آج ڈاکٹر بینا نہ صرف قبیلہ پہچان لیتے ہیں بلکہ ہر دکھ درد کا رشتہ اس قبیلے سے جوڑ کر اس کا مداوا کرتے ہیں۔

میں اب تک آنکھوں دیکھی اور من بیتی ہی سناتا رہا۔ آپ نے بھی تو کچھ دیکھا ہی ہوگا۔ یہ تو ضرور دیکھا ہوگا کہ منان فیس اس طرح لیتے ہیں جیسے کسی معشوق کا خط لے رہے ہوں۔ گھبرائے گھبرائے عجل عجل۔ بند مٹھی کا بھرم بند مٹھی سے رکھیں گے۔ ڈرائر میں اس طرح فیس ڈال دیں گے کہ خود ان کی نظر بھی نہ پڑے اُردو شاعری معشوق کی بے اعتنائی سے بھری پڑی ہے۔ بھلا وہ عشوہ طراز کہاں خط لکھتی ہے۔ بس اسی حساب سے ڈاکٹر منان کی ڈرائر میں فیس پہنچتی ہے۔ سینکڑوں مریض ہیں سب ہی میری طرح سفاک ہیں شہر بھر میں اگر کوئی ڈاکٹر نجیب الطرفین کے ساتھ ساتھ اجتماع ضدین بھی پکارا جا سکے تو وہ میرے منان بھائی ہی ہیں۔ فیس لے کر اداس سے لگیں گے اور فیس نہ پاکر ایسے شاداں و فرحاں کہ چہرے کی کرنیں چھپائے نہیں چھپیں گی۔ اسی لئے تو جن دنوں ان کی مسیحائی کا طوطی بول رہا تھا۔ کرایے کے مکان میں جو سلیمہ خاتون کی مسجد کے سامنے تھا، کیسے مطمئن و مگن تھے وہ —— بس دو پیسی قسم کے چھوٹے چھوٹے

سفید بالوں بھرے کتنے ہی ان کی امارت کی نشانی تھے۔ عمارت کی نشانی کچھ نہ تھی ــــ کوئی اور ہوتا تو کلینک کے نام سے اس کا اچھا خاصہ ہاسپٹل ہوتا۔ بلک بیالنس کے نام سے بنک ہوتا۔ لیکن میں جانتا ہوں ان کے پاس کیا ہے ــــ کیا نہیں ہے ــــ وہ شخص جو دینا زیادہ جانتا ہو اور لینا کم کم اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔ ویسے ان کی دولت مندی سے نہ مجھے انکار ہے نہ آپ کو ہو سکتا ہے ــــ ان کی جائیدادیں شہر بھر میں بکھری ہوئی ہیں ــــ ہر اس دکھی دل میں جو منان سے وابستہ ہوا ہے منان موجود ہیں۔ کتنے ہی انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل منان کے چلتے پھرتے مکان ہیں۔ اور ان مکانوں میں پناہ لینے کے لئے منان نے اپنا سکھ چین کھویا ہے۔ راتوں کی نیندیں تج دی ہیں۔ نم آنکھوں کے سمندر کھنگالے ہیں، تب کہیں جاکر انھیں یہ جائیدادیں ملی ہیں۔ یہ دولت جو انھوں نے کمائی ہے نہ کسی قارون کے پاس تھی نہ کسی برلا، ٹاٹا کے پاس ہے۔ ہمارے شہر کا یہ بے سرمایہ دولت مند کروڑ پتیوں میں بھی اپنا ایک امتیاز رکھتا ہے۔

کوئے جاناں میں بھی آتا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج ہے سردار جُدا

---

۵۰ سال سے ملک کی مشہور و معروف اور ہزاروں کی دل پسند چائے!!

ملک کے ہر دکان پر دستیاب!!!

لاسا اسپیشل چائے
لمسا اسپیشل چاکلیٹ چائے
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس: نیلگری ٹی امپوریم، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد اے پی (انڈیا)

تنگ عنایت پوری

خوب صورت مشورہ

اک جواں جوڑا ہوا اک روز کشتی میں سوار
شوہر و زن کے بغل میں جلوہ گر تھی بوڑھی ماں
بات میں مصروف تھے بیٹا بہو، ماں تھی خموش
آگے بڑھتی جا رہی تھی کشتی اک انداز سے
پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور بھی کچھ کشتیاں
یک بہ یک موسم کا جادو کشتیوں پر چل گیا
اس جواں جوڑے کی کشتی بیچ میں تھی بے اماں
کھاتی تھی ہچکولے اس جوڑے کی کشتی بار بار
بچنے کی صورت نہ تھی کیوں کہ کنارا دور تھا
اتنے میں اس بوڑھی ماں کے دل میں آیا یہ خیال
اس نے بیٹے سے کہا لے کر بہو کو کود جا
میں تو بوڑھی ہوں مرا کیا ڈوب کر مر جاؤں گی
ساس کا یہ مشورہ سن کر بہو بولی "نہیں"
آج بوڑھی ماں کو بیٹے کا سہارا چاہیے
اس نے شوہر سے کہا ماں کو بچانا فرض ہے
تیر کر لے آپ بوڑھی ماں کو لے کر جائیے

جھومتے تھے پانی کے دھارے فضا تھی خوش گوار
نیچے تھا بہتا سمندر اور اوپر آسماں
اس جواں جوڑے کے دل میں آرزوؤں کا تھا جوش
شوہر و زن جھومتے تھے مستیوں میں ناز سے
تھے سواران کشتیوں پر سیکڑوں بوڑھے جواں
یعنی وہ بہتا سمندر آندھیوں میں ڈھل گیا
جانب کشتی بڑھی آتی تھیں اندھی آندھیاں
موت کے آغوش میں تھے اس سفینے کے سوار
کیسے کشتی کو بچاتا ناخدا مجبور تھا
آندھیوں کی زد سے اس کشتی کا بچنا ہے محال
تیر کر اپنی دولھن کی زندگی بیٹا بچا
مرتے مرتے میں بہو بیٹے کے کام آجاؤں گی
آپ کے اس مشورے سے رائے ہے میری جیں
بچ نکلنے کے لیے ہمت کا دھارا چاہیے
اس کٹھن لمحے میں ماں کے کام آنا فرض ہے
آپ میرے واسطے مطلق نہیں گھبرائیے

ایک کو آواز دوں گی تو کئی آجائیں گے
میں جواں ہوں مجھ کو تو لاکھوں بچانے آئیں گے

اقبال ہاشمی

○

آگیا ہے سماج سڑکوں پر
اب تو ہوتے ہیں کاج سڑکوں پر

عادتاً ہاتھ باندھ کر ہم سے
پوچھتے ہیں مزاج سڑکوں پر

خاکی وردی جو گھر میں گھس آئی
آگئی گھر کی لاج سڑکوں پر

نوجوانی تلاش کرتی ہے
رشتۂ ازدواج سڑکوں پر

ہم اُگائیں مکان کھیتوں میں
تم اُگاؤ اناج سڑکوں پر

کل جو چوہوں سے گھر میں ڈرتے تھے
آج کرتے ہیں راج سڑکوں پر

بند کمروں کے فیصلے ہم سے
مانگتے ہیں خراج سڑکوں پر

ہاشمی بھیڑ خود ہی کر دے گی
سر سے پا تک مساج سڑکوں پر

○

رؤف رحیم

○

کسی کے باپ نے دھوکا دیا بڑا مجھ کو
دکھا کے تاج محل، قلعہ دے دیا مجھ کو

جہیز لے کے چلا تھا خوشی خوشی لیکن
رپورٹ تھانے میں کر کے پھنسا دیا مجھ کو

نماز پڑھنے گیا تھا میں آج ہی مسجد
خدا کا شکر کہ جوتا نیا ملا مجھ کو

حسین طریقوں سے بیوی کو لکھ دیا بیوہ
یہ کاتبوں نے کہیں کا نہیں رکھا مجھ کو

بٹے گی شہر میں ہر سمت جائیداد مری
کبھی وزیر کا عہدہ جو مل گیا مجھ کو

جو ایک گھونٹ گلے سے اتر گیا میرے
دکھائی دیتا ہے ذرہ ہمالیہ مجھ کو

تھا تُندخو جو مرا چارہ گر میں کیا کرتا
نکالا دانت وہ جب کہ بخار تھا مجھ کو

یہ خواب بھی کھلی آنکھوں کے خواب ہوتے ہیں
بنا رہے تھے جو صدرِ مشاعرہ مجھ کو

میں گھر میں مارتا رہتا ہوں رات دن مچھر
شکاری بننے کا یوں بھی جنون تھا مجھ کو

اگرچہ دیگ بھی کھا لوں تو ہضم کر لوں گا
حکیم وقت سے نسخہ نیا ملا مجھ کو

میں اپنے شہر کی تاریخ پڑھ رہا تھا رحیم
کہ حرف حرف لہو سے بھرا ملا مجھ کو

احمد سلطان

جنگِ پانی پت

ایک بچّے نے پوچھا دادا سے
واش بیسن کے نیچے یہ کیا ہے
دادا بولے، یہ پائپ ہے نل کا
اس کے ذریعے ہی پانی آتا تھا
ٹونٹی کھلتے ہی بہنے لگتا تھا
اب تو اس میں سے کچھ نہیں آتا
بچّے پانی سے کھیلا کرتے تھے
سب بڑے ہاتھ دھویا کرتے تھے
اب نہ پانی میں وہ پریشر ہے
بوردیل نل سے اورا بتر ہے
کھود لیتے ہیں گھر ہی میں وہ گڑھے
گھر کے باہر جو جا نہیں سکتے
دن پرانے وہ یاد آتے ہیں
روز پانی جو بھرنے جاتے ہیں
ایک دن آڑ موٹر آتی ہے
پانی ٹینکر میں بھر کے لاتی ہے
شور ہوتا ہے اور ہنگاما
اس کے اطراف لگتا ہے میلا
لوگ برتن لیے لپکتے ہیں
نل کی ٹونٹی پہ سب جھپٹتے ہیں
ٹکرا جاتے ہیں جب بدن سے بدن
پھوٹ جاتے ہیں مٹّی کے برتن
چوٹ کھا کے بھی مسکراتے ہیں
بھیگ کر لوگ پانی لاتے ہیں

اس کے آنے سے آتی ہے آفت
برپا ہوتی ہے جنگِ پانی پت

چوّے

میاں بیوی کے جھگڑے میں طوالت ہو گئی اتنی
کہ پوچھا اک پڑوسی نے کہ جھگڑے کی بنا کیا ہے
اشارہ کر کے بیوی کی طرف بولے میاں پوچھو
نہیں کچھ یاد، بیوی نے کہا مجھ کو ہوا کیا ہے

میاں کو لاٹری میں جب ملا اک لاکھ کا انعام
وہ گھر دوڑا ہوا پہنچا خوشی کی یہ خبر دینے
ہمیشہ کی طرح بیوی نے آ کر طیش میں پوچھا
لیا تھا لاٹری کا یہ ٹکٹ کس کی اجازت سے

ڈاکٹر حبیب ضیاء
(حیدرآباد)

اچھے پڑوسی

ہر مذہب نے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اچھے پڑوسی بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں۔ وہ لوگ انتہائی خوش نصیب ہیں جن کے پڑوسی شریف ہوتے ہیں۔ ورنہ پاس پڑوس کے چار پانچ گھروں میں سے ایک بھی کم ظرف ہو تو سارے لوگوں کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ لڑنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی فطرت انھیں مجبور کرتی ہے کہ اپنے پڑوسی کو کسی نہ کسی طرح تنگ کریں۔ کالونیوں میں اس قسم کے پڑوسیوں کے بہت سے واقعات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ایک دفعہ جب ہم نے گھر تبدیل کیا تھا، گملوں کی حفاظت کی خاطر ان کے اطراف کٹی ہوئی خاردار جھاڑیاں لگا دیں اور پڑوسیوں پر واضح کر دیا کہ یہ بالکل عارضی انتظام ہے۔ لیکن دوسرے دن دس بارہ لوگوں کے دستخط کے ساتھ ایک شکایت آفس پہنچ گئی کہ پڑوسی بچے کے پاؤں میں کانٹے چبھ سکتے ہیں۔ اس لیے فوراً نکال دی جائیں۔ ہم نے پڑوسی سے پوچھا "آپ کا بچہ کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "ماں کے پیٹ میں"۔ ہم نے پھر پوچھا۔ ماں کہاں ہے؟ ابھی آنے والی ہے چار پانچ ماہ بعد..... بچے کو جنم دینے کے لیے!

بعض لوگوں میں تو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنتا ہے اور دونوں کورٹ تک جا کر ہی دم لیتے ہیں۔ کسی گھر میں پڑوسن کی نوکرانی سے جھگڑا شروع ہوتا ہے تو کسی کے پاس بچوں کی آپس کی لڑائی بڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بات کچھ نہیں ہوتی۔ فریقین میں سے ایک بھی اگر سوجھ بوجھ سے کام لے تو قصہ وہیں رفع دفع ہو جائے لیکن لوگ اس کو وقار کا مسئلہ بنا کر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ سنا کہ ایک گھر میں رہنے والی خاتون اوپری منزل سے نیچے کچرا پھینکا کرتی تھی۔ پڑوسن نے ہر طریقے سے اسے اس فعل سے باز آنے کے لیے کہا لیکن وہ کسی طرح نہ مانتی تھی۔ تنگ آکر اس نے اس کا پھینکا ہوا کچرا جمع کرنا شروع کیا پھر ایک پاکٹ میں ڈال کر پڑوسن کی بچی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ کچرا پھینکنا تو بند کر دیا لیکن دن میں دو تین بار بلا ضرورت مختلف اشیا کوٹنا شروع کر دیں۔ کوٹنے پیسنے کی ان ناگوار آوازوں کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ کیوں کہ وہ اپنے ہی گھر میں، اپنے فرش پر مسلسل مار رہی ہوتی ہے۔ دوسرے کے سر کی اسے کیا پرواہ۔

بعض لوگ اپنے بچوں کو کچھ ایسی تربیت دیتے ہیں کہ بچے پڑوسیوں کا صحیح معنوں میں جینا حرام کر دیتے ہیں
بچے پڑوسی کو کتنا تنگ کرتے ہیں اس بارے میں وہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ بچوں کی بیجا
جھوٹی اور غلط شکایت کی جا رہی ہے۔ اچھے پڑوسی ہیں جو ذرا سی شکایت پر بچوں کی غلطی بیان کی فوراً تنبیہ کریں۔
لیکن اکثر لوگ منع کرنے کی بجائے ان کی حرکتوں سے خوش ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی بچے کا ذکر ہے جو مختلف طریقوں
سے اپنے پڑوسیوں کو تنگ کیا کرتا ہے۔ سب کی آنکھ بچا کر دوسروں کے گھروں میں کاغذ، چین کے ٹکڑے کاٹ کے
ڈالنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ موقع ملنے پر وہ گھروں میں جا کر پھول پتوں پر بھی ہاتھ صاف کرتا ہے پڑوسیوں
کے گھر کے سامنے کانچ کے ٹکڑے ڈالتا ہے اور جب ان حرکتوں سے جی بھر جاتا ہے تو نظریں بچا کر اسکوٹروں
کے ٹائر پنکچر کر دیتا ہے۔ وہ اور اس کے ماں باپ سر اونچا کر کے چلتے ہیں۔ غالباً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان سے
مرعوب ہیں۔ اس لیے کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ان غیر شائستہ حرکتوں سے محلے والوں کے پاس ان کا جو مقام ہے وہ محلے والے ہی
جانتے ہیں۔ بعض پڑوسیوں میں ایک دوسرے کو ستانے کا مقابلہ چلتا ہے۔ ایک صاحبہ کو گانے کا شوق ہے۔
وہ نہ صرف کلاسیکی موسیقی کا روزانہ دو گھنٹے ریاض کرتی ہیں بلکہ کچھ بچوں کو سا نہ کے ساتھ گانا بھی سکھاتی
ہیں۔ اچھا خاصا گھر میوزک کالج کا سماں پیش کرتا ہے۔ پڑوسن کو گانے سے مطلق دلچسپی نہیں روزانہ
سنتے سنتے اس کے کان پک گئے ہیں، اس لیے جواب میں اس نے ایک تالتو کتا پال رکھا ہے۔ جس کو وہ کم
کھانا دے کر چھوٹی سی رسی سے باندھ کر رکھتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بھونک کر گانے کا صحیح جواب دے
سکے۔ لڑائی دو گھروں میں ہے لیکن دوسرے پڑوسی مجبوراً گانا سنتے ہیں اور کتے کی کرخت آوازوں کو بھی برداشت
کرتے ہیں۔ دو پڑوسیوں کے بچوں میں کھیل کود کے دوران لڑائی ہوئی۔ دو چار دن بعد بچے ایسے گھل مل
گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا لیکن بڑوں کے دلوں میں ایک بار میل آ جائے تو دھلنا مشکل ہے۔ ایک نے
انتقاماً نل کا ایسا بندوبست کر دیا کہ دوسری کے گھر پانی آنا ہی بند ہو گیا۔ تو تو میں میں بڑھتے بڑھتے گالی
گلوچ تک آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی سات پشتوں کو نواز دیا۔ ایک کی چوٹی دوسری کے
ہاتھوں میں تھی۔ کئی دنوں تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ تھک کر ایک نے دوسری پر مقدمہ دائر کر دیا۔
دونوں نے مہینوں کورٹ کے چکر کاٹے اور پھر دس دس روپے جرمانے پر دونوں سیدھی ہو گئیں۔ یہ وضاحت
بے جا نہ ہوگی کہ دونوں خواتین شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اکثر خواتین کا اپنے پڑوسیوں کے گھر بہت زیادہ آنا جانا ہوتا ہے۔ وقت بے وقت دروازہ کھٹکھٹاتی
ہیں اور اطمینان سے اپنا وقت گزار کر واپس ہوتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ خود اگر بے کار ہیں تو ضروری نہیں کہ
پڑوسن بھی بے کار ہو۔ بعض خواتین کو گھر گھر کے جالے لینے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کئی گھر پھر کر ساری خبریں
جمع کر لیتی ہیں اور پھر مرچ نمک لگا کر اپنی پڑوسن کو سنا دیتی ہیں۔ مثلاً کس گھر کی ساس اپنی بہو کو طعنے دیتی
ہے۔ کس گھر کی بہو اپنی ساس کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے۔ کس گھر میں ہر پہلی تاریخ کو میاں بیوی میں زوردار
جھگڑا ہوتا ہے۔ کس کے بچے ماں باپ سے باغی ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ محلے کے یہ سارے راز وہ اپنی پڑوسن
کے پاس جا کر ایک ہی بیٹھک میں اگل دیتی ہیں۔ وہ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے۔

بے وقت آنے جانے کے علاوہ بعض لوگ مہمان کی آمد پر یا کسی بھی وقت کوئی چیز منگوانے کے لیے پڑوسی کا دروازہ بلا تکلف کھٹکھٹاتے ہیں ۔ ہر ایک کے آرام کا ایک وقت ہوتا ہے اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں جن سے پڑوسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔

ہر گھر میں ٹیلی فون نہیں ہوتا ۔ پڑوسی کے ٹیلی فون کا استعمال ضرورت پڑنے پر سبھی کرتے ہیں لیکن لوگوں کو چاہیے کہ شدید ضرورت کے وقت ہی ٹیلی فون استعمال کریں ۔ ایک صاحب صبح ۹ بجے آفس چلے جاتے ہیں ۔ گیارہ بجے ان کی بیوی ہمارے گھر آکر فون کرتی ہیں " راجو پکچر چلنے کے لیے ضد کر رہا ہے اس کا بھی ٹکٹ لیتے آئیے ۔ اور کافی ختم ہو گئی ہے ' میں صبح کہنا بھول گئی "

اس قسم کی باتیں کرتے وقت لوگ مطلق نہیں سوچتے کہ پڑوسی کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے ۔
سونے پہ سہاگہ یہ کہ آفس سے شوہر بیوی کو فون کرتے ہیں ۔ درمیان میں دو گھر ہوں تو جا کر انھیں بلانا ہوتا ہے ۔ وہ بے فکری سے ریڈیو کے ساتھ گاتے ہوئے کپڑے پٹک پٹک کر دھونے میں مصروف ہوتی ہیں ۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھولتی ہیں ۔ انسان بن کر پانچ منٹ بعد فون کرنے آتی ہیں —— شوہر سے مخاطب ہوتی ہیں ۔ ادھر سے آواز آتی ہے " آج کھانا کچھ زیادہ بھیجنا ' دہی رکھنا نہ بھولنا اور ہاں ..... مرچ کم ڈالو ۔ میں گھر میں کہنا ہی بھول جاتا ہوں ۔ کبھی فون آتا ہے ۔ پڑوسن آکر بات کرتی ہیں ' دوسری طرف سے آواز آتی ہے ۔ ہیلو بیگم ! میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ منا پڑھ رہا ہے یا نہیں " ؟ ایسی ہی شدید ضروری باتوں کے لیے لوگ پڑوسی کے گھر کا فون استعمال کرتے ہیں ۔ ایک دفعہ ایسے ہی فون پر ہم نے ہمت کرکے پوچھ لیا " کیا ضروری بات کہنی ہے آپ کو ؟ اس وقت یہاں سے کوئی ملانے والا نہیں " ۔ جواب ملا —— جی —— جی ہاں ۔ ضروری بات ہی تھی ۔ میں اپنی بیوی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس وقت کیا کر رہی ہیں ؟ —— کوئی بات نہیں میں ٹھیر کر پھر فون کر لوں گا " ——

بہر حال ہر قسم کے پڑوسیوں سے لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے ۔ آپس میں تعلقات خوش گوار ہوں تو دونوں ایک دوسرے کے آڑے وقت کام آتے ہیں اور تعلقات بگڑے ہوئے ہوں تو ایک کے گھر ایمبولنس آجانے پر بھی دوسرا تماشائی بنا دروازے یا کھڑکی سے جھانک لینے پر ہی اکتفا کرتا ہے ۔ ●●

نامور مزاح نگار نریندر لوتھر کے انشائیوں کا تازہ مجموعہ

الف تماشا

صفحات ۱۷۴   قیمت ۱۶ روپیے

مطبوعہ زندہ دلان حیدرآباد

مصطفیٰ علی بیگ

زندہ اسٹاچو

میں شاعر محبوب نگر ★ کا
ہنگری تھرسٹی دبلا پتلا
YESTERDAY اس شہر میں آیا
خالی پیٹ تھا میں غش کھایا
آنکھ کھلی تو
میں نے خود کو مردہ خانے کی نعشوں کے بیچ میں پایا
سڑے سڑے
ٹھنڈے ٹھنڈے
نیلے پیلے کالے مردے
اصلی مردے
اپنی ڈیڈ آنکھوں سے مجھ کو گھور رہے تھے
جیسے مجھ سے پوچھ رہے ہوں
تو کیوں آیا؟
تیری باڈی میں تو اب تک HEAT ہے باقی
زندہ لوگوں میں تیری اک سیٹ ہے باقی
تو کیوں آیا؟
یہ بھی کوئی بزم سخن ہے
یا پھر کوئی عید ملن ہے

تو کیوں آیا؟
کب تک تو مردوں کی ایکٹنگ کر سکتا ہے
کب تک گھر والوں سے چھپ کر
ان کے خالی پیٹوں کو بھر سکتا ہے
بھولے پیارے ہاف ڈیڈ ساتھی
اک اڈوائس ہماری سن لے
تو بھی اک اسٹاچو بن جا
ایک پیڈسٹل تو بھی چن لے
روز نیا اک پوز بنا کر
تو بھی ناٹک کر سکتا ہے
گورنمنٹ کے بجٹ سے تجھ کو
کچھ نہ کچھ تو مل سکتا ہے
کم سے کم زندہ تو رہے گا
اک زندہ اسٹاچو بن کر

★ آندھرا پردیش کا ایک ضلع جہاں قحط ہے

حلیمہ فردوس (بنگلور)

مصروفیت پروفیسر کی اور قسمت لکچرر کی

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تتلی کیڑے سے، مرغی انڈے سے اور پروفیسر لکچرر سے بنتے ہیں۔ خدا مہربان ہو تو گدھا بھی پہلوان بن جاتا ہے۔ اگر قسمت چمک اٹھے، سنہری موقع مل جائے (جو بہت کم کسی کو ملتا ہے) اور آپ بحسنِ اتفاق ڈاکٹر آف فلاسفی ہوں تو لکچرر اور ریڈر کی ارتقائی منازل طے کیے بنا ہی پروفیسر بن سکتے ہیں۔ جو پیدائشی کولھو کے بیل ہوتے ہیں وہ وظیفہ یاب ہونے تک کالج کی محدود فضا یعنی تتلی کی چار دیواری میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔

پروفیسر کو بہ آسانی دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ویزیٹنگ پروفیسر اور دوسرے یونیورسٹی پروفیسر۔ ان دونوں کے علاوہ تیسرا گروہ اُن پروفیسروں کا بھی ہوتا ہے جو بیس بائیس سال کالجوں میں لکچراری کا طوق پہننے کے بعد پروفیسر بنا کر آزاد کیے جاتے ہیں مگر یونیورسٹی کے پروفیسر انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔

وزٹینگ پروفیسر: وہ ہے جو ایک یونیورسٹی سے وابستہ رہ کر دوسری یونیورسٹیوں کی دعوتوں پر سیر و تفریح کرتا رہتا ہے۔ یہ یونیورسٹی کی دعوت پر بہت کم وقفہ کے لیے طیارہ میں اڑتا ہوا اپنے زرّین خیالات کی طلباء پر دھونس جمانے کے لیے چلا آتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ قابلیت کے بل بوتے پر بُلایا جاتا ہے یا شعبہ کے دیگر پروفیسروں کی ناک کٹوانے کے لیے یا پھر طلباء جب اپنے پروفیسروں کو گھر کی مُرغی دال برابر سمجھنے لگتے ہیں تو تب وزٹینگ پروفیسر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پروفیسرز عموماً اپنے طلباء کو گھسے پٹے اشعار، ناقدوں کے تھکے ماندے خیالات اور رٹے رٹائے لکچر سُنا کر بور کرتے ہیں۔ لیکن اُنہیں جب کسی یونیورسٹی کا دعوت نامہ ملتا ہے تو وہ چاق و چوبند ہو کر ساری تنقیدی کتابیں کھنگال ڈالتے ہیں۔ اُردو تو اُردو انگریزی ادب کے اوراق بھی چاٹ لیتے ہیں تاکہ ان کے معلومات افزا لکچر کو سُن کر وہاں کے پروفیسر سر اٹھا نہ سکیں۔ اور انہیں دوبارہ سیر کرنے کا موقع ملے۔ جب وہ اس سفر سے لوٹتے ہیں تو چند دن کافی جوش و خروش کے ساتھ ادب کے نئے نئے پہلوؤں اور اصناف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس تبدیلی پر طلباء کے ہوش بھی ٹھکانے نہیں رہتے۔ وہ بھی جوش و خروش کے ساتھ پروفیسر کی باتوں کی تصدیق کے لیے لائبریری میں کتابوں میں کھوئے رہتے ہیں۔

بہر حال یہ سلسلہ دو مہینے چلتا ہے پھر سوڈے کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ پروفیسرز خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہتے ہیں۔ اس دوران اُن کے نام آئی ہوئی کوری کوری کتابیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ کسی یونیورسٹی کا دعوت نامہ ہی اُنہیں اس خواب سے چونکا سکتا ہے۔ ایسے پروفیسر کے ہمراہ سفر میں زادِ راہ کے طور پر بڑی محنت سے

تیار کیا ہوا مقالہ نئی نئی کتابیں (جو قدر دانِ ادب بڑے خلوص و احترام کے ساتھ بھیجتے ہیں) درجن بھر خطوط آ جاتے جن
کو ہی اصد دچار قلم ہوتے ہیں۔ مہینوں سے پڑے ہوئے اس کام کو وہ منٹوں میں ختم کر دیتے ہیں۔ جن کی پہلی تخلیق ہو
یہی لکھا جاتا ہے کہ کتاب دیکھ کر جی خوش ہوا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے سے بھی کوئی خاص نظر نہیں آئی پہلی تخلیق ہے کوشش جاری انشاءاللہ
کرے زورِ قلم اور زیادہ فی الوقت فرصت نہیں۔ کشمیر جانا ہے پھر بنارس پھر متھرا" تو مشقوں سے ہٹ کر بار کسی اچھے
شاعر یا مقبول ناول نگار کی آجاتے تو بڑی سنجیدگی سے دو چار جملے لکھ دیئے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا پورا یقین
ہوتا ہے کہ یہ جملے حوالے کے طور پر کسی مضمون میں نقل کیے جائیں گے یا پھر فنکار کی اگلی کتاب کے حاشیے پر دہرائے جائیں
گے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو ریڈنگ پروفیسر اور یونیورسٹی پروفیسر میں بہت گاڑھی چھنتی ہے کیونکہ یہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں
وہ ایک دوسرے کو حاجی اور مُلّا کہنے میں ہی اپنا تمام وقت گذار دیتے ہیں۔ ان کی یہ دوستی اور باہمی لین دین کا رشتہ "کیا
خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے" کی تفسیر نظر آتا ہے۔ ریڈنگ پروفیسرز اپنی آمدنی کے بعض مدّات
سے پٹرول کا خرچ برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ رشوت خور نہیں ہوتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رشوت خوری میں اب
محکمۂ تعلیمات بھی محکمۂ آبکاری سے پیچھے نہیں رہا۔ تبھی تو مرحومین اور وظیفہ یاب صاحبین کے تبادلے بھی کیے جاتے ہیں
پروفیسر بے ایمانی کر بھی لیں تو بس اتنا کہ کسی کی پُر زور سفارش پر دو چار نمبر بڑھا دیئے اور ذاتی تعصب کی بنا کسی کے
دو چار نمبر گھٹا دیئے یا پھر اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے کسی اُلو کے پٹھے کو ڈاکٹر کی ڈگری عطا کر کے اپنا ماتحت بنا لیا
تاکہ مخالفت کے تیر برسنے لگیں تو یہ نشان کا ساتھی سامنے رہے۔

یونیورسٹی بسا اوقات کسی معروف ہستی کو خواہ وہ رائٹر ہو کہ فلم ایکٹر ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری عطا کرتی
ہے۔ کیا عجب کہ کسی یونیورسٹی کو یہ نیک خیال آ جائے کہ دلیپ کمار یا امیتابھ بچن کو اعزازی ڈگری دی جائے صد
افسوس ہمیں اس کا علم نہیں کہ ایسی اعزازی ڈگریاں پروفیسر کی جائیداد کے لیے قابلِ قبول ہوتی ہیں یا نہیں۔ ہم نے
قطرے سے دریا بنتے تو نہیں دیکھا البتہ لکچرر سے پروفیسر بنتے ضرور دیکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قطرے سے بننے
والے دریا میں وہ روانی نہیں ہوتی جو پاٹ دار ندی میں ہوتی ہے۔ یہی فرق کالج کے پروفیسر اور یونیورسٹی کے پروفیسر
میں ہوتا ہے اس لیے یونیورسٹی کے پروفیسر انھیں منہ نہیں لگاتے۔ یونیورسٹی کے پروفیسر
پہلے دن (joining day) سے ہی سوٹ یا ٹائی اور چمکتے جوتوں کے ساتھ یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہیں
اور مرنے تک یہی ان کا معمول ہو جاتا ہے۔ جبکہ کالج کے پروفیسر بچوں کی پڑھائی، بیوی کی بیماری اور پیسے کے پریمیم
بھرتے بھرتے اس قدر نڈھال ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے عہدہ کا بھی خیال نہیں رہتا۔ بیوی پر رعب جمانے اور
بچوں کو خوش کرنے کبھی سوٹ کا وزن سنبھالے، گلے میں ٹائی کا پھندہ ڈال لیتے ہیں وہ پروفیسر کے بجائے سرکس کے [illegible] نظر آتے ہیں۔

سماج میں ڈاکٹر اور انجنیئر "A GRADE" ہیں تو لکچرر "B GRADE" وہ اس قدر شریف
اور غریب ہوتا ہے کہ طالب علم کے برسائے ہوئے پتھروں کو خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے۔ دھمکیاں سن کر بھی انجان
بنا رہتا ہے۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتا۔ یہ لکچرر ہے یا کھونٹے سے بندھی ہوئی ہندوستانی ناری۔ اب تو ہندوستانی
ناری بھی بھاگ گئی ہے۔ پر لکچرر کی قسمت نہیں جاگی۔ اگر وہ جاگ جائے تو ہندوستان پھر جہالت کے دہانے پر کھڑا ہو
جائے گا۔ ہر اہل و نا اہل کے ہاتھوں ڈگریاں تھمانے والا کون رہے گا۔

لیکچرر الفاظ کے معنی سمجھاتا ہے لیکن وہ الفاظ کے مکیں سے واقف نہیں ہوتا اس کی ترقی کی فائل منسٹر کے پاس اس لیے روک دی جاتی ہے کہ وہ پی اے کو اس کا معاوضہ دے نہیں پاتا۔ بالغرض محال منسٹر اس غریب آسامی پہ رحم کھاکر اس کی فائل پر "APPROVED" لکھ بھی دے تو اس کا سکریٹری اُسی قلم اور سیاہی سے صرف ایک لفظ "NOT" کا اضافہ کرکے اس کی ترقی کو روک دیتا ہے۔ آخر عاجز آکر وہ اُس کے ہاتھوں تگڑی رقم تھمادیتا ہے تو پھر ایک حرف ("E") کے اضافے سے "NOT" کو "NOTE" میں بدل دیتا ہے اور اس کی ترقی کی فائل "NOTE" "APPROVED" کے ریمارکس اور منسٹر کی دستخط کے ساتھ اُسے مل جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس بدمعاشی کا ذکر منسٹر سے نہیں کرسکتا کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اس میں منسٹر بھی برابر کا ساجھے دار ہوسکتا ہے۔

بیس بائیس سال لیکچرر رہنے پہ پروفیسر بن جانے سے اُس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ اس ترقی کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔ یہ وہ سیڑھی ہے جو معاشی اعتبار سے اُسے نیچے کی طرف لے جاتی ہے سماجی اعتبار سے آگے کی طرف۔ یہ بھی سچ ہے کہ پروفیسر کی جائیداد پر براجمان ہونے سے اس قدر اعزازی جلسے نہیں ہوتے جس قدر عمر کے اواخر میں پروفیسر بننے سے ہوتے ہیں۔ جو کمر دن قرضے کا بوجھ اُٹھاتے اٹھاتے جھک گئی تھی وہ پھولوں کے بار سے اور بھی جھک جاتی ہے۔ پروفیسر بن جانے سے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے لیکچرر کی قسمت چمک جاتی ہے۔ وہ جب تک لیکچرر تھا اُسے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا جب اُس کے نام کے آگے پروفیسر کا دم چھلا لگ جاتا ہے تو خود بخود قابل گردانا جاتا ہے۔ اُسے مختلف کمیٹیوں کا ممبر بنایا جاتا ہے۔ مختلف جلسوں کی صدارت کرنی پڑتی ہے۔ بوڑھا دماغ جو کچھ سوچ نہیں سکتا اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے ایک ہی تقریر ہر پلیٹ فارم پہ دہراتا رہتا ہے۔ جسے سن کر یونیورسٹی کے پروفیسر بل کھاکے رہ جاتے ہیں لیکن فائدہ بھی کیا۔ مرتے ہوؤں کو مار کے کیا مارا۔ ●●

نیک خواہشات کے ساتھ

پٹنی پولٹری فارم

ٹولی چوکی روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۸ آے پی

فون نمبر 31376

اَن پڑھ بھونگیری

○

آگئے مرید آخر مرشدوں کی چالوں میں
"خوف تھا اندھیروں کا لُٹ گئے اجالوں میں"

چل پڑی ہے خوشیوں کی پھر ہوا کلالوں میں
چھپکے پینے والے ہیں بعض داڑھی والوں میں

نہ خیالِ دوزخ ہے نہ خیالِ جنّت ہے
اب تو ہے سری دیوی شیخ کے خیالوں میں

آگئے ہیں چکّر میں سب کے سب گرانی کے
مرغ مچھلی والے بھی پڑ گئے ہیں دالوں میں

ہم نے خوں بہایا تھا کیا صلہ ملا ہم کو
بچ گئے تھے گوروں سے لٹ رہے ہیں کالوں میں

آکے ہم نمائش میں کھوئے کھوئے رہتے ہیں
گورے گورے گالوں میں کالے کالے بالوں میں

اس طرح شبِ جلوہ اپنی کٹ گئی اَن پڑھ
ہم رہے جوابوں میں وہ رہے سوالوں میں

○

کیا جانے کس سے کر کے ملاقات رک گئے
کیوں چلتے چلتے لوگ ترے ساتھ رک گئے

اپنی سٹی میں پانی کا جب سے ہوا ہے کال
شاید اسی وجہ سے فسادات رُک گئے

تھا نوجوان لڑکی سے جو تھا نکاح یہ
مرشد کے اس کے بعد کرامات رُک گئے

کچھ رہبرانِ قوم کے اگلے چناؤ میں
دلچسپ ان کے سارے بیانات رہ گئے

انجان تھے تو ہم پہ بڑے مہربان تھے
شادی شدہ ہوں کہتے ہی سوغات رُک گئے

دنگل بنی ہوئی تھیں مساجد اسی لیے
کچھ واعظوں کے اس جا خطابات رک گئے

اَن پڑھ کبھی سناؤ تو ایسی خوشی کی بات
شادی، بیاہ کے بھی خرافات رک گئے
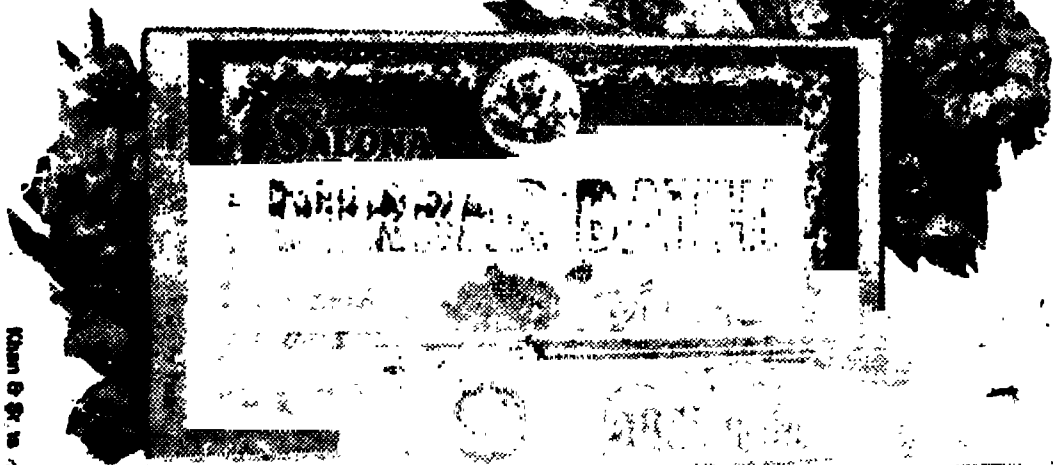
اشرف خوندمیری

دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

گھس گھس کو ایلو سے کا چچہ چپٹا کو چھوڑیں تالو سلا سلا کو ڈیچہ گھما کو چھوڑیں
اُپر سے ہلو ہلو ڈُوبہ پنا کو چھوڑیں نیچے سے ہلو ہلو گرنگا بہا کو چھوڑیں
بیٹھے بٹھائے سب کا کونپہ ڈبا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

بس ہونے تئیں لے کاماں اُن کا ہے کارنامہ "ایونا کرشنا، کرشنا" ایونا راما راما
باتاں بنا بنا کو ہاتاں نچا نچا کو ڈئیلاگ بی گھما کو کرنے لگیں ڈرامہ
ہولوں بیوا ایکٹنگ کا سکہ جما کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

چُنّا انوں بی ڈل رئیں امّا انوں بی ڈل رئیں گھمتا ہے تِ کے بھایاں بن بن کو دونوں جل رئیں
گھائیاں دکھا دکھا کو باڑاں انوں دلا رئیں باتاں میں ان کے آکو دونوں بی خوب پھسل رئیں
دونوں کو ٹیمپ مارئیں پھگّا بنا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

محفوظ ہے سو اُن کو کیکو سکتے تحفظ اپنے ریزرو کرلیئو اپنا اپنے تحفظ
جھوٹے تحفظوں کی جنت کیسے دکھاریں بیچ میں بن کو رکھ لیئو اپنے کئے تحفظ
کیوں دل میں نفرتوں کا سوتا چپا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنّا لگا کو چھوڑیں

گھٹی دِرم کی ساڑی بن لے کو ناچ ناچیں   ٹھنڈی پڑ گئیے سو دل کی بھڑکا کو آنچ ناچیں
میک اپ ذرا سا کرکو لوگوں کے دل کو لوٹیں   رکھ لے کو پاؤں کے نیچے مستی کی کانچ ناچیں

ناچے تو ناچے بن کی ہمناں نچا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنا لگا کو چھوڑیں

لاکپ میں بے دِکوں کے کِتے کی مُردے گڑگئیں   لاشا پڑا نے پڑ کو گل گل کو سڑ ملکو سڑ گئیں
بس ڈھیلی ڈوری دے کو چھوڑیں بُرے جنوں کو   اچھے جنوں کے پیچھے پولس کے شدّے پڑگئیں

شدّوں کو بیٹھے بیٹھے اچھّا کمبا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنا لگا کو چھوڑیں

پیاسی ہے ماںجرا بی ہوٹلی ندی بی سک رہیے   ہونٹوں پو پپڑی جم کو سینے میں سانس رک رہیے
پینے کو نئیں ہے پانی کھانے کو نئیں ہے کھانا   سب کے قریب غپ چپ آ آ کو موت چُک رہیے

مُنّے پو زندگی کا رکشا لگا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنا لگا کو چھوڑیں

وعدوں کا ان کے اب تو اتا رہا نہ پتا   کھودیں پہاڑ جب بی اس میں سے نکلا چوا
لوگوں کی آنتڑی سک رہیے ان کو تو کیا کی سُدر ہیے   سب کے سنگات کھیلیں بس اپنی ضد کا جوا

کٹّے پو آرزو کا پُتلا بٹھا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنا لگا کو چھوڑیں

مطلب نکل گیا تو سو کا رین کو بیٹھیں   تقدیر کے تخت پو مختار بن کو بیٹھیں
راتوں کو کرکو کیساں دن کو بدل کو بھیساں   سب کے سروں پو ہلوا و تار بن کو بیٹھیں

اَلّا میاں بھی ان کو گیا کیا بنا کو چھوڑیں
دو گرگٹوں کے موں کو چُنا لگا کو چھوڑیں

سراج زملی

○

مجرموں کا پاسباں، مظلوم کا قاتل بنا
سیکڑوں شیطاں مرے تو آج کا عادل بنا

پہلے جب دیکھا اسے تو وامٹنگ ہونے لگی
بعد میک اپ کے ہی مکھڑا دید کے قابل بنا

کچھ نہ کچھ محنت لگی، بہتر تلاش روزگار
نوکری اب مل گئی تو میں بڑا کاہل بنا

اے خدا! فرزند کو ہرگز نہ تو شاعر بنا
ہے مجھے منظور اسے کاہل بنا جاہل بنا

ہاتھ گردن پر کرٹے کا مسز نے رکھ دیا
پورے دس دن بعد ہی اٹھنے کے میں قابل بنا

بن بلائے آگئے جب سے ترے ماتا پتا
بینک بیلنس ایک ہفتے میں ہمارا نل ہوا

بس خدا ہے ساتھ میرے، آتا جاتا کچھ نہیں
مار کر دو چار پھونکیں عامل کامل بنا

کھیلنا ہے گر تجھے لاکھوں کروڑوں میں سراج
بہتریں تھیٹر بنا، ہوٹل بنا، سائل بنا

★

○

کتنے روتی صورت ہیں، وہ ہنسی سے ڈرتے ہیں
غم کے ہو گئے عادی اور خوشی سے ڈرتے ہیں

سیکولر حکومت کی بے حسی سے ڈرتے ہیں
"بھارتی" ہیں ہم، پھر بھی بھارتی سے ڈرتے ہیں

شیر اور ببر سے ہم مطلقاً نہیں ڈرتے
آدمی کے مارے ہیں آدمی سے ڈرتے ہیں

فیس کر سکیں گے ہم دشمنی بھی دانا کی
لیکن ایک ناداں کی دوستی سے ڈرتے ہیں

"منّہ مری" ہے اک بیوی، دوسری لڑاکو ہے
پیٹتے ہیں خیرن کو چاندنی سے ڈرتے ہیں

"شیر خاں" ہے نام ان کا زن مرید ٹائٹل ہے
شیر سے نہیں ڈرتے والف ہی سے ڈرتے ہیں

کب نہ جانے کھانے میں والف سنکھیا دے دے
اس لیے ہی ایل آئی سی پالیسی سے ڈرتے ہیں

اپٹ اے ٹائم دس غزلیں وہ سناتے ہیں اکثر
ہم سراج صاحب کی شاعری سے ڈرتے ہیں

★

بمباٹ حیدرآبادی

جنّتی شوہر

خواب میں آیا اپنی بیوی کے
ایک شب اس کا شوہرِ مرحوم
زندگی بھر رہا تھا جو مظلوم
اتنا خوش تھا کہ گنگناتا تھا
دیکھ کر اس کو مسکراتا تھا
پوچھا بیوی نے یہ تعجب سے
زندہ جب تک تھے تم ہمارے پاس
آخری سانس تک تھے کتنے اداس
گنگنانا نہ جانتے تھے تم
مسکرانا نہ جانتے تھے تم
اور آج اتنے خوش ہو سوچتی ہوں میں
تم یقیناً ہو آج جنّت میں
حور و غلماں کی رفاقت میں
بولا شوہر کہ جی نہیں بی بی
ہے کوئی بات میں اگر خوش ہوں
گو میں دوزخ میں ہوں مگر خوش ہوں

عظمت بھلاواں

غزل

جاہلوں سے میں ٹکرا یا گیا
گالیوں سے نوازا گیا
پردے جتنے بھی تھے ہٹ گئے
گرم موسم غضب ڈھا گیا
دل کو حاصل ہوا جب سکوں
پھر مکرّر وہ تڑپا گیا
پہلی مجلس میں کھا کر بھی وہ
آخری صف میں پھر آ گیا
زلف ان کی ابھی تک ہے خم
رنگ میرا ہوا کھا گیا
کی بھلاویں نے خوش فعلیاں
دوستوں کو مزا آ گیا

o

ننھے منّے بچّوں کی دُودھ ہی امانت ہے
کالی چائے برسوں سے پی رہی ہیں خالہ ماں

o

پارسا کے نکلے ہیں پیٹ میں سے پاؤں اب
اس سفید چادر پر رنگ کس نے ڈالا ہے

o

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

زندہ دلان حیدرآباد نے اپنی عمر کے ۲۵ سال مکمل کر لیے اس عرصے میں اس منفرد ادارے نے قومی اور بین قومی سطح پر طنز و مزاح اور خاص طور سے اردو مزاح کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کا تفصیلی جائزہ آئندہ کسی موقع پر لیا جائے گا۔ ویسے سلور جوبلی تقاریب میں ایک علیحدہ تنقیدی اجلاس اسی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے۔ ادارے کو ۱۹۶۶ء میں کل ہند حیثیت حاصل ہوئی جب کہ مجتبیٰ حسین کی معتمدی میں مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوئی تھی۔ سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر طنز و مزاح کے فروغ کے لیے مجتبیٰ حسین نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کے اعتراف کے لیے خصوصی اجلاس منعقد کیا جا رہا ہے نیز شگوفہ کا ضخیم مجتبیٰ حسین نمبر بھی شائع ہو رہا ہے جس کے ذریعے مجتبیٰ کے فکر و فن کا احاطہ کیا گیا ہے۔
ہم ممتاز شاعر صلاح الدین نیر کے ممنون ہیں جنھوں نے اس سووینیر کے کنوینر کی حیثیت سے قیمتی وقت دیا اور خوش نویس غالب کے تعاون سے زیر نظر شمارے کی اشاعت کا بعجلت ممکنہ اہتمام کیا۔

—— جدید ترین طرز کی سجاوٹ کے مطابق ——

- پردے
- بیڈ شیٹس
- توال
- بلینکٹ
- مچھردان
- دری

اور اس نوعیت کے دوسرے آپ کے ذوق کے عین مطابق کپڑوں کے لئے
تشریف لائیے!

یف ۔ ڈی ۔ خان اینڈ سنس

عابد روڈ ۔ حیدرآباد ۔ ۱ ۔ فون: 232566

پان کا لوازمہ
خوش ذائقہ

کشمیری قوام

خالص زعفران، مشک، عنبر وغیرہ سے تیار کردہ

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض (مشرق) ۔ پنجہ شاہ ۔
786-6-22 ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

سلور جوبلی تقریبات

— نیک خواہشات کے ساتھ —

مسرس سرسوتی ماربلس

پتہ :۔ کملاپوری ۔ مین روڈ ۔ سری نگر کالونی ، بلاک نمبر 230
حیدرآباد ۔ آندھراپردیش

فون :۔ 229406

— نیک خواہشات کے ساتھ —

مسرس اسری کنسٹرکشنس ، انجینیرس اینڈ کنٹریکٹرس

پتہ :۔ 2 & 1/3/38 - 7 - 1 ، رسالہ خورشید جاہی
زمستان پور ۔ مشیرآباد ۔ حیدرآباد

فون : 67447

ماہنامہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

حیدرآباد

جلد ۲۰
شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۷ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

منیجر: مسیح [illegible]
منیجر اعزازی [illegible] فیاض احمد فیضی
ٹائیٹل: [illegible]
کتابت: محمد عبدالرؤف

قیمت فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: پچاس روپے (-/50)
[illegible]

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۔ ۲

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱ [illegible] کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس 557716 رہائش 521064

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد

ڈسٹری بیوٹرس برائے:-

۱۔ موہن میکن بریویز ۲۔ اجنتا ڈیری آگرہ ۳۔ انڈین ایسٹ کمپنی لمیٹڈ ۴۔ ہارکو سری نگر
۵۔ کیکو کیننگ انڈسٹریز تریچور ۶۔ میڈونا کیننگ کمپنی ۷۔ جمپنگ وائٹ رولس ۸۔ پری سوشن اینڈ فنس
۹۔ ڈرگ ہندوستان فوڈ پراڈکٹس ۱۰۔ SIL سیل (جیسی ہامنڈ اینڈ کمپنی) وغیرہ

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذت کا انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

تیار کنندگان:-

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض۔ حیدرآباد

اُردو کے منفرد مزاح نگار
مُجتبیٰ حسین
کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ!
ماہنامہ **شگوفہ** حیدرآباد کا

ایک یادگار
اور
دستاویزی

مجتبیٰ حسین نمبر

مقتدر ادیبوں اور ناقدوں کے سیر حاصل مضامین!
خاکے، تصاویر، مجتبیٰ حسین کے نام ادیبوں کے خطوط!!
مجتبیٰ حسین کی بہترین تخلیقات کا انتخاب!!!

چند لکھنے والے:-

شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر مغنی تبسم
پروفیسر شمیم حنفی، عمیق حنفی، اختر حسن، ڈاکٹر مظفر حنفی، ساحر ہوشیارپوری، پروفیسر سوزوکی تاکیشی (جاپان)
دلیپ سنگھ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فکر تونسوی، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی، زبیر رضوی، [illegible]
براج ورما، ڈاکٹر شہریار، ظفر پیامی، رفعت سروش، پرویز یداللہ مہدی، رضا نقوی واہی، مسیح انجم
علی باقر، مخمور سعیدی، کمال پاشی وغیرہ

سرورق — مجتبیٰ حسین کا کیری کیچر (آرٹسٹ طالب خوندمیری)

شمارہ [illegible] کے لئے [illegible] قیمت ۴۰ روپیہ

○ ضخامت: ۴۶۴ صفحات ○ قیمت: ۵۵ روپے

ماہنامہ **شگوفہ** کا

اپنی زندگی کے بیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔

آئندہ شمارہ

سالنامہ ہوگا

- ہندو پاک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں کی نثری و شعری تخلیقات!
- کارٹون ○ لطائف، کیری کیچر
- سہ رنگی خوبصورت سرورق
- ضخامت: [112] صفحات
- قیمت: سات روپے

جنت آسام و نیلگری

کے باغات سے راست منگوائی ہوئی چائے

اسٹرانگ و خوش ذائقہ!

آپکے ذوق کے عین مطابق!!

آسام ٹی ٹریڈرس

نزد: یاقوت محل ٹاکیز، یاقوت پورہ حیدرآباد

فون: 525444

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

چورن (منظومات)

نیک خواہشات...
ایپکو فیبرکس
سنکرانتی کے موقع پر —
20 فی صد
گورنمنٹ ریبیٹ
سے استفادہ کیجئے
دلکش ڈیزائن، رسوم و رواج کے پاسدار نقش و نگار
اور خیال و خواب کی طرح حسین رنگوں میں
پارچہ پہ گل بوٹوں کی فن کاری
آپ کی خدمت میں ایپکو پیش کرتا ہے۔
پارچہ جات کی تمام قسمیں، ہر موقع اور محل کے لیے
سلک، پولیسٹر، ہینڈلوم کاٹن، چنتا ساڑی اور دھوتی۔
تشریف لایئے —— اور ہمارے مختلف النوع کپڑوں سے انتخاب کیجئے
جو آپ کے بجٹ کے عین مطابق ہے۔
ایپکو ملازمین سرکار کو کریڈٹ پہ خریدنے کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔
اپنے کپڑوں کی تمام ضروریات کے لیے آندھرا پردیش اور دوسرے صوبوں میں واقع ہمارے ۴۳۱ شوروموں پر تشریف لایئے۔
ایپکو۔ منفرد فیبرکس۔ جو آپ کو دوسروں سے جدا، سمارٹ فیشن ایبل اور آرام دہ ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔
دی آندھرا پردیش اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹڈ
3-5-770 ویورس بھون نارائن گوڑہ حیدرآباد 500 029

عابد معز
(سعودی عرب)

عقبی ادب

عنوان پڑھ کر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ عقبی ادب سے ہماری کیا مراد ہے۔ کالے دھندے کی طرح یہ کوئی ناجائز ادب ہے یا پھر وہ ادب جو محفلوں میں پڑھنے اور کتابوں کے لئے لکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ نہیں جناب ہمارے مضمون کے عنوان کا مطلب بالکل سیدھا سادھا ہے۔ ہماری مراد اس ادب سے ہے جو مختلف اشیاء کے پیچھے تحریر کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے پیچھے، مختلف سواریوں کے پیچھے، انسانوں کے پیچھے کپڑوں پر، غلافوں اور تھیلوں کے پیچھے درج شدہ تحریروں کو ان کا مستحقہ مقام دلانے کے لئے ہم نے ادب کی ایک نئی صنف عقبی ادب میں ان کا شمار کیا ہے۔ نقادوں کو اس طرح زمرہ بندی پر شاید اعتراض ہو۔ ہوا کرے ہر نئی تحریک کی یوں ہی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے ادب پر باقاعدہ مضامین لکھے جانے چاہئیں اور تحقیق ہونی چاہئے۔

ہر کتاب کے پیچھے کچھ نہ کچھ تحریر ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی کتاب کی جلد کا آخری صفحہ کورا کاغذ ہوتا ہے۔ کتابوں کی پشت کا ادب نثری ہوتا ہے۔ شعری مجموعوں کی پشت پر بھی نثر ہی لکھا ہوتا ہے لیکن انداز شاعرانہ ہوتا ہے۔ نوجوانی کی مسکراتی ہوئی تصویر کے نیچے بوڑھے مصنف کا پتہ لکھا دیا جاتا ہے۔ تاریخ پیدائش دو میں سے تین صحیح ہوتی ہے۔ پیدائش کا دن اور مہینہ صحیح رہتا ہے جبکہ سن غلط لکھا جاتا ہے۔ اردو ادب کا ہر تخلیق کار پیدائشی ادیب ہوتا ہے کم سنی سے ہی وہ ادب کی جانب راغب ہو جاتا ہے۔ اردو ادیب پیدائشی تخلیق کار ہونے کے علاوہ ادب کے خاص ماحول میں اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ باپ دادا یا کسی اور قریبی رشتہ دار کی ادبی گود میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ پہلی غزل، نظم، افسانہ یا مضمون اردو ادیب سن بلوغ کو پہنچنے سے [illegible] سال پہلے لکھ جاتا ہے جسے پڑھ کر اس وقت کا کوئی مستند اور بڑا ادیب اس لڑکے میں ادیب کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ اتفاقیہ طور پر جب کوئی شاعر یا ادیب ادبی ماحول میں جنم نہیں لیتا (جس میں ظاہر ہے اس کا کوئی قصور نہیں) تو اس کی پیدائش ایسے گھرانے میں ہوتی ہے جہاں اسے کتنا پڑتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوتا ہے کہ خاندانی ذمہ داریوں اور غربت کی وجہ سے موصوف باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن بچپن ہی سے اپنی قابلیت کا جھنڈا بلند کرتے رہے چونکہ اکثر تخلیق کار پیدائشی ہوتے ہیں اسی لئے انھیں کبھی استاد کی ضرورت نہیں پڑی لیکن پھر بھی کسی استاد سے شروع شروع میں اصلاح لے لیا کرتے ہیں اس کے بعد ادیب کا ادبی تعلق اور نسبت کے بارے میں لکھا ہوتا ہے جدیدیت کے خاندان سے تعلق ہے یا روایت کا علمبردار ہے ترقی پسند ہے یا غزل پسند. دو چار جملے مصنف کی تخلیقات کے تعلق سے یقینی طور پر بطور شارٹ نوٹ لکھے ہوتے ہیں۔ قابلیت اور ادبی حیثیت کے بعد ازدواجی زندگی کے بارے میں لکھا ہوتا ہے۔ ادبی حضرات کی شریک حیات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے ہم سفر کے ادب کو پروان چڑھانے کی حتی المقدور کوشش کرتی ہیں اور دوسری وہ جو ادب سے بیزار ہو کر شریک زندگی سے پیچھا چھڑا لیتی ہیں۔ دو ایک سطریں اولاد کے تعلق سے بھی لکھی ہوتی ہیں (اگر انھیں ادب کا شوق و ذوق ہو) ایسے بھی اکثر و بیشتر ادیب کے گھر ادب اور ادیب ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مصنف کی جملہ تصانیف کی فہرست بھی درج رہتی ہے۔ ہر کتاب کی تعداد اشاعت مشکل سے ہی ہندسوں میں ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت کا اظہار یوں ہوتا ہے گویا سابقہ ریکارڈ توڑ کر عام و خواص میں ہاتھوں ہاتھ لے لئے جاتے ہیں۔ ان مسودوں کی فہرست بھی پشت کے صفحات میں شامل ہوتی ہے جنھیں چھاپنے کے لئے ادیب کسی غیبی مدد کا انتظار کر رہا ہوتا ہے (غیبی امداد کا مطلب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے یعنی اردو اکیڈیمیاں)

عجمی ادب میں کتابوں کی پشت پر بیوڈاٹا کے علاوہ صاحب کتاب کے تعلق سے کسی نقاد یا دوسری صنف کے کسی ادیب کی رائے موجود رہتی ہے۔ کسی کے تعلق سے رائے دینا بھی ایک ادبی فن ہے۔ گول مول باتیں جو قاری تو کیا لکھنے والا یا جس کے تعلق سے لکھا جائے اس کی بھی سمجھ میں نہ آئیں۔ مخصوص لفظوں کا استعمال جدیدیت اور روایت شکنی کی تکرار اور دو ایک مشہور ادیبوں کے ذکر سے اس قسم کا عجمی ادب تخلیق ہوتا ہے جس کسی کتاب پر آپ رائے دیکھیں تو یقین کر لیں کہ یہ مصنف کی تیسری یا پانچویں کتاب ہے پہلی اور دوسری کتاب کے لئے مصنف کو صاحب رائے نہیں ملتے۔ صاحب الرائے تو ویسے بھی ناپید ہیں۔ اسی لئے اسے اپنے بیوڈاٹا پر اکتفا کرنا پڑتا ہے دو ایک کتابوں پر اپنے تعلق سے گول مول رائے چھاپ کر مصنف خود رائے دینے کے قابل ہو جاتا ہے اور اپنے تعلق سے دوسروں کی رائے سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی پانچویں یا چھٹی کتاب کے لئے عجمی ادب تخلیق کرتا ہے اور درج کرواتا ہے۔ یہ روایت شکنی پبلشر کو پسند نہیں آتی۔ یہ بات ہم بتلا دیں کہ اردو ادیب کا سفر اگر پانچ چھ کتابوں سے آگے جاری رہا تو اسے پبلشر دستیاب ہو گئے ہیں۔ اس مرتبہ پبلشر عجمی ادب تخلیق کرتا ہے جو کہ عام طور پر کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہوتا ہے یا پھر اصلی کتابوں کے تعلق سے نقادوں سے ہتھیائے ہوئے کے لئے اقتباس کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

عجمی ادب کی دوسری قسم وہ ادب ہے جو سواریوں کے پیچھے تخلیق کیا جاتا ہے۔ سواریوں کے پیچھے کا ادب زیادہ تر اشعار پر محیط ہوتا ہے جب کہ کتابوں کے پیچھے کا ادب نثر میں ہوتا ہے۔ آپ نے سواریوں کے پیچھے کئی مختلف اشعار پڑھے ہوں گے۔ بعض اوقات اشعار کے [illegible]

قلیے کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ ایک لحاظ سے ہم اسے جدید ادب کی ایک صنف میں شمار کر سکتے ہیں۔
مثال کے طور پر ہم چلتے ہیں۔ لوگ جلتے ہیں، یہ ہے لوکل لاری ابھی بھری ابھی خالی۔ ایک پھول دو مالی بُری
نظر والے تیرا منہ کالا۔ یا رب تیرا ہی ہے سہارا۔ یہ بات بھی نہیں کہ سواریوں کے پیچھے کے ادب میں صرف
تک بندی ہوتی ہے بعض دفعہ اچھے اشعار بھی درج ہوتے ہیں۔ کوئی اقبال کی خودی کو بلند کرتا ہے۔ تو
کوئی غالب کی نصیحت پر ایمان لے آتا ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے (یہ اور بات ہے کہ دیوان
غالب میں یہ شعر کہیں نہیں ملتا ممکن ہے عقبی ادب کے کسی مالک رام کی یہ تحقیق ہو۔) ایک مرتبہ ہم نے ایک آٹو رکشا
میں سفر کیا جس کے پیچھے یہ شعر لکھا تھا ؎

دن کو خورشید جگمگاتا ہے رات کو چاند مسکراتا ہے
رونق میرے آٹو کی کم نہیں ہوتی ایک آتا ہے ایک جاتا ہے

ہم نے آٹو ڈرائیور سے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ ڈرائیور نے ناراضگی کا اظہار کیا "کس کا ہے کیا مطلب۔
جناب یہ میرے خون پسینے کا شعر ہے" اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ خون پسینے کی شاعری بھی ہوتی ہے۔ ہم نے ڈرائیور
سے کہا "بھائی آپ شاعر ہیں" انھوں نے مختصراً "ہاں" کہہ کر عرض کیا ہے کے ساتھ لہک لہک کر اپنی غزل سنانی شروع
کر دی۔ آٹو رکشا کا سفر بے ہنگم سڑکیں، شاعر ڈرائیور اور خون پسینے کی شاعری ہمیں تو لگا جیسے گناہوں کی معافی
مانگنے اور کلمہ پڑھنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ہمیں ڈرا ہوا اور سہما ہوا پا کر ڈرائیور نے تڑسے یہ شعر داغ دیا ؎

گل و بلبل کی زندگی ہے چمن کی بہار پر
ڈرائیور اور مسافر کی زندگی ہے گاڑی کی رفتار پر

واہ واہ کے بجائے ہمیں آہ آہ کرنا اس لئے پڑا کہ ہمارا آٹو رکشا سامنے سگنل پر رکی لاری سے جا ٹکرایا
جس پر یہ شعر درج تھا ؎

اب دیکھنا ہے موت سے ملتا ہے ہم کو کب
تحفے میں زندگی نے کئی حادثے دیئے

ہم ایک لاری ڈرائیور سے واقف ہیں جو اپنے گھر سے باہر رہنے کے سبب عشقیہ اور ہجر آموز شاعری
کرتے ہیں کئی غزلیں اور نظمیں لکھ چکے ہیں۔ مجموعہ کلام چھپانے میں یقین نہیں رکھتے اور تازہ کلام موزوں
ہوتے ہی لاری کے پیچھے تحریر کروا کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کے کلام کو پڑھنے والے ہزاروں کی تعداد میں
دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ موصوف کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں خدا سے دعا ہے کہ ؎

عاشق کو زر دے یا زمین دے
پر معشوق کو پردہ نشین کر دے

یہ بھی غالباً عقبی ادب کی جدید شاعری ہے جس میں فن و زبان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ سواریوں
کے پیچھے کا ادب ہر صنف پر محیط ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ کلام بھی سواریوں کی زینت بنتا ہے۔ ایک سواری کے پیچھے

ہم نے یہ شعر لکھا دیکھا ہے ؎

میں نے سہارا دیا تجھے اپنا سمجھ کر
تیرے باپ نے تجھے پیٹا طبلہ سمجھ کر

ہم نے صاحب شعر ڈرائیور سے پوچھا "یہ آپ کا تجربہ ہے یا مشاہدہ" موصوف نے ہمیں سمجھایا ادب کی تخلیق کے لئے حساس ہونا ضروری ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں، سوچ سکتے ہیں۔ قریب اور دور کی کوڑی لا سکتے ہیں اور نام کما سکتے ہیں" موصوف کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ادب میں کئی قابل شخصیتیں چھپی بیٹھی ہیں جن کی طرف نقادوں نے توجہ نہیں کی۔ یوں بھی نقاد .... خیر اب جانے دیجئے۔

آج کل اردو شاعری میں سرقے کی دھوم ہے۔ ایک شعر بلکہ مصرعے کے دعویدار دو چار شعرا ہیں جس کی وجہ سے غزل گانے والوں کو مشکل پیش آ رہی ہے۔ محتاط گلوکار شاعر کا نام نامعلوم کہہ کر اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ شاعری میں سرقے کی روایت عقبی ادب سے شروع ہوتی ہے اس لئے کہ عقبی ادب میں اشعار کا سرقہ دھڑلّے سے کیا جاتا ہے۔ سواریوں کما دھرا اُدھر گھومنے سے اس کی تشہیر بھی ہوتی ہے۔ مشہور اشعار کو تھوڑا بہت اپنے مقصد کی خاطر تبدیل کر کے حق ملکیت جتایا جاتا ہے۔ ایک رکشہ کے پیچھے ہمیں ایک نئے نام سے یہ شعر نظر آیا ؎

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر گوشہ گندم کو جلا دو

ہم نے کہا۔ جناب یہ شعر تو علامہ اقبال کا ہے۔ موصوف سینہ تان کر بولے "ہو گا سر لیکن جب تک یہ شعر میرے رکشہ کے پیچھے ہے میرا اپنا ہے۔ یہ محنت کشوں کا شعر ہے" ہم سمجھ گئے کہ موصوف پر ترقی پسندی کا آسیب سوار ہے۔ ایک آٹو رکشا کے پیچھے یہ شعر لکھا ہوا تھا جس میں غالباً سواریوں کے بارے میں تنبیہ کی گئی تھی ؎

کسی کے مال کو دیکھ کر تو حیران نہ ہو
خدا تجھے بھی دے گا تو پریشان نہ ہو

عقبی ادب کی تیسری قسم کپڑوں کے پیچھے چھپے ہوئے فقروں کی ہے۔ یہ جدید ادب انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ ابھی اس کا چلن دوسری زبانوں میں رائج نہیں ہوا ہے۔ کسی حسینہ کے ٹی شرٹ کے پیچھے FOLLOW ME لکھا ہوتا ہے۔ پتلون کے پیچھے PRIVATE PROPERTY لکھا ہوتا ہے۔ نمبری قسم کے کپڑوں پر مختلف نمبر درج ہوتے ہیں جیسے ڈسکو ۸۰ء، ۱۸۸۰ء، صفر صفر سات، ۵۵۵، اسٹیل اپ، ہمارے خیال میں کپڑوں کے پیچھے اردو محاوروں کا استعمال خوب رہے گا۔ مثلاً محبت اندھی ہوتی ہے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، رائی کا پربت، وغیرہ وغیرہ جس طرح کھلاڑیوں کے نام لکھے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے ادیبوں کے نام بھی کپڑوں کے پیچھے لکھے جائیں تو شاید ادیبوں کو ان کا جائز مقام نہ ملنے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔ کپڑوں کے پیچھے لکھے ہوئے فقروں، نمبروں اور محاوروں کی اہمیت پر یقیناً بہتر سے بہتر مقالے لکھے جانے چاہئیں۔

نقادوں کو اگر اعتراض نہ ہو تو تکیہ غلافوں پر کڑھی ہوئی اسلی اور لکھی ہوئی تحریروں کو عقبی ادب میں

شامل کیا جاسکتا ہے اور یہ ادب نثر و نظم دونوں پر مشتمل ہے لیکن اردو زبان میں شاعری کے چلن سے زیادہ اسکا چلن ہے بعض اشعار یا فقرے ایسے ہوتے ہیں جنھیں پڑھ کر نیند آنے کے بجائے نیند اڑ جاتی ہے۔ "شب بخیر! میٹھی نیند جھولے خواب" "نیند ہماری خواب تمہارے" جیسے فقرے بھی درج ہوتے ہیں۔ ایک تکیہ پر ہمیں اس جملہ نے رات بھر سونے نہ دیا کہ "اپنے گناہوں کا حساب کرلیں" اسی قسم کے عقبی ادب میں تکیئے، تکیوں، اور بستوں پر موجود اشعار اور فقرے بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اس قسم کے ادب کے فروغ کے لئے خواتین کا اہم حصہ ہوا کرتا تھا گھنٹوں جیسی سوئی دھاگے سے اردو ادب تخلیق کیا کرتی تھیں لیکن آج کل شاذ و نادر ہی تکیہ غلافوں تکیئے تکیوں اور بستروں پر اردو کا ادب نظر آتا ہے۔

ہم نے اس مضمون میں عقبی ادب کی مختلف اہم قسموں کے بارے میں توجہ مبذول کروائی ہے تاکہ مستقبل میں نقاد اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔ ساتھ ہی ہم عقبی ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں سے عرض کریں گے کہ وہ اپنی انجمن یا بزم بنائیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ ؎

بڑھا کر ہاتھ جو لے لے یہاں مینا اسی کا ہے۔

●●

نامور مزاح نگار

نریندر لوتھر

کے مزاحیہ مضامین

الف تماشا

قیمت : ۱۶ روپے

ناشر :

زندہ دلان حیدرآباد

مرزا مرچ

اسی روز و شب میں اُلجھ کر......

—— نیوکلیائی ہتھیاروں کے استعمال پر امتناع روس اور امریکہ کا اصولی طور پر اتفاق (ایک خبر) ؎

صلح ہے اک مہلت سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ!

—— بوفرس اسکنڈل کا بلینہ مجرم ذہن چدھا امریکہ فرار (ایک خبر)

ارباب اقتدار کو ہمارے شاہ نصیر بہت پہلے ایسے مواقع کے لیے مشورہ دے گئے ہیں ؎

پکڑ کے سر کو نہ اپنے نصیر پیٹ کر
کہ سانپ بھاگ گیا اب لکیر پیٹا کر

—— روس افغانستان سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے تیار (ایک خبر)

روس نے ہنگری اور چیکوسلواکیہ سے بھی فوجوں کو واپس بلانے کا قبل ازیں ایسا ہی اعلان کیا تھا ؎

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

—— حکومت سے غلط سلط معاہدہ کرنے پر کالج ٹیچروں کے لیڈروں کی ٹیچروں کے ہاتھوں پٹائی۔ (ایک خبر)

گرہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

—— راز کے قوانین کے پیش نظر رشوت لینے والوں کے نام ظاہر کرنے سے بوفورس کمپنی کا انکار (ایک خبر)

معلوم نہیں ہمارا ملک کب اتنی ترقی کرے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی قوانین نافذ العمل اور ہمارا ملک بھی سویڈن جیسی جنت ارضی بن جائے ؎

رہ رو کے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوں میں
ہنستی ہے مجھ پہ دوری منزل جگہ جگہ

—— بلا تبصرہ

○ راجستھان کے ایک گاؤں میں روپ کنور اپنے شوہر کی چتا پر ستی کردی گئی۔

○ اب ہمیں ۲۱ ویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریاں شروع کردینی چاہئیں۔ (راجیو گاندھی)

○ گنڈی پیٹ، آشرم کے سوامیری کوئی جائیداد نہیں (این۔ ٹی۔ آر)

—— راجیو گاندھی کے حلقہ انتخاب امیٹھی میں سونیا گاندھی کے ہاتھوں کمبلوں کی تقسیم ؎

جو کام نکلتے نہ تھے شمشیر و سناں سے
وہ ہم نے نکالے نگہ نور جہاں سے

•
•

جہانگیر آتش (سیوان)

... گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

خط لکھنا ایک سماجی ضرورت ہے۔ کم و بیش ہر شخص خط لکھتا ہے۔ جو خود نہیں لکھ سکتا وہ دوسروں سے لکھواتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک خط لکھنا بھی ایک عبادت ہے۔ عبادت کے لیے بھلے ہی وہ اہتمام نہ کریں لیکن خط لکھنے کے لیے حد سے سوا اہتمام کرتے ہیں۔ شہر میں ملنے والا سب سے نفیس کاغذ، اعلیٰ قسم کی روشنائی اور امپورٹیڈ قلم کے ساتھ دلنشیں فضا اور مکمل تنہائی انھیں جب تک میسر نہیں ہوتی، وہ خط لکھنے کا تصور بھی نہیں کر پاتے ۔ عام طور سے خط کسی خاص مقصد کے تحت لکھا جاتا ہے۔ والدین نصیحت کے بطور اپنے بچوں کو خط لکھتے ہیں، بچے روپے کے لیے والدین کو خط لکھتے ہیں، بیوی کا خط فرمائشوں کی فہرست ہوتی ہے، عاشق کے خط میں درد دل رقم ہوتا ہے، اکثر شوہر دل کا خط کوک شاستر کا ایک نامکمل باب ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بقول شاعر ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ؛ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے تحت وقت گزاری کے لیے خط لکھتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے بجائے خود اپنے نام لکھے جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں خط لکھنا جن کی ہابی ہے۔ وہ جب تک خط نہیں لکھتے خود کو نامکمل محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محکوک کے حساب سے خط لکھ کر محکمۂ ڈاک کے کام میں اضافہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خط لکھنا ان کے نزدیک پیشۂ آبائی اور باعث فخر ہے۔

خط لکھنا ایک فن ہے جس طرح شاعری ایک فن ہے۔ لیکن شاعری کے برعکس خط لکھنا ایک آسان اور عام فہم فن ہے۔ آپ کہیں گے کہ "شاعری کون سا مشکل فن ہے اگر شاعری مشکل ہوتی تو ہر دوسرا اور دواں شاعر نہیں ہوتا۔ جنھیں اپنا نام لکھنا نہیں آتا وہ بھی شاعروں میں لہک لہک کر غزلیں سناتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔" آپ کی بات سر آنکھوں پر۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعری کرنا ایک الگ بات ہے اور شاعر ہونا ایک دوسری بات ہے۔ شاعری کرنے والوں میں کتنے شاعر ہوتے ہیں بس اچھے شعراء کی تعداد بہت دور ہے کیونکہ بقول علامہ اقبال ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ؛ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس طرح شاعری اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن شاعر بعض لوگ ہی ہوتے ہیں اسی طرح خط سبھی لکھتے ہیں لیکن سلیقے سے لکھنا بعض لوگوں کا ہی حق ہے۔ خط لکھنا کوئی خوبی نہیں اصل خوبی سلیقے سے لکھنا ہے۔ بقول شخصے گناہ بھی اگر سلیقے سے

کیا جائے تو اس پر نیکی کا گمان ہونے لگتا ہے مشہور ہے کہ دو دوستوں میں دشمنی ہوگئی (دوستوں میں ہی دشمنی ہوتی ہے) کیوں ہوئی؟ یہ مجھے معلوم نہیں لیکن بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ زر، زن اور زمین کے طفیل دوستی دشمنی میں بدلتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی دوستی کو دشمنی میں بدلنے میں بھی زر، زن اور زمین میں سے ہی کسی کا ہاتھ ہو۔ فریق اول ہر کام سلیقے سے کرنے کا عادی تھا۔ اس نے دوستی کی طرح دشمنی نبھانے میں بھی سلیقے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ماضی کے دوست اور حال کے دشمن پر اپنی دشمنی ظاہر کیے بغیر اسے باقاعدگی کے ساتھ اپنے روپے سے شراب پلانے لگا، جوئے خانے میں لے جانے لگا اور عیاشی کرانے لگا۔ جب فریق دوم شراب نوشی، جوا اور عیاشی کا عادی ہوگیا تو فریق اول نہایت ہی دانشمندی کے ساتھ "بی جمالو" کی طرح تماشائی بن گیا۔ ایک شرابی، جواری اور عیاش کا کیا حشر ہوتا ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ دیکھا آپ نے سلیقہ مندی کا کمال بقول شیکسپیر "تو تو میں میں" اور خون خرابہ کے کسی طرح دشمنی نبھ گئی سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سلامت رہی۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا کہ خط تو ہر شخص لکھتا ہے لیکن سلیقے سے لکھنا بعض لوگوں کو ہی آتا ہے۔ اگر خط سلیقے سے لکھا جائے تو پڑھنے والے کو نصف ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اس طرح خط لکھنے والا اپنے حصولِ مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے بصورت دیگر خط پیغامبر بن جاتا ہے یا محکمہ اطلاعات کا خبرنامہ، کسی سیاسی پارٹی کا منشور بن جاتا ہے یا مذہبی ادارے کا مبنی اشتہار۔ بعض ذاتی خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر اپوائنٹمنٹ لیٹر، ٹرانسفر لیٹر، اسٹے آرڈر، کلکٹر کے حکمنامہ یا کلاتھ اسٹور کے کیش میمو کا گمان ہوتا ہے جنھیں پڑھنے والے کے منہ کا مزہ ہی نہیں بدلتا بلکہ ذہنی اور بھی بہک جاتی ہے۔

سلیقے سے خط لکھنا تلوار کی دھار پہ ننگے قدم چلنے کے مترادف ہے۔ تلوار کی دھار پہ ننگے قدم چلنے سے پیر زخمی ہوتا ہے اور سلیقے سے خط نہ لکھنے سے شخصیت زخمی ہوتی ہے کیوں کہ خط مکتوب نگار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ خط، مکتوب نگار کے ظاہر کو ہی نہیں بلکہ باطن کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ اگر کسی کی حقیقی تصویر دیکھنا ہے تو اس کے خط کے آئینے میں دیکھ لیجیے۔ اس کی تمام ظاہری اور باطنی خوبیاں اور خامیاں آپ کو نظر آجائینگی۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمند لوگ خط لکھنے میں نہایت ہی احتیاط برتتے ہیں۔ آپ انھیں خط پر خط لکھے جائیے لیکن وہ کبھی جواب نہ دیں گے۔ اول تو وہ خط لکھنا ہی نہیں چاہتے اور اگر لکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ بغیر لکھے بات بنائے نہ بنے تو کلیجہ پہ پتھر رکھ کر ایک دو سطر لکھیں گے اس کے بعد ان کا قلم اڑیل ٹٹو بن جائے گا۔ اس طرح وہ اپنی شخصیت کی تصویر کو خط کے آئینے میں ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اکثر وہ خط نہ لکھنے کے جواز میں عدیم الفرصتی کا رونا رو کر اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ اس طرح بقول شاعر

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

خط لکھنے کے لیے مکمل یکسوئی اور ذہن کا تمام غیر ضروری خیالات اور احساسات سے عاری ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ مکمل یکسوئی اور غیر ضروری خیالات اور احساسات کو دماغ و دل سے نکالے بغیر خط لکھتے ہیں ان کا حال میری پڑوسن نسیمہ کا ہوتا ہے۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نسیمہ ایک دن اپنے شوہر کو خط لکھ رہی تھی کہ اچانک ایک کتا آنگن میں گھس آیا۔ اس کا دل و دماغ خط لکھنے سے زیادہ گھر کی رکھوالی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے کتے کو ڈانٹنا شروع کیا "حرامزادے نکمے، بدذات تم اپنی حرکت سے باز نہیں آؤگے" دل عیاری کا یہ جھٹکا تو

خط میں بھی رقم ہوگیا۔ شوہر نے جب یہ خط پڑھا تو سرتاپا آگ بگولہ ہوگیا۔ اس کا پارا اتنا زیادہ چڑھا کہ وہ دن کی دوری گھنٹوں میں طے کر کے گھر پہنچا اور نسیم کی وہ خبر لی کہ جس کے تصور سے وہ آج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ اس دن سے نسیم خط لکھنے کے نام سے اس طرح تائب ہوئی جس طرح کانگریسی لیڈر گاندھی جی کے اصول سے تائب ہوگئے ہیں۔
خط لکھنے کی ابتداء کب ہوئی اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی ابتداء کسی عاشق کے ہاتھوں ہوئی۔ اپنے جذبۂ عشق کو بالواسطہ محبوبہ تک پہنچانے کے لیے خط سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں۔ خط وہ زنجیر ہے جو عاشق و معشوق کو باندھنے کے کام آتی ہے۔ اس پل کو عبور کرنے کے بعد ہی وصال نصیب ہوتا ہے۔ لب پہ جو آ سکتا نہیں وہ بھی خط میں بے جھجک تحریر کیا جا سکتا ہے۔ بعض عاشق تو خط میں اپنا کلیجہ بھی نکال کر رکھ دیتے ہیں ؎

قاصد لے جائیو خط کو سنبھال کر ؎ کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

اور خط میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کے بعد یہ استدعا کرتے ہیں ؎

چلا جا تو اے خط شتاب و شتاب ؎ جو ہوگی محبت تو دے گا جواب

اگر محبوبہ کم فہم ہے تو عاشق کے خط کے فریب میں آکر جوابی خط لکھ بیٹھتی ہے۔ پھر تو خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس کا آخری باب رسوائی یا شادی پر ختم ہوتا۔ بقول اکبر۔

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے ؎ کثرت اولاد جلوہ اپنا دکھا جاتی ہے

یعنی خط لکھنے کے طفیل محبوبہ عاشق کی بے زر خرید لونڈی اور بچوں کی دایہ بن جاتی ہے۔ اور اگر عاشق کے بجائے کسی اور سے اس کی شادی ہوجاتی ہے تو اس کا لکھا ہوا خط عاشق کے لیے مداری کا وہ ڈنڈا بن جاتا ہے جس سے وہ اپنی ماضی کی محبوبہ کو زندگی بھر بندر ناچ نچاتا رہتا ہے۔

پہلے زمانے میں گھوڑے قاصد کے فرائض انجام دیتے تھے جس کی وجہ سے خط کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں ہفتہ، مہینہ اور کبھی کبھی تو سال تک لگ جاتا تھا۔ عاشقوں کے اندر انتظار کی تاب نہیں ہوتی اس لیے جلد بازی کے خیال سے گھوڑے کے بجائے وہ کبوتر سے کام لیتے تھے۔ یورپ اور فرانس کے حدود میں بسنے والی محبوبہ کیلئے پتنگ کو قاصد بنا دیا جاتا تھا۔ لیکن جدید دور نے پرانی روایات کو بدل دیا۔ جدید تہذیب اور مشین کی ایجاد نے محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کردیا۔ عام خطوط اور عاشقانہ خطوط کی ترسیل میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ اب تمام خطوط محکمہ ڈاک اپنے توسط سے بذریعہ ریل، موٹر یا ہوائی جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ پہلے خطوط اپنی منزل تک ہفتہ، مہینہ اور کبھی کبھی سال تک میں پہنچتے تھے لیکن محکمہ ڈاک کی عمدہ کارکردگی کے طفیل اب زیادہ تر خط اپنی منزل تک پہنچتے ہی نہیں۔ بعض دس، پندرہ اور بیس سال بعد اس حال میں پہنچتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر بوڑھی طوائف کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے بعض عاشقوں نے اپنے خطوط کے لیے نجی قاصد بحال کیے لیکن اس کا عبرتناک نتیجہ نکلا یعنی اکثر کی محبوبائیں بدل گئیں۔ قاصد نے "الف" کی محبوبہ کا خط "ب" کی محبوبہ کے، اور "ب" کی محبوبہ کا خط "الف" کی محبوبہ کے حوالے کردیا۔ مشینی یا محکمہ ڈاک نام کے قاصد نے تو اکثر عاشقوں کے عشق کو پنڈولم بنا دیا۔ مشہور ہے کہ ایک عاشق نے اپنی محبوبہ کو بذریعہ ڈاک محبت نامہ ارسال کیا اور بے تابی سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک سال، دو سال، تین سال ... آخر کوئی کب تک انتظار کرے۔ تھک ہار کر

اس نے کسی اور سے شادی کرلی۔ بیس برسوں کے بعد جب کہ وہ آٹھ بچوں کا باپ بن کر ریٹائر زندگی گزارنے کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اسے اپنی محبوبہ کا جواب ملا "کاش کہ آپ کا خط بہار کے موسم میں ملا ہوتا۔ اب تو خزاں آگئی ہے۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کی فکر میں ہوں اب یہ محبت نامہ میرے کس کام کا اس لیے بحفاظت واپس کر رہی ہوں تاکہ سند رہے۔"

اور اس واقعہ نے تو بذریعے ڈاک محبت نامہ بھیجنے والے عاشقوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک عاشق اپنی محبوبہ کو روزانہ خط لکھا کرتا۔ ڈاکیے کے روز روز کے دیدار نے اس کی محبوبہ کو ڈاکیے کا ہی دیوانہ بنا دیا نتیجتاً اس نے عاشق کو انگوٹھا دکھا کر ڈاکیے سے ہی شادی کرلی۔ اس واقعہ سے متعلق ایک دلچسپ پہلو کی علامہ گرگٹ نے اس طرح نشاندہی کی ہے کہ اب عاشق روز خط لکھیں یا ہفتہ میں ایک بار، ڈاکیے کو خط پہنچانے کی فرصت نہیں شاید اس لیے کہ تمام ڈاکیے خط پہنچا کر شادی شدہ ہو گئے ہیں۔ اب دوسری شادی سے کترا رہے ہیں اور نیا پے کمیشن بیٹھنے تک کتراتے رہیں گے۔

دانشوروں کے بقول خط لکھنے سے تعلق استوار ہوتے ہیں۔ محبت بڑھتی ہے۔ خط کا جواب نہ دینا اخلاقی جرم ہے لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ خط لکھنے سے روپیہ اور وقت دونوں برباد ہوتا ہے۔ تلخی پیدا ہوتی ہے۔ عاشق کا خط محبوبہ کے بجائے دوسرے کے پاس پہنچ جانے کے طفیل محبوبہ سربازار رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے نتیجتاً عاشق کو محبوبہ کے ساتھ شادی کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ محبوبہ، بیوی بن جائے عاشق کا کتنا بڑا المیہ ہے۔ ویسے بھی عقلمندی کا تقاضہ ہے کہ کسی کو اپنی تحریر نہ دی جائے کیونکہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپنے کا دعویٰ کرنے والے بھی اکثر خط کا غلط مفہوم نکال لیتے ہیں۔ قبرستان کے منتظم کے ایک دوست نے ایک لاوارث میت کے متعلق سفارشی خط لکھا۔ "جنازہ روکو مت جانے دو۔" قبرستان کے منتظم نے پڑھا "جنازہ روکو، مت جانے دو۔" یعنی اس وقت تک جنازہ رکا رہا جب تک منتظم کی مٹھی گرم نہ ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ خط لکھ کر نصف ملاقات کا شرف حاصل کرنے سے بہتر ہے کہ روبرو ملاقات کی جائے اس طرح وقت اور روپے کی بچت کے ساتھ غلط فہمی پیدا ہوتے اور تعلق ٹوٹنے کا بھی اندیشہ نہیں رہے گا۔

زندہ دلان حیدرآباد کی تازہ پیشکش

ممتاز انشائیہ نگار ڈاکٹر رشید موسوی کے بیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ!

کاغذی ہے پیرہن

خوبصورت دورنگی ڈسٹ کور * صفحات: (۱۴۴) قیمت: (۲۰) روپے

کُل ہند تحریری (مزاحیہ نثر و نظم) انعامی مقابلے کے نتائج

زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر مزاحیہ نثر و نظم کا ایک کُل ہند انعامی مقابلہ رکھا گیا تھا۔ عام مقابلے کے لیے مزاحیہ مضمون کا عنوان "روزگار کی تلاش" اور نظم کا عنوان "آج کا نیتا" تجویز کئے گئے تھے۔ جبکہ کالج کے طلباء و طالبات کے لیے صرف مزاحیہ نثر کا مقابلہ رکھا گیا تھا: ججس کے فیصلے کی روشنی میں حسب ذیل تخلیقات انعامات کی مستحق قرار دی گئیں۔ انعامات کی تقسیم زندہ دلانِ حیدرآباد کے تنقیدی اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی (دہلی) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انعامات کو احمدس کلاتھ شوروم سیتھر گوڑہ نے اسپانسر کیا تھا۔

ججس کے اسمائے گرامی:

- پروفیسر گیان چند جین • ڈاکٹر مجاور حسین • محترمہ جیلانی بانو • جناب مظفر مجاز • ڈاکٹر رشید موسوی
- ڈاکٹر بیگ احساس۔

انعام پانے والوں کے نام:-

مزاحیہ نثر:-

انعام اول (پانچ سو روپے) ـــــ سید عباس متقی، حیدرآباد

انعام دوم (تین سو روپے) ـــــ انصاری محمد رمضان، مالیگاؤں

ترغیبی انعام (دو سو روپے) ـــــ سید ممتاز مہدی، حیدرآباد

مزاحیہ نظم:-

انعام اول (پانچ سو روپے) ـــــ ڈاکٹر محبوب راہی، برسی ٹاکلی، اکولہ، مہاراشٹرا

انعام دوم (تین سو روپے) ـــــ پاگل عادل آبادی، آندھرا پردیش

ترغیبی انعام (دو سو روپے) ـــــ اعجاز غالبی، کھار، بمبئی۔

کالج کے طلباء و طالبات کے لیے:-

انعام اول (چار سو روپے) ـــــ امتہ الاسلام عالمہ صدیقی، آرٹس کالج، حیدرآباد۔

انعام دوم (تین سو روپے) ـــــ محمد عبدالقدیر، ممتاز کالج، حیدرآباد۔

انعام سوم (دو سو روپے) ـــــ معراج محمد خاں، اردو آرٹس کالج، حیدرآباد

وہاب قیصر
کنوینر انعامی مقابلہ جات

مسیح انجم، جنرل سکریٹری،
زندہ دلان حیدرآباد!

نوٹ:- زیرِ نظر شمارے میں دو انعام یافتہ مضامین اور ایک نظم شاملِ اشاعت ہے ـــــ

آج کا نیتا

مفلس تارونی
(ڈاکٹر محبوب راہی)

(انعام اوّل)

ذکر یہ اس شخص کا اس آدمی کا ہے کلام	آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں سدا جس کے عوام
اک نیا چکر چلاتا رہتا ہے جو صبح و شام	انگلیوں پر اپنی لوگوں کو نچاتا ہے ملام
آج جس کے ہاتھ میں ہے ملک و ملت کی لگام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

صرف موسم میں الیکشن کے نظر آتا ہے جو	مینڈکوں کی طرح اسٹیجوں پہ ٹرّاتا ہے جو
ووٹ لیکر جو کے کرسی پر پہنچ جاتا ہے جو	پھر انھیں کے سامنے آنے سے کتراتا ہے جو
جس کے جھانسے میں سدا آتے رہے ہیں خاص و عام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

لوگ رشوت کہتے ہیں اس کے لیے نذرانہ ہے	اس "مجاہد" کا ہر اک اقدام بیباکانہ ہے
قصرِ شاہی سے بھی برتر اس کا دولت خانہ ہے	قوم کے سیوک کا جو انداز ہے شاہانہ ہے
قوم کا آقا ہے جو اور قوم ہے جس کی غلام
رہنما اُردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

کار خانے اور ملیں اس کی ہوں اس کا روزگار	ایک عالی شان کوٹھی اس کے آگے ایک کار
اس کے ہاتھوں میں رہے پیہم عنانِ اقتدار	یعنی اسبابِ جہاں پر ہو اسی کا اختیار
جو ہوس کا ہے پجاری خواہشوں کا ہے غلام
رہنما اُردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

لوگ اُسے گمراہ و بدکردار کہتے ہیں، کہیں	زانی اور خاطی کہیں، بدکار کہتے ہیں، کہیں
مجرموں کا قافلہ سالار کہتے ہیں، کہیں	ملک بھر کے مفلس و نادار کہتے ہیں، کہیں
لکھتے ہیں اس پر قصیدے شاعرانِ خوش کلام
رہنما اُردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

جو تھے معمارانِ ہندوستاں وہ کوئی اور تھے	ہو گئے جو دیش پر قرباں وہ کوئی اور تھے
کر گئے جو مشکلیں آساں وہ کوئی اور تھے	آدمی وہ اور تھے انساں وہ کوئی اور تھے
اُن سبھی سے مختلف ہے اس کا اخلاقی نظام
رہنما اُردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

ہوں زبانوں کے وہ جھگڑے یا مذاہب کے فساد	مزرعِ فصلِ سیاست کے لیے ہے خوب کھاد
انتشار و برہمی کا کیوں کرے وہ انسداد	اس میں تو ہے اس کی دوکانِ سیاست کا مفاد
خود ہی کرتا ہے فسادوں کا جو ہر دم اہتمام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

قوم کے غم میں مگر مچھ کی طرح روتا ہے جو — ہر گھڑی وعدوں کا اک بارِ گراں ڈھوتا ہے جو
آم کھاتا ہے اگرچہ املیاں بوتا ہے جو — سینکڑوں کرتا ہے حاصل اک اگر کھوتا ہے جو
آم کھا کر گٹھلیوں کے بھی لیا کرتا ہے دام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

بیکسوں کے حال پر آتا نہیں اس کو ترس — ہو جو تکمیلِ غرض کرتا نہیں کچھ پیش و پس
سب تصرّف میں ہو اس کے سب پہ اسکی دسترس — ہے یہی اس کی تمنا ہے یہی اس کی ہوس
یعنی یہ ساری خدائی اس کی ہو جائے غلام
رہنما اُردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

پارٹی بازی مسلسل سازشیں، گٹھ بندیاں — رات دن رہتی ہیں جس کی بس یہی سرگرمیاں
جس کی ہر اک بات سے مطلب ٹپکتی ہے میاں — ہر گھڑی اپنے حریفوں کی اچھالے پگڑیاں
سانپ کی مانند ڈس کر لے جو اُن سے انتقام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

کیا کسی بھی تشنہ لب کی یہ بجھائیگا پیاس — یہ کہ ہے اک خوبصورت کانچ کا خالی گلاس
مطمئن اوپر سے ہے اندر سے لیکن بدحواس — من ہے میلا جسم پر کھدر کا پاکیزہ لباس
زہر باطن میں، بظاہر خوش نوا، شیریں کلام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

بیٹیاں، بیٹے، بھتیجے، بھانجے، داماد، سب — پل پڑیں یکلخت بن کر قوم پر قہر و غضب
بانٹ لیں آپس میں جتنے بھی ہیں اسباب طرب — یہ سنہرا وقت ہے۔ پھر بار بار آئے گا کب
دے رہا ہے اہلِ خانہ کو جو اپنے اذنِ عام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

آج ہے اس پارٹی میں کل ہے کوئی دوسری — ہے ابھی مشرق کی جانب اور مغرب میں ابھی
کج ادائی خاص اک پہچان ہے اس کی یہی — رنگ گرگٹ کی طرح پل پل بدلتا ہے کئی
فیصلہ کوئی بھی ہو اس کا نہیں اس کو دوام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

موتیوں کے مول اس کے بول اس کی بات ہے — دھوپ کو برسات وہ کہدے تو پھر برسات ہے
دن کو گر وہ رات کہدے تو یقیناً رات ہے — میں تو اک مفلس ہوں آخر میری کیا اوقات ہے
اچھے اچھے کرتے ہیں اس کا ادب اور احترام
رہنما اردو میں ہے ہندی میں نیتا جس کا نام

سید عباس متقی
حیدرآباد

[انعام اول پانے والی تحریر]

تلاشِ روزگار

جب ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو شریفوں کی طرح مغموم اور رحمتوں کی طرح محروم دکھائی دینے لگتے ہیں کہ اب تک کی زندگی بشمول لڑکپن "تلاش روزگار" میں گزری ہے۔ شاید بچپن اور شیرخوارگی کے دور میں بھی ہم لاشعوری طور پر یہ کارِ خیر انجام دیتے رہے ہوں لیکن اس "تلاشِ بسیار" کے باوجود ہنوز ہم بے روزگار سے ہیں یعنی جو ملازمت کہ ہم بخوشی انجام دے سکتے تھے نہ ملی، جو ملازمتیں کہ یکے بعد دیگرے ملتی اور چھٹتی رہیں اسے ہم بخوشی دے سکتے نہ تھے البتہ بخوشی آج تک مسلسل مستعفی ہوتے آرہے ہیں۔

ہم آج تک نہ سمجھ سکے کہ "باروزگار" خوش بخت ہوتا ہے یا "بے روزگار"۔ البتہ جب تک ہم بے روزگار رہے خود کو یقینی طور پر خوش بخت ہی متصور کرتے رہے، کیونکہ اپنے آپ کو اچھا سمجھنا پیدائشی حق ہے۔ اگر یہ حق بھی ہم سے چھین لیا گیا تو ہم محض کپڑوں کا ایک جوڑا ہو کر رہ جائیں۔ وہ بھی کیا دن تھے بے روزگاری بامِ عروج پر تھی، نہ ہم گھڑی رکھتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ وقت پابہ زنجیر تھا نہ ہم، دن آوارہ گردی میں گزر جاتا تو رات شب بیداری میں۔ تفریحاً اخبار دیکھ لیتے شاید کسی کو ہماری ضرورت لاحق ہو۔ گھر، بزرگوں کی گالیاں ہٹا دی جائیں تو جنت کا نمونہ تھا۔ بزرگ؟ چشمہ و دہن کے علاوہ پیکر مہر و کرم تھے۔ کھیلتے کودتے گھر میں داخل ہوتے تھوڑی بہت گالیاں سُن لیتے اور بہت کچھ کھا پی کر چلتے بنتے ہم تو کہتے ہیں کہ اگر آدمی گالیاں کھانے سے گریز نہ کرے تو زندگی بھر آرام سے گھر بیٹھے بغیر کمائے کھا پی سکتا ہے اور پھر یہ بات طے شدہ ہے کہ دھیرے دھیرے مزاج اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں گالیاں پیش از طعام چورن کا قائم مقام بن جاتی ہیں۔ بھلا ہو غیر یقینی، غیر موزوں روزگار کا کہ ہمیں اس "مقام عالیہ" تک پہنچنے نہ دیا ؎

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہم بچپن سے شاعر ہیں۔ غم جاناں کو فرضِ اولین قرار دیتے ہیں۔ تاہم شاعرانہ لوازمات کے تحت غم روزگار کو بھی اگر فرض نہیں تو واجب ضرور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ گاہے گاہے اس کارِ خیر سے بھی بہرہ آزمائی رہی اور عملی طور پر ہم نے ہر ہندوستانی نوجوان کی طرح ہر محکمہ میں "تیاہ آزمائی" کی اور نتیجتہً ہر تعلیم یافتہ نوجوان کی طرح نامراد رہے۔ اپنی مرضی کے خلاف ہم نے بعض محکموں کی طرف خاص توجہ کی جن میں محکمہ پولیس اور محکمہ بلدیہ قابلِ ذکر ہیں۔ پولیس میں بھرتی ہونا اک زمانے میں میٹرک ہونے سے زیادہ آسان تھا۔ چنانچہ لوگ جب میٹرک نہ ہوسکتے تو اس کا نعم البدل سمجھ کر پولیس میں بھرتی

ہو جاتے تھے۔ لیکن جب ہم نے اشتہار دیکھ کر ہیڈ کوارٹر پہنچے تو وہاں محض مردوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ اور ہم قطار کے آخر میں بغل میں اسناد دبائے "منتظر پیرد" تھے۔ کیونکہ ناپ تول پردے کے اندر ہو رہا تھا۔ پولیس کا محکمہ اور ناپ تول۔ ڈر بھی رہے تھے کہ پتہ نہیں کیا کیا ناپا اور کیا کیا تولا جائے گا۔ دم کے علاوہ ہر چیز اپنے مقام پر تھی تاہم سر بے نیاز کے بارے میں آج تک مشکوک ہیں۔ ہم شاعر آدمی ہیں سہولت پسند واقع ہوئے ہیں۔ جلد بازی اور پھرتی کو شیطانیت سمجھتے ہیں اس لیے طمانیت ہماری زندگی کا طرۂ امتیاز ہے مگر لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ ہماری خاص اداؤں کو کاہلی اور سستی سے تعبیر کرتے ہیں جو ہم پر ظلم کے مترادف ہے جمعدار نے ہمیں طلب کیا تو ہم خراماں خراماں حاضر ہوئے جیسے مشاعرہ میں غزل سنانے جا رہے ہوں۔ جمعدار ہمیں دیکھتے ہی قہقہہ لگایا گویا ہم پولیس میں نہیں پاگلوں میں بھرتی ہونے آئے ہیں۔ ٹیپ لے کر سینہ ناپا گیا۔ ہمارا سینہ طور سینا تو تھا نہیں کہ نگاہ میں بھرتا۔ کشادگی کی دعوت دی۔ جس قدر دم خم تھا ہم نے زور لگایا۔ ڈھیر ساری سانس لے لی۔ شائد ہمارے پھیپھڑوں میں آکسیجن کے علاوہ ہائیڈروجن اور نائٹروجن بھی خاصی مقدار میں پہنچ جاتی اگر ان گیسوں کا داخلہ ممنوع نہ ہوتا۔ ممکن ہے ہمیں صرف گال پھلانا آتا ہو، کما حقہٗ سینہ نہ پھلا سکے۔ گول مٹول جمعدار نے کچھ ایسی مایوسی کے آثار ظاہر کئے جیسے طبلہ نواز ترشے ہوئے طبلہ سے مایوس ہو جاتا ہے۔ پولیس کا محکمہ بھی عجیب ہوتا ہے دل دیکھنے کی بجائے سینہ دیکھتے ہیں۔ سینا پرونا تو عورتوں کا دیکھا جاتا ہے۔ اب قد کی باری تھی ہم نہ محبوب کی طرح سرو قد واقع ہوئے ہیں اور نہ نقشہ پر وازوں کی طرح پست قد۔ واجبی واجبی سے قد کے مالک ہیں "لمبوں" میں عقلمند "گِڈوں" میں شریف محض اپنے قد کی بناء پر سمجھے جاتے ہیں۔ بہرحال سینہ و قد کی عدم موزونیت کی بناء پر پولیس میں بھرتی ہونے سے رہ گئے۔

پولیس میں بھرتی ہونے سے کیا رہ گئے کہ لوگوں نے طعنہ دینا شروع کر دیا کہ جو شخص پولیس میں بھرتی نہ ہو سکا وہ بھرتی کے شعر کے مماثل ہے۔ محکمہ پولیس سے مایوس لوٹ کر محکمہ بلدیہ میں درخواست دے دی۔ کتے پکڑنے پر مامور کر دیئے گئے اور ہم اپنا مفوضہ کام بخوشی انجام دینے لگے کہ مکھیاں مارنے سے کتے پکڑنا بہرحال اچھا ہے۔ ہم کتے پکڑنے کے لیے ٹولی بنا کر نکلتے گویا وہ آوارہ کتے نہ ہوں بلکہ منظم "نکسلائٹ" ہوں۔ شاید کتے بلدیہ کے جوانوں کی بو سے بھاگتے ہیں۔ ہم ابھی کچہری سے نہیں نکلتے کہ محلہ کتوں سے پاک ہو جاتا۔ البتہ پاگل کتے گدھوں کی طرح لاپرواہ گھومتے نظر آتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کوئی لاپرواہی سے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا ہے وہ پاگل کتے کی مانند ہے۔ ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ کوئی نادان کہیں ہماری عزت و ناموس سے گستاخی نہ کر بیٹھے۔ پاگل کتے بھی عجیب مخلوق ہوتے ہیں جب تک کہ پکڑ نہ لیئے جائیں بھاگتے ہیں نہ چیختے ہیں۔ چنانچہ از صبح تا شام پاگل کتوں کو پکڑنا اور کچہری لے آنا ہمارا کام تھا۔ چند دن میں صحبت کا اثر شروع ہوا صحبت کنا ترا کنا کند۔ راتوں میں نیند نہیں آنے لگی۔ سرا دیئے کئے رات دیر گئے کچھ بھنبھنانے لگے۔ بعض وقت آواز گلے میں رندھ جاتی، جسم مرتعش ہو جاتا خاص موقعوں پر ایک ٹانگ غیر اختیاری طور پر اٹھ جاتی۔ غصہ بھی جلد جلد آنے لگا۔ ناک کے نتھنے آنکھوں کے حلقوں کو چھونے لگے۔ بیوی بچے حیران تھے کہ روزگار کی تلاش نے ہمیں کیا سے کیا بنا دیا۔ کتا کہنے سے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ہم کاٹ نہ لیں۔ ایک دن ہم کسی شاندار کتے کے پیچھے پڑ گئے۔ دیر تک رسی کا حلقہ لیے پیچھا کیا۔ کتا ہاتھ نہ آتا تھا اور ہم گدھے کی طرح ہانپتے تھے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور اسے پکڑ کر ہی دم لیا۔ لیکن کتا کم بخت کسی منسٹر کا نکلا اور ہمیں ایک عزت مآب منسٹر کے کتے کو آوارہ کتا سمجھ کر گرفتار کرنے کی پاداش میں بلدیہ سے خارج کر دیا گیا اور ہم خوش تھے کہ محض بلدیہ سے نکالا گیا ہے بلدہ سے نہیں۔

ایک مقولہ ہے کہ جب آدمی کسی کام کا نہیں رہتا تو پڑھانے لگتا ہے، مگر ہم اس مقولے پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتے

کہ ہم کام کے آدمی ہوتے ہوئے تلاش روزگار میں مدرسوں کی خاک چھاننے لگے۔ ہمارے شہر میں ہر آدمی کام کا ہے کہ بے شمار مدارس میں بے شمار مدرسین کی جائیدادیں محتاج تقرر واقع ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ جائیدادیں اردو سے متعلق ہیں اس لیے پُر نہیں ہوتیں۔ سرکاری مدرسی تو محض سند یافتہ مدرس ہی کو مل سکتی تھی، ہم رہے نرے تعلیم یافتہ ایک خانگی مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ کام ہمارا اردو پڑھانا تھا مگر کہہ دیا گیا کہ چپراسی کی عدم موجودگی کی صورت میں ہمیں چپراسی کے تمام کام انجام دینے پڑیں گے۔ اب یہ ہماری قسمت تھی کہ جس دن ہمارا تقرر ہوا اُس دن سے چپراسی غائب۔ مدرس آمد چپراسی برخواست۔ پڑھاتے پڑھاتے جھاڑو دیتے۔ لکھاتے لکھاتے پانی بھرتے سمجھاتے سمجھاتے گھنٹی بجاتے۔ شاگرد اردو پڑھانے والے مدرس کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہے کہ عزت اور تنخواہ کا حال کچھ واجبی واجبی سا ہوتا ہے خود کو چپراسی کم معلم کہنے لگے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والا معاملہ تھا۔ چند ہی دنوں میں پریشان ہو گئے اور زیادہ پریشانی اس لیے تھی کہ پریشانی کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم وہ نہیں جو درحقیقت ہیں اور ہم دراصل وہ ہیں جو، حقیقتاً نہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کی تفسیر تھے۔ بچوں کی کاپی پر GOOD لکھ کر پیٹنے لگے اور VERY BAD لکھ کر شاباشی دینے لگے ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ حرکتیں پاگل خانہ پہنچانے والی ہیں مگر کم تنخواہ پانے والا مدرس اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چند ہی دنوں میں قویٰ جواب دینے لگے۔ جوں جوں مدرسہ ترقی کرتا ہے مدرسین زوال پذیر ہوتے ہیں۔ صدر مدرس تو مدرسہ سنبھالتے اور ہم کھو پڑی۔ جب مدرسہ تین منزلہ عمارت کی صورت اختیار کر گیا تو ہم نے قرض کی درخواست دی تو موصوف نے یک قلم برخواست کر دیا۔ ان کے خیال میں ہم ابھی عقل مند تھے اور ہم ان کی بے وقوفی کو کوستے ہوئے میٹرک فیل طالب علم کی طرح مدرسے سے نکل گئے۔ چھوٹا تھا خراب ہونے سے بڑی گرمی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا تالاب ناموزوں، نامناسب، ناواجبی سے لوگوں کا ٹھکانہ مدرسہ ہے اور ہم مدرسہ سے نکالے گئے تھے۔ رہ رہ کر غالب کا یہ شعر کچھ اس انداز سے سینہ کوبی کے ساتھ پڑھنے لگے ۔ع

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن ۔ بڑے ناکام ہو کر مدرسے سے تیرے ہم نکلے۔

حضرت آدم جنت سے ضرور نکلے ہیں لیکن یہ ضرور پھر جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ ہم جس مدرسہ سے نکلے تھے وہاں ہمارا جانا ممکن نہیں کیونکہ خانگی مدارس کو ہم جنت نہیں شکم مادر سمجھتے ہیں۔

ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ بہتر روزگار اور دوسری مرتبہ بہتر بیوی نہیں مل سکتی۔ استثنائی صورتیں الگ ہیں کہ بعض احمقوں کو یہ دونوں چیزیں بار بار ملتی ہیں ہمیں غصہ اس بات پر نہیں آتا کہ یہ دونوں چیزیں انھیں بار بار ملتی ہیں لیکن اس بات پر آتا ہے کہ بہتر ملتی ہیں۔ اگر کوئی اپنی کم نصیبی کے تحت نصیب کا قائل نہ ہو تو یہاں آکر قائل ہو جاتا ہے۔ سعدی نے یہ شعر

اگر بہر سر موئیت ہنر دو صد باشد ۔ ہنر بکار نیاید چو بخت بد باشد

شاید ہماری بوقلموں شخصیت کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ ہم بیک وقت شاعر، ادیب، مفتی، مزاح نگار، مدرس، واعظ، خطیب، ایم اے نہ جانے کیا کیا ہیں لیکن تلاش روزگار میں کٹی پتنگ کی طرح تھاپ پر تھاپ کھاتے یہ آفس سے وہ آفس، یہ مدرسہ سے وہ مدرسہ اس کالج سے اس کالج تک خارش زدہ کتیا کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں اور انٹرویو دیتے چلے جاتے ہیں۔ ـــــ بہر حال ہم عمر کی ان حدوں پر قدم رکھ چکے ہیں جہاں سرکاری مدرسوں میں ملازمت کی کوئی گنجائش نہیں البتہ لکچرر شپ، ریڈر شپ اور پروفیسر شپ کے بہت سارے امکانات ہنوز باقی ہیں اور ہمارا ایقان ہے کہ اگر ہم ـــــ۔

سچے مسلمان اور پکے ہندوستانی کی طرح تلاش روزگار میں کوشش بسیار سے لگے رہیں تو عالم پیری ہی میں سہی لیکن بہتر روزگار سے ضرور ہم کنار ہوں گے اور مرزا غالب کے شعر کو پوپلے منہ سے کچھ یوں دہرائیں گے۔

گو پاؤں میں جنبش نہیں، منہ میں تو زباں ہے
رہنے دو در جامعہ ابھی دارے آگے

10

"چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر" (میر)

اور

چشم کی بہتری بسا اوقات چشمے یعنی "عینک" کی مرہون ہوتی ہے۔
ہمہ اقسام کی عینکوں اور عمدہ و دیدہ زیب فریمس کی خریدی و درستگی کے لیے
ایک بار
ضرور تشریف لائیے۔ اس کے بعد تو خود آپ اپنے احباب کو ہماری دوکان کا پتہ بتائیں گے۔
یاد رکھیئے!
حیدرآباد و سکندرآباد کی ایک نہایت ہی قابلِ اعتماد دوکان۔

آپٹیکس کارپوریشن

گدوال ہینڈلومس بلڈنگ عابد روڈ ـــ حیدرآباد

اور

نیو آپٹیکس کارپوریشن

الہ دین کامپلکس ـ نزد کلاک ٹاور، سروجنی دیوی روڈ سکندرآباد

خواہ مخواہ (بمبئی)

قطعات

○

دن ہیں رنگین تو ارمان بھری راتیں ہیں
کیوں نہ ہوں روز حسینوں سے ملاقاتیں ہیں
خواہ مخواہ نام تو کر جاؤ گے مردانے میں
کیا زنانے میں پہنچنے کی یہی باتیں ہیں

○

ہم وہ ہیں جو لفظوں کا گلدستہ بناتے ہیں
روتے ہوئے چہروں کو پل بھر میں ہنساتے ہیں
گر طنز کے نشتر سے کچھ زخم اُبھر آئیں
ہم ان پہ ظرافت کا مرہم بھی لگاتے ہیں

○

جنہیں ہم مہرباں سمجھے تھے وہ تیغِ ستم نکلے
جھکایا جن کے آگے سر وہ پتھر کے صنم نکلے
جھگڑ کر خواہ مخواہ بیگم جو بولیں گھر سے جانے کو
بہت بے آبرو ہو کر خود اپنے گھر سے ہم نکلے

رُباعی

جس روز سے سسرال میں آباد رہا
ہر وقت غم و فکر سے آزاد رہا
اُلٹا نہ کوئی خواہ مخواہ تختہ میرا
داماد کو اُلٹا بھی تو داماد رہا

ملتے جلتے، آتے جاتے

نظر برنی

آپ اگر کوشش فرماتے، ملتے جلتے، آتے جاتے
خاموشی سے نوٹ دکھاتے، ملتے جلتے، آتے جاتے
گر خواہش ہے پر وموشن کی، چوری چوری باس سے ملتے
دفتر کا دستور نبھاتے، ملتے جلتے، آتے جاتے
راہ و رسم سے بات بگڑتا، لنچ و ڈنر سے آپکا ہوتا
خود جاتے یا اسے بُلاتے، ملتے جلتے، آتے جاتے
سامنے اسکے بن کے رہتے، بھیگی بلّی اور چند بھی
لیکن پیچھے رعب دکھاتے، ملتے جلتے، آتے جاتے
آپ سے گر مسٹیک ہوئی تھی اسکی ڈانٹ کو سُنتے رہتے
اسکے آگے لب نہ ہلاتے، ملتے جلتے، آتے جاتے

آپ میں گر ہمت کی کمی تھی پھر تو سہارا غیر کا لیتے
اس کے چمچوں کو ہی پٹاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
رشوت سے یارانہ کرتے، صاحب تم سے خوش ہوجاتا
خود کھاتے اور اسے کھلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
E.B کو کھلوانا ہی تھا کوٹھی جاتے دکھڑا روتے
چُپکے سے ڈالی پہونچاتے، ملتے جلتے آتے جاتے

افسر کو افسر ہی سمجھو اپنا نظر تو وشواس یہی ہے
شان میں اس کی شعر سناتے، ملتے جلتے آتے جاتے

○

انصاری محمد رمضان (مالیگاؤں) [انعام دوم پانے والی تحریر]

روزگار کی تلاش

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

مرزا غالب غم عشق میں مبتلا ہیں اور اپنے دل کو یوں بہلا رہے ہیں اور تسکین دے رہے ہیں کہ بھیا چپ چاپ عشق کا فرضی غم سہے جاؤ ورنہ یہ نہ ہوگا تو غم روزگار کے حقیقی اور بھیانک غم سے سابقہ پڑے گا۔ وہ اپنے آپ کو یوں بہلا رہے ہیں جیسے ہم چھوٹے بچوں کو کسی خوفناک شئے سے ڈرا کر راضی کرتے ہیں کہ مان جاؤ ورنہ بھوت آئے گا، شیر آجائے گا۔ بھکاؤ آئے گا وغیرہ۔ بچے بے چارے ڈر کر ہماری بات مان لیتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہم بچوں کو ایک فرضی بلا سے ڈراتے ہیں اور مرزا حقیقی بلا سے خوف زدہ ہیں۔ عشق کا غم فرضی ویسے ہی ہے جیسے عشق میں مرجانا۔ عاشق صبح سے شام تک کئی بار مرتا اور جیتا ہے۔ عشق میں مرنا جینا کیا۔ سو سو بار جیئے مرکر۔ اور عاشق تو روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں۔ تو جناب جیسا مرگ عشق ہوتا ہے ناویسا ہی غم عشق بھی ہوتا ہے یعنی فرضی۔ حقیقی غم غم روزگار ہی ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

محبت کے علاوہ اور کون سا غم ہو سکتا ہے بھلا۔ ظاہر ہے کہ یہ روزگار کا غم ہی ہے۔

یوں تو اس جہانِ فانی اور عالم آب و گل میں اپنے ورودِ مسعود سے لیکر عالم جاودانی کی جانب کوچ کر جانے تک، یعنی دنیا میں پہلی مرتبہ آنکھ کھولنے سے لیکر آخری مرتبہ آنکھ بند کرنے تک یعنی کہ پیدا ہونے سے مرجانے تک۔ آدمی ہمیشہ ہی کسی نہ کسی شئے کا متلاشی رہتا ہے۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل طے ہے کہ تلاش ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے جس کی قلت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں روزگار کی تلاش کے ساتھ ہی ساتھ آدمی تاعمر خلوص و وفا، ہمدردی، غمگساری، عزت و آبرو، کھرے دوست اور سچے دشمن، بغیر ملاوٹ کی اشیائے خورد و نوش اور باتیں، اصلی چہرے، غیر نمائشی اخلاق، بے غرض رہنما، سماجی ورکر، سچی خوشی، ذمہ داریوں سے فرار کی راہیں، اچھی صحت، طویل عمر پانے کا راز، پہلا انعام اور خدا جانے کن کن چیزوں کی تلاش کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

روزگار کی کم یابی نے آدمی کو مجبور کیا ہے کہ وہ انسانی خدمت کے ذرائع کو بھی روزگار بنالے جیسے طبابت، مدرسی، لیڈری وغیرہ۔ ویسے طبیب، مدرس اور لیڈر حضرات دل سے نہ بھی چاہیں تب بھی ان کے ذریعہ کچھ نہ کچھ انسانی خدمت ہو ہی جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سیاست اور عبادت کو بھی بطور روزگار استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اور اس کے ذریعے دولت، عزت اور شہرت سبھی کچھ بادل ناخواستہ قبول کیا گیا ہے۔ پیر، فقیر، گنڈے، تعویذ دینے والے، جھاڑ پھونک کرنے والے اور بھوت چڑیل اتارنے والوں کے بارے میں البتہ بہت سارے لوگ یقین سے کہہ نہیں سکتے کہ یہ ان کا روزگار ہے یا انسانی خدمت یا محض شوق۔ اسی طرح پارلیمنٹ، اسمبلی اور میونسپلٹی کے الکشن کے امیدواروں کے متعلق بھی وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ ان کی نیت کیا ہے۔ گو ان کی نیتوں کے بارے میں حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کچھ اشارہ ضرور دیا ہے۔

سروس نہیں کرتا ہوں، میں ہوں قوم کا خادم ؛ چندے کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

تلاش روزگار کے نتیجے میں دنیا میں بعض ایسے حادثے بھی ہوئے ہیں جن کے اثرات سے آج تک بنی نوع انسان چھٹکارا پا نہیں سکا ہے۔ جیسے نئی دنیا امریکہ کی تلاش۔ جیسے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام۔ وغیرہ۔ تلاش روزگار میں آدمی نے کبھی بھی روزگار کے حسن و قبح یا اس کے محفوظ اور غیر محفوظ ہونے کی فکر نہیں کی۔ کہیں وہ دفتروں اور دکانوں میں آرام اور چین سے بیٹھ کر جمع تفریق کرتا اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں مختلف اشیاء رکھ کر انھیں برابر کرنے کی کوشش کرتے رہتا ہے تو کہیں سرکس میں کرتب یا زبن کر خود اپنی اونکبھی ڈرائیور بن کر اپنے ساتھ مسافروں کی بھی جان ہتھیلی یا ہتھیلیوں پر لیے رہتا ہے۔ کبھی سیکڑوں ہزاروں فٹ گہری کانوں میں کام کرتا ہے۔ کبھی سمندر کی گہرائیاں ناپتا ہے اور کبھی ہوا کے دوش پر اڑتا ہے۔ حتیٰ کہ سارے ایسے کام انجام دیتا ہے جن میں ایک معمولی سی لغزش "غم ہستی کا علاج بن سکتی ہے"۔ غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج

سچ پوچھئے تو روزگار کی ضرورت صرف ان کو ہی نہیں ہے جو کھائے پیئے بغیر ہی زندہ رہتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے بارے میں ابھی تک دنیا والے لاعلم ہیں۔ چنانچہ نہ صرف دین کی خاطر بلکہ روزگار کی تلاش میں بھی۔

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے اس نے ؛ دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے اس نے

جا کے پہنچا کبھی یورپ کے گلی کوچوں میں ؛ کبھی آفریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

اور تو اور اسی ایک مشترک مقصد کی خاطر آدمی کتنے ہی متضاد اور باہم متصادم کام انجام دیتا ہے ایک طرف وہ چور، غنڈہ اور فسادی بن کر لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے گلی ڈنڈا اور فٹ بال کھیلتا ہے تو دوسری جانب ایسوں کو سرکاری مہمان بنا کر جیل "کھانے" سے تواضع بھی کرتا ہے۔ آدمی اپنے روزگار کی خاطر قانون ساز بھی ہے قانون شکن بھی۔ امن کا نقیب بھی، جنگ باز بھی۔ اسمگلر اور منشیات کا تاجر بھی اور انسداد جرائم کا ٹھیکدار بھی۔

جو قتل کر رہا ہے سو یہ بھی ہے روزگار	جو جاں بچا رہا ہے سو یہ بھی ہے روزگار
بندر نچا رہا ہے سو یہ بھی ہے روزگار	کرتب دکھا رہا ہے سو یہ بھی ہے روزگار
بھوک بنا ہوا ہے سو یہ بھی ہے روزگار	ایڈیشن دے رہا ہے سو یہ بھی ہے روزگار

اگلے وقتوں میں ضروریات زندگی کی فراوانی اور ارزانی کی وجہ سے لوگ فکر معاش سے نہ صرف بیگانہ تھے بلکہ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا شرافت سے بعید بھی جانتے تھے۔ چنانچہ اگر لوگ نوکری کے طلب گار بھی ہوتے تو محض

حصولِ دولت کی خاطر نہیں عزت و آبرو میں اضافہ بھی مقصود ہوتا تھا۔ مرزا غالب نوکری کی پیشکش ٹھکرا کر محض اس لیے چلے آئے تھے کہ انگریز صاحب بہادر استقبال کے لیے پہلے سے حاضر نہ تھے۔ خود مرزا نے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ نوکری اس لیے کرنی چاہیے تھی کہ مرتبہ بڑھے نہ اس لیے کہ جو ہے اس میں بھی کمی واقع ہو۔ شاعری، عاشقی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، شطرنج، گنجفہ، چوسر اور رقص و سرود میں ہی لوگ شب و روز غرق رہا کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں لوگ نوکری کے بغیر بھی بھوکوں نہیں مرتے تھے۔ آج تو ڈگری ہولڈروں کی فوج نوکری کی خاطر سڑکیں ناپتی پھرتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں بی اے پاس مشکل سے ملتے تھے۔ اسی لیے حضرت اکبر الہ آبادی نے لیلیٰ کی ماں کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے ؛ کہ بیٹا تو اگر کرے بی اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے ؛ بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

لیلیٰ کی ماں نے لیلیٰ کو بیاہ دینے کے لیے صرف بی اے پاس کی شرط لگائی تھی نوکری کی نہیں۔ گویا اس وقت بی اے پاس کرنا نوکری کی ضمانت تھی۔

یوں غور کیجئے تو دنیا کی ساری چہل پہل، ساری رونق، ساری بھاگ دوڑ، ساری گہما گہمی، اور سارا ہنگامہ محض اس وجہ سے ہے کہ آدمی کو روزگار کی تلاش ہے۔ اور آدمی روزگار کی تلاش پر اس لیے مجبور ہے کہ اسے بھوک لگتی ہے۔ چنانچہ بھوکے پیٹ نہ صرف یہ کہ بھجن نہ ہوئے بلکہ قدرتی نظاروں میں بھی دلکشی نظر نہیں آتی بقول نظیر اکبر آبادی۔ مہر و ماہ بھی اسے روٹیاں نظر آتے ہیں۔ تمام جاندار چرند و پرند اور درندا کیڑے مکوڑے اور طرح طرح کے حشرات الارض جب بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں تو خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ان میں بہت سارے ایسے ہیں جو اپنے سے کمزوروں کو ہی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ قدیم زمانے یعنی پتھر کے زمانے کا آدمی بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ لیکن آج وہ مہذب ہوگیا ہے۔ اس لیے اب وہ کمزوروں کو ہڑپ کرنے کے لیے مہذب طریقے اپناتا ہے۔

بات تلاش روزگار کی ہے۔ آج نئے نوجوان تعلیم سے فارغ ہوتے ہی روزگار کی تلاش میں جب پہلی کوشش کرتے ہیں تو انھیں توقع تو ہوتی ہے پانچ ہزار والی نوکری کی لیکن در بدر ٹھوکریں کھانے اور مسلسل ناکامیوں کے بعد آخر میں انھیں پانچ سو پر ہی مجبوراً راضی ہونا پڑتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا سلسلہ ہے کہ جس میں آدمی پیمبری لینے جاتا ہے اور آگ لے کر لوٹتا ہے۔ دراصل آدمی کی اپنی صلاحیت کے بارے میں خود اس کی اپنی جو رائے ہوتی ہے اس سے دوسرے لوگ ذرا کم ہی اتفاق کرتے ہیں۔ مجبوراً نوکری کے طالب غرض مند کو ہی اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔ اور جہاں تک اپنی رائے بدلنے کا تعلق ہے دنیا کے تمام معاملات میں غرض مندوں اور حاجت مندوں کا یہی حال ہے۔ پھر کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند۔۔ اسی لیے ہر ایک پر یہ وقت آتا ہی ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

جس طرح پیٹ بھرنے کے لیے آدمی الٹی سیدھی نوکریاں کر لیتا ہے اسی طرح نوکری حاصل کرنے کے لیے وہ بعض اوقات الٹے سیدھے راستے بھی اپناتا ہے۔ ایک صاحب اپنے سے کہیں بہتر سیکڑوں امیدواروں کی موجودگی میں محض اس بنا پر نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ انھوں نے انٹرویو لینے والے منیجر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ دفتری کام تو انجام نہیں دے سکیں گے۔ مگر آفس میں تمام ملازمین پر کڑی نگاہ رکھیں گے کہ کون کون کس کس وقت آتا جاتا ہے۔ کون مخالف ہے کون موافق۔ کون لوگ ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے

ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ضرورت پڑنے پر ان کے مخالفین کے اتحاد کو توڑنے اور انھیں منتشر کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا کریں گے۔ اور دفتر میں ان کے خلاف ہونے والی ساری باتوں کو روز کے روز ان کے گوش گزار کر دیا کریں گے۔

نوکری حاصل کرنے کے لیے نذرانے وغیرہ دینا تو اب بالکل عام بات ہو چکی ہے۔ اور یہ تو خیر پھر بھی بعد کا اسٹیج ہے۔ اب تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی نذرانے اور عطیے لازم ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو روزگار کے بغیر کم از کم آج کی دنیا میں آدمی کا کام چل نہیں سکتا۔ اس کے لیے آدمی کو خواہ کتنے ہی مصائب برداشت کرنے پڑیں۔ اس کے دل سے یہ خیال جا نہیں سکتا۔ ع

ہے اس عہد کا نعرہ روزگار کی تلاش

کاروباری حضرات سے اپیل

اردو زبان ایک عالمگیر زبان ہے لیکن اردو داں حضرات نے اس زبان کو ادب ہی کی حد تک محدود رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کا استعمال کاروبار میں بھی ہو۔

ہماری اپیل ہے کہ:-

تاجر حضرات اپنا حساب کتاب (کھاتہ بہی) اُردو میں رکھیں جبکہ دستور ہیں اس بات کی پوری طرح اجازت دیتا ہے، اس میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بے شمار فوائد پائے گئے ہیں۔

- اس میں اپنے کاروباری راز کی ضمانت ہے اور حفاظت بھی • اردو داں کی روزی کا ذریعہ ہے۔
- غریب و نادار طلباء اپنے فرصت کے اوقات میں کھاتہ نویسی کر کے پڑھائی کا بار خود برداشت کر سکتے ہیں
- عوام کا ذہن اردو مدارس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ • اردو داں طلبار کی معلومات و تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ • محکمہ ٹیکس میں اردو داں کی آسامیاں پیدا ہونگیں۔ اردو زبان و کاروبار کی اصطلاحیں عوام و خواص میں عام ہونگیں۔

تنظیم رضا انعامات

عطاء ازہری بک ایجنسی کمہار محلہ ہبلی ۵۸۰۰۲۸

(۱)

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار
— پاکستان —

ہیں شیریں بہت بندہ مزدور کے اوقات

ہمارا وسیع و عریض مبلغ دو کمروں پر مشتمل گھر ساون بھادوں کے نرغے میں تھا۔ چھت کی مٹی دلِ مفلس کی طرح گھل گھل کر پرنالوں کے راستے بہہ کر کب کی بحیرۂ عرب میں مل چکی تھی۔ سوچا اس سے پہلے کہ کمروں کی ٹیڈی چھتیں فروہی میں گدائی کاغذ کی جسامت اختیار کریں ان پر نئے لیپ کروانے ضروری ہیں لیکن مصروف آدمی چراغِ رُخِ زیبا لے کر کہاں کہاں مزدور کو ڈھونڈے۔ ناچار سب مصروفیات ترک کر کے چشمہ چوک کی سیاحی کی۔ ایک بابوٹائپ مزدور پسند آیا تو خوشی خوشی اُسے گھر لے آئے۔ موقع واردات اُس کی طبعِ نازک پہ گراں گزرا۔ حضرتِ عالی مقام فرمانے لگے کہ مٹی کی "کہانی" ابھی مارتا ہوں اور تھوڑی دیر بعد چھت لیپ دوں گا۔ میں تو سمجھا تھا کوئی لمبا چوڑا کام ہوگا۔

"کسی اور دائبڑہ تو کہیں سے لائیں" اس نے اچانک کہا۔

"کہاں سے لاؤں" پریشان ہو کر سوچتے ہوئے کہا

"کہیں اڑوس پڑوس سے پتہ کرلیں"

امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا پڑوسیوں کے دروازے پہ دستک دی۔

"کون ہے" خاتونِ خانہ نے کہا۔ ہم گو اور مگو کی حالت میں کھڑے تھے۔

"اچھا! ڈاکٹر صاحب ہیں آیئے تشریف لایئے کیسے آنا ہوا"

"دابڑے اور کسی کا طلب گار ہوں" ہم نے خجالت سے معمور لہجے میں کہا

دونوں چیزوں سے لدے پھندے واپس پہنچے تو مزدور نے کہا

"اس کام کے پچاس روپے ہوں گے صاحب"

"تھوڑے سے کام کی اتنی زیادہ مزدوری۔ کچھ تو رحم دلی سے کام لو"

"سوچ لیں اگر منظور نہیں تو رخصت ہوتا ہوں"

رمضان کے دن تھے اور گرمی اپنے جوبن پر۔ اُس وقت کسی دوسرے مزدور کو کہاں سے دریافت کرتا اِس لیے "مرتا یہی کرتا کے مصداق" حامی بھر لی۔ وہ کسّی لے کر مٹی کے ڈھیر پر پل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ موصوف سائے

میں بیٹھے شربت پی رہے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا اور حلق ہیں کانٹے سے چبھ رہے تھے اس لیے یہ منظر دیکھ اس پر بڑا رشک آیا اور شاعر کا کہا ہوا کافی حد تک مشکوک نظر آیا بلکہ حالت اس کے برعکس تھی۔ یعنی ؎

ہیں شیریں بہت بندۂ مزدور کے اوقات

دنیا یقیناً رحم دل مزدوروں سے خالی نہیں ہوگی لیکن آج تک ہمیں تو بے رحم مزدوروں ہی سے سابقہ (اور لاحقہ) پڑا ہے یعنی منہ مانگی اُجرت کا مژدہ سُنائیں گے اور پھر لاکھ منت سماجت کریں مزدور کے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آئے گی۔ چھوٹے بہن بھائی روزانہ تانگے پر سکول جاتے ہیں ایک دن کوچوان صبح صبح بادائے بے نیازی سے چابک لہلاتے ہوئے آیا اور حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"اب آپ ایک بچے کو سکول لے جانے کا سو روپیہ ماہوار ادا کیا کریں"

"وہ کس خوشی میں"

(اکڑ کر) "جی کمشنر صاحب نے حکم دیا ہے کہ ایک تانگے میں چالیس کی بجائے صرف آٹھ بچے سوار ہونے چاہیں اس لیے فی بچہ مشاہرہ بڑھانا اشد ضروری ہو گیا ہے" ہم نے سر تسلیم خم کر دیا۔ کچھ روز گزرے تو بچوں کو موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئیں۔ مہینہ ابھی تولد ہوا تھا اس دن پہلی تاریخ تھی۔ بچے صرف سکول میں تعطیلات کے لیے ہوم ورک لینے گئے اور واپس آ گئے۔ دوسرے دن پھر کوچوان ٹپک پڑا اور سو روپے کا ٹیکس ناجائز روح فرسا مطالبہ کیا۔ اُس سے عرض کیا کہ اگر انصاف کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھو تو فیصلہ بلکہ زمامِ کار تمہارے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ ظالم ڈنڈی مار گیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب۔ بچے ایک دن سکول جائیں یا ایک ماہ میں تو سو روپیہ ہی وصول کروں گا"

ہم نے سٹپٹا کر سوچا کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا ٭ طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مزدور سے صرف عام آدمی ہی خائف اور ہراساں نہیں بلکہ بارعب مزدوروں کو دیکھ کر تو بڑے بڑے سیٹھوں کے دل گھبرا اٹھتے ہیں اور بہت سے سیٹھ صاحبان کے پتّے پانی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ناتواں لوگ سالہا سال سے ہنسی خوشی اپنے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں صرف اس لیے رہ رہے ہیں کہ نئی تعمیر کے سلسلے میں مستری صاحب اور مزدور کا خرچہ دنیا ہی لیں میں نہیں ہم جیسا غیر دور اندیش آدمی بھی جب نئے گھر کی تعمیر و ترقی یا فلاح و بہبود کا سوچتا ہے تو مزدور کے خوف سے جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے کو ہماری اندرونی سراسیمگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی نہا کر غسل خانے سے برآمد ہوئے ہیں۔

کارخانہ دار تو بیچارہ بہت ہی ڈرپوک ہوتا ہے۔ ذرا سوچئے تو (چلیں ہمارے کہنے پر ہی سوچ لیں) کہ سیٹھ صاحب کمرے میں ایسی لگا کر نرم و آرام دہ کرسی میں دھنسے ہوئے کس قدر تکلیف دہ حالت میں ہیں کیونکہ اس وقت وہ مزدوروں کے توسیعی مطالبات اور حد سے بڑھے ہوئے بونس کے متعلق پریشان ہیں جب کہ مزدور خوش گپیوں میں مصروف ہیں اور سیٹھ صاحب کی اس حالت پر پھولے نہیں سماتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کبھی ورکر کی اپنی غلطی سے ہاتھ مشین میں آ گیا تو سیٹھ صاحب کو خوب رگڑا لگے گا۔ ہسپتال میں علاج کروائیں گے۔ کچھ قانونی دان طبیعت کے مالک مزدور اس کو ورغلائیں گے کہ کم از کم اتنے ہزار روپیہ لے کر سیٹھ کی جان بخشی کرنا۔ اگر مزدور

رحم دل ہے تو حاتم کی قبر پر لات مار کر (حاتم کو اس بات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں) طے شدہ رقم لے کر اُن کی جان بخشی کر دے گا۔

یہ مخلوق اگر کام چھوڑ اور کھڑکی توڑ ہڑتال پر کاربند ہو جائے تو ملکی معیشت کی حالت نازک اور بیکری کے بسکٹ سے بھی زیادہ خستہ ہو جاتی ہے۔ بعض قومی اداروں میں تو عملی طور پر احکامات ہی مزدور کے ہوتے ہیں اور افسرانِ زیرین کے ساتھ ساتھ افسرانِ بالا بھی اسی کے حکم پر سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مزدور لیڈر اور مسکین سے ڈویژنل چیف انجینئر صاحب کی گفتگو کا یہ ناگفتہ بہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

مزدور :۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں آپ نے لیبر کو تنخواہ بہت دیر سے دی۔

انجینئر صاحب :۔ (ڈرتے ڈرتے) ہاں جی دراصل ایسا اس لیے ہوا کہ درمیان میں کچھ چھٹیاں آ گئی تھیں۔ دفتری عملہ بل نہیں بنا سکا۔

مزدور :۔ میں یہ فضول بہانے تسلیم نہیں کرتا۔ اب کسی مہینے ایسا ہوا تو آپ کے خلاف جلوس سڑکوں پر نکل آئے گا اس لیے اس قسم کی اطلاع دوبارہ سُننا پسند نہیں کرتا۔

انجینئر صاحب :۔ آئندہ ہم احتیاط کیا کریں گے لیکن آپ بھی یونین کے عہدیداروں سے کہہ دیں کہ بلاوجہ تنگ نہ کیا کریں۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا۔

مزدور :۔ (رعب سے) کوئی مزدور کسی کو تنگ نہیں کرتا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو چاہیے جب بھی کوئی یونین کا عہدیدار آئے تو آپ اسے اُٹھ کر ملیں اسے مناسب عزت دیں آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

انجینئر صاحب :۔ (نظریں بدستور جھکائے) ٹھیک ہے جناب آئندہ ایسا ہی ہوگا۔

بہت سے نمائندہ قسم کے مزدور صاحبان بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ اصل شیرینی تو ان کے شب و روز میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ اندر ہی اندر صاحبانِ اقتدار سے ملے ہوتے ہیں اور باہر سے مزدور بھائیوں کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو کچھ مراعات دینے کا فیصلہ ہو جائے تو یہ لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں اور حکام کو رو کتے ہیں کہ پہلے ہمیں مزدوروں کے اجتماعات میں اپنی مراعات کے بارے میں تقریریں تو کر لینے دیں پھر کچھ دن گزریں تو ان سہولتوں کا اعلان جاری کیا جائے تاکہ اس کام کا سہرا ہمارے سر اور گردن کے گرد حمائل رہے اور سارا کریڈٹ ہمیں ملے۔

کل رات گھر کی بجلی نے اپنی خدمات جاری رکھنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ پورا خاندان تیرگی کا شکار تھا طبیعتوں کی شگفتگی تک ظلمت کے اندھیرے سائے تلے دب چکی تھی۔ الیکٹریشن کو بلایا گیا۔ کہنے کو یہ حضرت بھی محنت کش ہیں۔ بعض لوگ حقیقی معنوں میں محنت کش ہوتے ہیں اور کچھ دراصل محنت کُش ہوتے ہیں جیسے جراثیم کُش اور مسلم کُش وغیرہ۔ ہماری ناقص رائے میں صرف فیوز اُڑا تھا لیکن اس نے ہمارے ہوش اُڑانے کے لیے کہا۔

"پوری وائرنگ اُڑ گئی ہے۔ تاریں بچ کر گئی تھیں بہت زیادہ نقصان بھی ہو سکتا تھا۔"

"تو بھلا آپ کے منہ میں خاک۔ پورے گھر کی بربادی کی بات نہ کریں۔ یہ تو بڑا خوفناک بچ تھا ہم تو ابھی تک آرٹسٹک بچ ہی سے واقف تھے۔"

"میں ابھی آپ کو وائرنگ اُکھاڑ کر مشاہدہ کرواتا ہوں۔"

عدالت کی بجائے مصروف الگاتے ہوئے کہا ہے

دے گا تمام کمرے کے بجلیے اوپر تو

مگر الیکٹریشن کے انہماک میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جذبہ اور لگن ہو تو ایسی کہ جب تک ایسی کی تیسی نہ پھیرے کسی اور طرف دھیان ہی نہ دے۔ وہ لپے اور تاروں سمیت دیوار سے بدستور گتھم گتھا تھا۔ اس کے عادات و اطوار بتا رہے تھے کہ ارادے نہایت بلند ہیں اور اتنی آسانی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ شاید ابھی اور اسی وقت گھر کا ہر کمرہ غسل خانہ اور صحن تک منور کرنے کی تمنا دل میں بسائے ہوئے ہے۔ ہم نے پوچھا تو اس نے اشارات میں جواب دیا یعنی ؎

جلاتا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے تیرے تاریک کمروں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

لیکن یہ ملحوظ بات ہے کہ اس کا پیش کردہ بل ادا کر کے مدتوں دل کی بستی تاریک اور سونی سونی رہی۔ پسینہ خشک ہونے سے پیشتر اُجرت ادا کرنا ضروری ہوتا ہے شاید اسی لیے اکثر مزدوروں کو پسینہ بہت آتا ہے اور وہ اسے پونچھنے کا بھی کوئی اہتمام نہیں کرتے کوئی چھوٹا تولیہ ہی پاس رکھ لیا کریں۔ پھر اُجرت وصول کرنے والے کو بھی تو کچھ خوفِ خدا ہونا چاہیئے کہ مزدوری کی بجائے اگر بھاری جرمانہ وصول کرنا شروع کر دے گا تو دینے والے کو جو پسینہ آئے گا وہ دیر تک خشک نہیں ہوگا۔ نتھیا گلی میں رہنے والوں کو اور مشکلات ضرور پیش آتی ہوں گی لیکن یہ آسانی ہے کہ مزدور کو جب چاہا مزدوری دے دی کیونکہ وہاں پسینہ آتا ہی نہیں تو خشک ہونے کا انتظار کون کرتا ہوگا۔

فیض اور حضرتِ دانش کے کلام کا تھوڑا بہت مطالعہ کرنے کے بعد ایک تاثر اُبھرتا ہے اور بہت سے بے خبر ذرائع نے اس کی تائید بھی کی ہے کہ صبح اور دوپہر کا وقت اکثر مزدوروں پر بڑا تلخ گزرتا ہے کیونکہ اس وقت انھیں ڈٹ کر کام کرنا پڑتا ہے مالک ان کے سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ مالکوں کی اس بے ہیچ عادت کی وجہ سے وہ حقہ پانی کے بہانے کام چھوڑ کر نہیں جا سکتے خصوصاً سرکاری تعمیرات میں مصروف لوگ تو بہت زیرک ہوتے ہیں۔ قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان میں ایسے کچھ مزدور نظر آئے کہ پہروں ایک ہی اینٹ پکڑ کر اس کے پہلوؤں کا مطالعہ فرماتے رہتے تھے۔ ایک دو گھنٹے سوچنے کے بعد جب وہ اوزار اینٹ پر مارتے بھی ہیں تو اس نزاکت سے جیسے چوٹ زیادہ پڑی تو اینٹ کے درد ہونے لگے گا۔ فیض کو بہت غم تھا کہ مزدور کو دوپہر کے وقت نیند آتی ہے مگر بیچارہ سو نہیں سکتا حالانکہ اس میں دُکھ کی کونسی بات ہے اکثر دکاندار اور کاروباری لوگ بھی دوپہر کو نہیں سوتے اور اگر مزدور دوپہر کو نہیں سو سکتا تو رات کو خراٹے مار کر سوتا ہوگا اس طرح دوپہر کی کسر نکالنے کے لیے اکثر مزدور دوسری صبح تو دس بجے بیدار ہوتے ہیں۔ یہ تو دوپہر تک کا احوال تھا جس میں ہمارا فیض اور احسان دانش سے خاص اختلاف نہیں لیکن اکثر مزدوروں کی شام بڑی رنگین ہوتی ہے۔ تمام خرادیئے اور دھاڑی دار مزدور دو دو روپے والی ٹکٹ مار کٹائی سے بھرپور طریقہ استعمال کر کے خریدتے ہیں اور پھر انجمن اور سلطان راہی کی فلم سکرین کے بالکل آگے بیٹھ کر دیکھتے ہوئے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس سے انھیں ایسا مزہ آتا ہے کہ سارے دن کی تھکان دُور ہو جاتی ہے۔ جب بھی پردہ اسکرین پر کوئی دلفریب رقص نظر آئے تو یہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، قمیص اور شلوار [illegible] سے [illegible]

بہت سے غم اور پریشانیاں ایسی ہیں کہ جن کی تلخی سے امراء کے حلق ہر وقت کڑوے رہتے ہیں جیسے انکم ٹیکس اور اکرنا سیلز ٹیکس دینا ٹیلی فون کا بل اور ٹی وی لائسنس فیس۔ آج پھر کسی ادنی سطح کے اجلاس میں درآمدی ڈیوٹی میں اضافہ ہوگیا تو انھیں رات کو نیند نہیں آے گی جو چیزیں مہنگے داموں بیچنے کا خوشگوار تصور دل میں آباد تھا اُن کی قیمتیں عالمی منڈی یا قصبے کی منڈی میں گرنے کی ذرا خبر سنی تو پیٹ خراب ہوگیا پہلے مروڑ اُٹھے پھر اسہال شروع ہو گئے (محکمہ صحت کو ان امراء کی بیماریوں کے لئے بھی مخصوص نمکول ایجاد کرنا چاہیئے) اس کے مقابلے میں لیبر کلاس کے آدمی کو کوئی دکھ نہیں نہ ٹیکس کا خطرہ نہ مارکیٹ میں چیزوں کے چڑھاؤ گرنے کا خوف کیا آزاد اور خود بیں زندگی ہے!

عدم کے مجموعہ کلام چارہ درد سے ۔۔۔ ایک شعر سنیئے ۔

محبت کرنے والی آنکھ بھی مزدور ہوتی ہے ؛ کبھی تو کچھ حساب اُجرتِ مزدور کر ڈالو

آج تک ہمارے ذہن میں مزدور کا تصور بڑا کھردرا سا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ ڈھیلا ڈھالا سا روش اور ہوادار لباس یعنی لنڈی سی قمیص اور ٹیڈی سا تہبند باندھے ہوئے لیکن عدم نے یکسر نیا اور سہانا سا تصور پیش کیا ہے ان کا تشکیل کردہ یہ مزدور یعنی محبت کرنے والی آنکھ تو بہت ہی نرم ملائم اور لطیف ہے بالکل ریکسونا صابن کے جھاگ کی طرح۔ اندازہ لگایئے کہ ان کے خیال میں محبت کرنے والی آنکھ بھی "دھاڑیاں" کرتی ہے لہٰذا اس محنت کش کو بھی اجرت ملنی چاہیئے کیا ہی اچھا ہوتا اگر عدم اس کا بھی کوئی فارمولا بتا جاتے کہ یہ مزدوری کس کرنسی میں ادا کی جائے۔ البتہ ہمارے ذہن میں ایک نیک خیال پل رہا ہے کہ اس قسم کی مزدوری لینے اور دینے والے دونوں فریقین کو یہ اجرت کسی اچھے سے نکاح خواں کو دے دینی چاہیئے جو ان کے مل جل کر رہنے کی بنا ڈالے۔ خدا نے چاہا تو ایسے مزدوروں کے اوقات بہت ہی شیریں ہوں گے (وما علینا الا البلاغ)

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مجموعے!

○ قصہ مختصر ۱۲ روپے ○ آدمی نامہ ۱۲ روپے ○ بالآخر ۱۴ روپے

○ تکلف برطرف ۱۴ روپے ○ قطع کلام ۱۲ روپے ○ جاپان چلو ۱۴ روپے (سفرنامہ)

○ سو ہے وہ بھی آدمی ۱۸ روپے ○ الغرض ۱۵ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کیجئے!

نٹ کھٹ عظیم آبادی

ہم نے جب اُس سے کہا تم ہماری میٹ ہے
جھٹ سے بولی جھاڑ دما رے تم سے مجھ کو ہیٹ ہے
جب پڑی ترچھی نظر کتنے ہی انسا جت ہوئے
فلمی پریوں کا نشانہ کتنا ایکوریٹ ہے
میں نے موجودہ مسائل پر اُٹھایا ہے قلم
بات جو بھی لکھ رہا ہوں یار و اپ ٹو ڈیٹ ہے
اب تو پی ایچ-ڈی کی تھیسس بھی بکاؤ مال ہے
دوستو بازار میں اس کا مقرر ریٹ ہے
ہے تعجب آج کیسے آ گئی ہے وقت پہ
ورنہ اسٹیشن پہ ہر گاڑی پہنچتی لیٹ ہے
کر لو شادی آج ہی پھر ٹل نہ جائے یہ گھڑی
مولوی نے بھی کہا ہے یہ مناسب ڈیٹ ہے
کوئی خوش خوراک نیتا آ گیا ہے کیا یہاں
آج کیوں بازار میں مرغوں کا دونا ریٹ ہے
کھا کے رشوت کی کمائی اس قدر چربی چڑھی
ہر منسٹر کا تو ساڑھے تین من کا ویٹ ہے
بے ڈکارے ہضم کرتے جا رہے ہیں قوم کو
غار ہے خندق ہے کھائی ہے کہ ان کا پیٹ ہے
کس طرح نٹ کھٹ بلائے اس کو بزمِ شعر میں
اس کو بس مجھ سے ہے الفت شاعری سے ہیٹ ہے

روشن لال روشن بنارسی

نہ گھر نہ گھاٹ کے تھے آل انڈیا شاعر
خوشا! جو بن نہ سکے آل انڈیا شاعر
عجیب شہر بنارس بھی ہے جہاں ہم کو
قدم قدم پہ ملے آل انڈیا شاعر!
خدا کے فضل سے جمہوریت یہاں پہ ہے
جو چاہے خود کو کہے آل انڈیا شاعر
فقط ہمیں ہیں کہ روشن بنارسی نہ ہوئے
تمام لوگ ہوئے آل انڈیا شاعر
یہ راز دوستو مجھ پر مشاعرے میں کھلا!
ہوئے تمام گدھے آل انڈیا شاعر
مشاعرے کو تو اک شاعرہ نے لوٹ لیا
ڈرے ڈرے سے تھے کھڑے آل انڈیا شاعر
مشاعرہ بھی کیا خاک! اور اوپر سے
کرایہ لے کے ٹلے آل انڈیا شاعر
یہ ہیکڑی یہ اکڑ یہ مزاجِ عرش نشیں
کہیں کے آئے بڑے آل انڈیا شاعر
مشاعرہ تو سنا آل انڈیا تھا مگر
مشاعرے میں نہ تھے آل انڈیا شاعر
کوئی بتاؤ کہ یارو کہاں ہے مہنگائی
ٹکے کے چار بکے آل انڈیا شاعر

میر حسین علی امام (پاکستان)

ن سے نمک۔

ن سے نمک۔ آٹے میں نمک اور ہر چیز میں نمک نمک نہ ہو تو سالن پھیکا اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔ ہر سالن میں نمک کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے اور سالن ہی پر کیا موقوف ہر چیز میں رکھنا پڑتا ہے۔ مزدور مالک کا، وزیر بادشاہ کا سب ایک دوسرے کے نمک کا پاس رکھتے ہیں نمک حلالی کرتے ہیں اور جو نمک حلالی نہیں کرتے ہیں وہ نمک حرامی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نمک حلالی نہایت مشکل کام ہے۔ نمک حرامی نہایت آسان ہے اور ہر کوئی آسانی سے موقع بے موقع کر سکتا ہے۔

نمک سمندر، دریاوں، پہاڑوں سے نکالا جاتا ہے، بحیرۂ مردار، اتنے نمکین پانی پر مشتمل ہے کہ کسی بھی جاندار شئے کا اس میں زندہ رہنا محال ہے۔ ہمارے کھیوڑے کی کانوں میں کام کرنے والے بھائی پتہ نہیں نمک کی زیادتی کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ نمک سے ہر شئے نمکین ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جن چہروں میں نمک پایا جاتا ہے ان چہروں کو نمکین چہرہ کہا جاتا ہے۔ اگر رنگ کم ہو۔ لیکن چہرہ نمکین ہو تو رشتہ قبول ہو جاتا ہے اور بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ رنگ ذرا سا کم ہے تو کیا ہوا چہرے پر نمک تو ہے۔ یوں لڑکی پسند آجاتی ہے گویا نمک رشتے کرانے کے لئے اہم ایجنٹ کا کام کرتا ہے۔

نمک کیمیا کی رو سے ترشے اور الکلی کے ملاپ سے بننے والی شئے ہے اور جو نمک ہم کھاتے ہیں اس کا کیمیائی نام سوڈیم کلورائیڈ ہے۔ کیمیا میں نمکیات کے لحاظ سے کئی مرکبات اور ان کے خواص آتے ہیں۔ جن کا فی الوقت ذکر بے محل ہے۔ نمک کا زیادہ کھانا نقصان دہ ہے لیکن بسا اوقات بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ایک ہوٹل میں چند شعرا حضرات بیٹھے تھے وہاں سے ایک عام سے شخص کا گذر ہوا۔ شعراء نے اسے مدعو کیا اور چائے کے ساتھ نمکین بسکٹ کھلایا اور کہنے لگے کہ آپ نے نمکین بسکٹ کھایا ہے اب نمک حلال کیجئے اور غزل سنیے۔ غزل در غزل دیوان در دیوان، رات ختم ہو گئی۔ نمکین بسکٹ مہنگے پڑ گئے۔ اب ہمارے اس دوست کا کہنا ہے کہ سب کی نمکین اشیاء کی دعوت قبول کریں لیکن شعرا حضرات کی نمکین دعوت کوئی قبول نہ کرے!

نمک جس برتن میں رکھتے ہیں اسے نمک دانی کہتے ہیں۔ نمک دانی، بڑی نازک اور العڑ حسینہ کی مانند ہے جیسے

نمک دان بڑا بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ نمک دان نے کھانے کی میزوں سے نکل کر مجید لاہوری کی کوششوں سے ادب میں پہنچ گیا اور پھر ادب سے ڈائجسٹی دنیا میں عباس باوزیر اسے نمک دان ڈائجسٹ کے روپ میں لے آئے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ عباس باوزیر وزیر ہو گئے اور نمک دانی کے چکر میں پڑ گئے اور نمک دان پھر غائب ہو گیا۔

نمک کا استعمال ہمیشہ سے حکمت و طب میں موضوع بحث رہا ہے۔ نمک کے زیادہ استعمال سے بلڈ پریشر ہونے کا احتمال رہتا ہے آنکھیں کمزور ہوتی ہیں۔ اس لئے حکما و ڈاکٹر حضرات کمزور آنکھوں والوں اور بلڈ پریشر کے مریضوں کو نمک کی مقدار میں کمی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ ساری قوم بلکہ ساری دنیا کو شاید نمک کی فراوانی کھا گئی ہے۔ کیونکہ آئے دن کے ہنگامے توڑ پھوڑ، فرسٹریشن اور بلڈ پریشر کی علامت ہیں۔ گویا قوم کا بلڈ پریشر یہ نمک بڑھا گیا ہے۔

کوئی زخموں پر نمک چھڑکنے کے فرائض انجام دیتا ہے اور کوئی نمک پاشی کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں نمک کے حوالے سے بہت سی کہانیاں اور حکایتیں لکھی جاتی تھیں۔ مثلاً رزق کی قدر کرو۔ نمک زمین پر گر جائے تو قیامت کے دن پلکوں سے اٹھانا پڑے گا۔ یا ایک ایسی کہانی جس میں کوئی شہزادہ جہاز پر نمک لے کر نکلا اور ایسے ملک جا پہونچا جہاں نمک نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سلامت نے نمکین کھانے کھائے تو انھیں نہایت مزہ آیا اور جہاز میں موجود نمک کے بدلے سونا چاندی جہاز پر لاد دیا اور حسب معمول اپنی شہزادی کی شادی بھی اس نمک والے شہزادے سے کر دی۔ یوں شہزادے کو نمک کی تجارت نے ولی عہدی اور پھر شہزادی تک پہونچایا۔

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کس قوم اور امت نے نمک دریافت کیا یا استعمال کیا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک عقلمند اور زبان کی ماہر تھی اور نمک کے ذائقہ کو کھانوں میں شامل کر کے آنے والوں پر ایک احسان کر گئی۔ زمین دار حضرات کے متعلق آتا ہے کہ اگر کوئی اچھا اور کامیاب زمین دار ہے تو وہ صرف بازار سے نمک خریدے گا بقیہ تمام کھانے کی اشیاء سبزی، چاول، دالیں وغیرہ کو اسے خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی اور شہروں میں تو آپ کو معلوم ہے کہ نمک سے لے کر تمام اشیاء خریدنی پڑتی ہیں۔

نمک کھانا ہمیں سالن میں پسند ہے چائے اور چاول میں نہیں۔ لیکن نمک سے زیادہ میز پر نمک دانی سجانا پسند ہے اور نمک دانی سجانے سے زیادہ نمک دار رسالے (طنز و مزاح) پڑھنا ہمیں پسند ہے اور ان کے لیے نمکین تحریریں لکھنا اور زیادہ پسند ہے۔ شاید آپ کو بھی ہماری لکھی ہوئی نمکین تحریریں پسند آئیں یا ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں کہ اس میں کچھ نمک کم یا زیادہ پڑ گیا۔ ●●

میں کھٹ سے ٹارزن کی طرح اُٹھ کے آؤں گا
مُنّے کے ابّا کہہ کے صدا دیجیے مجھے

ظہیر قدسی (مالیگاؤں)

انیس سلطانہ (بھوپال)

"انہونی"

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اچھا بھلا آدمی بہ قائمی ہوش و حواس الٹا لٹکنے لگے تو تعزیرات ہند کی دفعہ فلاں و فلاں کے تحت کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوتا۔ ایک سنہری، البیلی، گاتی، مسکراتی اور باقی خصوصیات صیغۂ راز میں ہیں) پتہ نہیں صبح تھی کہ شام کوئی وقت ضرور تھا، ہم پر انکشاف ہوا کہ ہم بھی شاعری کر سکتے ہیں۔ بس، خیال کا آنا تھا کہ اس کے پر لگ گئے۔ پر جو لگے تو روکنا محال۔ ایسی آناً فاناً شاعری کا پیدا ہو جانا اور وہ بھی اس دھوم دھام سے۔ . . یوں سمجھئے کہ ہفتہ دس دن میں ہم نے انبار لگا دیئے۔ جی ہاں مضامین نو کے انبار۔ ابتداء ہوئی تھی ایک عدد معصوم صورت نظم سے۔ ہندوستانی طرز پہ لب گیت۔ ہر چہار طرف "سوکھا" سوکھا کی دہشت آمیز پکارنے اور گھر سے نظر آنے والے بڑے تالاب کی روز بروز گھٹتی ہوئی سطح نے ایک عدد بے بحر سی نظم کہلوائی۔ ابھی نظم کسی کو دکھا بھی نہ پائے تھے کہ اسی روز سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ اُدھر بارانِ رحمت جوش پر تھا۔ اِدھر طبع رواں۔

بارشوں کا زور تو گھٹ گیا، لیکن اس برسات نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ ارے نظمیں ہی لکھتے رہتے تو کون سا قاضی گلہ کرتا۔ مگر شامت آگئی غزل کی بھی۔ غزلیں جب ہم پر زیادہ حاوی ہونے لگیں تو اگلے پچھلے تمام گناہوں سے توبہ کی، کر ہمت چست کے، جدید شاعروں کو دل ہی دل میں (کہ انھیں کانوں کان خبر نہیں!) چیلنج دیا اور یوں کہا کہ راہ جدید میں جہاد کے لیے تلوار یا قلم علم کر دیا۔ ردیف و قافیہ کی پرواہ کئے بغیر ان کے سورج، سمندر، کرب، خواب، خون، جنون کو اپنے جنونِ قلم کی نذر میں لرزاری علامتوں پر پانی پھیر دیا۔ اب نہ مطلع کی کاوش، نہ مقطع کی پرسش تخلص کا الزام ہم اپنے سر آنے نہ دیں گے۔

بچوں کو شعر و سخن سے مس نہیں، شوہر نامدار اس جھگڑے میں پڑے ہی نہیں۔ ؎
سخن شناس نہ ٔ دلبرا خطا اینجا ست۔

مدد کی دوڑ با گرفتگی محترمہ شفیقہ آپا (شفیقہ فرحت) کو پورا کرنے کی ہماری عادت پرانی اور ان کا یہ حال کہ
سر ٹ لو یہ گماں کہ مخاطب ہمیں سے ہے۔

لطف یہ کہ جب کبھی ہماری شاعری منظرِ علم پر آئے گی (شاید) اور ہم جو یہ کہیں کہ ہم ان کے شاعر عزیز ہو تو مستقبل بعید میں انہیں بھی ضرور شاعر سمجھ لیا جائے گا۔ دیوان کی تلاش ہوگی۔ اور کیا عجب کہ مل ہی جائے۔ آدمی کو گزشتہ دیر لگتی ہے!

بہت سے ایسے افراد (فرد کی جمع) پیدا ہوئے جن کا کوئی ثانی نہیں۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اس قبیل کے اشعار ذہن عزیز میں تنہائی وارد ہوئے۔ کچھ تو بن کھلے ہی مرجھا گئے۔ جو سخت جان تھے وہ بچ رہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے: امکانوں کا مجمع

کہیں مجمع تھا ہا کمالوں کا
ذکر تھا مستند حوالوں کا
کچھ کتابوں کا، کچھ رسالوں کا
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ___ بات پہنچی تری جوانی تک۔

علم الحساب:-

ہر چند ہم حساب میں کمزور ہیں بہت
گزری شب فراق اسی احتساب میں
حالت جامزہ سے مددلی تو کیا نہیں
تارے جو گن چکے تو ستارے بھی سر پڑے
(علمی ستارے)

عاشقانہ رنگ بھی ملاحظہ کیجئے:

جگر کے زخموں کا جا لالان ہوگیا ہے آج
وہ دل، جگر کے حسینوں کا آج مرکز ہے
وہاں یہ داغ یہ زخموں کا کام کیا ہے بھلا
یہ دل میں عاشق صادق کے رہ نہیں سکتے۔
یہ دل ہے عاشق صادق کا یہ فری تو نہیں
کہ بجلی پیٹھ لے گا یہ جھونپڑی تو نہیں

جدید اصطلاحات میں ایک ہائیکو:

شاید غم حیات کی زنجیر کھل گئی
پہلے بھی آسمان کے برابر نہ تھا کبھی
اور اب تو آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔

معذرات:

حضور تلخ کلامی کو آپ معاف کریں
ذرا سنیں تو سہی مجھ سے ماجرا کیا ہے
حضور تلخی دوراں انوکھی بات نہیں
حضور تلخی دوراں کو آپ معاف کریں
وہی ہے بھوک، وہی تشنگی وہی افلاس
وہی ہے تلخ مزاجی وہی تلاش معاش
شکستہ خواب وہی ہے وہی غم احساس
حضور تلخی دوراں انوکھی بات نہیں
حضور وعدۂ فردا پہ غور فرمائیں
مگر یہ وعدۂ فردا، کچھ ایسی بات نہیں
کہ کل کبھی نہیں آتا زمانہ شاہد ہے

دستر خوان عہد جدید:

کدو کی کھیر بھی پکنے لگی ہے
کدو کا حلوہ بھی پکتا ہے لازم
کدو کا رائتہ ہوتا ہے کیا خوب
"کدو کاوش" سے پکتا ہے دگرنہ
کدو کی آج شامت آگئی ہے۔

اور چلتے چلتے گلے دیکھئے۔
"شگوفہ" دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

قلمی معاونین اپنی تخلیقات پر پتہ لکھنا نہ بھولیں!

حفیظ حارث
(کامٹی)

دوسری شادی

جب استاد فیضو نے ہمارے کانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ حاجی یاقوت ساٹھ برس کی عمر میں دوسری شادی رچانے جا رہے ہیں تو ہمیں ذرّہ برابر بھی حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس سال سردیوں میں ہم نے انھیں معجون شباب آور کے ڈبّے خریدتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تبھی ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا اور اب استاد فیضو کی سنائی ہوئی خبر ہمارے خیال کو حقیقت کا رنگ دے رہی تھی۔

"کیا کوئی بیوہ ہے استاد؟" ہم نے استاد فیضو سے دریافت کیا۔

"نہیں بھئی کنواری ہے ایک دم کنواری! اور وہ بھی سترہ برس کی حسین و جمیل دوشیزہ" استاد نے الفاظ چبا چبا کر جواب دیا۔

"سترہ برس کی حسین و جمیل دوشیزہ!" ہم نے حیرت سے دہرایا۔ "کہیں آپ کچھ غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہے استاد!"

"لو یہ بھی خوب رہی۔ ارے میاں مجھے کیا پڑی ہے جو میں غلط بیانی سے کام لوں۔ حاجی یاقوت سترہ سال کی کنواری سے شادی رچائیں یا ساٹھ سالہ بڈھی کھوسٹ سے، مجھے اس سے کیا غرض!" استاد نے بُرا مان جانے والے انداز میں کہا۔

"ارے استاد! آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ بات ذرا عجیب لگ رہی تھی اس لیے میں نے حیرت ظاہر کر دی۔ ویسے ہو سکتا ہے بھئی ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ حاجی یاقوت کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے تو ہیں نہیں۔ مالدار آدمی ہیں، شہر کے رئیس ہیں۔ ساٹھ برس کی عمر میں سترہ برس کی دوشیزہ تو درکنار وہ تو اسّی برس کی عمر میں پندرہ برس کی لڑکی سے بھی شادی رچا سکتے ہیں۔ انھیں کون روکے گا اور انھیں لڑکی کیوں نہ ملے گی۔ مالدار جو ٹھہرے۔"

ہم نے استاد کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے جلدی سے کہا۔ ہماری بات سن کر استاد کی چڑھی ہوئی تیوری ڈھیلی پڑ گئی اور پیشانی کے بل آناً فاناً غائب ہو گئے۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم عود کر آیا اور چہکتی ہوئی آواز میں بولے "اور شادی بھی ایسی ویسی یا چپکے چپکے نہیں ہوگی بلکہ علی الاعلان ہوگی۔ حاجی یاقوت باقاعدہ برات لے کر جائیں گے لڑکی والوں کے یہاں۔"

"اچھا!" ہم نے حیرت آمیز لہجہ میں کہا۔

"ہاں میاں ! مجھے سب معلوم ہے ۔ میں خود حاجی یاقوت سے مل کر آرہا ہوں " اُستاد فیضو نے کہا ۔ یہ سن کر ہماری بھی طبیعت مچلنے لگی کہ حاجی یاقوت سے روبرو گفتگو کی جائے ۔ اور اس سلسلے کے تمام احوال انھیں کی زبانی سُنے جائیں ۔ اس سے ہمارا شک وشبہ بھی دور ہو جائے گا اور حقیقت بھی سامنے آجائے گی ۔ کیونکہ سترہ سالہ دوشیزہ والی بات ابھی بھی ہماری حلق سے نہیں اتر رہی تھی ۔ اُستاد فیضو لاکھ سچ بولیں ، ہمیں اعتبار بھی نہیں آرہا تھا ۔ ! ہم اپنے آپ کو شک وشبہ کے بھنور میں پھنستا ہوا محسوس کر رہے تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ حاجی یاقوت سے براہِ راست ملاقات کی جائے اور ان سے مل کر استاد فیضو کے کیے گئے " انکشافات " کی تصدیق کروائی جائے ۔ حاجی یاقوت سے ہمارے دیرینہ مراسم تھے اور چونکہ ہم ان کے منہ پر ہی ان کی تعریف کیا کرتے تھے اس لیے وہ ہم کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے ۔ اور اُن سے ہمارے تعلقات " علیک سلیک " کی حدود سے تجاوز کر کے دوستی کی حدوں میں داخل ہو گئے تھے ۔

چنانچہ دوسرے روز صبح ہی ہم ان کے دولت خانے پر تشریف لے گئے ۔ اس وقت حاجی صاحب قبلہ ہمیں " قوت وجوانی کے قیمتی راز " نامی کتاب پڑھتے ہوئے ملے ۔ ہم نے با آوازِ بلند ان کی سماعت پر سلام کا ہتھوڑا چلایا ۔ چونک کر ہماری طرف دیکھا اور " وعلیکم السلام " کہتے ہوئے اُٹھ کر بڑی گرم جوشی سے ہم سے بغلگیر ہو گئے ۔

" آؤ . . . آؤ میاں ! بیٹھو ۔ کچھ دنوں سے ہم آپ ہی کو یاد کر رہے تھے ۔ "

" خیریت ! " ہم نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

" کیا عرض کروں میاں ؟ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ چھ ماہ قبل ہماری زوجۂ محترمہ ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں ۔ ! " انھوں نے غمناک لہجہ میں کہا ۔

" جی ہاں قبلہ معلوم ہے مسز حاجی یاقوت کا انتقال ایک سانحۂ عظیم ہے " ہم نے اپنی آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے جواب دیا ۔

" بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو ۔ ہمارا ہی کلیجہ تھا جو یہ صدمہ سہہ گئے ۔ چالیس برس کی رفاقت تھی میاں ہماری ان سے " وہ رو دینے کے سے انداز میں بولے ۔ اور پھر انھوں نے زور سے دونوں آنکھیں میچیں شاید اس اُمید پر کہ آنکھوں سے ایک آدھ قطرہ آنسو کا نکل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔ !

" ہاں تو میاں ! " انھوں نے بات آگے بڑھائی " اتنی طویل ازدواجی زندگی کے بعد ہم بیوی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ بغیر بیوی کے زندگی ہمارے لیے پہاڑ بن چکی ہے ۔ ہمیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ہے ۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے رائے دی کہ ہم دوسری شادی کر لیں ۔ تجویز ہمیں معقول نظر آئی اس لیے ہم نے بھی دوسری شادی کا ارادہ کر لیا ۔ ٹھیک کیا نا ۔ "

" جی ہاں بالکل ٹھیک فیصلہ کیا آپ نے " ہم بولے " شادی آپ کے لیے بہت ضروری ہے حاجی صاحب ! ورنہ یہ پہاڑ سی جوانی آپ تنہا کیسے کاٹ سکیں گے " ہم نے ان کی جوانی کی بابت بلاشبہ مبالغہ سے کام لیا تھا ۔ ورنہ ہمیں حاجی یاقوت کے وجود میں جوانی کی کرن تو کجا کوئی چھوٹی موٹی چنگاری بھی نظر نہیں آرہی تھی لیکن ہماری بات سن کر حاجی یاقوت کی آنکھوں کے دیئے روشن ہو گئے اور خوشی کے مارے بچے کھچے دانت نکل پڑے ۔ !

" تم ٹھیک کہتے ہو میاں ! تنہائی سے ہی تو ہمیں ہول آتا ہے ۔ بیوی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ بغیر بیوی کے ہم رہ ہی نہیں سکتے ۔ ! "

"لڑکی تو پسند کرلی ہی ہوگی ؟" ہم نے دریافت کیا۔

"ہاں میاں! عتیق بھائی نے ایک لڑکی دکھائی تھی۔ کیا لڑکی ہے میاں چندے آفتاب چندے ماہتاب!"
حاجی صاحب رال ٹپکاتے ہوئے بولے۔ "ہمیں پسند آگئی اور ہم نے انھیں کے ذریعہ بات پکی کروالی۔"

حاجی یاقوت کو ندیدوں کی طرح رال ٹپکاتے دیکھ کر غصہ تو بہت آیا کہ اٹھوں اور جماؤں دو چار ہاتھ نابنجار کی پیٹھ پر۔ لیکن ہم ضبط کئے بیٹھے رہے۔

"لڑکی بیوہ ہے یا مطلقہ ؟" ہم نے مزید کریدا۔

"اجی لاحول بھیجئے" حاجی یاقوت نے برا مان جانے والے انداز میں کہا۔ "کیا آپ نے ہمیں ایسا ویسا سمجھ رکھا ہے!"
ہم نے انھیں بگڑتے دیکھا تو فوراً کہا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ تو نجیب الطرفین ہیں حاجی صاحب آپ نے ہماری کس بات سے اندازہ لگایا کہ ہم آپ کو ایسا ویسا سمجھتے ہیں؟"

"یہی سوال جو آپ ہم سے کر رہے ہیں کہ لڑکی بیوہ ہے یا مطلقہ؟ اب ہم کیا اتنے گرے پڑے ہیں جو کسی سکنڈ ہینڈ لڑکی سے شادی رچائیں۔ ارے میاں! ہم جس لڑکی سے شادی کرتے جارہے ہیں وہ کنواری ہے کنواری! اور وہ بھی سترہ سالہ!! سمجھے۔ انھوں نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

"جزاک اللہ! حاجی صاحب قبلہ! آپ نے تو کمال کر دکھایا۔" ہم نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور دل ہی دل میں سوچا۔
"ابے او بڈھے کھوسٹ! کیوں اپنی دولت کے بل بوتے پر کسی غریب دوشیزہ کی ارمان بھری زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔"
لیکن ہم دل کی بات زبان پر نہ لاسکے اور جلے بھنے لہجے میں پوچھا۔ "لیکن حاجی صاحب یہ رشتہ طے کیسے ہوگیا۔ لڑکی والے راضی کیسے ہوگئے؟"

"دیکھو میاں! یہ تم کیا بے کار کی ہانکنے لگے۔ لڑکی والے راضی کیوں نہیں ہوتے۔؟ میاں! جس گھر میں دولت کی ریل پیل ہو اس کے لیے لڑکیوں کی کون سی کمی؟" حاجی یاقوت نے سینہ پھلا کر کہا۔

"تو پھر کب ہو رہا ہے نکاح"؟ ہم نے دریافت کیا۔

نکاح! ارے میاں شادی ہوگی شادی۔ باقاعدہ بارات جائے گی۔!! دھوم دھام سے۔ پھر ہوگا نکاح سمجھے۔"
انھوں نے چہکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"حضرت کچھ تو شرم کیجئے اس عمر میں اور سفید داڑھی میں آپ بارات نکالیں گے؟" اب ہمارا صبر رخصت ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم نے مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا اور حقیقت بیانی شروع کردی۔

"تو کیا داڑھی والے برات نہیں نکال سکتے؟" انھوں نے غصہ سے پوچھا

"جی داڑھی والے برات تو نکال سکتے ہیں لیکن ساٹھ برس کے داڑھی والے نہیں ۔! وہ تو کسی کے ارمانوں کا صرف جنازہ ہی نکال سکتے ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟" حاجی یاقوت غصہ سے پھنکارتے ہوئے بولے۔

"جی بکتا نہیں بلکہ حقیقت عرض کر رہا ہوں۔" ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی معصوم کو بھینٹ چڑھائیں ۔!"

"ابے تو ہوتا کون ہے بولنے والا۔ کیا تو لڑکی کا بھائی ہے؟" حاجی یاقوت شدت غصہ سے کف بردار ہو چکے تھے اور

دامنِ تہذیب بھی ہاتھوں سے جھٹک چکے تھے۔

"میں لڑکی کا بھائی ہوں یا نہیں لیکن عمر کے حساب سے آپ ضرور لڑکی کے نانا یا دادا لگتے ہیں"۔ ہم نے انھیں مزید غصّہ دلاتے ہو کہا۔

"ابے ٹھہر تو سہی، بدمعاش!" حاجی یاقوت غصّہ میں بھرے ادھر ہمیں مارنے کے لیے لپکے۔ لیکن ہم تو پہلے ہی سے تیار کھڑے تھے۔ ایک ہی جست میں کمرے سے باہر ہو گئے اور حاجی یاقوت اپنے ہی زور میں چاروں شانے چت ——! پھر حاجی یاقوت ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ گئے اور ہم یہ جا وہ جا ——!

دلہن کی خوبصورتی کو نکھارنے کے لیے من پسند دوپٹہ!
دلہن سب سے زیادہ جس کھڑے دوپٹے میں خوبصورت لگے، وہ کھڑا دوپٹہ صرف اور صرف

اے ایچ۔ زری والا

کا ہوگا

اِس کے علاوہ ہمارے شوروم کا شیوا اسٹاک
* بنارسی سلک ساڑیاں * تنچوی * ساٹن * جارجٹ * آرگنزا * ٹشو * شفان * پٹولہ
* بروکیڈ * دھرما درم * کانچی درم * پوچم پلی * نارائن پیٹ * میسور کریپ * ایمبرائیڈری اور ڈریس میٹریل
خصوصی کاؤنٹر میاچنگ کے لیے:۔
بلوز * دوپٹہ * کرتے اور فالس۔
ہم استقبال کرتے ہیں آپ کا اور آپ تمام کا۔

اے ایچ۔ زری والا

لاڈ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

فون: 525232 * کیبل "زری والا"

جی ایم احمد خواہ مخواہ (بمبئی)

موازنہ

چچی جان کو ہمارے گھر آئے مشکل ایک ہفتہ ہی ہوا ہوگا مگر اس ایک ہفتے میں وہ بین الاقوامی مسائل سے لے کر ہندوستان کی موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال پر بے لاگ تنقید اور تبصروں سے نواز کر ہماری معلومات میں اضافہ کرتی رہیں۔ اخبار کی سرخیاں، ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں کے خلاصے انہیں ازبر ہوگئے تھے اور وہ اُن کی روشنی میں اپنے گرانقدر مشوروں سے ہمیں یوں نوازتیں جیسے ہندوستان کی عنانِ حکومت ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اُن کے مشوروں پر عمل پیرا ہوکر ہم قوم کا بیڑہ پار لگا سکتے ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ہندوستانی کرنسی کی قیمت گر جانے سے دن بدن بڑھتی ہوئی گرانی اور اس کے تباہ کن نتائج کے خوف سے ہمیشہ متفکر و پریشان رہتیں۔ ہم نے انہیں بارہا سمجھایا کہ ایک ہم ہی نہیں دنیا کی سبھی قومیں مہنگائی کے خوفناک دیو سے نبرد آزما ہیں اور رفتہ رفتہ اس جدوجہد کے عادی بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے ہم چچی جان کے زرّیں مشوروں پر زیادہ دھیان بھی نہیں دے رہے تھے۔ لیکن جب وہ آج کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کا موازنہ ان کے اپنے وقت کی ارزانی سے کرنے لگ جاتیں تو ہمیں اچنبھا بھی ہوتا کہ کیا ہمارا ہندوستان واقعی اُس سنہرے دور سے گزر چکا ہے؟ مختصر یہ کہ اُن کی ہر بحث کی تان اُن کے اپنے زمانے کی خوشحالی پر ٹوٹتی۔

ابھی کل ہی کی بات ہے ہم بنیے کی دوکان سے مہینے بھر کا غلّہ اور دوسری اشیاے ما یحتاج گھر میں بھر رہے تھے۔ جب انہوں نے چاول، گیہوں، شکر اور دیگر اجناس کے دام سُنے تو اپنا سر پیٹنے لگیں "کیا قیامت ہے؟ اتنی مہنگائی!! خاک پڑے ایسی آزادی پر۔ اس سے تو گورے انگریزوں کی غلامی کیا بُری تھی۔ کم از کم اناج تو سستا مل جاتا تھا۔" ہم نے انھیں چھیڑا۔ "چچی جان! ناراض نہ ہو۔ آج بھی بہت ساری چیزیں پرانے داموں سے بھی سستی دستیاب ہیں۔"

کہنے لگیں "میں بھی تو سنوں کہ آخر وہ کونسی چیزیں ہیں، نگوڑی موت تک تو مہنگی ہے اس زمانے میں۔"

ہم نے جواب دیا "دیکھیے! آزادی کے بعد نت نئی بیماریاں مفت اور گھر بیٹھے ملنے لگی ہیں اور مشوروں کی تو آپ کے زمانے میں کچھ نہ کچھ قیمت رہی ہوگی لیکن آج ہر موضوع اور مسئلے پر ہر سائز اور ہر نوعیت کے مشورے نہ صرف مفت بلکہ بن مانگے مل جاتے ہیں۔"

بس چراغ پا ہوگئیں۔ "احمد میاں! مجھے غصّہ نہ دلاؤ۔ بے شک ہم انگریزوں کے غلام تھے لیکن ایسی آزادی بھی کس کام کی کہ انسان اچھا کھانے اور پہننے کو ترس جائے۔ تم یقین نہیں کروگے تمہاری بیوی جو ساڑی پہنے ہوتی ہیں نا، ویسی ہماری زمانے میں آتی ہلکی ساڑی تو خدا بخشے تمہارے چچا جان نے جو خادمہ میرے لیے رکھی تھی۔ وہ بھی نہیں پہنتی تھی۔ اور یہ تمہارے نحیف و لاغر جسم پر ڈگو ٹا مار ایک رنگی ڈریس پہنا دو جیسے تم مغل کا ایتے ہو

اس سے قیمتی یونیفارم تو ہمارا ڈرائیور پہنتا تھا۔ مرد گیبرڈین، شارک اسکن اور ٹوئیڈ کے سوٹ اور شیروانیاں پہنتے۔ تم نے تو شاید ان کپڑوں کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ اگر جھوٹ کہوں تو میرے منہ میں خاک، اللہ بخشے تمہارے چچا میرے لیے جارجٹ، شیفون اور کتان کی ساڑیوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ بنارسی سلک تو روزمرہ کے استعمال کا کپڑا تھا۔ ان ساڑیوں کے پلو پر جو زری کا کام ہوتا تھا اس کی قیمت سے آج کی دس ساڑیاں خریدی جا سکتی ہیں۔ جب سے یہ ٹیری لین، ٹیری کاٹ اور نائیلان کا مصنوعی کپڑا نکلا ہے۔ تب سے کپڑوں کی قدر و قیمت ہی جاتی رہی ہے ــــ"

بھڑک کر کہنے لگیں ــــ "تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں قیمت اب تم کسی چیز کی بھی بڑھا لو۔ اب یہی دیکھ لو۔ اللہ بخشے تمہارے چچا جان کی حجامت نائی خود گھر پر آ کر بنا جاتا اور تین آنے لے کر ہنسی خوشی لوٹتا ــــ کل ہی تمہارے صاحب زادے اپنے بالوں کی اصلاح کر کے جو لوٹے تو کسی طرف سے بھی دکھائی نہ دیا کہ حجامت بنوا آئے ہیں۔ سنا کہ ایک گھنٹہ انتظار کیا اور مزید ایک گھنٹہ نائی کے آگے سر تسلیم خم کیے بیٹھے رہے۔ آٹھ روپے اجرت اور دو روپے بخشش جو دی سو وہ الگ ارے میں کہوں۔ رمضان کی عید کے موقعے پر سارے گھر کی حجامت بنانے کے بعد نائی کو دس بارہ آنے دے دیتے تو وہ بقر عید تک سب کی مفت حجامت کرتا ــــ"

ہم نے انھیں سمجھایا۔ "چچی جان گرانی ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے پھر بھی ہندوستان کی حالت دیگر پسماندہ ممالک سے بہتر ہے۔ یہ سن کر ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ "خاک بہتر ہے! ہمارے ملک میں ترقی کے سارے ذرائع و وسائل موجود ہیں۔ پھر بھی ہمارا نمبر غریب ممالک کی فہرست میں سر فہرست ہے۔ میں تو خیر نری جاہل ہوں۔ کل ہی تمہارا چھوٹا لڑکا کہہ رہا تھا کہ ہانگ کانگ نام کا ایک ملک ہے جہاں کوئی پیداوار نہیں ہوتی حتی کہ پینے کا پانی بھی پڑوسی ملک چین فراہم کرتا ہے مگر وہاں کی رعایا ہم سے زیادہ خوش حال ہے"! ہم نے چچی جان کو ہتھے سے اکھڑتے دیکھا تو انھیں قابو میں کرنے کے لیے کہا ــــ "لیکن چچی جان! ہمیں آزادی کی کچھ نہ کچھ قیمت دینی پڑے گی ــــ" بات کاٹ کر دھاڑیں ــــ آزادی! آزادی! آزادی!! تم جو یہ بار بار آزادی کا نام لیتے رہتے ہو یہ آخر ہے کہاں؟ آزادی کیا اسی کا نام ہے کہ لوگ کھانے پینے کی چیزوں کو ترس جائیں ان کے سروں پر چھت تک نہ ہو حد ہو گئی کہ انسان مرنا بھی چاہے تو اسے زہر تک اصلی نہیں ملتا۔ خود تمہاری یہ حالت ہے کہ اپنے ہی گھر میں سہمے سہمے سے رہتے ہو۔ اللہ جانے دفتر میں کیا کرتے ہوگے ــــ" ہم نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہا ــــ "جی! میں تو دفتر میں بھی کام کرتا ہوں" کہنے لگیں۔ "خیر تم تو پیدا ہی ہوئے ہو کام کرنے کے لیے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ بے شک نگوڑے مارے فرنگیوں نے ہماری محنت کا فائدہ اٹھایا لیکن انھوں نے ہماری فلاح و بہبود کا بھی خیال رکھا تھا۔ لیکن تم ہی بتاؤ، آزادی کے بعد جب اپنے ہی نام نہاد لیڈروں اور نیتاؤں نے عوام کی محنت کا استحصال کیا انھیں غریب سے غریب تر کر دیا اور خود دیکھتے دیکھتے امیر بن گئے تو ایسی آزادی سے وہ غلامی بہتر نہیں تھی جس میں عوام کو جینے کی ساری سہولتیں بہ آسانی میسر تھیں اور لوگ چین سے مر سکتے تھے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو اللہ بخشے تمہارے چچا کہا کرتے تھے ــ کل تک تھے آزاد قفس میں آج اسیر گلشن ہیں! جس میں جینا مرنا مشکل یہ کیسی آزادی ہے"

اس استدلال پر ہم پریشان ہو کر اپنی بغلیں جھانکنے لگے۔

شہرت بخاری

کھوئے ہوؤں کی جستجو میں خود اپنے آپ کو بھی گنوا بیٹھے

سعادت یار خان رنگین کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا۔ وہی مشہور شاعر جس نے انشاء اللہ خان انشاء کی رفاقت میں "ریختی" میں نام پیدا کیا۔ ان سعادت یار خاں رنگین کے خاندان میں رنگین کی وفات کے تقریباً سو برس بعد ایک بچہ پیدا ہوا جس نے اپنے جدِّ امجد کی طرح ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ فرق یہ ہے کہ رنگین ریختی کے استاد تھے اور یہ استاد ریختہ کے منصب پہ فائز ہوا۔ والدین نے اس کا جو نام رکھا تھا، اس میں تخلص کا اضافہ اس عزیز نے خود کر لیا اور چودہ برس کی عمر میں جب وہ احسان دانش کے حلقۂ شاگردان میں شامل ہوا تو اس نے اپنا تعارف "سید محمد انور نرگس بخاری" کی حیثیت سے کرایا۔ احسان دانش نے کہا، بھلا نرگس بھی کسی مرد کا تخلص ہوتا ہے؟ یوسف ظفر کی تجویز پہ نیا تخلص منتخب کیا گیا اور پھر یہ شاعر آگے چل کر شہرت بخاری کے نام سے مشہور ہوا۔

شہرت بخاری قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والے غزل گو شاعروں میں اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے صنفِ غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو مزید گرنے سے بچایا اور کلاسیکی انداز میں چند اچھی غزلیں لکھیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اپنے گہرے دوست ناصر کاظمی کی طرح غزل میں کوئی منفرد انداز پیدا نہ کر سکے۔ اس میں شہرت بخاری کا کوئی قصور نہیں۔ غزل ہی ایسی کم طلب صنفِ سخن ہے کہ اس میں کوئی الگ راستہ نکالنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ ایک ہی راستے پہ چلتے رہنا غزل گو شاعروں کی مجبوری ہے۔ لہذا دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر اس مجبوری کی حدود میں رہتے ہوئے کس حد تک "مختاری کی تہمت" اٹھاتا ہے۔ شہرت بخاری کے ہاں ڈیڑھ دو درجن شعر ایسے ضرور مل جاتے ہیں جو ان کی خوش گوئی اور خوش ذوقی کی دلیل کے طور پہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ڈیڑھ دو درجن شعروں کے ساتھ ایک اور چیز بھی شہرت بخاری کا نام زندہ رکھے گی اور وہ ہے ان کی تازہ نثری تصنیف "کھوئے ہوؤں کی جستجو"۔ یہ ضخیم کتاب یادوں اور یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ شہرت بخاری نے اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کیے ہیں اور اپنے حوالے سے بعض شخصیات کا تذکرہ کا نام کیا ہے۔ کتاب کا نام اس کے موضوع سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔ شہرت بخاری نے بعض گمشدہ شخصیات ہی کو نہیں، اپنے آپ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسروں کو تو کسی حد تک تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اپنا سراغ نہیں لگا سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جہت میں تلاش کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

آپ بیتی لکھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لکھنے والے کا حافظہ قابلِ اعتماد ہو۔ شہرت بخاری اس شرط کو پورا نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں خود موصوف کا بیان کردہ ایک واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ

وہ اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ فلم دیکھنے کے بعد "میں اس کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا، چلتا رہا، پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا۔ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اب جو دیکھا تو میرے سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ کوئی اور خاتون تھی۔ وہ بولی تو کچھ نہیں مگر اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا.... ایسا صرف اس لیے ہوا کہ مجھے یاد نہیں تھا کہ اس کے کپڑوں کا رنگ کیا ہے۔ جب صورتحال یہ ہو تو پھر میں کیسے اپنی نظر پر اعتماد کر سکتا ہوں اور ایسی چیزوں کے بارے میں کیونکر یقین کر سکتا ہوں جن کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں"۔

یہ اعتراف حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم اس پر صرف اس قدر اضافہ کریں گے کہ جو شخص اپنی بیوی کو کپڑوں کے رنگ سے پہچانتا ہو، اور یہ رنگ بھی اسے یاد نہ رہے تو ایسے شخص کو صرف شعر کہنے چاہئیں وقائع نگاری نہیں کرنی چاہیے۔

شہرت بخاری نے یوں تو اس کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ذیلی فصلیں بھی قائم کی ہیں، لیکن مواد کے اعتبار سے کوئی خاص ترتیب نظر نہیں آتی۔ جو واقعہ جہاں یاد آیا۔ لکھ دیا اور اگر دوبارہ یاد آگیا تو تب بھی لکھنے میں تکلیف نہیں کیا بعض ابواب مکمل طور پر شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ یہی شخصی خاکے اس کتاب کی جان ہیں۔ کاش شہرت بخاری آپ بیتی کے چکر میں نہ پڑتے، صرف شخصی خاکے لکھتے۔ سید عابد علی، یوسف ظفر، احسان دانش، ناصر کاظمی اور بعض غیر معروف لوگوں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان شخصیات کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اپنے گھریلو ملازم دمحمد مختار کا جو خاکہ انھوں نے لکھا ہے، اسے اردو کے اچھے شخصی خاکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

شہرت بخاری کو خوابوں سے اور محیرالعقول واقعات سے خاصی دلچسپی ہے۔ جہاں حافظہ بالکل ساتھ چھوڑ دیتا ہے، وہاں وہ خواب نگاری فرماتے ہیں اور جہاں خواب بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، وہاں اپنے اور دوسروں کے محیرالعقول واقعات تحریر کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس قسم کے طویل واقعے کا کچھ حصہ آپ بھی سنیے...... "مڑ کر دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گنوار سا ہو سر پر یہ بڑا سا گٹھا اٹھائے مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بیل تھا...... یہ حیران ہوئے کہ کیسا بدتمیز انسان ہے کہ بیل کو مسجد میں لیے آرہا ہے۔ پھر جو دیکھا تو ایک عورت اس کے سر پر بھی بڑی سی گٹھڑی، ایک بچے کو انگلی سے لگائے داخل ہوئی یہ تینوں ان سے چند گز کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گئے۔ مرد نے پگڑا اتارا اور بیوی سے کہا "بھوک لگی ہے سخت" اس نے کہا "گٹھڑ میں روٹیاں ہیں، کھالے"۔ گٹھڑ کھولا تو اس میں سیکڑوں روٹیاں۔ وہ چند نوالوں میں کھا گیا۔ پھر کہا "بھوک ابھی ختم نہیں ہوئی اس نے گٹھڑی کھولی۔ اس میں بھی لاتعداد روٹیاں.......... وہ انہیں بھی چٹ کر گیا۔ مگر اس کی بھوک قائم تھی........ اس نے بیل کو گرا، چھری پھیری، چند ہی منٹ میں کچا چٹ کر گیا۔ کہنے لگا، معلوم نہیں کیا بات ہے، آج پیٹ ہی نہیں بھر رہا، عورت نے غصّہ میں کہا "اب کہاں سے لاؤں، یہ مرد وا بیٹھا ہے، اس سے تیرا پیٹ بھر جائے گا۔ اس نے خوش ہو کر کہا "ارے ہاں تو نے پہلے کیوں بتایا یہ تو بڑے مزے کا ہوگا....."

شہرت بخاری کو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے جو عقیدت ہے، اس کا اظہار بھی کتاب میں جا و بے جا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم اہل پاکستان کو بھٹو نے دوبارہ جنم دیا تھا۔ لہذا اس شخص کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ پاکستان کے خاتمے کی دلیل ہے، وہ بھٹو کی پھانسی کے واقعے کو سانحۂ کربلا کے مساوی قرار دیتے ہیں اور بھٹو کی پھانسی کے بعد اپنے گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو امام حسینؓ کے پسماندگان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہی نہیں بھٹو کی پھانسی کے روز انہیں لاہور اور کوفے میں کوئی فرق نظر نہ آیا اور...... "لاہور ایک بڑا قبرستان معلوم ہو رہا تھا جس پر بدروحیں قابض تھیں

ہر عورت چڑیل، ہر مرد بھوت دکھائی دے رہا تھا کلیجے چبانے والی اور خون پینے والی مخلوق ان کی آنکھوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں اور نتھنوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ لمبے لمبے ناخن جن میں گوشت کے ریشے الجھے ہوئے تھے اور ہونٹ لہو سے تر تھے۔"

اہلِ لاہور کی ایسی بھیانک تصویر ایک لاہوری ہی کے ہاتھوں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی!

اس ضمن میں شہرت بخاری نے بہت سی نازیبا باتیں بھی لکھی ہیں۔ کتاب لکھتے وقت انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا شاید کتاب پڑھ کر ہو جائے۔ شہرت بخاری میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی نازیبا باتوں میں معذرت طلب کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جس کا اندازہ ان کے سے کیا جا سکتا۔ اہلِ پنجاب کے کیا کہنے، ایسے مہمان نوازی لوگ تو شاید ہی کسی شہر میں ملتے ہیں۔ پردیسی سے ان کا سلوک خاص ہوتا ہے۔ اس کی زیادتیوں کو بھی برداشت کر جاتے ہیں۔ دائرہ ادبیہ کی ایک نشست میں کسی مسئلے پر بات ہو رہی تھی ...... میرے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل گئی۔ سید ضیاء جعفری مرحوم .... اکھڑ گئے۔ غصے سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا........ کمالِ ضبط کے بعد سید صاحب نے صرف اتنا کہا مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آپ سید ہیں اور پردیسی بھی تو میرا چاقو آپ کے دل میں اتر جاتا ...... میں نے معذرت چاہی اور کہا کہ میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ لفظ سنتے ہی جعفری صاحب کھڑے ہو گئے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور گلے لگاتے ہوئے کہا "آدمی کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیئے۔"

اگر سید ضیاء الدین جعفری زندہ ہوتے تو وہ شہرت بخاری کی کتاب کے سیاسی حصے پڑھ کر ایک مرتبہ پھر ضرور کہتے۔ "آدمی کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیئے"

اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں شہرت بخاری نے دلچسپ باتیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً جس زمانے میں وہ "مجلسِ زبانِ دفتری" میں ملازم تھے، وہاں ان کی مصروفیات کی تفصیل انھیں کی زبان سے سنیئے:-

"—— میں نے تقریباً چار برس ملازمت کی جو برائے نام تھی۔ اتنا آرام زندگی میں کہیں حاصل نہیں ہوا۔ اس محکمے کا کام ایک ایسا لغات تیار کرنا تھا جو اردو کے سرکاری زبان بننے میں ممد ثابت ہو سکے ..... مگر میرا کام یہ تھا کہ میں صبح دفتر جاؤں، تھوڑی دیر ادھر ادھر پھیر دل دیگر ممبروں سے ادھر ادھر کی ہانکوں، چائے پیوں اور میز پر پڑ کر سو جاؤں دوپہر کو اٹھوں، کھانا کھانے گھر جاؤں اور پھر اکثر واپس نہ آؤں۔" حیرت ہے کہ شہرت بخاری کی قابلِ رشک کارکردگی کے باوجود اردو اب تک سرکاری زبان نہیں بن سکی!!

نامور مزاح نگار یوسف ناظم
کے مضامین
البتہ
قیمت دس روپے

یوسف یکتا

○

بد ہے وہ بدنام نہیں ہے
اُس پر تو الزام نہیں ہے

میں انساں ہوں اتنا سمجھ
میرا کوئی نام نہیں ہے

رُوٹھ گئی ہے میری قسمت
تم پر کچھ الزام نہیں ہے

کیسی ہیں یہ فصلیں یارو
آم نہیں ہے جام نہیں ہے

یوسف ہوں بے فیض ہوں لیکن
میرا تو کچھ دام نہیں ہے

یکتا کو بھی ہو گئی بخشش
اُس سے اب کچھ کام نہیں ہے

○

بچے ہوں بڑے ہوں سبھی ڈر جاتے ہیں
ماموں جو لڑھکتے ہوئے گھر آتے ہیں

لاحول پڑھو ایسے پدر پر یارو
بیٹوں کی کمائی پہ جو اکڑ آتے ہیں

سمجھے تھے محافظ جسے قاتل نکلا
اب کہیے جناب آپ کیا فرماتے ہیں

پھرتے ہیں مزے کرتے ہیں غنڈے سارے
معصوم ہی ہر وقت سزا پاتے ہیں

کیا خاک تمھیں فائدہ ہوگا یکتا
پرہیز نہیں کرتے دوا کھاتے ہیں

سید عباس متقی

میری موٹر

پھر چلی موٹر مری گیرج سے لہراتی ہوئی
اپنی بے ہنگم صدا سے سب کو چونکاتی ہوئی
کھٹکھٹاتی، چرچراتی، چیختی، جھنگھارتی
نغمۂ دجال یا بانگ دُہل گاتی ہوئی
جیسے پاگل کا ترنم ہے دیوانوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں دل کو دھڑکاتی ہوئی
کیا حسیں جمیل کیا کھمبے اور کیا بجلی کے پول
سامنے جو چیز آئے اُس سے ٹکراتی ہوئی

جب لگاتا ہوں "بریک" تو "گیر" میں آتی ہے یہ
"گیر" میں لوں تو ٹھہر جاتی ہے یہ بل کھاتی ہوئی
بوجھ ڈھو لیتی ہے میرا، میرے بچوں کا مگر
بھاگتی ہے نام سے بیگم کے گھبراتی ہوئی
دوڑتی ہے جیسے اُس کی دُم سے ڈبہ ہو بندھا
اور کبھی "اڑیل گدھے" کی طرح اڑ جاتی ہوئی
پیش کرتی بیچ رستے میں تماشے کا سماں
جب "ٹرافک" میں یہ رک جاتی ہے چکراتی ہوئی
گاہ اگلی سیٹ پر ہے گاہ پچھلی سیٹ پر
اگلیوں پر بیٹھنے والوں کو اچکاتی ہوئی
اک زمانہ دیکھتا ہے شوق و حیرت سے اسے
دل لبھا کرتی ہے یہ آتی ہوئی جاتی ہوئی
جانے بے بی آسٹن کہتے ہیں کیوں اب تک اسے
جبکہ بوڑھی ہو گئی خدمت وہ فرماتی ہوئی
میری موٹر میری بیگم کی طرح ہے متقی
چل رہی ہے آج تک یہ گالیاں کھاتی ہوئی

میں خط و کتابت کا اسٹیج ہر مریض کو آتا ہے۔

دوسری محفوظ جگہ جو افسانوں میں بتائی گئی ہے وہ چلتی ٹرین ہے۔ مگر اس سفر کے لیے آپ کو گھر ہی سے اپنے سوٹ کیس میں کچھ ٹافی، چاکلیٹ اور بسکٹ رکھ لینا ہوگا۔ کمپارٹمنٹ میں اپنی نشست ٹھیک حسینہ کے سامنے رکھیں۔ جب ٹرین کچھ مسافت طے کر لے تو گنگنانا شروع کریں اور اس حسینہ کو گھورنا شروع کریں۔

اگر اس کی گود میں بچہ ہو اور وہ چلانا شروع کرے تو جھٹ اسے کچھ ٹافی بسکٹ دے دیں۔ اگر آپ کی خوش اخلاقی پر وہ مسکرا دے تو سمجھیے تیر نشانے پر بیٹھ رہا ہے۔ بچوں کو ٹرین کے سفر میں خواہ مخواہ پیاس لگتی ہے۔ جیسے ہی وہ گلاس نکالے آپ اسے لے کر سامنے لگے بیسن سے پانی لا دیجیے۔ چوں کہ لمبے سفر کی ٹرین میں عموماً پانی اسٹارٹنگ پوائنٹ ہی سے نہیں رہتا اس لیے جیسے ہی کسی جنکشن پر گاڑی رکے، دوڑ کر گندہ پانی ہی سہی لا دیجیے۔ مگر اپنی خوش اخلاقی کے یہ سب مظاہرے کرتے وقت، اگر اس کا شوہر بھی ساتھ ہو تو اس کے تیور بھی دیکھتے چلیے اور اسی حساب سے قدم بڑھائیے یا پیچھے ہٹائیے۔

تیسری محفوظ جگہ ہر شہر کا میدان ہے۔ کھلے میدان میں زیادہ تر لوگ تفریح کے لیے ہر موسم میں شام کو آیا کرتے ہیں۔ آپ کسی حسینہ کے پیچھے لگ جائیے اور کبھی آہستہ اور کبھی زور سے کچھ عشقیہ مصرعے شروع کیجیے:

"اے عشق ہمیں برباد نہ کر، برباد نہ کر! ناشاد نہ کر"
"مجھ سے مت پوچھ مرے عشق میں کیا رکھا ہے"
یا "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد وہی سائنٹفک اسٹائل طریقہ اختیار کریں جو ابتدا میں بیان کیا گیا ہے۔

o

اس سلسلے میں کچھ شک و شبہات کا بھی ازالہ ضروری ہے تاکہ آپ پورے اعتماد کے ساتھ عشق کی وادی میں قدم رکھیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ عشق کا روگ لگا لینے کے لیے معشوق کے سن کی کوئی قید نہیں۔ ایک بزرگ شاعر تھے وہ روزانہ اپنے محبوب کو پھولوں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے مگر باغباں کو تاکید تھی کہ:

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہے ایک کم سن کے لیے

دوسری بات یہ کہ اس میں عاشق کے سن کی کوئی قید نہیں۔ لیکن ہو یا جوانی [illegible] جیسے جوان [illegible] ہیں کہ:

"جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی"

اگر عمر کی قید ہوتی تو جناب فصیح الملک صاحب جب [illegible] کے [illegible] ساتھ [illegible] کی بات کرتے [illegible]

حضرتِ داغؔ کا یہ سنِ شریف
اور پھر شوخ سیم بر کی تلاش

تیسری بات یہ کہ خوب رویوں کو چاہنے کے لیے عاشق کا خوب رو ہونا مطلقاً ضروری نہیں۔ "دبیر الملک" اور فصیح الملک جیسے کلاسیکل عشاق اپنی بدصورتی پر پھبتیاں سنتے رہے مگر ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اوّل الذکر پر تو لوگوں نے ایک خوب رو کو یہ پھبتی کستے سنا:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اور موخرالذکر پر کسی کی یہ پھبتی مشہور ہے:

داغؔ کی شکل دیکھ کر وہ بولے
ایسی صورت کو پیار کون کرے

چوتھی بات یہ کہ اس میں محبوب کے لیے کسی ذات پات، حسب نسب، رنگ، قومیت، اونچ نیچ، امیر غریب کی کوئی قید نہیں۔ عشق کرنے کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ:

"جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا"

یادوں کی برات والے شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا:

مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور

★

۱۵ سال سے ملک کی مشہور و معروف ہزاروں کی دلپسند چائے
ملک کی ہر دکان پر دستیاب ہوتی ہے

لاسا اسپیشل چائے
لمسا اسپیشل چاکلیٹ چائے
لاسا سوپر بلنڈ ٹی

ہیڈ آفس: نیلگیری ٹی امپوریم، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد اے پی (انڈیا)

کسی لیڈر سے پوچھیں گے ——— رفیع احمد (مالیگاؤں)

وطن کا حال ہے کیسا کسی لیڈر سے پوچھیں گے
ہے سونے کی کہاں چڑیا؟ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

غریبی کو ہٹائیں گے، گرانی کو گرائیں گے
سنیں کب تک یہی چرچا؟ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

نہ سونے پر، نہ چاندی پر، نہ ہیرے اور موتی پر
تو ہے کرسی پہ کیوں شیدا؟ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

شرافت، غم گساری اور محبت جس کی فطرت ہو
وہ کیوں بنتا نہیں نیتا؟ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

سفیدی آ گئی سر میں، ملی نہ نوکری اب تک
چلو بے کاری کا قصہ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

غریبوں کی ہے کثرت اور حکومت ہے امیروں کی
رفیع اب ماجرا ہے کیا؟ کسی لیڈر سے پوچھیں گے

غزلیں ——— سراج نرملی

★

تری نظر کا بنا جب سے دل نشانہ ہے
گلی میں تیری، مرا تب سے آنا جانا ہے

بہو کی لائف کو انشور کر کے آتا ہے
پھر اس کی موت کو اک حادثہ بتاتا ہے

اکیڈمی سے ملے ایڈ تو چھپانا ہے
نہیں تو غزلیں یہ ردی میں بیچ آنا ہے

ابھی تو فارنی کے ایمس ہم کو جانا ہے
قریب شام ہے اور دور آشیانہ ہے

غلط یہ بات کہ چالاک اور شانہ ہے
سراج دوستو! پاگل ہے اور دوانہ ہے

★

روزانہ مرغ و ماہی مفت کھا رہا ہوں میں
رشوت میں ڈھیر ساری رقم پا رہا ہوں میں

ہے شوق خاکسار کو رمی کا ریس کا
لے جا رہا ہے شوق چلا جا رہا ہوں میں

خاں چوں کرے گی تو تو ترا توڑ دوں گا سر
ڈائرکٹ "تاڑبن" سے چلا آ رہا ہوں میں

سیدھی طرح سے بات مری مان جائیے
انسانیت سے آپ کو سمجھا رہا ہوں میں

انوائیٹ کرنا بھول گیا ہوگا سوچ کر
دعوت میں بن بلائے چلا جا رہا ہوں میں

اس شب مشاعرہ ہے ڈیلپنے شہر میں
تازہ غزل سراج سے لکھوا رہا ہوں میں

دے کے خط (مراسلے)

بتاریخ ۱۹ نومبر ۱۹۷۸ء کو حیدرآباد دکن میں زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے شاہ طنز و ظرافت مجتبیٰ حسین کا جشن جس آب و تاب کے ساتھ منایا گیا۔ وہ تاریخِ ادب میں ایک مثال ہے۔ جس وقت اہلِ دکن مجتبیٰ حسین کو محفل میں دولہا بنا رہے تھے میں ان کے دلی جذبات۔ نیک نیت اور خلوص بیکراں میں محو تھا۔ اور وہ منظر میری نگاہوں میں محفوظ ہے۔ آج تک کسی کی نیک نیتی کسی کا خلوص اور اس کی محبت کو ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں بنا ہے۔

۱۹ نومبر کا یہ جشن ایسی ہی بے مثال اور انفرادی تقریب تھا۔ میں اہلِ دکن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اردو ادب کے ایک شاہِ طنز و ظرافت کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور مجتبیٰ حسین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی ادبی خدمات کو اللہ رب العزت نے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں اہلِ نظر آپ کی ستائش کرتے ہیں۔

دلکش بدایونی۔ محلہ بدایوں

فکر تونسوی اور احمد جمال پاشاہ کے انتقال کی خبریں پڑھ کر افسوس ہوا — ان کے انتقال سے شگوفہ کا بھی بڑا نقصان ہوا —

زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی مبارک —
زندہ دلان بمبئی کے قیام کی بھی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی — امید ہے کہ اہلِ بمبئی کچھ کر دکھائیں گے۔

(ڈاکٹر) عابد معز (الملتقا تنوری عرب)

استاذی جناب احمد جمال پاشا کی موت نے جسم کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک چپ سی لگ گئی ہے۔ پٹنہ میں میرے مہمان تھے۔ اس سانحۂ عظیم کی روداد لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ میری تحقیق برائے پی۔ ایچ ڈی کا موضوع وہی تھے

افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان کی بہت سی غیر مطبوعہ چیزیں میرے پاس موجود ہیں۔ شگوفہ کا سوونیر دیکھا۔ پسند آیا۔ یوسف ناظم کا رپورتاژ دلچسپ ہے۔ منظومات میں طالب خوندمیری، اسرار جامعی، ظہیر ابن قدسی اور یکجع جلیل نے متاثر کیا۔

ظفر کمالی — پٹنہ

میں سب سے پہلے آپ کو زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب پر مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک خالص ادبی ادارے کا سلور جوبلی منانا ہماری اس کاروباری دنیا میں ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جو آپ اور آپ کے ساتھیوں کی محنت کا ہی کمال معلوم ہوتا ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی کامیابی نے کارنامہ دکھایا کہ طنز و مزاح ہر خاص و عام میں سرایت کر گیا ہے۔ ہر شہر میں زندہ دلان حیدرآباد کی ایک عدد شاخ کی شدید ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔
خدا کرے ہمیں زندہ دلانِ حیدرآباد کی گولڈن جوبلی دیکھنا بھی نصیب ہو!

منظور وقار — گلبرگہ۔

مکرم و محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب!
آپ کے مشاعرہ میں شرکت نہ کرنے کا افسوس ہوا۔ دلاور فگار اور مجھے تو حکومت پاکستان نے NOC دے دیا تھا مگر پھر بھی ویزا نہ ملا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی!
"ظرافت" کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ مجھے یہ مطلع فرمایئے کہ یہ رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا ہے یا نہیں میں تو باقاعدہ ارسال کرتا ہوں۔
کانفرنس اور مشاعرہ کی تصاویر اور مختصر روداد مجھے "ظرافت" کے لیے بھیجئے۔

ضیاء الحق قاسمی
شیریں اسکوائر
کراچی یونیورسٹی کراچی ۳۲

پھر ملیں گے اگر خدا لایا [اداریہ]

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب ۱۸ ر تا ۲۱ ر نومبر ۲۰۰۸ کو بڑے اہتمام اور کامیابی کے ساتھ منائی گئیں۔ ۱۸ ر نومبر کو جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں ان تقاریب کی افتتاحی رسم ادا ہوئی۔ جناب لوتھر نے زندہ دلانِ حیدرآباد کی ۲۵ سالہ مساعی کا تفصیلی ذکر کیا۔ اور ماہنامہ شگوفہ کی ۴۰ سالہ خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ زندہ دلان کے اولین صدر جناب مجارت چند کھنہ نے ۲۵ شمعیں فروزاں کرتے ہوئے ادارے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ نامور مزاح نگار جناب یوسف ناظم اور ادارے کے اولین صدر جناب مجتبیٰ حسین اس افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔ ۱۸ ر نومبر کی شب منعقدہ ادبی اجلاس کی صدارتی کرسی فکر تونسوی کی یاد میں خالی رکھی گئی تھی فکر تونسوی اکثر زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقریبات میں شریک رہا کرتے تھے۔ بمبئی سے یوسف ناظم، پروفیسر اللہ [illegible] فیاض فیضی، دلی سے مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ، کویت سے سید نصرت اور بنگلور سے حلیمہ فردوس نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ مہمانوں کے علاوہ نریندر لوتھر، مسیح انجم، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور برہان حسین نے اپنے دلچسپ مضامین کے ذریعہ اس منفرد نثری اجلاس کو چار چاند لگائے۔ حسبِ معمول اس اجلاس میں داخلہ کے لیے شگوفہ سوونیر کی خریدی کا شرط تھی۔ اس بار سلور جوبلی سوونیر طالب خوندمیری کے بنائے ہوئے خوبصورت ہمہ رنگی سرورق کے ساتھ شائع ہوا۔ قارئین شگوفہ نے یقیناً یہ شمارہ پسند کیا ہوگا۔

۱۹ ر نومبر کو زندہ دلانِ حیدرآباد کے اولین معتمد اور نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو دولہا بنایا گیا۔ حسن اتفاق کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرح مجتبیٰ حسین کے تخلیقی سفر کے ۲۵ سال بھی مکمل ہوئے ہیں۔ تہنیتی تقریب کی صدارت جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے کی۔ مجتبیٰ حسین نے اخبار سیاست کے کالم نگار کی حیثیت سے طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ [illegible] مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مہمانِ خصوصی جناب سید ہاشم علی اختر نے اس جلسہ میں شرکت کی اور اپنی پُرلطف تقریر سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ مجتبیٰ حسین کی دو تازہ تصانیف "الغرض" اور "سو ہے یہ بھی آدمی" پروفیسر شکیل الرحمٰن کی کتاب "مجتبیٰ حسین کا فن" اور شگوفہ کے خصوصی "مجتبیٰ حسین نمبر" کی رسمِ اجراء ہاشم علی اختر صاحب نے انجام دی۔ اس قدر عظیم [illegible] بخارس کے بعد مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کے حصہ میں آیا ہے! تہنیتی تقریب کو دلی اور حیدرآباد کے نمائندہ [illegible] پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر شمیم حنفی، دلیپ سنگھ، پروفیسر اشتیاق حسین عابدی، جناب شمس الاسلام، اور جناب اختر حسن نے مخاطب کیا اور مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

اس بار ۲۰ ر نومبر کو شام میں منعقدہ لطیفہ گوئی کی محفل کو اس نوعیت کے جلسوں میں کامیاب ترین قرار دیا گیا۔ محفل لطیفہ سے قبل تنقیدی اجلاس پروفیسر گیان چند جین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور ڈاکٹر اشرف رفیع نے مقالے پڑھے۔ پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر مغنی تبسم، اور پروفیسر شمیم حنفی کے علاوہ دیگر حضرات نے طنز و مزاح کی اہمیت اور اس کے مقام پر عالمانہ روشنی ڈالی۔ پروفیسر گیان چند جین نے

شگوفہ کی خدمات کا خصوصی ذکر کیا اور کہا کہ اودھ پنچ کے بعد ظریفانہ صحافت کے سلسلہ میں شگوفہ کا نام لیا جا سکتا ہے جناب گیان چند کی تقریر تک محفل لطیفہ کے سامع سینکڑوں کی تعداد میں آچکے تھے۔ ان سب نے پروفیسر گیان چند کی پر مزاح صدارتی تقریر کا مسلسل تالیوں کی گونج میں خیر مقدم کیا۔ سلور جوبلی تقاریب کا آخری حصہ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ تھا۔ جس کا افتتاح گورنر شریمتی کمودبین جوشی نے کیا مشاعرہ کی یہ محفل ۹ بجے شروع ہوئی اور رات ۱½ بجے اختتام عمل میں آیا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد نے اس سال زندگی کے پچیس سال مکمل کر لیے اور شگوفہ نے بیسویں سال میں قدم رکھا۔ دونوں اداروں کا ماضی تو بلاشبہ شاندار تھا لیکن نئی نسل کے رویہ، تعاون اور دلچسپی پر مستقبل کا انحصار ہے اب وقت آگیا ہے کہ ادارے میں نیا خون داخل ہو۔ نوجوان اس قسم کی سرگرمیوں میں آگے آئیں۔ اس کے لیے ذاتی شہرت سے زیادہ جذبۂ اخلاص کی ضرورت ہے۔ سلور جوبلی تقاریب کے بعد ہمیں پھر ایک بار اپنا محاسبہ کرنے دوسری صف تیار کرنے اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ طنز و مزاح کی تحریک کو آگے بڑھانے کا کام انجام دینا ہے۔

Accession Number.
121885
Date 11.12.85

حلیمہ فردوس
کے
مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

مَاشاءاللہ

قیمت: ۱۵؍ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

نامور مزاح نگار
مسیح انجم کے مضامین کا تیسرا مجموعہ!

چنانچہ

۱۲؍ روپے

ناشر
زندہ دلانِ حیدرآباد

No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H. HD 6
l 20 Copy 12 Dec. 1987 Phone : 567716

ZINDA TILISMATH

To relieve you of cough, cold and other common 'ills'

ZINDA BALM

For relief from aches, pains and stiff joints

FAROOKY TOOTH POWDER

The proof of this powder's effectiveness is in the whiteness of your teeth

3 USEFUL HOME REMEDIES IN THE RICH UNANI TRADITION

Useful home remedies in the rich Unani tradition trusted for over 60 years.

Karkhana
Zinda Tilismath
Amberpet, Hyderabad 500 013.